جلد دوم

ہادیِ عالم ﷺ کی سیرت سے ماخوذ، عصرِ حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ دروس وعِبر اور فوائد وثمرات

سیرۃ النبی ﷺ

دکتور علی محمد صلابی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

معزز قارئین توجہ فرمائیں!

کتاب وسنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب ....

- عام قاری کے مطالعے کے لیے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق واجازت کے بعد اپ لوڈ (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کی خاطر ڈاؤن لوڈ، پرنٹ، فوٹوکاپی اور الیکٹرانک ذرائع سے محض مندرجات نشرواشاعت کی مکمل اجازت ہے۔

☆ تنبیہ ☆

- کسی بھی کتاب کو تجارتی یامادی نفع کے حصول کی خاطر استعمال کرنے کی ممانعت ہے۔
- ان کتب کو تجارتی یادیگر مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی، قانونی وشرعی جرم ہے۔

﴿اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں﴾

- نشرواشاعت، کتب کی خرید وفروخت اور کتب کے استعمال سے متعلقہ کسی بھی قسم کی معلومات کے لیے رابطہ فرمائیں۔

kitabosunnat@gmail.com

www.KitaboSunnat.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اللہ کے نام سے شروع جو نہایت رحم کرنے والا خوب مہربان ہے۔

مدحت النبی صلی اللہ علیہ وسلم

وأحسن منك لم تر قط عيني
وأجمل منك لم تلد النساء
خلقت مبرأ من كل عيب
كأنك قد خلقت كما تشاء

اور آپ کی ذاتِ اقدس سے زیادہ حسین میری نگاہ نے کبھی کوئی دیکھا ہی نہیں
اور آپ سے زیادہ حسن و جمال والا کبھی کسی ماں نے جنا ہی نہیں
آپ ہر قسم کے عیب سے پاک صاف پیدا کیے گئے ہیں
گویا آپ کی ذاتِ اقدس کو آپ کے منشا کے عین مطابق بنایا گیا ہے

ہادیٔ عالم ﷺ کی سیرت سے ماخوذ، عصرِ حاضر
کے تقاضوں سے ہم آہنگ دروس و عبر اور فوائد و ثمرات
سیرت النبی ﷺ
2

© مكتبة دار السلام، ١٤٣٣ هـ

فهرسة مكتبة الملك فهد الوطنية أثناء النشر

الصلابي، علي محمد

سيرة النبي صلى الله عليه وسلم / علي محمد الصلابي - الرياض، ١٤٣٣ هـ

ص: ٨٤٠ مقاس: ٢٩×١٤ سم

ردمك: ٨-٠٩١-٥٠٠-٦٠٣-٩٧٨ (مجموعة)

٢-٠٩٣-٥٠٠-٦٠٣-٩٧٨ (ج ٢) (النص باللغة الاردية)

١. السيرة النبوية أ. العنوان

ديوي ٢٣٩ ١٤٣٣/٢٧٦٣

رقم الإيداع: ١٤٣٣/٢٧٦٣

ردمك: ٨-٠٩١-٥٠٠-٦٠٣-٩٧٨ (مجموعة)

٢-٠٩٣-٥٠٠-٦٠٣-٩٧٨ (ج ٢)

سعودی عرب (ہیڈ آفس)

شاہ عبدالعزیز بن جلاوی سٹریٹ پوسٹ بکس: 22743 الریاض: 11416 سعودی عرب

فون: 4033962-4043432 1 00966 فیکس: 4021659 www.darussalamksa.com

Email: darussalam@awalnet.net.sa info@darussalamksa.com

الریاض • العلیا فون: 4614483 1 00966 فیکس: 4644945 • الملز فون: 4735220 1 00966 فیکس: 4735221
• سویدی فون: 4286641 1 00966 • سویلم فون/فیکس: 2860422 1 00966

جدہ فون: 6879254 2 00966 فیکس: 6336270 مدینہ منورہ فون: 8234446,8230038 4 00966 فیکس: 8151121 04

الخبر فون: 8692900 3 00966 فیکس: 8691551 3 00966 خمیس مشیط فون/فیکس: 2207055 7 00966

ینبع البحر فون: 0500887341 فیکس: 8691551 قصیم (بریدہ) فون: 0503417156 فیکس: 3696124 6 00966

امریکہ • نیویارک فون: 5925 625 718 001 • ہیوسٹن: 0419 722 713 001 کینیڈا • [illegible] فون: 4186619 416 001

لندن • [illegible] فون: 77252246 20 0044-85394885 20 0044 • برمنگھم: 7739309 0121 0044

متحدہ عرب امارات • شارجہ فون: 5632623 6 00971 فیکس: 5632624 فرانس فون: 52928 480 01 0033 فیکس: 52997 480 01 0033

انڈیا • [illegible] فون: 45566249 44 0091 موبائل: 12041 98841 0091 • [illegible] فون: 4180 2373 22 0091

• [illegible] فون: 4892 2451 40 0091 موبائل: 30850 98493 0091 • [illegible] فون: 42157847 44 0091

سری لنکا • [illegible] فون: 358712 115 0094 • [illegible] فون: 2669197 114 0094

پاکستان ہیڈ آفس و مرکزی شوروم

لاہور 36-لوئر مال، سیکرٹریٹ سٹاپ لاہور فون: 00 4 32 372,24 400 372,34 240 373 42 0092 فیکس: 72 540 373 042

• غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور فون: 54 200 371 42 0092 فیکس: 03 207 373 042

• Y بلاک، گول کمرشل مارکیٹ، دکان: 2 (گراؤنڈ فلور) ڈیفنس، لاہور فون: 10 926 356 42 0092

کراچی مین طارق روڈ، آفس مال سے (بہادر آباد کی طرف) دوسری گلی کراچی فون: 36 939 343 21 0092 فیکس: 37 939 343 21 0092

اسلام آباد F-8 مرکز، اسلام آباد فون/فیکس: 13 815 22 51 0092

info@darussalampk.com | www.darussalampk.com

ہادیِ عالم ﷺ کی سیرت سے ماخوذ، عصرِ حاضر
کے تقاضوں سے ہم آہنگ دروس وعبر اور فوائد وثمرات

سیرت النبی ﷺ

تالیف:

دکتور علی محمد صلابی

مترجمین:

مولانا محمد یونس بٹ

مولانا محمد ادریس سلفی   مولانا محمد ندیم شہباز

اللهم صل على
محمد ﷺ
وعلى آل محمد كما صليت على ابراهيم
وعلى آل ابراهيم انك حميد مجيد
اللهم بارك على محمد وعلى آل محمد
كما باركت على ابراهيم وعلى آل ابراهيم
انك حميد مجيد

فہرست (جلد دوم)

حصہ: 8 | رسول اللہ ﷺ اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی ہجرت

حصہ 10: غزوۂ بدر کبریٰ

حصہ 11: غزوۂ بدر سے غزوۂ احد تک

حصہ: 12 | غزوۂ احد اور خندق کے درمیان کے اہم واقعات

اجمالی فہرست ونقشہ جات

حصہ 8

رسول اللہ ﷺ اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی ہجرت

باب : 1 مشرکین کا منصوبۂ قتل اور ہجرت مدینہ

باب : 2 مہاجرین کے اوصافِ حمیدہ، ان کا انعام و اکرام اور ہجرت سے پیچھے رہنے والوں کا انجام

وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ ؕ وَيَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ۝

”اور (اے نبی! یاد کیجیے) جب وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا آپ کے بارے میں تدبیر کر رہے تھے تاکہ وہ آپ کو قید کر دیں یا آپ کو قتل کر دیں یا آپ کو (مکہ سے) نکال دیں اور وہ تدبیریں کر رہے تھے اور اللہ بھی تدبیر کر رہا تھا اور اللہ بہترین تدبیر کرنے والا ہے۔“

(الأنفال 8:30)

باب 1

مشرکین کا منصوبۂ قتل اور ہجرتِ مدینہ

رسول اللہ ﷺ کو (نعوذ باللہ) قتل کرنے کی ناکام کوشش

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی ہجرتِ مدینہ کے راستے میں قریشیوں نے طرح طرح کی رکاوٹیں کھڑی کیں مگر انھیں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ جب صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی اکثریت مدینہ ہجرت کر گئی تو قریش کو معاملے کی سنگینی کا احساس ہوا۔ ان کے اقتصادی مفادات اور قبائل عرب پر ان کی معاشرتی برتری خطرے میں پڑ گئی، لہٰذا انھوں نے اسلامی تحریک کے سربراہ کو (نعوذ باللہ) ختم کرنے کے لیے دارالندوہ میں مجلس مشاورت کا انعقاد کیا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان نازل ہوا:

﴿وَإِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِيُثْبِتُوكَ أَوْ يَقْتُلُوكَ أَوْ يُخْرِجُوكَ ۚ وَيَمْكُرُونَ وَيَمْكُرُ اللَّهُ ۖ وَاللَّهُ خَيْرُ الْمَاكِرِينَ ۝﴾

”اور (اے نبی! یاد کیجیے) جب وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا آپ کے بارے میں تدبیر کر رہے تھے تاکہ وہ آپ کو قید کر دیں یا آپ کو قتل کر دیں یا آپ کو (مکہ سے) نکال دیں اور وہ تدبیریں کر رہے تھے اور اللہ بھی تدبیر کر رہا تھا اور اللہ بہترین تدبیر کرنے والا ہے۔“[1]

ابن عباس رضی اللہ عنہما اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ ایک رات قریش نے مکہ میں مجلس

[1] الأنفال 8:30.

مشاورت قائم کی۔ ایک آدمی نے مشورہ دیا کہ اس (محمد رسول اللہ ﷺ) کو بیڑیوں میں جکڑ دیا جائے،[1] دوسرے نے قتل کرنے اور تیسرے نے جلاوطن کرنے کا مشورہ دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس مجلس کی خبر رسول اللہ ﷺ کو بذریعہ وحی پہنچادی، چنانچہ آپ اسی رات مکہ سے روانہ ہو گئے اور آپ کے بستر پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے رات بسر کی۔[2] صبح کے وقت جب قریش حملہ آور ہوئے تو بستر پر علی رضی اللہ عنہ کو پایا۔ انھیں اپنا منصوبہ ناکام ہوتا نظر آیا تو پوچھا: ''تمھارا ساتھی کہاں ہے؟'' علی رضی اللہ عنہ نے کہا: ''مجھے معلوم نہیں۔'' تب قریش نبی ﷺ کے آثار کا تعاقب کرتے ہوئے جبل ثور تک جا پہنچے۔ جب پہاڑ پر چڑھتے ہوئے غار پر سے گزرے تو غار کے دھانے پر مکڑی کا جالا نظر آیا۔ کہنے لگے کہ اگر کوئی اس غار میں داخل ہوتا تو یہ جالا یہاں نہ ہوتا۔ آنحضرت ﷺ غار ثور میں تین دن مقیم رہے۔[3]

سید قطب رحمہ اللہ مذکورہ آیت کی تفسیر میں مشرکین کے مکر اور قاتلانہ منصوبے کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں: ''درحقیقت اس آیت مبارکہ میں مسلمانوں کے حالات کی تبدیلی سے پہلے کے مکی دور کا تذکرہ بھی ہے اور مستقبل میں احوال تبدیل ہونے کی یقین دہانی بھی جیسا کہ اللہ کی طے شدہ تدبیر اور حکمت کے بہتر اور موثر ہونے کا ذکر کیا گیا ہے، چنانچہ مسلمان جو قرآن کے اولین مخاطب تھے، ماضی اور مستقبل دونوں کے حالات جان گئے کیونکہ وہ ماضی قریب میں خود ان حالات سے گزر چکے تھے۔ اس میں ماضی کے خوفناک اور پرالم واقعات کی یاددہانی کے ساتھ ساتھ حق و باطل کی اس کشمکش کے نتیجے میں حاصل ہونے والے امن و سکون کی خوشخبری بھی دی گئی ہے۔ وہ یہ کہ نہ صرف مسلمانوں کو مشرکین کے ظلم و ستم سے نجات ملے گی بلکہ نبی ﷺ کے خلاف کفار کا منصوبہ ناکام رہے گا اور بالآخر مسلمانوں کو ان پر غلبہ حاصل ہوگا۔ دوسری یہ کہ مشرکین نے رسول اللہ ﷺ کے

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 124/2-126، ودلائل النبوة للبيهقي: 466/2-468. [2] مسند أحمد: 348/1. [3] البداية والنهاية: 181/3، و فتح الباري، شرح الحديث: 3905.

خلاف کیسی کیسی سازشیں کیں۔ اس آیت میں ان سازشوں سے نہ صرف چھٹکارا پانے کی نوید تھی بلکہ آئندہ زمانے میں ان پر غلبہ حاصل کرنے کا عندیہ بھی تھا۔

قریشی چاہتے تھے کہ (معاذ اللہ) کسی طرح مکروفریب سے نبی ﷺ کو قید کر لیا جائے اور قید ہی میں آپ کا انتقال ہو جائے یا آپ ﷺ کو قتل کر کے خلاصی حاصل کی جائے، یا پھر آپ کو مکہ سے کہیں دور جلاوطن کر دیا جائے، چنانچہ مشورے کے بعد آپ کے قتل کا منصوبہ اس طرح طے پایا کہ مختلف قبائل کے نوجوانوں پر مشتمل ایک جماعت تشکیل دی جائے جو یکبارگی آپ پر حملہ آور ہو۔ اس طرح آپ کا خون مختلف قبائل میں بٹ جائے گا اور بنو ہاشم پورے عرب کا مقابلہ نہ کر سکیں گے اور مجبوراً انھیں دیت قبول کرنی پڑے گی۔

اس آیت میں ایک طنز بھی پوشیدہ ہے، وہ یہ کہ ذات باری تعالیٰ کے قہر و غضب سے مخلوق کو ڈرنا چاہیے مگر یہاں کمزور ترین انسان (کفار) مضحکہ خیز طور پر اس قادرِ مطلق کا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں جو عظیم طاقت کا مالک اور اپنے بندوں پر غالب ہے، ہر حال میں اپنے فیصلے نافذ کرنا جانتا ہے اور ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے۔"●

رسول اللہ ﷺ کے ہجرت کے پروگرام کی ترتیب

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ روزانہ ہمارے گھر صبح یا شام کو تشریف لایا کرتے تھے لیکن جس روز آپ ﷺ کو مکہ سے ہجرت کرنے اور اپنی قوم کو الوداع کہنے کا حکم ملا آپ ﷺ دوپہر کے وقت ہمارے گھر تشریف لائے، حالانکہ عموماً ایسے وقت میں آپ نہیں آیا کرتے تھے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے دیکھتے ہی کہہ دیا کہ آپ ﷺ کا اس وقت تشریف لانا ضرور کسی نئی بات کا پیش خیمہ ہے۔ جیسے ہی رسول اللہ ﷺ نے گھر میں قدم رکھا، ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنی مسند آپ کے لیے خالی کر دی۔ گھر میں اس وقت میرے اور میری

● تفسير في ظلال القرآن لسيد قطب: 1501/3.

بہن اسماء کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ آپ ﷺ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ سے فرمایا: «أَخْرِجْ عَنِّي مَنْ عِنْدَكَ» ''سب کو باہر نکال دو۔''

ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''یہ دونوں میری بیٹیاں ہیں۔ آپ فکر نہ کریں۔ میرے ماں باپ آپ پر قربان! معاملہ کیا ہے؟''

آپ ﷺ نے فرمایا: «فَإِنِّي قَدْ أُذِنَ لِي فِي الْخُرُوجِ وَالْهِجْرَةِ» ''مجھے روانگی اور ہجرت کا حکم ملا ہے۔''

ابوبکر رضی اللہ عنہ نے سوال کیا: ''کیا مجھے بھی (اس سفر میں) آپ کا ساتھ نصیب ہوگا؟''

آپ ﷺ نے فرمایا: «نَعَمْ» ''ہاں۔'' صدیق اکبر رضی اللہ عنہ رونے لگے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ اس دن سے قبل میں نہیں جانتی تھی کہ کوئی خوشی سے بھی روسکتا ہے۔

ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''میرے پاس یہ دو سواریاں (اونٹنیاں) ہیں جو میں نے اسی سفر کے لیے تیار کر رکھی ہیں۔''

دونوں حضرات نے ایک آدمی عبداللہ بن اریقط سے راستے کی رہنمائی کے لیے اجرت طے کر لی۔ عبداللہ بنو دیل بن بکر سے تھا۔ اور اس کی ماں بنو سہم بن عمرو سے تھی۔ وہ ابھی تک مشرک ہی تھا۔ انھوں نے دونوں اونٹنیاں اس کے سپرد کر دیں۔ وہ اس کے پاس رہیں اور وہ نبی ﷺ اور ابوبکر رضی اللہ عنہ سے طے شدہ وقت تک انھیں چراتا اور ان کی دیکھ بھال کرتا رہا۔[1]

امام بخاری رحمہ اللہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ایک لمبی روایت نقل کی ہے جس میں وہ فرماتی ہیں: ''ایک دن ہم دوپہر کے وقت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے گھر میں بیٹھے تھے تو کسی نے کہا: ''دیکھو، اللہ کے رسول ﷺ سر پر کپڑا ڈالے ایسے وقت میں تشریف لا رہے ہیں کہ پہلے کبھی اس وقت نہیں آئے۔'' ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''میرے ماں باپ آپ ﷺ پر قربان! اللہ کی قسم! ضرور کوئی معاملہ پیش آیا ہے۔'' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''سب کو یہاں سے

1 السيرة النبوية لابن كثير: 234,233/2، والسيرة النبوية لابن هشام: 129,128/2.

نکال دو۔'' ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ''اللہ کے رسول! یہ تو آپ کے اہل خانہ ہیں۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا: ''مجھے ہجرت کا حکم ہوا ہے۔'' ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ''میرے ماں باپ آپ پر قربان! کیا مجھے شرفِ صحبت حاصل ہونے والا ہے؟'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہاں!'' ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ''اللہ کے رسول! میرے ماں باپ آپ پر قربان! یہ میری دو سواریاں ہیں، ان میں سے ایک آپ لے لیجیے۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بلا قیمت لینے سے انکار کر دیا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ''ہم نے دونوں سواریاں جلدی سے تیار کیں، زاد راہ تیار کر کے چمڑے کے ایک تھیلے میں ڈال دیا۔ اسماء نے اپنے کمر بند سے ایک ٹکڑا کاٹ کر تھیلے کا منہ بند کر دیا، اس لیے اسے ذات النطاقین کا لقب ملا، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر رضی اللہ عنہ غار ثور میں جا ٹھہرے۔ وہ وہاں تین راتیں چھپے رہے۔ عبداللہ بن ابی بکر رضی اللہ عنہما رات وہاں گزارتا اور سحری کے وقت مکہ پہنچ جاتا اور قریش سمجھتے کہ وہ مکہ ہی میں رات گزارتا ہے۔ عبداللہ رضی اللہ عنہ ایک ذہین اور سمجھدار نوجوان تھا۔ مکہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بارے میں جو بھی پروگرام بنتا اسے سمجھ لیتا اور رات کے اندھیرے میں غار ثور پہنچ کر ساری گفتگو ان سے کہہ دیتا۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ کا غلام عامر بن فہیرہ دن بھر بکریاں چراتا، جب رات کا ایک حصہ گزر جاتا تو بکریاں لے کر ان کے پاس پہنچ جاتا۔ اس طرح رات کو بکریوں کا دودھ پی کر دونوں آسودہ ہو جاتے، پھر صبح تڑکے ہی عامر بن فہیرہ بکریاں ہانک کر چل دیتا۔ تینوں راتیں اس نے ایسا ہی کیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بنو دیل کے ایک آدمی کی خدمات اجرت پر حاصل کر رکھی تھیں۔ وہ راستوں کی رہنمائی کا بڑا ماہر تھا۔ عاص بن وائل سہمی کا حلیف تھا اور ابھی تک قریش کے دین پر تھا۔ اس پر اعتبار کرتے ہوئے دونوں سواریاں اسی کے سپرد کر دی گئی تھیں۔ اس نے وعدہ کیا تھا کہ تین راتوں کے بعد غار ثور کے پاس سواریاں لے کر آئے گا، چنانچہ جب وہ وہاں پہنچ گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ابوبکر رضی اللہ عنہ اور عامر بن فہیرہ رضی اللہ عنہ

کو لے کر اس نے ساحل کا راستہ اختیار کیا۔"[1]

مکہ سے غار ثور تک

رسول اللہ ﷺ مکہ سے نکلے تو علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ، ابوبکر رضی اللہ عنہ اور آپ کے گھر والوں کے علاوہ کسی کو اس کا علم نہ تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو پیچھے رہنے کا حکم تھا کہ وہ اہل مکہ کی امانتیں واپس کر دیں۔ مکہ والے جب اپنی کسی چیز کے بارے میں تلف یا گم ہونے کا خطرہ محسوس کرتے تو آپ ﷺ کے پاس بطور امانت رکھ دیا کرتے تھے کیونکہ وہ آپ ﷺ کے صدق و امانت کے قائل تھے۔[2]

رسول اللہ ﷺ اور ابوبکر رضی اللہ عنہ طے شدہ وقت پر ابوبکر رضی اللہ عنہ کے گھر کے پچھواڑے سے نکلے۔[3] تاکہ روانگی صیغہ راز میں رکھی جائے اور قریش ان کا تعاقب کرتے ہوئے کہیں انھیں اس بابرکت سفر سے روکنے میں کامیاب نہ ہو جائیں۔ انھوں نے عبداللہ بن اریقط کو تین راتوں کے بعد غار ثور پہنچنے کا کہا اور خود عازم سفر ہوئے۔[4]

نبی ﷺ کی مکہ سے نکلتے وقت دعا اور مکہ سے اظہار عقیدت و محبت

نبی ﷺ نے مکہ سے نکلتے ہی یہ دعا فرمائی:

«اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي خَلَقَنِي وَلَمْ أَكُ شَيْئًا، اَللّٰهُمَّ أَعِنِّي عَلٰى هَوْلِ الدُّنْيَا، وَبَوَائِقِ الدَّهْرِ، وَمَصَائِبِ اللَّيَالِي وَ الْأَيَّامِ، اَللّٰهُمَّ اصْحَبْنِي فِي سَفَرِي، وَاخْلُفْنِي فِي أَهْلِي، وَلَكَ فَذَلِّلْنِي، وَذٰلِكَ عَلٰى خُلُقٍ صَالِحٍ فَقَوِّمْنِي وَإِلَيْكَ يَا رَبِّ فَحَبِّبْنِي، وَإِلَى النَّاسِ فَلَا تَكِلْنِي،

[1] صحيح البخاري، حديث: 3905. [2] السيرة النبوية لابن كثير: 234/2. [3] الهجرة في القرآن الكريم لأحزمي سامعون جزولي، ص: 334. [4] خاتم النبيين لأبي زهرة: 659/1، و السيرة النبوية لابن كثير: 234/2.

رَبَّ الْمُسْتَضْعَفِينَ! فَأَنْتَ رَبِّي، أَعُوذُ بِوَجْهِكَ الْكَرِيمِ الَّذِي أَشْرَقَتْ لَهُ نُورَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ، وَكَشَفْتَ بِهِ الظُّلُمَاتِ، وَصَلَحْتَ بِهِ أَمْرَ الْأَوَّلِينَ وَالْآخِرِينَ، أَنْ تُحَلِّلَ عَلَيَّ سَخطَكَ، أَوْ تُنَزِّلَ عَلَيَّ غَضَبَكَ، أَعُوذُبِكَ مِنْ زَوَالِ نِعْمَتِكَ وَفُجَاءَ ةِ نِقْمَتِكَ، وَتَحَوُّلِ عَافِيَتِكَ، وَجَمِيعِ سَخَطِكَ، لَكَ الْعُتْبٰى عِنْدِي مَا اسْتَطَعْتُ، لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ»

''تمام تعریفیں اس ذات کے لائق ہیں جس نے مجھے پیدا کیا حالانکہ میں کچھ نہ تھا۔ اے اللہ! دنیا کی ہولنا کیوں، زمانے کی آفتوں اور شب و روز کے مصائب پر میری مدد فرما۔ اے اللہ! میرے اس سفر میں اپنا ساتھ نصیب فرما، میرے اہل خانہ کی حفاظت اور میری درست رہنمائی فرما دے اور مجھے اس پر کاربند رکھ۔ اے اللہ! مجھے اپنا محبوب بنالے اور لوگوں کے سپرد نہ کر۔ تو میرا اور کمزور لوگوں کا رب ہے۔ میں تیرے چہرے کے اس نور کی پناہ چاہتا ہوں جس سے تو نے زمین و آسمان اور تاریکیوں کو روشن کر دیا اور تو نے پہلے والے اور آخری لوگوں کے معاملے کو درست کر دیا کہ تو مجھ پر اپنا غضب نازل کرے یا تیرا عتاب مجھ پر وارد ہو۔ اے اللہ! میں تیری پناہ چاہتا ہوں کہ تیری نعمت زائل ہو یا تیری سزا اچانک وارد ہو۔ اے اللہ! میں تجھ سے مستقل تندرستی مانگتا ہوں اور تیری تمام تر ناراضی سے پناہ چاہتا ہوں۔ اور اپنی بساط کے مطابق تیری ہی رضا مطلوب ہے۔ اور تیرے بغیر کوئی زور اور طاقت نہیں۔''[1]

پھر نبی ﷺ مکہ کے بازار میں ایک بلند مقام پر کھڑے ہوئے اور فرمایا: «وَاللّٰهِ! إِنَّكِ

[1] السيرة النبوية لابن كثير: 2/230-234، والمصنف لعبد الرزاق، حديث: 9234، روایت ضعیف ہے۔

لَخَيْرُ أَرْضِ اللّٰهِ، وَ أَحَبُّ أَرْضِ اللّٰهِ إِلَى اللّٰهِ، وَ لَوْلَا أَنِّي أُخْرِجْتُ مِنْكِ مَا خَرَجْتُ» ''اللہ کی قسم! (اے مکہ) یقیناً تو کائنات کی بہترین اور اللہ تعالیٰ کی محبوب ترین زمین ہے۔ اگر مجھے یہاں سے نکلنے پر مجبور نہ کیا جاتا تو میں یہاں سے کبھی نہ جاتا۔''[1]

پھر رسول اللہ ﷺ اور ابوبکر رضی اللہ عنہ محو سفر ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے انھیں مشرکین کی پکڑ سے محفوظ فرما دیا اور وہ ناکام ہو کر لوٹ گئے۔

امام احمد رحمہ اللہ عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ مشرکین رسول اللہ ﷺ کے آثار پر چلتے ہوئے غار ثور تک جا پہنچے اور جب پہاڑ پر چڑھے تو غار کے قریب سے گزرے جس کے دہانے پر مکڑی کا جالا تھا اور کہنے لگے: ''اگر کوئی اس غار میں گیا ہوتا تو یہاں مکڑی کا جالا نہ ہوتا۔''[2]

یہ من جملہ اللہ تعالیٰ کے ان لشکروں میں سے ہیں جن کے ذریعے وہ باطل کو رسوا کرتا اور حق کی مدد فرماتا ہے۔ اللہ کے لشکر مادی ہوں یا غیر محسوس، بے شمار ہیں۔ بالفرض اگر مادی ہوں تو ضروری نہیں کہ وہ جسامت میں ضخیم ہوں۔ کبھی کبھی تو ایک جرثومہ جسے آنکھ بھی نہیں دیکھ سکتی، ایک بڑے لشکر کو ختم کرنے کے لیے کافی ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

﴿وَمَا يَعْلَمُ جُنُودَ رَبِّكَ إِلَّا هُوَ ۚ وَمَا هِيَ إِلَّا ذِكْرَىٰ لِلْبَشَرِ ۝﴾

''اور آپ کے رب کے لشکروں کو بس وہی جانتا ہے۔ اور وہ (جہنم) بشر کے لیے نصیحت ہی تو ہے۔''[3]

یعنی آپ کے رب کے لشکر کثیر تعداد میں ہونے کے باعث صرف وہی جانتا ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کی طاقت وقدرت بے کنار ہے، اسی طرح اس کے لشکر بھی بے پناہ ہیں۔[4]

---

[1] جامع الترمذي، حديث: 3925، و سنن ابن ماجه، حديث: 3108، و مسند أحمد: 305/4 واللفظ له. [2] مسند أحمد: 348/1. موسوعہ حدیثیہ کے محققین نے اس کی سند کو ضعیف کہا ہے۔
[3] المدثر 31:74. [4] تفسير الرازي: 208/30.

کوئی آدمی نہ تو انھیں شمار کرسکتا ہے اور نہ ان کے حقائق اور صفات کو اجمالاً ہی جان سکتا ہے کجا یہ کہ ان کے مکمل کوائف مقدار، کیفیت اور تناسب سمیت جان سکے۔ [1]

نبی ﷺ کی حفاظت کا الوہی اہتمام

نبی ﷺ نے تمام ممکنہ احتیاطی تدابیر اور اسباب اختیار کیے مگر کامل بھروسا اللہ تعالیٰ ہی پر کیا۔ آپ ﷺ ہمیشہ اپنے رب سے نصرت وحمایت انھی الفاظ میں طلب کرتے رہے جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو خصوصی طور پر سکھلائے تھے۔ [2] وہ الفاظ اس طرح ہیں:

﴿رَّبِّ اَدۡخِلۡنِیۡ مُدۡخَلَ صِدۡقٍ وَّاَخۡرِجۡنِیۡ مُخۡرَجَ صِدۡقٍ وَّاجۡعَلۡ لِّیۡ مِنۡ لَّدُنۡكَ سُلۡطٰنًا نَّصِیۡرًا ۝﴾

''اور کہیے: اے میرے رب! داخل کر مجھے سچا داخل کرنا اور نکال مجھے سچا نکالنا اور مجھے اپنے پاس سے مدد دینے والا غلبہ عطا کردے۔'' [3]

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو ہدایت فرمائی کہ آپ خود بھی یہی دعا کریں اور اپنی امت کو بھی یہ دعا سکھائیں اور انھیں اپنے رب کا قرب حاصل کرنے کا طریقہ بتائیں۔ یہ ایسی دعا ہے جس میں مکہ سے سچائی کے ساتھ نکلنے اور مدینہ میں سچائی کے ساتھ پہنچنے کی تمنا کا تذکرہ ہے اور یہ خیر وعافیت کا اشارہ ہے جو آخر تک سارے سفرِ ہجرت پر محیط ہے۔

﴿صِدۡقٍ﴾ (سچائی) کا لفظ موقع کی مناسبت سے ذکر کیا گیا ہے کیونکہ مشرکینِ مکہ آپ ﷺ کو وحی الٰہی کے حوالے سے آزمائش میں مبتلا کرنا چاہتے تھے کہ آپ اللہ کے بارے میں کذب بیانی سے کام لیں۔ اور سچائی کے کچھ فائدے بھی ہیں جیسے: دل کی پختگی، اطمینانِ قلب، پاکیزگی اور اخلاص۔

[1] تفسیر أبي السعود: 60/9. [2] الهجرة النبوية المباركة للدكتور عبدالرحمٰن البر، ص: 72.
[3] بنيٓ إسرآءيل 80:17.

اور ﴿وَاجْعَلْ لِّيْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا﴾ میں ﴿سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا﴾ سے مراد قوت و ہیبت ہے جن کے ذریعے سے اقتدار اور مشرکین کی قوت پر غلبہ حاصل ہوا۔ اور ﴿مِنْ لَّدُنْكَ﴾ میں اللہ تعالیٰ کے قرب، اس سے براہِ راست مدد اور اس کی پناہ حاصل کرنے کی طرف اشارہ ہے۔

داعی صرف اپنے رب سے قوت کا طلبگار ہوتا ہے اور اس سے ڈرتا ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ نہ کرے اور اس کے بجائے کسی حاکم یا صاحبِ جاہ و منصب سے مدد کا طلب گار ہو کہ وہ اس کی نصرت و حمایت کا بندوبست کرے۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ بادشاہوں کے دل میں دعوت اسلامی سرایت کر جاتی ہے اور وہ اس تحریک کے خادم بن جاتے ہیں اور اس کے غلبے کے لیے کوشش کرتے ہیں۔ یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ درحقیقت غلبۂ اسلام من جانب اللہ ہے، اسے کسی صاحب جاہ وحشمت کی بھی ضرورت نہیں۔ [1]

جب مشرکین نے غار ثور کا احاطہ کر لیا اور سامنے نظر بھی آنے لگے تو رسول اللہ ﷺ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اللہ کی معیت کا حوالہ دے کر دلاسا دیا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے آپ ﷺ سے کہا اور ہم اس وقت غار ثور میں تھے: ''اگر ان مشرکین میں سے کوئی بھی نیچے دیکھے تو ہمیں دیکھ سکتا ہے۔'' اس پر نبی ﷺ نے فرمایا:

«مَا ظَنُّكَ يَا أَبَا بَكْرٍ بِاثْنَيْنِ اللّٰهُ ثَالِثُهُمَا؟»

''اے ابوبکر! تیرا ان دو آدمیوں کے بارے میں کیا خیال ہے جن کے ساتھ تیسرا ان کا اللہ ہے؟'' [2]

اور ایک روایت کے الفاظ اس طرح ہیں:

---

[1] تفسير في ظلال القرآن لسيد قطب: 2247/4. [2] صحيح البخاري، حديث: 3653، و صحيح مسلم، حديث: 2381.

«اُسْكُتْ يَا أَبَابَكْرٍ، اثْنَانِ اللّٰهُ ثَالِثُهُمَا»

''اے ابوبکر! خاموش ہو جائیے۔ دو آدمیوں کا تیسرا اللہ ہے۔'' [1]

اللہ تعالیٰ نے اس حقانیت کا تذکرہ اپنے اس فرمان میں کیا ہے:

﴿اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثَانِيَ اثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا﴾

''اگر تم اس (نبی) کی مدد نہیں کرو گے تو تحقیق اللہ نے اس کی (اس وقت) مدد کی (تھی) جب کافروں نے اس کو (مکہ سے) نکال دیا تھا، (وہ) دو میں دوسرا تھا، جبکہ وہ دونوں غار (ثور) میں تھے، جب وہ (نبی) اپنے ساتھی (ابوبکر) سے کہہ رہا تھا: غم نہ کر، یقیناً اللہ ہمارے ساتھ ہے۔'' [2]

علامہ طبری اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو خبر دی ہے کہ لوگ چاہے میرے نبی کی مدد کریں یا نہ کریں، میں اسلام دشمنوں کے خلاف اپنے پیغمبر کی ضرور مدد کروں گا اور غلبہ بھی عطا کروں گا، نیز کفار کو یاددہانی کروائی گئی ہے کہ تم چاہے بظاہر کثیر تعداد میں ہو اور پیغمبر کی جماعت قلت میں ہے لیکن حقیقت میں وہ اللہ کے خصوصی لشکروں کی وجہ سے کثرت میں ہے۔ اللہ تعالیٰ ایمانداروں سے مخاطب ہے کہ اے ایماندارو! اگر تم میرے رسول کی مدد کے لیے نہ بھی نکلے تو اللہ اس کا ناصر و مددگار ہے۔

﴿اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ یعنی جب کفار مکہ نے اسے اس کے وطن اور گھر سے نکالا۔ یعنی جب قریش نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ سے جلاوطن کر دیا تو وہ دو افراد میں سے ایک تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہی وہ دو افراد ہیں جب مکہ والوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنا چاہا تو وہ دونوں قریش سے تنگ آ کر وہاں سے نکلے اور غار ثور میں چھپ گئے۔ ﴿اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ﴾ یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر رضی اللہ عنہ جو کہ غار ثور میں تھے۔

[1] صحيح البخاري، حديث: 3922. [2] التوبة 9:40.

﴿اِذْ يَقُوْلُ لِصٰحِبِهٖ﴾ یعنی رسول اللہ ﷺ ابوبکر رضی اللہ عنہ سے فرما رہے تھے کہ غم نہ کر۔ اور یہ جملہ آپ نے اس لیے فرمایا کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ ڈر رہے تھے کہ اگر کفار نے یہاں تلاش شروع کر دی تو وہ دونوں پکڑے جا سکتے ہیں۔ ان کی اس گھبراہٹ کو دیکھتے ہوئے نبی ﷺ نے فرمایا تھا: ''غم نہ کر۔ اللہ ہمارے ساتھ ہے۔'' وہ ہمارا مددگار ہے، اس لیے مشرکین ہمیں ڈھونڈ سکتے ہیں نہ پکڑ سکتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ گویا یاددہانی کرا رہا ہے کہ جب تمھیں خوف اور قلت تعداد کا احساس تھا، اس وقت میں نے اپنے نبی کی مدد کی اور اب تو اس کے پاس انصار و مہاجرین کے لشکر بھی موجود ہیں تو کون اسے رسوا کرنے یا گزند پہنچانے کی جرأت کر سکتا ہے![1]

ڈاکٹر عبدالکریم زیدان آیت کریمہ میں وارد معیت کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ﴿اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا﴾ سے مستفاد معیت اس معیت سے اعلیٰ و افضل ہے جو اللہ تعالیٰ نے متقین اور پرہیزگار لوگوں کے لیے اس آیت میں بیان فرمائی ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِيْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ ۝﴾

''بلاشبہ اللہ ان کے ساتھ ہے جنھوں نے پرہیزگاری کی اور وہ احسان کرتے ہوں۔''[2]

اللہ تعالیٰ نے اپنی معیت کا تذکرہ اپنے نبی ﷺ کے حق میں فرمایا ہے۔ اس کا تعلق صرف ذات رسول ﷺ اور آپ کے ہم سفر ابوبکر رضی اللہ عنہ سے ہے اور کسی خاص وصف کو یہاں بطور علت نہیں بیان کیا جس طرح کہ متقین کے لیے تقویٰ و احسان کا انعام معیت قرار دیا گیا، لہٰذا یہ معیت آپ کی ذات اور ابوبکر کے ساتھ خاص تھی جسے قرآن کی آیات بینات اور خرقِ عادت معجزاتِ نبوی کی حمایت حاصل تھی۔[3]

انھی آیات کی تفسیر میں سید قطب رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''جس طرح ایک ظالم قوت کلمہ حق

[1] تفسير الطبري: 136,135/10. [2] النحل 128:16. [3] المستفاد من قصص القرآن لعبد الكريم زيدان: 100/2.

کا مقابلہ نہ کرسکے تو وہ اپنے آپ کو ایسی مشکل حالت میں پاتی ہے کہ نہ اپنا دفاع کرسکتی ہے اور نہ اسے قرار آتا ہے تو کچھ ایسی ہی حالت قریش کی ہوئی کہ جب ان کے لیے نبی ﷺ کا وجود ناقابل برداشت ہوگیا تو انھوں نے باہم مشورہ کیا کہ اس نبی سے اب نجات حاصل کرلی جائے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے اس منصوبے کو پیغمبر پر آشکارا فرمادیا اور حکم دیا کہ ابوبکر کو ساتھ لے کر مدینہ ہجرت کر جایئے۔ حالت یہ تھی کہ آپ ﷺ کے پاس کوئی لشکر تھا نہ پیروکاروں کی قابل ذکر تعداد تھی۔ اور دشمن کی تعداد اور قوت بہت زیادہ تھی، پھر کیا تھا کہ ایک طرف ساری مادی قوتیں تھیں اور دوسری طرف تنہا رسول اللہ ﷺ اپنے ساتھی ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ہمراہ تھے مگر ان دیکھے ربانی لشکران کے مددگار تھے، لٰہذا شکست، ذلت اور رسوائی کفار کا مقدر بنی، ارشاد ربانی ہے:

﴿وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِينَ كَفَرُوا السُّفْلَىٰ﴾

''اور اس نے کافروں کی بات کو پست کردیا۔''[1]

اور اللہ کی بات (توحید) اپنی جگہ برتر، غالب، قوی اور نافذ ہو کے رہی۔

اس آیت کریمہ میں رسول اللہ ﷺ اور دین اسلام کی مدد کا تذکرہ ہے اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اگر لوگ آپ کی نصرت وحمایت سے پہلوتہی اختیار کریں تو اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر کا رخ کسی دوسری قوم کی طرف بھی موڑ سکتے ہیں جو مشرکین مکہ کی طرح قبول حق میں سست اور پھسڈی نہ ہو۔''[2]

راہ ہجرت میں ام معبد کا خیمہ

غار ثور میں تین راتیں قیام کرنے کے بعد رسول اللہ ﷺ اور ابوبکر رضی اللہ عنہ غار سے نکلے تو آپ ﷺ کی تلاش کا کام ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔ مشرکین آپ تک پہنچنے میں ناکام ہوچکے تھے۔

[1] التوبة 9:40. [2] تفسير في ظلال القرآن لسيد قطب: 3/1656.

آپ ﷺ اور ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بنو دیل کے ایک آدمی عبداللہ بن اریقط کو اجرت پر راستے کی رہنمائی کے لیے تیار کیا تھا اگرچہ وہ مشرک ہی تھا لیکن اس پر اعتبار کیا اور اپنی دونوں سواریاں اس کے حوالے کر دیں تاکہ وہ انھیں تین راتوں کے بعد غار ثور تک لے آئے۔ حسب وعدہ وہ سواریاں لے کر آیا۔ وہ، آپ ﷺ اور دوسرے ہمراہیوں کو لے کر ایک غیر معروف راستے پر چلنے لگا تاکہ کفار قریش سے مڈبھیڑ نہ ہو۔[1]

اس سفر میں آپ ﷺ کا گزر ام معبد کے خیمے پر ہوا جو علاقہ بنوخزاعہ کے قریب قدید نامی جگہ میں واقع تھا۔ ام معبد حبیس بن خالد خزاعی کی بہن تھیں اور حبیس نے اس قصے کو روایت کیا ہے اور پھر اسے مختلف راویوں اور سیرت نگاروں نے نقل کیا ہے۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ قصہ مشہور ہے اور کثیر طرق سے مروی ہے جو ایک دوسرے کو تقویت دیتے ہیں۔[2]

خالد اپنے باپ حبیس بن خالد خزاعی رضی اللہ عنہ سے بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب مکہ سے بغرضِ ہجرت روانہ ہوئے تو آپ ﷺ کے ساتھ ابوبکر رضی اللہ عنہ، ان کے غلام عامر بن فہیرہ رضی اللہ عنہ اور بطور گائیڈ عبداللہ بن اریقط لیثی تھے۔ یہ سب لوگ راستے میں ام معبد کے خیمے سے گزرے۔ وہ ایک بوڑھی اور سمجھ دار خاتون تھی جو اپنے خیمے کے صحن میں دو زانو ہو کر بیٹھتی اور وہیں کھانے پینے کا انتظام کرتی۔ جب یہ تمام مسافر وہاں پہنچے تو اس سے گوشت اور کھجوروں کے بارے میں سوال کیا تاکہ اس سے خرید سکیں لیکن اس کے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ وہ مسکین اور قحط زدہ قوم سے تعلق رکھتی تھی۔

اچانک رسول اللہ ﷺ نے خیمے کے پاس ایک بکری دیکھی تو پوچھا: «مَا هٰذِهِ الشَّاةُ يَا أُمَّ مَعْبَدٍ؟» ''اے ام معبد! یہ بکری یہاں کیسے؟'' ام معبد نے جواب دیا کہ یہ کمزوری کی وجہ سے ریوڑ کے ساتھ نہ جا سکی۔ آپ ﷺ نے پوچھا: «فَهَلْ بِهَا مِنْ لَّبَنٍ؟»

[1] المستفاد من قصص القرآن لعبد الكريم زيدان: 101/2. [2] البداية والنهاية: 188/3.

مدینہ منورہ
قباء
ذات الجیش
ذوالحلیفہ
بطن رئم
منصرف
بدر
جحفہ
رابغ البحر
مشلل
قدید
خلیص
عسفان
الروضہ
سرف
حدیبیہ
مکہ مکرمہ
جبل ثور
جدہ
بحیرہ قلزم (بحر احمر)
کلومیٹر
200
150
100
50
25
0
مسجد نبوی
ہجرت نبوی
* نبی ﷺ 12 ربیع الاول مطابق 24 ستمبر 622ء بروز پیر قباء پہنچے۔
* یکم محرم 1ھ 16 جولائی 622ء کے مطابق ہے اور یہی ہجری تقویم کی ابتدا ہے۔
ہجرت کا راستہ
قافلوں کا راستہ
کعبہ اور مسجد الحرام
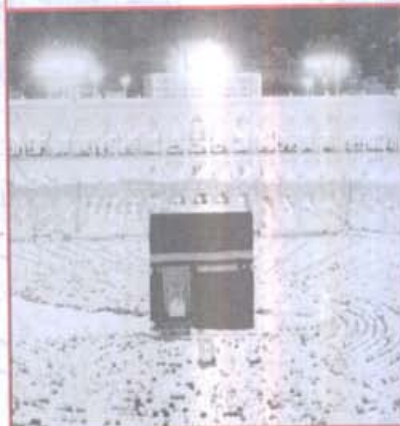
”کیا یہ دودھ دے سکتی ہے؟“

ام معبد بولیں: ”یہ بہت زیادہ لاغر ہے اور دودھ نہیں دے سکتی۔“ تب نبی ﷺ نے پوچھا: «أَتَأْذَنِينَ أَنْ أَحْلِبَهَا؟» ”کیا میں اس کا دودھ دوہ سکتا ہوں؟“

ام معبد نے کہا: ”کیوں نہیں؟ میرے ماں باپ آپ پر قربان! اگر دودھ ہے تو نکال لیجیے۔“ رسول اللہ ﷺ نے بکری قریب لانے کو کہا، پھر اللہ کا نام لے کر اس کے تھن کو ہاتھ لگایا اور برکت کی دعا فرمائی۔ بکری نے اپنی دونوں ٹانگیں پھیلا دیں، جگالی کرنے لگی اور دودھ اتار دیا۔ آپ نے ایک بڑا برتن منگوایا جو ایک جماعت کو سیر کرنے کے لیے کافی تھا۔ آپ نے اپنے ہاتھوں سے بکری کا تیز دھار کے ساتھ دودھ نکالا یہاں تک کہ برتن بھر گیا اور اوپر جھاگ نظر آنے لگا۔ آپ ﷺ نے ام معبد اور اپنے تمام ساتھیوں کو دودھ پلایا۔ جب سب اچھی طرح سیراب ہوگئے تو خود پیا، پھر دوسری مرتبہ سب نے دودھ پیا۔ آپ نے دوبارہ دودھ نکالا اور برتن بھر گیا۔ یہ برتن آپ ﷺ نے ام معبد کے پاس چھوڑا۔ بعد ازاں ام معبد سے بیعت لی اور آگے چل دیے۔

تھوڑی دیر بعد اس کا خاوند ابومعبد دوپہر کے وقت کمزور بکریوں کا ریوڑ ہانکتا ہوا آیا اور بکریاں بوڑھی اور کمزور ہونے کی وجہ سے گرا چاہتی تھیں۔ اچانک اس کی نظر دودھ پر پڑی تو بہت تعجب کیا اور پوچھا: ”ام معبد! یہ دودھ کہاں سے آیا، بکری تو کمزور تھی، دودھ والی نہ تھی اور گھر میں دودھ بھی نہ تھا!؟“

ام معبد نے کہا: ”اللہ کی قسم! ہمارے ہاں ایک بابرکت آدمی آیا تھا جس کا حلیہ اس طرح کا تھا۔“ ابومعبد نے کہا: ”میرے سامنے اس کی تمام صفات بیان کرو۔“

ام معبد کہنے لگی: ”میں نے ایک آدمی دیکھا جس کا حسن و جمال جھلک رہا تھا، چہرہ تابناک، خوش اندام، توندلے پن کا عیب نہ دبلے پن کی خامی، حسن میں ڈھلا ہوا پیکر، سرگیں آنکھیں، لمبی پلکیں، بھاری آواز، لانبی گردن، گھنی ڈاڑھی، باریک اور باہم ملے ہوئے ابرو،

خاموش ہو تو باوقار، گفتگو کرے تو گردن اٹھا کر، چہرے کی رونق فزوں تر، حسن و جمال میں سب سے بڑھ کر، دور سے دیکھنے میں سب سے تابناک اور قریب سے شیریں ترین اور حسین ترین، گفتگو میں چاشنی، بات واضح اور دوٹوک، کم گو نہ بسیار گو، گفتگو ایسی گویا لڑی سے موتی جھڑ رہے ہوں، درمیانہ قد، نہ لمبا کہ ناگوار لگے، نہ ناٹا کہ نگاہ میں نہ جچے، دو شاخوں کے درمیان ایسی شاخ کی طرح جو تینوں میں سب سے خوش منظر اور سب سے شاندار ہو، رفقاء اس کے گرد حلقہ بنائے ہوئے تھے، وہ کوئی بات کہتا تو دھیان سے سنتے، کوئی حکم دیتا تو لپک کر بجالاتے، وہ مخدوم و مطاع تھا، ترش رو تھا نہ لغو گو!''

ابو معبد نے کہا: ''اللہ کی قسم! وہ تو وہی قریشی ہے جس کے معاملے (نبوت) کا ذکر مکہ سے ہمارے پاس پہنچتا رہا ہے۔ میرا تو بہت دل چاہتا ہے کہ اس کی صحبت اختیار کروں۔ اگر مجھے موقع ملا تو ضرور یہ کام کروں گا۔'' ادھر مکہ میں ایک بلند آواز سنی گئی جس کا کہنے والا معلوم نہ ہو سکا، وہ کہہ رہا تھا:

جَزَى اللّٰهُ رَبُّ النَّاسِ خَيْرَ جَزَائِهِ　　رَفِيقَيْنِ قَالَا خَيْمَتَيْ أُمِّ مَعْبَدِ

هُمَا نَزَلَا بِالْبِرِّ ثُمَّ تَرَوَّحَا　　فَقَدْ فَازَ مَنْ أَمْسٰى رَفِيقَ مُحَمَّدِ

فَيَا لَقُصَيٍّ مَّا زَوَى اللّٰهُ عَنْكُمْ　　بِهٖ مِنْ فِعَالٍ لَّا تُجَارٰى وَ سُؤْدُدِ

لِيَهْنِ بَنِي كَعْبٍ مَّكَانَ فَتَاتِهِمْ　　وَ مَقْعَدُهَا لِلْمُؤْمِنِينَ بِمَرْصَدِ

سَلُوا أُخْتَكُمْ عَنْ شَاتِهَا وَ إِنَائِهَا　　فَإِنَّكُمْ إِنْ تَسْأَلُوا الشَّاةَ تَشْهَدِ

دَعَاهَا بِشَاةٍ حَائِلٍ فَتَحَلَّبَتْ　　عَلَيْهِ صَرِيحًا ضَرَّةُ الشَّاةِ مُزْبِدِ

فَغَادَرَهَا رَهْنًا لَّدَيْهَا لِحَالِبٍ　　يُرَدِّدُهَا فِي مَصْدَرٍ ثُمَّ مَوْرِدِ

''اللہ تعالیٰ، لوگوں کا رب ان دونوں رفیقوں کو اپنی جناب سے بہترین جزا عطا

کرے جو ام معبد کے خیمے میں بغرض آرام تشریف لائے۔‘‘

’’وہ وہاں ٹھہرے تو نیکی کو ساتھ لیے ہوئے اور شام ہوتے ہی چلے گئے اور کامیاب وہی ہوا جو محمد ﷺ کا رفیق بنا۔‘‘

’’ہائے، بنو قصی! اللہ تعالیٰ نے جو عزتیں اور سرداریاں اس پیغمبر (کے یہاں سے جانے) کی بدولت تم سے سمیٹ لی ہیں، ان کا مداوا نہیں ہو سکتا۔‘‘

’’بنو کعب کو اپنے زنان خانوں اور دیوان خانوں سے خوش ہونا چاہیے کہ وہ مومنوں کے ٹھہرنے کے مقام ہیں۔‘‘

’’اپنی بہن سے اس کی بکری اور برتن کا حال پوچھو اور اگر تم اس کی بکری سے پوچھو تو وہ بھی گواہی دے گی۔‘‘

’’انھوں نے ام معبد سے ایک غیر حاملہ بکری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اسے دوہنے کی اجازت مانگی تو بکری کے تھن دودھ سے بھر گئے اور اس نے کثرت سے دودھ دیا۔‘‘

’’انھوں نے وہ بکری ام معبد کے پاس چھوڑی تاکہ دودھ دوہنے والا بار بار اس کا دودھ دوہتا رہے۔‘‘ [1]

سراقہ بن مالک رسول اللہ ﷺ کے تعاقب میں

قریش مکہ نے مکہ کی تمام مجلسوں میں منادی کروا رکھی تھی کہ جو بھی نبی ﷺ یا ابوبکر رضی اللہ عنہ کو زندہ یا مردہ لائے گا، اسے سو اونٹ انعام دیے جائیں گے اور جب یہ خبر مکہ کے مضافات میں بدوی قبائل تک پہنچی تو سراقہ بن مالک بن جُعْشُم نے قریش کی اس پیشکش کے لالچ میں تگ و دو شروع کر دی لیکن اللہ تعالیٰ کی قدرت غالبہ نے سراقہ کی یوں کایا پلٹ دی کہ

[1] المعجم الكبير للطبراني، حديث: 3605، والأحاديث الطوال للطبراني، حديث: 30، ومجمع الزوائد:6/57,56.

وہ جو نبی ﷺ کو گرفتار یا قتل کرنے کے ارادے سے نکلا تھا، آپ ﷺ کا مطیع اور محافظ بن کر لوٹا۔

ابن شہاب کہتے ہیں کہ سراقہ کے بھتیجے عبدالرحمٰن بن مالک مدلجی بتاتے ہیں کہ سراقہ نے میرے والد گرامی سے مکمل قصہ اس طرح بیان فرمایا: ''میرے پاس کفار قریش کے منادی کرنے والے آئے اور بتایا کہ جو آپ ﷺ اور ابوبکر رضی اللہ عنہ میں سے کسی کو بھی زندہ یا فوت شدہ حالت میں لے آئے، سو اونٹ انعام کا مستحق قرار پائے گا۔ اسی دوران اس مجلس میں میری قوم بنومدلج کا ایک آدمی آیا اور کہنے لگا: ''اے سراقہ! میں نے ابھی ابھی ساحل سمندر کے ساتھ ساتھ کچھ لوگوں کو جاتے دیکھا ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ محمد اور اس کے ساتھی ہیں۔'' سراقہ نے کہا کہ میں نے اس وقت پہچان لیا تھا کہ وہ قریش کے مطلوبہ افراد ہیں لیکن میں نے کہا: ''نہیں تجھے غلط فہمی ہوئی ہے۔ وہ تو کوئی دوسرے لوگ ہیں جو ابھی ابھی ہمارے سامنے اس طرف گئے ہیں۔'' سراقہ نے کہا: ''پھر میں تھوڑی دیر بعد مجلس سے اٹھا اور گھر پہنچا اور اپنی لونڈی کو ٹیلے کے پیچھے سے گھوڑا لانے اور اسے تیار کرنے کو کہا اور خود اپنا نیزہ لیے گھر کے پچھلے راستے سے نکل گیا۔ میں نے نیزے کو سرنگوں رکھا حتی کہ اس کی انی زمین سے چھو رہی تھی، پھر میں اپنے گھوڑے پر سوار ہوا اور تیزی سے مسافت طے کرنے لگا۔ جب میں ان کے قریب پہنچا تو میرا گھوڑا پھسلا اور میں زمین پر گر گیا۔ میں اٹھا اور فال کا تیر نکالا کہ کیا میں آپ کے قافلے کو گزند پہنچا سکوں گا یا نہیں؟ تیر میرے منشا کے خلاف نکلا لیکن میں نے تیر کی نہ مانی اور دوبارہ تعاقب کرنے لگا یہاں تک کہ مجھے رسول اللہ ﷺ کی قراءت سنائی دینے لگی۔ آپ مسلسل بغیر مڑے پڑھتے جارہے تھے اور ابوبکر رضی اللہ عنہ مسلسل پیچھے دیکھ رہے تھے۔ اچانک میرے گھوڑے کے دونوں اگلے پاؤں گھٹنوں تک زمین میں دھنس گئے، میں گرا، سنبھلا اور گھوڑے کو ڈانٹا۔ بڑی مشکل سے اس نے اپنے دونوں پاؤں زمین سے نکالے۔ اس کے ساتھ ہی زمین سے دھویں

جیسا گرد وغبار بھی بلند ہوا۔ میں نے دوبارہ تیروں سے فال نکالی مگر فال میرے منشا و ارادے کے خلاف نکلی۔ میں نے بلند آواز سے قافلے والوں کو آواز دی اور امان طلب کی تو وہ ٹھہر گئے۔ اب میں گھوڑے پر سوار ہو کر ان کے پاس اس حالت میں پہنچا کہ مجھے یقین ہو چلا تھا کہ عنقریب رسول اللہ ﷺ کی دعوت کامیاب ہونے والی ہے۔ میں نے کہا: ''آپ کی قوم نے آپ کی گرفتاری پر سو اونٹ انعام مقرر کیا ہے۔'' اور پھر باقی تمام خبریں بھی کہہ سنائیں۔ میں نے اپنا زادِ راہ اور سامان آپ ﷺ کی خدمت میں پیش کیا لیکن آپ نے لینے سے انکار کر دیا۔ نبی ﷺ نے مجھ سے کچھ نہیں مانگا، صرف اتنا کہا کہ ہمیں لوگوں سے پوشیدہ رکھنے کی کوشش کرنا۔ اور پھر میں نے نامۂ امن کی درخواست کی جو آپ ﷺ کے حکم سے عامر بن فہیرہ نے چمڑے کے ٹکڑے پر لکھ کر مجھے دے دیا، بعد ازاں آپ ﷺ وہاں سے رخصت ہوئے۔''[1]

سراقہ بن مالک کے بارے میں وہ باتیں بھی مشہور ہیں جو حافظ ابن عبدالبر اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ اور دیگر نے بیان فرمائی ہیں۔[2] ابن عبدالبر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''سفیان بن عیینہ ابوموسیٰ سے اور وہ حضرت حسن سے بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے سراقہ بن مالک رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا: «كَيْفَ بِكَ إِذَا لَبِسْتَ سَوَارَيْ كِسْرٰى؟» ''اس وقت تیری کیسی حالت ہوگی جب تجھے کسریٰ کے کنگن پہنائے جائیں گے؟'' سراقہ کہتے ہیں کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس کسریٰ کے کنگن، شاہی پٹکا اور تاج لائے گئے تو انھوں نے سراقہ بن مالک رضی اللہ عنہ کو بلایا اور یہ سب کچھ انھیں پہنا دیا۔ سراقہ کی کلائیوں پر گھنے بال تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اپنے دونوں بازو بلند کرو اور پھر بلند آواز سے فرمایا: ''اللہ سب سے بڑا ہے اور شکر ہے اللہ تعالیٰ کا جس نے یہ سارا سامان کسریٰ سے چھینا جو

[1] صحيح البخاري، حديث:3906، وصحيح مسلم، حديث:(91)-2009. [2] الإصابة:35/3، والاستيعاب لابن عبد البر، رقم:916.

اپنے آپ کو لوگوں کا رب خیال کرتا تھا اور بنو مدلج کے ایک اعرابی سراقہ بن مالک کو پہنا دیا۔'' [1] پھر سراقہ کو سوار کیا گیا اور مدینہ کی گلیوں سے اس حال میں گزارا گیا کہ لوگ اس کے اردگرد تھے اور سراقہ رضی اللہ عنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بات کو بار بار اونچی آواز سے دہرا رہے تھے کہ اللہ سب سے بڑا ہے اور شکر ہے اللہ تعالیٰ کا جس نے یہ سارا سامان کسریٰ سے چھین لیا اور بنو مدلج کے ایک گنوار سراقہ بن مالک کو پہنا دیا۔ [2]

دلوں کو پھیرنے والی ذات پاکیزہ ترین ہے: سراقہ بن مالک گھر سے نبی ﷺ پر دسترس حاصل کرنے کی غرض سے روانہ ہوئے تھے تاکہ آپ ﷺ کو اہل مکہ کے حوالے کر کے سو اونٹ انعام حاصل کر سکیں لیکن تمام معاملات یکسر تبدیل ہو گئے۔ اب وہی سراقہ آپ ﷺ کے سفر کو لوگوں سے مخفی رکھنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ راستے میں جب کسی سے ملاقات ہوتی تو کہتے: ''اس راستے میں آپ کے مطلوبہ افراد نہیں۔'' اور جب سراقہ رضی اللہ عنہ مطمئن ہو گئے کہ اب رسول اللہ ﷺ مدینہ طیبہ پہنچ چکے ہوں گے تو اپنا سارا ماجرا کہہ سنایا اور یہ قصہ اتنا مشہور ہوا کہ اہل مکہ کی ہر مجلس میں اس کا تذکرہ ہونے لگا۔ سردارانِ قریش کو خوف لاحق ہو گیا کہ کہیں یہ واقعہ اہل مکہ کے اسلام قبول کرنے کا سبب نہ بن جائے کیونکہ سراقہ اپنے قبیلے کے سربراہ تھے۔ ابوجہل نے بنو مدلج کو لکھا:

''اے بنو مدلج! مجھے ڈر ہے کہ تمھارا ایک کم عقل آدمی سراقہ، تمھارے خلاف محمد (ﷺ) کی مدد کرے۔ اور تمھیں ایسا گمراہ کرے کہ تمھارا شیرازہ بکھر جائے اور تمھاری جماعت عزت و سرداری کے بعد منتشر ہو جائے۔''

سراقہ بن مالک رضی اللہ عنہ نے ابوجہل کا جواب ان الفاظ میں لکھا:

''اے ابوالحکم! تجھے لات کی قسم! جب میرے گھوڑے کے پاؤں زمین میں دھنس

[1] الروض الأنف للسهيلي: 218/4، والهجرة في القرآن الكريم لأحزمي سامعون جزولي، ص: 346. [2] السيرة النبوية لأبي شهبة: 495/1.

رہے تھے تو اسے دیکھتا، تعجب کرتا اور یقین کر لیتا کہ محمد اللہ کے رسول ہیں۔ اس پر بہت سے دلائل موجود ہیں۔ اور کوئی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔''

''تجھ پر لازم ہے کہ تو آپ ﷺ کا لوگوں سے دفاع کرے کیونکہ میں نے دیکھا ہے کہ آپ ﷺ کا معاملہ ضرور پھیلے گا۔ آپ ﷺ کے امر نبوت کو میں اس طرح پھیلتا ہوا دیکھ رہا ہوں کہ تمام لوگ اس سے صلح کرنے کے خواہاں ہیں۔''[1]

رسول اللہ ﷺ کا مدینہ میں استقبال

جب مدینہ کے مسلمانوں نے نبی ﷺ کی مکہ معظّمہ سے کوچ کی خبر سنی تو روزانہ صبح سویرے حرہ کی طرف نکل جاتے اور آپ کا انتظار کرتے اور جب دوپہر کی گرمی شدت اختیار کرتی تو مجبورًا لوٹ جاتے۔ ایک دن اسی طرح طویل انتظار کے بعد اہل مدینہ گھروں کو لوٹ گئے۔ ایک یہودی نے ایک ٹیلے پر کھڑے ہو کر نگاہ دوڑائی تو اسے نبی ﷺ اور ان کے ساتھی سفید کپڑوں میں ملبوس آتے دکھائی دیے، وہ بے اختیار چلا اٹھا: ''اے عرب والو! تمھاری وہ مقدس ہستی جس کا تم انتظار کر رہے تھے پہنچ گئی۔'' مسلمان یہ آواز سنتے ہی جلدی سے اپنے ہتھیاروں کی طرف لپکے اور حرہ (کالے پتھر والی زمین) میں رسول اللہ ﷺ کے گرد آن جمع ہوئے اور پھر سارا قافلہ دائیں طرف مڑ کر بنو عمرو بن عوف کے محلے میں پہنچ گیا۔ یہ سوموار کا دن اور ربیع الاول کا مہینہ تھا۔[2]

رسول اللہ ﷺ خاموشی سے تشریف فرما ہوئے اور ابوبکر رضی اللہ عنہ لوگوں کے سامنے کھڑے رہے۔ جن لوگوں نے ابھی تک رسول اللہ ﷺ کو نہیں دیکھا تھا وہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کو سلام کہتے اور مبارکباد پیش کرتے اور پھر جب سورج کی کرنیں آپ ﷺ پر پڑنے لگیں تو ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ پر اپنی چادر سے سایہ کیا۔ یوں سب لوگوں نے آپ ﷺ کو پہچان لیا۔

---

[1] السيرة النبوية لأبي شهبة: 494/1، وفتح الباري، شرح الحديث: 3906. [2] فتح الباري، شرح الحديث: 3906، والهجرة في القرآن الكريم لأحزمي سامعون جزولي، ص: 351.

نبی ﷺ بنو عمرو بن عوف (قباء) کے پاس دس سے اوپر کچھ راتیں قیام پذیر رہے۔ اسی اثنا میں وہاں ایک مسجد کی تعمیر کا آغاز تقوے کی بنیاد پر کیا گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے وہاں نماز بھی ادا فرمائی۔ پھر مدینہ کی جانب رخت سفر باندھا۔[1]

قباء میں چند روز ٹھہرنے کے بعد آپ ﷺ نے انصار مدینہ کو پیغام بھیجا کہ وہ مدینہ میں داخل ہونا چاہتے ہیں، چنانچہ انصار مدینہ آئے، رسول اللہ ﷺ اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کو سلام کیا اور کہنے لگے: ''آپ بلا خوف سواری پر سوار ہوں ہم آپ کے فرمانبردار ہیں۔'' جب دونوں سوار ہو گئے تو انصار کے مسلح دستے نے آپ ﷺ کو گھیرے میں لے لیا۔ اور جب رسول اللہ ﷺ مدینہ کی گلیوں میں پہنچے تو لوگ آپ ﷺ کو دیکھتے ہی کہنے لگے: ''اللہ کے نبی آ گئے۔ اللہ کے نبی آ گئے۔''[2]

یہ ایک خوشگوار اور پر رونق دن تھا۔ مدینہ کو کبھی ایسا اچھا دن میسر نہ آیا تھا۔ لوگوں نے عمدہ کپڑے پہنے جیسے عید کے دن پہنے جاتے ہیں۔ درحقیقت ان کے لیے یہ دن عید سے کم نہ تھا کہ اس دن اسلام مکہ کی تنگ فضا سے ایسے کھلے ماحول میں منتقل ہو چکا تھا کہ اب پورے مدینہ بلکہ پوری دنیا میں اسلامی پرچم لہرانا تھا۔ اہل مدینہ نے اس نعمت الٰہی کا شکریہ ادا کیا اور اس شرف کا احساس کیا جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے انھیں منتخب فرمایا تھا کیونکہ رسول اللہ ﷺ اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے ان کے شہر کو اپنا وطن بنا لیا تھا۔ یہاں سے اسلام جیسے مکمل نظام حیات کو اپنی تمام تر خوبیوں کے ساتھ پھیلنا تھا، اسی لیے اہل مدینہ خوشی اور سرور سے جھومتے، لا الٰہ الا اللہ کا ورد کرتے، آپ ﷺ کے استقبال کے لیے گھروں سے نکلے اور ان کی زبان پر ایک ہی کلمہ تھا: ''محمد ﷺ آ گئے، اللہ کے رسول آ گئے۔''[3]

---

[1] صحيح البخاري، حديث: 3906، و فتح الباري، شرح الحديث: 3906، و الهجرة في القرآن الكريم لأحزمي سامعون جزولي، ص: 351. [2] صحيح البخاري، حديث: 3911.

[3] الهجرة في القرآن الكريم لأحزمي سامعون جزولي، ص: 353.

امام مسلم رحمہ اللہ نے اپنی سند سے اس روایت کو بیان کیا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ مدینہ طیبہ میں داخل ہوئے، مرد اور عورتیں گھروں کی چھتوں پر چڑھ گئے۔ بچے اور غلام گلی کوچوں میں بکھر گئے اور یہی نعرے لگنے لگے: ''محمد ﷺ آگئے، اللہ کے رسول آگئے۔''[1]

تاریخ انسانی کے اس فقید المثال استقبال کے بعد نبی ﷺ آگے روانہ ہوئے اور ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے گھر کے قریب پڑاؤ ڈالا۔ انس رضی اللہ عنہ کی طویل حدیثِ ہجرت میں بیان کیا گیا ہے: ''آپ ﷺ آئے اور چلتے گئے حتی کہ دار ابی ایوب کے پاس پہنچ گئے۔ آپ ﷺ ان کے گھر والوں سے گفتگو فرما رہے تھے کہ عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کے بارے میں سنا، جبکہ وہ کھجوروں کے ایک باغ میں اپنے گھر والوں کے لیے ٹوکری میں کھجوریں ڈال رہے تھے۔ وہ جلدی سے وہاں پہنچے اور ٹوکری بھی ان کے پاس تھی اور اللہ کے رسول ﷺ کی باتیں سنیں، پھر اپنے گھر روانہ ہوگئے۔ اب نبی ﷺ نے پوچھا: «أَيُّ بُيُوتِ أَهْلِنَا أَقْرَبُ؟» ''یہاں ہمارے رشتہ داروں کا کون سا گھر قریب ہے؟'' ابوایوب رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ''اللہ کے رسول! میرا گھر قریب ہے۔ یہ رہا میرا گھر اور یہ اس کا دروازہ۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: «فَانْطَلِقْ فَهَيِّئْ لَنَا مَقِيلًا» ''چلیے! ہمارے لیے استراحت کا بندوبست کیجیے۔''[2]

پھر آپ ﷺ وہاں مقیم رہے یہاں تک کہ مسجد نبوی اور امہات المؤمنین کے حجروں کی تعمیر مکمل ہوگئی۔

اب رسول اللہ ﷺ کی ہجرت تو مکمل ہوچکی تھی لیکن ہجرت کے وسیع تر اغراض و مقاصد حاصل کرنے ابھی باقی تھے، جبکہ مدینہ طیبہ پہنچتے ہی آپ کو مشکلات اور نئے چیلنجوں کا سامنا کرنا تھا۔ نبی ﷺ اپنی امت کے روشن مستقبل کو سامنے رکھتے ہوئے تمام مصائب کو برداشت کرنے کا عزم کرچکے تھے کیونکہ اب ایک ایسی مملکت کا قیام معرض وجود میں آنے

[1] صحیح مسلم، حدیث: (75)-2009. [2] صحیح البخاري، حدیث: 3911.

والا تھا جہاں سے انسانیت کی شاندار ترقی کا راستہ کھلنا تھا اور اس زمانے کی طاقتور سلطنتوں فارس اور روم کو زیرنگیں کر لینے کے بعد ایمان، تقویٰ، احسان اور عدل جیسے زریں اصول کی بنیاد پر ایک مضبوط مملکت وجود میں آنے والی تھی۔[1]

دروس و عبر اور پند و نصائح

حق و باطل کی جنگ زمانۂ قدیم سے جاری ہے

یہ اللہ تعالیٰ کا نافذ العمل قانون ہے۔ فرمان الٰہی ہے:

﴿ اَلَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ۭ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ۭ وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ﴾

”وہ لوگ جنھیں ان کے گھروں سے ناحق نکال دیا گیا، صرف اس لیے کہ وہ کہتے ہیں: ہمارا رب اللہ ہے اور اگر اللہ لوگوں میں سے بعض کو بعض کے ذریعے سے دفع نہ کرتا تو بلاشبہ خانقاہیں اور گرجے اور (یہودی) عبادت خانے اور مسجدیں ڈھادی جاتیں جن میں اللہ کا نام بکثرت ذکر کیا جاتا ہے اور اللہ ضرور اس کی مدد کرے گا جو اس (کے دین) کی مدد کرے گا، بے شک اللہ یقیناً بہت قوت والا، خوب غالب ہے۔“[2]

اور اس جنگ کا نتیجہ و انجام واضح ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں آیا ہے:

﴿ كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِيْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ﴾

”اللہ نے لکھ رکھا ہے کہ میں اور میرے رسول ضرور غالب آئیں گے، بے شک اللہ

[1] الهجرة في القرآن الكريم لأحزمي سامعون جزولي، ص:355. [2] الحج 22:40.

قوی، بڑا زبردست ہے۔“ [1]

اسلامی دعوت کے مخالفین کا مکروفریب

مخالفین اسلام کا مکر چاہے قید کرنے یا قتل کرنے یا جلاوطنی کی شکل میں ہو، داعی کو چاہیے کہ وہ صرف اللہ کی طرف توجہ کرے اور کامل بھروسا اسی پر رکھے اور یقین رکھے کہ حیلہ ساز خود اپنے جال میں پھنس جاتا ہے۔ [2] اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْيَقْتُلُوْكَ اَوْيُخْرِجُوْكَ ۚ وَيَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ ۗ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ۝﴾

”اور (اے نبی! یاد کیجیے) جب وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا آپ کے بارے میں تدبیر کر رہے تھے تاکہ وہ آپ کو قید کر دیں یا آپ کو قتل کر دیں یا آپ کو (مکہ سے) نکال دیں اور وہ تدبیریں کر رہے تھے اور اللہ بھی تدبیر کر رہا تھا اور اللہ بہترین تدبیر کرنے والا ہے۔“ [3]

اہل باطل کا ایک داؤ اور مکر یہ بھی ہے کہ اسلامی دعوت اور اس کے حاملین کو ختم کرنے کے لیے کمزور طبقے کو مال کا لالچ دیتے ہیں اور اس خیال سے انھوں نے رسول اللہ ﷺ کو زندہ یا مردہ لانے پر سو اونٹ بطور انعام مقرر کیے تھے، سراقہ بن مالک اور دیگر لالچی لوگ اسی مشن پر نکلے مگر سراقہ رضی اللہ عنہ اس مادی مشن کی ناکامی کے بعد کثیر نفع اور عمدہ رزقِ ایمان لے کر لوٹے اور انھوں نے دیگر تعاقب کرنے والوں کو بھی اس کام سے باز رکھنے کا حیلہ کیا۔ اللہ تعالیٰ اس طرح اپنے اولیاء اور داعیانِ اسلام کی مدد اور حفاظت فرماتا ہے۔ [4]

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ لِيَصُدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ فَسَيُنْفِقُوْنَهَا

---

1 المجادلة 21:58. 2 الهجرة النبوية المباركة للدكتور عبدالرحمٰن البر، ص: 199. 3 الأنفال 30:8. 4 الهجرة النبوية المباركة للدكتور عبد الرحمٰن البر، ص: 200.

ثُمَّ تَكُوْنُ عَلَيْهِمْ حَسْرَةً ثُمَّ يُغْلَبُوْنَ ۬ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى جَهَنَّمَ يُحْشَرُوْنَ ۝﴾

''بے شک جن لوگوں نے کفر کیا وہ اپنے مال خرچ کرتے ہیں تاکہ وہ (لوگوں کو) اللہ کے راستے سے روکیں تو وہ ابھی (اور) مال خرچ کریں گے، پھر وہ ان کے لیے باعث حسرت ہوگا، پھر وہ مغلوب ہو جائیں گے اور جن لوگوں نے کفر کیا وہ جہنم کی طرف اکٹھے کیے جائیں گے۔'' [1]

ٹھوس منصوبہ بندی اور اسباب اختیار کرنا

ہجرت مدینہ کے سفر پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں کس قدر ٹھوس منصوبہ بندی کی گئی اور کس طرح شروع سے لے کر آخر تک تمام ممکنہ اسباب و ذرائع اختیار کیے گئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام امور بذریعہ وحی طے پائے تھے۔ مختلف ذرائع اختیار کرنا سنتِ نبوی اور حکم الٰہی ہے اور جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ نہ تو یہ سنت ہے اور نہ اس کی ضرورت ہے، وہ غلطی پر ہیں اور اپنے آپ اور مسلمانوں کے گنہگار ہیں۔ [2]

جب ہجرت کا وقت قریب آ گیا تو رسول اللہ ﷺ نے پروگرام کے مطابق سفر کی ابتدا فرمائی۔ اس حوالے سے درج ذیل نکات ہمارے سامنے ہیں:

ایک ٹھوس پروگرام کی تشکیل جس میں باوجود مصائب اور رکاوٹوں کے آپ ﷺ کامیابی سے ہمکنار ہوئے کیونکہ اس پروگرام کا ہر جز مکمل سمجھداری سے ترتیب دیا گیا تھا، مثلاً:

❁ اللہ کے رسول ﷺ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے گھر دوپہر کے وقت تشریف لائے، جبکہ عموماً آپ اس وقت نہیں آیا کرتے تھے اور نہ اس وقت کوئی گھر سے نکلتا تھا۔ اس کا مقصد مکمل راز داری کا اہتمام تھا۔

[1] الأنفال 8:36. [2] الأساس في السنة لسعيد حوّى:357/1.

* آپ ﷺ اپنے گھر سے ابوبکر رضی اللہ عنہ کے گھر تک آتے ہوئے سر اور چہرے پر کپڑا لپیٹے ہوئے تھے۔ اس طرح آدمی کا چہرہ قدرے انجان بن جاتا ہے۔ [1]
* رسول اللہ ﷺ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ سب کو باہر نکال دو۔ اس کے باوجود آپ ﷺ نے صرف ہجرت کے بارے میں بات کی، مقام ہجرت کی نشاندہی نہ فرمائی۔
* رات کو اور پھر پچھلے دروازے سے نکلنا بھی رازداری کی غرض سے تھا۔
* سفر میں غیر معروف راستہ اختیار کرنا بھی احتیاطی تدابیر کا حصہ تھا۔ اس سلسلے میں آپ ﷺ نے ایک مشرک مگر صحرائی و جنگلی راستوں کے ماہر سے مدد لی۔ معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص بھی صاحب خلق اور سنجیدہ ہو تو اس سے مدد لی جا سکتی ہے کیونکہ نبی ﷺ معلومات حاصل کر لیا کرتے تھے، خواہ وہ کسی سے بھی حاصل ہوں۔
* صاحب فراست شخصیات کا انتخاب کیا گیا تا کہ امور ہجرت میں مکمل تعاون حاصل رہے۔ اور قابل غور بات یہ ہے کہ یہ تمام افراد آپس میں بہت قربت رکھتے تھے اور ایک ہی مہم سے وابستہ تھے۔ اس طرح ایک بڑے مقصد کو پانے کے لیے وہ ایک ایسی جماعت تھی جس کے ارکان کو ایک دوسرے کا مکمل تعاون حاصل تھا۔
* ہر فرد کو اس کے حسب حال کام پر متعین کیا گیا تا کہ وہ بہتر طریقے سے اسے اور اس کے ذیلی امور انجام دے سکے۔
* حضرت علی رضی اللہ عنہ کا رسول اللہ ﷺ کے بستر پر سونا بھی ایک کامیاب سکیم تھی جس سے قریشی مکمل طور پر دھوکا کھا گئے اور رسول اللہ ﷺ رات کے اندھیرے میں وہاں سے روانہ ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی حفاظت فرمائی اور کفار خواب غفلت میں رہے اور ان کی آنکھیں آپ ﷺ کے بستر پر لگی رہیں۔ وہ اس خیال میں رہے کہ آپ ﷺ اس طرح چادر اوڑھے آخر کتنی دیر سوئے رہیں گے، حالانکہ سونے والے تو علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ تھے۔

[1] السيرة النبوية للدكتور إبراهيم العلي، ص:141.

❁ عبد اللہ بن ابی بکر رضی اللہ عنہما دشمن کے منصوبوں اور ان کی نقل وحرکت کی ٹھیک ٹھیک خبریں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچاتے رہے۔

❁ اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما ذات النطاقین مکہ سے راشن غار ثور میں پہنچاتی تھیں، حالانکہ مشرکین دیوانہ وار آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تلاش کر رہے تھے تاکہ آپ کو قتل کر سکیں۔

❁ عامر بن فہیرہ رضی اللہ عنہ ایک خوش مزاج چرواہے تھے۔ وہ دودھ اور گوشت غار تک پہنچاتے اور آنے والوں کے قدموں کے نشانات پر بکریاں ہانکتے ہوئے واپس لے جاتے تاکہ قریشی غار تک نہ پہنچ سکیں۔ یہ چرواہا گویا ایک طرف کھانے پینے کا سامان اور دیگر امداد پہنچاتا اور دوسری طرف انھیں لوگوں کی نظروں سے بچانے کا اہتمام بھی کرتا۔

❁ عبد اللہ بن اریقط ہجرت کے سفر کا امانتدار راہبر اور صحرائی راستوں کو جاننے والا تھا۔ وہ اس انتظار میں رہا کہ جیسے ہی اسے اشارہ ملے وہ حاضر دماغی سے کام لیتے ہوئے سواریاں لے کر غار کے دہانے تک پہنچ جائے تاکہ سفر کا آغاز ہو سکے۔

یہ وہ تدابیر تھیں جنھیں بروقت، عمدگی اور دانائی سے اور حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے اختیار کیا گیا تھا۔ ہر شخص سے مناسب کام لیا گیا، تمام رخنوں کو بند کیا گیا، سفر کی تمام ضروریات کسی زیادتی اور اسراف کے بغیر ٹھیک ٹھیک پوری کی گئیں اور صرف ضروری افراد کو ساتھ رکھا گیا۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی استطاعت کے مطابق ٹھوس منصوبہ بندی سے تمام معقول اسباب و ذرائع اختیار فرمائے اور یوں متوقع طور پر اللہ تعالیٰ کی عنایت کاملہ حاصل رہی۔[1]

اسباب و ذرائع اختیار کرنا لازم ہے

بے شک حصول مقصد کے لیے مختلف ذرائع اور اسباب اختیار کرنا لازمی ہے لیکن اس کا

1 أضواء علی الهجرة لتوفيق محمد سبع، ص: 393-397.

مطلب یہ نہیں کہ ہمیشہ اسباب ہی نتیجہ خیز ثابت ہوتے ہیں، اس لیے کہ نتائج تو اللہ تعالیٰ کی مشیّت وارادے سے منسلک ہیں، لہٰذا اللہ تعالیٰ پر بھروسا کرنا بہت ضروری ہے بلکہ یہ تو اختیارِ اسباب کی تکمیل ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے تمام ممکنہ اسباب و وسائل اختیار کیے لیکن ہمیشہ دعا گو رہے کہ اللہ ذوالجلال والاکرام اپنی مدد سے آپ کو کامیاب فرمائے۔ ایسے ہی مرحلے میں دعائیں قبول ہوتی ہیں، چنانچہ یہ مقبول دعا ہی کا نتیجہ تھا کہ قریش غار کے دہانے پر پہنچ کر واپس آگئے اور سراقہ کا گھوڑا زمین میں دھنس گیا اور ہجرت کی ساری اسکیم مکمل کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔[1]

طبعی معجزات پر ایمان

سفرِ ہجرت میں بہت سے طبعی معجزات پیش آئے جو منجانب اللہ آپ ﷺ کی حفاظت و نصرت کا بین ثبوت ہیں جیسے مکڑی کا غارِ ثور کے دہانے پر جالا بُننا، ام معبد کے خیمے میں بکری کے تھنوں میں دودھ اترنا اور سراقہ بن مالک رضی اللہ عنہ کے ساتھ پیش آمدہ واقعہ اور انھیں کسریٰ کے کنگن پہننے کی بشارت دینا وغیرہ۔

داعیوں کو چاہیے کہ بجائے ان معجزات سے پہلو تہی اختیار کرنے کے انھیں بیان کریں کیونکہ یہ تمام سنت نبویہ سے ثابت شدہ ہیں اور بیان کرنے کا مقصد یہ ہو کہ لوگ ان خرقِ عادت امور کو جان سکیں کیونکہ یہ رسول اللہ ﷺ کی نبوت و رسالت پر مضبوط دلائل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

قابل اعتماد غیر مسلم سے مدد لینے کا جواز

اگر کوئی قابل اعتماد آدمی میسر ہو تو میدان دعوت میں اس سے مدد لینے میں کوئی حرج نہیں اگرچہ وہ غیر مسلم ہی کیوں نہ ہو کیونکہ آپ ﷺ اور ابوبکر رضی اللہ عنہ نے راستے کی رہنمائی

[1] من معين السيرة لصالح الشامي، ص: 148.

کے لیے اجرت پر مشرک کی خدمات حاصل کی تھیں۔ ان دونوں نے اپنی سواریاں اسے دے کر انھیں غار ثور پر لانے کا وعدہ لیا۔ معاملہ بہت نازک تھا، تاہم نبی ﷺ اور ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس پر اعتماد کیا تھا، لہٰذا داعیانِ اسلام کسی بھی ایسے کافر اور مشرک سے تعاون لے سکتے ہیں اگرچہ بظاہر اس کا اہل ایمان سے کوئی تعلق نہ بھی ہو کیونکہ بعض اوقات آپس میں رشتے داری، پرانی جان پہچان یا پڑوسی کا رشتہ بھی ہوسکتا ہے یا پھر وہ شخص داعی کا احسان مند یا امانت دار اور نیک طینت ہو۔ یہ مسئلہ اجتہادی ہے اور داعی کی سمجھ بوجھ اور اس آدمی سے جان پہچان پر منحصر ہے جس سے مدد حاصل کرنی ہو۔[1]

ہجرت مدینہ میں عورت کا کردار

آسمان ہجرت پر بہت سے نام ستاروں کی طرح چمکتے نظر آتے ہیں جنھیں اس سلسلے میں نمایاں فضیلت حاصل ہوئی۔ ان میں ایک نام حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا ہے جنھوں نے یہ مکمل قصہ ہجرت ہم تک پہنچایا۔ ام سلمہ رضی اللہ عنہا انتہائی صابرہ خاتون تھیں، انھوں نے مشکل حالات میں ہجرت کی۔ اور اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا ذات النطاقین جنھوں نے پانی اور غذا کی شکل میں زاد راہ غار ثور میں پہنچایا۔ اس سلسلے میں وہ اپنی استقامت اور ستم سہنے کا تذکرہ یوں بیان فرماتی ہیں: ''جب رسول اللہ ﷺ اور ابوبکر رضی اللہ عنہ سفر ہجرت کے لیے روانہ ہوئے تو میرے پاس قریش کا ایک گروہ آیا جن میں ابوجہل بھی تھا۔ وہ ہمارے دروازے پر آن کھڑا ہوا۔ میں باہر نکلی تو بولا: ''اے ابوبکر کی بیٹی! تیرا باپ کہاں ہے؟'' میں نے کہا: ''اللہ کی قسم! مجھے معلوم نہیں کہ میرا باپ کہاں ہے؟'' تو اس پر ابوجہل نے، جو بے حیا اور گندا آدمی تھا، میرے چہرے پر اتنے زور سے تھپڑ مارا کہ میرے کان کی بالی نیچے گر گئی، پھر وہ سب واپس چلے گئے۔''[2]

---

1 المستفاد من قصص القرآن لعبد الكريم زيدان: 108/2. 2 السيرة النبوية لابن هشام: 132,131/2، و تاريخ الطبري: 380,379/2.

حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کے اس قصے سے قیامت تک آنے والی مسلمان عورتوں کو یہ سبق ملتا ہے کہ دشمنوں سے مسلمانوں کے راز کس طرح چھپائے جائیں اور وہ ظلم وزیادتی کے سامنے مضبوط چٹان کی طرح کیسے ٹھہر سکتی ہیں۔

اور دوسرا سبق واقعے کے اس حصے سے حاصل ہوتا ہے جب ابو قحافہ جو نابینا تھے، گھر آئے اور کہا کہ اللہ کی قسم! میرا خیال ہے کہ ابوبکر سارا مال لے گیا اور تمھیں مشکل میں چھوڑ گیا ہے تو حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا کہنے لگیں: ''ہرگز نہیں، اے ابا جان! آپ اپنا ہاتھ اس مال پر رکھیے۔'' فرماتی ہیں: ''ابو قحافہ نے اپنا ہاتھ ایک ڈھیر پر رکھا اور بولا کہ ٹھیک ہے اگر وہ کچھ مال چھوڑ گیا ہے تو بہتر ہے تمھارے کام آئے گا۔'' کہتی ہیں: ''اللہ کی قسم! ہمارے لیے وہاں کچھ نہ تھا۔ میں تو صرف اپنے بزرگوار دادا کو مطمئن کرنا چاہتی تھی۔''[1]

حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے انتہائی سمجھداری سے معاملے پر پردہ ڈالا اور ایک عمر رسیدہ شخص کو بغیر کذب بیانی کے اطمینان دلایا، حالانکہ وہ ڈھیر تو صرف چند پتھروں کا تھا جو وہاں پڑے تھے۔ درحقیقت جو قیمتی چیز ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان کے لیے چھوڑی وہ تھا ایسا مضبوط ایمان جسے نہ تو پہاڑ اور تند ہوائیں ہلا سکتی تھیں نہ مال کی قلت و کثرت سے اس میں کوئی فرق آسکتا تھا۔ یہ تو ایک ایسی پختگی تھی جس کا کوئی کنارہ نہ تھا اور ایسی ہمت تھی جس کے ذریعے پستیوں سے نکل کر بلندیوں کی طرف گامزن ہوا جاسکتا تھا۔ گویا کہ تاریخ میں ایسی مثال قائم ہوئی جس کا دوبارہ پایا جانا مشکل یا ناممکن نظر آتا ہے۔ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے عالمِ اسلام کی تمام عورتوں کے لیے ایسی مثال پیش کی اور ایسا اسوہ قائم کردکھایا جس کی پیروی ازحد ضروری ہے۔

بہر حال حضرت اسماء رضی اللہ عنہا اپنی بہنوں کے ساتھ مکہ اقامت پذیر رہیں، کسی تنگی کا شکوہ کیا نہ کسی حاجت کا اظہار کیا یہاں تک کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ اور اپنے غلام

1 السيرة النبوية لابن هشام: 102/2.

ابورافع کو دو سواریاں اور پانچ سو درہم دے کر مکہ روانہ کیا تاکہ وہ آپ ﷺ کی بیٹیوں فاطمہ رضی اللہ عنہا، ام کلثوم رضی اللہ عنہا، ام المؤمنین سودہ بنت زمعہ رضی اللہ عنہا، اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما اور ان کی ماں برکہ (ام ایمن رضی اللہ عنہا) کو لے آئیں اور پھر عبد اللہ بن ابوبکر بھی ابوبکر رضی اللہ عنہ کے اہل کو لے کر ساتھ ہولیے جن میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور اسماء رضی اللہ عنہا تھیں اور یہ قافلہ بحفاظت مدینہ پہنچا اور حارثہ بن نعمان رضی اللہ عنہ کے گھر رہائش پذیر ہوا۔[1]

نبی ﷺ کے پاس مشرکوں کی امانتیں

قریشی نبی ﷺ کے سخت مخالف تھے اور آپ ﷺ کے قتل کے درپے تھے اس کے باوجود امانتیں آپ ﷺ کے پاس رکھتے تھے اور یہ ان کی زندگی کا بڑا عجیب تضاد تھا کہ وہ جس آدمی کی توہین کرنے کی کوشش کرتے تھے اور اسے یہ کہہ کر جھٹلاتے کہ وہ جادوگر، دیوانہ یا نبوت کے معاملے میں جھوٹا ہے، اپنی امانتیں اسی کے پاس رکھتے تھے۔ انھیں اپنے گردو پیش نبی ﷺ کے علاوہ کوئی صاحب امانت یا سچا آدمی دکھائی نہ دیتا تھا جس کے پاس وہ اپنی امانتیں رکھیں اور ان کے اموال محفوظ رہ سکیں۔ معلوم ہوا کہ ان لوگوں کے کفر کا سبب آپ ﷺ کی صداقت و امانت میں شک نہ تھا بلکہ وہ حق کے خلاف غرور و تکبر میں مبتلا تھے اور انھیں خطرہ تھا کہ کہیں سرداری ان کے ہاتھ سے نہ چلی جائے۔[2] ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَيَحْزُنُكَ الَّذِيْ يَقُوْلُوْنَ فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ۝﴾

”(اے نبی!) تحقیق ہم جانتے ہیں کہ بے شک آپ کو وہ بات غمگین کرتی ہے جو وہ کہتے ہیں، پس بے شک وہ آپ کو نہیں جھٹلاتے بلکہ دراصل یہ ظالم تو اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں۔“[3]

1 الهجرة النبوية المباركة للدكتور عبد الرحمٰن البر، ص: 128. 2 فقه السيرة للبوطي، ص: 193.
3 الأنعام 6:33.

اگرچہ حالات انتہائی مشکل تھے لیکن ہجرتِ مدینہ کی اسکیم کو ہر ممکن طور پر پایۂ تکمیل تک پہنچانا ضروری تھا، لہٰذا آپ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ وہ اہل مکہ کی امانتیں لوٹا کر آئیں۔ گویا جن کٹھن حالات میں انسان کو اپنے آپ کا ہوش نہیں ہوتا، ان حالات میں بھی رسول اللہ ﷺ کو لوگوں کی امانتیں واپس کرنے کی فکر دامن گیر تھی۔[1]

سواری قیمتاً خریدنا

نبی ﷺ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کی سواری پر سوار ہونے سے انکار فرمایا جب تک کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ سے اس کی قیمت طے نہ کر لی اور پھر جو قیمت طے پائی وہ آپ ﷺ کے ذمے رہی۔ یہ ایک واضح سبق ہے کہ حاملین دعوت کو کسی وقت بھی اللہ کے سوا کسی کا محتاج ہونا چاہیے نہ کسی پر بوجھ بننا چاہیے۔ وہ تو خود لوگوں کے لیے منبع خیر ہیں۔ اگر وہ کسی پر خرچ کرنے کی حالت میں نہ بھی ہوں تو کم از کم انھیں کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلانا چاہیے۔ آپ ﷺ نے بھی سواری بلاقیمت لینا گوارا نہ کی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے اس سلوک کو اس طرح بیان فرمایا ہے:

﴿وَمَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝﴾

''اور میں تم سے اس (تبلیغ) پر کوئی اجر نہیں مانگتا، میرا اجر تو رب العالمین ہی کے ذمے ہے۔''[2]

ایک سچے عقیدے اور ایمان کے حاملین کے لائق نہیں کہ اللہ کے سوا کسی کے سامنے دست سوال دراز کریں کیونکہ یہ ان کی دعوت کے منافی ہے۔ لوگ داعیوں کے وعظ سے زیادہ ان کے کردار پر نظر رکھتے ہیں اور آج اہل اسلام کی پستی و ذلت اسی وجہ سے ہے کہ اسلامی دعوت کا واسطہ بننے والے اور حاملین دعوت مادیت پر انحصار کرنے لگے ہیں۔ ہر

[1] الهجرة في القرآن الكريم لأحزمي سامعون جزولي، ص:364. [2] الشعرآء109:26.

کوئی جاہ و مرتبے کے حصول میں سرگرداں ہے اور ان کے ہر عمل پر مادی رنگ چڑھ چکا ہے جس سے روحانیت اور باطنی زندگی کی روشنی ختم ہوتی نظر آتی ہے۔ مسلمان امر بالمعروف اور امامت و خطابت کے میدان میں صرف تنخواہ دار ہی نظر آنے لگے ہیں اور منبر و محراب سے اٹھنے والی آواز جو اللہ کے خوف اور رضائے الٰہی کی حامل ہوا کرتی تھی اس کا مقصد صرف چند ٹکوں کا حصول رہ گیا ہے اور جیسے ہی یہ سکے ختم ہوتے ہیں آواز بھی بند ہو جاتی ہے، اس لیے کہا جاتا ہے: «لَيْسَتِ النَّائِحَةُ كَالثَّكْلٰى» ''نوحہ کرنے والی عورت اس عورت کی طرح نہیں ہو سکتی جس کا بچہ گم ہوا ہو۔''

یہی وجہ ہے کہ وعظ کی تاثیر کم ہوگئی اور لوگ سیدھے راستے سے ہٹنے لگے۔[1]

لوگوں کے مال سے احتراز

جب رسول اللہ ﷺ نے سراقہ بن مالک کو معاف فرما دیا تو سراقہ رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کو تعاون کی پیشکش کرتے ہوئے کہا: ''یہ میرا ترکش ہے آپ (بطورِ علامت) جتنے چاہیں تیر لے لیجیے اور میرے اونٹ اور بکریاں فلاں جگہ پر آپ کو ملیں گے، اپنی ضرورت کے مطابق اُن میں سے لے لینا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: «لَا حَاجَةَ لِي فِيهَا» ''مجھے ان کی ضرورت نہیں۔''[2]

جب داعیان اسلام لوگوں کے مال سے کنارہ کش رہتے ہیں تو لوگ ان سے محبت کرتے ہیں لیکن جب داعیوں کی نظر ان کے اموال پر ہوتی ہے تو لوگ ان سے نفرت کرتے ہیں اور یہ ان کے لیے ایک عظیم ترین سبق ہے۔[3]

اعلیٰ ترین مردانگی اور خوشی کے آنسو

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ میں تربیت نبوی کا اثر واضح دکھائی دیتا ہے۔

[1] من معين السيرة لصالح الشامي، ص: 149,148. [2] صحيح مسلم، حديث: 2009، بعد الحديث: 3014، ومسند أحمد: 3/1. [3] الهجرة النبوية لأبي فارس، ص: 58.

ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ہجرت مدینہ کا ارادہ کیا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا تھا: «لَا تَعْجَلْ لَعَلَّ اللّٰهَ يَجْعَلُ لَكَ صَاحِبًا» ''تو جلدی نہ کر شاید کہ اللہ تجھے کوئی ہمسفر عطا فرمادے۔''[1] اسی دن سے ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ہجرت کی تیاری اور مکمل منصوبہ بندی شروع کر دی تھی۔ انھوں نے دو سواریاں خریدیں اور گھر ہی میں چارہ ڈال کر انھیں سفر کے لیے تیار کرنا شروع کر دیا تھا۔ صحیح بخاری کی روایت میں ہے: ''ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنی دونوں سواریوں کو چار ماہ تک ببول کے پتے کھلائے۔''[2]

ابوبکر رضی اللہ عنہ اپنی روشن بصیرت سے سمجھ گئے تھے کہ ہجرت کا وقت مشکل بھی ہوگا اور اچانک آئے گا، لہٰذا انھوں نے ہجرت کا وسیلہ اور زادِ راہ تیار کر رکھا تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس خدمت میں اپنے سارے گھرانے کو مصروف کر رکھا تھا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہجرت کا حکم ملنے کی خبر سنائی تو خوشی کی شدت سے ابوبکر رضی اللہ عنہ کے آنسو بہہ پڑے۔

اس بارے میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ اس دن سے پہلے مجھے احساس تک نہ تھا کہ کوئی خوشی کے آنسو بھی روسکتا ہے یہاں تک کہ میں نے اپنے والد محترم ابوبکر رضی اللہ عنہ کو خوشی کی بنا پر روتے ہوئے دیکھ لیا۔[3]

یہ انسانی خوشی کی انتہا ہے کہ خوشی آنسوؤں میں تبدیل ہوجائے۔ ایک شاعر نے کہا ہے:

وَرَدَ الْكِتَابُ مِنَ الْحَبِيبِ بِأَنَّهُ ۔۔۔ سَيَزُورُنِي فَاسْتَعْبَرَتْ أَجْفَانِي

غَلَبَ السُّرُورُ عَلَيَّ حَتّٰى إِنَّنِي ۔۔۔ مِنْ فَرْطِ مَا قَدْ سَرَّنِي أَبْكَانِي

يَا عَيْنُ صَارَ الدَّمْعُ عِنْدَكِ عَادَةً ۔۔۔ تَبْكِينَ مِنْ فَرَحٍ وَّمِنْ أَحْزَانِ

''مجھے اپنے پیارے دوست کی طرف سے خط ملا کہ وہ میری ملاقات کے لیے آئے

[1] الروض الأنف للسهيلي: 306/2. [2] صحيح البخاري، حديث: 3905. [3] السيرة النبوية لابن كثير: 234,233/2.

گا تو میری پلکیں بھیگ گئیں۔"

"مجھ پر خوشی غالب آگئی یہاں تک کہ مجھے پہنچنے والی انتہائی خوشی نے رلا دیا۔"

"اے آنکھ! آنسو بہانا تو تیری عادت بن گئی ہے۔ خوشی ہو یا غم تو نے رونے کو شعار بنالیا ہے۔"

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ جانتے تھے کہ سفر کی رفاقت کا مطلب یہ ہے کہ وہ بطور رفیق اکیلے کم از کم دس دن سے زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہیں گے اور اپنی جان اپنے آقا، قائد اور محبوب پر نچھاور کریں گے۔[1]

ابوبکر رضی اللہ عنہ کی محبت کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ غار ثور میں مشرکین کی طرف سے دیکھ لیے جانے کے امکان پر کتنے گھبرا رہے تھے اور ابوبکر رضی اللہ عنہ نے گویا کہ اسلامی دعوت کے ایک سچے مجاہد کا کردار پیش کیا کہ جب اس کا قائد اس کے ساتھ ہو، ہر طرف سے خطرات نے گھیرا ہوا ہو، جان خطرے میں ہو تو اس مجاہد کا کیا کردار ہونا چاہیے، حالانکہ اس وقت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی جان کو بھی سخت خطرہ تھا کہ اگر مشرکین نے انھیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دیکھ لیا تو انھیں مار دیا جائے گا لیکن وہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کے مستقبل کے بارے میں پریشان تھے کہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم مشرکین کے ہاتھ لگ گئے تو مشکلات کھڑی ہوسکتی تھیں۔ اگر ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اپنی جان کی فکر ہوتی تو آپ کی مصاحبت اختیار ہی نہ کرتے۔[2]

ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ہجرت کے سفر میں کمال احتیاطی تدابیر اختیار کی تھیں جیسے ابوبکر رضی اللہ عنہ سے

---

1 التربية القيادية للدكتور الغضبان: 2/192,191. 2 السيرة النبوية للدكتور مصطفى السباعي، ص: 71. حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اپنی جان کی فکر نہیں تھی بلکہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے فکر مند تھے۔ اس بات کی دلیل وہ واقعہ ہے جو راہ ہجرت میں پیش آیا۔ جب سراقہ بن مالک دو یا تین نیزوں کی دوری پر آگیا تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ گھبرا گئے اور انھیں رونا آگیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: «لِمَ تَبْكِي؟» "کیوں روتے ہو؟" تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کی: "اے اللہ کے رسول! میں اپنی جان کی فکر میں نہیں رو رہا، میں تو آپ کے لیے رو رہا ہوں (کہ کہیں دشمن آپ کو نقصان نہ پہنچا دے۔") (مسند أحمد: 3/1)

سائل نے پوچھا تھا کہ یہ تمھارے آگے کون ہیں؟ تو ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا تھا: ''یہ آدمی مجھے راستہ دکھاتا ہے۔'' سائل نے یہی سمجھا کہ کوئی سفری رہنما ہے لیکن صدیق رضی اللہ عنہ کا مقصد تو راہ خیر کا راہنما تھا۔[1]

یوں ابوبکر رضی اللہ عنہ نے پیش آمدہ مسائل کو بہتر انداز سے حل فرمایا اور اس میں انھوں نے خلاف حقیقت بات نہیں کی۔[2] سائل کا جواب دینے میں تو یہ (ذو معنی) اشارہ بھی تھا اور اس تربیت کا اثر بھی جو انھوں نے حصول تحفظ کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کی تھی کیونکہ ہجرت کا معاملہ مکمل طور پر پوشیدہ تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جواب پر انکار بھی نہیں فرمایا جو آپ کی رضامندی کی دلیل تھی۔[3]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا کردار بھی ایک مخلص اور سچے مجاہد کا کردار تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے اس کردار میں اپنے قائد پر فدا ہوتے نظر آتے ہیں کیونکہ اگر قائد سلامت ہے تو دعوت بھی محفوظ ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ہجرت کی رات آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بستر پر گزاری اور عین ممکن تھا کہ قریشی نوجوانوں کی تلواریں ان کی گردن تک پہنچ جاتیں لیکن انھوں نے کوئی پروا نہ کی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو صرف یہی فکر دامن گیر تھی کہ اسلامی دعوت کے قائد اور امت کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم محفوظ رہیں۔[4]

روحانی قیادت اور لوگوں کے ساتھ برتاؤ

دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طرح ابوبکر رضی اللہ عنہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حد درجہ محبت رکھتے تھے جس کا اظہار سفر ہجرت میں سامنے آیا۔ یہ ایک دلی محبت تھی جس کی بنیاد اخلاص پر تھی۔ اس میں کوئی نفاق تھا نہ اس کی بنیاد کسی دنیاوی مصلحت، لالچ یا ڈر پر تھی۔ اور اس

[1] صحيح البخاري، حديث: 3911. [2] الهجرة النبوية المباركة للدكتور عبد الرحمٰن البر، ص: 204. [3] السيرة النبوية لأبي فارس، ص: 254. [4] السيرة النبوية للدكتور مصطفى السباعي، ص: 68.

سچی عقیدت کی اصل وجہ نبی ﷺ کی عمدہ قائدانہ صلاحیت تھی۔ آپ ﷺ نے خود جاگ کر لوگوں کو آرام فراہم کیا، خود محنت کی اور لوگوں کو آسانی دی، خود بھوکے رہے لوگوں کو کھانا کھلایا، ان کی خوشیوں کو اپنی خوشی سمجھا اور ان کے غم کو اپنا غم سمجھا، لہٰذا جو بھی شخص باہمی رویوں میں رسول اللہ ﷺ کی سنتوں پر عمل پیرا ہوگا، اپنے رفقاء کے غم کو اپنا غم سمجھے گا اور اپنی خوشی عامۃ الناس کے ساتھ مشترکہ رکھے گا، اپنی معاشرتی اور نجی زندگی میں لوگوں کے دکھ اور خوشیوں میں شریک ہوگا۔ اور یہ سب صرف اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لیے کرے گا تو ایسا شخص لیڈر ہو یا سردار یا امت کا کوئی اور ذمہ دار، اسے لوگوں کی محبت سے وافر حصہ نصیب ہوگا۔[1]

لیبیا کے ایک شاعر احمد رفیق مہدوی نے اس بات کو یوں بیان کیا ہے:

فَإِذَا أَحَبَّ اللّٰهُ بَاطِنَ عَبْدِهِ ظَهَرَتْ عَلَيْهِ مَوَاهِبُ الْفَتَّاحِ

وَ إِذَا صَفَتْ لِلّٰهِ نِيَّةُ مُصْلِحٍ مَّالَ الْعِبَادُ عَلَيْهِ بِالْأَرْوَاحِ

”جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے محبت فرماتا ہے تو اس پر کامیابیوں کے دروازے کھل جاتے ہیں۔“

”اور جب کسی مصلح کی نیت خالص ہو تو لوگ دلی طور پر اس کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں۔“[2]

درست قیادت وہی ہوسکتی ہے جو سب سے پہلے روحانی رہنمائی پر توجہ اور لوگوں کی روحانی تربیت کا اہتمام کرے۔ جتنی اچھی قیادت ہوگی اس کے پیروکار بھی اتنے ہی فدائی ہوں گے اور قیادت جس قدر جذبۂ ایثار سے سرشار ہوگی اسی قدر متبعین میں محبت کا جذبہ ہوگا۔ رسول اللہ ﷺ اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کے لیے انتہائی رحیم اور مشفق تھے۔ آپ ﷺ نے اس وقت ہجرت فرمائی جب صحابہ رضی اللہ عنہم کی اکثریت ہجرت کر چکی تھی اور مکہ میں صرف کمزور،

---

[1] الهجرة النبوية لأبي فارس، ص: 54. [2] الحركة السنوسية في ليبيا للصلابي: 2/7.

آزمائش میں مبتلا اور ہجرت کے متعلق خاص ذمہ داری کے حامل افراد ہی رہ گئے تھے۔

سفر ہجرت میں بریدہ اسلمی رضی اللہ عنہ کا قبولِ اسلام

بلاشبہ ایسا مسلمان جس کے دل میں اسلام پوری طرح داخل ہو چکا ہو، وہ لوگوں کو اسلامی دعوت پیش کرنے میں ذرہ بھر کوتاہی نہیں کرتا۔ حالات چاہے کتنے ہی ناسازگار اور پریشان کن ہوں اور امن مفقود ہو، پھر بھی ایک سچا مسلمان اسلامی دعوت پیش کرنے کے بہانے تلاش کر ہی لیتا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام جنھیں جیل کی کوٹھڑیوں میں ڈال دیا گیا لیکن اس اندھیر نگری میں بھی وہ اپنی ذمہ داری کو نہیں بھولے۔ وہاں بھی اپنے ساتھ قید دیگر افراد کے سامنے دعوت توحید پیش کرتے رہے اور شرک، غیر اللہ سے بیزاری اور کسی بھی مخلوق کے سامنے جھکنے سے روکتے رہے۔[1]

سورۂ یوسف مکہ میں نازل ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ وہ دعوتی میدان میں سابقہ انبیائے کرام علیہم السلام کی پیروی کریں، اسی لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کے دوران بھی اپنی ذمہ داری کا احساس کرتے رہے، حالانکہ حالات اتنے دگرگوں تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ سے نکال دیا گیا، آپ کا خون رائیگاں قرار دے دیا گیا اور جرائم پیشہ لوگوں کو خطیر انعامات کا لالچ دیا گیا کہ آپ کو زندہ یا مردہ پیش کریں (نعوذ باللہ)۔ راستے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک شخص بریدہ بن حصیب اسلمی ملا جو اپنی قوم کے ساتھ ایک قافلے میں تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں اسلام کی دعوت پیش کی تو وہ تمام لوگ مسلمان ہو گئے۔[2]

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سفر ہجرت میں بریدہ بن حصیب بن عبداللہ بن حارث اسلمی سے ملے اور انھیں اسلام قبول کرنے کی دعوت دی۔ وہ مسلمان

[1] دیکھیے یوسف 12:37-40. [2] الهجرة النبوية لأبي فارس، ص: 59، وشرح المواهب للزرقاني:1/405.

ہوئے اور انھوں نے تقریباً سولہ غزوات میں شرکت کی۔[1]

مسلمان ہونے کے بعد بریدہ بن حصیب اسلمی رضی اللہ عنہ داعیان اسلام میں شامل ہو گئے اور ان کی قوم پر ہدایت کے راستے کھل گئے۔ وہ پکے مسلمان بنے اور ایسا نبوی منہج اختیار کیا جو ساری انسانیت کے لیے مشعلِ راہ ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: «أَسْلَمُ، سَالَمَهَا اللّٰهُ، وَ غِفَارُ غَفَرَ اللّٰهُ لَهَا، أَمَا إِنِّي لَمْ أَقُلْهَا وَ لٰكِنْ قَالَهَا اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ» ''قبیلۂ اسلم کو اللہ سلامت رکھے اور قبیلہ غفار کو اللہ بخش دے۔ یہ الفاظ میں نے اپنی مرضی سے نہیں بلکہ اللہ کے حکم سے کہے ہیں۔''[2]

دو چوروں کا مسلمان ہونا

رسول اللہ ﷺ ابھی سفر ہجرت میں تھے کہ مدینہ کے قریب قبیلہ اسلم کے دو چوروں سے ملاقات ہوئی جو ''مُہانان'' یعنی ''رسوائی والے / بدنام زمانہ'' کہلاتے تھے۔ نبی ﷺ نے انھیں اسلام لانے کی دعوت دی تو وہ دونوں دائرۂ اسلام میں داخل ہو گئے، پھر آپ ﷺ نے ان سے ان کے نام دریافت کیے تو انھوں نے کہا: ''ہمارا نام مہانان ہے۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: «بَلْ أَنْتُمَا الْمُكْرَمَانِ» ''نہیں بلکہ تمھارا نام ''مکرمان'' (عزت والے) ہے۔'' پھر انھیں مدینہ آنے کی دعوت دی۔[3]

اس واقعے سے دعوت کے سلسلے میں آپ ﷺ کی تگ و تاز کا علم ہوتا ہے۔ آپ نے موقع غنیمت جانتے ہی دونوں چوروں کو اسلام کی دعوت دی اور وہ مسلمان ہو گئے۔ چور جو کہ لوٹ مار اور چوری سے تعلق رکھتے تھے ان کا اسلام قبول کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ اگر خلوص اور سچائی سے حق پیش کیا جائے تو لوگ اسے جلد قبول کر لیتے ہیں۔ اور ان دونوں

---

[1] الإصابة: 146/1. [2] صحيح البخاري، حديث: 3514، و صحيح مسلم، حديث: 2516، والمستدرك للحاكم: 92/4، حديث: 6981. [3] مسند أحمد: 74/4، روایت ضعیف ہے۔

کے نام تبدیل کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی ﷺ مسلمانوں کی نیک نامی اور ان کے جذبات و احساسات کا خاص خیال رکھتے تھے تاکہ ان کی عزت افزائی ہو اور ان کا مورال بلند ہو۔ اور جب کسی فرد کو احساس کمتری سے نکال لیا جائے تو اس کی شخصیت مضبوط ہوجاتی ہے۔ اور وہ مزید ترقی حاصل کرنے کے لیے اپنی ساری قوت خیر وفلاح کے کاموں میں صرف کردیتا ہے۔[1]

سفر ہجرت میں زبیر وطلحہ رضی اللہ عنہما سے ملاقات

سفر ہجرت میں آپ ﷺ کی طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہما سے ملاقات ہوئی جو کہ مسلمانوں کے ایک تجارتی قافلے میں شام سے واپس آرہے تھے۔ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کو سفید کپڑے پہنائے۔[2]

قبائلی دشمنی ختم کرنے میں دین کا کردار

درست عقیدہ اور عظیم دین اسلام دلوں سے دشمنی اور کینہ دور کرنے اور دلوں میں الفت پیدا کرنے میں عظیم کردار کا حامل ہے۔ یہ ایسا اثر آفریں دین ہے کہ کسی اور دین اور عقیدے میں اس جیسی مثال نہیں ملتی۔ تاریخ شاہد ہے کہ اسلامی عقیدے نے اوس و خزرج کے درمیان کس طرح محبت ڈال دی۔ سالہا سال سے جاری جنگوں کے آثار تک ختم کردیے اور مختصر وقت میں بڑے بڑے کشت وخون کے دروازے بند کردیے۔ مدینہ میں قبول اسلام اور بیعت نبوی کا سلسلہ ابھی ابتدائی مراحل میں تھا، اس کے باوجود انصار میں اسلامی عقیدہ اس قدر راسخ ہوگیا تھا کہ انھوں نے مہاجرین کا کھلے دل سے استقبال کیا اور بھائی چارے کی ایک عمدہ مثال قائم کی جو اسلام کے علاوہ کسی اور مذہب میں نظر

[1] التاريخ الإسلامي للحميدي: 178/3. [2] صحيح البخاري، حديث: 3906، ودلائل النبوة للبيهقي:498/2.

نہیں آتی۔ یہی وجہ ہے کہ دشمن اسلامی عقیدے کو کمزور کرنے اور اہلِ اسلام کے دلوں سے اس کے اثرات مٹانے کی سرتوڑ سعی کر رہا ہے اور اس کے لیے علاقائی اور قومی عصبیتوں کو ہوا دی جا رہی ہے۔[1]

نبی ﷺ کی تشریف آوری پر مہاجرین و انصار کی خوشی

مدینہ کے باسی، خواہ مہاجر تھے یا انصار، آپ ﷺ کے صحیح سلامت مدینہ پہنچنے پر بہت خوش ہوئے۔ عورتیں اور بچے مارے خوشی کے گھروں سے نکل آئے۔ مردوں نے روزمرہ کے معمولات ترک کر دیے اور آپ ﷺ کے استقبال میں مگن ہو گئے۔ یہودِ مدینہ بھی بظاہر لوگوں کے ساتھ تھے لیکن ایک نئے رئیس کی آمد پر دلوں میں نفرت رکھتے تھے۔

مسلمانوں کی خوشی کوئی حیرت انگیز بات نہ تھی کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے آپ ﷺ نے انھیں جہالت کے اندھیروں سے نکال کر روشنیاں عطا فرمائی تھیں۔ ادھر یہود اپنے دلوں میں ان لوگوں کے بارے میں سخت کینہ و بغض اور نفاق رکھتے تھے جن کی وجہ سے ان کی سرداری ختم ہو گئی، مختلف قبائل پر ان کا غلبہ متاثر ہوا، قرض کے ذریعے لوگوں کے اموال ہضم کرنے کا راستہ بند ہو گیا اور انھوں نے خیر خواہی اور مشاورت کے نام پر جو خون ریزی کروائی تھی اس کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔ یہودیوں نے ہمیشہ اس شخص سے کینہ و بغض رکھا جس نے قبائل کو یہود کے غلبے سے نجات دلانے کی کوشش کی، چنانچہ انھوں نے ہمیشہ اہل اسلام کے خلاف سازشوں کا جال بچھائے رکھا اور موقع ملنے پر ان پر حملہ آور بھی ہوتے رہے۔ یہی ان کی فطرت اور یہی ان کا دین ہے۔[2]

مہاجرین و انصار کی طرف سے رسول اللہ ﷺ کے اس استقبال سے امراء اور علمائے کرام کا گرمجوشی اور عزت و اکرام سے استقبال کا جواز ملتا ہے۔

---

[1] الهجرة النبوية المباركة للدكتور عبدالرحمٰن البر، ص: 405. [2] السيرة النبوية للدكتور مصطفى السباعي، ص: 43، والهجرة في القرآن الكريم لأحزمي سامعون جزولي، ص: 367.

اسی طرح بھلائی کے کاموں میں سبقت لے جانے اور صاحبان علم وشرف کے اکرام کا سبق بھی ملتا ہے جیسا کہ مدینہ کا ہر قبیلہ نبی ﷺ کی میزبانی کی سعادت حاصل کرنا چاہتا تھا اور آپ ﷺ کی حفاظت کی ذمہ داری لینا چاہتا تھا۔[1]

ہجرت اور سفر اسراء و معراج میں تقابل

ہجرت نبوی عوامی سطح پر عمل میں آئی اور مسلمانوں کے لیے ایک مثال بن گئی۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اسی معروف طریقے سے مکہ سے مدینہ آئے۔ اللہ تعالیٰ نے سفر معراج کی طرح یہاں کوئی براق ارسال نہیں کیا، حالانکہ اس سفر میں آپ ﷺ کو براق کی اشد ضرورت تھی اور لوگ مدینہ میں آپ ﷺ کی آمد کے منتظر بھی تھے۔ بفرض محال اگر تو قریشی آپ ﷺ کو ڈھونڈ نکالتے تو آپ ﷺ کی جان جانے کا خطرہ بھی تھا۔

اگر تقابلی جائزہ لیا جائے تو اس امر کی حکمت کچھ اس طرح عیاں ہوتی ہے کہ دراصل ہجرت مدینہ صرف آنحضرت ﷺ کے ساتھ خاص نہ تھی بلکہ تمام مومنین بھی مہاجر ہوئے۔ اور وہ تو اسلامی دعوت کی ترقی کے مراحل میں سے ایک مرحلہ اور اس کی اشاعت کے لیے اہم وسیلہ تھا۔ اس وقت عام مسلمانوں پر ہجرت فرض تھی یہاں تک کہ قدرت کے باوجود ہجرت نہ کرنے والوں کے درمیان مقاطعہ ہوا۔[2]

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَالَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يُهَاجِرُوا مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَايَتِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا﴾

''اور جو لوگ ایمان تو لے آئے مگر انھوں نے ہجرت نہیں کی، ان کی دوستی سے تمھیں کوئی غرض نہیں حتی کہ وہ ہجرت کریں۔''[3]

[1] السيرة النبوية لأبي فارس، ص:359,358. [2] الهجرة في القرآن الكريم لأحزمي سامعون جزولي، ص:365. [3] الأنفال8:72.

اب اگر سفر معراج کا جائزہ لیا جائے تو وہ آپ ﷺ کی عزت افزائی اور شرف و عزت کی بڑھوتری کے لیے پیش آیا تاکہ اللہ تعالیٰ اپنے نبی ﷺ پر غائب امور واضح فرمائیں اور اپنی عجائبات قدرت کا مشاہدہ کرائیں۔ یہ تمام سفر معجزات اور خرق عادت امور کا مجموعہ تھا۔ انھی امور کے پیش نظر سواری بھی خرق عادت ہی اختیار کی گئی۔ نیز یہ سفر رسول اللہ ﷺ کی خصوصیت تھی کہ کوئی بشر ایسا فضل حاصل نہیں کرسکتا اور نہ ہی ہمیں اس سلسلے میں اقتداء کا حکم ہے۔[1]

بتدریج حصولِ مقصد کا اصول

نبی ﷺ نے انصار مدینہ سے اپنی ابتدائی ملاقات میں انھیں اسلام کی ترغیب دی اور قرآن کریم پڑھ کر سنایا اور آئندہ سال بیعت نساء (عقبہ اولی) لی جو کہ عبادات، اخلاقیات اور فضائل کے بارے میں تھی اور پھر اگلے سال دوسری بیعت عقبہ ہوئی جو جہاد اور تحریک اسلامی کی مدد وحمایت کے سلسلے میں تھی۔[2]

قابل توجہ امر یہ ہے کہ دوسری بیعت پورے دو سال بعد عمل میں آئی، یعنی اس کی تیاری اور مناسب فضا تیار کرنے میں دو سال کا عرصہ بیت گیا۔ یہ وہ نبوی منہج ہے جو دعوت کے ابتدائی دن ہی سے اختیار کیا گیا، یہ بتدریج حصول مقصد کے اصول پر مبنی تھا۔[3]

رسول اللہ ﷺ نے اسی منہج ربانی کا التزام فرمایا۔ نو مسلم انصار سے اسلام پر جو پہلی بیعت لی گئی اس میں عقیدے، طریق کار اور تربیت کا اہتمام کیا گیا تھا اور دوسری بیعت عقبہ میں اسلامی دعوت کی حمایت اور اسلامی معاشرے کی تائید ونصرت پر بیعت لی گئی جو بارآور ہو چکا تھا اور جس کی بنیادیں ٹھوس اور مضبوط ہو چکی تھیں۔ یہ دونوں بیعتیں درحقیقت دعوت اسلامی کے تربیتی منہج کا حصہ تھیں اور ایک دوسرے کی تکمیل تھیں۔

---

[1] تأملات في سيرة الرسول لمحمد سيد الوكيل، ص: 104,103. [2] الهجرة النبوية المباركة للدكتور عبد الرحمٰن البر، ص: 202. [3] بناء المجتمع الإسلامي لمحمد توفيق رمضان، ص: 119.

پہلی بیعت عقیدۂ توحید کی پابندی کا عہد تھی۔ دوسری بیعت اگرچہ دوسال بعد قوم انصار کے متعدد افراد کے اسلام لانے کے بعد عمل میں آئی لیکن یہ ''بیعتِ حرب'' دراصل وہ باڑھ تھی جسے عقیدۂ توحید کی حفاظت کرنا تھی۔ یہاں یہ امر قابل توجہ ہے کہ ایسی بیعت پہلی دفعہ انصار کے ساتھ ہوئی اور جس سرزمین سے ان کا تعلق تھا وہ اسلامی دعوت کے لیے ایک اچھی پناہ گاہ ثابت ہوسکتی تھی جہاں سے مجاہدین پیش قدمی کرسکتے تھے، جبکہ مکہ مکرمہ اس وقت جنگ کے لیے مناسب نہ تھا۔[1]

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر رحمت کرتے ہوئے اس وقت تک جہاد کی ذمہ داری نہ ڈالی تھی جب تک کہ انھیں ایک ایسا دارالاسلام میسر نہ آجائے جو ان کی پناہ گاہ بن سکے، چنانچہ مدینہ منورہ پہلا دارالاسلام قرار پایا۔[2]

پہلی بیعت اللہ اور رسول ﷺ پر ایمان کے بارے میں تھی، جبکہ دوسری بیعت ہجرت و جہاد کے سلسلے میں تھی۔ ان تینوں عناصر ایمان باللہ، ہجرت اور جہاد ہی سے اسلام کا وجود تشکیل پاتا ہے۔ اگر انصار جیسا حمایتی گروہ میسر نہ آتا تو ہجرت ممکن نہ تھی۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۚ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يُهَاجِرُوْا مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَايَتِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا ۚ وَاِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ اِلَّا عَلٰى قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ ۗ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ﴾

''بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے ہجرت کی اور اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور جنھوں نے (مہاجروں کو اپنے ہاں)

[1] بناء المجتمع الإسلامي لمحمد توفيق رمضان، ص: 123,122. [2] فقه السيرة للبوطي، ص: 172.

جگہ دی اور (ان کی) مدد کی، وہ ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ اور جو لوگ ایمان تو لے آئے مگر انھوں نے ہجرت نہیں کی، ان کی دوستی سے تمھیں کوئی غرض نہیں حتی کہ وہ ہجرت کریں۔ اور اگر وہ تم سے دین (کے معاملے) میں مدد مانگیں تو تم پر مدد لازم ہے مگر اس قوم کے خلاف نہیں کہ جن کے اور تمھارے درمیان کوئی معاہدہ ہو اور تم جو کام کرتے ہو اللہ دیکھ رہا ہے۔''[1]

مزید فرمایا:

﴿وَالَّذِينَ آمَنُوا مِنْ بَعْدُ وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا مَعَكُمْ فَأُولَٰئِكَ مِنْكُمْ ۚ وَأُولُو الْأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَوْلَىٰ بِبَعْضٍ فِي كِتَابِ اللَّهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ﴾

''اور جو لوگ بعد میں ایمان لائے اور انھوں نے ہجرت کی اور تمھارے ساتھ (مل کر) جہاد کیا تو وہ بھی تمھی میں سے ہیں اور اللہ کی کتاب میں (خون کے) رشتے دار آپس میں ایک دوسرے کے زیادہ حقدار ہیں۔ بے شک اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔''[2]

دوسری بیعت نبی ﷺ اور صحابۂ کرام کی ہجرت مدینہ کی آخری تمہید تھی۔ اس سے اسلام کو ایک ایسا مرکز نصیب ہو گیا جہاں سے حق کے علمبردار دانائی اور مواعظ حسنہ لے کر نمودار ہوئے اور دین حق پھیلانے کی کوششوں کا آغاز ہوا اور آخر کار ایک ایسی مملکت وجود میں آئی جہاں اللہ کی شریعت نافذ العمل ہوئی۔[3]

ہجرت اللہ کی راہ میں عظیم قربانی

نبی ﷺ اور صحابہ کرام کی مکہ سے مدینہ ہجرت ایک عظیم قربانی تھی جسے رسول اللہ ﷺ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا:

[1] الأنفال 72:8. [2] الأنفال 75:8. [3] الغرباء الأولون للدكتور سلمان العودة، ص: 199,198.

«وَاللّٰهِ إِنَّكِ لَخَيْرُ أَرْضِ اللّٰهِ وَ أَحَبُّ أَرْضِ اللّٰهِ إِلَى اللّٰهِ، وَ لَوْلَا أَنِّي أُخْرِجْتُ مِنْكِ مَا خَرَجْتُ»

''اللہ کی قسم! اے مکہ! یقیناً تو سب سے بہترین اور اللہ کی محبوب سرزمین ہے۔ اگر مجھے یہاں سے نکالا نہ جاتا تو میں کبھی نہ نکلتا۔''[1]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ''جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو یہاں بخار کی وبا تھی اور مدینہ کی وادی میں گندا پانی بہتا تھا جس سے صحابۂ کرام بیمار ہوگئے لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم محفوظ رہے۔ حضرت ابوبکر، عامر بن فہیرہ اور بلال رضی اللہ عنہم ایک ہی گھر میں رہتے تھے۔ جب انھیں بخار آیا تو میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے ان کی عیادت کے لیے گئی، ابھی حجاب کا حکم نازل نہ ہوا تھا۔ میں وہاں پہنچی تو وہ تینوں بخار کی تکلیف میں مبتلا تھے اور ان کی تکلیف اللہ کے سوا کوئی نہ جانتا تھا۔ میں ابوبکر رضی اللہ عنہ کے قریب ہوئی اور سوال کیا: ''ابا جان! آپ کیسے ہیں؟'' انھوں نے کہا:

كُلُّ امْرِئٍ مُّصَبَّحٌ فِي أَهْلِهِ   وَالْمَوْتُ أَدْنٰى مِنْ شِرَاكِ نَعْلِهِ

''ہر آدمی اپنے گھر میں صبح (اور شام) کرتا ہے، حالانکہ موت اس کے جوتے کے تسمے سے بھی زیادہ قریب ہے۔''

عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ میں نے کہا: ''میرے باپ کو علم نہیں وہ کیا کہہ رہے ہیں''، پھر میں عامر بن فہیرہ کی طرف متوجہ ہوئی اور پوچھا: ''عامر! تم اپنے آپ کو کیسا محسوس کرتے ہو؟'' اس نے کہا:

لَقَدْ وَجَدْتُ الْمَوْتَ قَبْلَ ذَوْقِهِ   إِنَّ الْجَبَانَ حَتْفُهُ مِنْ فَوْقِهِ

كُلُّ امْرِئٍ مُّجَاهِدٌ بِطَوْقِهِ   كَالثَّوْرِ يَحْمِي جِلْدَهُ بِرَوْقِهِ

[1] جامع الترمذي، حديث: 3925.

''میں نے موت کا مزہ چکھنے سے پہلے اسے پالیا اور بزدل کی موت تو اس کے اوپر سے آگرتی ہے۔''

''ہر شخص اپنی قوت کے مطابق بچاؤ کی کوشش کرتا ہے جس طرح بیل اپنے آپ کو سینگوں کے ذریعے سے محفوظ رکھتا ہے۔''

عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں: ''میں نے کہا: اللہ کی قسم! عامر کو علم نہیں وہ کیا کہہ رہا ہے۔'' حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو جب بخار سے افاقہ ہوتا تو گھر کے صحن میں لیٹ جاتے اور بلند آواز سے کہتے:

أَلَا لَيْتَ شِعْرِي هَلْ أَبِيتَنَّ لَيْلَةً ... بِوَادٍ وَّ حَوْلِي إِذْخِرٌ وَّ جَلِيلُ

وَ هَلْ أَرِدَنْ يَوْمًا مِّيَاهَ مَجَنَّةٍ ... وَّ هَلْ يَبْدُوَنْ لِّي شَامَةٌ وَّ طَفِيلُ

''کاش! میں جانتا کہ کوئی رات وادی مکہ میں گزار سکوں گا اور میرے گرد اذخر اور جلیل گھاس ہوگی۔''

''اور کیا کسی دن مجنہ کے چشمے پر وارد ہوسکوں گا اور مجھے شامہ اور طفیل پہاڑ دکھائی دیں گے؟''

عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ''میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر دی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی: «اَللّٰهُمَّ حَبِّبْ إِلَيْنَا الْمَدِينَةَ كَحُبِّنَا مَكَّةَ أَوْ أَشَدَّ، اَللّٰهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِي صَاعِنَا وَ فِي مُدِّنَا، وَ صَحِّحْهَا لَنَا، وَ انْقُلْ حُمَّاهَا إِلَى الْجُحْفَةِ» ''اے اللہ! ہمارے دل میں مدینہ کی محبت اس طرح ڈال دے جس طرح مکہ کی محبت ہے یا اس سے بھی زیادہ، اے اللہ! ہمارے (وزن کے پیمانے) صاع اور مد میں برکت فرمادے۔ اے اللہ! مدینہ طیبہ کی فضا ہمارے لیے موافق کردے۔ اور اس زمین کا بخار جحفہ منتقل فرمادے۔''[1]

---

1 صحيح البخاري، حديث: 1889، وصحيح مسلم، حديث: 1376، والسيرة النبوية لابن هشام: 589,588/2.

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی دعا کو شرف قبولیت بخشا اور مسلمان اس کے بعد بخار سے نجات پا گئے اور سرزمین مدینہ تمام مہاجرین اور دوسرے آنے والے وفود کے لیے پرکشش بن گئی۔ مختلف علاقوں اور معاشروں سے تعلق رکھنے کے باوجود تمام لوگ مدینہ میں امن و سکون سے زندگی بسر کرنے لگے۔[1]

نبی ﷺ کا ام معبد کو احسان کا بدلہ دینا

روایات میں آیا ہے کہ ام معبد کی بکریاں بہت زیادہ ہو گئیں وہ ان میں سے ایک ریوڑ مدینہ بھی لائیں۔ وہاں ان کے بیٹے نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو دیکھا اور کہا: ''اے اماں! یہ تو وہی آدمی ہے جو اس بابرکت آدمی کے ساتھ تھا۔'' ام معبد نے ابوبکر رضی اللہ عنہ سے پوچھا: ''اے اللہ کے بندے! تیرے ساتھ وہ آدمی کون تھا؟'' ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''کیا تو انھیں نہیں جانتی؟'' اس نے کہا: ''نہیں۔'' ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''وہ اللہ کے نبی تھے'' پھر ابوبکر رضی اللہ عنہ انھیں اپنے ہمراہ لیے رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے۔ رسول اللہ ﷺ نے انھیں کھانا بھی کھلایا اور تحائف بھی عطا کیے۔

اور ایک روایت میں ہے: وہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ چلی اور رسول اللہ ﷺ کو پنیر اور دیگر دیسی اشیاء پیش کیں تو آپ ﷺ نے بھی انھیں لباس اور دیگر تحائف عطا فرمائے اور وہ مسلمان ہو گئیں۔

''الوفاء'' کے مؤلف نے ذکر کیا ہے کہ ام معبد رضی اللہ عنہا اور اس کے خاوند نے ہجرت بھی کی اور اس کا بھائی خنیس مسلمان ہوا اور اس نے فتح مکہ کے دن شہادت پائی۔[2]

حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ اور یادگار لمحات

حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''جب اللہ کے رسول ﷺ ہمارے گھر

[1] التربية القيادية للدكتور الغضبان: 310/2. [2] السيرة النبوية لأبي شهبة: 490,489/1.

ٹھہرے تو نچلی منزل میں تھے اور میں اور ام ایوب اوپر والی منزل میں تھے۔ میں نے رسول اللہ ﷺ سے درخواست کی کہ آپ پر میرے ماں باپ قربان! یہ انتہائی نامناسب ہے کہ ہم آپ کے اوپر اور آپ نیچے قیام فرمائیں، آپ براہ کرم اوپر رہائش اختیار فرمائیے اور ہم نچلی منزل میں رہیں گے تو نبی ﷺ نے فرمایا: «يَا أَبَا أَيُّوبَ! إِنَّ أَرْفَقَ بِنَا وَ بِمَنْ يَّغْشَانَا أَنْ نَّكُونَ فِي سُفْلِ الْبَيْتِ» ''اے ابوایوب! ہمارے لیے اور ہر آنے جانے والے کے لیے نچلی منزل میں سہولت ہے۔'' ابوایوب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ''ایک دن ہم سے پانی کا مٹکا ٹوٹ گیا اور پانی بہہ گیا۔ ہمارے پاس ایک ہی لحاف تھا ہم نے اس لحاف سے پانی خشک کرنا شروع کر دیا کہ مبادا رسول اللہ ﷺ پر کوئی قطرہ گرے اور اذیت کا باعث بنے۔''[1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ہجرت

حضرت علی رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کی طرف سے اہل مکہ کی امانتیں واپس کرنے کے بعد سوئے مدینہ عازم سفر ہوئے۔ نبی ﷺ کے قباء پہنچنے کے دو یا تین راتیں بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی قباء پہنچ گئے اور تقریباً دو راتیں وہاں قیام کیا، پھر نبی ﷺ کے ہمراہ جمعہ کے دن مدینہ میں داخل ہوئے۔[2]

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے قباء میں اقامت کے دوران ایک غیر شادی شدہ عورت کو دیکھا کہ رات کے اندھیرے میں اس کے دروازے پر ایک آدمی آیا، وہ نکلی تو اس شخص نے اسے کوئی چیز دی جو عورت نے وصول کر لی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھے اس کے بارے میں شک گزرا تو (صبح کے وقت) پوچھا: ''اللہ کی بندی! یہ کون آدمی ہے جو رات تیرے دروازے پر آیا۔ اور تجھے کچھ دے کر واپس چلا گیا، حالانکہ وہ تیرا خاوند نہیں۔'' وہ بولی: ''یہ سہل بن حنیف ہے۔ وہ جانتا ہے کہ میں یہاں اکیلی رہتی ہوں۔ شام کے وقت

[1] السيرة النبوية لابن هشام:499,498/2، و السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري: 220/1. [2] السيرة النبوية لأبي شهبة:497/1.

اس نے اپنی قوم کے بت توڑے تو چند ٹکڑے میرے پاس لے آیا اور کہا کہ انھیں چولہے میں جلا لو۔‘‘

جب حضرت سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ سرزمین عراق میں فوت ہوئے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ لوگوں سے یہ قصہ بیان کیا کرتے تھے۔[1]

ہجرت نبوی ایک اہم تاریخی موڑ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مکہ سے مدینہ ہجرت کرنا ایک ایسا عظیم تاریخی موڑ تھا جس نے زندگی کا رخ پھیر دیا اور وہ تمام طریقے جن کے تحت لوگ زندگی گزار رہے تھے یکسر تبدیل کر دیے۔ ان کے خود ساختہ قوانین، رسوم و رواج، عادات، اخلاق، معاملات، عقائد، عبادات، علم و فن، جہالت اور کم عقلی، ہدایت و گمراہی اور عدل و انصاف کے سب ضابطے بدل ڈالے گئے۔[2]

ہجرت انبیائے کرام علیہم السلام کی سنت ہے

اللہ کے راستے میں ہجرت کا عمل قدیم دور سے چلا آرہا ہے۔ انبیائے کرام علیہم السلام اپنے عقائد کے تحفظ کے لیے ہجرت کرتے رہے تھے۔ اس لیے حیات انبیاء میں ہجرت کوئی نئی چیز نہیں تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی دعوت کے تحفظ کے لیے اور ایک ایسا زرخیز معاشرہ قائم کرنے کے لیے جو دعوت کو قبول کرے، اپنے وطن اور اس سرزمین سے ہجرت کی جہاں آپ کی ولادت ہوئی تھی۔ بعینہ انھی اسباب کی بنا پر دیگر انبیاء علیہم السلام نے بھی ہجرت کی تھی۔ ایک ایسی بنجر زمین جو دعوتِ حق کو قبول کرنے کے بجائے اس کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کرتی اور اسے روکنے کی کوشش کرتی رہی بلکہ وہاں اس دعوت کو انتہائی تنگ دائرے

[1] محمد رسول الله لصادق عرجون: 421/2. [2] محمد رسول الله ﷺ لصادق عرجون: 423/2.

میں محصور کر دیا گیا تھا۔ اس سرزمین سے ہجرت کے نتیجے میں دعوت کے باقی رہنے سے اللہ تعالیٰ کی یہ سنت واضح ہو کر مومنوں کے سامنے آتی ہے کہ جب ان کے اور ان کے عقیدے کے درمیان رکاوٹیں کھڑی کی جائیں، ان کے وجود اور بقا کو خطرہ ہو اور ان کی غیرت و عزت کو پامال کرنے کی کوشش کی جائے تو وہ اس سنت الٰہی پر عمل کرتے ہوئے وہاں سے ہجرت کر جائیں۔ اس کی مثالیں قرآن کریم نے اقوام ماضی کے انبیائے کرام علیہم السلام اور ان کے پیروکاروں کی ہجرتوں کی صورتوں میں بیان کی ہیں۔[1]

1 الهجرة في القرآن الكريم لأحزمي سامعون جزولي، ص: 175.

باب 2

مہاجرین کے اوصاف حمیدہ، ان کا انعام واکرام اور ہجرت سے پیچھے رہنے والوں کا انجام

ہجرتِ مدینہ اسلامی دعوت کی تاریخ کا سنگ میل ہے۔ اس ہجرت سے مسلمانوں کی کایا پلٹ گئی۔ وجہ یہ ہے کہ اس ہجرت سے پہلے مسلمانوں کی حیثیت ایک ''امت دعوت'' کی سی تھی جو لوگوں کو اللہ کا پیغام تو سناتی تھی لیکن اس کا کوئی سیاسی مقام نہیں تھا جو مسلمانوں کو تحفظ فراہم کرتا اور دشمن کے مقابلے میں ان کا دفاع کرتا۔

ہجرت کے بعد اسلامی ریاست کا قیام عمل میں آیا تو اسلام جزیرہ نمائے عرب کے اندرون و بیرون میں تیزی سے پھیلتا چلا گیا۔ داعیان اسلام آس پاس کے علاقوں میں جاتے اور دعوتِ دین کا فریضہ انجام دیتے۔ اسلامی ریاست نے ان مبلغین کی حفاظت کا بیڑا اٹھایا اور دشمن کی ہر زیادتی کا منہ توڑ جواب دیا۔ چاہے اس کے لیے جنگ و جدال کی بھٹی ہی میں کیوں نہ کودنا پڑے۔[1]

قرآن فہمی اور علوم قرآن میں ہجرت کا کردار

ہجرتِ مدینہ کا قرآن فہمی اور علومِ قرآن کی تدوین میں بھی نمایاں کردار ہے۔ علمائے کرام نے اسی ہجرت کو مدنظر رکھتے ہوئے مکی اور مدنی سورتوں کی تقسیم کی ہے۔ جو سورت

[1] الهجرة النبوية لأبي فارس، ص: 13.

ہجرت سے پہلے، خواہ مکہ سے باہر ہی نازل ہوئی ہو اسے مکی سورت کہا گیا اور جو ہجرت کے بعد خواہ مدینہ سے باہر ہی نازل ہوئی ہو اُسے مدنی سورتوں کے زمرے میں شمار کیا گیا۔ قرآنی سورتوں کی اس تقسیم سے حسب ذیل اہم ترین فوائد حاصل ہوئے:

① قرآن کریم کے گوناگوں اسالیبِ بیانی کا ذائقہ لینا اور دعوت دین کے میدان میں ان سے استفادہ کرنا۔

② قرآنی آیات کے توسط سے سیرت نبوی کے واقعات اور ان کی تاریخوں سے واقفیت بہم پہنچانا۔[1]

ہجرتِ نبوی کی اہمیت کے پیشِ نظر قرآنِ کریم نے مختلف طریقوں سے اہلِ ایمان کو ہجرت کرنے کا شوق دلایا ہے۔ اس ضمن میں قرآنِ کریم نے نہایت عمدگی سے مہاجرین کی تعریف کی، اُن کے لیے اجر وثوب کا وعدہ کیا اور ہجرت سے کنارہ کشی اختیار کرنے والوں کو انجامِ بد کی وعید سنائی ہے۔[2]

مہاجرین کے اوصافِ حمیدہ

اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں مہاجرین کی تعریف بیان کی، ان کے غیر معمولی اوصاف کا تذکرہ کیا اور بتایا ہے کہ انھیں ظلم وزیادتی کا نشانہ بنایا گیا اور اپنے گھروں سے بے دخل کر کے مال و متاع سے بھی محروم کر دیا گیا اور ان کے عزیز و اقارب بھی ان کے لیے اجنبی بن گئے۔ ان کا قصور صرف اتنا تھا کہ وہ اللہ ہی کو اپنا رب مانتے تھے۔

مہاجرین کی اہم ترین صفات یہ ہیں:

اخلاص: اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيٰرِهِمْ وَاَمْوٰلِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا

---

1 مباحث في علوم القرآن للقطان، ص: 59. 2 الهجرة في القرآن الكريم لأحزمي سامعون جزولي، ص: 84.

﴿مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَّيَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝﴾

''(مالِ فَے) ان مہاجر فقراء کے لیے ہے جو اپنے گھروں اور اپنی جائیدادوں سے نکالے گئے، وہ اللہ کا فضل اور اس کی رضا ڈھونڈتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی مدد کرتے ہیں، یہی لوگ سچے ہیں۔'' [1]

﴿يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا﴾ کا ٹکڑا اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ مہاجرین کو ان کے گھروں اور مال و متاع سے بے دخل کیے جانے کا سبب ایک ہی تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ سے مخلص اور اس کی رضا کے طالب تھے۔ [2]

صبر: اللہ تعالیٰ نے مہاجرین کے خاص وصف ''صبر'' کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِي اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ۭ وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَلٰي رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۝﴾

''اور جن لوگوں نے ظلم و ستم سہنے کے بعد اللہ کی راہ میں ہجرت کی، البتہ ہم انھیں دنیا میں ضرور اچھا ٹھکانا دیں گے اور یقیناً آخرت کا اجر تو بہت بڑا ہے۔ کاش! وہ علم رکھتے۔ وہ لوگ جنھوں نے صبر کیا اور وہ اپنے رب ہی پر توکل کرتے ہیں۔'' [3]

نیز اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ هَاجَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا فُتِنُوْا ثُمَّ جٰهَدُوْا وَصَبَرُوْٓا ۙ اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝﴾

''پھر بے شک آپ کا رب ان لوگوں کے لیے (مہربان ہے) جنھوں نے آزمائش میں پڑنے کے بعد ہجرت کی، پھر جہاد کیا اور صبر کیا، بے شک آپ کا رب ان (آزمائشوں) کے بعد (ان لوگوں کے لیے) البتہ بہت بخشنے والا، نہایت مہربان ہے۔'' [4]

[1] الحشر 8:59. [2] الهجرة في القرآن الكريم لأحزمي سامعون جزولي، ص: 86. [3] النحل 42,41:16. [4] النحل 110:16.

سچائی: سچائی بھی مہاجرین کا امتیازی وصف تھا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيٰرِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَّيَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۚ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ○﴾

''(مالِ فَے) ان مہاجر فقراء کے لیے ہے جو اپنے گھروں اور اپنی جائیدادوں سے نکالے گئے، وہ اللہ کا فضل اور اس کی رضا ڈھونڈتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی مدد کرتے ہیں، یہی لوگ سچے ہیں۔''[1]

علامہ بغوی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں لکھا: ''﴿اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ○﴾ کا مطلب ہے کہ وہ اپنے ایمان میں سچے تھے۔'' قتادہ کا قول ہے: ''یہ وہ مہاجر ہیں جنھوں نے گھربار، مال و متاع اور خاندان اللہ اور اس کے رسول کی محبت پر قربان کر دیا۔ ناسازگار حالات کے باوجود اسلام کا دامن تھامے رکھا۔ روایات میں ہے کہ انھیں بھوک کی شدت میں کمر سیدھی رکھنے کے لیے پیٹ پر پتھر باندھنے پڑتے اور اوڑھنے کے لیے لحاف نہ ہوتا تو چٹائی اوڑھ کر ہی سردیوں کی رات بسر کر لیتے۔''[2]

جہاد اور قربانی: ارشادِ ربانی ہے:

﴿اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ○﴾

''وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے جہاد کیا، اللہ کے ہاں درجے میں (وہ) سب سے بڑھ کر ہیں اور وہی مراد پانے والے ہیں۔''[3]

انبیاء علیہم السلام کی دعوتِ دین میں قربانی اور جاں نثاری کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس سچی دعوت کو ہمیشہ سرکشی، تکذیب اور سخت دشمنی جیسے چیلنجوں کا سامنا رہا ہے

[1] الحشر 8:59. [2] تفسير البغوي: 318/4. [3] التوبة 20:9.

جن سے نمٹنے کے لیے جفاکشی، زبردست ایمانی قوت، عقیدے کی پختگی اور بے جگری کی ضرورت ہوتی ہے۔ عقیدۂ توحید ہی وہ عقیدہ ہے جو انسان کو باطل سے ٹکرانے کی ہمت عطا کرتا ہے۔

ابتدائے نبوت میں جبریل علیہ السلام کا وحی لے کر اترنا گویا اس بات کا اعلان تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قوم کی طرف سے ایذا رسانی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ورقہ بن نوفل نے (پہلی وحی کے نزول کے موقع پر) کہا تھا: ''یہ وہی فرشتہ ہے جو موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوا کرتا تھا۔ کاش میں اس وقت مضبوط جوان ہوں اور تب تک زندہ رہوں جب آپ کی قوم آپ کو (شہر سے) نکال باہر کرے گی۔'' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حیرت سے پوچھا: «أَوَ مُخْرِجِيَّ هُمْ؟» ''کیا یہ لوگ مجھے (مکہ سے) بے دخل کر دیں گے؟'' ورقہ بن نوفل نے جواب دیا: ''ہاں! جو بھی آدمی یہ دعوت لے کر آیا جیسی آپ لائے ہیں تو اس سے ضرور دشمنی روا رکھی گئی۔ میرے ہوتے وہ دن آ گیا تو میں آپ کی بھرپور مدد کروں گا۔''[1]

ہجرت مدینہ قربانی اور جاں نثاری کی داستان تھی۔[2]

یہ امر غور طلب ہے کہ قربانی اور جہاد فی سبیل اللہ لازم و ملزوم ہیں۔ قربانی کے بغیر جہاد کا تصور ناممکن ہے۔[3]

اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَّيَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۚ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ○﴾

''(مالِ فے) ان مہاجر فقراء کے لیے ہے جو اپنے گھروں اور اپنی جائیدادوں سے نکالے گئے، وہ اللہ کا فضل اور اس کی رضا ڈھونڈتے ہیں اور اللہ اور اس کے

[1] صحيح البخاري، حديث: 3، وصحيح مسلم، حديث: 160. [2] الهجرة في القرآن الكريم لأحزمي سامعون جزولي، ص: 104. [3] الهجرة في القرآن الكريم لأحزمي سامعون جزولي، ص: 106.

رسول کی مدد کرتے ہیں، یہی لوگ سچے ہیں۔''[1]

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے مہاجرین کی تعریف بیان کی ہے کہ وہ مکہ چھوڑ کر مدینہ صرف اللہ اور اس کے رسول کی نصرت وحمایت کے لیے آئے تھے۔ اللہ تعالیٰ کی مدد کرنے سے جنگ میں مدد ملتی اور ثابت قدمی عطا ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ ۝ ﴾

''اے ایمان والو! اگر تم اللہ (کے دین) کی مدد کرو گے تو وہ تمھاری مدد کرے گا اور تمھارے قدم ثابت رکھے گا۔''[2]

سید قطب لکھتے ہیں: ''اہل ایمان اللہ تعالیٰ کی کیونکر مدد کریں کہ وہ اس کی نصرت و حمایت سے سرفراز ہوں اور انھیں ثابت قدمی نصیب ہو؟''

اس سوال کا جواب وہ خود ہی دیتے ہیں: ''اہل ایمان پر اللہ کا یہ حق ہے کہ وہ ہر قسم کے ظاہری و باطنی شرک سے بچیں، اللہ کو اپنی ذات اور ہر خواہش سے بڑھ کر محبوب رکھیں۔ زندگی کی تمام رغبتوں اور تمناؤں میں، حرکات وسکنات میں، پوشیدہ طور پر بھی اور علانیہ بھی، معاشرے کی تمام سرگرمیوں میں اور افکار ونظریات میں اللہ کی حکومت تسلیم کریں۔ اپنی ذات کی حد تک اللہ کی مدد یہ ہے۔ اس بات کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانی حیات کے لیے ایک مکمل ضابطہ وضع کیا جسے شریعت کہا جاتا ہے۔ شریعت کی عمارت چند مضبوط بنیادوں پر استوار ہے۔ یہ کسوٹی خاص اقدار کی حامل ہے۔ انسانی زندگی اور کائنات کے بارے میں اس کا جداگانہ تصور ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مدد کا حصول اس شریعت و منہج کی مدد کیے بغیر ممکن نہیں۔ وہ اس طرح کہ بلاامتیاز زندگی کے تمام شعبوں میں اسے نافذ کرنے کی سعی کی جائے اور اسے قولِ فیصل مانا جائے۔ دنیاوی معاملات میں اللہ کی مدد کرنے کا طریق کار یہ ہوا۔''[3]

[1] الحشر 8:59. [2] محمد 7:47. [3] تفسیر في ظلال القرآن لسید قطب: 6/3288.

اللہ تعالیٰ پر کامل اعتماد: ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِي اللّٰهِ مِنْ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ۖ وَلَأَجْرُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ○ الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ○﴾

''اور جن لوگوں نے ظلم وستم سہنے کے بعد اللہ کی راہ میں ہجرت کی، البتہ ہم انھیں دنیا میں ضرور اچھا ٹھکانا دیں گے اور یقیناً آخرت کا اجر تو بہت بڑا ہے۔ کاش! وہ علم رکھتے۔ وہ لوگ جنھوں نے صبر کیا اور وہ اپنے رب ہی پر توکل کرتے ہیں۔'' [1]

اللہ تعالیٰ نے تعریف کے پیرائے میں مہاجرین کے اللہ پر اعتماد کرنے کا تذکرہ فرمایا۔

اللہ پر توکل ایمان کی خاصیت، علامت، اس کا مقصد اور تقاضا ہے۔ قرآنِ کریم میں ہے:

﴿قَالَ رَجُلَانِ مِنَ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمَا ادْخُلُوْا عَلَيْهِمُ الْبَابَ فَاِذَا دَخَلْتُمُوْهُ فَاِنَّكُمْ غٰلِبُوْنَ ۚ وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○﴾

''ان میں سے دو آدمی جن پر اللہ کا فضل تھا، وہ بولے: تم ان کے مقابلے کے لیے دروازے میں داخل ہو جاؤ، پھر جب تم دروازے میں داخل ہو گئے تو بے شک تم غالب آ جاؤ گے اور اگر تم مومن ہو تو تمھیں اللہ ہی پر بھروسا کرنا چاہیے۔'' [2]

ایک اور موقع پر فرمایا:

﴿وَقَالَ مُوْسٰى يٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ ○﴾

''اور موسیٰ نے کہا: اے میری قوم! اگر تم اللہ پر ایمان لائے ہو تو اسی پر توکل کرو اگر تم فرماں بردار ہو۔'' [3]

ایک اور مقام پر فرمایا:

[1] النحل 16:41، 42۔ [2] المآئدۃ 5:23۔ [3] یونس 10:84۔

﴿قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ إِنْ نَّحْنُ إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۖ وَمَا كَانَ لَنَآ أَنْ نَّأْتِيَكُمْ بِسُلْطٰنٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ○﴾

''ان کے رسولوں نے ان سے کہا: واقعی ہم تمھارے جیسے بشر ہی ہیں اور لیکن اللہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اس پر احسان کرتا ہے۔ اور ہمیں یہ اختیار نہیں کہ اللہ کے حکم کے بغیر ہم تمھارے پاس کوئی نشانی (یا دلیل) لاسکیں اور مومنوں کو اللہ ہی پر توکل کرنا چاہیے۔''[1]

نبی علیہ السلام اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے ہجرت مدینہ میں توکل علی اللہ کی ایسی مثال قائم کی جو رہتی دنیا تک قابلِ اتباع رہے گی یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی ستائش کی۔[2]

رحمتِ الٰہی کی امید: مہاجرین کی ایک نمایاں صفت، جس پر اللہ تعالیٰ نے اُن کی ستائش کی ہے، رحمتِ الٰہی کا امیدوار ہونا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿إِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ أُولٰٓئِكَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ ۚ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○﴾

''بے شک جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا، وہی لوگ اللہ کی رحمت کی امید رکھتے ہیں اور اللہ بہت بخشنے والا، بہت رحم کرنے والا ہے۔''[3]

اللہ تعالیٰ نے لفظ ﴿يَرْجُوْنَ﴾ کے ذریعے سے مہاجرین کی ستائش کی ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ دنیا میں کوئی انسان اطاعت وفرماں برداری کی کتنی ہی منزلیں طے کرے، اسے جنتی ہونے کا علم نہیں ہوسکتا کیونکہ اول تو اسے یہ پتا نہیں کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔ دوسرا اس لیے بھی کہ انسان کہیں عمل نہ چھوڑ بیٹھے۔ مہاجرین کو اللہ نے اپنی بخشش

---

[1] إبراهيم 11:14. [2] الهجرة في القرآن الكريم لأحزمي سامعون جزولي، ص: 114-117.

[3] البقرة 218:2.

سے نواز دیا تھا، اس کے باوجود وہ اللہ کی رحمت کے طلبگار تھے۔ یہ ان کے پختہ ایمان کی نشانی ہے۔[1]

اتباع رسول ﷺ: ہجرت مدینہ کے عظیم المرتبت ہونے کا ثبوت اس بات سے بھی ملتا ہے کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے مہاجرین و انصار کے متعلق بیان فرمایا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کرتے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّهٗ بِهِمْ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ﴾

’’یقیناً اللہ نے نبی اور ان مہاجرین و انصار پر مہربانی فرمائی جنھوں نے تنگی کی گھڑی میں آپ کی پیروی کی، بعد اس کے کہ ان میں سے ایک گروہ کے دل بہک جانے کو تھے، پھر اللہ نے ان پر مہربانی فرمائی۔ بے شک وہ ان پر بہت شفقت کرنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔‘‘[2]

مہاجرین و انصار نے مشکل کی ہر گھڑی میں نبی ﷺ کی فرماں برداری کی جو اس امر کی دلیل ہے کہ یہ لوگ عظیم درجات پر فائز کیے جانے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے معافی کے مستحق تھے۔

یہ آیت غزوۂ تبوک کے بارے میں نازل ہوئی۔ صحابۂ کرام قحط سالی اور شدید گرمی کے موسم میں، پانی اور زادراہ کی کمی کے باوجود جہاد پر روانہ ہوئے تھے۔

قتادہ رحمہ اللہ کا بیان ہے: ’’صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم آگ برساتی گرمی میں غزوۂ تبوک کے لیے شام کی طرف روانہ ہوئے۔ انتہائی کٹھن حالات تھے۔ کہا جاتا ہے کہ دو دو آدمی ایک ایک کھجور پر گزارا کرتے اور بعض اوقات چند آدمی صرف ایک کھجور پر اس طرح گزارا

[1] تفسير القرطبي:50/3، و تفسير أبي السعود:218/1. [2] التوبة 117:9.

کرتے کہ ہر فرد کھجور چوستا اور پانی پی لیتا۔ اللہ نے ان کی محنتوں کو قبول کر کے انھیں معاف کردیا۔ اور وہ غزوے سے صحیح سلامت واپس ہوئے۔''[1]

بلاشبہ اتباع رسول ﷺ دین و ایمان کی حقیقت ہے۔ یہ کفر و ایمان کے درمیان حد فاصل اور حُبّ الٰہی کا بیّن ثبوت ہے۔ حُبّ الٰہی زبانی دعوے یا وجدانی کیفیت کا نام نہیں بلکہ یہ رسول اللہ ﷺ کی فرماں برداری، ہدایت کی راہ پر چلنے اور اسلام کو زندگی کے ہر شعبے میں نافذ کرنے کا نام ہے۔ ایمان خالی خولی الفاظ، بھڑکتے جذبات یا محض ظاہری علامات کو نہیں کہتے بلکہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت اور اللہ کی طرف سے عطا کردہ ضابطۂ حیات کی پابندی کا نام ہے جسے رسول اللہ ﷺ نے ہم تک پہنچایا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○ قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ○﴾

''آپ کہہ دیجیے: اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمھارے گناہ بخش دے گا اور اللہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔ آپ کہہ دیجیے: تم اللہ کی اور اس کے رسول کی اطاعت کرو، پھر اگر وہ منہ موڑیں تو بے شک اللہ کافروں کو پسند نہیں کرتا۔''[2]

اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے لکھا ہے: ''اس آیت کریمہ نے فیصلہ کردیا ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کی محبت کا دم تو بھرتا ہے لیکن محمدی منہج اختیار نہیں کرتا وہ اپنے دعوے میں جھوٹا ہے۔ تا آنکہ وہ شریعتِ محمدی کو زندگی کا ضابطہ بنا لے۔''[3] نبی ﷺ نے فرمایا: «مَنْ عَمِلَ عَمَلًا لَّيْسَ عَلَيْهِ أَمْرُنَا فَهُوَ رَدٌّ» ''جس نے کوئی ایسا عمل کیا جس

[1] تفسیر ابن کثیر: 397/2. [2] آل عمرٰن 3: 31، 32. [3] تفسیر ابن کثیر: 466/3.

کے بارے میں ہم نے کوئی حکم نہیں دیا تو وہ مسترد ہے۔''[1]

ایمان وعمل میں سبقت: اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ﴾

''اور مہاجرین اور انصار میں سے (قبول اسلام میں) سبقت کرنے والے اور وہ لوگ جنھوں نے احسان کے ساتھ ان کی پیروی کی، اللہ ان سے راضی ہو گیا اور وہ اس سے راضی ہو گئے اور اللہ نے ان کے لیے ایسے باغ تیار کیے ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، وہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے، یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔''[2]

امام رازی رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے رقمطراز ہیں: ''یہ سبقت فضیلت کا باعث ہے۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے اسلام لانے اور ہجرت کرنے میں سبقت کی، اس لیے بعد کے لوگوں پر لازم ہے کہ ان کی اتباع کریں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«مَنْ سَنَّ فِي الْإِسْلَامِ سُنَّةً حَسَنَةً، فَلَهُ أَجْرُهَا، وَ أَجْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا، إِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ»

''جس نے اسلام میں اچھا طریقہ جاری کیا اسے قیامت تک اپنا اور اس پر عمل کرنے والوں کا ثواب ملتا رہے گا۔''[3]

ذاتی معاملہ ہو یا دین کا، اپنے جیسوں کو دیکھ کر لوگوں میں کام کرنے کا جذبہ بڑھتا ہے۔ اس آیت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مہاجرین مسلمانوں کے سردار اور رؤسا ہیں۔''[4]

---

1 صحيح البخاري، حديث: 2697، و صحيح مسلم، حديث: (18)-1718. 2 التوبة 9:100.

3 صحيح مسلم، حديث: 1017، و جامع الترمذي، حديث: 2675، و سنن النسائي، حديث: 2555، و سنن ابن ماجه، حديث: 203، ومسند أحمد: 4/358,357، و فتح الباري: 12/193.

4 تفسير الرازي: 10/208.

اللہ تعالیٰ نے مہاجرین کو ایسی منفرد صلاحیتوں سے نوازا تھا جن کی بدولت انھوں نے ہر قسم کے دباؤ، آزمائش، بھوک اور غریب الوطنی جیسی تکالیف کو ہنسی خوشی برداشت کیا اور موت تک کو گلے لگا لیا۔ یوں پہلے مکہ اور پھر مدینہ میں اسلام کو ان کی شکل میں نہایت ٹھوس بنیادیں فراہم ہوئیں۔ انصار اگرچہ مہاجرین کے بعد دائرہ اسلام میں آئے تھے لیکن ان کی بیعت عقبہ میں شمولیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی طبیعتیں بھی خالص اور کھری تھیں جو اس دین کے مزاج سے مکمل طور پر میل کھاتی تھیں۔

مہاجرین و انصار کے باہمی تعلق و ارتباط سے اسلام کے لیے ایسی ٹھوس بنیاد تشکیل پائی جس کے قوام میں عربی معاشرے کے مضبوط اور مستحکم ترین عناصر شامل تھے۔ کچھ عناصر جو قلیل تعداد میں تھے ان تکالیف کو برداشت نہ کر سکے اور دین سے مرتد ہو کر جاہلیت کی طرف پلٹ گئے۔ دین اسلام کا معاملہ کھلی کتاب کے مانند تھا۔ جاہلیت سے نکل کر دائرۂ اسلام میں آنے اور اس دشوار گزار راستے کو طے کرنے کی ہمت وہی عناصر کرتے تھے جو غیر معمولی مزاج اور مصمم ارادے کے مالک ہوتے۔[1]

یوں مہاجرین و انصار کی فضیلت اور ان کا مرتبہ واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ایسے حالات میں روپیہ پیسہ خرچ کیا اور جہاد کیا جب ان کے مددگار بھی کم تھے، عقیدۂ توحید کی مخالفت بھی زوروں پر تھی اور آسودگی، نفع یا غلبہ کی توقع بھی نہیں تھی۔ ایسے مشکل حالات میں انفاق اور جہاد اتنے عظیم اعمال تھے کہ ان کا کوئی ثانی نہیں۔[2]

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَمَا لَكُمْ أَلَّا تُنفِقُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلِلَّهِ مِيرَاثُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۚ لَا يَسْتَوِي مِنكُم مَّنْ أَنفَقَ مِن قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ ۚ أُولَٰئِكَ أَعْظَمُ دَرَجَةً

[1] تفسير في ظلال القرآن لسيد قطب: 1703/3. [2] الهجرة في القرآن الكريم لأحزمي سامعون جزولي، ص: 124.

مِّنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَقٰتَلُوْا ؕ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝﴾

''اور تمھیں کیا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے؟ جبکہ آسمانوں اور زمین کی میراث اللہ ہی کے لیے ہے۔تم میں سے جن لوگوں نے فتح (مکہ) سے پہلے خرچ کیا اور جہاد کیا یہ (ان لوگوں کے) برابر نہیں ہیں (جنھوں نے فتح مکہ کے بعد یہی کام کیے۔) یہ (پہلے کرنے والے) لوگ درجے میں ان لوگوں سے عظیم تر ہیں جنھوں نے اس (فتح) کے بعد خرچ کیا اور لڑائی کی اور اللہ نے ہر ایک سے نیک جزا کا وعدہ کیا ہے اور اللہ اس سے خوب باخبر ہے جو تم عمل کرتے ہو۔''[1]

امام ابن کثیر رحمہ اللہ ایمان وعمل میں سبقت لے جانے والے مہاجرین وانصار کے متعلق لکھتے ہیں: ''اللہ کریم نے مہاجرین وانصار میں سے سب سے پہلے سبقت کرنے والوں ﴿وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ﴾ کو اپنی رضامندی کی سند عطا فرمائی ہے۔ان لوگوں کی بربادی ہو جو ان تمام یا کسی ایک سے بغض رکھتے ہیں۔ یا انھیں برا بھلا کہتے ہیں بالخصوص اس شخص کو جو سب سے افضل، قابل قدر اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد امت کا پیشوا بنا۔ میری مراد سید الصحابہ، خلیفۃ الرسول سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں۔ یہ راندۂ درگاہ گروہ رافضیوں کا ہے جو صحابۂ کرام سے بغض رکھتے ہیں اور ان پاکباز ہستیوں کو گالیاں دے کر اپنا منہ کالا کرتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی عقل الٹی اور دل ٹیڑھے ہیں کیونکہ وہ امت کی ان ہستیوں کو برا جانتے ہیں جن سے اللہ تعالیٰ راضی ہے۔

اہل سنت کا عقیدہ ہے کہ ان تمام افراد کے متعلق دل صاف رکھا جائے جن سے اللہ راضی ہو اور انھیں برا سمجھا جائے جنھیں اللہ اور اس کا رسول برا سمجھیں۔ دوستی اور دشمنی کا یہی معیار ہے۔ ایسے لوگ ہی اتباع اور اقتدا کی راہ اپناتے ہیں نہ کہ بدعت کی۔یہی لوگ

[1] الحدید 10:57۔

اللہ تعالیٰ کا کامیاب گروہ اور اس کے مومن بندے ہیں۔''[1]

کامیابی: اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ هَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ۝﴾

''وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے جہاد کیا، اللہ کے ہاں درجے میں (وہ) سب سے بڑھ کر ہیں اور وہی مراد پانے والے ہیں۔''[2]

علامہ ابوسعود اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں: ''﴿هُمُ الْفَآئِزُوْنَ﴾ سے مراد وہ افراد ہیں جو خاص طور پر کامیابی سے ہمکنار ہوئے، گویا اس کامیابی کی نسبت دوسرے لوگوں کی کامیابیاں کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔''[3]

مذکورہ بالا آیت میں اللہ تعالیٰ نے مہاجرین کو عظیم کامیابی کا مستحق قرار دے کر ان کی تعریف کی۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملنے والی کامیابی عظیم ہی ہوگی۔ اللہ جسے آگ سے بچا لے اور جنت میں لے جائے اس سے بڑی کامیابی اور کیا ہو سکتی ہے! اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ؕ وَاِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ؕ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ۝﴾

''ہر کوئی موت کا ذائقہ چکھنے والا ہے، بے شک قیامت کے دن تمھیں پورے پورے اجر دیے جائیں گے، پھر جسے آگ سے دور رکھا گیا اور جنت میں داخل کر دیا گیا تو وہ یقیناً کامیاب ہو گیا اور دنیا کی زندگی دھوکے ہی کا سامان تو ہے۔''[4]

[1] تفسیر ابن کثیر:2/332. [2] التوبة9:20. [3] تفسیر أبي السعود:4/53. [4] آل عمرٰن3:185.

سچا ایمان: قرآن کریم میں مہاجرین کا ایک وصف ان کے ایمان کی سچائی بھی بیان کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ۚ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ﴾

''اور جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور جنھوں نے (مہاجرین کو) جگہ دی اور (ان کی) مدد کی، وہی لوگ سچے مومن ہیں، ان کے لیے مغفرت اور باعزت روزی ہے۔''[1]

یہ اللہ علیم وخبیر کی شہادت ہے کہ مہاجرین سچے مومن تھے جو نبی ﷺ کے بعد امت کے لیے نمونے کی حیثیت اختیار کر گئے۔ انھی صفات کی بدولت وہ اللہ تعالیٰ کی مدح وستائش کے مستحق ٹھہرے کہ دراصل یہی مومن ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ۚ لَهُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ﴾

''(سچے) مومن تو صرف وہ لوگ ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں اور جب ان پر اس کی آیتوں کی تلاوت کی جائے تو وہ ان کا ایمان بڑھا دیتی ہیں اور وہ اپنے رب ہی پر توکل کرتے ہیں۔ وہ لوگ جو نماز قائم کرتے ہیں اور ہم نے انھیں جو رزق دیا ہے اس میں سے وہ خرچ کرتے ہیں، یہی لوگ سچے مومن ہیں، ان کے لیے اپنے رب کے ہاں درجے ہیں اور بخشش ہے اور باعزت رزق ہے۔''[2]

[1] الأنفال 8:74۔ [2] الأنفال 8:2-4۔

یہ صفات مہاجرین کی زندگیوں میں واضح طور پر نظر آتی ہیں اور انھی صفات کے حامل افراد ہی درحقیقت اہلِ ایمان ہیں۔

مہاجرین کے انعامات

اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں مہاجرین کو ملنے والے انعامات کا تذکرہ فرمایا ہے۔ ان میں سے چند انعامات یہ ہیں:

دنیا میں فراخی رزق: اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً ۚ وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْۢ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ۗ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا۝﴾

”اور جو شخص اللہ کی راہ میں ہجرت کرے وہ زمین میں پناہ لینے کے لیے بہت جگہ اور فراخی پائے گا۔ اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہجرت کرنے کی خاطر اپنے گھر سے نکلے، پھر اسے راستے میں موت آجائے تو اس کا اجر اللہ کے ذمے واجب ہو گیا۔ اور اللہ نہایت بخشنے والا، بہت رحم کرنے والا ہے۔“[1]

دنیا میں ان کا رزق یوں فراخ کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے فَے اور غنیمت کا مال ان کے لیے بھی خاص کر دیا، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَّيَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۚ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ۝﴾

”(مالِ فَے) ان مہاجر فقراء کے لیے ہے جو اپنے گھروں اور اپنی جائیدادوں سے نکالے گئے، وہ اللہ کا فضل اور اس کی رضا ڈھونڈتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی مدد کرتے ہیں، یہی لوگ سچے ہیں۔“[2]

1 النسآء 100:4. 2 الحشر 8:59.

مہاجرین ان اموال کے اس لیے مستحق ٹھہرے کہ انھیں ناحق اپنے گھروں اور مالوں سے بے دخل کیا گیا تھا۔[1]

مہاجرین کے لیے رزق میں فراخی یوں بھی کی گئی کہ انصار سے بخیلی دور کر کے ان کے سینے مہاجرین کے لیے کشادہ کر دیے گئے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ تَبَوَّءُو الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۚ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾

''اور (مالِ فَے ان کے لیے ہے) جنھوں نے (مدینہ کو) گھر بنا لیا تھا اور ان (مہاجرین) سے پہلے ایمان لا چکے تھے، وہ (انصار) ان سے محبت کرتے ہیں جو ان کی طرف ہجرت کرے اور وہ اپنے دلوں میں اس (مال) کی کوئی حاجت نہیں پاتے جو ان (مہاجرین) کو دیا جائے اور اپنی ذات پر (ان کو) ترجیح دیتے ہیں اگرچہ خود انھیں سخت ضرورت ہو اور جو کوئی اپنے نفس کے لالچ سے بچا لیا گیا تو وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔''[2]

اللہ تعالیٰ نے مہاجرین سے دنیا میں فراخی رزق کا وعدہ فرمایا۔ یہ وعدہ پورا ہوا۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہجرت کرنے والوں کو واضح طور پر تمام ممکنہ خطرات سے آگاہ کیا اور راہ ہجرت میں پیش آنے والے تمام مصائب حتیٰ کہ موت کا ذکر بھی کر دیا۔ اس کے ساتھ چند ایسے حقائق بھی سامنے رکھ دیے جن سے اطمینان قلب اور ہجرت کے سلسلے میں اللہ کی طرف سے ضمانت حاصل ہوتی ہے۔ اور ہجرت وہی ہے جو اللہ کے راستے میں ہو۔ اسلام میں یہی ہجرت معتبر ہے نہ کہ وہ ہجرت جو حصولِ مال، دکھوں سے

[1] تفسیر ابن کثیر: 295/4، و تفسیر أبي السعود: 228/8، و فتح القدیر للشوکاني: 200/5.

[2] الحشر 9:59.

نجات، لذتوں کے حصول یا دنیا کے سازوسامان اکٹھا کرنے کی غرض سے ہو۔ مذکورہ ہجرت ہی اللہ کے ہاں مقبول ہے اور ایسا مہاجر زمین میں کشادگی، نجات اور رزق پائے گا کیونکہ اللہ اس کا مددگار ہوگا اور اس کی راہنمائی کرے گا۔[1]

گناہوں کی مغفرت: گناہوں کی مغفرت بھی مہاجرین کا خصوصی انعام تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّيْ لَآ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى ۚ بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ ۚ فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَ اُوْذُوْا فِيْ سَبِيْلِيْ وَ قٰتَلُوْا وَ قُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ ۝﴾

’’پھر ان کے رب نے ان کی دعا قبول کی کہ تم میں سے میں کسی عمل کرنے والے کا عمل ضائع نہیں کروں گا، خواہ کوئی مرد ہو یا عورت، تم آپس میں ایک دوسرے کے ہم جنس ہو، پھر جن لوگوں نے ہجرت کی اور انھیں ان کے گھروں سے نکال دیا گیا اور انھیں میری راہ میں تکلیفیں دی گئیں اور انھوں نے جہاد کیا اور وہ قتل ہوئے تو میں ضرور ان کی برائیاں ان سے دور کردوں گا اور یقیناً انھیں ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں جاری ہیں۔ یہ اللہ کی طرف سے ثواب ہوگا اور اللہ ہی کے پاس بہترین ثواب ہے۔‘‘[2]

رسول اللہ ﷺ کے متعدد فرامین اس امر کے شاہد ہیں کہ ہجرت گناہوں کی مغفرت کا اہم ذریعہ ہے۔ شماسہ مہری رحمہ اللہ کا بیان ہے کہ ہم سیدنا عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے، وہ نزع کے عالم میں تھے۔ سیدنا عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے زارو قطار روتے

[1] تفسیر في ظلال القرآن لسید قطب:745/2. [2] آل عمرٰن195:3.

ہوئے اپنا چہرہ دیوار کی طرف پھیر لیا۔ ان کا بیٹا کہنے لگا: ''ابا جان! آپ کیوں روتے ہیں؟ اللہ کے رسول نے آپ کو فلاں فلاں خوشخبری نہیں سنائی؟'' اس پر انھوں نے اپنا رخ سیدھا کیا اور کہا: ''ہم نے جو کچھ تیار کیا ہے اس میں سب سے افضل عمل اللہ کی وحدانیت کا اقرار اور رسول اللہ کی رسالت کی گواہی ہے۔ میری زندگی تین مراحل سے گزری۔ (پہلے مرحلے میں) میں رسول اللہ ﷺ سے سخت بغض رکھتا تھا۔ میری انتہائی کوشش تھی کہ آپ کو قتل کر دوں۔ اگر میں اسی حالت میں مر گیا ہوتا تو جہنمی قرار پاتا، پھر جب اللہ تعالیٰ نے میرے دل میں ایمان کی شمع روشن کی، میں نبی ﷺ کی خدمت میں آیا اور کہا: ''دایاں ہاتھ بڑھایئے۔ میں آپ سے بیعت کرنا چاہتا ہوں۔'' آپ ﷺ نے اپنا ہاتھ بڑھایا تو میں نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ نبی ﷺ نے وجہ دریافت کی تو میں نے عرض کیا: ''میں شرط لگانا چاہتا ہوں۔'' آپ ﷺ نے پوچھا: «تَشْتَرِطُ بِمَاذَا؟» ''کیا شرط لگانا چاہتے ہیں؟'' میں نے عرض کی کہ میرے گناہ معاف ہو جائیں۔ فرمایا: «أَمَا عَلِمْتَ یَا عَمْرُو! أَنَّ الْإِسْلَامَ یَهْدِمُ مَا کَانَ قَبْلَهُ؟ وَ أَنَّ الْهِجْرَةَ تَهْدِمُ مَا کَانَ قَبْلَهَا وَ أَنَّ الْحَجَّ یَهْدِمُ مَا کَانَ قَبْلَهُ؟» ''کیا آپ کو علم نہیں کہ اسلام پچھلے تمام گناہوں کو مٹا دیتا ہے؟ ہجرت اور حج بھی سابقہ تمام گناہوں کو ختم کر دیتے ہیں۔''

''پھر (دوسرے مرحلے کے دوران) یہ حالت ہو گئی کہ رسول اللہ ﷺ سے زیادہ مجھے کوئی محبوب نہیں تھا، نہ میری نظر میں آپ سے بڑھ کر کسی کی عظمت تھی۔ آپ ﷺ کی بارعب شخصیت کے سبب میں نظر بھر کر آپ کی طرف نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اگر کوئی مجھ سے رسول اللہ ﷺ کا حلیہ بیان کرنے کو کہے تو میں بیان نہیں کر پاؤں گا کیونکہ میں آپ ﷺ کو کبھی نظر بھر کر نہیں دیکھ سکا۔ میں اسی حالت میں مر جاتا تو امید تھی کہ جنتی ہوتا، پھر (تیسرے مرحلے میں) ہمیں چند ذمہ داریاں سونپی گئیں۔ میں نہیں جانتا کہ میں ان ذمہ داریوں سے کہاں تک عہدہ برآ ہو سکا۔ میں مر جاؤں تو کوئی نوحہ کرنے والی میرے (جنازے کے)

ساتھ نہ جائے اور نہ کوئی آگ لے کر (جنازے کے ساتھ) چلے، جب تدفین کر چکو تو قبر پر بکھیر بکھیر کر مٹی ڈالنا، پھر قبر کے پاس اتنی دیر کھڑے رہنا جتنی دیر اونٹ ذبح کر کے اس کا گوشت تقسیم کر دیا جاتا ہے تا کہ تمھاری موجودگی میں (وہاں) میرا دل لگ جائے اور دیکھوں کہ اپنے رب کے پیغامبروں (فرشتوں) کو کیا جواب دیتا ہوں۔''[1]

علامہ نووی رحمہ اللہ نے اس روایت کی شرح میں لکھا: ''اس حدیث میں اسلام، ہجرت اور حج کی عظمت بیان کی گئی ہے، ان میں سے ہر ایک سابقہ گناہوں کو منہدم کر دیتا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ قریب المرگ انسان کو یہ تلقین کرنی چاہیے کہ وہ اللہ سے حسنِ ظن رکھے۔ اسے امید و بیم کی آیات اور معافی کی احادیث پڑھ کر سنانی چاہئیں۔ اسے اس کے نیک اعمال یاد دلائے جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کی مہمانی کے لیے جو سامان تیار کر رکھا ہے اس کے متعلق بتایا جائے تا کہ اس کی موت اللہ سے حسن ظن پر آئے۔ قریب المرگ کی عیادت میں یہ آداب ملحوظ رکھنا بالاتفاق مستحب ہے۔''[2]

اللہ کے ہاں مراتب و درجات کی بلندی: اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں سے عظیم درجات کا وعدہ کیا ہے جنھوں نے ایمان، ہجرت اور جہاد فی سبیل اللہ کے سلسلے میں اپنا مال اور اپنی جانیں قربان کیں۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ۝﴾

''وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے جہاد کیا، اللہ کے ہاں درجے میں (وہ) سب سے بڑھ کر ہیں اور وہی مراد پانے والے ہیں۔''[3]

---

1 صحيح مسلم، حديث: 121. 2 شرح صحيح مسلم للنووي، شرح الحديث: 121. 3 التوبة 20:9.

امام فخر الدین رازی لکھتے ہیں: ''آیت کریمہ میں جن افراد کو چار صفات سے متصف بیان کیا گیا ہے وہ عظمت کے مینار ہیں۔ انسان کے پاس بنیادی طور پر تین ہی چیزیں ہیں: روح، بدن اور مال و متاع۔ مہاجرین کی روح اسلام لانے کے بعد اوج کمال تک جا پہنچی۔ بدن اور مال انھوں نے ہجرت اور جہاد پر قربان کر دیے، حالانکہ یہ دونوں چیزیں انسان کی محبوب ترین چیزیں ہیں۔ وہ انھیں اس صورت میں چھوڑ سکتا ہے جب ان سے زیادہ محبوب شے پا لے۔ مہاجرین کے ہاں اللہ کی رضا جان و مال سے زیادہ محبوب نہ ہوتی تو کبھی آخرت کو دنیا پر ترجیح نہ دیتے اور نہ جان و مال کی قربانی پیش کرتے۔ چنانچہ ثابت ہوا کہ ان چار صفات سے متصف انسان انسانیت کے اعلیٰ معیار اور فرشتوں کے ابتدائی درجے تک پہنچ جاتا ہے۔ یوں مہاجرین مطلق طور پر ساری انسانیت پر فائق تھے۔ جو صفات ان میں پائی جاتی تھیں وہ انھیں سعادت و فضیلت کے اسی درجے پر پہنچانے والی تھیں۔''[1]

کچھ مسلمانوں کی رائے تھی کہ سقایت (حاجیوں کو پانی پلانا) اور عمارت (مسجد حرام کی آبادکاری) اسلام لانے کے بعد سب سے بڑے عمل ہیں لیکن اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ اہلِ ایمان مہاجرین جنھوں نے جان و مال سے اللہ کے راستے میں جہاد کیا، وہ سب سے افضل ہیں اور ثواب کے زیادہ مستحق ہیں۔ ہجرت کرنے والے اور جان و مال کی قربانی دینے والے ہی عزت کے لحاظ سے ان تمام افراد سے اعلیٰ و افضل ہیں جن میں یہ صفات نہیں پائی جاتیں۔ اہلِ سقایت و عمارت بھی انھی افراد میں شامل ہیں جو فضیلت کے اعتبار سے مہاجرین سے فروتر ہیں۔[2]

اللہ تعالیٰ نے مہاجرین کو اہلِ سقایت و عمارت ہی سے افضل نہیں گردانا۔ ایسا ہوتا تو وہ صرف انھی سے افضل ہوتے۔ اللہ تعالیٰ نے مطلق طور پر ان کی برتری ثابت کی ہے جو

[1] تفسير الرازي: 13/16. [2] تفسير المراغي: 78/10.

تمام لوگوں سے ان کے افضل ہونے کی دلیل ہے۔[1]

﴿اَعْظَمُ دَرَجَةً﴾ میں صیغہ اسم تفضیل سے یہ نہ سمجھا جائے کہ جن میں مہاجرین کی صفات نہ ہوں گی وہ ان سے کم درجہ کے حامل ہوں گے بلکہ مہاجرین کی فضیلت مطلق طور پر بتائی ہے کہ ان کا درجہ سب سے بلند ہے۔ جبکہ ان کے مقابلے میں جن لوگوں کا ذکر ہے ان کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ وَفِي النَّارِ هُمْ خٰلِدُوْنَ﴾

''انھی لوگوں کے (سب) اعمال برباد ہو گئے اور وہ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے۔''[2]

لٰہذا دوسرے لوگوں کو مومن و مجاہد مہاجرین سے کسی درجے میں کوئی نسبت ہی نہیں۔[3]

جنت کا استحقاق اور اس میں ہمیشہ کا قیام: قرآن کریم میں مہاجرین کے لیے انعامات بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے جنت کے استحقاق اور اس میں ہمیشہ کے قیام کا ذکر بھی کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ۝ يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ وَّجَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ ۝ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا اَبَدًا ۚ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ﴾

''وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے جہاد کیا، اللہ کے ہاں درجے میں (وہ) سب سے بڑھ کر ہیں اور وہی مراد پانے والے ہیں، ان کا رب انھیں اپنی طرف سے رحمت اور رضامندی اور ایسے باغوں کی خوشخبری دیتا ہے جن میں ان کے لیے ہمیشہ رہنے

[1] تفسیر الرازي: 14/16. [2] التوبة 9:17. [3] تفسیر في ظلال القرآن لسید قطب: 3/1614.

والی نعمتیں ہوں گی، وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے ابد تک۔ بے شک اللہ کے ہاں بہت بڑا اجر ہے۔"[1]

امام شوکانی رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "آیت میں ﴿رَحْمَةٍ﴾، ﴿رِضْوٰنٍ﴾ اور ﴿وَّجَنّٰتٍ﴾ کے الفاظ کو تعظیم جتانے کی غرض سے نکرہ لایا گیا ہے۔ معنی یہ ہیں: یہ جنتیں بیان کرنے والوں کے بیان اور تصور کرنے والوں کے تصور سے بالاتر ہیں۔ انسانی عقل ان کا ادراک کرنے سے قاصر ہے۔ ہمیشہ رہنے والی نعمتوں سے مراد یہ ہے کہ وہ کبھی ختم ہوں گی نہ ساتھ چھوڑیں گی۔ لفظ ﴿اَبَدًا﴾ کو خلود کے بعد ذکر کرنا تاکید کے لیے ہے۔[2]

یہ ایسی خوش خبری ہے کہ اس کے بعد کوئی خوش خبری ہو ہی نہیں سکتی۔ اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان خواتین و حضرات سے جنتوں میں ہمیشہ کے قیام کا وعدہ کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ۭ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝﴾

"اللہ نے مومن مردوں اور مومن عورتوں سے ایسے باغوں کا وعدہ کیا ہے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، وہ ہمیشہ ان میں رہیں گے اور سدا بہار باغوں میں پاکیزہ محلات کا (وعدہ ہے) اور اللہ کی رضامندی سب سے بڑھ کر (نعمت) ہوگی، یہی عظیم کامیابی ہے۔"[3]

اللہ کی رضا اور عظیم کامیابی: اللہ تعالیٰ نے مہاجرین سے جن انعامات کا وعدہ کیا ہے ان میں سے ایک انعام یہ ہے کہ وہ عظیم کامیابی سے ہمکنار ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشادِ گرامی ہے:

[1] التوبة 9:20-22. [2] فتح القدير للشوكاني: 2/345. [3] التوبة 9:72.

﴿اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ۝﴾

’’وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے جہاد کیا، اللہ کے ہاں درجے میں (وہ) سب سے بڑھ کر ہیں اور وہی مراد پانے والے ہیں۔‘‘ [1]

اللہ تعالیٰ کی رضا ان کے لیے تمام نعمتوں سے بڑی اور عظیم نعمت ہے۔ یہ اچھائی کی انتہا، اعلیٰ ترین نعمت اور پورا پورا بدلہ ہے۔ [2]

قرآنِ مجید میں ہے:

﴿وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ۚ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ۚ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝﴾

’’اللہ نے مومن مردوں اور مومن عورتوں سے ایسے باغوں کا وعدہ کیا ہے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، وہ ہمیشہ ان میں رہیں گے اور سدا بہار باغوں میں پاکیزہ محلات کا (وعدہ ہے) اور اللہ کی رضامندی سب سے بڑھ کر (نعمت) ہوگی، یہی عظیم کامیابی ہے۔‘‘ [3]

مہاجرین کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے حاصل ہونے والی رضامندی ایسی رضا ہے جس کے بعد انھیں اجر وثواب ملتا ہے، حالانکہ اللہ کی رضا بذاتِ خود اعلیٰ درجے کا ثواب ہے۔

مہاجرین کے اللہ تعالیٰ سے راضی ہونے کا مطلب اللہ تعالیٰ کے انعامات پر شکر اور آزمائشوں پر صبر کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ اور مہاجرین کے آپس میں راضی ہونے سے رضا کی وسیع وعریض اور نہایت خوبصورت فضا قائم ہوئی جس کی وجہ سے ان چنیدہ ہستیوں کی شان بلند ہوئی اور

[1] التوبة 9:20. [2] تفسير ابن كثير: 2/320، وتفسير المراغي: 10/79. [3] التوبة 9:72.

وہ ایسے اعلیٰ و ارفع مقام پر فائز ہوئے کہ باوجود مخلوق ہونے کے اپنے خالق سے رضا کا تبادلہ کرنے لگے۔ یہ ایسا عمدہ ماحول ہے کہ انسانی الفاظ اس کی تعبیر کرنے سے قاصر ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہی نے اپنے بے مثال کلام میں اسے ذکر خیر بخشا ہے۔ [1]

یہ تھا اس اجر وثواب کا مختصر تذکرہ جو اللہ تعالیٰ نے مہاجرین کو ان کی سخت جدوجہد کے بدلے میں عطا کیا۔

مہاجرین نے ایمانِ راسخ اور یقینِ محکم کی بدولت اسلامی دعوت کو جو ابھی ابتدائی مراحل میں تھی، جاہلیت کے ہاتھوں زندہ درگور ہونے سے بچا لیا۔ انھوں نے رسول اللہ ﷺ پر نازل ہونے والی وحی کی تعلیمات پر مستقل مزاجی سے عمل کیا۔ قریش کی شدید مخالفت نے ان کی استقامت میں اضافہ ہی کیا۔ جاہلیت ظلم وستم میں حد سے بڑھ گئی تو اللہ تعالیٰ نے صابر مومنین کو ہجرت کی اجازت دی۔ انھوں نے گھر بار، مال ومتاع کو خیر باد کہا اور مدینہ روانہ ہو گئے۔ یہ ہجرت کفر کے ڈر سے نہیں تھی، نہ اس میں دنیاوی اغراض کا شائبہ تھا۔ مسلمان اس ہجرت کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ کی رحمت کے طلبگار اور اس کی رضا و فضل کے متلاشی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ دنیا میں فضلِ الٰہی کے مستحق ٹھہرے اور قیامت کے دن ثوابِ عظیم سے بہرہ مند ہوں گے۔ [2]

ہجرت نہ کرنے والوں کو وعید

جزا وسزا کے معاملات میں قرآن کریم نے جو اسلوب اختیار کیا ہے اس کا ہدف یہ ہے کہ دلوں میں خشیت و رجا (امید وبیم) کے جذبات بیک وقت پیدا ہوں۔ رجا (امید) جو دلوں کو طاعت و استقامت کی طرف لے جائے اور خشیت (بیم) جو گناہ سے روکے اور تیزی سے توبہ و استغفار کے راستے پر چلا دے۔ مومن امید وبیم کے درمیان اعتدال کی راہ

[1] تفسير في ظلال القرآن لسيد قطب: 1705/3. [2] هجرة الرسول و صحابته في القرآن و السنة لأحمد عبدالغني، ص:333,332.

پر چلتا ہے۔ وہ امید کا دامن ہاتھ سے چھوڑ کر مایوسی کا شکار ہوتا ہے نہ اللہ کی قائم کردہ حدوں کو پھلانگنے کی جرأت کرتا ہے نہ احکام الٰہی کی تعمیل میں سستی کرتا ہے۔ قرآن کریم نے خشیت و رجا جیسے اسلحے کے ذریعے سے فرد کی شخصیت اور جان، مال و متاع، عقل و شعور، عزت اور دین کی نسبت سے معاشرے کے اجزائے ترکیبی کو تحفظ فراہم کیا ہے۔ اسلامی ریاست انسانی زندگی کو ان پانچ پہلوؤں سے تحفظ فراہم کرتی ہے جو شریعتِ اسلامیہ کے مقاصد میں شامل ہے۔ یہ پانچ بنیادیں ہی ہیں جن پر قابل فخر زندگی کا دارومدار ہے۔ قرآنِ کریم نے انسانی حیات کو نسل در نسل خشیت و رجا ہی کی بدولت روشنی سے ہمکنار کیا۔ جب یہ نور قرآن کریم سے دوری کے سبب مدھم پڑ گیا تو فرد کا اپنی فطرت سے اور معاشرے کا اپنی حقیقت سے تصادم ہوا جس کے نتیجے میں اعلیٰ اخلاقی اقدار نے اپنی قدر و قیمت کھو دی۔ زندگی کے معاملات و مقاصد اور تمام تصورات تہ و بالا ہو گئے۔ یقینی بات ہے کہ اس امت کے آخری زمانے کے معاملات بھی اسی طریقے سے درست ہوں گے جس ذریعے سے اس کے ابتدائی زمانے کے معاملات درست ہوئے۔ اور یہ اس وقت تک ناممکن ہے جب تک خشیت و رجا (امید و بیم) کے سارے رشتے اللہ سے نہیں جوڑے جاتے۔[1]

ہجرت سے پیچھے رہنے والوں کا برا انجام قرآن کریم نے یوں بیان کیا ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ تَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيٓ أَنفُسِهِمْ قَالُوا فِيمَ كُنتُمْ ۖ قَالُوا كُنَّا مُسْتَضْعَفِينَ فِي الْأَرْضِ ۚ قَالُوٓا أَلَمْ تَكُنْ أَرْضُ اللّٰهِ وٰسِعَةً فَتُهَاجِرُوا فِيهَا ۚ فَأُولٰٓئِكَ مَأْوٰهُمْ جَهَنَّمُ ۖ وَسَآءَتْ مَصِيرًا ۝﴾

"جن لوگوں کی اس حالت میں فرشتے جان قبض کرتے ہیں کہ وہ (جان بوجھ کر کافروں میں رہ کر) اپنی جانوں پر ظلم کرتے رہے ہوں تو فرشتے پوچھتے ہیں کہ تم کس حال میں تھے؟ وہ کہتے ہیں: ہم زمین میں کمزور تھے۔ تب فرشتے کہتے ہیں:

1 تفسیر سورۃ فصلت للدکتور محمد صالح علي، ص: 98.

کیا اللہ کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کر جاتے؟ چنانچہ یہی لوگ ہیں جن کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے۔''[1]

امام بخاری رحمۃ اللہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت لائے ہیں کہ مکہ کے کچھ مسلمان مشرکین کا لشکر بڑھانے کی غرض سے ان کے ساتھ جنگوں میں نکلتے۔ اچانک کوئی تیر آتا یا تلوار لگتی تو ان میں سے کوئی مارا جاتا۔ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔[2]

ابن عباس رضی اللہ عنہما ہی کی ایک روایت میں ہے کہ مکہ کے کچھ لوگ مسلمان ہوئے۔ وہ اسلام کے معاملے کو چھپاتے تھے۔ بدر کے دن مشرکین انھیں اپنے ہمراہ لائے۔ ان میں سے چند افراد مارے گئے تو مسلمانوں نے کہا: ''ہمارے یہ ساتھی مسلمان تھے اور انھیں مجبور کیا گیا تھا۔'' پھر یہ آیت لکھ کر مکہ روانہ کر دی گئی کہ اب تمھارے لیے کوئی عذر نہیں رہا، وہ یہ آیت پڑھ کر ہجرت کا عزم لیے گھروں سے روانہ ہوئے۔ مشرکین نے انھیں جا لیا اور تحفظ دینے کا وعدہ کیا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ فَاِذَآ اُوْذِيَ فِي اللّٰهِ جَعَلَ فِتْنَةَ النَّاسِ كَعَذَابِ اللّٰهِ ۭ وَلَىِٕنْ جَاۗءَ نَصْرٌ مِّنْ رَّبِّكَ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّا كُنَّا مَعَكُمْ ۭ اَوَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِمَا فِيْ صُدُوْرِ الْعٰلَمِيْنَ ○﴾

''اور لوگوں میں سے بعض وہ ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ پر ایمان لائے، پھر جب اللہ کی راہ میں انھیں ایذا دی جاتی ہے تو وہ لوگوں کے ستانے کو اللہ کے عذاب کے برابر ٹھہراتے ہیں اور اگر آپ کے رب کی طرف سے مدد آجائے تو وہ ضرور کہیں گے: بے شک ہم تمھارے ساتھ تھے، کیا جو کچھ جہان والوں کے سینوں میں ہے اللہ اُسے خوب جاننے والا نہیں۔''[3]

مسلمانوں نے یہ آیت بھی لکھ کر مکہ روانہ کر دی اب مکہ کے مسلمان عازم مدینہ ہوئے

[1] النسآء 4:97. [2] صحيح البخاري، حديث:4596. [3] العنكبوت 29:10.

اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

﴿ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ هَاجَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا فُتِنُوْا ثُمَّ جٰهَدُوْا وَصَبَرُوْٓا اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ؀﴾

''پھر بے شک آپ کا رب ان لوگوں کے لیے (مہربان ہے) جنھوں نے آزمائش میں پڑنے کے بعد ہجرت کی، پھر جہاد کیا اور صبر کیا، بے شک آپ کا رب ان (آزمائشوں) کے بعد (ان لوگوں کے لیے) البتہ بہت بخشنے والا، نہایت مہربان ہے۔''[1]

اللہ تعالیٰ نے ہجرت نہ کرنے والوں کو ظالم قرار دیا۔ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو دار کفر میں اسلام لائے اور مدینہ کی طرف ہجرت نہ کی، گویا مکہ میں اقامت گزیں رہنا اور ہجرت نہ کرنا ظلم تھا۔[2] یہ لوگ دارالاسلام سے دور رہے اور ایک بلند پایہ، باعزت اور آزاد زندگی سے محروم ہو گئے۔ انھوں نے دار الکفر میں ذلت آمیز، حقیرانہ اور بے چارگی کی زندگی گزاری۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں جہنم اور برے ٹھکانے کی وعید سنائی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی مرضی سے مکہ ٹھہرے رہے۔[3]

اس آیتِ کریمہ میں ہجرت سے کنارہ کشی کرنے والوں کو سنگین انجام کی وعید سنائی گئی۔ اس کا بہتر نتیجہ یہ نکلا کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم حکم الٰہی کے پابند بنے اور عذاب سے بچنے کے لیے فوراً مدینہ میں قائم نئے اسلامی معاشرے کی طرف ہجرت کر گئے۔ اس وعید کا صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے دلوں پر گہرا اثر پڑا۔

ضمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ نے مکہ میں جب یہی (سابقہ) آیت سنی تو اپنے بیٹوں سے کہا: ''مجھے اٹھا کر لے چلو۔ میں بے بس اور کمزور نہیں ہوں۔ مجھے راستہ سجھائی دیتا ہے۔ میں یہ رات مکہ میں نہیں گزاروں گا۔'' انھوں نے والد کو چارپائی پر اٹھایا اور مدینہ کو عازم سفر

---

1 النحل 110:16، وزاد المسير لابن الجوزي: 97/2، و تفسير القاسمي: 399/3. 2 الهجرة في القرآن الكريم لأحزمي سامعون جزولي، ص: 161. 3 تفسير في ظلال القرآن لسيد قطب: 744/2.

ہوئے۔ ضمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ خاصے عمر رسیدہ بزرگ تھے۔ تنعیم تک پہنچے تھے کہ ان کی وفات ہوگئی۔ نزع کے عالم میں انھوں نے اپنا دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ پر رکھا اور کہا: ''اے اللہ! ایک تیرا اور دوسرا تیرے رسول کا ہاتھ ہے۔ میں ان باتوں پر تجھ سے بیعت کرتا ہوں جن پر تیرے رسول نے بیعت کی۔'' جب یہ خبر مدینہ پہنچی تو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے کہا: ''کاش وہ مدینہ میں وفات پاتے۔'' اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

﴿وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً ۚ وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْۢ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ۗ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا۝﴾

''اور جو شخص اللہ کی راہ میں ہجرت کرے وہ زمین میں پناہ لینے کے لیے بہت جگہ اور گنجائش پائے گا۔ اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہجرت کرنے کی خاطر اپنے گھر سے نکلے، پھر اسے راستے میں موت آجائے تو اس کا اجر اللہ کے ذمے واجب ہوگیا۔ اور اللہ نہایت بخشنے والا، بہت رحم کرنے والا ہے۔''[1]

ضمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ کے واقعے سے معلوم ہوتا ہے کہ حالات جیسے بھی ہوں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم حیلے بہانے تراشتے تھے نہ رعایتوں اور سہولتوں کی تلاش میں رہتے تھے بلکہ تنگی اور آسانی ہر صورت میں حکمِ الٰہی کی تعمیل کرنے کے لیے مستعد رہتے تھے۔[2]

بعض روایات میں ہے کہ ضمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ اس وقت بیمار تھے۔ مگر ان کا خیال تھا کہ وہ مالدار ہیں اور ہجرت مدینہ کی استطاعت رکھتے ہیں، اس لیے ان کا عذر قابلِ قبول نہیں۔ یہ قرآنی فہم ایمان کا الہام کردہ ہے جسے اخلاص و یقین نے صیقل کیا ہے۔[3]

اللہ تعالیٰ نے ہجرت نہ کرنے والوں کی سزا کا تذکرہ فرمایا اور بوڑھے، کمزور و بے بس

---

1 النسآء 4:100، و تفسیر الآلوسي: 129,128/5، و أسباب النزول للواحدي، ص: 181.

2 الهجرة النبوية المباركة للدكتور عبد الرحمٰن البر، ص: 124. 3 الهجرة النبوية المباركة للدكتور عبد الرحمٰن البر، ص: 126,125.

افراد، عورتوں اور بچوں کو مستثنیٰ قرار دے دیا جو دارالاسلام کی پرامن زندگی سے محروم رہتے ہیں اور دارالکفر میں قیام پذیر رہنے اور دین کے معاملے میں فتنے کا شکار ہونے کے سوا ان کے پاس کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ یہ لوگ اپنے عذر کی وجہ سے معافی اور رحمت کے مستحق ہیں۔ [1] اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ حِيْلَةً وَّلَا يَهْتَدُوْنَ سَبِيْلًا ۝ فَاُولٰٓئِكَ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّعْفُوَ عَنْهُمْ ۚ وَكَانَ اللّٰهُ عَفُوًّا غَفُوْرًا ۝﴾

''مگر وہ مرد، عورتیں اور بچے جو واقعی بے بس ہوں اور وہ اس جگہ سے نکلنے کا کوئی وسیلہ اور کوئی راستہ نہیں پاتے، اس لیے ان لوگوں کے بارے میں امید ہے کہ اللہ انھیں معاف کر دے گا اور اللہ بہت معاف کرنے والا، نہایت بخشنے والا ہے۔'' [2]

1 الهجرة في القرآن الكريم لأحزمي سامعون جزولي، ص: 167. 2 النسآء 4:98,99.

مدینہ منورہ میں اسلامی ریاست کے اولین اقدامات

باب : 1 مسجد نبوی کی تعمیر

باب : 2 مواخات مدینہ

باب : 3 میثاقِ مدینہ

باب : 4 تعلیم وتربیت کا تسلسل

باب : 5 اصلاحات و قانون سازی

باب : 6 سنتِ مزاحمت اور جنگی مہمات کی تحریک

لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ یَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِیْهِ ؕ

''البتہ وہ مسجد جس کی بنیاد اول روز ہی سے تقوے پر رکھی گئی ہے اس کی زیادہ حق دار ہے کہ آپ اس میں کھڑے ہوں۔''

(التوبة 9:108)

وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا

''اور تم اپنے آپ پر اللہ کی اس نعمت کو یاد کرو جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے، پھر اس نے تمھارے دلوں میں الفت ڈال دی اور تم اس کے احسان سے بھائی (بھائی) بن گئے۔''

(آل عمرٰن 3:103)

رسول اللہ ﷺ مدینہ منورہ تشریف لائے تو مضبوط اور مستحکم بنیادوں پر نئی اسلامی ریاست کے قیام کی خاطر سرگرم عمل ہو گئے۔ آپ ﷺ نے ترجیحی بنیادوں پر امت کے بنیادی ستونوں کی تعمیر کا آغاز کیا۔ مسجد نبوی کی تعمیر اور مہاجرین وانصار کے مابین اسلامی بھائی چارے کا قیام، شہر میں اسلامی دستور کا نفاذ، مسلمانوں، یہود اور مشرکینِ مدینہ کے درمیان معاہدۂ امن، مملکت اسلامیہ کی حفاظت اور دفاع کے لیے اسلامی فوج کی تشکیل، نو آموز اسلامی معاشرے کی مشکلات کا حل تلاش کرنا اور اسے زندگی کے تمام مراحل میں قانونِ الٰہی کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرنا رسول اللہ ﷺ کے اہداف و مقاصد کے اہم نکات تھے۔

دوسری طرف بھی جاری رہی۔ مدنی دور میں نازل ہونے والی سورتوں یا آیات میں اللہ تعالیٰ کی عظمت کو اجاگر کیا گیا۔ کائنات کی حقیقت بتائی گئی۔ جنت کی رغبت دلائی گئی اور جہنم سے ڈرایا گیا۔ پیش آمدہ حالات کے متعلق قانون سازی کی گئی اور اسلامی ریاست جس نے اسلامی دعوت کی اشاعت اور جہاد فی سبیل اللہ میں نمایاں کردار ادا کرنا تھا، اس کے اجزائے ترکیبی کو مستحکم کیا گیا۔ اسلامی دعوت کے ارتقا، اسلامی معاشرے کی تمدنی ترقی اور ریاست کے قیام کے ساتھ ساتھ امت کا علمی اور تربیتی سفر بھی اپنے مراحل طے کرتا رہا۔ رسول اللہ ﷺ نے تجارت اور لین دین کے احکام نافذ کر کے مدینہ کے اقتصادی بحران پر قابو پایا۔ تربیت کے میدان میں مسلم معاشرے کی بنیادیں یوں استوار ہوئیں کہ روزے فرض کیے گئے اور زکاۃ کا نظام جاری کیا گیا۔ یوں مسلم معاشرہ پھلنے پھولنے لگا اور نہایت مضبوط بنیادوں پر قائم اسلامی ریاست استحکام سے ہمکنار ہو گئی۔

باب 1

مسجد نبوی کی تعمیر

رسول اللہ ﷺ نے مدینہ منورہ میں پہلا کام مسجد نبوی کی تعمیر کا کیا تاکہ اسلامی شعائر، جواب تک مخالفت کا شکار تھے، اجاگر ہوں۔ نماز کی ادائیگی کا اہتمام ہوتا کہ رب سے تعلق مضبوط ہو اور دل دنیاوی آلائشوں سے پاک ہو جائے۔[1]

امام بخاری رحمہ اللہ روایت لائے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اپنی سواری پر سوار مدینہ منورہ میں داخل ہوئے۔ لوگ آپ ﷺ کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ سواری مسجد نبوی کے مقام پر جا بیٹھی۔ ان دنوں وہاں مسلمانوں کے چند آدمی نماز پڑھا کرتے تھے۔ یہ احاطہ کھجور سکھانے کے کام آتا تھا۔ یہ جگہ سہل اور سہیل دو یتیم بچوں کی ملکیت تھی جو سیدنا اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ کی زیر کفالت تھے۔ سواری بیٹھ گئی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «هٰذَا إِنْ شَاءَ اللّٰهُ الْمَنْزِلُ» "ان شاء اللہ! یہی منزل ہے۔" پھر آپ ﷺ نے دونوں یتیم بچوں کو طلب فرمایا اور ان سے اس احاطے کی قیمت طے کرنا چاہی تاکہ وہاں مسجد کا قیام عمل میں لایا جائے۔ دونوں نے کہا: "اے اللہ کے رسول! ہم یہ جگہ مسجد کے لیے وقف کرتے ہیں۔" آپ ﷺ نے اسے وقف کے طور پر لینے سے انکار کر دیا اور ان سے یہ جگہ خرید کر ہی لی۔[2]

سیدنا انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ وہاں کھجوروں کے درخت اور مشرکین کی (چند پرانی) قبریں تھیں اور کچھ جگہ ویران تھی۔ آپ ﷺ نے کھجور کے درخت کاٹنے، قبریں اکھاڑنے

1 فقه السيرة للغزالي، ص: 191، و فقه السيرة للبوطي، ص: 151. 2 صحيح البخاري، حديث: 3906.

اور ویران جگہ کو ہموار کرنے کا حکم دیا۔ درخت کاٹ کر قبلہ رخ قطار میں نصب کر دیے گئے اور چوکھٹ کے دونوں بازو پتھر کے بنائے گئے۔ اس دوران رسول اللہ ﷺ اور صحابۂ کرام یہ رجز پڑھ رہے تھے:

اَللّٰهُمَّ لَا خَيْرَ إِلَّا خَيْرُ الْآخِرَه فَانْصُرِ الْأَنْصَارَ وَالْمُهَاجِرَه

''اے اللہ! زندگی تو بس آخرت کی زندگی ہے۔ تو انصار اور مہاجرین کی مدد فرما۔''[1]

رسول اللہ ﷺ نے اس مبارک تعمیر کی ابتدا اپنے دست مبارک سے فرمائی۔ آپ ﷺ نے کدال پکڑی اور بنیاد کھودنے کے لیے پہلی ضرب لگائی جس کے بعد تمام صحابۂ کرام سرگرمی سے مصروف عمل ہو گئے۔ تین ہاتھ گہری بنیاد کھودی گئی۔ دیواریں گارے اور کچی اینٹوں سے تیار کی گئیں جو درمیانے آدمی کے قد سے ذرا بلند تھیں۔[2] مسجد کے شمالی گوشے میں کھجور کے تنوں پر ایک چھپر کھڑا کیا گیا جس پر کھجور کی ٹہنیاں ڈالی گئیں۔ اس چھپر کو ''صفہ'' کہا جاتا تھا۔ باقی ساری مسجد بغیر چھت کے کھلی چھوڑ دی گئی۔[3]

مسجد نبوی کے تین دروازے بنائے گئے۔ ایک مسجد کی پچھلی جانب جنوبی سمت میں، دوسرا عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرے کے بالمقابل مشرقی جانب جس سے گزر کر رسول اللہ ﷺ مسجد میں آتے جاتے تھے۔ تیسرا دروازہ مغربی جانب رکھا گیا جسے باب الرحمہ یا باب عاتکہ کہا جاتا ہے۔[4]

مسجد نبوی کے پہلو میں ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کے حجرے

مسجد نبوی کے گردا گرد چند کمرے تعمیر کیے گئے تاکہ ان میں رسول اللہ ﷺ اور آپ کے اہلِ خانہ رہائش پذیر ہوں۔ یہ گھر قیصر و کسریٰ اور بادشاہوں کے محلات جیسے نہیں تھے

[1] صحيح البخاري، حديث: 428، و صحيح مسلم، حديث: 524. [2] البداية والنهاية: 303/3.
[3] البداية والنهاية: 303/3. [4] التاريخ السياسي والعسكري للدكتور علي معطي، ص: 157.

یہ تو اس ہستی کی رہائش گاہیں تھیں جو دنیا اوراس کی زیب و زینت سے کنارہ کش اور آخرت کی طلبگار تھی۔ یہ گھر بھی مسجد کی طرح کچی اینٹ، گارے اور پتھروں سے تیار کیے گئے تھے۔ ان کی چھتیں کھجور کے تنے اور ٹہنیوں کی تھیں۔ چھوٹی عمارت اور مختصر صحن پر مشتمل یہ حجرے اتنے اونچے تھے کہ لمبا لڑکا بآسانی چھتوں کو چھو سکتا تھا۔ حسن بصری رحمہ اللہ جو ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی لونڈی خیرہ کے بطن سے تھے، بتاتے ہیں کہ میں ان کمروں کی چھت چھو لیتا تھا۔ [1]

مدینہ ان دنوں بلند و بالا قلعہ نما عمارتوں پر مشتمل تھا جنھیں مدینے کی اشرافیہ نے امن کے دنوں میں فخر کے طور پر اور جنگ کے ایام میں حفاظت کی غرض سے تعمیر کیا تھا۔ انھوں نے ان قلعوں کے مختلف نام بھی رکھے ہوئے تھے، چنانچہ عبداللہ بن ابی ابن سلول کے قلعے کا نام مزاحم (مزاحمت کار) اور حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کے قلعے کا نام فارع (بلند و بالا) تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر سادگی اور عجز کا خوبصورت نمونہ تھے۔ آپ چاہتے تو بلند و بالا محلات تعمیر کروا سکتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک اشارۂ ابرو پر انصار ان کی تعمیر میں جت جاتے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ آپ ریاست کے خزانے (مال فے وغیرہ) کی مدد سے یہ محلات کھڑے کر لیتے لیکن آپ نے ایسا نہیں کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کے لیے ترکِ دنیا اور سادگی کی نہایت عظیم مثال قائم کی اور یہ سبق دیا کہ انسان اپنی ساری توانائیاں موت کے بعد پیش آنے والے حالات کو بہتر بنانے میں صرف کرے۔ [2]

مدینہ منورہ میں اذان کی ابتدا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ کیا کہ نماز کا وقت بتانے کے لیے کیا طریقہ اختیار کیا جائے۔ بعض نے نماز کے وقت علم بلند کرنے کا مشورہ دیا کہ لوگ اسے دیکھ کر نماز کے لیے آ جائیں گے۔ اس رائے پر یہ اعتراض کیا گیا کہ سونے والا اور غافل اس سے مستفید نہیں ہو سکیں گے۔ چند ایک نے کہا کہ کسی بلند ٹیلے پر آگ روشن کی جائے۔

[1] السيرة النبوية لأبي شهبة: 36/2. [2] التاريخ الإسلامي للحميدي: 13/4.

یہ رائے بھی مسترد کر دی گئی۔ دیگر افراد نے بگل بجانے کا مشورہ دیا جسے یہود نمازوں کے اوقات بتانے کے لیے استعمال کرتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے یہود کی مشابہت کے باعث یہ مشورہ رد کر دیا۔ بعض نے ناقوس بجانے کو کہا جسے نصاریٰ استعمال کرتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے اسے بھی ناپسند کیا۔ آخر یہ تجویز سامنے آئی کہ نماز کا وقت ہو تو ایک آدمی لوگوں میں جا کر پکار لگایا کرے کہ نماز کے لیے جمع ہو جاؤ۔ یہ تجویز مان لی گئی۔ پکار لگانے والوں میں عبداللہ بن زید انصاری رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔ ایک دن غنودگی کے عالم میں اُنھوں نے خواب دیکھا کہ ایک شخص ان کے سامنے آیا اور بولا: ''کیا میں آپ کو چند الفاظ نہ سکھاؤں جنھیں آپ نماز کی پکار لگاتے ہوئے کہیں؟'' عبداللہ نے جواب دیا: ''کیوں نہیں، ضرور سکھائیے۔'' اس آدمی نے کہا: ''آپ چار مرتبہ اللّٰہ أکبر، دو مرتبہ أشهد أن لا إلٰه إلا اللّٰه اور دو مرتبہ أشهد أن محمدا رسول اللّٰه، پھر دو مرتبہ حي علی الصلاة اور دو مرتبہ حي علی الفلاح، پھر دو مرتبہ اللّٰه أکبر اور پھر ایک مرتبہ لا إلٰه إلا اللّٰه کہا کریں۔''

عبداللہ رضی اللہ عنہ بیدار ہوئے تو سیدھے نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سارا خواب کہہ سنایا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: «إِنَّهَا لَرُؤْيَا حَقٌّ» ''واقعی یہ سچا خواب ہے۔'' آپ ﷺ نے عبداللہ رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ یہ الفاظ بلال رضی اللہ عنہ کو سکھا دیں۔ ان کی آواز آپ کی نسبت زیادہ بلند ہے۔ سیدنا بلال رضی اللہ عنہ جب یہ اذان دے رہے تھے تو عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ (جلدی میں) اپنی چادر گھسیٹتے ہوئے حاضر ہوئے اور عرض کیا: ''اللہ کے رسول! اللہ کی قسم! میں نے بھی خواب میں یہی دیکھا ہے۔'' [1]

سیدنا بلال بن رباح اور عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہما مؤذن مقرر ہوئے۔ رسول اللہ ﷺ

---

1 سنن أبي داود، حديث: 499، و جامع الترمذي، حديث: 189، و سنن ابن ماجه، حديث: 706، و مسند أحمد: 43/4 واللفظ له.

نے حضرت ابومحذورہ رضی اللہ عنہ کو اذان سکھائی تو فرمایا فجر کی اذان میں حی علی الفلاح کے بعد دو مرتبہ الصلاۃ خیر من النوم کہا کرو۔[1] ابتدا میں اذان بلند مقام پر کھڑے ہو کر کہی جاتی تھی۔ بعد ازاں اس مقصد کے لیے مینار معرضِ وجود میں آیا۔

مدینہ منورہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پہلا خطاب

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں پہلا خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

«أَمَّا بَعْدُ! أَيُّهَا النَّاسُ فَقَدِّمُوا لِأَنْفُسِكُمْ، تَعْلَمُنَّ وَاللّٰهِ لَيُصْعَقَنَّ أَحَدُكُمْ، ثُمَّ لَيَدَعَنَّ غَنَمَهُ لَيْسَ لَهَا رَاعٍ، ثُمَّ لَيَقُولَنَّ لَهُ رَبُّهُ لَيْسَ لَهُ تَرْجُمَانٌ وَّ لَا حَاجِبٌ يَّحْجُبُهُ دُونَهُ: أَلَمْ يَأْتِكَ رَسُولِي فَبَلَّغَكَ، وَ آتَيْتُكَ مَالًا، وَّ أَفْضَلْتُ عَلَيْكَ، فَمَا قَدَّمْتَ لِنَفْسِكَ فَلَيَنْظُرَنَّ يَمِينًا وَّشِمَالًا فَلَا يَرٰى شَيْئًا، ثُمَّ لَيَنْظُرَنَّ قُدَّامَهُ فَلَا يَرٰى غَيْرَ جَهَنَّمَ، فَمَنِ اسْتَطَاعَ أَنْ يَّقِيَ وَجْهَهُ مِنَ النَّارِ وَ لَوْ بِشِقِّ تَمْرَةٍ فَلْيَفْعَلْ، وَ مَنْ لَّمْ يَجِدْ فَبِكَلِمَةٍ طَيِّبَةٍ، فَإِنَّ بِهَا تُجْزَى الْحَسَنَةُ عَشْرَ أَمْثَالِهَا إِلٰى سَبْعِمِائَةِ ضِعْفٍ، وَالسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَ رَحْمَةُ اللّٰهِ وَ بَرَكَاتُهُ»

''اما بعد! لوگو! اپنے لیے اچھے کام کرلو۔ واللہ! تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ تم میں سے ہر ایک موت کا نشانہ بن کر رہے گا، پھر وہ اپنی بکریوں کو ضرور ایسی حالت میں چھوڑے گا کہ ان کا کوئی چرواہا نہیں ہوگا، پھر اس کا رب اس سے کہے گا جبکہ اس کا کوئی ترجمان ہوگا نہ درمیان میں کوئی پردہ حائل ہوگا: ''کیا تیرے پاس میرا رسول نہیں آیا تھا اور اس نے تجھے میرا پیغام نہیں پہنچایا تھا؟ میں نے تجھے مال دیا

[1] سنن أبي داود، حديث: 500، البانی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ دیکھیے صحیح سنن ابو داود میں مذکورہ حدیث۔

اور تجھ پر اپنا فضل کیا۔ تو نے اپنے لیے کون سے عمل آگے بھیجے؟'' وہ (بندہ) دائیں بائیں دیکھے گا لیکن کچھ نہیں پائے گا، پھر سامنے دیکھے گا اسے صرف جہنم نظر آئے گی، لہٰذا جس سے ہو سکے اپنا چہرہ آگ سے بچائے، خواہ کھجور کے ٹکڑے کے ذریعے سے جسے کھجور کا ٹکڑا بھی میسر نہ ہو وہ اچھی بات ہی کہہ دے۔ اتنی سی نیکی کا عوض بھی دس سے سات سو گنا تک ہوگا۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہ۔''[1]

آپ ﷺ لوگوں سے دوسری مرتبہ یوں مخاطب ہوئے:

«إِنَّ الْحَمْدَ لِلّٰهِ، أَحْمَدُهُ وَ أَسْتَعِينُهُ وَنَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُورِ أَنْفُسِنَا وَ سَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهُ، وَ مَنْ يُّضْلِلْ فَلَا هَادِيَ لَهُ وَ أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ. إِنَّ أَحْسَنَ الْحَدِيثِ كِتَابُ اللّٰهِ، قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَيَّنَهُ اللّٰهُ فِي قَلْبِهِ وَ أَدْخَلَهُ فِي الْإِسْلَامِ بَعْدَ الْكُفْرِ وَاخْتَارَهُ عَلٰى مَا سِوَاهُ مِنْ أَحَادِيثِ النَّاسِ إِنَّهُ أَحْسَنُ الْحَدِيثِ وَ أَبْلَغُهُ، أَحِبُّوا مَنْ أَحَبَّ اللّٰهُ، أَحِبُّوا اللّٰهَ مِنْ كُلِّ قُلُوبِكُمْ وَلَا تَمَلُّوا كَلَامَ اللّٰهِ وَ ذِكْرَهُ وَ لَا تَقْسُ عَنْهُ قُلُوبُكُمْ فَإِنَّهُ مِنْ كُلِّ مَا يَخْلُقُ اللّٰهُ يَخْتَارُ وَ يَصْطَفِي، فَقَدْ سَمَّاهُ خَيْرَتَهُ مِنَ الْأَعْمَالِ، وَ مُصْطَفَاهُ مِنَ الْعِبَادِ، وَالصَّالِحَ مِنَ الْحَدِيثِ، وَ مِنْ كُلِّ مَا أَتَى النَّاسَ مِنَ الْحَلَالِ وَالْحَرَامِ، فَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَ لَا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا وَّاتَّقُوهُ حَقَّ تُقَاتِهِ، وَاصْدُقُوا اللّٰهَ صَالِحَ مَا تَقُولُونَ بِأَفْوَاهِكُمْ، وَ تَحَابُّوا بِرَوْحِ اللّٰهِ بَيْنَكُمْ. إِنَّ اللّٰهَ يَغْضَبُ أَنْ يُّنْكَثَ

[1] السيرة النبوية لا بن هشام:146/2، و دلائل النبوة للبيهقي:524/2. روایت ضعیف ہے۔

عَهْدُهُ، وَالسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَ رَحْمَةُ اللّٰهِ وَ بَرَكَاتُهُ»

''بلاشبہ سب تعریف اللہ کے لیے ہے۔ میں اس کی حمد بیان کرتا ہوں اور اس سے مدد طلب کرتا ہوں۔ ہم اپنے نفوس کے شر اور اعمال کی برائیوں سے اللہ کی پناہ میں آتے ہیں۔ جسے اللہ ہدایت دے اسے گمراہ کرنے والا کوئی نہیں اور جسے وہ گمراہ کرے اس کا کوئی رہنما نہیں۔ اور میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ یکتا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔ بے شک بہترین بات اللہ تبارک و تعالیٰ کی بات ہے۔ اللہ نے اس کتاب کی خوبی جس کے دل میں بٹھا دی اور کفر کے بعد اسے اسلام میں داخل کر لیا اور جس نے لوگوں کی باتوں پر اس کتاب کو ترجیح دی بلاشبہ وہ فلاح پا گیا۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ بہترین اور نہایت بلیغ کلام ہے۔

جس چیز سے اللہ کو محبت ہے تم بھی اس سے محبت کرو۔ دل کی گہرائیوں سے اللہ کو چاہو۔ اللہ کے کلام اور اس کی یاد سے بیزار نہ رہو۔ تمھارے دل اس سے ہٹ کر سخت نہ ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ جن چیزوں کو پیدا کرتا ہے ان میں سے بعض کو منتخب کر لیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اچھے اعمال، اچھی باتوں اور اپنے برگزیدہ بندوں کے متعلق وضاحت سے بتا دیا ہے۔ جو اشیاء لوگوں کو دی گئی ہیں ان میں حلال بھی ہے اور حرام بھی۔ پس اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ اور اس سے یوں ڈرو جس طرح ڈرنے کا حق ہے۔ جو باتیں تم اپنے منہ سے کہتے ہو ان میں اللہ سے سچ بولو (نہایت سچائی اختیار کرو۔) اللہ کی رحمت کے سبب آپس میں ایک دوسرے سے محبت رکھو۔ اللہ اس بات سے ناراض ہوتا ہے کہ اس سے عہد شکنی کی جائے۔ والسلام علیکم۔''[1]

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 147,146/2، ودلائل النبوة للبيهقي: 525,524/2.

مسجد نبوی سے متصل اصحاب صفہ رضی اللہ عنہم کا چبوترا

مدنی زندگی کے ابتدائی سولہ مہینے بیت المقدس قبلہ رہا۔ جب بیت اللہ کو قبلہ قرار دیا گیا تو مسجد نبوی کی پچھلی جانب سابقہ قبلے کی دیوار بدستور قائم تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر سائبان ڈالنے کا حکم دیا۔ اس کا نام صفہ یا ظلہ (چھپر) رکھا گیا۔ اس چھت کے علاوہ اس کے گرد کوئی دیوار وغیرہ نہیں تھی۔ [1]

قاضی عیاض رحمہ اللہ نے لکھا: ''صفہ چھپر کو کہا جاتا ہے جو مسجد نبوی کی پچھلی جانب ڈالا گیا تھا۔ یہاں مساکین پناہ لیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں اہل صفہ کہا گیا۔'' [2]

ابن تیمیہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''مدینہ منورہ میں مسجد نبوی کی پچھلی جانب شمال کی طرف واقع جگہ ''صفہ'' کہلاتی تھی۔'' [3]

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ رقم طراز ہیں: ''صفہ مسجد نبوی کی پچھلی جانب ایک جگہ تھی جسے سائبان سے ڈھانپا گیا تھا۔ جن مسافروں کا کوئی گھر یا ٹھکانا نہ ہوتا وہ وہاں قیام کرتے تھے۔'' [4]

اصحاب صفہ رضی اللہ عنہم: سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا کہنا ہے: ''اہلِ صفہ اسلام کے مہمان تھے۔ ان کا کوئی گھر بار، مال و متاع نہیں تھا اور نہ ہی وہ کسی کی زیرِ کفالت تھے۔'' [5]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے، آپ کے ہمراہ یا آپ کے بعد ہجرت کرنے والے مہاجرین کو انصار مدینہ نے اپنے گھروں میں پناہ دی اور ان کے اخراجات بھی برداشت کیے۔ غزوۂ بدر سے پہلے تقریباً یہی انداز رہا۔ جب بعد ازاں مہاجرین کی تعداد میں اضافہ ہوا اور ان کی کفالت کرنا انصار کے بس کی بات نہ رہی تو بہت سے بے گھر لوگ آ کر صفہ میں قیام پذیر

---

1 وفاء الوفاء للسمهودي: 321/1. 2 نظام الحكومة النبوية لعبد الحي الكتاني: 474/1.
3 الفتاوى لابن تيمية: 38/11. 4 فتح الباري، شرح الحديث: 3581. 5 صحيح البخاري، حديث: 6452.

ہو گئے۔ [1]

اسلام جب اپنی حقانیت کے سبب پھیلنے لگا اور لوگ گروہ در گروہ دائرۂ اسلام میں داخل ہونے لگے تو فقراء، اغنیاء، خاندانوں کے خاندان اور دیگر افراد مدینہ پہنچے۔ اگر کسی کو رہائش میسر نہ آتی تو وہ مسجد نبوی میں مقامِ صفہ میں قیام کرتا۔ [2]

جیسے ہی کوئی مہاجر مدینہ پہنچتا اور رسول اللہ ﷺ سے ملاقات کرتا، آپ ﷺ اسے کسی انصاری کی کفالت میں دے دیتے۔ وقتی طور پر اگر کوئی انتظام نہ ہو پاتا تو وہ صفہ میں قیام کرتا۔ [3]

عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کا بیان ہے: ''رسول اللہ ﷺ مدینہ میں بہت مصروف ہوتے تھے۔ جب کوئی مہاجر آتا تو اسے ہم میں سے کسی کی کفالت میں دے دیتے جو اسے قرآن کی تعلیم دیتا۔ مجھے بھی ایک مہاجر کا کفیل بنایا گیا۔ میں اسے قرآن پڑھاتا اور اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ کھانے میں بھی شریک کرتا۔'' [4]

صفہ میں سب سے پہلے مہاجرین قیام پذیر ہوئے تھے، اس لیے اسے صفة المهاجرين کہا گیا۔ [5] مسلمان ہو کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونے والے پردیسی لوگوں کے وفود بھی یہاں قیام کیا کرتے تھے۔

اسی طرح کوئی مسلمان مدینہ پہنچتا اور وہاں اس کا کوئی جاننے والا نہ ہوتا تو وہ بھی صفہ میں قیام کرتا۔ [6]

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ صفہ میں ٹھہرنے والے تمام مستقل یا عارضی قیام پذیر افراد کے واقف کار تھے۔ نبی ﷺ نے جب کبھی اصحاب صفہ کی دعوت کرنا ہوتی ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو پیغام

---

1 السيرة النبوية لصالح الشامي، ص: 175. 2 الفتاوى لابن تيمية: 41,40/11. 3 السيرة النبوية لصالح الشامي، ص: 175. 4 مسند أحمد: 324/5. 5 وفاء الوفاء للسمهودي: 323/1.
6 السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري: 259,258/1.

بھیج دیتے تو وہ انھیں بلا لاتے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اصحاب صفہ کی شخصیات اور ریاضت و عبادت میں ان کے مراتب سے بھی بخوبی آگاہ تھے۔[1]

مہاجرین کے علاوہ بعض انصار بھی علم کے حصول، زہد، مجاہدے اور فقیرانہ زندگی کے شوق میں وہاں قیام پذیر تھے، حالانکہ مدینہ میں ان کے اپنے گھر موجود تھے۔ کعب بن مالک انصاری، غسیل الملائکہ حنظلہ بن ابی عامر انصاری اور حارثہ بن نعمان انصاری رضی اللہ عنہم جیسے صحابۂ کرام ان افراد میں شامل تھے۔[2]

اہل صفہ کے اخراجات اور ان کے لیے نبی ﷺ اور صحابہ کرام کی سرپرستی:

رسول اللہ ﷺ بنفس نفیس اہل صفہ کی خبر گیری کیا کرتے تھے۔ آپ ﷺ ان سے ملاقات کرتے، ان کے حالات دریافت کرتے اور ان کے مریضوں کی بیمار پرسی کے لیے جاتے۔ آپ ﷺ اکثر ان کے درمیان بیٹھا کرتے، ان کی رہنمائی کیا کرتے، دلجوئی کرتے، تعلیم دیتے، نصیحت کرتے، تلاوتِ قرآن اور اس کی تعلیم و تعلم کی رغبت دلاتے، ذکر اور فکرِ آخرت کا درس دیتے تھے۔[3]

اہلِ صفہ کے اخراجات پورے کرنے کے لیے رسول اللہ ﷺ کے پاس حسبِ ذیل وسائل تھے:

① صدقے کی کوئی چیز آتی تو آپ ﷺ ان کی طرف بھیج دیتے۔ تحفہ آتا تو اس میں سے خود بھی لیتے اور انھیں بھی بھیجتے۔[4]

② بسا اوقات رسول اللہ ﷺ انھیں اپنے گھر میں کھانے پر مدعو کرتے۔ آپ ﷺ ان سے کبھی تغافل نہ برتتے اور ان کے طعام و قیام کی فکر کرتے تھے۔ عبدالرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: ''اصحابِ صفہ ضرورت مند لوگ تھے۔ ایک دفعہ نبی ﷺ نے فرمایا: «مَنْ كَانَ

[1] السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري:259/1. [2] السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري:259/1. [3] السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري:266/1. [4] صحيح البخاري، حديث:6452.

عِنْدَهُ طَعَامُ اثْنَيْنِ فَلْيَذْهَبْ بِثَالِثٍ، وَ مَنْ كَانَ عِنْدَهُ طَعَامُ أَرْبَعَةٍ فَلْيَذْهَبْ بِخَامِسٍ أَوْ بِسَادِسٍ» ''جس کے پاس دو آدمیوں کا کھانا ہو وہ تیسرے کو اور جس کے پاس چار آدمیوں کا کھانا ہو وہ پانچویں یا چھٹے کو اپنے ساتھ شریک کرے۔'' ابوبکر رضی اللہ عنہ تین جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اصحابِ صفہ میں سے دس آدمیوں کو اپنے ہمراہ لے گئے۔[1]

یعیش بن طخفہ بن قیس غفاری رضی اللہ عنہ کا بیان ہے: ''میرے والد بھی اصحابِ صفہ میں سے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن سب کو جمع کیا اور ایک ایک دو دو کر کے لوگوں کے ساتھ روانہ کر دیا۔ میرے والد کہتے ہیں: ''ہم پانچ آدمی باقی بچ گئے۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «اِنْطَلِقُوا» ''چلو!'' ''ہم سب آپ کے ہمراہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر چلے گئے۔''[2]

③ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں سے کہتے تھے کہ وہ اپنے صدقات اصحابِ صفہ کو بھیجا کریں۔ روایت ہے کہ جب حسن رضی اللہ عنہ پیدا ہوئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فاطمہ رضی اللہ عنہا سے کہا کہ اس کا سر مونڈ دو اور بالوں کے برابر چاندی اہل صفہ پر صدقہ کرو۔[3]

④ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اصحابِ صفہ کی ضروریات ہمیشہ مقدم رکھتے تھے۔ ایک دفعہ چند قیدی آئے۔ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک خادم طلب کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا: «وَاللّٰهِ! لَاأُعْطِيكُمَا وَ أَدَعُ أَهْلَ الصُّفَّةِ تُطْوٰى بُطُونُهُمْ مِّنَ الْجُوعِ، لَا أَجِدُ مَا أُنْفِقُ عَلَيْهِمْ، وَ لٰكِنْ أَبِيعُهُمْ وَ أُنْفِقُ عَلَيْهِمْ أَثْمَانَهُمْ» ''اللہ کی قسم! اہلِ صفہ فاقے کر رہے ہیں اور میرے پاس ان پر خرچ کرنے کے لیے کچھ نہیں، اس لیے تمھیں خادم نہیں ملے گا۔ میں قیدیوں کو فروخت کروں گا اور ان کی قیمت سے اہلِ صفہ کے اخراجات پورے کروں گا۔''[4]

⑤ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو اہلِ صفہ پر صدقہ کرنے کی وصیت کی تھی، چنانچہ وہ

---

[1] صحيح البخاري، حديث: 3581، وصحيح مسلم، حديث: 2057. [2] مسند أحمد: 430,429/3، ومسند الطيالسي، حديث: 1339. [3] مسند أحمد: 391,390/6. [4] صحيح البخاري، حديث: 3113، و مسند أحمد: 106/1.

حسبِ استطاعت اہلِ صفہ سے صلہ رحمی کرتے اور صاحبِ حیثیت لوگ ان کے لیے کھانے کا انتظام کرتے تھے۔[1]

اہلِ صفہ کا علم، عبادت اور جہاد کے لیے وقف ہونا: اہل صفہ مسجد نبوی میں عبادت کرنے میں مشغول رہتے تھے۔ دنیا سے بے رغبتی ان کے مزاج کا حصہ تھی اور فقیرانہ زندگی سے انھیں الفت تھی۔ وہ خلوتوں میں نوافل پڑھتے، قرآن کی تلاوت کرتے، آیاتِ الٰہی پر غور وفکر کرتے اور اللہ کے ذکر میں مصروف رہتے تھے۔ بعض لکھنا پڑھنا بھی سیکھتے تھے۔ ان میں سے کسی نے عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کو اپنی کمان تحفے کے طور پر پیش کی تھی کیونکہ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ انھیں قرآن پڑھاتے اور لکھنا پڑھنا سکھاتے تھے۔[2]

ان میں سے چند افراد نے علم اور حفظِ حدیث کے میدان میں غیر معمولی ناموری حاصل کی۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کثرت سے احادیث بیان کرنے میں معروف ہوئے۔ حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہما نے فتنوں کی احادیث از بر کر رکھی تھیں۔

اصحاب صفہ جہاد فی سبیل اللہ میں بھی شرکت کرتے تھے۔ صفوان ابن بیضاء، خریم بن فاتک اسدی، خبیب بن یساف، سالم بن عمیر اور حارثہ بن نعمان رضی اللہ عنہم بدر میں شہادت سے سرفراز ہوئے۔ غسیل الملائکہ حنظلہ رضی اللہ عنہ نے احد میں جامِ شہادت نوش کیا۔ جرہد بن خویلد اور ابو سریحہ غفاری رضی اللہ عنہ حدیبیہ میں شریک ہوئے۔[3]

ثقیف بن عمرو خیبر میں، عبداللہ ذوالبجادین تبوک میں اور سالم مولیٰ ابی حذیفہ (ابوحذیفہ کے آزاد کردہ غلام) اور زید بن خطاب رضی اللہ عنہم جنگ یمامہ میں شہید ہوئے۔ یہ لوگ اگر زاہد اور شب زندہ دار تھے تو میدانِ کارزار کے شہسوار بھی تھے۔[4]

[1] حلية الأولياء لأبي نعيم: 340/1و 378، و السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري: 267/1. [2] سنن أبي داود، حديث: 3416. [3] حلية الأولياء لأبي نعيم: 353/1-357. [4] السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري: 264/1.

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ جیسے بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم شوقیہ طور پر بھی اصحاب صفہ کے ساتھ رہتے تھے۔ وہ فتح خیبر کے بعد 7ھ میں مدینہ آئے تھے۔ ان کی کوشش تھی کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں زیادہ سے زیادہ وقت گزاریں اور تاخیر سے مدینہ آنے کی وجہ سے جو علمی کمی رہ گئی تھی اسے پورا کریں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیادہ سے زیادہ باتیں سننا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے رہن سہن اور حال احوال سے واقفیت بہم پہنچانا اور آپ کی خدمت کر کے دنیا و آخرت کی برکات سمیٹنا تبھی ممکن تھا جب وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کے قریب رہتے اور صفہ ہی وہ واحد جگہ تھی جو اس مقصد کے حصول کے لیے موزوں ترین تھی۔

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا اپنا بیان ہے: ''آپ لوگ کہتے ہیں کہ ابوہریرہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بہت حدیثیں بیان کرتا ہے، جبکہ مہاجرین و انصار اتنی روایات بیان نہیں کرتے۔ بات دراصل یہ ہے کہ میرے مہاجر بھائی بازاروں میں تجارت کی غرض سے مصروف رہتے تھے، میں قوتِ لایموت پر گزارا کرتا اور رسول اللہ کی صحبت میں رہتا، چنانچہ لوگ غیر حاضر ہوتے مگر میں حاضر ہوتا۔ وہ بھول جاتے مگر میں یاد رکھتا۔ میرے انصاری بھائی اپنے کھیتوں کھلیانوں کی دیکھ بھال میں مشغول رہتے اور میں ٹھہرا مساکین صفہ میں سے ایک مسکین۔ میرے پاس تھا بھی کیا جس کی میں فکر کرتا، اس لیے لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں بھول جاتے اور مجھے یاد رہ جاتیں۔''[1]

گویا سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اختیار کرنے کے لیے اصحاب صفہ کے ساتھ رہتے تھے، حالانکہ مدینہ میں ان کا اپنا گھر موجود تھا جہاں ان کی والدہ بھی رہتی تھیں جن کی ہدایت کے لیے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دعا کی درخواست بھی کی تھی۔[2]

یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بالکل ہی مفلوک الحال و نادار نہیں

[1] صحيح البخاري، حديث:2047، وصحيح مسلم، حديث:2492. [2] صحيح مسلم، حديث: 2491، و مسند أحمد:320/2.

تھے۔ وہ خیبر سے مدینہ آئے تو پہلے ہی دن نبی ﷺ نے انھیں مالِ غنیمت سے بکریوں کا ایک ریوڑ دیا تھا۔ ایک خدمت گار غلام بھی ان کے ہمراہ تھا۔ وہ چاہتے تو صفہ میں قیام نہ کرتے لیکن وہ نبی ﷺ کی صحبت میں رہ کر آپ ﷺ کے فرامین سے فیض یاب ہونا چاہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے فقیرانہ زندگی اختیار کی۔[1]

اہلِ صفہ کی تعداد میں نت نئے حالات کے پیشِ نظر کمی بیشی ہوتی رہتی تھی۔ کسی کو گھر میسر آ گیا تو کوئی شادی کر لیتا۔ کوئی آسودہ حال ہو گیا تو کسی کو شہادت مل جاتی۔ ان کے فقر و فاقہ کا سبب یہ نہیں تھا کہ وہ محنت کرنے سے جی چراتے تھے۔ زمخشری نے لکھا ہے کہ اہلِ صفہ دن میں کھجور کی گٹھلیاں کوٹ کر معاش کا بندوبست کیا کرتے تھے۔[2]

اہل صفہ کی تعداد: اصحاب صفہ کی تعداد حسبِ حالت کم و بیش ہوتی رہتی تھی۔ مدینہ میں وفود آتے تو ان کی تعداد بڑھ جاتی اور جب مہمان کم ہوتے تو تعداد بھی کم ہو جاتی۔ عام طور پر ان کی تعداد ستر کے قریب رہتی تھی۔[3]

بعض اوقات اصحابِ صفہ کی تعداد بہت زیادہ ہو جاتی، یہاں تک کہ اکیلے سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ اسّی آدمیوں کی مہمانی کرتے۔ دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مہمان بننے والے افراد ان کے علاوہ ہوتے۔[4]

اصحاب صفہ رضی اللہ عنہم کے اسمائے گرامی: اصحاب صفہ کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں:

① ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ، جنھوں نے اپنے شوق سے اصحاب صفہ کی صحبت اختیار کر رکھی تھی۔

② ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ، یہ بھی اپنی مرضی سے صفہ میں رہتے تھے۔

③ واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ۔

④ قیس بن طخفہ غفاری رضی اللہ عنہ، یہ بھی اپنی خوشی سے وہاں ٹھہرے۔

---

1 السيرة النبوية لصالح الشامي، ص: 184. 2 المدينة النبوية لمحمد حسن شرّاب: 222/1.
3 حلية الأولياء لأبي نعيم: 339/1-341. 4 حلية الأولياء لأبي نعيم: 341/1.

⑤ کعب بن مالک انصاری رضی اللہ عنہ۔

⑥ سعید بن عامر بن حذیم جمحی رضی اللہ عنہ۔

⑦ سلمان فارسی رضی اللہ عنہ۔

⑧ اسماء بن حارثہ بن سعید اسلمی رضی اللہ عنہ۔

⑨ حنظلہ بن ابی عامر انصاری غسیل الملائکہ رضی اللہ عنہ۔

⑩ حازم بن حرملہ رضی اللہ عنہ۔

⑪ حارثہ بن نعمان انصاری نجاری رضی اللہ عنہ۔

⑫ حذیفہ بن اَسِید ابو سریحہ انصاری رضی اللہ عنہ۔

⑬ حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہما۔

⑭ جاریہ بن حُمیل بن نُشبہ بن قرط رضی اللہ عنہ۔

⑮ جعیل بن سراقہ ضمری رضی اللہ عنہ۔

⑯ جرہد بن خویلد اسدی رضی اللہ عنہ۔

⑰ ابولبابہ رفاعہ انصاری رضی اللہ عنہ۔

⑱ عبداللہ ذوالبجادین رضی اللہ عنہ۔

⑲ دکین بن سعید مزنی یا خثعمی رضی اللہ عنہ۔

⑳ خبیب بن یساف بن عنبہ رضی اللہ عنہ۔

㉑ خُریم بن اوس طائی رضی اللہ عنہ۔

㉒ خُریم بن فاتک اسدی رضی اللہ عنہ۔

㉓ خُنیس بن حذافہ سہمی رضی اللہ عنہ۔

㉔ خبّاب بن ارتّ رضی اللہ عنہ۔

㉕ حکم بن عمیر ثُمالی رضی اللہ عنہ۔

㉖ حرملہ بن ایاس یا حرملہ بن عبداللہ عنبری رضی اللہ عنہ۔

㉗ زید بن خطاب رضی اللہ عنہ۔

㉘ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ۔

㉙ طفاوی دوسی رضی اللہ عنہ۔

㉚ طلحہ بن عمرو نضری رضی اللہ عنہ۔

㉛ صفوان ابن بیضاء فہری رضی اللہ عنہ۔

㉜ صہیب بن سنان رومی رضی اللہ عنہ۔

㉝ شداد بن اسید رضی اللہ عنہ۔

㉞ شقران رضی اللہ عنہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام۔

㉟ سائب بن خلاد رضی اللہ عنہ۔

㊱ سالم بن عمیر اوسی جو بنو ثعلبہ بن عمرو بن عوف سے تعلق رکھتے تھے۔

㊲ سالم بن عبید اشجعی رضی اللہ عنہ۔

㊳ سالم رضی اللہ عنہ، یہ ابو حذیفہ رضی اللہ عنہ کے آزاد کردہ غلام ہیں۔

㊴ سفینہ رضی اللہ عنہ، یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام ہیں۔

㊵ ابو رزین رضی اللہ عنہ۔

㊶ اغر مزنی رضی اللہ عنہ۔

㊶ بلال بن رباح رضی اللہ عنہ۔

㊸ براء بن مالک رضی اللہ عنہ۔

㊹ ثوبان رضی اللہ عنہ، یہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام ہیں۔

㊺ ثابت بن ودیعہ انصاری رضی اللہ عنہ۔

㊻ ثقف بن عمرو بن سمیط اسدی رضی اللہ عنہ۔

(47) سعد بن مالک ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ۔

(48) عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ۔

(49) غرفہ ازدی رضی اللہ عنہ۔

(50) عبدالرحمٰن بن قُرط رضی اللہ عنہ۔

(51) عبادہ بن خالد غفاری رضی اللہ عنہ۔ [1]

بعض ٹیڑھے صوفیاء نے اہلِ صفہ کے طرزِ عمل کو دلیل بنا کر معاش کی تگ و دو ترک کردی اور رہبانیت و گوشہ نشینی کی زندگی اختیار کرلی، حالانکہ ان کا یہ استدلال بالکل غلط ہے۔ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ جو صفہ کے اراکین میں سے تھے، ہمیشہ صفہ میں نہیں رہے۔ انھوں نے زندگی کی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لیا۔ وہ عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں بحرین کے گورنر مقرر ہوئے۔ ان کی طبیعت میں کوئی کھردراپن یا خشکی نہیں تھی۔ [2] اہلِ صفہ مردمیدان اور مجاہد لوگ تھے۔ ان میں سے چند ایک نے جامِ شہادت بھی نوش کیا۔

فوائد ومسائل، اخلاقی اسباق اور اہم نکات

اسلامی معاشرے میں مسجد کا کردار

اسلامی معاشرے کی عمارت میں مساجد کی حیثیت مضبوط ستون کی ہے۔ اسلامی معاشرے کی پختگی اور یکجہتی کا انحصار اسلامی نظام اختیار کرنے، عقیدۂ توحید اپنانے اور اسلامی آداب کو دائرۂ عمل میں لانے پر ہے۔ یہ خصوصیات مسجد کی روحانی فضا ہی میں پروان چڑھتی ہیں۔ [3] اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿لَا تَقُمْ فِيهِ أَبَدًا ۚ لَمَسْجِدٌ أُسِّسَ عَلَى التَّقْوَىٰ مِنْ أَوَّلِ يَوْمٍ أَحَقُّ أَن

---

[1] السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري: 263/1. [2] السيرة النبوية لصالح الشامي، ص: 188,186. [3] فقه السيرة للبوطي، ص: 203.

﴿تَقُوْمَ فِيْهِ ۚ فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ۚ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ ○﴾

''(اے نبی!) آپ اس مسجد (ضرار) میں کبھی بھی کھڑے نہ ہوں، البتہ وہ مسجد جس کی بنیاد اول روز ہی سے تقوے پر رکھی گئی ہے اس کی زیادہ حق دار ہے کہ آپ اس میں کھڑے ہوں۔ اس میں ایسے لوگ ہیں جو (اس بات کو) پسند کرتے ہیں کہ وہ پاک صاف ہوں اور اللہ پاک صاف رہنے والوں کو پسند کرتا ہے۔''[1]

ایک اور موقع پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿فِيْ بُيُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ يُسَبِّحُ لَهٗ فِيْهَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ○ رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ يَخَافُوْنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيْهِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ ○ لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَيَزِيْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ؕ وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ○﴾

''یہ (چراغ اور قندیلیں) ان گھروں میں ہیں (جن کی بابت) اللہ نے حکم دیا ہے کہ ان کو بلند کیا جائے اور ان میں اللہ کا نام ذکر کیا جائے (اور) وہ وہاں صبح و شام اس کی تسبیح کرتے ہیں، وہ لوگ جنھیں تجارت اور خرید وفروخت، اللہ کے ذکر اور نماز قائم کرنے اور زکاۃ دینے سے غافل نہیں کرتی، وہ اس دن سے ڈرتے ہیں جس میں دل اور آنکھیں الٹ پلٹ جائیں گے، (وہ یہ کام کرتے ہیں) تاکہ اللہ انھیں ان کے اعمال کی بہترین جزا دے اور انھیں اپنے فضل سے زیادہ دے اور اللہ جسے چاہے بے حساب رزق دیتا ہے۔''[2]

مسجد اسلامی جامعیت کی علامت ہے

مسجد کا قیام نماز ادا کرنے، اللہ کا ذکر کرنے، اس کی تسبیح و تقدیس بیان کرنے اور اس

[1] التوبة 9:108. [2] النور 24:36-38.

کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے کے لیے عمل میں آتا ہے۔ مسلمان وہاں نماز پڑھتا اور دیگر عبادات بجالاتا ہے۔ جب تک وہ مسجد کا تقدس ملحوظ خاطر رکھے اور اس کے احترام کا حق ادا کرتا رہے، کوئی اسے گزند نہیں پہنچا سکتا۔

❁ مسجد نبوی کے قیام کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ وہ نبی ﷺ اور صحابۂ کرام کے لیے ملاقات کا مرکز ہو اور بیرونِ مدینہ سے آنے والے بھی یہیں رسول اللہ ﷺ سے ملاقات کریں۔ [1]

❁ مسجد نبوی اس لیے بھی قائم کی گئی کہ وہ ان عقلی و نقلی علوم کی یونیورسٹی ثابت ہو جن کے متعلق قرآن کریم میں غور وخوض کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اور وہ ایسا مدرسہ بنے جس میں اہل ایمان اسلامی احکامات کی تعلیم و تعلم کا سلسلہ جاری کریں، نیز دنیا کے ہر گوشے سے تشنگانِ علم اس ادارے میں پہنچیں اور علمی پیاس بجھائیں، پھر واپس جا کر اپنی قوم کو اللہ کی طرف بلائیں اور یہ سلسلہ نسل در نسل چلتا رہے۔

❁ مسجد نبوی کے قیام کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ اجنبی مسافر کسی کا احسان لینے کے بجائے وہاں قیام کرے اور اپنی عقلی ونفسیاتی استعداد کے مطابق رشد و ہدایت کی کرنوں سے بہرہ ور ہو اور اسے کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ کتنے ہی عظیم لیڈر اس ادارے کے فیض یافتہ ہوئے اور اس کی دیواروں کے سایے تلے ان کے جوہر کھلے۔ اس کی آغوش میں کتنے ہی علماء علم کا سمندر بنے، پھر لوگوں کی علمی پیاس بجھاتے رہے۔ داعی اور مبلغین وہاں سے دعوت الی اللہ کا سبق سیکھ کر نکلے اور دنیائے اسلام کے داعیوں اور مبلغین کے لیے اسوہ (Role Model) بنے۔ ایسا بھی ہوتا کہ اکھڑ مزاج، کھردرا اور ان پڑھ اعرابی (بدو) اس مسجد میں آتا، صحابہ کرام کو نبی ﷺ کے گرد حلقہ بنائے دیکھتا کہ وہ آپ کی باتیں سر جھکائے غور سے سن رہے ہیں گویا ان کے سروں پر پرندے بیٹھے ہیں وہ بدو بھی ان کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی باتیں سماعت کرتا۔ جاہلیت کے پردوں میں چھپی عقل سے پردہ ہٹ جاتا، وہ دین کی سمجھ حاصل

[1] محمد رسول اللہ ﷺ لصادق عرجون: 33/3.

کرتا اور ہدایت و روشنی پاتا، پھر وہ واپس اپنی قوم کے پاس جاتا، اپنے علم و کردار کی قوت سے ان کی تربیت کرتا، سب لوگ اس کی دعوت پر ایمان لے آتے، اس کی رہنمائی میں اسلام کے راستے پر چلتے اور تاریخ اسلامی کی کتب میں اپنے لیے سنہری سطریں تحریر کرا لیتے۔[1]

❁ مسجد نبوی کی حیثیت ایک قلعے کی تھی جہاں مجاہدین جہاد پر روانگی سے قبل جمع ہوتے، یہیں قائدین کے لیے جہادی عَلَم باندھے جاتے جن کے زیر سایہ اللہ کے سپاہی فتح یا شہادت کی طلب میں روانہ ہوتے تھے۔

❁ مسجد نبوی سے ہسپتال کی خدمات بھی لی جاتی تھیں۔ وہاں زخمی مجاہدین کا علاج کیا جاتا۔ نبی ﷺ ان کی عیادت کو گاہے گاہے وہاں تشریف لاتے اور ان کے لیے دوا دارو کا بندوبست کرتے۔

❁ مسجد نبوی پیغام رساں ادارے کا کام بھی دیتی تھی۔ یہاں سے خبریں اور خطوط ارسال کیے جاتے۔ صلح یا جنگ کی سیاسی خبریں بھی یہیں موصول ہوتی تھیں۔ کمک کی طلب یا فتح و نصرت کے پیغامات بھی یہیں ملتے۔ شہید ہونے والے افراد کے ناموں کا اعلان بھی یہیں کیا جاتا تھا۔

❁ مسجد نبوی رصد گاہ کا کام بھی دیتی تھی جہاں سے دشمن کی حرکات و سکنات کا پتا چلتا تھا۔ خاص طور پر یہود، منافقین اور ان مشرکین کی سرگرمیوں کا جائزہ لیا جاتا تھا جو شرک میں ڈوبے ہوئے تھے اور اسے چھوڑنا ان کے بس میں نہیں تھا۔ اس نگرانی اور خبر گیری کا یہ فائدہ ہوتا تھا کہ مسلمان ایسے لوگوں کی تدابیر اور مکر و فریب سے محفوظ رہنے اور ان کی طرف سے عہد شکنی یا خیانت کا شکار ہونے سے بچ جاتے۔[2]

رسول اللہ ﷺ مدینہ منورہ تشریف لائے تو اولین فرصت میں مسجد تعمیر کی تاکہ ان تمام مقاصد کا حصول بآسانی ممکن ہو اور گھروں کی تعمیر میں لوگ سادگی کے اس نمونے کی پیروی کریں۔[3]

---

[1] محمد رسول اللہ ﷺ لصادق عرجون: 35,34/3. [2] محمد رسول اللہ ﷺ لصادق عرجون: 36-34/3. [3] محمد رسول اللہ ﷺ لصادق عرجون: 33/3.

کردار کے ذریعے سے تعلیم وتربیت

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ نبی ﷺ نے صحابۂ کرام کے ہمراہ مسجد نبوی کی تعمیر میں عملی طور پر حصہ لیا۔ آپ ﷺ اپنے سینے اور کندھوں پر پتھر اور اینٹیں ڈھوتے اور عام لوگوں کے ساتھ مل کر ہاتھوں سے زمین کھودتے تھے۔ یوں آپ ﷺ نے حاکمِ عادل کی ایک خوبصورت مثال قائم کی۔ ایک ایسا حاکم جو امیر و مامور، قائد و کارکن اور غنی وفقیر میں کوئی فرق روا نہیں رکھتا۔ اللہ کے حضور سبھی ایک ہیں۔ ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان پر سوائے تقویٰ کے اور کوئی فضیلت حاصل نہیں۔ اسلام عدل اور مساوات کا نام ہے۔ بلند درجہ اس شخص کو حاصل ہے جو رفاہ عامہ کے کاموں میں مال د متاع خرچ کرتا ہے۔ اسی بلند درجے سے اللہ کا ثواب وابستہ ہے۔ نبی ﷺ بھی دیگر مسلمانوں کی طرح اللہ کے ثواب ہی کے طلبگار تھے۔ [1]

رسول اللہ ﷺ نے عام لوگوں کی طرح مسجد کی تعمیر میں حصہ لیا۔ صرف یہ نہیں کہ ریشمی فیتہ کاٹنے یا کدال کی افتتاحی ضرب لگانے پر اکتفا کیا ہو بلکہ عملی طور پر تعمیر میں حصہ لیا۔ رسول اللہ ﷺ مٹی میں لت پت تھے۔ مسلمان آپ کو دیکھ کر حیران ہو رہے تھے۔

سیدنا اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ یہ منظر دیکھ کر آگے بڑھے تاکہ آپ کا بوجھ اٹھا لیں اور عرض کی: ''اے اللہ کے رسول! یہ پتھر مجھے دے دیجیے۔'' نبی ﷺ نے جواب دیا: «اِذْهَبْ فَاحْتَمِلْ غَيْرَهُ، فَإِنَّكَ لَسْتَ بِأَفْقَرَ إِلَى اللّٰهِ مِنِّي» ''آپ مجھ سے بڑھ کر اللہ کی رحمت کے محتاج نہیں، آپ دوسرا پتھر پکڑ لیں۔'' [2] یہ جواب سن کر مسلمان زیادہ تندہی سے تعمیر کے کام میں مصروف ہو گئے۔ [3]

---

[1] التاريخ السياسي والعسكري للدكتور علي معطي، ص: 158. [2] سبل الهدىٰ والرشاد للصالحي: 337/3. [3] التاريخ السياسي والعسكري للدكتور علي معطي، ص: 158.

یہ اپنی نوعیت کا انوکھا طرز عمل ہے جس کی نظیر دنیا میں نہیں ملتی۔ دیکھنے میں آیا ہے کہ حکمران طبقے کے افراد کبھی کبھار عام لوگوں کے ساتھ صرف اس وقت کام میں شریک ہوتے ہیں جب ٹیلی ویژن اور دیگر ذرائع ابلاغ انھیں کوریج دینے کو تیار ہوں تاکہ لوگ ان کے اخلاق و انکسار کے گن گائیں۔ ادھر نبی کریم ﷺ کو اپنا بوجھ کسی اور کے سر ڈالنا گوارا نہیں تھا اور نہ دکھاوا مقصود تھا بلکہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں بھی اللہ کی رحمت کا محتاج اور اس کے ثواب کا امیدوار ہوں۔ مسجد کی تعمیر میں صحابۂ کرام نے رسول اللہ ﷺ سے گہری ہم آہنگی کا مظاہرہ کیا۔ کام کے دوران وہ درج ذیل رجزیہ اشعار گنگناتے رہتے تھے:

لَئِنْ قَعَدْنَا وَالنَّبِيُّ يَعْمَلُ　　لَذَاكَ مِنَّا الْعَمَلُ الْمُضَلَّلُ

''رسول اللہ ﷺ کام کریں اور ہم بیٹھے رہیں تو یہ ایک گمراہ کن عمل ہوگا۔''[1]

یہ عملی تربیت خالی خولی وعظ یا چرب زبانی سے نہیں ہوتی۔ اس کے لیے عمل پیہم کی زندہ مثال قائم کرنا ضروری ہوتا ہے۔ مکہ کی ہولناک فضاؤں میں ایسی مثال قائم کرنا ناممکن تھا جہاں مسلمان شدید دباؤ کا شکار تھے۔ یہ مثال اس نئے معاشرے اور جدید ریاست ہی میں قائم ہوسکی۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کام میں مصروف ہوتے اور ہم آہنگ ہوکر پکارتے:

اَللّٰهُمَّ! إِنَّهُ لَا خَيْرَ إِلَّا خَيْرُ الْآخِرَه　　فَانْصُرِ الْأَنْصَارَ وَالْمُهَاجِرَه

''اے اللہ! آخرت کی زندگی ہی اصل زندگی ہے تو انصار و مہاجرین کی مدد فرما۔''

وہ یک زبان ہوکر کہتے:

لَئِنْ قَعَدْنَا وَالنَّبِيُّ يَعْمَلُ　　لَذَاكَ مِنَّا الْعَمَلُ الْمُضَلَّلُ

''رسول اللہ ﷺ کام کریں اور ہم بیٹھے رہیں تو یہ ایک گمراہ کن عمل ہوگا۔''

1 السيرة النبوية لابن هشام:1/496، و فتح الباري، شرح الحديث:3906.

تیسری آواز یہ تھی:

هٰذَا الْحِمَالُ لَاحِمَالَ خَيْبَرْ   هٰذَا أَبَرُّ لِرَبِّنَا وَأَطْهَرْ

''یہاں ہم جو کچھ اٹھا رہے ہیں وہ (تجارت کی) ان اشیاء سے مختلف ہے جو خیبر سے لائی جاتی ہیں۔ یہ ہمارے رب کے نزدیک ان اشیاء سے بہتر اور زیادہ پاکیزہ ہے۔''[1]

دراصل کھجور اور منقیٰ جو بطور تجارت خیبر سے مدینہ لایا جاتا، مدینہ میں اس کی بڑی قدر تھی لیکن اب خیبر سے کھجور اور منقیٰ اٹھا لانے کے بجائے ان اینٹوں کا تذکرہ ہونے لگا جو مسجد نبوی کی تعمیر کے لیے اٹھائی جاتی تھیں، گویا لوگوں نے یقین کرلیا تھا:

﴿مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللهِ بَاقٍ﴾

''جو کچھ تمھارے پاس ہے وہ فنا ہو جائے گا اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ (ہمیشہ) باقی رہنے والا ہے۔''[2]

چوتھا نعرہ یہ تھا:

لَا يَسْتَوِي مَنْ يَعْمُرُ الْمَسَاجِدَا   يَدْأَبُ فِيهَا قَائِمًا وَّقَاعِدًا

وَمَنْ يُّرٰى عَنِ الْغُبَارِ حَائِدًا

''مساجد تعمیر کرنے والے اور ان میں ہمیشہ قیام وقعود کرنے والے اور مٹی سے بچنے کے لیے دور بھاگنے والے برابر نہیں ہیں۔''[3]

کارکنان کے تجربے اور پیشہ ورانہ مہارت کی پہچان

طلق بن علی یمامی حنفی رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے، انھوں نے بتایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مسجد نبوی کی تعمیر میں حصہ لیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: «قَرِّبُوا الْيَمَامِيَّ مِنَ

[1] صحيح البخاري، حديث: 3906 و 3932، والسيرة النبوية لابن هشام: 25/3. [2] النحل 96:16. [3] فتح الباري، شرح الحديث: 3906، والسيرة النبوية لابن هشام: 142/2.

الطِّينِ، فَإِنَّهُ أَحْسَنُكُمْ لَهُ مَسِيسًا» ''یمامی کو گارے کے قریب کرو۔ یہ تم لوگوں سے اچھا گارا بناتا ہے۔''[1] ایک اور روایت میں ہے: طلق بن علی یمامی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم مسجد نبوی کی تعمیر میں مصروف تھے۔ مجھے محسوس ہوتا تھا کہ آپ کو ان کا کام پسند نہیں آ رہا، میں نے بیلچا اٹھایا اور گارا ملانے لگا۔ آپ کو میرا کام پسند آیا تو فرمایا کہ گارے کا کام حنفی کے سپرد کرو یہ تم لوگوں سے بہتر گارا بناتا ہے۔''[2]

ابن حبان طلق کی روایت لائے ہیں کہ انھوں نے کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا: ''کیا میں بھی ان کی طرح پتھر ڈھوؤں؟'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''نہیں! تم گارے کا کام سنبھالو کیونکہ تم اس کے ماہر ہو۔''[3]

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں نووارد کو اہمیت دی جو نو مسلم بھی تھا اور گارے کے کام میں اس کے تجربے سے فائدہ اٹھایا۔ آپ کے اس طرزِ عمل سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ ہنرمند افراد کی صلاحیتوں کو سراہنے کے ساتھ ساتھ ان سے استفادہ بھی کریں۔ مذکورہ حدیث سے اس کے متعلق بھی بابرکت نبوی رہنمائی ملتی ہے کہ ایسے ہنر مند افراد سے کیسا معاملہ کیا جائے۔ آج ہمیں اس گہری سمجھ بوجھ کی ضرورت بھی بہت ہے۔[4]

اذان اسلامی ریاست کا شعار

اذان پہلی عالمی اسلامی ریاست کا شعار ہے۔ اللّٰہ أکبر کا مطلب ہے کہ اللہ تمام سرکشوں اور اقامت دین کے راستے میں رکاوٹ ڈالنے والوں سے برتر ہے۔ وہ اپنا کام کر کے رہتا ہے۔ أشهد أن لا إلٰه إلا اللّٰه کا مطلب یہ ہے کہ حاکمیت، سیادت اور اختیار صرف اللہ رب العالمین کا ہے۔ فرمان باری تعالیٰ ہے: ﴿إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ﴾ ''حاکمیت صرف

---

1 مجمع الزوائد: 9/2. 2 المعجم الكبير للطبراني، حديث: 8254، و مجمع الزوائد: 9/2.
3 صحيح ابن حبان، رقم: 1122. 4 التربية القيادية للدكتور الغضبان: 252/2.

اللہ کی ہے۔" چنانچہ لا إلٰہ إلا اللّٰہ کے معنی یہ ہوئے کہ حاکم اور شارع صرف اللہ ہے۔

أشھد أن محمدا رسول اللّٰہ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے محمد ﷺ کو قیادت عطا فرمائی ہے جسے ان سے کوئی نہیں چھین سکتا۔ یہ الفاظ اس امر کا اعتراف ہیں کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں، امت مسلمہ کی دینی و دنیاوی قیادت آپ ﷺ کے ہاتھ میں ہے اور زندگی کے ہر معاملے میں آپ ہی کی بات قولِ فیصل مانی جائے گی۔ [1]

حی علی الصلاۃ، حی علی الفلاح کا مطلب یہ ہے کہ اے انسان! اسلامی ریاست کے جھنڈے تلے آ جاؤ جو اللہ کے لیے مخلص ہے اور اعلیٰ اخلاقی قدروں کی بنیاد پر مسلمان کا اپنے رب اور دیگر مسلمانوں کے ساتھ تعلق مضبوط کرنا اس کے اہداف میں شامل ہے۔

قد قامت الصلاۃ کا مطلب یہ ہے کہ نماز کو جملہ عبادات پر فوقیت حاصل ہے کیونکہ یہ دین کا ستون ہے۔ اس میں رکوع و سجود اور قیام جیسے ارکان عبادت کا بڑا روپ ہیں۔ ان ارکان میں عبادت اپنے وسیع ترین مفہوم کے ساتھ آ گئی ہے۔

عبادت کے مفہوم میں خشوع و خضوع، عجز و انکسار، درماندگی اور جھکاؤ کے مطالب شامل ہیں۔ نماز میں ایسا انکسار پایا جاتا ہے جس سے اوپر کوئی انکسار نہیں۔ اللہ کی اطاعت کا ہر وہ عمل عبادت ہے جو خشوع و خضوع اور عجز و انکسار کے طور پر انجام دیا جائے۔ اس کی صورت حال وہی ہے جس میں غلام اپنے آقا کی اطاعت کرتا ہے اور عجز و انکسار اور اطاعت کے جذبات دل میں بسائے اس کے حضور خود سپردگی کے عالم میں دست بستہ کھڑا ہوتا ہے۔ کتاب اللہ میں مرقوم ہے:

﴿قُلْ اِنِّیْ نُهِیْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَمَّا جَآءَنِیَ الْبَیِّنٰتُ مِنْ رَّبِّیْ وَ اُمِرْتُ اَنْ اُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۝﴾

[1] دولة الرسول من التكوين إلى التمكين للدكتور كامل سلامة، ص:438.

''آپ کہہ دیجیے: بے شک مجھے اس سے روک دیا گیا ہے کہ میں ان کی عبادت کروں جنھیں تم اللہ کے سوا پکارتے ہو جبکہ میرے پاس میرے رب کی طرف سے واضح نشانیاں آگئیں اور مجھے یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں رب العالمین کا فرماں بردار رہوں۔''[1]

اذان کے الفاظ اسلامی ریاست کا شعار بنے، یہ ریاست کو اللہ کی حاکمیت اور شریعت کی بالادستی سے جوڑتے ہیں۔ یہ الفاظ طاغوت اور اس کے نظام کے اختتام کا اعلان کرتے ہیں۔ حی علی الفلاح اور قد قامت الصلاۃ سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ نماز کا کماحقہ اہتمام اسلامی ریاست کے زیر سایہ ہی ممکن ہے۔ مسلمان مکہ کی گھاٹیوں میں چھپ کر نمازیں پڑھا کرتے تھے۔ انصار کے تعاون سے اس اسلامی ریاست کا قیام عمل میں آیا تو کھلے عام اذان و اقامت کہی جانے لگی اور لوگ بلا خوف و خطر رب العالمین کے حضور سربسجود ہوئے۔

تاریخی حقائق سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کا حق صرف اور صرف ایک مضبوط ریاست کے زیر سایہ ہی ادا ہوسکتا ہے جو رعایا کو دشمنوں کی ریشہ دوانیوں سے محفوظ رکھے۔

اذان کے الفاظ دہرانے سے مقصود یہ ہے کہ اس کے مطالب کی تاکید ہو۔[2]

ہمیں اذان اور اس کے معانی کے فہم و ادراک کی بہت ضرورت ہے تاکہ ہم اس کی عملی تصویر بن کر اللہ کے راستے میں جہاد کریں اور کفر کے نعرے مٹا کر ایمان کے نعرے بلند کریں۔ توحید کی بنیاد پر اسلامی ریاست قائم ہو اور قوانین الٰہی نافذ العمل ہوں۔

مساجد کو چونا گچ کرنے اور اُن کی تزئین و آرائش کا شرعی حکم

علمائے کرام نے مساجد کو چونے وغیرہ سے پلستر کرنے کی اجازت دی ہے اور اسے اچھا عمل قرار دیا ہے۔ حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما نے مسجد نبوی کو از سرنو پختہ انداز

[1] المؤمن 40:66. [2] دولة الرسول من التكوين إلى التمكين للدكتور كامل سلامة، ص: 439.

سے تعمیر کیا اور اس کی توسیع و تزئین بھی کی تھی۔

مساجد میں نقش و نگار بنانے کو جمہور علماء نے مکروہ جانا ہے۔ بعض نے اس عمل کو حرام قرار دیا ہے اور بعض اس کے مکروہ تنزیہی ہونے کے قائل ہیں، البتہ یہ دونوں فریق اس بات پر متفق ہیں کہ مساجد کی تعمیر کے لیے خاص فنڈ نقش و نگار اور تزئین و آرائش کے لیے استعمال کرنا جائز نہیں ہے۔[1]

سب سے پہلے مساجد کی زیبائش ولید بن عبدالملک نے کی تھی۔ اس دن سے لوگ مساجد کی تزئین و آرائش میں مبالغہ آرائی سے کام لے رہے ہیں، حتی کہ بعض مساجد نے عجائب گھروں اور سیر گاہوں کی صورت اختیار کر لی ہے۔ یہ صورت حال رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات سے لگا نہیں کھاتی۔[2]

آج کل مساجد کی تعمیر و ترقی کے ذمے دار اپنی پوری کوشش اُن کی تزئین و آرائش اور نقش و نگار بنانے میں صرف کرتے نظر آتے ہیں۔ جو ایک بڑی غلطی ہے۔ مسجد میں آنے والا بندگی کے تقاضے بھول کر جدید اندازِ تعمیر اور زیبائش و آرائش میں کھو جاتا ہے۔ فقراء و مساکین بھی دنیاوی جھمیلوں سے نکل کر کہیں پناہ حاصل نہیں کر سکتے۔ پہلے لوگ مساجد کا رخ کرتے اور دنیا کے تفکرات سے پیچھا چھڑا کر اللہ کی یاد اور فکرِ آخرت میں لگے رہتے تھے۔ مساجد میں دنیاوی شان و شوکت کا ایسا سامان فراہم ہو چکا ہے جو مساجد میں بھی اس طبقے کی حوصلہ شکنی کرنے اور اسے کم مائیگی کا احساس دلانے کے لیے کافی ہے۔ مسلمانوں کی حالت قابل رحم ہے کہ وہ اسلامی حقائق پسِ پشت ڈال کر ایسے مناظر میں کھو چکے ہیں جو بظاہر تو دین سے متعلق ہیں لیکن در پردہ دنیا اُن میں اپنی پوری حشر سامانیوں کے ساتھ موجود ہے۔[3]

---

1 فقه السيرة للبوطي، ص: 145. 2 السيرة النبوية لأبي شهبة: 33/2. 3 فقه السيرة للبوطي، ص: 146.

مسجد نبوی کے فضائل

نبی ﷺ نے مسجد نبوی کے فضائل بیان کیے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے دل اس مسجد میں اٹکے رہتے تھے۔ ان فضائل کی تلخیص ذیل میں پیش کی جاتی ہے:

مسجد نبوی کی بنیاد تقوی پر: ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں رسول اللہ ﷺ کے ہاں آیا اور سوال کیا: ''اے اللہ کے رسول! وہ کون سی مسجد ہے جس کی تاسیس تقوی پر ہوئی؟'' اس پر آپ ﷺ نے کنکریوں کی مٹھی بھری اور زمین پر مارتے ہوئے کہا: «هُوَ مَسْجِدُكُمْ هٰذَا» ''وہ آپ کی یہ مسجد ہے۔''[1]

بعض علمائے کرام نے اُن احادیث میں کلام کیا ہے جن کے مطابق مسجد نبوی ہی وہ مسجد ہے جس کی تاسیس تقویٰ پر ہوئی تھی۔ اُن کا کہنا ہے کہ یہ احادیث قرآن کی اس آیت کے خلاف ہیں:

﴿لَا تَقُمْ فِيْهِ اَبَدًا ۭ لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ ۭ فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ ○﴾

''(اے نبی!) آپ اس مسجد (ضرار) میں کبھی بھی کھڑے نہ ہوں، البتہ وہ مسجد جس کی بنیاد اول روز ہی سے تقوے پر رکھی گئی ہے اس کی زیادہ حق دار ہے کہ آپ اس میں کھڑے ہوں۔ اس میں ایسے لوگ ہیں جو (اس بات کو) پسند کرتے ہیں کہ وہ پاک صاف ہوں اور اللہ پاک صاف رہنے والوں کو پسند کرتا ہے۔''[2]

سورۂ توبہ کی اس آیت میں تقویٰ پر قائم ہونے والی مسجد سے مراد کے بارے میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ وہ مسجد نبوی ہے اور بعض کہتے ہیں کہ وہ مسجد قباء ہے۔ طبری رحمہ اللہ نے علماء کے اقوال درج کر کے لکھا: ''میرے نزدیک راجح قول

---

[1] صحيح مسلم، حديث: 1398، و جامع الترمذي، حديث: 3099، و مسند أحمد: 8/3، و السنن الكبرىٰ للنسائي: 36/2. [2] التوبة 108:9.

یہ ہے کہ اس مسجد سے مراد ''مسجد نبوی'' ہے کیونکہ یہ صحیح روایت سے ثابت ہے۔''[1]

درحقیقت یہ حدیث اور آیت کی اس تفسیر کے درمیان کہ تقویٰ کی بنیاد پر قائم ہونے والی مسجد ''مسجد قباء'' ہے، کوئی اختلاف نہیں۔[2] شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے لکھا: ''آیت مسجد قباء کے بارے میں نازل ہوئی تھی لیکن اس سے مراد مسجد قباء بھی ہے اور اس سے زیادہ تقوی کی حامل مسجد نبوی بھی۔ یہ صفت دونوں مساجد پر صادق آتی ہے۔ یوں وہ حدیث بھی صحیح سلامت رہتی ہے جو صحیح سند سے ثابت ہے جس میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''وہ میری یہ مسجد ہے۔''[3]

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ ایک اور موقع پر لکھتے ہیں: ''تو معلوم ہوا کہ دونوں مسجدیں تقویٰ پر قائم ہوئی ہیں۔ لیکن مسجد نبوی اس وصف میں زیادہ کامل ہے، چنانچہ وہ اس نام کی حق دار بھی مسجد قباء سے بڑھ کر ہے۔ ہاں نزولِ آیت کا سبب مسجد قباء ہی ہے۔''[4]

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ رقم طراز ہیں: ''نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنی مسجد کے لیے تقویٰ پر قائم ہونے کی صفت بیان کرنا دراصل اس خیال کی نفی تھی کہ یہ وصف صرف مسجد قباء میں پایا جاتا ہے۔''[5]

مسجد نبوی میں نماز ادا کرنے کی فضیلت: ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انھوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «صَلَاةٌ فِي مَسْجِدِي هٰذَا خَيْرٌ مِّنْ أَلْفِ صَلَاةٍ فِيمَا سِوَاهُ إِلَّا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ» ''میری مسجد میں پڑھی ہوئی نماز مسجد حرام کے سوا کہیں بھی پڑھی ہوئی ایک ہزار نمازوں سے افضل ہے۔''[6]

مسجد نبوی تین مساجد میں سے ایک ہے: سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «لَا تُشَدُّ الرِّحَالُ إِلَّا إِلٰى ثَلَاثَةِ مَسَاجِدَ: اَلْمَسْجِدِ الْحَرَامِ، وَمَسْجِدِ الرَّسُولِ، وَمَسْجِدِ الْأَقْصٰى» ''کجاوے باندھ کر (حصولِ برکت

---

[1] تفسير الطبري:14/476-479. [2] الأحاديث الواردة في فضائل المدينة لصالح الرفاعي، ص: 372. [3] منهاج السنة النبوية لابن تيمية: 7/74. [4] الفتاوٰی لا بن تيمية:27/406. [5] فتح الباري: 7/245. [6] صحيح البخاري، حديث: 1190، و صحيح مسلم، حديث:(507,506)- 1394.

اور زیادتِ ثواب کی نیت سے) صرف تین مساجد کا سفر کیا جا سکتا ہے: مسجد حرام، مسجد نبوی اور مسجد اقصیٰ۔"[1]

جنت کا ایک باغ: سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: «مَا بَيْنَ بَيْتِي وَ مِنْبَرِي رَوْضَةٌ مِّنْ رِّيَاضِ الْجَنَّةِ، وَ مِنْبَرِي عَلٰى حَوْضِي» "میرے گھر اور منبر کی درمیانی جگہ جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے اور میرا منبر حوض پر ہوگا۔"[2]

مسجد نبوی میں تعلیم و تعلم کی فضیلت: سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا: «مَنْ دَخَلَ مَسْجِدَنَا هٰذَا لِيَتَعَلَّمَ خَيْرًا أَوْ لِيُعَلِّمَهُ، كَانَ كَالْمُجَاهِدِ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ، وَ مَنْ دَخَلَهُ لِغَيْرِ ذٰلِكَ كَانَ كَالنَّاظِرِ إِلٰى مَا لَيْسَ لَهُ» "جو شخص ہماری اس مسجد میں آیا اور بھلائی کی بات سیکھی یا سکھلائی وہ (مقام و مرتبے میں) مجاہد فی سبیل اللہ کی طرح ہے۔ اور جو کسی اور غرض سے آیا وہ اُس شخص کی طرح ہے جو ایسی شے پر نگاہ ڈالتا ہے جو اُس کی نہیں۔"[3]

اہل صفہ اور حاجت مند مہاجرین کے متعلق نازل ہونے والی آیت

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي

---

[1] صحيح البخاري، حديث: 1189، و صحيح مسلم، حديث: (511)-1397. [2] صحيح البخاري، حديث: 1196، و صحيح مسلم، حديث: 1391. [3] سنن ابن ماجه، حديث: 227، و مسند أحمد: 350/2، و المستدرك للحاكم: 91/1.

وضاحت: جو شخص مسجد نبوی میں داخل ہو اور کسی قسم کی بھلائی کی بات نہ سیکھے اور نہ سکھائے تو اس کی مثال اس شخص کی طرح ہے جو بازار میں داخل ہوتا ہے، نہ تو کچھ خریدتا ہے اور نہ کچھ بیچتا ہے بلکہ لوگوں کا سامان دیکھ کر چلا جاتا ہے۔ اس سے اسے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔ دیکھیے: (حاشية السندي علی سنن ابن ماجة: 211/1)

الْأَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ أَغْنِيَاءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِيمَاهُمْ لَا يَسْأَلُونَ النَّاسَ إِلْحَافًا ۗ وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ ﴾

''(صدقات تو) ان ضرورت مندوں کے لیے ہیں جو اللہ کے کاموں میں ایسے مشغول ہوں کہ (اپنے روزگار کے لیے) زمین میں دوڑ دھوپ نہ کر سکتے ہوں، ناواقف شخص ان کے سوال نہ کرنے کی وجہ سے انھیں مال دار خیال کرے، تم انھیں ان کے چہروں سے پہچان لو گے، وہ لوگوں سے چمٹ کر سوال نہیں کرتے اور تم اپنے مال میں سے جو کچھ خرچ کرتے ہو، بے شک اللہ اسے خوب جاننے والا ہے۔''[1]

ابن سعد رحمہ اللہ اپنی سند سے ابن کعب قرظی سے روایت کرتے ہیں کہ ''فقراء'' (حاجت مندوں) سے مراد اصحابِ صفہ ہیں۔''[2]

امام طبری رحمہ اللہ مجاہد اور سدی کا قول نقل کرتے ہیں کہ آیت کا مصداق حاجت مند مہاجرین ہیں۔[3]

دیگر کئی احکامات بھی مسجد نبوی کی تعمیر سے متعلق ہیں جن میں یتیموں کے حقوق کی پاسداری، پرانی قبریں اکھاڑنا اور زمین پاک صاف ہوجائے تو وہاں مسجد کے قیام کا جواز وغیرہ شامل ہیں۔ طوالت کے خوف سے انھی فوائد و مسائل اور اخلاقی اسباق کے تذکرے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

[1] البقرة2:273. [2] الطبقات الكبرىٰ لابن سعد:255/1. [3] تفسير الطبري:591/5.

باب 2

مواخاتِ مدینہ

نبی ﷺ نے امت مسلمہ اور اسلامی ریاست کی ترقی کے لیے جو پروگرام مرتب کیا اُس میں دعوت توحید جاری رکھنا، قرآن کی راہنمائی میں آگے بڑھنا، مسجد نبوی کی تعمیر اور مہاجرین و انصار کے درمیان بھائی چارے کا قیام شامل تھا۔ مواخات کا عمل ایک ایسا اقدام تھا جو اہمیت میں مسجد نبوی کی تعمیر سے کم نہ تھا۔ اس کا مقصد اسلامی معاشرے میں باہمی الفت کو فروغ دینا اور اس جدید ڈھانچے کے خدوخال اجاگر کرنا تھا۔[1]

صحابۂ کرام کے درمیان عام بھائی چارے کا ماحول تو مکی دور میں دعوت اسلامی کے آغاز ہی سے پیدا ہو چکا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے ہر اس حرکت سے منع کر رکھا تھا جو اہلِ اسلام کی صفوں میں انتشار پھیلنے اور حسد و بغض پیدا ہونے کا سبب بنے۔ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: «لَا تَبَاغَضُوا، وَ لَا تَحَاسَدُوا، وَ لَا تَدَابَرُوا، وَ كُونُوا عِبَادَ اللّٰهِ إِخْوَانًا، وَ لَا يَحِلُّ لِمُسْلِمٍ أَنْ يَهْجُرَ أَخَاهُ فَوْقَ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ» ''آپس میں بغض اور حسد نہ رکھو۔ ایک دوسرے سے چہرہ مت پھیرو۔ اور اے اللہ کے بندو! بھائی بھائی بن جاؤ۔ اور کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ تین دن سے زیادہ اپنے (مسلمان) بھائی سے ناراض رہے۔''[2]

ایک اور موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا: «اَلْمُسْلِمُ أَخُو الْمُسْلِمِ، لَا يَظْلِمُهُ

---

[1] الإدارة الإسلامية في عصر عمر بن الخطاب للدكتور مجد لاوي، ص:53,52. [2] صحيح البخاري، حديث:6065و6076، وصحيح مسلم، حديث:2559.

وَلَا يُسْلِمُهُ، وَمَنْ كَانَ فِي حَاجَةِ أَخِيهِ، كَانَ اللّٰهُ فِي حَاجَتِهِ، وَ مَنْ فَرَّجَ عَنْ مُّسْلِمٍ كُرْبَةً، فَرَّجَ اللّٰهُ عَنْهُ كُرْبَةً مِّنْ كُرُبَاتِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ، وَمَنْ سَتَرَ مُسْلِمًا سَتَرَهُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ» ''مسلمان مسلمان کا بھائی ہے۔ وہ اس پر ظلم نہیں کرتا، نہ اسے دشمن کے سپرد کرتا ہے۔ جو اپنے بھائی کی ضرورت پوری کرے اللہ اس کی ضرورت پوری کرتا ہے۔ اور جو مسلمان اپنے بھائی کو کسی مشکل سے نکالتا ہے اللہ تعالیٰ اسے روز قیامت کی مشکلات میں سے کسی مشکل سے نکالے گا۔ اور جو اپنے بھائی کے عیبوں پر پردہ ڈالے اللہ قیامت کے دن اس کے عیبوں پر پردہ ڈالے گا۔''[1]

خود قرآن کریم نے ابنائے امت کے درمیان اخوت اور بھائی چارے کی ضرورت پر زور دیا ہے چنانچہ فرمان باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۚ وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ۗ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ﴾

''اور سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لو اور جدا جدا نہ ہو اور تم اپنے آپ پر اللہ کی اس نعمت کو یاد کرو جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے، پھر اس نے تمھارے دلوں میں الفت ڈال دی اور تم اس کے احسان سے بھائی (بھائی) بن گئے۔ اور تم آگ کے گڑھے کے کنارے پر تھے، پھر اس نے تمھیں اس میں گرنے سے بچا لیا، اللہ تعالیٰ اسی طرح تمھارے لیے اپنی آیتیں بیان کرتا ہے شاید کہ تم ہدایت پاؤ۔''[2]

ایک اور موقع پر فرمایا:

[1] صحيح البخاري، حديث:2442، و صحيح مسلم، حديث:2580. [2] آل عمرٰن 3:103.

﴿وَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ ۚ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ ۚ اِنَّهٗ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ﴾

''اور اس نے ان (مومنوں) کے دلوں میں الفت ڈال دی اگر آپ دنیا بھر کے سب خزانے خرچ کر دیتے تو بھی ان کے دلوں میں الفت پیدا نہ کر سکتے لیکن اللہ ہی نے ان میں الفت ڈالی۔ بے شک وہ زبردست (اور) خوب حکمت والا ہے۔''[1]

ان آیات میں عام طور پر قائم ہونے والی مواخات کا تذکرہ تھا۔ مدنی دور میں قائم ہونے والی مواخات خاص تھی جو شرعی حکم کے تحت تھی اور اس کے نتیجے میں اہل ایمان پر کچھ حقوق و فرائض عائد ہوتے جن کی اہمیت تمام مسلمانوں کے عام حقوق و فرائض سے کہیں زیادہ تھی۔[2]

بعض علمائے کرام اس خاص مواخات کا وجود عہد مکی میں بھی ثابت کرتے ہیں۔ بلاذری رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ نبی ﷺ نے ہجرت سے قبل مکہ میں مسلمانوں کے مابین حق اور غمخواری کی بنیاد پر مواخات قائم کی تھی، چنانچہ آپ ﷺ نے ایک طرف حمزہ اور زید بن حارثہ رضی اللہ عنہما، ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما اور عثمان اور عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہما کو مواخات کی لڑی میں پرو دیا۔ دوسری طرف زبیر بن عوام اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما، عبیدہ بن حارث اور بلال حبشی رضی اللہ عنہما اور مصعب بن عمیر اور سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہما کو بھائی بھائی بنایا۔ ابوعبیدہ بن جراح اور سالم مولیٰ ابی حذیفہ رضی اللہ عنہما اور سعید بن زید بن عمرو بن نفیل اور طلحہ بن عبیداللہ رضی اللہ عنہما اور خود اپنے اور علی رضی اللہ عنہ کے درمیان اخوت کے تعلقات قائم کیے۔''[3]

بلاذری (المتوفی 276ھ) وہ پہلے فرد ہیں جنھوں نے مکی مواخات کا تذکرہ کیا ہے۔ بعد ازاں علامہ ابن عبدالبر (المتوفی 463ھ) نے بھی اُن کا نام لیے بغیر مکی مواخات کا ذکر

---

1 الأنفال 8:63. 2 السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري: 240/1. 3 أنساب الأشراف للبلاذري: 270/1، والسيرة النبوية لابن هشام: 2/150-152.

کیا اور ان دونوں ائمہ کے بعد ابن سید الناس نے بلاذری یا ابن عبدالبر کا حوالہ دیے بغیر مکی زندگی کی مواخات کے بارے میں لکھا ہے۔[1]

امام حاکم نے جمیع بن عمیر کی سند سے ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت نقل کی کہ انھوں نے بتایا: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکر و عمر، طلحہ و زبیر، عبدالرحمٰن بن عوف اور حضرت عثمان میں سے ہر دو کے درمیان بھائی چارہ قائم کر دیا تھا۔''[2] اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی یہ روایت نقل کی ہے: ''نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے زبیر اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما کے درمیان مواخات کا رشتہ قائم کیا تھا۔''[3]

ابن قیم اور ابن کثیر رحمہ اللہ مواخات مکہ کے قائل نہیں۔ ابن قیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں مہاجرین کو مواخات کے رشتے میں گانٹھا تھا۔ علی رضی اللہ عنہ کو آپ نے اپنا بھائی بنایا تھا اور جو مواخات مدینہ میں ہوئی وہ دوسری مواخات تھی، جبکہ درست یہ ہے کہ مواخات کا سلسلہ صرف ایک دفعہ مدینہ میں پیش آیا تھا۔ مہاجرین کو وطن اور اسلام کی اخوت اور خون کے رشتوں کی وجہ سے آپس میں مواخات کی ضرورت نہیں تھی۔''[4]

ابن کثیر رحمہ اللہ نے تحریر کیا: ''ابن قیم رحمہ اللہ کی بیان کردہ علّت کے باعث علمائے کرام نے مکی بھائی چارے کی روایت کو درست نہیں مانا۔''[5]

فن سیرت پر لکھی جانے والی بنیادی کتب میں مکہ کی مواخات کا تذکرہ نہیں ملتا۔ بلاذری نے «قالوا» (مورخین کا کہنا ہے) کے لفظ سے یہ روایت نقل کی ہے۔ یہ انداز اس کے ضعیف ہونے کی چغلی کھاتا ہے۔ خود بلاذری کو بھی ناقدین حدیث نے ضعیف قرار دیا ہے۔ بالفرض اس مواخات کے وقوع کو صحیح تسلیم کر بھی لیا جائے تو یہ مواخات ایک

[1] السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري: 1/240. [2] المستدرك للحاكم: 3/314.
[3] المستدرك للحاكم: 3/314. [4] زاد المعاد: 2/79. [5] السيرة النبوية لابن كثير، ص: 228.

دوسرے کی مدد اور خیر خواہی پر قائم ہوئی تھی۔ اس کے نتیجے میں بھائی چارے کے زمرے میں آنے والے افراد کو ایک دوسرے کی وراثت کے حقوق حاصل نہیں ہوتے تھے۔ [1]

مدینہ منورہ میں باقاعدہ مواخات کا اہتمام

مواخات کے نظام نے امت کو یکجا کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ تعلق مکمل بھائی چارے کی مضبوط بنیادوں پر استوار کیا جس نے جاہلیت کے تعصّبات مٹادیے۔ اب غیرت وحمیت صرف اسلام کے لیے تھی۔ خون، رنگ ونسل اور وطن کے امتیازات ختم ہوگئے۔ اسلام کی نظر میں ترقی وتنزلی کا معیار تقویٰ اور انسانیت ٹھہرا۔

رسول اللہ ﷺ نے اس بھائی چارے کو ایک نافذ العمل معاہدے کی شکل دی تھی۔ یہ خالی خولی الفاظ کی سوداگری نہیں تھی۔ اس عمل کے ڈانڈے جان و مال کی قربانی سے ملے ہوئے تھے۔ یہ حروف سپاس نہیں تھے جو بارہا زبانوں پر جاری ہوتے ہیں لیکن اُن میں کوئی تاثیر نہیں ہوتی۔ مواخات کے اس عظیم عمل میں ایثار و قربانی اور محبت و ہمدردی کے بیش قیمت جذبات کی آمیزش تھی جس نے جدید اسلامی معاشرے کو عمدہ طرز عمل کے بہترین نمونوں سے بھر دیا تھا۔ [2]

مہاجرین و انصار کے درمیان قائم ہونے والی مواخات کی تقویت کا باعث وہ دین تھا جو انھوں نے دل و جان سے اختیار کیا تھا۔ اس دین کا پہلا سبق یہ تھا کہ جو کہو وہ کر کے بھی دکھاؤ۔ اس دین نے ایمان اور عمل دونوں کی یکساں تعلیم دی۔ وہ لوگ معاشرے میں رائج کھوکھلے نعروں سے کوسوں دور تھے۔ اُن کی حالت وہی تھی جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے کیا ہے:

﴿إِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِينَ إِذَا دُعُوٓا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ أَن يَقُولُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا ۚ وَأُولَٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝﴾

”بس مومنوں کی تو بات ہی یہ ہے جب وہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلائے

1 السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري: 241/1. 2 فقه السيرة للغزالي، ص: 194,193.

جاتے ہیں تاکہ وہ ان کے مابین فیصلہ کرے تو وہ کہتے ہیں: ہم نے سنا اور اطاعت کی اور وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔'' [1]

مسلمان جب علم وعمل کی تصویر بنے تو یہ اخوت مضبوط اور دیرپا ثابت ہوئی اور اس کی بدولت اللہ کے دین اور اس کے نبی ﷺ کو تقویت ملی جس کے مثبت اثرات دعوت دین کے تمام مراحل میں نمایاں طور پر نظر آئے۔ مواخات کا خوش کن اثر اس وقت بھی ظاہر ہوا جب نبی مکرم ﷺ کی وفات کے بعد سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ چنا گیا تھا۔ انصار کو اُن کے نفوس نے اس بات کی اجازت نہیں دی کہ وہ غلبے اور تسلط کے فطری جذبات اور حکمرانی کی خواہش کے زیر اثر امت کا شیرازہ بکھیرنے کا باعث بنیں، چنانچہ جلد ہی صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کی خلافت پر مہاجرین وانصار کے دونوں گروہوں کا اتفاق ہوگیا۔

مواخات مدینہ کا عمل ایک عظیم تر سیاسی سوچ کا نتیجہ تھا جس سے رسول اللہ ﷺ نے مہاجرین وانصار کے دلوں میں الفت ڈال دی اور اُن کے اندر محبت کے جذبات راسخ کردیے۔ صحابۂ کرام نے بھی اس بے مثال بھائی چارے اور الفت ومحبت کے سلسلے کو دوام بخشنے کے لیے انتھک محنت کی بلکہ وہ مواخات کی شقوں پر عمل درآمد کرنے اور کرانے کے لیے ایک دوسرے پر سبقت کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ [2]

اس عمل میں انصار کا کردار بہت نمایاں تھا جسے بیان کرنے میں سیرت نگاروں نے زبان وبیان کی سحر آفرینیوں سے کیسا ہی فائدہ اٹھایا ہو لیکن وہ اس دلکشی اور جمال آفرینی کو نہیں پاسکے جو اللہ تعالیٰ کے بیان میں ہے: [3]

﴿ وَالَّذِيْنَ تَبَوَّءُو الدَّارَ وَالْإِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ إِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ أُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى أَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۚ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ ﴾

---

[1] النور 51:24. [2] فصول في السيرة النبوية لعبد المنعم السيد، ص:200. [3] هجرة الرسول و صحابته في القرآن والسنة لأحمد عبد الغني، ص:245.

''اور (مالِ فَے ان کے لیے ہے) جنھوں نے (مدینہ کو) گھر بنا لیا تھا اور ان (مہاجرین) سے پہلے ایمان لا چکے تھے، وہ (انصار) ان سے محبت کرتے ہیں جو ان کی طرف ہجرت کرے اور وہ اپنے دلوں میں اس (مال) کی کوئی حاجت نہیں پاتے جو ان (مہاجرین) کو دیا جائے اور اپنی ذات پر (ان کو) ترجیح دیتے ہیں اگرچہ خود انھیں سخت ضرورت ہو اور جو کوئی اپنے نفس کے لالچ سے بچا لیا گیا تو وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔''[1]

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے انصار کے حق میں پانچ باتوں کی شہادت دی ہے:

① انصار کا مہاجرین کی آمد سے قبل مدینہ میں جگہ بنانا اور ایمان لانا۔

② مہاجرین کے لیے محبت کے جذبات۔

③ مہاجرین کو جو کچھ دیا جائے انصار اس کی حاجت نہیں پاتے یا ان کے دلوں میں اس سے حسد پیدا نہیں ہوتا۔

④ مہاجرین کو اپنی ذات پر ترجیح دینا گو خود تنگی کا سامنا کرنا پڑے۔

⑤ یہ لوگ اپنے نفوس کے لالچ سے محفوظ رکھے گئے ہیں۔ نتیجتاً یہ فلاح پانے والے ہیں۔[2]

یہ آیت سبق آموز اور حکمت بھری باتوں سے پر ہے جن میں سے چند ایک کی تفصیل حسبِ ذیل ہے:

① مدینہ منورہ کو الدّار یعنی خاص گھر کے لفظ سے اس لیے تعبیر کیا گیا کہ اس امر کا اظہار ہو کہ یہ وہاں کے باشندوں اور بیرون شہر سے آ کر رہائش اختیار کرنے والے ہر فرد کا ذاتی گھر ہے جس کے اندر امن و امان اور صلح و آشتی کا دور دورہ ہوتا ہے۔ الدار کے لفظ سے اس امر کے اظہار میں ایک نوع کی نفسانی طمانیت کا احساس پایا جاتا ہے۔ انصار اپنے اس گھر میں ایمان کی دولت سے مالا مال امن و امان اور مادی استحکام کی زندگی گزار رہے

[1] الحشر 59:9. [2] التربية القيادية للدكتور الغضبان: 284/2.

تھے۔ان پر سکینت نازل ہو رہی تھی جس نے انھیں اپنے نور کے ہالے میں لے رکھا تھا۔ رحمت کی چار دیواری ان کے ارد گرد قائم تھی جس کے ہوتے ہوئے انھیں کوئی خطرہ نہیں تھا اور نہ پریشانی و اضطراب ہی وہاں دم مارتے تھے۔

② ﴿مِنْ قَبْلِهِمْ﴾ میں هُمْ کی ضمیر سے مراد مہاجرین ہیں۔مطلب یہ ہے کہ انصار نے مہاجرین کی آمد سے قبل مدینہ منورہ کو گھر بنایا اور ایمان لائے۔اگرچہ مہاجرین ان سے پہلے مسلمان ہوئے لیکن انصار کی طرح انھیں کوئی ایسا گھر نصیب نہ ہوا تھا جس میں مادی استحکام نصیب ہو اور وہ دشمن کے حملوں سے اپنے جان و مال اور ایمان کو محفوظ سمجھتے ہوں۔مہاجرین نے ایمان اپنایا تھا لیکن انھیں پر امن خطۂ ارض میسر نہ آیا تھا جبکہ انصار کو دونوں چیزیں حاصل تھیں۔

③ ایک نکتے کی بات یہ ہے کہ قرآن نے انصار کی تعریف سے پہلے مہاجرین کی تعریف کی ہے، چنانچہ فرمایا:

﴿لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيٰرِهِمْ وَاَمْوٰلِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَّيَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۚ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝﴾

”(مالِ فَے) ان مہاجر فقراء کے لیے ہے جو اپنے گھروں اور اپنی جائیدادوں سے نکالے گئے، وہ اللہ کا فضل اور اس کی رضا ڈھونڈتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی مدد کرتے ہیں، یہی لوگ سچے ہیں۔“[1]

اپنے دار و بلاد میں دوسروں کو ٹھہرانے پر انصار کی تعریف کی اور دار و بلاد کے چھن جانے پر مہاجرین کی مدح و ستائش کی کیونکہ انھوں نے اللہ کے فضل اور اس کی رضا کی تلاش میں گھر گنوایا تھا۔انھوں نے اللہ کے دین کی مدد کی تو اللہ نے ان کی مدد کی۔رسول اللہ ﷺ کی رسالت مان کر اور اس کی دعوت پر لبیک کہہ کر انھوں نے رسول کی مدد کی۔اللہ نے

[1] الحشر 8:59.

انھیں سچائی کے گراں قدر وصف سے نوازا اور بتایا کہ لوگ اس دین کی حمایت کرنے اور صاف گوئی میں ان کے نقشِ قدم پر چلتے ہیں۔ اللہ نے مہاجرین کی یہ بلند ترین خصوصیات بیان کرتے ہوئے فرمایا:

﴿ أُولَٰٓئِكَ هُمُ ٱلصَّٰدِقُونَ ۝ ﴾

''یہی لوگ سچے ہیں۔'' [1]

دوسری طرف عام مسلمانوں کو حکم دیا کہ سچے لوگوں کی ہمراہی میں آ جاؤ۔

﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا ٱتَّقُوا ٱللَّهَ وَكُونُوا مَعَ ٱلصَّٰدِقِينَ ۝ ﴾

''اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، اللہ سے ڈرو اور سچ بولنے والوں کے ساتھ ہو جاؤ۔'' [2]

﴿ مِن قَبْلِهِمْ ﴾ میں جس اولیت کو انصار کی مدح قرار دیا گیا ہے اس میں اشارہ تھا کہ وہ مہاجرین کے حقوق پہچانیں جنھوں نے اللہ کے فضل اور اس کی رضا کے لیے اپنے گھر بار اور مال و متاع کی قربانی دی۔ اللہ کے دین اور پیغمبر کی مدد کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر دیں۔ صرف اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرنے کے لیے مکہ جیسے گھر کو خیر باد کہا جہاں ان کی جائیدادیں اور قریبی رشتے دار تھے۔ وہ انصار سے پہلے ایمان لائے اور ان کے ساتھ دارِ امن مدینہ میں آ کر رہنے لگے۔ یوں مہاجرین کے لیے ایمان اور مدینہ میں رہائش اختیار کرنے کا عمل پورا ہو گیا۔ پہلے پہل ایمان قبول کرنے کی فضیلت میں ان کا کوئی ہمسر نہیں۔ سچی محبت کی بنیاد پر قائم ہونے والے بھائی چارے (مواخات) کی عمارت کو انصار نے مدد اور پناہ کے دو مضبوط ستونوں کا سہارا دیا۔ ان کی یہ خوبی بیان کرتے ہوئے کہا گیا: ﴿ يُحِبُّونَ مَنْ هَاجَرَ إِلَيْهِمْ ﴾ کہ وہ ان لوگوں سے محبت کرتے ہیں جو ہجرت کر کے ان کی طرف آئیں۔ انصار میں یہ خوبی اللہ کی محبت کی وجہ سے پیدا

[1] الحشر 59:8. [2] التوبة 9:119.

ہوئی، جسے اللہ نے ان کی فضیلت اور مہاجرین کے مقابلے میں انصار کا امتیازی وصف قرار دیا۔ مہاجرین جو اپنے گھربار اور جائیدادوں سے بے دخل کر دیے گئے، صرف اس لیے کہ وہ اللہ کی رضا کے متلاشی تھے اور اس کے فضل کی موسلا دھار اور پیہم بارش سے سیراب ہونا چاہتے تھے۔ وہ اپنے پہلوؤں میں ایسے دل اٹھائے پھرتے تھے جو انصار کی محبت سے آباد تھے۔ انصار جو اخلاصِ محکم سے بہرہ ور تھے اور اخلاص بھی وہ جو اللہ کی خاطر محبت کا ثمرہ تھا۔ ان کے متعلق کہا گیا: ﴿وَلَا يَجِدُونَ فِي صُدُورِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ أُوتُوا﴾ یعنی ان کے مہاجر بھائیوں کو ایمان میں سبقت، گھربار کے سلسلے میں قربانیاں اور نصرت دین پر کمربستہ ہونے کی وجہ سے جو فضیلت ملی ہے اس کی طرف وہ جھانکتے ہیں نہ اس میں سے کسی چیز کے حصول یا اس میں شراکت کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

④ ﴿يُحِبُّونَ مَنْ هَاجَرَ إِلَيْهِمْ﴾ میں انصار کی مہاجرین سے محبت پر مبنی صفت کی جس احسن پیرائے میں مدح سرائی کی گئی ہے وہ قیامت تک ہوتی رہے گی۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ایمان باللہ اور مال و منال اور گھربار کی قربانی جیسے اعمال ہی بقا کی ضمانت ہیں، جبکہ دنیاوی مال ومتاع تو قابل فنا ہیں۔

﴿وَلَا يَجِدُونَ فِي صُدُورِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ أُوتُوا﴾ میں انصار کی جس محبت اور اخلاص کا تذکرہ کیا گیا ہے وہ اس صفت کی وجہ سے اعلیٰ درجے پر فائز ہیں۔ یہ اسی محبت کا اثر ہے کہ انھوں نے مہاجرین کے لیے سب کچھ قربان کر دیا اور ایثار کی اعلیٰ مثال قائم کی۔

⑤ ﴿وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰٓ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ﴾ یہ محبت سے حاصل ہونے والے نتیجے کا بیان ہے۔ یہ محبت ایمان کے چشمے سے جاری ہوئی تھی۔ اس محبت نے انصار کو اتنی بلندی پر فائز کر دیا کہ قدیم و جدید تاریخ میں کوئی اس مقام پر نہ پہنچ سکا۔

⑥ اللہ تعالیٰ نے مہاجرین کو پچھلی آیت میں سچائی کے لقب سے اور انصار کو اس آیت میں فلاح و کامیابی کے لقب سے نوازا۔ انصار کی سابقہ صفات کو بیان کرنے کے بعد اللہ نے

ان سے بخیلی کی نفی کرتے ہوئے انھیں جود وسخا کے عظیم مرتبے پر فائز کر دیا، چنانچہ فرمایا:
﴿وَمَنْ يُّوقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○﴾ [1]

مواخات میں شریک چند مہاجرین اور ان کے بھائی بند انصار کے اسمائے گرامی

مہاجرین	انصار
ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ	خارجہ بن زہیر رضی اللہ عنہ
عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ	عتبان بن مالک رضی اللہ عنہ
ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ	سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ
عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ	سعد بن ربیع رضی اللہ عنہ
زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ	سعد بن سلامہ بن وقش رضی اللہ عنہ
طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ	کعب بن مالک رضی اللہ عنہ
سعید بن زید رضی اللہ عنہ	ابی بن کعب رضی اللہ عنہ
مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ	ابوایوب خالد بن زید رضی اللہ عنہ
ابوحذیفہ بن عتبہ بن ربیعہ رضی اللہ عنہ	عباد بن بشر بن وقش رضی اللہ عنہ
عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما	حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہما
ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ	منذر بن عمرو رضی اللہ عنہ
حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ	عویم بن ساعدہ رضی اللہ عنہ
سلمان فارسی رضی اللہ عنہ	ابودرداء رضی اللہ عنہ
بلال (موذن رسول) رضی اللہ عنہ	ابورویحہ عبداللہ بن عبدالرحمٰن خثعمی رضی اللہ عنہ [2]

[1] ملخص از محمد رسول اللہ ﷺ لصادق عرجون: 3/94-98. [2] السیرة النبویة لابن ھشام: 2/109-111، و السیرة النبویة لابن کثیر: 2/324.

اسباق، دروس اور فوائد ومسائل

عقیدے کا رشتہ مضبوط تعلقات کی بنیاد ہے

مدینے کا معاشرہ خالص عقیدے کی بنیاد پر قائم ہوا تھا۔ یہ معاشرہ اللہ اور اس کے رسول کی حمایت اور اہل ایمان کی خیر خواہی وطرفداری کے سوا کچھ نہیں جانتا تھا۔ یہ تعلق وارتباط کی نہایت اعلیٰ اور ارفع قسم ہے اور اس کی روح فکر اور عقیدے کی وحدت سے منسلک تھی۔ [1]

اللہ تعالیٰ نے بیان کیا ہے کہ ابن نوح اگرچہ پیغمبر کا بیٹا تھا لیکن جب وہ حق سے پھرا اور اللہ کے نبی نوح علیہ السلام کی حکم عدولی کر کے کفر کا مرتکب ہوا تو سیدنا نوح علیہ السلام سے اس کی نسبت ختم کر دی گئی، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: ﴿قَالَ يٰنُوۡحُ اِنَّهٗ لَيۡسَ مِنۡ اَهۡلِكَ‌ ۚ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيۡرُ صَالِحٍ﴾ ''اللہ نے کہا: اے نوح! بے شک وہ تیرے اہل میں سے نہیں، بے شک اس کا عمل نیک نہیں۔'' [2] اسلامی تعلیمات کے مطابق اہلِ ایمان ہی ایک دوسرے کے دوست اور بھائی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿اِنَّمَا الۡمُؤۡمِنُوۡنَ اِخۡوَةٌ فَاَصۡلِحُوۡا بَيۡنَ اَخَوَيۡكُمۡ‌ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمۡ تُرۡحَمُوۡنَ ۝﴾ ''مومن تو (ایک دوسرے کے) بھائی ہیں، لہٰذا تم اپنے بھائیوں کے درمیان صلح کرادو اور تم اللہ سے ڈرو تا کہ تم پر رحم کیا جائے۔'' [2]

اہلِ ایمان اور مشرکین و یہود ونصاریٰ کے آپس کے دوستانہ تعلقات کی اور خونی رشتوں کی نفی کرنا اور یہود ونصاریٰ ومشرکین سے تعلقات بڑھانے والے مسلمان کو ظالم قرار دینا اس بات کی دلیل ہے کہ اہلِ ایمان کی کافروں سے دوستی و رشتہ داری بڑا گناہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَتَّخِذُوۡۤا اٰبَآءَكُمۡ وَاِخۡوَانَكُمۡ اَوۡلِيَآءَ اِنِ اسۡتَحَبُّوا الۡـكُفۡرَ عَلَى الۡاِيۡمَانِ‌ ؕ وَمَنۡ يَّتَوَلَّهُمۡ مِّنۡكُمۡ فَاُولٰٓـئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوۡنَ ۝﴾

[1] السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري: 252/1. [2] هود 46:11. [3] الحجرات 10:49.

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اگر تمھارے باپ اور بھائی ایمان پر کفر کو پسند کریں تو تم (ہرگز) انھیں دوست نہ بناؤ۔ اور تم میں سے جو ان کو دوست بنائیں گے تو وہی لوگ ظالم ہیں۔''[1] اللہ تعالیٰ نے ایک اور موقع پر فرمایا:

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا عَدُوِّي وَعَدُوَّكُمْ أَوْلِيَاءَ تُلْقُونَ إِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوا بِمَا جَاءَكُمْ مِنَ الْحَقِّ يُخْرِجُونَ الرَّسُولَ وَإِيَّاكُمْ أَنْ تُؤْمِنُوا بِاللَّهِ رَبِّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ خَرَجْتُمْ جِهَادًا فِي سَبِيلِي وَابْتِغَاءَ مَرْضَاتِي تُسِرُّونَ إِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَأَنَا أَعْلَمُ بِمَا أَخْفَيْتُمْ وَمَا أَعْلَنْتُمْ وَمَنْ يَفْعَلْهُ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاءَ السَّبِيلِ ○ إِنْ يَثْقَفُوكُمْ يَكُونُوا لَكُمْ أَعْدَاءً وَيَبْسُطُوا إِلَيْكُمْ أَيْدِيَهُمْ وَأَلْسِنَتَهُمْ بِالسُّوءِ وَوَدُّوا لَوْ تَكْفُرُونَ ○﴾

''اے ایمان والو! تم میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ، تم ان کی طرف دوستی کا پیغام بھیجتے ہو، حالانکہ وہ (اس) حق (سچے دین) کے منکر ہوئے ہیں جو تمھارے پاس آیا ہے، وہ رسول کو اور تمھیں بھی جلاوطن کرتے ہیں، اس لیے کہ تم اپنے رب اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔ اگر تم میرے راستے میں جہاد کرنے اور میری رضا ڈھونڈنے کے لیے نکلے ہو، (تو کفار کو دوست نہ بناؤ)، تم ان کو دوستی کا خفیہ پیغام بھیجتے ہو اور میں خوب جانتا ہوں جو تم چھپاتے ہو اور جو ظاہر کرتے ہو اور تم میں سے جو کوئی ایسا کرے گا تو یقیناً وہ سیدھی راہ سے بھٹک گیا۔ اگر وہ تمھیں (کہیں) پائیں تو تمھارے دشمن ہو جائیں اور اپنے ہاتھ اور اپنی زبانیں تمھاری طرف دراز کریں برائی (کی نیت) سے اور وہ چاہتے ہیں کہ کسی طرح تم بھی (دین حق کے) منکر ہو جاؤ۔''[2]

ان آیات میں اہلِ ایمان کے لیے کفار کی طرف قلبی میلان رکھنے کا حکم امتناعی جاری

[1] التوبة 23:9. [2] الممتحنة 2,1:60.

کیا گیا ہے۔ دوسری طرف خاص طور پر اہلِ کتاب کی اطاعت، ان سے دوستانہ تعلقات قائم کرنے اور ان کی طرف میلان رکھنے سے روکا گیا ہے۔[1] ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ۭ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ۭ وَلَىِٕنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَاۗءَھُمْ بَعْدَ الَّذِيْ جَاۗءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ﴾

''اور یہودی اور عیسائی آپ سے ہرگز راضی نہ ہوں گے یہاں تک کہ آپ ان کی ملت کی پیروی کریں۔ کہہ دیجیے: بے شک اللہ کی ہدایت ہی حقیقی ہدایت ہے اور آپ کے پاس جو علم آ گیا اس کے بعد اگر آپ نے ان کی خواہشات کی پیروی کی تو آپ کو اللہ (کی پکڑ) سے (بچانے والا) نہ کوئی حمایتی ہو گا اور نہ کوئی مددگار۔''[2]

ایک اور موقع پر فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِيْعُوْا فَرِيْقًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ يَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ كٰفِرِيْنَ﴾

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اگر تم اہل کتاب کے ایک فریق کی بات مانو گے تو وہ تمھارے ایمان لانے کے بعد تمھیں کافر بنا کر چھوڑیں گے۔''[3]

ارشادِ ربانی ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰٓى اَوْلِيَاۗءَ ۘ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاۗءُ بَعْضٍ ۭ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ﴾

[1] الهجرة في القرآن الكريم لأحزمي سامعون جزولي، ص: 417. [2] البقرة 2:120. [3] آل عمران 3:100.

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! یہودیوں اور عیسائیوں کو دوست نہ بناؤ، وہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں اور تم میں سے جو کوئی ان سے دوستی رکھے گا تو بے شک وہ انھی میں سے ہوگا۔ یقیناً اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔''[1]

سید قطب رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''سابقہ آیت میں خطاب اگرچہ مدنی مسلمانوں کو ہے لیکن بیک وقت یہ خطاب قیامت تک دنیا کے اطراف و اکناف میں بسنے والے ہر مسلمان کو ہے۔ جب یہ حکم نازل ہوا تو اہل ایمان کو اس علیحدگی کی فوری ضرورت تھی کیونکہ مسلمان یہود و نصاریٰ سے گھل مل کر رہتے تھے اور ان کے آپس میں دوستی، تعاون، تجارت اور ہمسائیگی کے تعلقات تھے جو زمانۂ قدیم سے عرب اور یہود کے درمیان استوار چلے آرہے تھے۔ ایسے حالات میں یہود کو بآسانی موقع ملتا تھا کہ وہ دین کے خلاف سازشوں کا جال بچھانے میں اپنا مکارانہ کردار ادا کریں۔ مسلمانوں کے لیے قرآن کریم کا یہی پیغام تھا کہ وہ نئے معاشرے کی تشکیل میں عقیدۂ توحید پر قائم رہیں اور اہلِ کفر سے مکمل طور پر علیحدگی اختیار کریں۔

ایک سچے مسلمان کا فرض ہے کہ وہ یہود و نصاریٰ اور دیگر کفار کے معاملے میں اخلاقی اقدار کو ملحوظ خاطر رکھے لیکن قلبی رجحانات صرف اللہ، اس کے رسول اور اہلِ ایمان کی طرف ہوں۔ مسلمانوں میں نسل در نسل یہ شعور اجاگر ہونا چاہیے اور علیحدگی و امتیاز قائم کرنے کی تحریک ہر علاقے میں اٹھنی چاہیے۔

﴿بَعْضُهُمْ أَوْلِيَآءُ بَعْضٍ﴾ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا کسی خاص زمانے سے کوئی تعلق نہیں۔ دراصل یہ حقیقت متعلقہ اشیاء کی فطرت سے پھوٹتی ہے۔ عالم کفر کسی علاقے میں اور تاریخ کے کسی موڑ پر عالم اسلام کا کبھی خیر خواہ نہیں رہا۔ صدیوں پر گزرتی صدیاں اس امر کی سچائی پر گواہ ہیں۔ یہ قاعدہ (یہود و نصاریٰ ایک دوسرے کے دوست

[1] المآئدة 5:51.

ہیں) ایک بار بھی نہیں ٹوٹا اور اس زمین میں ہمیشہ وہی ہوتا آیا ہے جسے قرآن نے زوردار الفاظ میں بیان کیا ہے۔

قرآن نے یہود و نصاریٰ کی اس دائمی سرشت کا اظہار جملہ اسمیہ کے ذریعے سے کیا ہے جو دوام پر دلالت کرتا ہے۔ ﴿ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ﴾ یہ محض ایک تعبیر نہیں بلکہ دائمی اور حقیقی وصف بیان کرنے کے لیے واضح الفاظ کا بہترین چناؤ ہے۔[1]

اللہ تعالیٰ نے منافقین سے دوستانہ تعلقات رکھنے کی بھی ممانعت فرمائی ہے۔ یہ طبقہ اللہ کے دین کا دشمن اور کفار کا دلی دوست ہوتا ہے۔ ارشاد ہے:

﴿ بَشِّرِ الْمُنٰفِقِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمَا ۝ الَّذِيْنَ يَتَّخِذُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۝ ﴾

”(اے نبی!) منافقوں کو خبردار کر دیجیے کہ ان کے لیے دردناک عذاب ہے، جو مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست بناتے ہیں، کیا وہ ان کافروں کے ہاں عزت تلاش کرتے ہیں؟ پھر بے شک عزت تو ساری اللہ ہی کے لیے ہے۔“[2]

مدنی آیات میں بھی منافقین سے علیحدگی اختیار کرنے کا اشارہ ملتا ہے۔ فرمایا:

﴿ يٰاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ۚ وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝ ﴾

”اے نبی! کافروں اور منافقوں سے جہاد کیجیے اور ان پر سختی کیجیے اور ان کا (اصل) ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ لوٹ کر جانے کی بدترین جگہ ہے۔“[3]

اللہ تعالیٰ نے ان کی نماز جنازہ ادا کرنے اور ان کی قبروں کے قریب (بغرضِ دعا) ٹھہرنے سے منع فرمایا ہے۔ ارشاد ہے:

[1] تفسیر في ظلال القرآن لسید قطب: 911/2. [2] النسآء 139,138:4. [3] التوبة 73:9.

﴿وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ مَاتُوْا وَ هُمْ فٰسِقُوْنَ ○﴾

''اور (اے نبی!) ان میں سے جو مرجائے آپ اس کی نماز (جنازہ) ہرگز نہ پڑھیں اور نہ کبھی اس کی قبر پر کھڑے ہوں۔ بے شک انھوں نے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کیا اور وہ حالت فسق میں مرے۔''[1]

اللہ نے مومنین کے لیے دوستانہ تعلقات قائم کرنے کے سلسلے میں درست سمت کا تعین کیا ہے جو ایمان کی صفت سے مطابقت رکھتی ہے اور وضاحت سے بتایا ہے کہ اہل ایمان کو کیسے لوگ دوست بنانے چاہئیں، چنانچہ ارشاد فرمایا:

﴿اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ ○ وَمَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ ○﴾

''تمھارے دوست تو صرف اللہ اور اس کا رسول اور وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے، جو نماز قائم کرتے ہیں اور زکاۃ دیتے ہیں اور وہ رکوع کرنے والے ہیں۔ اور جو کوئی اللہ سے اور اس کے رسول سے دوستی رکھتا ہے اور ان لوگوں سے دوستی رکھتا ہے جو ایمان لائے ہیں تو (وہ اللہ کا گروہ ہیں اور) یقیناً اللہ کا گروہ ہی غالب آنے والا ہے۔''[2]

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے جان لیا تھا کہ ان کی تمام تر وفاداری مسلم قیادت ہی کے لیے ہو گی۔ ان کے اخلاص کا محور و مرکز عقیدہ اور ان کا جہاد صرف اعلائے کلمۃ اللہ (اللہ کے دین کی سربلندی) کے لیے ہوگا۔ اپنے طور پر انھوں نے ان تمام مقاصد کی تکمیل کی اور ان کے حصول کو اپنی زندگی کا نصب العین قرار دیا۔ وہ اللہ، اس کے رسول اور اہلِ ایمان کے

[1] التوبة 9:84. [2] المآئدة 5:55,56.

وفادار تھے۔ ان کی درخشاں تاریخ ایسے سنہرے واقعات سے پُر ہے جو اس امر کی دلیل ہیں کہ انھوں نے ولاء (وفاداری، حمایت، محبت، جاں نثاری) کے معانی گہرائی سے سمجھے تھے۔
مہاجرین و انصار کے درمیان قائم ہونے والے بھائی چارے کی بنیاد ایک عقیدہ تھا جس پر اتفاق ہو چکا تھا اور سب اس پر ایمان لے آئے تھے۔ عقیدہ ہی وہ بنیاد ہے جس پر یہ عمارت استوار کی جا سکتی تھی کیونکہ متضاد نظریات یا عقائد کے حامل دو افراد کو بھائی بھائی بنا کر ایک کر دینا اور یہ سمجھ لینا کہ وہ عقیدے یا نظریے کی اس تفریق کے باوجود ایک ہو جائیں گے، بے تکی بات اور خیالی پلاؤ پکانے کے مترادف ہے۔ خاص طور پر جب اس فکر یا عقیدے کا اثر اس کے حامل کی عملی زندگی پر ایک خاص طرزِ عمل کی صورت میں ظاہر ہو رہا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی عقیدہ مواخات کے عمل میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ عقیدے نے تقویٰ اور عملِ صالح کے سوا تمام امتیازات مٹا کر سب انسانوں کو اللہ کے عبادت گزار و خاکسار بندوں کی صف میں لا کھڑا کیا تھا۔[1]

الحب فی اللہ مدنی معاشرے کی بنیاد

اللہ کے لیے محبت کی بنیاد پر قائم ہونے والا بھائی چارہ امت مسلمہ کی تعمیر و ترقی میں بڑا نمایاں کردار ادا کرتا ہے۔[2] یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نئے اسلامی معاشرے کے اندر الحب فی اللہ کی روح پھونکنے کے سلسلے میں غیر معمولی جدوجہد کی۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

«إِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى يَقُولُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ: أَيْنَ الْمُتَحَابُّونَ بِجَلَالِي؟ اَلْيَوْمَ أُظِلُّهُمْ فِي ظِلِّي، يَوْمَ لَا ظِلَّ إِلَّا ظِلِّي»

”بلاشبہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ فرمائے گا: ”میرے جلال کی خاطر محبت کرنے والے کہاں ہیں؟ آج میں انھیں اپنے سایے میں جگہ دیتا ہوں۔ آج کے دن

[1] فقه السيرة للبوطي، ص: 156. [2] محمد رسول اللهﷺ لصادق عرجون: 129/3.

میرے سایے کے سوا کوئی سایہ نہیں۔''[1]

ایک اور موقع پر نبی ﷺ نے فرمایا:

«قَالَ اللّٰهُ تَبَارَكَ وَ تَعَالٰى: حَقَّتْ مَحَبَّتِي لِلْمُتَحَابِّينَ فِيَّ، وَ حَقَّتْ مَحَبَّتِي لِلْمُتَوَاصِلِينَ فِيَّ، وَحَقَّتْ مَحَبَّتِي لِلْمُتَبَاذِلِينَ فِيَّ: اَلْمُتَحَابُّونَ فِيَّ عَلٰى مَنَابِرَ مِنْ نُّورٍ، يَّغْبِطُهُمُ النَّبِيُّونَ، وَالصِّدِّيقُونَ وَالشُّهَدَاءُ»

''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''میری خاطر آپس میں محبت، صلہ رحمی اور خرچ کرنے والوں کے لیے میری محبت لازم ہوگئی ہے۔ میری خاطر محبت کرنے والے نور کے منبر پر براجمان ہوں گے۔ نبی، صدیق اور شہداء ان پر رشک کریں گے۔''[2]

نبی ﷺ کے متعدد فرامین لوگوں کو آپس میں محبت، باہمی تعاون اور ایک دوسرے کا احترام کرنے کا درس دیتے ہیں تاکہ کوئی مالدار فقیر پر، حاکم محکوم پر اور طاقتور کمزور پر برتری کا اظہار نہ کرے۔

اس نئے قائم شدہ معاشرے میں اللہ کی خاطر محبت کا اچھا اور نمایاں اثر ظاہر ہوا۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کے پاس کھجوروں کے باغ سب انصار سے زیادہ تھے۔ بیرحاء نامی باغ جو مسجد نبوی کے بالمقابل تھا، انھیں بہت پسند تھا۔ نبی ﷺ وہاں تشریف لے جاتے اور اس کا خوش گوار پانی نوش فرماتے۔ جب یہ آیت نازل ہوئی:

﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۚ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ○﴾

''تم ہرگز بھلائی نہ پاسکو گے جب تک ان چیزوں میں سے اللہ کی راہ میں خرچ نہ

[1] صحيح مسلم، حديث: 2566، و مسند أحمد: 237/2و 535. [2] جامع الترمذي، حديث: 2390، و مسند أحمد: 229/5و239.

کرو جنھیں تم پسند کرتے ہو اور تم جو بھی چیز خرچ کرو گے تو بے شک اللہ اسے خوب جاننے والا ہے۔''[1]

تو ابوطلحہ رضی اللہ عنہ عرض پرداز ہوئے: ''اے اللہ کے رسول! اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے اور میرا سب سے زیادہ پسندیدہ مال بیرحاء باغ ہے۔ میں اسے اللہ کی راہ میں صدقہ کرنا چاہتا ہوں۔ میں ثواب اور اللہ کے ہاں اس کے ذخیرہ ہونے کی توقع رکھتا ہوں۔ اب آپ اسے جہاں چاہیں صرف کریں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «ذٰلِكَ مَالٌ رَّابِحٌ! ذٰلِكَ مَالٌ رَّابِحٌ! وَّ قَدْ سَمِعْتُ مَا قُلْتَ، وَ إِنِّي أَرٰى أَنْ تَجْعَلَهَا فِي الْأَقْرَبِينَ» ''یہ نفع بخش مال ہے، یہ نفع بخش مال ہے۔ میں نے تمھاری بات سن لی ہے۔ میری رائے یہ ہے کہ تم اسے اپنے ضرورت مند اقربا میں تقسیم کر دو۔'' ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے کہا: ''میں اسی طرح کروں گا۔'' انھوں نے وہ باغ اپنے چچا زاد بھائیوں اور دیگر اقارب میں تقسیم کر دیا۔[2]

سیدنا عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ الحب فی اللہ اور باہمی تعاون کی ایک عمدہ مثال بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں: ''جب ہم مدینہ پہنچے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے اور سعد بن ربیع کے درمیان بھائی چارہ قائم کر دیا۔ سعد نے کہا: ''میں انصار کا سب سے مالدار آدمی ہوں۔ میں آپ کے لیے اپنا آدھا مال پیش کرتا ہوں اور میری جو بیوی آپ کو پسند ہو اسے طلاق دے دوں گا اور جب وہ عدت گزار چکے تو آپ اس سے نکاح کر لینا۔'' میں نے کہا: ''مجھے ان چیزوں کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے کسی بازار کا رستہ بتائیں۔'' سعد رضی اللہ عنہ نے انھیں قینقاع کے بازار کا پتہ بتا دیا۔ عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ وہاں گئے، کچھ پنیر اور گھی خرید کر لے آئے۔ روزانہ اسی طرح کرتے رہے۔ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر زرد رنگ کے نشانات دیکھے اور پوچھا: «تَزَوَّجْتَ؟» ''کیا تم نے شادی کر لی ہے؟'' عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے

---

[1] آل عمرٰن 3:92. [2] صحيح البخاري، حديث: 1461، و صحيح مسلم، حديث: 998، و السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري: 254/1.

عرض کیا: ''جی!'' آپ ﷺ نے پوچھا: «وَمَنْ؟» ''کس سے؟'' عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: ''ایک انصاری خاتون سے۔'' آپ ﷺ نے حق مہر کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ ایک گٹھلی برابر سونا دیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

«أَوْلِمْ وَلَوْ بِشَاةٍ» ''ولیمہ کرو خواہ ایک بکری ہی ہو۔''[1]

اس روایت میں ایک طرف سعد رضی اللہ عنہ کی طرف سے بھرپور تعاون کا اظہار ہوا تو دوسری طرف عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کی طرف سے خودداری اور عزت نفس کا مظاہرہ دیکھنے کو ملا۔ یہ صرف عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ ہی کی سوچ نہیں تھی بلکہ اکثر مہاجرین اپنے انصاری بھائیوں کے گھر رہے، پھر محنت مزدوری کرنے لگے حتیٰ کہ اس آمدنی سے گھر خرید لیے اور خود کفیل ہو گئے۔ ابوبکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم وغیرہ انھی مہاجرین میں سے تھے۔

خیر خواہی

بھائی چارے نے مسلمانوں کو ایک دوسرے کا خیر خواہ اور ہمدرد بنا دیا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے سلمان فارسی اور ابودرداء رضی اللہ عنہما کے مابین مواخات قائم کی۔ ایک دن سلمان فارسی رضی اللہ عنہ ابودرداء رضی اللہ عنہ کے گھر تشریف لائے۔ ام درداء کو پراگندہ حالت میں دیکھا تو وجہ دریافت کی۔ ام درداء رضی اللہ عنہا نے بتایا کہ آپ کے بھائی کسی قسم کی دنیاوی حاجت نہیں رکھتے۔ اسی دوران ابودرداء رضی اللہ عنہ بھی آ گئے۔ کھانا تیار ہوا تو ابودرداء رضی اللہ عنہ نے کہا: ''میں تو روزے سے ہوں، اس لیے کھانا نہیں کھاؤں گا۔'' سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے کہا: ''میں اس وقت تک کھانا نہیں کھاؤں گا جب تک آپ بھی میرے ساتھ نہ کھائیں گے۔'' ابودرداء رضی اللہ عنہ نے کھانا کھا لیا۔ رات ہوئی تو ابودرداء قیام اللیل کے ارادے سے بیدار ہوئے۔ سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے کہا: ''سو جاؤ۔'' وہ سو گئے۔ تھوڑی دیر بعد دوبارہ قیام کے ارادے سے بیدار ہوئے۔

[1] صحيح البخاري، حديث: 2048 و 3780، و صحيح مسلم، حديث: (79)-1427.

سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے دوبارہ سو جانے کو کہا۔ رات کا آخری پہر ہوا تو سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے کہا: ''اب اٹھ جاؤ'' اور دونوں نے اکٹھے تہجد کی نماز پڑھی۔ سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے نصیحت کی: ''ابودرداء! تمھارے رب کا تم پر حق ہے۔ اسی طرح تمھاری جان اور تمھارے گھر والوں کا بھی تم پر حق ہے۔ ہر حق دار کو اس کا حق دیا کرو۔'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جب یہ خبر پہنچی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «صَدَقَ سَلْمَانُ» ''سلمان نے درست کہا۔'' [1]

انصار کا ذکرِ خیر اور اُن کے لیے دعا

انصار نے نہ صرف مہاجرین کی صدقِ دل سے غمخواری کی تھی بلکہ دنیا کی ہر بھلائی میں انھیں فوقیت دی تھی۔ ان کے سچے ایمان اور خالص محبت کی یہی نشانی تھی۔ اس سلسلے میں انصار کی طرف سے کیے جانے والے اقدامات کا مہاجرین کے دلوں پر گہرا اثر ہوا۔

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ انصار نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے گزارش کی کہ ہمارے کھجوروں کے باغات ہیں۔ آپ انھیں ہمارے اور مہاجرین بھائیوں کے درمیان تقسیم فرما دیجیے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انکار کر دیا۔ انھوں نے مہاجرین سے کہا: ''آپ ہمارے باغات میں کام کریں۔ ہم آپ کو پیداوار کا حصہ دیں گے۔'' سب نے یہ بات تسلیم کی۔ [2]

معلوم ہوا کہ انصار نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے اموال، جو ان دنوں کھجوروں کے باغات پر مشتمل تھے، اپنے اور مہاجرین کے درمیان تقسیم کرنے کی درخواست کی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تقسیم کے بجائے کوئی ایسا طریقہ تلاش کیا جس میں انصار کو نقصان نہ ہو اور اموال سے ان کی ملکیت بھی زائل نہ ہو۔ اسی دوران جب انصار نے کام اور پیداوار میں شراکت کی بات کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے پسند فرمایا کیونکہ اس میں مہاجرین کی ضرورتوں کو پورا کرنے

[1] صحيح البخاري، حديث: 1968 و 6139، وجامع الترمذي، حديث: 2413. [2] صحيح البخاري، حديث: 2325.

کا سامان بھی تھا اور انصار کی ملکیت بھی برقرار تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے مہاجرین کو انصار کے ساتھ باغات کو پانی دینے اور نگہبانی کے معاملات میں لگا دیا اور انصار نے انھیں باغات کی پیداوار میں شریک کرلیا۔ یہی وجہ تھی کہ سب نے یہ بات تسلیم کی۔ [1]

مہاجرین انصار کا ہاتھ بٹانے لگے اس کے باوجود زیادہ تر کام انصار خود اپنے ہاتھوں انجام دیتے۔ مہاجرین نے انصار کی کرم فرمائی اور ایثار کا شکریہ ادا کیا اور نبی ﷺ سے عرض کیا: ''ہم نے انصار جیسے لوگ آج تک نہیں دیکھے۔ جو کام تھوڑا لیتے ہیں اور خرچ زیادہ کرتے ہیں۔ ہم باغبانی میں ان کے ساتھ شریک ہوتے ہیں۔ وہ ہمیں پیداوار سے وافر حصہ دیتے ہیں۔ اب تو ہمیں یہ احساس بھی ہونے لگا ہے کہ وہ سارا ثواب حاصل کر لیں گے۔'' نبی ﷺ نے فرمایا: «لَا، مَا أَثْنَيْتُمْ عَلَيْهِمْ وَ دَعَوْتُمُ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ لَهُمْ» ''نہیں، جب تک تم ان کا ذکر خیر کرتے رہو گے اور اللہ تعالیٰ سے ان کے حق میں دعا کرتے رہو گے۔'' [2]

مہاجرین کے اس اخروی اجر وثواب کی طرف اشارہ کرنے سے ان کے اخروی زندگی کے تصور اور اپنی تمام سوچوں پر اس تصور کے غلبے کا پتا چلتا ہے۔ [3]

نبی ﷺ نے انصار کی اس عزت افزائی کا بدلہ دینے کا ارادہ فرمایا۔

---

[1] التاريخ الإسلامي للحميدي: 30/4. [2] جامع الترمذي، حديث: 2487، و مسند أحمد: 201,200/3، والمصنف لابن أبي شيبة: 68/9. تحفۃ الاحوذی میں اس حدیث کی شرح کے تحت امام طیبی رحمہ اللہ کا قول قابل دید ہے۔ وہ فرماتے ہیں: ''جب مہاجرین نے یہ کہا کہ انصار نے ہم پر اتنے احسان کیے حتی کہ ہمیں خدشہ ہوا کہ وہی سارا اجر لے جائیں گے اور ہم ان کے احسانات کا بدلہ نہیں چکا سکیں گے تو رسول اللہ ﷺ نے گویا یوں فرمایا: ''یہ بات نہیں ہے۔ کیونکہ جب تم ان کی اچھائیوں کے بدلے میں ان کا ذکر خیر اور ان کے لیے دعا کرتے رہو گے تو گویا تم ان کے احسانات کا بدلہ چکا رہے ہو اور اس طرح تم ان کے برابر نیکیاں حاصل کر رہے ہو۔'' (تحفة الأحوذي: 279/6)

[3] التاريخ الإسلامي للحميدي: 406/4.

سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی علیہ السلام نے انصار کو بلایا کہ بحرین کا علاقہ انھیں عطا فرما دیں۔ انصار نے یہ کہہ کر انکار کر دیا: ''پہلے ہمارے مہاجر بھائیوں کو بھی ایسا علاقہ عنایت فرمائیں۔'' اس پر نبی علیہ السلام نے فرمایا: «إِمَّا لَا، فَاصْبِرُوا حَتّٰى تَلْقَوْنِي، فَإِنَّهُ سَيُصِيبُكُمْ بَعْدِي أَثَرَةٌ» ''اگر تم انکار ہی کرتے ہو تو سنو! تم ہمیشہ صبر کرنا، یہاں تک کہ مجھے حوض کوثر پر ملو۔ میرے بعد دوسروں کو تم پر ترجیح دی جائے گی۔''[1]

بھائی چارے نے مہاجرین کی اجنبیت ختم کرنے، مہاجرین کا اپنے گھر کے افراد اور خاندان سے دوری کی وجہ سے ان کے لیے ہمدردی کا سامان فراہم ہونے، تعلقات کی مضبوطی اور ایک نئی ریاست کے قیام جیسے مقاصد پورے کر لیے۔ بلاشبہ کوئی بھی ریاست یا قبیلہ بھائی چارے اور باہمی محبت کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا اور نہ اس میں مساوات اور باہمی تعاون کی فضا قائم ہو سکتی ہے۔[2]

مواخات کی بنیاد پر وراثت کی تقسیم

انصار نے مہاجرین کا جس فراخدلی، محبت اور سچے جذبات سے استقبال کیا، انھیں قیام گاہ فراہم کی اور ان کے لیے دیگر آسانیاں پیدا کیں، تاریخ انسانی میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ یہ بھائی چارہ عملی طور پر ان کی زندگیوں میں رچ بس گیا تھا۔ یہ مواخات کوئی علامتی نہیں تھی بلکہ یہ تو ایک جیتی جاگتی حقیقت اور انصار و مہاجرین کے درمیان طے پانے والے عملی تعلقات کا نام تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میثاق اخوت کو سب کے لیے ایک اہم ذمہ داری قرار دیا جس کے نہایت مثبت نتائج برآمد ہوئے۔

اللہ تعالیٰ نے قرابت داروں سے صرف نظر کرتے ہوئے سلسلۂ وراثت کو بھی اسی مواخات کی بنیاد پر قائم فرما دیا تاکہ اصل اسلام کے تصورات میں یہ عمل ایک جیتی جاگتی

[1] صحيح البخاري، حديث:3794. [2] تفسير في ظلال القرآن لسيد قطب:3526/6.

حقیقت بن کر ابھرے۔ مطلب یہ کہ مواخات اور آپس میں محبت صرف الفاظ یا کوئی علامتی چیز نہیں تھی۔ یہ ایسا مضبوط بندھن تھا جس کے اثرات وفوائد معاشرے میں واضح طور پر محسوس کیے گئے اور یہ آگے چل کر معاشرتی نظامِ انصاف کی بنیاد بنا۔

مواخات کی اساس پر قائم ہونے والا نظامِ وراثت ایک عرصے بعد منسوخ کر دیا گیا، جس کی حکمت یہ تھی کہ حکم ناسخ کی بنیاد بھی اسلامی اخوت پر تھی کیونکہ مختلف مذاہب کے حامل دو افراد ایک دوسرے کے وارث نہیں ہو سکتے۔ ہجرت کے فوری بعد ابتدائی مرحلے میں انصار و مہاجرین کے درمیان اخوت کے تعلقات قائم کرنے اور مہاجرین سے ہمدردی کی ضرورت تھی۔ مہاجرین اپنے گھر بار اور اہل وعیال مکہ میں چھوڑ کر مدینہ میں انصاری بھائیوں کے ہاں آئے تھے۔ ایسے حالات میں ایک خاص ذمہ داری کا احساس اجاگر کرنے کی اشد ضرورت تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے اس سلسلے میں اخوت کے مضبوط رشتے کی بنیاد رکھی۔ وقت کا تقاضا بھی یہی تھا کہ آپس کے دینی تعلقات اور مواخات کا ناتا تمام رشتہ داریوں کی نسبت مضبوط ہو، چنانچہ وراثت کا نظام اس مواخات کی بنیاد پر قائم کر دیا گیا۔ جب مہاجرین کی زندگیاں معمول پر آ گئیں اور ایک اسلامی ریاست معرض وجود میں آ گئی تو اس جدید اسلامی معاشرے میں سلسلہ وراثت عام قوانین پر قائم کر دیا گیا اور پہلا حکم منسوخ ہو گیا۔

یوں جب مہاجرین مدینہ کی فضا کے عادی ہو گئے، اجنبیت ختم ہو گئی، سلسلۂ روزگار چل نکلا اور بدر کے غنائم کے سبب کچھ خوشحالی میسر آ گئی تو وراثت کا نظام بشری تقاضوں کے مطابق طبعی وضع پر لوٹ آیا جس کی اساس صلہ رحمی پر تھی اور بھائی چارے کی اساس پر قائم نظام وراثت ختم کر دیا گیا۔ اس ضمن میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَالَّذِينَ آمَنُوا مِن بَعْدُ وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا مَعَكُمْ فَأُولَٰئِكَ مِنكُمْ ۚ وَأُولُو الْأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَوْلَىٰ بِبَعْضٍ فِي كِتَابِ اللَّهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ﴾

”اور جو لوگ بعد میں ایمان لائے اور انھوں نے ہجرت کی اور تمھارے ساتھ (مل کر) جہاد کیا تو وہ بھی تمھی میں سے ہیں اور اللہ کی کتاب میں (خون کے) رشتے دار آپس میں ایک دوسرے کے زیادہ حقدار ہیں۔ بے شک اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔“ [1]

یہ آیت کریمہ اخوت کی بنیاد پر قائم نظامِ وراثت کے لیے ناسخ ثابت ہوئی اور باہمی تعاون و خیر خواہی کا جذبہ بدستور برقرار رہا۔

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان:

﴿وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ ۚ وَالَّذِينَ عَقَدَتْ أَيْمَانُكُمْ فَآتُوهُمْ نَصِيبَهُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدًا﴾

”ماں باپ اور قریبی رشتہ دار جو مال چھوڑ جائیں اس میں ہم نے ہر ایک کے لیے وارث بنائے ہیں اور جن سے تمھارا عہد بندھ چکا ہو انھیں ان کا حصہ دو، بے شک اللہ ہر چیز پر گواہ ہے۔“ [2]

کی تفسیر کرتے ہوئے کہا: ﴿مَوَالِيَ﴾ سے مراد ورثاء ہیں، چنانچہ مہاجرین جب مدینہ تشریف لائے تو مواخات کے تحت مہاجر انصاری کا وارث بنتا اور اصلی رشتہ دار کو کچھ نہ ملتا، پھر اللہ تعالیٰ کا فرمان: ﴿وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ﴾ نازل ہوا تو وراثت کا یہ نظام ختم کر دیا گیا۔“ انھوں نے مزید کہا: ”اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿وَالَّذِينَ عَقَدَتْ أَيْمَانُكُمْ فَآتُوهُمْ نَصِيبَهُمْ﴾ سے مراد ایک دوسرے کی مدد، ہمدردی اور خیر خواہی ہے، لہٰذا اب وراثت ختم ہو چکی ہے، البتہ ان کے حق میں وصیت کی جا سکتی ہے۔“ [3]

انسانی اقدار اور مثالی اصول

مہاجرین و انصار کے مابین قائم بھائی چارے کی وجہ سے ایسی انسانی اور معاشرتی اقدار

---

[1] الأنفال 8:75. [2] النسآء 4:33. [3] صحيح البخاري، حديث:2292و4580و6747، وسنن أبي داود، حديث:2922، والسنن الكبرٰى للنسائي، حديث:11037.

وجود میں آئیں جو اس سے قبل کسی بھی قبائلی معاشرے میں ناپید تھیں۔ یہ اقدار صرف اسی جدید اور قابلِ رشک اسلامی معاشرے کا حصہ بنیں۔ ان میں سرفہرست اپنے ہاتھ سے کسبِ رزق کے وسائل مہیا کرنا تھا۔ مہاجرین نے ابتدا میں انصار بھائیوں کی مہمان نوازی قبول کی، پھر مستقل طور پر انصار کے کندھوں پر بوجھ بننے کے بجائے روزگار کے مواقع تلاش کیے۔ ان میں بعض تجارت اور بعض کھیتی باڑی کے پیشے سے وابستہ ہوگئے۔ وہ اس بات پر خوش تھے کہ کسی پر بوجھ بننے اور کسی سے کچھ لینے کے بجائے خود محنت کر رہے ہیں اور یہ کہ لینے کے بجائے دینے والا ہاتھ اللہ کے نزدیک زیادہ پسندیدہ اور بہتر ہے۔

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے اسلامی تعلیمات سے یہ سبق سیکھا کہ اپنے ہاتھوں سے کمایا ہوا رزق عین عبادت ہے۔ یہ ایسا مرتبہ و مقام ہے جہاں انسان کی صرف مادی ضرورتوں کو پورا کرنے والا دورِ حاضر کا کوئی نظام نہ پہنچ سکا۔ ان اسلامی راہنما اصولوں کی روشنی میں ہم بخوبی یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ بھائی چارہ اور محنت مزدوری مدنی معاشرے کے بنیادی امتیازات تھے۔ آگے چل کر یہی امتیازات اس معاشرے کی ترقی کا ضامن بنے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زیرِ نگرانی قائم ہونے والا معاشرہ اوجِ ثریا پر جا پہنچا اور اتنا پھلا پھولا کہ سارے عالم کے لیے سایہ دار درخت کی حیثیت اختیار کر گیا۔[1]

علاقائی اور قبائلی برتری کا خاتمہ

جاہلی معاشرہ، جہاں تعصب کو بنیادی حیثیت حاصل تھی، اس میں پائے جانے والے علاقائی اور قبائلی تعصب کو ختم کرنا آسان کام نہ تھا۔ بھائی چارے کا عمل اسی تعصب کو ختم کرنے کا خواہاں تھا۔

آج کل مسلمانوں کی صفوں میں موجود بعض نادان داعی حضرات کے دلوں میں علاقائی

[1] الهجرة في القرآن الكريم لأحزمي سامعون جزولي، ص: 411.

تعصب نے جگہ بنا رکھی ہے۔ یہ ایک ایسا مرض ہے جس کے سبب نہ صرف اسلام مغلوب ہوا ہے بلکہ امتِ اسلامیہ کی وحدت پارہ پارہ ہوتی اور شیرازہ بکھرتا نظر آ رہا ہے۔ امت اپنے اصل مقاصد کو بھول کر انھی تعصّبات میں جکڑ کر رہ گئی۔ شہر شہر اور بستی بستی پھیلی ہوئی اسلامی تحریکیں علاقائی تعصب کا شکار نظر آتی ہیں۔[1]

دیکھا جائے تو دلوں میں پیدا ہونے والے ان تعصّبات کا سبب قرآنی تعلیمات اور سنت رسول ﷺ سے دوری ہے۔ نہ اسلامی تعلیمات کو اپنایا جا رہا ہے اور نہ ان کے مطابق تربیت ہو رہی ہے۔ نتیجہ باہمی بغض و عناد کی صورت میں سامنے آ رہا ہے۔

آج عالم اسلام مہاجرین و انصار کے مابین قائم ہونے والے آئیڈیل بھائی چارے کا محتاج ہے۔ عالم اسلام کو ان کریمانہ اوصاف کی اشد اور فوری ضرورت ہے جو صرف اس مواخات میں پائے جاتے ہیں۔ ایسے اوصاف کے بغیر عزت و وقار کا حصول تقریباً ناممکن نظر آتا ہے۔ آج بلند پایہ ایمان اور عظیم قربانیوں کی ضرورت ہے جس کا حصول میدانِ عمل میں ممکن ہے۔ صرف زبانی نعرے ذرہ برابر سودمند نہیں ہو سکتے۔

آج کل کا دور جس میں امت اسلامیہ مسائل کا شکار ہے، اس میں ایک مسلمان جب خود کو ایسے بھائیوں کے درمیان پائے گا جو محبت اور تعاون کرنے والے ہوں گے تو اس کا حوصلہ بڑھ جائے گا اور وہ اعلیٰ اقدار کا حامل ہو جائے گا۔ وہ اپنے اندر ایک عجیب قسم کا جوش اور ولولہ محسوس کرے گا۔ بصورت دیگر اسلامی صفوں میں کمزوری کے آثار نظر آئیں گے۔ ہر فرد عدمِ تحفظ کا شکار ہو گا اور خود کو اکیلا اور کینہ پرور دشمنوں میں گِھرا ہوا محسوس کرے گا۔ وہ ایسے مادی اور نفسیاتی دباؤ کو بھلا کیسے برداشت کر سکتا ہے؟[2]

مورخین نے اسلامی معاشرے کی وحدت اور اس جہاد کا خصوصی تذکرہ کیا ہے جو ہمیشہ جاری رہے گا اور بڑھتا چلا جائے گا۔ دشمنانِ اسلام نے مسلمانوں کی صفوں میں انتشار

---

[1] التربية القيادية للدكتور الغضبان: 286/2. [2] الطريق إلى المدينة لمحمد العبده، ص: 10 و 101.

پھیلانے کے لیے بہت سی تدابیر اختیار کیں۔ ان کی یہ تمام کاوشیں اس لیے ناکامی سے دوچار ہوئیں کہ مدمقابل ایمانی قوت کا حامل ایسا معاشرہ تھا جس کے اجزائے ترکیبی اتنے مضبوط اور آپس میں جڑے ہوئے تھے کہ نہ تو انھیں جدا کیا جا سکتا تھا اور نہ ان کے باہمی تعلقات کو ختم کیا جا سکتا تھا۔[1]

بھائی چارہ داخلی مضبوطی کا سبب

اسلامی معاشرے کی مضبوطی کے اسباب میں افرادِ امت کی ربانی منہج پر تربیت کرنا، نیک سیرت لوگوں کی قیادت، فرقہ بندی سے اجتناب اور وحدت امت جیسے اصولوں پر کاربند رہنا شامل تھا۔[2]

امت مسلمہ کی ترقی کا باعث عقیدۂ توحید پر یقین، اسلام کے ساتھ سچا تعلق، تلاش حق اور جذبۂ اخوت کو فروغ دینا تھا۔ اسی مضبوط بھائی چارے کی وجہ سے اسلامی صفوں میں اتحاد، ہم آہنگی اور یکجہتی جیسی خوبیاں پیدا ہوئیں۔

بھائی چارے کا عمل ربانی تحفہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے مخلص، پرہیز گار اور قابل قدر بندوں کو عطا فرمایا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاِنْ يُّرِيْدُوْٓا اَنْ يَّخْدَعُوْكَ فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ ۭ هُوَ الَّذِيْٓ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ ○ وَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ ۭ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ ۭ اِنَّهٗ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ○﴾

"اور اگر وہ آپ کو دھوکا دینا چاہیں تو بے شک آپ کے لیے اللہ کافی ہے، وہی تو ہے جس نے اپنی مدد سے اور مومنوں سے آپ کی تائید کی اور اس نے ان (مومنوں) کے دلوں میں الفت ڈال دی، اگر آپ دنیا بھر کے سب خزانے خرچ کر دیتے تو

1 محمد رسول اللهﷺ لصادق عرجون: 3/152. 2 فقه التمكين في القرآن الكريم للصلابي، ص:253.

بھی ان کے دلوں میں الفت پیدا نہ کرسکتے لیکن اللہ ہی نے ان میں الفت ڈالی۔
بے شک وہ زبردست (اور) خوب حکمت والا ہے۔''[1]

اخوت ایک ایسی ایمانی قوت کا نام ہے جو مسلمان میں جذبۂ صادق، محبت و احترام کا احساس اور ایسا اعتماد پیدا کرتی ہے جس کی بنیاد خالص اسلامی منہج پر ہو، پھر تعاون، ایثار، شفقت، درگزر، ہمدردی اور امداد باہمی کی فضا پیدا ہوتی ہے۔ گویا ایمان اور اخوت لازم و ملزوم ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ فَأَصْلِحُوا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ○﴾

''مومن تو (ایک دوسرے کے) بھائی ہیں، لہٰذا تم اپنے بھائیوں کے درمیان صلح کرادو اور تم اللہ سے ڈرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔''[2]

ایمان کی مٹھاس بھی اخوت کے جذبات سے سرشار مسلمان ہی محسوس کرسکتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«ثَلَاثٌ مَّنْ كُنَّ فِيهِ وَجَدَ حَلَاوَةَ الْإِيمَانِ: أَنْ يَّكُونَ اللّٰهُ وَ رَسُولُهُ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِمَّا سِوَاهُمَا، وَ أَنْ يُّحِبَّ الْمَرْءَ لَا يُحِبُّهُ إِلَّا لِلّٰهِ، وَ أَنْ يَّكْرَهَ أَنْ يَّعُودَ فِي الْكُفْرِ كَمَا يَكْرَهُ أَنْ يُّقْذَفَ فِي النَّارِ»

''تین وصف جس آدمی میں پائے جائیں وہ ایمان کی حلاوت محسوس کرے گا۔ اللہ اور اس کے رسول کو ساری دنیا سے زیادہ محبوب رکھنا، آپس میں صرف اللہ کی رضا کے لیے محبت کرنا اور کفر کی طرف لوٹنا ایسا ہی ناپسند ہو جس طرح آگ میں داخل ہونا۔''[3]

[1] الأنفال 8:62، 63. [2] الحجرات 49:10. [3] صحيح البخاري، حديث: 16، و صحيح مسلم، حديث: 43.

قرآن ہمارے سامنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا انتہائی دلنشین تصور پیش کرتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ۡ سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ۚ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ ۚ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْـَٔهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ۗ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ۝﴾

"محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ آپ کے ساتھ ہیں، وہ کافروں پر بہت سخت ہیں، آپس میں نہایت مہربان ہیں، آپ انھیں رکوع و سجود کرتے دیکھیں گے، وہ اللہ کا فضل اور (اس کی) رضامندی تلاش کرتے ہیں، ان کی خصوصی پہچان ان کے چہروں پر سجدوں کا نشان ہے، ان کی یہ صفت تورات میں ہے اور انجیل میں ان کی صفت اس کھیتی کے مانند ہے جس نے اپنی کونپل نکالی، پھر اسے مضبوط کیا اور وہ (پودا) موٹا ہوگیا، پھر اپنے تنے پر سیدھا کھڑا ہوگیا، کسانوں کو خوش کرتا ہے، (اللہ نے یہ اس لیے کیا) تاکہ ان (صحابۂ کرام) کی وجہ سے کفار کو خوب غصہ دلائے، اللہ نے ان لوگوں سے جو ان میں سے ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے، مغفرت اور بہت بڑے اجر کا وعدہ کیا ہے۔"[1]

قرآنِ کریم نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی یہ تصویر پیش کر کے گویا اس امر کا اعلان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں عزت بخشی ہے، یعنی یہ لوگ کافروں کے لیے سخت ہیں، خواہ کافروں کے درمیان ان کے آباء و ابناء و اخوان ہی کیوں نہ موجود ہوں۔ اخوت کی جو منظر کشی اس

[1] الفتح 29:48.

آیت میں کی گئی ہے وہ درحقیقت دینی اخوت کا اصلی تصور ہے۔

دینی اخوت کے اسی مستحکم جذبے نے مسلمانوں کو درپیش چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کی ہمت عطا کی۔ دینی بھائی چارے کے احساس نے مسلمانوں کی صفوں میں ہم آہنگی پیدا کی۔ یہ خوشگوار احساس ان کی قوت وسطوت میں اضافے کا باعث بنا اور اسی کے سبب انھیں بالادستی نصیب ہوئی۔[1]

انصار کے مناقب

انصار کی پہلی اور سب سے بڑی خوبی تو یہی ہے کہ اللہ اور اس کے رسول نے انھیں انصار (مددگار) کا نام دیا۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ انھوں نے اسلام کی بیعت کے بعد اہلِ ایمان کو پناہ دی اور یوں اللہ، اس کے رسول اور دین کی مدد کی۔ اس سے قبل وہ اس نام سے نہیں جانے جاتے تھے۔[2] غیلان بن جریر کہتے ہیں: ''میں نے انس رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ ''انصار'' کا لقب آپ لوگوں نے خود اختیار کیا تھا یا اللہ تعالیٰ نے منتخب فرمایا؟ انھوں نے جواب دیا: ''نہیں بلکہ ہمارا یہ نام اللہ نے رکھا تھا۔''[3]

انصار کے اجتماعی و انفرادی فضائل بے شمار ہیں۔ اجتماعی فضائل جو قرآن کریم میں بیان ہوئے ہیں، ان کی تفصیل یہ ہے:

اللہ تعالیٰ نے انصار کے متعلق بیان کیا ہے کہ وہ سچے مومن ہیں۔ فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ۚ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ﴾

''اور جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور جنھوں نے (مہاجرین کو) جگہ دی اور (ان کی) مدد کی، وہی لوگ سچے مومن ہیں،

[1] شرح رسالة التعليم للدكتور محمد عبد الله الخطيب، ص: 296. [2] الهجرة النبوية المباركة للدكتور عبد الرحمٰن البر، ص: 131-135. [3] صحيح البخاري، حديث: 3776.

ان کے لیے مغفرت اور باعزت روزی ہے۔''[1]

اللہ تعالیٰ نے انصار کو خوشخبری دی ہے کہ وہ ان سے راضی ہے اور اس بات پر ان کی ستائش کی ہے کہ وہ بھی اللہ تعالیٰ سے راضی ہیں۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے:

﴿وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ﴾

''اور مہاجرین اور انصار میں سے (قبول اسلام میں) سبقت کرنے والے اور وہ لوگ جنھوں نے احسان کے ساتھ ان کی پیروی کی، اللہ ان سے راضی ہو گیا اور وہ اس سے راضی ہو گئے اور اللہ نے ان کے لیے ایسے باغ تیار کیے ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، وہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے، یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔''[2]

یہی نہیں، اللہ تعالیٰ نے انصار کا ذکر کرتے ہوئے کامیابی اور فلاح کا حوالہ دیا ہے۔ ارشاد فرمایا ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ تَبَوَّءُو الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۭ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾

''اور (مالِ فے ان کے لیے ہے) جنھوں نے (مدینہ کو) گھر بنا لیا تھا اور ان (مہاجرین) سے پہلے ایمان لا چکے تھے، وہ (انصار) ان سے محبت کرتے ہیں جو ان کی طرف ہجرت کرے اور وہ اپنے دلوں میں اس (مال) کی کوئی حاجت نہیں پاتے جو ان (مہاجرین) کو دیا جائے اور اپنی ذات پر (ان کو) ترجیح دیتے ہیں اگرچہ خود انھیں سخت ضرورت ہو اور جو کوئی اپنے نفس کے لالچ سے بچا لیا گیا تو

[1] الأنفال 8:74. [2] التوبة 9:100.

وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔‘‘[1]

انصار کے فضائل میں جو احادیث ہم تک پہنچی ہیں، ان میں سے چند ایک حسب ذیل ہیں:

انصار کے لیے نبی ﷺ کی محبت: انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے کہا: ’’نبی ﷺ نے بچوں اور عورتوں کو آتے دیکھا (راوی کا خیال ہے کہ انس رضی اللہ عنہ نے یہ بھی بتایا تھا کہ یہ لوگ کسی شادی سے آ رہے تھے) تو ان کی عزت افزائی کے لیے کھڑے ہو گئے اور تین بار کہا: «اَللّٰهُمَّ أَنْتُمْ مِّنْ أَحَبِّ النَّاسِ إِلَيَّ» ’’اللہ کی قسم! تم میرے محبوب ترین لوگوں میں سے ہو۔‘‘[2]

انصار سے محبت ایمان اور ان سے بغض نفاق کی علامت: براء بن عازب رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، کہتے ہیں: ’’میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: «اَلْأَنْصَارُ لَا يُحِبُّهُمْ إِلَّا مُؤْمِنٌ، وَّ لَا يُبْغِضُهُمْ إِلَّا مُنَافِقٌ، فَمَنْ أَحَبَّهُمْ أَحَبَّهُ اللّٰهُ وَ مَنْ أَبْغَضَهُمْ أَبْغَضَهُ اللّٰهُ» ’’انصار سے صرف مومن محبت کرتا ہے اور صرف منافق ہی ان سے بغض رکھتا ہے، لہٰذا جو ان سے محبت کرے گا اللہ اس سے محبت کرے گا اور جو ان سے بغض رکھے گا اللہ بھی اس سے بغض رکھے گا۔‘‘[3]

حب الٰہی اور بغض الٰہی کی علامت: جو انصار سے محبت کرے گا، وہ اللہ کی محبت سے ہمکنار ہو گا اور جو ان سے بغض رکھے گا اس پر اللہ کی پھٹکار برسے گی۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «مَنْ أَحَبَّ الْأَنْصَارَ أَحَبَّهُ اللّٰهُ، وَ مَنْ أَبْغَضَ الْأَنْصَارَ أَبْغَضَهُ اللّٰهُ» ’’جس نے انصار سے محبت کی اللہ تعالیٰ اس سے محبت کرے گا اور جس نے انصار سے بغض رکھا اللہ تعالیٰ اس سے بغض رکھے گا۔‘‘[4]

---

[1] الحشر 9:59. [2] صحیح البخاري، حدیث: 3785، و صحیح مسلم، حدیث: 2508.
[3] صحیح البخاري، حدیث: 3783، و صحیح مسلم، حدیث: 75. [4] مسند أحمد: 501/2 و527، ومجمع الزوائد: 39/10، و مسند أبي یعلٰی، حدیث: 7367، و مسند البزار، حدیث: 2793,2792.

انصار کی عفت و پاکدامنی اور ان کے صبر کی شہادت: عفت و پاکدامنی اور صبر دو کریمانہ خصلتیں ہیں جو آدمی کے سلیم الفطرت ہونے اور اچھے خاندان سے تعلق رکھنے پر دلالت کرتی ہیں۔ ایسا باہمت انسان جوانمردی اور وقار جیسی بیش قیمت خوبیوں کا حامل ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے انصار کے لیے ان دونوں خوبیوں کی گواہی دی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی گواہی سے بڑھ کر کسی کی عظیم المرتبی کا ثبوت اور کیا ہوگا، چنانچہ عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«مَا يَضُرُّ امْرَأَةً نَّزَلَتْ بَيْنَ بَيْتَيْنِ مِنَ الْأَنْصَارِ، أَوْ نَزَلَتْ بَيْنَ أَبَوَيْهَا»

”جو عورت کسی انصاری کے گھر ہو یا اپنے والدین کے گھر ہو اسے کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔“[1]

نبی ﷺ کا خود کو انصار کی طرف منسوب کرنے کا شوق: ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے کہا: ”نبی ﷺ نے فرمایا تھا:

«لَوْ أَنَّ الْأَنْصَارَ سَلَكُوا وَادِيًا، أَوْ شِعْبًا لَّسَلَكْتُ فِي وَادِي الْأَنْصَارِ وَلَوْلَا الْهِجْرَةُ لَكُنْتُ امْرَأً مِّنَ الْأَنْصَارِ»

”انصار جو راہ اپنائیں میں بھی اسی راہ پر چلنا پسند کروں گا۔ ہجرت نہ ہوتی تو میں بھی انصار ہی کا ایک فرد ہوتا۔“[2]

انصار کے لیے نبی ﷺ کی دعا: نبی ﷺ نے انصار اور ان کے اہل وعیال اور ان کی پوری نسل کے لیے دعا کی۔ بلاشبہ رسول اللہ ﷺ کی دعا اللہ کے ہاں درجۂ قبولیت پر فائز تھی اور انصار کو یہ بے پایاں فضیلت حاصل ہوئی کہ آپ نے ان کے لیے دعا کی۔ امام بخاری رحمہ اللہ

[1] مسند أحمد: 257/6، ومجمع الزوائد: 40/10، والمستدرك للحاكم: 83/4، و مسند البزار، حديث: 2806، وصحيح ابن حبان، حديث: 7267. [2] صحيح البخاري، حديث: 3779 و 7244، ومسند أحمد: 410/2، والسنن الكبرٰى للنسائي، حديث: 8261.

عبداللہ بن فضیل رحمہ اللہ کی روایت لائے ہیں کہ انھوں نے انس رضی اللہ عنہ کو کہتے ہوئے سنا: ''مجھے حرہ کے واقعے کا بہت رنج ہوا۔[1]

اس پر زید بن ارقم رضی اللہ عنہ نے، جو ان دنوں کوفہ میں تھے، مجھے تسلی بھرا خط لکھا۔ زید بن ارقم کو جب یہ اطلاع ملی کہ اس واقعے کی وجہ سے مجھے شدید غم لاحق ہوا ہے تو انھوں نے مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک دعا لکھ کر ارسال کی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم دعا مانگا کرتے تھے: «اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِلْأَنْصَارِ وَ لِأَبْنَاءِ الْأَنْصَارِ» ''اے اللہ! انصار اور ان کے بیٹوں کی مغفرت فرما۔'' عبداللہ بن فضیل رحمہ اللہ کو انصار کے بیٹوں کے بیٹوں کے بارے میں شک ہے کہ وہ بھی اس دعا میں شامل تھے یا نہیں۔[2]

انس رضی اللہ عنہ کے قریب بیٹھے ایک شخص نے ان سے زید بن ارقم رضی اللہ عنہ کے متعلق پوچھا کہ یہ کون ہیں؟ اس پر انھوں نے بتایا کہ یہ وہی ہیں جن کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ یہ وہ انسان ہے جس کے کانوں کی سنی بات اللہ نے سچ ثابت کی۔[3]

1 واقعۂ حرہ 63 ہجری میں پیش آیا۔ اس کا باعث یہ بنا کہ اہلِ مدینہ کو یزید بن معاویہ کی منفی سرگرمیوں کے متعلق پتہ چلا (جس میں جھوٹ سچ سبھی شامل تھا) تو انھوں نے یزید بن معاویہ کی بیعت توڑ دی اور اس کے خلاف بغاوت پر اتر آئے۔ یزید بن معاویہ نے مسلم بن عقبہ مری کو ایک لشکر جرار دے کر یہ بغاوت فرو کرنے بھیجا۔ اہلِ مدینہ نے شکست کھائی اور مسلم بن عقبہ مری کی فوج نے مدینہ میں قتل عام کیا جس کے نتیجے میں انصار کی بڑی تعداد تہِ تیغ ہوئی۔ انس بن مالک رضی اللہ عنہ ان دنوں بصرہ میں مقیم تھے۔ آپ کو اس سانحے کی خبر ملی تو انصار کے قتلِ عام پر بے حد رنجیدہ خاطر ہوئے۔ 2 صحیح مسلم میں انصار کے بیٹوں کے بیٹوں کے بارے میں بھی حسب ذیل الفاظ موجود ہیں: [...... وَ أَبْنَاءِ أَبْنَاءِ الْأَنْصَارِ] ''اور انصار کے بیٹوں کے بیٹوں کی بھی مغفرت فرما۔'' دیکھیے: صحیح مسلم، حدیث: 2506. 3 صحیح البخاري، حدیث: 4906. حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری میں حضرت زید رضی اللہ عنہ کا واقعہ نقل کیا ہے۔ ابن شہاب زہری فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ ارشاد فرما رہے تھے کہ ایک منافق نے کہا: اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سچا ہے تو پھر ہم گدھوں سے بھی بدتر ہیں۔ یہ بات حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ نے سن لی تو انھوں نے کہا: ''اللہ کی قسم! محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بات میں سچے ہیں اور تم واقعی گدھے سے بھی بدتر ◄◄

انصار کے بارے میں نبی ﷺ کی وصیت: نبی ﷺ نے وصیت فرمائی کہ انصار سے اچھا سلوک کیا جائے اور انھیں عدمِ تحفظ کا شکار نہ کیا جائے۔ انصار نے اللہ تعالیٰ کے دین کی نشر و اشاعت کی خاطر بڑی جدو جہد کی۔ دین کے دفاع میں بھی انھوں نے کارہائے نمایاں سرانجام دیے۔ اس راہ میں انھوں نے زمانے کی سرد و گرم ہواؤں کی پروا نہ کی اور دین کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دینے سے بھی دریغ نہ کیا۔ قرآن کے سنہری حروف میں انصار کی اس بے مثال تگ و دو کا تذکرہ کیا گیا:

﴿لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّهٗ بِهِمْ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝﴾

”یقیناً اللہ نے نبی اور ان مہاجرین و انصار پر مہربانی فرمائی جنھوں نے تنگی کی گھڑی میں آپ کی پیروی کی، بعد اس کے کہ ان میں سے ایک گروہ کے دل بہک جانے کو تھے، پھر اللہ نے ان پر مہربانی فرمائی۔ بے شک وہ ان پر بہت

◄ ہو۔ یہ بات اللہ کے رسول ﷺ تک پہنچی تو منافق اپنی بات سے مکر گیا، اس پر اللہ تعالیٰ نے حضرت زید رضی اللہ عنہ کی تصدیق کے لیے درج ذیل آیت نازل فرمائی: ﴿يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ مَا قَالُوْا وَلَقَدْ قَالُوْا كَلِمَةَ الْكُفْرِ وَكَفَرُوْا بَعْدَ اِسْلَامِهِمْ وَهَمُّوْا بِمَا لَمْ يَنَالُوْا ۚ وَمَا نَقَمُوْٓا اِلَّآ اَنْ اَغْنٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ فَاِنْ يَّتُوْبُوْا يَكُ خَيْرًا لَّهُمْ ۚ وَاِنْ يَّتَوَلَّوْا يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَمَا لَهُمْ فِي الْاَرْضِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ۝﴾ ”وہ (منافقین) اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں کہ انھوں نے (کوئی بات) نہیں کہی، حالانکہ انھوں نے ضرور کلمۂ کفر کہا تھا اور وہ اسلام لانے کے بعد کافر ہو گئے۔ اور انھوں نے وہ کچھ کرنے کا ارادہ کیا جو وہ نہ کر سکے۔ اور انھوں نے غصہ نہیں نکالا، مگر اس بات پر کہ اللہ اور اس کے رسول نے اپنے فضل سے انھیں غنی کر دیا، پھر اگر وہ توبہ کر لیں تو ان کے لیے بہتر ہو گا اور اگر وہ پھر جائیں تو اللہ انھیں دنیا اور آخرت میں دردناک عذاب دے گا اور ان کا زمین میں کوئی حمایتی اور کوئی مددگار نہ ہو گا۔“ (التوبة 74:9) دیکھیے: فتح الباري: 651/8، روایت مرسل ہے۔

شفقت کرنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔‘‘[1]

یہی وجہ ہے کہ نبی ﷺ نے انصار کے متعلق یہ وصیت کی تھی کہ ان میں سے نیکی کرنے والوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا جائے اور خطا کاروں کو معاف کر دیا جائے۔ آپ ﷺ نے تاکید کی تھی کہ ان سے معاملہ کرتے ہوئے ڈرانے دھمکانے کا اسلوب اختیار نہ کیا جائے۔ یوں آپ ﷺ نے ان کے بارے میں بھلائی اور اچھے رویے کی وصیت فرمائی۔

چنانچہ انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، انھوں نے بتایا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «اَلْأَنْصَارُ كَرِشِي وَعَيْبَتِي، وَالنَّاسُ سَيَكْثُرُونَ وَيَقِلُّونَ، فَاقْبَلُوا مِنْ مُّحْسِنِهِمْ وَتَجَاوَزُوا عَنْ مُّسِيئِهِمْ» ’’انصار میرے مخلص ساتھی اور ہم راز ہیں۔ لوگ عنقریب کثرت سے دائرۂ اسلام میں داخل ہوں گے اور انصار کی تعداد کم ہوتی جائے گی۔ تم ان کے نیکوکاروں کی نیکی تسلیم کرو اور خطا کاروں سے صرفِ نظر کرو۔‘‘[2]

انس رضی اللہ عنہ ہی روایت کرتے ہیں کہ ایک دفعہ نبی ﷺ گھر سے نکلے۔ راستے میں انصار

---

[1] التوبة 9:117. [2] صحيح البخاري، حديث:3801، و صحيح مسلم، حديث: 2510. ابن حجر رحمہ اللہ اس حدیث کے ذیل میں لکھتے ہیں: ’’مطلب یہ ہے کہ انصار کی تعداد کم ہو جائے گی۔ دراصل یہ اس طرف اشارہ ہے کہ قبائلِ عرب و عجم یکے بعد دیگرے اسلام قبول کریں گے اور ظاہر ہے ان کی تعداد قبیلۂ انصار کی تعداد سے کئی گنا زیادہ ہے۔ افزائشِ نسل کا جو سلسلہ انصار میں جاری ہے وہ قبائلِ عرب و عجم میں بھی جاری رہے گا۔ یوں انصار کی تعداد دوسروں کی نسبت ہمیشہ کم ہی رہے گی۔ یہ بھی عین ممکن ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو وحی کے ذریعے سے بتا دیا گیا ہو کہ انصار کی تعداد گھٹ جائے گی، چنانچہ آپ ﷺ کی پیش گوئی پوری ہوئی۔ آج اکنافِ عالم میں سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی ثابت شدہ اولاد کی تعداد انصار کے دونوں قبائل اوس و خزرج کی ثابت شدہ نسل سے کئی گنا زیادہ ہے۔ یہ بات میں نے ان کثیر افراد سے قطع نظر کرتے ہوئے کہی ہے جن کا دعویٰ ہے کہ وہ انصار کی اولاد ہیں جبکہ ان کے پاس اس امر کی کوئی دلیل نہیں۔‘‘ دیکھیے: فتح الباري، شرح الحديث:3801.

سے ملاقات ہوئی تو فرمایا: «وَالَّذِي نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهِ! إِنِّي لَأُحِبُّكُمْ، وَ إِنَّ الْأَنْصَارَ قَدْ قَضَوْا مَا عَلَيْهِمْ، وَ بَقِيَ الَّذِي لَهُمْ، فَأَحْسِنُوا إِلٰى مُحْسِنِهِمْ وَتَجَاوَزُوا عَنْ مُسِيئِهِمْ» ”قسم اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے! واقعتاً میں تم لوگوں سے محبت کرتا ہوں۔ انصار نے بلاشبہ اپنی ذمہ داری خوب نبھائی ہے۔ اب ان کا حق باقی رہ گیا ہے۔ لوگو! تم ان کے نیکوکاروں سے اچھا سلوک کرنا اور ان کے خطا کاروں سے درگزر کرنا۔“ [1]

ابوقتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انھوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو منبر پر انصار کے حق میں یہ کہتے سنا:

«...... فَمَنْ وَلِيَ الْأَنْصَارَ فَلْيُحْسِنْ إِلٰى مُحْسِنِهِمْ وَلْيَتَجَاوَزْ عَنْ مُسِيئِهِمْ، وَ مَنْ أَفْزَعَهُمْ فَقَدْ أَفْزَعَ هٰذَا الَّذِي بَيْنَ هٰذَيْنِ وَأَشَارَ إِلٰى نَفْسِهِ»

”جو انصار کا والی بنے وہ ان کے نیکوکار سے اچھا برتاؤ کرے اور ان کے خطا کار سے درگزر کرے اور جو انھیں ڈرائے دھمکائے تو وہ جان لے کہ اس نے اسے دھمکایا، یہ کہہ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی طرف اشارہ کیا۔“ [2]

---

1 مسند أحمد: 187/3، والسنن الكبرٰى للنسائي، حديث: 8270، و صحيح ابن حبان، حديث: 7266و 7271، و مسند أبي يعلٰى، حديث: 3770. [2] المستدرك للحاكم: 79/4، والهجرة النبوية المباركة للدكتورعبد الرحمٰن البر، ص:151.

باب 3

میثاقِ مدینہ

نبی ﷺ مدینہ تشریف لائے تو اس کے باشندوں کے باہمی تعلقات منظم کرنے اور انھیں بہتر بنانے کے لیے ایک دستاویز تیار کی جس کا تذکرہ کتب تاریخ میں ملتا ہے۔ اس تاریخ ساز عہد نامے میں مدینہ کے بلدیاتی قوانین مرتب کیے گئے اور اہل مدینہ کے حقوق و فرائض کا تعین کیا گیا۔ قدیم کتب تاریخ میں اس عہد نامے کو تحریر یا صحیفہ کہا گیا ہے۔ معاصر مورخین نے اسے دستور یا میثاق کے نام سے یاد کیا ہے۔ ڈاکٹر اکرم ضیاء عمری نے اپنی کتاب السيرة النبوية الصحيحة میں اسی وثیقے کی تمام اسانید کا جائزہ لینے کے بعد لکھا ہے کہ تمام اسانید مل کر صحیح روایت کے مرتبے کو پہنچ جاتی ہیں۔[1]

وثیقے کا اسلوبِ تحریر بھی اس کے درست ہونے کی نشاندہی کرتا ہے۔ اس کے تمام الفاظ اور تعبیریں نبوی دور میں رائج تھیں۔ بعد ازاں ان کا استعمال کم ہو گیا اور ایسا وقت بھی آیا کہ یہ الفاظ ان مورخین کے علاوہ جو خاص اسی دور کی تحقیق سے متعلق تھے، دیگر تمام اصحابِ علم و فن کے لیے اجنبی بن کر رہ گئے۔ وثیقے کے اصل اور ثقہ ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ اس میں کسی خاص فرد یا گروہ کی مدح سرائی نہیں کی گئی اور نہ کسی خاص فرد یا جماعت پر تنقید یا الزام تراشی کے تیر برسائے گئے ہیں۔[2] وثیقے کے اسلوبِ تحریر اور رسول اللہ ﷺ کے خطوط کی انشا پردازی میں بڑی حد تک جو مشابہت پائی جاتی ہے وہ

[1] السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري:275/1. [2] تنظيمات الرسول الإدارية في المدينة لصالح العلي، ص:5،4.

بھی اس کی درستی اور اصلیت کا ثبوت فراہم کرتی ہے۔

میثاق مدینہ کی دفعات

① یہ تحریر اللہ کے رسول و نبی محمد ﷺ کی طرف سے ہے جو قریش اور اہل یثرب سے تعلق رکھنے والے مسلمانوں اور ان افراد کے درمیان طے پائی جنھوں نے ان کی پیروی کی، ان میں آ ملے اور ان کی ہمراہی میں جہاد کیا۔

② سب لوگوں سے قطع نظر یہ لوگ (مسلمان) ایک امت (سیاسی وحدت) ہیں۔

③ قریش کے مہاجرین (قبل از اسلام کے) دستور کے مطابق آپس کا خون بہا ادا کریں گے۔ اہلِ ایمان کے درمیان عدل و انصاف کی بنیاد پر عام طریقے سے وہ اپنے اسیروں کا فدیہ دیں گے۔

④ بنو عوف (قبل از اسلام کے) دستور کے مطابق اپنے پہلے خون بہا ادا کریں گے اور ہر طائفہ اپنے اسیروں کا فدیہ اہل ایمان کے درمیان عدل و انصاف کی بنیاد پر عام طریقے سے دے گا۔

⑤ بنو حارث (بنو خزرج) دستور کے مطابق اپنے پہلے خون بہا ادا کریں گے اور ہر طائفہ اپنے اسیروں کا فدیہ اہل ایمان کے درمیان عدل و انصاف کی بنیاد پر عام طریقے سے ادا کرے گا۔

⑥ بنو ساعدہ دستور کے مطابق اپنے پہلے خون بہا ادا کریں گے اور ہر طائفہ اپنے اسیروں کا فدیہ اہل ایمان کے درمیان عدل و انصاف کی بنیاد پر عام طریقے سے ادا کرے گا۔

⑦ بنو جشم دستور کے مطابق اپنے پہلے خون بہا ادا کریں گے اور ہر گروہ اپنے اسیروں کا فدیہ اہلِ ایمان کے درمیان عدل و انصاف کی بنیاد پر عام طریقے سے دے گا۔

⑧ بنو نجار دستور کے مطابق اپنے پہلے خون بہا ادا کریں گے اور ہر جماعت اپنے اسیروں

کا فدیہ اہلِ ایمان کے درمیان عدل و انصاف کی بنیاد پر رائج طریقے سے دے گی۔

⑨ بنوعمرو بن عوف دستور کے مطابق اپنے پہلے خون بہا ادا کریں گے اور ہر فریق اپنے اسیروں کا فدیہ اہلِ ایمان کے درمیان عدل و انصاف کی بنیاد پر عام اور معروف طریقے سے دے گا۔

⑩ بنوعبیت دستور کے مطابق اپنے پہلے خون بہا ادا کریں گے اور ہر گروہ اپنے قیدیوں کا فدیہ اہلِ ایمان کے درمیان عدل و انصاف کی بنیاد پر رائج طریقے سے دے گا۔

⑪ بنواوس دستور کے مطابق اپنے پہلے خون بہا ادا کریں گے اور ہر گروہ اپنے قیدیوں کا فدیہ اہلِ ایمان کے درمیان عدل و انصاف کی بنیاد پر مروجہ طریقے سے دے گا۔

⑫ اہلِ ایمان کسی مفلس یا مقروض کو بے یار و مددگار نہیں چھوڑیں گے بلکہ قاعدے کے مطابق فدیہ، دیت اور تاوان ادا کرنے میں اس کی مدد کریں گے اور کوئی مومن دوسرے مومن کے معاہداتی بھائی سے اس کی اجازت کے بغیر حلیفانہ معاہدہ نہیں کرے گا۔

⑬ تقویٰ شعار اہلِ ایمان ہر اس آدمی کے خلاف کمربستہ رہیں گے جو سرکشی کرے یا ظلم و زیادتی اور گناہ کا مرتکب ہو یا اہلِ ایمان میں فتنہ و فساد پھیلانے کی سعی کرے۔ ان سب کے ہاتھ ایسے شخص کی مخالفت پر ایک ساتھ اٹھیں گے، خواہ وہ ان میں سے کسی کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔

⑭ کوئی مومن کسی مومن کو کافر کی خاطر قتل نہیں کرے گا اور نہ کسی مومن کے خلاف کافر کی مدد کرے گا۔

⑮ اللہ کا عہد و پیمان (ضمانت) ایک (اور سب کے لیے) ہے۔ مسلمانوں کا ادنیٰ سے ادنیٰ فرد بھی کسی کو پناہ دے کر سب کو اس کا پابند کر سکتا ہے۔ لوگوں کے بالمقابل اہلِ ایمان ایک دوسرے کے حلیف اور ضامن ہیں۔

⑯ یہود کا کوئی فرد ہمارا ساتھ دیتا ہے تو اسے مکمل تعاون اور مساویانہ حقوق حاصل ہوں

گے۔ اس پر ظلم نہیں ہوگا اور نہ اس کے خلاف کسی کی مدد کی جائے گی۔

⑰ اہلِ ایمان کی صلح ایک ہے۔ اللہ کی راہ میں کوئی مومن کسی دوسرے مومن کو چھوڑ کر دشمن سے صلح نہیں کرے گا جب تک کہ صلح سب کے لیے برابر نہ ہو۔

⑱ ہر جنگجو گروہ جو ہماری معیت میں لڑے گا، اس کے افراد آپس میں ایک دوسرے کی جانشینی کریں گے۔

⑲ اہلِ ایمان االلہ کی راہ میں قتل ہونے والوں کا انتقام لیں گے۔

⑳ بلاشبہ متقی اہل ایمان بہترین اور سیدھے راستے پر ہیں۔ کوئی مشرک قریش کے کسی فرد یا جائیداد کو اپنی تحویل یا نگرانی یا ذمہ داری میں نہیں لے گا اور نہ اس سلسلے میں کسی مسلمان کے آڑے آئے گا۔

㉑ جو شخص کسی مومن کو ناحق قتل کرے اور اس کا ثبوت بھی مل جائے تو اس سے قصاص لیا جائے گا، بجز اس کے کہ مقتول کے ورثاء خون بہا لینے پر راضی ہو جائیں۔ تمام اہلِ ایمان قاتل کے خلاف ہوں گے اور اس کے سوا ان کے لیے کوئی صورت درست نہیں ہوگی۔

㉒ کسی مسلمان کے لیے جو اس نوشتہ کے مندرجات (کی تکمیل) کا اقرار کر چکا اور اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لایا ہے، جائز نہیں کہ وہ کسی قانون شکن کی مدد کرے یا اسے پناہ دے۔ جو ایسے مجرم کی مدد کرے گا یا اسے پناہ دے گا قیامت کے دن اللہ کی لعنت اور اس کے غضب کا مستحق ٹھہرے گا اور اس سے کوئی فدیہ یا عوض قبول نہیں کیا جائے گا۔

㉓ جب بھی تم لوگ کسی معاملے میں اختلاف کرو گے، اس معاملے میں اللہ اور اس کے رسول محمد ﷺ کی طرف رجوع کیا جائے گا۔

㉔ یہود اس وقت تک مسلمانوں کے ساتھ اخراجات برداشت کریں گے جب تک ان کے ہمراہ جنگ کریں گے۔

㉕ بنو عوف کے یہود مومنین کے ساتھ ایک امت (سیاسی وحدت) تسلیم کیے جاتے ہیں۔

یہود کے لیے ان کا دین ہے اور مسلمانوں کے لیے ان کا دین۔ موالی (آزاد کردہ غلام) ہوں کہ اصل۔ ہاں جو ظلم اور گناہ کا ارتکاب کرے وہ اپنی ذات اور گھرانے کے سوا کسی کو ہلاکت میں نہیں ڈالے گا۔

㉖ یہودِ بنو نجار کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو یہود بنو عوف کو حاصل ہیں۔

㉗ یہودِ بنو حارث کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو یہود بنو عوف کو حاصل ہیں۔

㉘ یہودِ بنو ساعدہ کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو یہود بنو عوف کو حاصل ہیں۔

㉙ یہودِ بنو جشم کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو یہود بنو عوف کو حاصل ہیں۔

㉚ یہودِ بنو اوس کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو یہود بنو عوف کو حاصل ہیں۔

㉛ یہودِ بنو ثعلبہ کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو یہود بنو عوف کو حاصل ہیں، البتہ جو ظلم اور گناہ کا ارتکاب کرے گا تو وہ اپنی ذات یا گھرانے ہی کو ہلاکت میں ڈالے گا۔

㉜ بنو جفنہ بنو ثعلبہ کی شاخ ہے۔ انھیں بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو بنو ثعلبہ کو حاصل ہیں۔

㉝ بنو شطیبہ کو بھی وہی مراعات حاصل ہوں گی جو بنو عوف کو حاصل ہیں۔ وفا شعاری ہو گی نہ کہ عہد شکنی۔

㉞ ثعلبہ کے موالی بھی انھی حقوق کے حامل ہوں گے جن سے بنو ثعلبہ بہرہ مند ہوں گے۔

㉟ یہود کے حامی اور دوست قبائل کو بھی وہی حقوق دیے جائیں گے جو خود یہود کو حاصل ہوں گے۔

㊱ ان میں سے کوئی بھی محمد ﷺ کی اجازت کے بغیر معاہدے سے نہیں نکلے گا۔

㊲ یہود اپنے اخراجات کے ذمہ دار ہوں گے اور مسلمان اپنے اخراجات کے۔ جو کوئی اس معاہدے کے شرکاء سے جنگ کرے گا، تمام شرکاء اس کے خلاف ایک دوسرے کی مدد کریں گے۔ انھیں باہمی مشاورت اور خیر خواہی سے کام لینا ہو گا اور وہ وعدے کا پاس

کریں گے، عہد شکنی کے مرتکب نہیں ہوں گے۔

38 کوئی شخص اپنے حلیف کی بد عملی کا ذمہ دار نہیں ہوگا اور مظلوم کی مدد ہر حال میں کی جائے گی۔

39 یہود اس وقت تک مسلمانوں کے ساتھ مصارف برداشت کرتے رہیں گے جب تک وہ ان کی ہمراہی میں جنگ کریں گے۔

40 معاہدے کے شرکاء کے لیے سرزمینِ یثرب کی حیثیت حرم (مقدس مقام اور جنگ کے لیے ممنوعہ علاقہ) کی ہوگی۔

41 پناہ گزیں سے وہی برتاؤ ہوگا جو عام باشندے سے ہوتا ہے۔ اسے کوئی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا اور نہ وہ خود عہد شکنی کرے گا۔

42 کسی کی زیرِ کفالت شے کو اس کی اجازت کے بغیر پناہ نہیں دی جائے گی۔

43 معاہدے کے شرکاء کے درمیان کوئی بات یا جھگڑا ہو جائے جس کے نتیجے میں فساد برپا ہونے کا خدشہ ہو تو اس کے متعلق اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) سے رجوع کیا جائے گا اور اس دستاویز میں اللہ تعالیٰ کو وہ چیز قبول ہے جو نیکی اور بھلائی کے زیادہ قریب ہے۔

44 قریش کو پناہ دی جائے گی نہ ان کے حامیوں کو اور اگر کوئی باہر سے یثرب پر حملہ آور ہوگا تو معاہدے کے شرکاء اس کے خلاف ایک دوسرے کی مدد کریں گے۔

45 اگر انھیں (یہود کو) صلح کرنے کی دعوت دی جائے تو وہ قبول کریں گے اور اگر وہ اسی قسم کا مطالبہ مسلمانوں سے کریں تو اسے ضرور پورا کیا جانا چاہیے، بجز اس کے کہ اس صورت میں ہر ایک اپنے مدمقابل کا سامنا کرے گا، وہ حلیف دین (اسلام) سے برسرِ پیکار نہ ہوں۔

46 اوس کے یہود کو، وہ موالی ہوں کہ اصل باشندے، شرکائے معاہدہ کے حقوق حاصل ہوں گے۔ شرکائے معاہدہ ان سے وفاداری کرنے کے پابند ہوں گے۔ عہد کا پاس کیا

جائے گا، پیمان شکنی نہیں کی جائے گی۔ ہر شخص اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہے۔ اس دستاویز میں اللہ تعالیٰ کو وہ چیز قبول ہے جو نیکی اور سچائی کے زیادہ قریب ہے۔

(47) یہ دستاویز کسی مجرم یا ظالم کو تحفظ نہیں دے گی۔ جو شخص جنگ کے لیے جائے گا وہ محفوظ ہے اور جو گھر میں بیٹھا رہے وہ بھی محفوظ ہے، سوائے اس کے جو ظلم یا جرم کا ارتکاب کرے۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ نیک اور متقی شخص کا حامی و محافظ ہے اور محمد اللہ کا رسول ہے۔ ﷺ[1]

اخلاقی اسباق، دروس اور فوائد و مسائل

امت کے مفہوم کا تعین

میثاق مدینہ میں ان تمام اصولوں کا تذکرہ کیا گیا ہے جو آج کل کی جدید ترقی یافتہ اقوام کے دستوروں میں پائے جاتے ہیں۔ ان میں مبدا کے طور پر امت کے مفہوم کا تعین کیا گیا ہے۔ دستاویز کے مطابق امت کے مفہوم میں تمام مہاجرین و انصار، ان کے پیروکار اور ان کے ساتھ مل کر جہاد کرنے والے لوگ شامل ہیں۔ یہ لوگ اقوامِ عالم سے الگ ایک امت کہلائیں گے۔[2]

جزیرہ نمائے عرب کی سیاسی تاریخ میں یہ نظریہ انوکھا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے اہلِ اسلام کو قبائلی نسبتوں سے نکال کر امت کا خطاب دیا۔ اس لفظ میں نیا دین (اسلام) قبول کرنے والے ہر فرد کو شامل کر لیا گیا۔ دستاویز کی پہلی اور دوسری شق میں اس کا تذکرہ ہے۔ قرآن کریم نے بھی اہلِ اسلام کو امت کا لقب عطا کیا اور فرمایا:

﴿إِنَّ هَٰذِهِۦٓ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَٰحِدَةً وَأَنَا۠ رَبُّكُمْ فَٱعْبُدُونِ ۝﴾

---

[1] مجموعة الوثائق السياسية لمحمد حميد الله، ص:41-47. [2] التاريخ السياسي والعسكري للدكتور علي معطي، ص: 169.

''بلاشبہ یہ تمھاری امت ایک ہی امت ہے اور میں تمھارا رب ہوں، لہٰذا تم میری ہی عبادت کرو۔''[1]

اللہ تعالیٰ نے اس امت کو سب سے بہتر قرار دیتے ہوئے فرمایا:

﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا﴾

''اور (جیسے تمھیں ہدایت دی) اسی طرح ہم نے تمھیں افضل اُمت بنایا تا کہ تم لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہوں۔''[2]

اللہ تعالیٰ نے واضح کیا کہ یہ امت مثبت سوچ کی حامل ہے جو معاشرتی مسائل سے بھاگنے کے بجائے نیکی کا حکم دیتی اور برائی سے روکتی ہے، اچھے اخلاق کی دعوت دیتی اور گھٹیا اقدار کی حوصلہ شکنی کرتی ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۗ وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ۚ مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَاَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ ○﴾

''تم بہترین امت ہو جو لوگوں (کی اصلاح) کے لیے پیدا کی گئی ہے، تم نیک کاموں کا حکم دیتے ہو اور برے کاموں سے روکتے ہو اور تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو اور اگر اہل کتاب ایمان لے آتے تو ان کے حق میں بہت بہتر ہوتا۔ ان میں بعض ایمان والے بھی ہیں مگر ان کے اکثر نافرمان ہیں۔''[3]

اہلِ یثرب میں موجود مسلمانوں کی جماعت پر بولے گئے اس نئے نام کی بدولت مختلف قبائل سے تعلق رکھنے والے جمیع مسلمان اسلامی رشتے کی بنیاد پر اس جماعت کے پرچم تلے آ گئے۔ وہ ایک دوسرے کا سہارا بنے، انھوں نے ظالم کے خلاف مظلوم کی مدد کا شعار

[1] الأنبیاء 92:21. [2] البقرة 143:2. [3] آل عمرٰن 110:3، دستور للأمة للدکتور عبدالناصر العطار، ص: 9.

اپنایا اور محبت، قرابت اور ہمسائیگی کے حقوق کی پاسداری کی۔ [1]

اوس وخزرج کے دونوں قبائل انصار میں تبدیل ہو گئے اور انصار و مہاجرین نے باہم مل کر مسلمانوں کی جماعت تشکیل دی۔ یوں وہ امتِ واحدہ کی صورت اختیار کر گئے۔ [2]

اس امت کے افراد خاندانی تعلقات اور خونی رشتوں کے بجائے عقیدۂ توحید کی بنا پر متحد ہوئے۔ ان کے افکار و نظریات میں زبردست ہم آہنگی پیدا ہو گئی، ان کے جذبات و احساسات ایک ہو گئے اور زندگی کے سفر میں وہ سب ایک درست سمت کی طرف چل پڑے۔ اس سے قبل ان کی وفاؤں کا مرکز ومحور ان کا قبیلہ تھا لیکن اب ان کی تمام تر وفاداری اور حمایت اللہ کے لیے تھی۔ ان کا سر رائج الوقت نظام کے آگے جھکنے کے بجائے شریعتِ اسلامی کے سامنے جھکا۔ وہ عامۃ الناس کے مقابلے میں امتیازی حیثیت اختیار کر گئے۔ اب امت کا یہ لفظ صرف مسلمانوں کے لیے ہے۔ یہود اور ان کے حلیف اس کے مفہوم میں شامل نہیں رہے۔

دراصل اس دینی جماعت کو الگ حیثیت دینا وقت کا ایک اہم تقاضا تھا۔ اس سے مقصود بھی یہی تھا کہ امت کی باہمی ہم آہنگی اور خود اعتمادی میں اضافہ ہو۔ [3]

مسلم امت کے امتیاز کا ایک مظہر تحویل قبلہ ہے کہ سولہ یا سترہ ماہ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرنے کے بعد بیت اللہ کو قبلہ قرار دے دیا گیا۔ [4]

نبی ﷺ نے بھی کئی ایک معاملات میں اپنے پیروکاروں کو دوسروں سے نمایاں کرنے کی کوشش کی اور وضاحت سے بتایا کہ میں ان امور میں اپنے لوگوں کو یہود سے مختلف اور ممتاز دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس سلسلے کا عملی اقدام یہ تھا کہ یہود جوتا پہن کر عبادت نہیں کرتے تھے نبی ﷺ نے اپنے اصحاب کو جوتا پہن کر نماز ادا کرنے کی اجازت دی۔ یہود سفید بالوں کو

---

1 التاريخ السياسي والحضاري للدكتور السيد عبد العزيز، ص: 100. 2 قيادة الرسول لأحمد راتب، ص: 93. 3 السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري: 293/1. 4 تاريخ خليفة بن خياط، ص: 24,23، والسيرة النبوية لابن هشام: 550/1.

رنگتے نہیں تھے۔ مسلمانوں نے سر کے سفید بالوں کو مہندی وغیرہ سے رنگنا شروع کر دیا۔ یہودی عاشورا کا روزہ رکھتے تھے۔ نبی ﷺ نے بھی یہ روزہ رکھا لیکن زندگی کے آخری ایام میں عزم کیا کہ آئندہ یہود کی مخالفت میں ''تاسوعا'' یعنی نویں محرم کا روزہ بھی رکھیں گے۔[1]

اس ضمن میں رسول اللہ ﷺ نے اہلِ اسلام کو دیگر اقوام وملل سے نمایاں نظر آنے کی خاطر اصولی فیصلہ کرتے ہوئے فرمایا: «مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ» ''جو کسی قوم سے مشابہت کرے وہ انھی میں سے ہے۔''[2] مزید فرمایا: «لَا تَشَبَّهُوا بِالْيَهُودِ» ''یہود سے مشابہت نہ کرو۔''[3]

بہت سی احادیث میں اہل ایمان کو دیگر اقوام کے مقابلے میں امتیازی حیثیت اختیار کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ بلاشبہ غیر مسلموں کی نقالی اسلامی شان وشوکت اور خود اعتمادی کے منافی ہے۔ لیکن نمایاں حیثیت اختیار کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ مسلمان اپنے آپ کو دیگر اقوام سے بالکل الگ تھلگ کر لیں اور اُن سے کسی قسم کا رابطہ نہ رکھیں۔ نہیں بلکہ امت مسلمہ میں شمولیت کے دروازے کھلے ہیں اور اس میں توسیع کی گنجائش موجود ہے۔ عقیدۂ توحید کے زیور سے آراستہ ہو کر ہر انسان اس کے زیر سایہ آ سکتا اور یہ امتیازی شان حاصل کر سکتا ہے۔[4]

میثاق میں یہود کو اسلامی ریاست کے باشندے کہا گیا اور انھیں ریاست کا ایک عنصر تسلیم کیا گیا ہے، چنانچہ معاہدے کی سولھویں شق میں لکھا گیا کہ یہود میں سے جس نے ہمارا ساتھ دیا اسے مسلمانوں کی مدد حاصل ہوگی اور اس سے مساویانہ سلوک کیا جائے گا۔ ان پر ظلم ہوگا اور نہ ان کے خلاف کسی سے تعاون کیا جائے گا۔ اس اصول کی مزید وضاحت پچیسویں شق میں کی گئی کہ بنوعوف کے یہود مومنین کے ساتھ مل کر ایک امت ہیں۔ یوں

[1] السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري: 293/1. [2] مسند أحمد: 50/2 و 92، و سنن أبي داود، حديث: 4031. [3] مسند أحمد: 165/1، و السنن الكبرٰى للنسائي: 137/8، و مسند أبي يعلٰى، حديث: 681. [4] السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري: 293/1.

اسلام نے اہل کتاب کو جو مدینہ کے بیچوں بیچ اور اطراف و جوانب میں آباد تھے، معاہدے کی پاسداری کی شرط پر مسلمانوں کے ساتھ ایک امت تسلیم کیا۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی انسان کے لیے دین یا مذہب کا اختلاف وطنیت سے محرومی کا باعث نہیں بن سکتا۔ [1]

اقتدار اعلیٰ صرف اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے لیے ہے

اس دستور کے مطابق مدینہ منورہ میں تمام داخلی و خارجی معاملات کا حتمی فیصلہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا ہوگا۔ معاہدے کی تیئسویں شق میں بیان کیا گیا کہ جب کبھی تم کسی چیز کے بارے میں اختلاف کرو تو اُس کے متعلق اللہ اور اس کے رسول کی طرف رجوع کیا جائے گا۔ اس شق کا واضح مقصد یہ تھا کہ اقتدار اعلیٰ کا تعین کیا جائے جو مدینہ کے داخلی و خارجی امور کا نگران ہو اور اختلافات میں اُس کی بات کو قول فیصل کا درجہ دیا جائے تا کہ شہر کے اندر مختلف قیادتوں کے نتیجے میں پھیلنے والی ممکنہ سیاسی انارکی اور اضطراب کا حفظِ ماتقدم کے طور پر سدباب ہو۔اس شق میں ضمنی طور پر یہ بات بھی کھول دی گئی کہ نبی ﷺ اس نئی ریاست کے فرماں روا ہوں گے۔ [2]

دستاویز میں یہ تعین بھی کیا گیا تھا کہ سیاسی نوعیت کے تین بنیادی عدالتی، قانون سازی اور نفاذ قوانین کے اختیارات کا سرچشمہ کیا ہوگا۔

رسول اللہ ﷺ اللہ کے احکامات کو اس نئی ریاست میں نافذ کرنے کی شدید خواہش رکھتے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ زمین پر اللہ تعالیٰ کی حاکمیت باور کرانا اور اس کے نفاذ کی کوشش کرنا اس کی بندگی کا مظہر ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ ۚ أَمَرَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ ۚ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ۝﴾

---

1 نظام الحكم لظافر القاسمي: 37/1. 2 التاريخ السياسي والحضاري للدكتور السيد عبدالعزيز، ص: 102.

”اللہ کے سوا کسی کا حکم نہیں۔ اس نے حکم دیا ہے کہ تم صرف اسی کی عبادت کرو یہی سیدھا دین ہے مگر اکثر لوگ علم نہیں رکھتے۔“ [1]

یعنی عقائد، عبادات اور معاملاتِ زندگی میں حقیقی حکومت اللہ تعالیٰ ہی کی ہے، وہ اپنے چنیدہ بندوں پر یہ احکام نازل فرماتا ہے۔ کسی بشر کے لائق نہیں کہ وہ ان معاملات میں اپنی رائے، خواہش، عقل، قیاس، اجتہاد یا استحسان وغیرہ سے کام لے۔ یہ قاعدہ اللہ کے دین کی اساس ہے جو تمام پیغمبروں نے بیان کیا۔ زمان و مکان کا ہیر پھیر اس میں کوئی تبدیلی نہیں لا سکتا۔ [2]

قرآنِ کریم نازل کرنے کا اصل مقصد یہی ہے کہ بندوں پر واضح کر دیا جائے کہ بندگی صرف اللہ تعالیٰ کی ہے اور اقتدارِ اعلیٰ بھی اسی کے پاس ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ۝ اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ ۚ وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ فِيْ مَا هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ڛ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ كٰذِبٌ كَفَّارٌ ۝﴾

”بے شک ہم نے یہ کتاب آپ کی طرف حق کے ساتھ نازل کی ہے، لہٰذا آپ اللہ کے لیے بندگی کو خالص کرتے ہوئے اسی کی عبادت کیجیے۔ سنو! خالص اطاعت و بندگی اللہ ہی کے لیے ہے اور جن لوگوں نے اس کے سوا کارساز بنا رکھے ہیں، (وہ کہتے ہیں:) ہم ان کی عبادت صرف اس لیے کرتے ہیں کہ وہ ہمیں اللہ کے زیادہ قریب کر دیں، یقیناً اللہ ان کے درمیان ان باتوں کا فیصلہ فرمائے گا جن میں وہ اختلاف کرتے ہیں، بے شک اللہ اسے ہدایت نہیں دیتا جو جھوٹا، ناشکرا ہو۔“ [3]

[1] یوسف 40:12. [2] تفسیر المنار لمحمد رشید رضا: 309/12. [3] الزمر 39:2،3.

ایک اور موقع پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ إِنَّآ أَنزَلْنَآ إِلَيْكَ ٱلْكِتَٰبَ بِٱلْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ ٱلنَّاسِ بِمَآ أَرَىٰكَ ٱللَّهُ ۚ وَلَا تَكُن لِّلْخَآئِنِينَ خَصِيمًا ۝ ﴾

''(اے نبی!) بے شک ہم نے آپ کی طرف یہ کتاب حق کے ساتھ نازل کی ہے تا کہ آپ کو اللہ نے جو سیدھی راہ دکھائی ہے اس کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلہ کریں اور آپ خیانت کرنے والوں کے حمایتی نہ بنیں۔''[1]

چنانچہ قرآن کریم کے نزول کا مقصد بندوں کو اللہ کی بندگی باور کرانا اور اس کی حاکمیت کا نفاذ ہے۔ عبادت کا سرچشمہ صرف وحی ہوسکتا ہے تو باقی تمام فیصلے بھی نازل شدہ قوانین یا ایسے قانون کے مطابق ہوں گے جس کی اساس قانونِ الٰہی پر ہو۔[2]

دراصل اللہ کی حاکمیت کا قیام اس کی بندگی ہی کو مستحکم کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ اسی کے واسطے سے وہ مقصد بھی پورا ہوتا ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے جن و انس کی تخلیق فرمائی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَمَا خَلَقْتُ ٱلْجِنَّ وَٱلْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ ۝ ﴾

''اور میں نے جن اور انسان اسی لیے تو پیدا کیے ہیں کہ وہ میری ہی عبادت کریں۔''[3]

میثاقِ مدینہ میں یہود نے اگرچہ اس عدالت عالیہ کو تسلیم کرلیا جس سے اہلِ مدینہ اپنے مسائل کے سلسلے میں رجوع کریں گے۔ اس کا تذکرہ وثیقے کی تینتالیسویں شق میں کیا گیا ہے۔ لیکن یہود پر یہ لازم نہیں تھا کہ ہر مسئلے کے بارے میں اسلامی عدالت سے فیصلہ کرائیں بلکہ انھیں صرف ان کے اور مسلمانوں کے درمیان پیدا ہونے والے اختلافات کے وقت حکم تھا کہ اسلامی عدالت سے رجوع کریں۔ ذاتی معاملات میں یہود کو تورات کی

[1] النسآء 4:105. [2] الحكم والتحاكم لعبد العزيز كامل:1/433. [3] الذّٰريٰت51:56.

طرف رجوع کرنے کی مکمل آزادی تھی۔ اور ان کے ''احبار اور ربی'' ان کے درمیان تورات کے مطابق فیصلہ کرنے کے پابند تھے۔ ہاں اگر وہ اپنی خوشی سے رسول اللہ ﷺ کی عدالتِ عالیہ میں مقدمہ پیش کرنا چاہتے تو بھی ان کی مرضی پر منحصر تھا۔ نبی ﷺ کو بھی ان کا فیصل بننے یا ان کے مسائل احبار کی طرف لوٹانے کا اختیار دیا گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ ۚ فَاِنْ جَآءُوْكَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ اَوْ اَعْرِضْ عَنْهُمْ ۚ وَاِنْ تُعْرِضْ عَنْهُمْ فَلَنْ يَّضُرُّوْكَ شَيْـًٔا ۭ وَاِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۝﴾

''وہ جھوٹی باتیں سننے کے عادی ہیں اور جی بھر کر حرام کھانے والے ہیں۔ پھر اگر وہ آپ کے پاس آئیں تو آپ (کو اختیار ہے کہ) ان کے درمیان فیصلہ کر دیں یا ان سے اعراض کریں اور اگر آپ ان سے منہ موڑ لیں گے تو بھی وہ آپ کو قطعاً کوئی نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔ اور اگر آپ ان کے درمیان کوئی فیصلہ کریں تو انصاف کے ساتھ کریں۔ بے شک اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔''[1]

یہود نے جن مسائل میں نبی ﷺ کو ثالث تسلیم کیا ان میں سے ایک بنونضیر اور بنوقریظہ کے درمیان مقتولین کی دیت کا مسئلہ تھا۔ بنونضیر بنوقریظہ پر فوقیت رکھتے تھے، چنانچہ وہ اپنے مقتولین کی دیت بڑھا چڑھا کر وصول کرتے۔ اسلام مدینہ میں پہنچا تو بنوقریظہ نے مقررہ مقدار سے زیادہ دیت دینے سے انکار کر دیا اور اس سلسلے میں مساوات کے طلبگار ہوئے۔[2]

اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

﴿وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَآ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَالْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ ۭ فَمَنْ تَصَدَّقَ

[1] المآئدة 5:42. [2] السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري: 1/291.

بِهٖ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ ۚ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝﴾

''اور ہم نے تورات میں ان کے لیے لکھ دیا تھا کہ بے شک جان کے بدلے جان ہے اور آنکھ کے بدلے آنکھ اور ناک کے بدلے ناک اور کان کے بدلے کان اور دانت کے بدلے دانت اور تمام زخموں کا قصاص ہے، پھر جو شخص اسے معاف کر دے تو وہ اس کے لیے کفارہ ہے۔ اور جو لوگ اللہ کے نازل کیے ہوئے کے مطابق فیصلے نہ کریں وہی ظالم ہیں۔''[1]

دستور کی تینتالیسویں شق میں کہا گیا کہ اہلِ میثاق کے درمیان کوئی معاملہ یا جھگڑا ہو جائے جس کے نتیجے میں فساد کا اندیشہ ہو تو اس کے متعلق اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف رجوع کیا جائے۔ اس شق کے مطابق رسول اللہ ﷺ کو فیصلہ کرنے کا مرکزی اختیار حاصل ہو گیا۔ تمام اہلِ مدینہ کو اسی عدالت سے رجوع کرنے کو کہا گیا۔ اسی مرکزی اختیار کو قانون کے نفاذ کا اختیار بھی دیا گیا کیونکہ قوانین الٰہیہ کی اطاعت واجب اور ان کا نفاذ لازم ہے۔ نبی ﷺ کے جاری کردہ احکامات بھی اللہ کی طرف سے وحی کی صورت میں نازل ہوئے تھے جنھیں تسلیم کرنا اور ان کا پابند ہونا ضروری ہے۔[2]

یوں رسول اللہ ﷺ اس ریاست کے سربراہ قرار پائے اور آپ کو قانون سازی، عدالتی اور مرکزی نفاذ قانون کے تینوں اختیارات بیک وقت حاصل ہو گئے، چنانچہ کلام اللہ کا مفسر اور شریعتِ اسلامی کا مبلغ ہونے کی حیثیت سے آپ ﷺ نے مرکزی نوعیت کے یہ تینوں اختیارات سنبھال لیے۔ آپ ﷺ کی سربراہی وثیقے کی دفعات کے تحت اور مدینہ میں موجود تمام سیاسی گروہوں کے اتفاق سے عمل میں آئی۔ رسول اللہ ﷺ کی اسی مرکزی حیثیت کو تسلیم کرتے ہوئے وثیقے کی چھتیسویں شق میں کہا گیا: ''ان میں سے کوئی بھی محمد ﷺ

[1] المآئدة 5:45. [2] دولة الرسول من التكوين إلى التمكين للدكتور كامل سلامة، ص: 418.

کی اجازت کے بغیر معاہدے سے نہیں نکلے گا۔''

یہ بات بھی نہایت اثر انگیز تھی کہ اہلِ میثاق میں سے کسی کو قریش اور اس کے حمایتی قبائل سے حلیفانہ تعلقات قائم کرنے کی اجازت نہیں۔ چوالیسویں شق میں جو اصول مقرر کیا گیا وہ کہیں زیادہ دور رس، دوٹوک اور واضح تھا کہ قریش اور اس کے ہم نواؤں کو پناہ نہیں دی جائے گی۔ یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ صحیفے میں رسول اللہ ﷺ کے سوا کسی شخص کا نام نہیں آیا۔[1]

ریاست کا دارالحکومت

دستاویز کی چالیسویں شق میں کہا گیا: ''شرکائے معاہدہ کے لیے سرزمینِ یثرب کی حیثیت حرم (مقدس مقام اور جنگ کے لیے ممنوعہ علاقہ) کی ہوگی۔''

حرم قرار دینے کا مطلب یہ ہے کہ نہ یہاں کا درخت کاٹا جائے گا اور نہ یہاں آباد یا موجود کسی پرندے کو مارا جائے گا۔ نباتات و پرند کو یہ تحفظ دیا گیا تو انسانی جان و مال کے تقدس کا عالم کیا ہوگا، اس کا اندازہ کرنا مشکل نہیں۔[2]

یوں اس دستاویز میں ریاست کے خدوخال کی وضاحت آ گئی ہے کہ ایک امت کا تصور، اسلامی ریاست کی سرزمین اور حاکمانہ اختیارات کا حامل ایک ادارہ جس کی طرف مسائل کے سلسلے میں رجوع کیا جائے اور وہ اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکامات کے مطابق فیصلہ کرے۔

مدینہ اسلامی ریاست کی ابتدائی سرزمین تھی۔ یہ نقطۂ آغاز تھا۔ یہ اس دائرے کا مرکز تھا جہاں سے یہ مملکت پھیلتی چلی گئی۔

رسول اللہ ﷺ نے صحابۂ کرام کو حرمِ مدینہ کی حدود کو جھنڈے گاڑ کر نشان زدہ کرنے

1 دولة الرسول من التكوين إلى التمكين للدكتور كامل سلامة، ص: 420. 2 نظام الحكم لظافر القاسمي: 38/1.

کے لیے بھیجا تھا۔ مدینہ کی مشرقی اور مغربی جانب دو حروں (سیاہ پتھریلے میدانوں) کی درمیانی زمین اور شمالی جانب جبل ثور اور جنوبی جانب جبل عیر حرم کی حدود قرار دی گئیں۔ ارشادِ نبوی ہے:

«اَلْمَدِينَةُ حَرَمٌ مَّا بَيْنَ عَيرٍ إِلٰى ثَوْرٍ، فَمَنْ أَحْدَثَ فِيهَا حَدَثًا، أَوْ آوٰى مُحْدِثًا، فَعَلَيْهِ لَعْنَةُ اللّٰهِ......»

''جبل عیر اور جبل ثور کے درمیان کا مدینہ حرم ہے۔ جس شخص نے یہاں دین میں کوئی نئی چیز شامل کی یا کسی بدعتی کو پناہ دی اس پر اللہ کی لعنت ہے......''[1]

فتوحات بڑھیں اور مفتوحہ علاقوں کی قومیں اسلام میں داخل ہوئیں تو ریاست اسلامی کی سرزمین بھی وسیع تر ہوتی چلی گئی اور اسلامی سلطنت کا دائرۂ عمل اس قدر وسعت اختیار کر گیا کہ اس کی سرحدیں مغرب میں بحر اوقیانوس، سپین اور فرانس تک، مشرق میں وسطی ایشیا اور چین تک اور جنوب میں صومالیہ و زنجبار اور افریقہ کے وسط تک پھیل گئیں۔[2]

اسلامی ریاست کھلی اور غیر محدود ہے۔ اس کی کوئی جغرافیائی یا سیاسی حد نہیں۔ یہ اپنے دارالخلافہ مدینہ سے شروع ہو کر پوری زمین پر پھیلی ہوئی ہے اور پوری زمین ہی اس کی حدود میں شامل ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ وَاصْبِرُوْا ۚ اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ ۙ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۭ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝﴾

''موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا: تم اللہ سے مدد مانگو اور صبر کرو، بے شک زمین تو اللہ ہی کی ہے، وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اس کا وارث بناتا ہے اور (اچھا) انجام تو پرہیزگاروں ہی کے لیے ہے۔''[3]

[1] صحيح البخاري، حديث: 6755، و صحيح مسلم، حديث: 1370. [2] دولة الرسول من التكوين إلى التمكين للدكتور كامل سلامة، ص: 411. [3] الأعراف 128:7.

ریاست کی طرح امت کا لفظ بھی وسیع مفہوم رکھتا ہے۔ یہ لفظ کسی ایک گروہ کے ساتھ خاص نہیں بلکہ پوری انسانیت کو محیط ہے۔ زمین پر بسنے والا ہر وہ انسان جو اللہ کے پسندیدہ دین (اسلام) کو اختیار کر لے، امت کا فرد ہے۔ یوں ریاستِ اسلامی عالمگیر رسالت کی عالمگیر ریاست ہے اور دنیا کے ہر گوشے میں بسنے والے مسلمان کا اس میں حصہ ہے اور یہ ریاست جہاد کے ذریعے وسعت اختیار کر گئی ہے۔[1]

آزادی اور انسانی حقوق

دستاویز کی تمام دفعات نبی ﷺ کی بلند پایہ اور وسیع سوچ کی آئینہ دار ہیں۔ اس کا مربوط اور جامع انداز آپ ﷺ کی عبقریت کا شاہدِ عادل ہے۔ مدینہ کے اس وقت کے حالات کے لیے یہ تحریر بہت مناسب تھی۔ اس میں ایسے قوانین وضع کر دیے گئے تھے جو بنی نوع انسان کے درمیان عدل و انصاف اور مساوات کے ضامن تھے۔ مختلف رنگ و نسل، زبان، متفاوت ادیان سے تعلق رکھنے والے تمام افراد کو اس تحریر کی رو سے وہ جمیع حقوق اور آزادیاں حاصل تھیں جن کا ذکر اس کے مندرجات میں کیا گیا تھا۔[2]

پروفیسر محمد سلیم العوا کہتے ہیں: ''اس دستور کے تمام قوانین پر ہمیشہ سے عمل رہا ہے۔ غالباً آج تک جتنے سیاسی دستور نافذ العمل رہے ہیں، اس تحریر کی بنیادی باتیں ان کا حصہ رہی ہیں۔ دنیا کے لوگ صدیوں کی تگ و دو کے بعد جس قانون تک پہنچے رسول اللہ ﷺ نے اسے آج سے چودہ سو برس پیشتر پہلے سیاسی وثیقے کی شکل میں مدون فرما دیا تھا۔''[3]

اس دستور نے اعلان کیا تھا کہ ہر قسم کی آزادی کا حق محفوظ ہے، چاہے وہ عقیدے کی آزادی ہو، عبادت کی آزادی یا امن کا حق۔ مذہب کی آزادی کا ذمہ بھی یہ کہہ کر

---

[1] دولة الرسول من التكوين إلى التمكين للدكتور كامل سلامة، ص:421. [2] دولة الرسول من التكوين إلى التمكين للدكتور كامل سلامة، ص: 420. [3] النظام السياسي في الإسلام لأبي فارس، ص: 65.

اٹھایا گیا تھا کہ مسلمانوں کے لیے ان کا دین ہے اور یہود کے لیے ان کا دین۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۖ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا ۗ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ﴾

''دین میں کوئی زبردستی نہیں، ہدایت، گمراہی سے واضح ہو چکی ہے، پھر جو شخص طاغوت کا انکار کرے اور اللہ پر ایمان لے آئے تو یقیناً اس نے ایک مضبوط کڑا تھام لیا جو ٹوٹنے والا نہیں اور اللہ خوب سننے والا، خوب جاننے والا ہے۔''[1]

تحریر میں اس بنیادی اصول کی خلاف ورزی کرنے والے کو سنگین نتائج کی وعید بھی سنائی گئی ہے۔

اسلامی ریاست کی ذمہ داری ہے کہ وہ لوگوں کے درمیان نظامِ عدل و انصاف قائم کرے اور لوگوں کے لیے حصولِ انصاف کے راستے آسان بنائے۔[2]

اسلامی ریاست کی یہ ذمہ داری بھی ہے کہ وہ حق دار کے راستے کی ہر رکاوٹ دور کرے۔ اسلام نے حکمرانوں کے لیے ضروری قرار دیا ہے کہ وہ علاقے، زبان اور معاشرتی مقام کی تمیز کے بغیر لوگوں کو فوری اور صحیح انصاف مہیا کریں اور حق کا ساتھ دیں۔ دوست، دشمن، امیر، غریب، رشتہ دار، عدل و انصاف کی راہ میں رکاوٹ نہ بنیں۔[3]

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ ۖ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ۚ اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۚ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ﴾

[1] البقرة 2:256. [2] النظام السياسي في الإسلام لأبي فارس، ص: 58. [3] النظام السياسي في الإسلام لأبي فارس، ص: 52.

”اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تم اللہ کے لیے (حق پر) قائم رہنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بنو اور کسی قوم کی دشمنی تمھیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم عدل نہ کرو، عدل کرو، یہی بات تقویٰ کے زیادہ قریب ہے اور اللہ سے ڈرو، بے شک تم جو عمل کرتے ہو اللہ اس سے خوب آگاہ ہے۔“ [1]

ارشادِ ربانی ہے:

﴿فَلِذٰلِكَ فَادْعُ ۚ وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ ۚ وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ ۚ وَّاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ ۭ اَللّٰهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۭ لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۭ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ ۭ اَللّٰهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا ۚ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ﴾

”لہٰذا آپ اسی (دین) کی طرف (سب کو) بلائیں اور ثابت قدم رہیں جیسے آپ کو حکم دیا گیا ہے اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کریں اور کہہ دیجیے: اللہ نے جو کتاب بھی نازل کی ہے، میں اس پر ایمان لایا ہوں اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمھارے درمیان انصاف کروں، اللہ ہی ہمارا رب ہے اور تمھارا بھی رب ہے، ہمارے لیے ہمارے اعمال ہیں اور تمھارے لیے تمھارے اعمال، ہمارے اور تمھارے درمیان کوئی جھگڑا نہیں، اللہ (روز قیامت) ہم سب کو جمع کرے گا اور اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔“ [2]

مولانا مودودی رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں: ”مطلب یہ کہ مجھے دشمنی کا نہیں بلکہ انصاف کا حکم ہے۔ میری شان کے لائق نہیں ہے کہ تعصب سے کام لوں۔ میرا تعلق سب لوگوں سے یکساں ہے جو عدل و انصاف پر مبنی ہے۔ میں حق دار کا مددگار اور ظالم کا مخالف ہوں اور میرے دین میں کسی سے امتیازی سلوک کی گنجائش نہیں۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ

[1] المآئدۃ 5:8. [2] الشوریٰ 42:15.

میرے اقربا کے لیے ایک قانون ہو اور دیگر افراد کے لیے دوسرا قانون۔ میرے نزدیک چھوٹے کے مقابلے بڑے کو امتیازی حیثیت حاصل نہیں۔ امیر کبیر اور نچلے طبقے کے لوگ میرے نزدیک برابر ہیں۔ حقوق سب کے لیے ایک سے ہیں۔ جرم سب کے لیے جرم ہے۔ حرام سب کے لیے حرام ہے اور حلال سب کے لیے حلال ہے۔ فرض سب پر فرض ہے حتیٰ کہ میں خود قانونِ الٰہی کی دسترس سے باہر نہیں ہوں۔‘‘ [1]

بلاشبہ مسلم معاشرے کی تربیت اور اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ جو اس کے تربیتی طریقِ کار میں موجود ہیں، بنی نوعِ انسان کی قیادت کے لیے اس معاشرے کی تیاری کا تمام تر انحصار اس امر پر ہے کہ عدل و انصاف کی بالادستی اور افرادِ ملت کے درمیان اس کا قیام ہو، اس لیے کہ عدل و انصاف ایک راست باز قیادت کی عمارت کا بنیادی رکن ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ وَلَوْ عَلَىٰ أَنفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ ۚ إِن يَكُنْ غَنِيًّا أَوْ فَقِيرًا فَاللَّهُ أَوْلَىٰ بِهِمَا ۖ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوَىٰ أَن تَعْدِلُوا ۚ وَإِن تَلْوُوا أَوْ تُعْرِضُوا فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا﴾

’’اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تم انصاف کے لیے ڈٹ جانے والے اور اللہ کے لیے سچی گواہی دینے والے بن جاؤ، خواہ وہ تمھارے اپنے خلاف یا تمھارے والدین اور رشتہ داروں کے خلاف ہو، (معاملے کا فریق) امیر ہو یا غریب، دونوں صورتوں میں تمھاری نسبت اللہ زیادہ ان کا خیر خواہ ہے۔ پس تم نفسانی خواہش کے پیچھے پڑ کر انصاف کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑو۔ اور اگر تم نے توڑ مروڑ کر بات کی یا (گواہی دینے سے) منہ موڑا تو بے شک تم جو بھی عمل کرتے ہو اللہ

[1] الحكومة الإسلامية للمودودي، ص:202.

اس سے خوب باخبر ہے۔'' [1]

قرآن کریم کی صریح نص کے مطابق اسلامی معاشرہ کامل ترین عدل و انصاف کا مظہر ہونا چاہیے۔ اپنے لیے اور عزیز و اقارب کے لیے عدل و انصاف کے جو پیمانے ہیں وہی دوسروں کے لیے بھی ہونے چاہئیں۔

﴿ كُونُوا ﴾ کا لفظ مسلم معاشرے کے تمام افراد کو، خواہ وہ دنیا میں جہاں بھی موجود ہوں، عدل کا حکم سنا رہا ہے۔ اس لفظ کا مادہ و ماخذ زندگی میں عدل و انصاف کے ضوابط کو لازماً قائم کرنے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ ﴿ قَوّٰمِيْنَ ﴾ مبالغے کا صیغہ ہے، جس کا مطلب ہے کہ اسلامی معاشرے کو اپنے تمام تر مادی یا روحانی وسائل کے ساتھ عدل و انصاف قائم کرنے کے لیے پوری طاقت صرف کرنی چاہیے اور اجتماعی عدل و انصاف کے ارکان کے استحکام کے سلسلے میں ہمت اور حوصلے سے کام لینا چاہیے۔

قرآن کریم اسلامی معاشرے کا دستور ہے جو انسانی زندگی میں قوانین عدل کے برائے نام نفاذ کا خواہاں نہیں۔ قرآن کریم انسانی ضمیر کی گہرائیوں میں داخل ہوتا ہے اور فرد کو ایسے جذبات کے زیرِ اثر آنے سے روکتا ہے جن میں امیر کی دولت کے دباؤ میں آنے یا غریب کی غربت کی وجہ سے اس پر رحم کھانے کا شائبہ ہو۔ امیر کی دولت کے دباؤ میں آ کر یا غریب کی غربت پر ترس کھا کر عدل و انصاف کے تقاضے پورے نہ کرنا قرآنی تعلیمات کے منافی ہے۔

قرآن کریم میں اس آیت کی مثل ایک اور آیت تقریباً انھی الفاظ کے ساتھ سورۂ مائدہ میں بھی وارد ہوئی ہے اور یہاں بھی ﴿ كُونُوا ﴾ کے لفظ سے مخاطب کر کے حکم دیا گیا ہے کہ عدل و انصاف اسلامی معاشرے کے افراد کے مزاج کا حصہ بن جانا چاہیے۔ [2]

ان دونوں آیات میں قیامت تک قائم رہنے والی اسلامی شریعت کے لازوال اصول

[1] النسآء 4:135. [2] محمد رسول اللہ ﷺ لصادق عرجون: 3/142-144.

"عدل و انصاف کی بالادستی" کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

دونوں آیات کا مقصد اسلامی معاشرے کو ایسا قطعی حکم دینا ہے جس میں نرمی کی کوئی گنجائش نہ ہو بلکہ جہاں تک ممکن ہو وہ علَمِ انصاف بلند کیے رہیں۔

مساوات

مساواتِ انسانی کے حوالے سے میثاقِ مدینہ میں وضاحت سے باتیں کی گئی ہیں۔ پندرھویں شق میں کہا گیا ہے: "اللہ کا عہد و پیمان (ضمانت) ایک ہے۔ مسلمانوں کا ادنیٰ سے ادنیٰ فرد بھی کسی کو پناہ دے کر سب کو اس کا پابند کر سکتا ہے۔ اہلِ ایمان دوسرے لوگوں کے بالمقابل آپس میں ایک دوسرے کے حلیف اور ضامن ہیں۔" حلیف و ضامن ہونے کا مطلب یہ ہے کہ تنگدستی ہو یا خوشحالی، وہ ایک دوسرے کی مدد کریں گے۔

انیسویں شق میں کہا گیا ہے: "اہلِ ایمان اللہ کی راہ میں قتل ہونے والوں کا بدلہ لیں گے۔"

سیرت ابن ہشام کے شارح سہیلی اپنی کتاب "الروض الانف" میں لکھتے ہیں: "شق میں مذکور لفظ یبیئ بواء سے ماخوذ ہے جس کے معنی مساوات کے ہیں۔[1]

مساوات کا اصول ایک عام اصول ہے جسے اسلام نے برقرار رکھا۔ یہ ان بنیادوں میں سے ایک ہے جو مسلم معاشرے کی تعمیر و ترقی میں نمایاں کردار ادا کرتی ہیں۔

اسلام کے علاوہ سابقہ شریعتوں اور جدید آئین میں بھی اس کا ذکر ملتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں مبدائے مساوات کے متعلق فرمایا:

﴿يَآأَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَٰكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَٰكُمْ شُعُوبًا وَقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوٓا۟ ۚ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ ٱللَّهِ أَتْقَىٰكُمْ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ ۝﴾

[1] الروض الأنف للسهيلي: 2/17.

”اے لوگو! بلاشبہ ہم نے تمھیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور ہم نے تمھارے خاندان اور قبیلے بنائے تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو، بلاشبہ اللہ کے ہاں تم میں سے زیادہ عزت والا (وہ ہے جو) تم میں سے زیادہ متقی ہے، بلاشبہ اللہ بہت علم والا، خوب باخبر ہے۔“ [1]

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«يَا أَيُّهَا النَّاسُ! أَلَا إِنَّ رَبَّكُمْ وَاحِدٌ، وَّ إِنَّ أَبَاكُمْ وَاحِدٌ، أَلَا لَا فَضْلَ لِعَرَبِيٍّ عَلٰى أَعْجَمِيٍّ، وَّلَا لِأَعْجَمِيٍّ عَلٰى عَرَبِيٍّ، وَّلَا لِأَحْمَرَ عَلٰى أَسْوَدَ، وَلَا لِأَسْوَدَ عَلٰى أَحْمَرَ إِلَّا بِالتَّقْوٰى»

”اے لوگو! آگاہ رہو کہ بلاشبہ تمھارا رب ایک ہے اور تمھارا باپ ایک ہے۔ سنو! کسی عربی کو عجمی پر، عجمی کو عربی پر، سرخ کو کالے پر اور کالے کو سرخ پر کوئی فوقیت حاصل نہیں سوائے تقویٰ کے۔“ [2]

مساوات ایسا اصول ہے جس کے سبب لوگ زمانۂ قدیم سے اس کی طرف کھچے چلے آرہے ہیں اور اسی کی بدولت خیر القرون کے مسلمانوں کو قوت نصیب ہوئی تھی۔[3] غلط فہمی کے شکار بعض لوگ مساوات سے مراد یہ لیتے ہیں کہ زندگی کے تمام شعبوں میں سب افراد برابر ہیں۔ وہ اسی برابری اور مساوات کو عدل و انصاف کا قرین سمجھتے ہیں۔[4] حالانکہ انسانی صلاحیتوں کا تفاوت و اختلاف اور لوگوں کی مختلف طبقات میں تقسیم بھی تخلیقِ کائنات کے اہداف میں شامل ہے۔[5]

میثاقِ مدینہ کی تحریر میں بیان کردہ مساوات کا تعلق ان مخصوص معاملات سے ہے جن

---

[1] الحجرٰت 49:13. [2] مسند أحمد: 411/5. [3] مبادئ نظام الحكم في الإسلام لعبد الحميد متولي، ص: 385. [4] الأخلاق الإسلامية لعبدالرحمٰن الميداني: 624/1. [5] فلسفة التربية الإسلامية لماجد عرسان الكيلاني، ص: 179.

میں مساویانہ حقوق ضروری اور شریعتِ اسلامی کا مطلوب ہیں۔ اس سے مراد زندگی کے تمام شعبوں میں سب انسانی طبقوں اور اجناس کے درمیان عام مساوات قائم کر دینا نہیں۔ [1]

یہاں مساوات کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں سے شریعت، عدل و انصاف اور اسلامی احکامات کے تقاضوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے رنگ و نسل اور طبقاتی تفریق کی تمیز کیے بغیر تعامل کیا جائے۔

اسلام کی نظر میں حاکم و محکوم، مرد و عورت، عرب و عجم، کالے گورے سب انسان برابر ہیں۔ اسلام نے لوگوں کے درمیان رنگ و نسل اور خاندانی و طبقاتی تقسیم کے امتیازات ختم کر دیے ہیں۔ [2]

ہر طبقے کے لوگ شریعت کی نظر میں برابر ہیں۔ اسلامی ریاست نے اپنے ابتدائی دور میں مساوات کے اسی قانون کو لاگو کیا تھا۔ ریاست نے حسبِ ذیل امور پیشِ نظر رکھے تھے:

- مساوات کا اصول عبادت کا درجہ رکھتا ہے جس پر خالقِ کائنات کی طرف سے اجر و ثواب دیا جاتا ہے۔
- انسانی مساوات کے منافی تمام طبقاتی، مروجہ قبائلی، نسلی، قومی، وطنی اور علاقائی معیار ختم کرنا اور ان کی جگہ فضیلت کے واحد معیارِ ربانی ''تقویٰ'' کا لحاظ کرنا ضروری ہے۔
- حسب و نسب اور مراتب کو نظر انداز کرتے ہوئے ہر خاص و عام کے لیے یکساں مواقع فراہم کرنا تاکہ ہر فرد اپنی صلاحیتوں کے مطابق ان مواقع سے استفادہ کر سکے۔
- اسلامی ریاست میں جاری مساوات کا اصول اہلِ ریاست کی یکجہتی کا باعث ہے۔ اس کے نتیجے میں مربوط اور رحمدل معاشرہ جنم لیتا ہے جو ایک خاص عقیدے اور سرچشمۂ حیات کا حامل ہوتا ہے اور ایک منفرد منہج پر عمل پیرا ہوتا ہے۔ [3]

[1] مبادئ علم الإدارة لمحمد نورالدين عبدالرزاق، ص: 116. [2] فقه التمكين في القرآن الكريم للصلابي، ص:463. [3] فقه التمكين في القرآن الكريم للصلابي، ص: 466.

وثیقے میں وہ تمام اجزا بدرجۂ اتم موجود ہیں جن سے ریاست کا دستوری و انتظامی ڈھانچا تشکیل پاتا ہے اور ریاست کے افراد سے ریاست کے تعلقات کی نوعیت متعین ہوتی ہے۔ قرآن کریم دس سال تک مدینہ میں نازل ہوتا رہا۔ اس دوران اس نے مسلمانوں کے لیے زندگی گزارنے کے طور طریقے بیان کیے۔ حکومت و سیاست کے اصول وضوابط مقرر کیے۔ معاشرتی مسائل کا شافی حل پیش کیا۔ حلال وحرام کے احکامات واضح کیے۔ عدل و قضاء کی بنیادیں رکھیں اور نئی مسلم ریاست کے داخلی و خارجی امور کے متعلق پالیسیاں وضع کیں۔

سنت رسول ﷺ نے نور و بصیرت کے آئینے میں قرآنی احکامات کی تائید کی، ان کے نقوش گہرے کیے اور قرآن میں جہاں جہاں اجمال تھا، اس کی تفصیل بیان کی۔

اس وثیقے نے دستوری اقدامات کے سلسلے میں وسیع و عریض لائحہ عمل پیش کیا۔ یہ تحریر ان معاہدوں میں گُلِ سرسبد کی حیثیت رکھتی ہے جو نہایت رواداری سے عدل و انصاف اور مساوات کے تقاضوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے مسلمانوں کے درمیان رہائش پذیر دیگر غیر مسلم اقوام کے ساتھ مسلمانوں کے تعلقات کی حد بندی کرتے ہیں۔

یہ پہلا اسلامی وثیقہ ہے جو ایسے افراد کے لیے تحریر کیا گیا جن پر اسلام سے قبل قبائلی تعصب کا قبضہ رہا اور جنھیں اپنے وجود کا احساس لوگوں پر تسلط اور ان کے شوق کی پامالی ہی سے ہوتا تھا۔[1]

وثیقے میں ایسے تہذیبی عناصر بڑی تعداد میں ملتے ہیں جنھیں دورِ حاضر میں ''حقوقِ انسانی'' کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

معاہدے کے شرکاء پر لازم تھا کہ وہ اس کی دفعات کا احترام کریں اور اس کے مندرجات پر سختی سے عمل پیرا ہوں۔ تو کیا شرکائے معاہدہ کی طرف سے اس بات کا اہتمام

[1] صور و عبر من الجهاد النبوي في المدينة للدكتور فوزي فيض الله، ص:30,29.

کیا گیا؟ اس سوال کا جواب آئندہ سطور میں دیا جاتا ہے۔[1]

یہودِ مدینہ کا نقطۂ نظر

محمد ﷺ کی رسالت کی سچائی پر قوی اور روشن دلائل میسر آ جانے کے باوجود یہودِ مدینہ کے دل محمد ﷺ اور آپ کے ہمراہیوں کے خلاف بغض و عناد اور حسد و عداوت کے جذبات سے مملو تھے۔ اہلِ کتاب ہونے کے گھمنڈ نے انھیں راہِ راست پر آنے سے روک لیا تھا۔

ام المومنین صفیہ بنت حیی بن اخطب رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ میں اپنے والد کی چہیتی اولاد تھی اور چچا ابویاسر بھی مجھ سے بہت پیار کرتے تھے۔ بچوں میں کھیلتے ہوئے وہ دونوں مجھی کو گود لیتے اور پیار کرتے۔ نبی ﷺ مدینہ تشریف لائے اور قبا میں بنو عمرو بن عوف کے ہاں ٹھہرے تو میرے والد حیی بن اخطب اور چچا ابویاسر بن اخطب منہ اندھیرے ان سے ملنے گئے اور سارا دن وہاں گزار کر غروب آفتاب پر لوٹے۔ وہ دونوں بوجھل قدم اٹھاتے، آہستہ خرامی سے چلتے ہوئے آئے۔ میں حسب عادت چہکتی ہوئی ان کی طرف بڑھی تو اللہ کی قسم! مارے غم کے دونوں میں سے کوئی بھی میری طرف متوجہ نہ ہوا، پھر میں نے چچا ابویاسر کو والد حیی بن اخطب سے سوال کرتے ہوئے سنا کہ کیا یہ وہی ہے؟ وہ بولے: ''ہاں اللہ کی قسم! یہ وہی ہے۔'' چچا نے پوچھا: ''کیا آپ اسے اچھی طرح پہچانتے ہیں؟'' والد نے جواب دیا: ''ہاں'' اس پر چچا نے دریافت کیا: ''پھر اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟'' والد نے دانت پیس کر کہا: ''عداوت، اللہ کی قسم! جب تک زندہ ہوں۔ اس شخص سے عداوت رکھوں گا۔''[2]

یہود نے پیغمبر ﷺ اور اہل ایمان کے خلاف پروپیگنڈا مہم شروع کر دی تاکہ آپ ﷺ

---

[1] هجرة الرسول و صحابته لأحمد عبدالغني، ص: 261. [2] السيرة النبوية لابن هشام: 519,518/1.

کی رسالت کو مشکوک بنا کر لوگوں کو اس سے متنفر کیا جائے اور انھیں نبی ﷺ کی ذات پر جو اعتماد ہے اسے بداعتمادی میں بدل دیا جائے۔

درحقیقت یہود اس دین کی ترقی و ترویج کے پسِ منظر میں اپنے ذاتی اور مذہبی مفادات پامال ہوتے دیکھ رہے تھے۔ اسلام کا عقیدۂ توحید ان کے کھوکھلے اور ان گمراہ کن عقائد کا قاتل تھا جن کی بنیاد پر اور نسلی برتری کے سبب وہ اقوامِ عالم پر استوار تھے۔ اسلام نے آتے ہی پکارا کہ اللہ ایک ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ وہی ایک عبادت کے لائق ہے۔ اس نے کسی کو جنم نہیں دیا، نہ وہ خود جنا گیا ہے جبکہ یہود کہتے تھے کہ عزیر اللہ کا بیٹا ہے۔

اسلام نسلِ انسانی کے تمام افراد کی برابری اور مساوات کا داعی تھا۔ اس کا اعلان تھا کہ کوئی قوم کسی قوم سے اور کوئی گروہ کسی گروہ سے برتر و بالا نہیں جبکہ یہود اپنے کو اللہ کی پسندیدہ قوم اور دوسری اقوام سے برتر سمجھتے اور اُنھیں اپنے سے فروتر خیال کرتے تھے۔[1]

انھی اسباب کی بنا پر یہودیوں نے میثاق مدینہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کی نبوت و رسالت کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ وہ لوگ نبی ﷺ کو عاجز کرنے کے لیے کئی سوال لے آئے۔ انھوں نے مومنین کو دھوکا دینے اور اجتماعی معاملات میں ہیرا پھیری کرنے کی کوشش کی اور مکر وفریب کے جال بچھاتے رہے۔[2]

یہود کی طرف سے داخلی محاذ آرائی کی مذموم کوشش: یہودِ مدینہ اسلام کے خلاف محاذ آرا تھے۔ اس محاذ آرائی کے ضمن میں ان کی انتہائی کوشش تھی کہ مدینہ میں فتنہ وفساد کا بازار گرم ہو اور اہلِ شہر، بالخصوص مسلمانوں کا امن وسکون برباد کر دیا جائے۔ ان کی نظر میں اس ہدف تک پہنچنے کا ایک ہی طریقہ تھا کہ جاہلیت کے خوابیدہ نعروں کو بلند آہنگ سے بیدار کر کے قبائلی تعصب کی بجھی ہوئی چنگاریوں کو پھر سے بھڑکا دیا جائے۔ وہ گہری

[1] الصراع مع اليهود لأبي فارس:31/1. [2] الصراع مع اليهود لأبي فارس:1/31-46.

سازشوں کا جال بچھا کر اسلامیانِ مدینہ کے درمیان پھوٹ ڈالنا اور ان کی جمعیت کا شیرازہ بکھیر دینا چاہتے تھے۔ مسلمانوں کی یکجہتی کا تو یہ حال تھا کہ وہ اس ایک جسم کی طرح تھے جس کے کسی ایک عضو کو تکلیف ہو تو سارے اعضاء اس کا درد محسوس کرتے ہیں۔[1]

ایک کائیاں اور سالخوردہ یہودی نے ایک دفعہ انصار کے درمیان پھوٹ ڈالنے کی غرض سے منصوبہ تراشا۔ اس سلسلے میں یہودی کا ارادہ تھا کہ انصار کی صفوں میں گھس کر قبائلی تعصب کو ہوا دی جائے۔ یوں وہ جاہلیت کی طرف لوٹ کر ایک بار پھر باہم دست و گریباں ہو جائیں اور رسول اللہ ﷺ حمایتیوں کی اس طاقتور اور مضبوط ترین جماعت سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔[2]

ابن اسحاق کا بیان ہے کہ شاس بن قیس نامی ایک بوڑھا یہودی کافر جسے مسلمانوں سے بے پناہ خار تھی، اوس و خزرج کے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی مجلس کے قریب سے گزرا جو مل بیٹھ کر باتوں میں مصروف تھے۔ وہ انصار کے درمیان اسلامی بھائی چارے کی بنیاد پر استوار ہونے والی محبت و الفت دیکھ کر غصے سے پیچ و تاب کھانے لگا کہ یہ وہی اوس و خزرج ہیں جو جاہلیت میں کبھی ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے۔ شاس بن قیس بولا: ''بنو قیلہ (اوس و خزرج کی والدہ) اس علاقے میں یوں باہم شیر و شکر نظر آئیں! نہیں، اللہ کی قسم! ایسی صورتحال میں تو ہمارا ان کے ساتھ گزارا ممکن نہیں۔'' اس نے اپنے ساتھ آئے ایک یہودی نوجوان سے کہا: ''ان کی محفل میں جا بیٹھو اور جنگ بعاث وغیرہ کے قصے چھیڑو اور انھیں وہ اشعار سناؤ جو ان لڑائیوں کے دوران کہے گئے تھے۔''

بعاث کی لڑائی میں اوس و خزرج ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار آئے تھے۔ اس جنگ میں کامیابی اوس کو ملی تھی۔ ان دنوں اوس ابو اسید حضیر بن سماک اشہلی کی قیادت میں لڑتے تھے۔ خزرج کا سردار عمرو بن نعمان بیاض تھا۔ یہ دونوں سردار بعاث کی جنگ میں

[1] الصراع مع اليهود لأبي فارس: 44/1. [2] التاريخ الإسلامي للحميدي: 37/4.

مارے گئے۔

ابن اسحاق کا بیان ہے کہ یہودی نوجوان نے شاس کے حکم کی تعمیل کی جس کے سبب اصحاب مجلس میں تو تو میں میں ہونے لگی۔ جھگڑے نے یہاں تک طول کھینچا کہ اوس کے قبیلے بنو حارثہ کا اوس بن قیظی اور خزرج کے قبیلے بنی سلمہ کا جبار بن صخر گھٹنوں کے بل بیٹھ کر ایک دوسرے کے لتے لینے لگے۔ ایک نے کہا: ''اگر تم چاہو تو ہم اسے (جنگ کو) ابھی جوان کر دیتے ہیں۔'' اس پر دونوں فریق طیش میں آ گئے اور بولے: ''ٹھیک ہے، حرہ میں جنگ ہوگی۔'' ہر طرف سے ہتھیار اٹھاؤ، ہتھیار اٹھاؤ کی آوازیں آنے لگیں اور سب حرہ کی طرف کھڑے ہوئے۔

رسول اللہ ﷺ کو اس واقعے کی خبر ہوئی تو آپ چند مہاجرین کے ہمراہ فوراً پہنچے اور فرمایا:

«يَا مَعْشَرَ الْمُسْلِمِينَ! اللّٰهَ اللّٰهَ! أَبِدَعْوَى الْجَاهِلِيَّةِ وَ أَنَا بَيْنَ أَظْهُرِكُمْ بَعْدَ أَنْ هَدَاكُمُ اللّٰهُ لِلْإِسْلَامِ، وَ أَكْرَمَكُمْ بِهٖ وَ قَطَعَ بِهٖ عَنْكُمْ أَمْرَ الْجَاهِلِيَّةِ وَاسْتَنْقَذَكُمْ بِهٖ مِنَ الْكُفْرِ وَ أَلَّفَ بِهٖ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ؟!»

''اے مسلمانوں کی جماعت! اللہ سے ڈرو۔ اللہ سے ڈرو۔ جاہلیت کی پکار لگائی جاتی ہے؟ جبکہ میں تمھارے درمیان موجود ہوں اور اللہ نے تم لوگوں کو اسلام کی ہدایت سے نوازا، اسلام کے ذریعے سے اس نے تمھیں عزت بخشی اور جاہلیت سے تمھاری جان چھڑائی، کفر سے نجات دی اور اسلام ہی کے واسطے سے اس نے تمھارے دل ملا دیے ہیں؟!''[1]

رسول اللہ ﷺ کی باتیں سن کر لوگوں کے اوسان بحال ہوئے۔ انھیں احساس ہوا کہ

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 2/211-214.

یہ شیطانی چکر تھا اور دشمن کی چال تھی۔ وہ زاروقطار رو دیے اور ایک دوسرے سے گلے ملے۔ اللہ تعالیٰ نے شاس بن قیس یہودی کی لگائی آگ بجھا دی۔ سب نے دوبارہ نبی ﷺ سے سمع و طاعت کا پیمان باندھا اور لوٹ آئے۔ اللہ تعالیٰ نے شاس بن قیس اور اس کی سازش کا بھانڈا ان آیات میں پھوڑ دیا:

﴿قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۖ وَاللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰى مَا تَعْمَلُوْنَ ۝ قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا وَّاَنْتُمْ شُهَدَآءُ ۗ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝﴾

”(اے نبی!) کہہ دیجیے: اے اہل کتاب! تم اللہ کی آیتوں کا انکار کیوں کرتے ہو؟ اللہ اس پر گواہ ہے جو کچھ تم کرتے ہو، کہہ دیجیے: اے اہل کتاب! تم اس شخص کو اللہ کے راستے سے کیوں روکتے ہو جو ایمان لے آیا؟ تم اس میں ٹیڑھ پن چاہتے ہو، حالانکہ تم خود اس (کے سیدھی راہ پر ہونے) کے گواہ ہو اور تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اس سے غافل نہیں ہے۔“ [1]

اللہ تعالیٰ نے اوس بن قیظی، جبار بن صخر اور ان کے ہمنواؤں کے متعلق جو شاس بن قیس کی دسیسہ کاری کا شکار ہونے چلے تھے، فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِيْعُوْا فَرِيْقًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ يَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ كٰفِرِيْنَ ۝﴾

”اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اگر تم اہل کتاب کے ایک فریق کی بات مانو گے تو وہ تمھارے ایمان لانے کے بعد تمھیں کافر بنا کر چھوڑیں گے۔“ [2]

اس واقعے سے ہم رسول اللہ ﷺ کی قائدانہ صلاحیتوں کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ آپ ﷺ نے یہود کی طرف سے اہل اسلام کی صفوں میں انتشار پیدا کرنے کے پروگرام

[1] آل عمرٰن 3:98,99. [2] آل عمرٰن 3:100. مزید وضاحت کے لیے آیت:105 تک دیکھیے۔

کو بطریق احسن ناکام بنایا۔ آپ اس طرح مسلمانوں کے تمام امور کی نگرانی کرتے اور ان کے مصائب و آلام کا تدارک کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ فی الفور انصار کے پاس پہنچے اور انھیں اللہ کی یاد دلائی۔ آپ نے نصیحت کی کہ یہ اقدامات جاہلیت سے تعلق رکھتے ہیں، پھر انھیں یاد دلایا کہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کی بدولت تمھاری دشمنیاں ختم کر دیں اور تمھارے دل کینوں سے پاک کر کے انھیں ایمان کا گہوارہ بنا دیا۔

اس گفتگو نے انصار کے دلوں پر گہرا اثر کیا اور ان کے اندر گویا ایک نئی روح پھونک دی۔ اللہ کی توفیق سے جاہلیت کے آثار مٹ گئے اور نبی ﷺ کے پُر تاثیر خطاب، روح پرور جذبات اور تیز ترین اہتمام نے انھیں باور کرا دیا کہ ان کا یہ جذباتی اقدام شیطانی وسوسہ اور دشمن کی سازش تھی۔ اس فعل پر وہ شرمندہ ہوئے اور باہمی محبت و ہم آہنگی کا ثبوت دیتے ہوئے روتے ہوئے ایک دوسرے کے گلے لگ گئے۔[1]

ذات باری تعالیٰ پر حملہ: کئی ایک سیرت نگاروں اور مفسرین نے لکھا ہے کہ ایک دفعہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ یہود کے معبد بیت المدراس میں گئے۔ وہاں انھوں نے بہت سے لوگوں کو ایک آدمی فِنحاص کے گرد جمع دیکھا جو اُن کا ایک عالم تھا۔ اُس کے ساتھ ایک اور عالم اشیع بھی موجود تھا۔ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فِنحاص سے کہا: ''دیکھو! اللہ سے ڈرو اور مسلمان ہو جاؤ۔ اللہ کی قسم! تم جانتے ہو کہ محمد ﷺ اللہ کے سچے رسول ہیں۔ وہ اللہ کی طرف سے حق لے کر آئے ہیں جو تم تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہو۔''

فِنحاص نے کہا: ''ابوبکر! اللہ کی قسم! ہمیں تو اللہ کی محتاجی نہیں بلکہ اللہ ہمارا محتاج ہے۔ جس طرح وہ ہمارے آگے گڑگڑاتا ہے، ہم نہیں گڑگڑاتے۔ ہم اُس سے بے نیاز ہیں وہ ہم سے بے نیاز نہیں۔ اگر وہ بے نیاز ہوتا تو ہم سے ہمارے اموال کا قرض کیوں مانگتا، جیسا کہ تمھارے صاحب کہتے ہیں۔ اللہ تمھیں سود سے منع کرتا ہے اور خود ہمیں سود

[1] التاريخ الإسلامي للحميدي: 42,41/4.

دیتا ہے۔ اگر وہ ہم سے بے نیاز ہوتا تو سود پر قرض طلب نہ کرتا۔ (معاذ اللّٰہ)"

سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ یہودی کی یہ بات سن کر سخت غصے میں آ گئے، آپ نے اس کے چہرے پر زور کا طمانچہ رسید کیا اور کہا: "اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! مجھے اس عہد کا پاس نہ ہوتا جو تمھارے اور ہمارے درمیان ہے تو اے اللہ کے دشمن! میں تیری گردن مار دیتا۔"

فِنحاص بھاگم بھاگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف آیا اور کہا: "اے محمد! دیکھیے، آپ کے ساتھی ابوبکر نے میرا کیا حشر کیا ہے!" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکر رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

«مَا حَمَلَكَ عَلٰى مَا صَنَعْتَ؟» "آپ نے ایسا کیوں کیا؟"

انھوں نے جواب دیا: "اے اللہ کے رسول! اس اللہ کے دشمن نے بڑی سنگین بات کہی کہ اللہ محتاج ہے اور ہم بے نیاز و غیر محتاج ہیں۔" اس کی بات سن کر میں صرف اللہ کے لیے غصے میں آیا اور اسے تھپڑ مار دیا۔" فِنحاص نے جھوٹ بولا کہ میں نے یہ بات نہیں کہی۔ اللہ تعالیٰ نے فِنحاص یہودی کے خلاف ابوبکر رضی اللہ عنہ کے حق میں یہ آیت نازل فرمائی:

﴿لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّ نَحْنُ اَغْنِيَآءُ ۘ سَنَكْتُبُ مَا قَالُوْا وَقَتْلَهُمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّنَقُوْلُ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ۝﴾

"اللہ نے ان لوگوں کی بات سن لی جنھوں نے کہا کہ اللہ فقیر ہے اور ہم مالدار ہیں۔ یقیناً ان کی یہ بات ہم لکھ لیں گے اور جو وہ نبیوں کو ناحق قتل کرتے رہے (وہ بھی ان کے اعمال نامے میں درج ہے) اور (قیامت کے دن) ہم ان سے کہیں گے: اب جلانے والے عذاب کا مزہ چکھو۔" [1]

یہودی عالم کی بات سُن کر ابوبکر رضی اللہ عنہ کو جو صدمہ ہوا، اُس کے بارے میں یہ آیت

[1] آل عمرٰن 181:3۔

نازل ہوئی:

﴿ لَتُبْلَوُنَّ فِيْٓ اَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اَذًى كَثِيْرًا ۭ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ۝ ﴾

''البتہ تمھیں تمھارے مالوں اور تمھاری جانوں کے بارے میں ضرور آزمایا جائے گا اور تم ان لوگوں سے جنھیں تم سے پہلے کتاب دی گئی اور ان لوگوں سے جنھوں نے شرک کیا، ضرور تکلیف دینے والی باتیں سنو گے اور اگر تم صبر کرو اور پرہیزگاری اختیار کرو تو بے شک یہ بڑی ہمت کا کام ہے۔''[1]

قرآن کریم نے بہت سے مقامات پر یہود کی طرف سے اللہ تعالیٰ کی شان میں گستاخی اور اس کی جناب میں بے ادبی کا ذکر کیا ہے۔ اُس نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ یہود باری تعالیٰ کو نقائص سے پاک نہیں سمجھتے تھے اور نہ اُس کے متعلق بات کرتے ہوئے شایانِ شان پیرایۂ بیان اختیار کرتے تھے۔ یہود کا یہ طرزِ عمل بے شرمی اور بے ادبی کی بدترین مثال ہے۔ قرآن فرماتا ہے:

﴿ وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ يَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ ۭ غُلَّتْ اَيْدِيْهِمْ وَلُعِنُوْا بِمَا قَالُوْا ۘ بَلْ يَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ ۙ يُنْفِقُ كَيْفَ يَشَاۗءُ ۭ وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّكُفْرًا ۭ وَاَلْقَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاۗءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۭ كُلَّمَآ اَوْقَدُوْا نَارًا لِّلْحَرْبِ اَطْفَاَهَا اللّٰهُ ۙ وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ ۝ ﴾

''اور یہودیوں نے کہا: ''اللہ کا ہاتھ بندھا ہوا ہے۔'' بندھ گئے انھی کے ہاتھ اور لعنت پڑی ان پر ان کے اس قول (ان کی اس بکواس) کی وجہ سے بلکہ اللہ کے تو

[1] آل عمرٰن 186، تفسیر القرطبي: 295/4، و السیرۃ النبویۃ لابن ھشام: 559,558/1، وسبل الھدیٰ والرشاد للصالحي: 583/3-585، و تفسیر مجاھد، ص: 140.

دونوں ہاتھ کھلے ہوئے ہیں، وہ جیسے چاہے خرچ کرتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ یہ (قرآن) جو آپ کے رب کی طرف سے آپ پر نازل کیا گیا ہے، اُن میں سے اکثر لوگوں کی سرکشی اور کفر میں ضرور اضافے کا باعث بنے گا۔ اور ہم نے قیامت کے دن تک ان کے درمیان دشمنی اور بغض ڈال دیا ہے۔ جب کبھی وہ لڑائی کی آگ بھڑکاتے ہیں تو اللہ اسے بجھا دیتا ہے اور وہ زمین میں فساد کرنے کو دوڑتے ہیں اور اللہ فساد کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔''[1]

آیت کے مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ یہود کا یہ نقطۂ نظر اُس ناراضی اور غیظ و غضب کا نتیجہ تھا جو نبی ﷺ کے مدینہ میں پاؤں جمانے اور دعوت اسلامی کے پھیلاؤ کو دیکھ کر اُن کے سینوں میں پیدا ہوا۔ اس کے ساتھ اس امر کا اضافہ کر لیا جائے کہ مسلمان یہود کی مکارانہ چالوں کے پیش نظر ان سے متنفر ہو کر اللہ کے حکم کی تعمیل میں ان سے مقابلہ کر چکے تھے جس کے باعث یہود اقتصادی طور پر مفلوج ہو کر رہ گئے۔ اُن کا یہی غم و غصہ اللہ کی جناب میں اُن کی بے ادبی اور رسول اللہ ﷺ کو ناموزوں جواب دینے کا سبب بنا۔[2]

اگلی آیت کا مضمون میرے اس موقف کی تائید کرتا ہے:

﴿ وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْكِتٰبِ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاَدْخَلْنٰهُمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ○ وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ۚ مِنْهُمْ اُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ ۗ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ سَآءَ مَا يَعْمَلُوْنَ ○ ﴾

''اور اگر اہل کتاب ایمان لے آئیں اور پرہیز گاری اختیار کر لیں تو یقیناً ہم ان سے ان کی برائیاں دور کر دیں گے اور انھیں نعمت والے باغوں میں ضرور داخل کریں گے اور اگر یقیناً وہ تورات اور انجیل اور اپنے رب کی طرف سے نازل کی

1 المآئدة 5:64. 2 الصراع مع اليهود لأبي فارس: 51/1.

گئی (دوسری) کتابوں کے احکام پر ٹھیک ٹھیک عمل کرتے تو وہ اپنے اوپر سے اور اپنے پاؤں کے نیچے سے (وافر رزق) کھاتے، ان میں سے ایک گروہ درمیانی راہ چلنے والا ہے۔ اور ان میں سے زیادہ تر لوگ جو کچھ کر رہے ہیں وہ برا ہے۔''[1]

رسول اللہ ﷺ، دیگر انبیائے کرام اور قرآن کریم کی شان میں گستاخی: یہود رسول اللہ ﷺ سے مخاطب ہوتے ہوئے بے ادبی سے پیش آتے۔ وہ آپ پر طعنہ زنی کرتے اور سلام کرنے کا تکلیف دہ طریقہ اپناتے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ چند یہودی رسول اللہ ﷺ کے ہاں آئے اور کہا: «اَلسَّامُ عَلَيْكَ يَا أَبَالْقَاسِمِ!» ''(نعوذ باللّٰه) اے ابوالقاسم! تمھیں موت آئے۔'' میں نے جواب میں کہا: «اَلسَّامُ عَلَيْكُمْ وَ فَعَلَ اللّٰهُ بِكُمْ» ''تمھیں موت آئے اور اللہ تمھارا برا کرے۔'' اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: «مَهْ يَا عَائِشَةُ! فَإِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفُحْشَ وَلَا التَّفَحُّشَ» ''عائشہ! ایسا مت کہو۔ اللہ بیہودگی اور بیہودہ گو بننے کو پسند نہیں کرتا۔'' میں نے کہا: ''اللہ کے رسول! جو انھوں نے کہا وہ آپ دیکھ رہے ہیں؟'' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «أَلَسْتِ تَرِينِي أَرُدُّ عَلَيْهِمْ مَّا يَقُولُونَ؟ وَ أَقُولُ: وَ عَلَيْكُمْ» ''تم مجھے نہیں دیکھ رہی کہ میں نے اُن کا کہا انھیں لوٹا دیا ہے؟ اور کہہ دیا ہے: تمھیں (موت آئے)۔''[2] پھر یہ آیت نازل ہوئی:[3]

﴿ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ نُهُوْا عَنِ النَّجْوٰى ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَيَتَنٰجَوْنَ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَتِ الرَّسُوْلِ ۫ وَاِذَا جَآءُوْكَ حَيَّوْكَ بِمَا لَمْ يُحَيِّكَ بِهِ اللّٰهُ ۙ وَيَقُوْلُوْنَ فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ لَوْلَا يُعَذِّبُنَا اللّٰهُ بِمَا نَقُوْلُ ؕ حَسْبُهُمْ جَهَنَّمُ ۚ يَصْلَوْنَهَا ۚ فَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ○﴾

''کیا آپ نے ان لوگوں کی طرف نہیں دیکھا جنھیں سرگوشیاں کرنے سے روکا گیا

---

1 المآئدة 5: 65، 66. 2 صحیح البخاري، حدیث: 2935، و صحیح مسلم، حدیث: 2165-(11). 3 زاد المسیر لابن الجوزي: 189/8.

تھا، پھر وہ اس چیز کی طرف لوٹتے ہیں جس سے انھیں روکا گیا تھا اور وہ گناہ، زیادتی اور رسول کی نافرمانی کی سرگوشیاں کرتے ہیں۔ اور جب وہ آپ کے پاس آتے ہیں تو آپ کو اس (کلمے) کے ساتھ سلام کہتے ہیں کہ اللہ نے اس کے ساتھ آپ کو (کبھی) سلام نہیں کہا اور وہ اپنے دل میں کہتے ہیں: اللہ ہمیں اس کی وجہ سے کیوں عذاب نہیں دیتا جو ہم کہتے ہیں؟ ان کے لیے جہنم کافی ہے، وہ اس میں داخل ہوں گے، پس وہ برا ٹھکانا ہے۔'' [1]

آیت کریمہ نے واضح کیا ہے کہ یہود کے دلوں میں بیٹھے ہوئے کینے اور حسد ہی نے انھیں آمادہ کیا تھا کہ وہ اسلام کو مٹانے، مسلمانوں پر تسلط جمانے اور رسالت مآب ﷺ کو (نعوذ باللّٰه) ختم کرنے کی غرض سے ہر حربہ آزمائیں اور اس سلسلے میں ہر ممکن طریقہ بروئے کار لائیں۔ بددعا کی صورت میں سلام کہنا دراصل اُن کی اُس نفسیاتی کمزوری کی طرف اشارہ ہے جس کے طاری ہونے پر وہ ایسی حرکتیں کیا کرتے تھے۔ اس مذموم فعل کا تجزیہ کرنے سے پتا چلے گا کہ یہود شدید نفسیاتی بحران کا شکار تھے جو نام نہاد عزت کے فقدان کی پیداوار تھا۔ وہ اپنے آپ کو عز و شرف کی بلندیوں پر دیکھتے تھے، جبکہ درحقیقت ذلت کی پستیوں میں گرے پڑے تھے۔ چند نئی قوتیں اُن کے ماضی و حال پر غلبہ پا کر اُسے فتح کر چکی تھیں اور وہ فاتح کے تقاضوں کے مطابق ڈھلنے اور اُس سے ہم آہنگ ہونے کی سکت اپنے میں نہیں پاتے تھے۔ جھوٹی غیرت اور حسد نے یہود کو نئے دین کے سایے میں آنے سے روک لیا تھا۔ انھوں نے اسلام اور اہل اسلام کے خلاف اپنے بے پناہ وسائل استعمال کر کے ناکامی کا منہ دیکھ لیا تو ان کے نفسیاتی بحران میں مزید اضافہ ہو گیا اور وہ اوچھے ہتھکنڈوں پر اتر آئے۔ حریف کو سلام کی صورت میں بددعا دینا بے بس کا ہتھیار، ناکام آدمی کا وسیلہ اور کینہ پرور کا تریاق دل ہے جس کے ذریعے وہ سینے

[1] المجادلة 8:58.

کا ابال نکالنے کی ناکام کوشش کرتا ہے۔[1]

نبی کریم ﷺ نے عائشہ رضی اللہ عنہا کا جواب سنا تو انھیں نرمی اختیار کرنے کی تلقین فرمائی اور سمجھایا کہ مسلمان حالت غضب میں بے لگام نہیں ہوتا۔ یہ وصف حسن خلق ہی سے پیدا ہوسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نرم (رفیق) ہے اور نرمی (رفق) کو پسند کرتا ہے۔ نرم گو آدمی کو اللہ تعالیٰ اپنے ان انعامات سے نوازتا ہے جو سخت گیر کو میسر نہیں آتے۔[2]

دیگر انبیائے کرام علیہم السلام کی شان میں یہود کی گستاخی یوں ہے کہ چند یہودی سردار جن میں ابو یاسر بن اخطب، نافع بن ابو نافع اور عازر بن ابو عازر وغیرہ شامل تھے، رسول اللہ ﷺ کے ہاں آئے اور سوال کیا کہ کون کون سے پیغمبر پر ایمان لانا ضروری ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا:

«نُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْنَا وَمَا أُنْزِلَ إِلٰى إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَ يَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ وَمَا أُوتِيَ مُوسٰى وَعِيسٰى وَمَا أُوتِيَ النَّبِيُّونَ مِنْ رَّبِّهِمْ، لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْهُمْ وَ نَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ»

''ہم اللہ پر ایمان لاتے ہیں اور اس پر جو ہماری طرف نازل کیا گیا اور جو ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور ان کی اولاد کی طرف نازل کیا گیا اور جو موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا گیا اور جو نبیوں کو ان کے رب کی طرف سے دیا گیا۔ ہم ان میں سے کسی کے درمیان فرق روا نہیں رکھتے۔ اور ہم اسی (اللہ) کے فرماں بردار ہیں۔''

آپ ﷺ نے جب عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر کیا تو یہود نے کہا: ''ہم عیسیٰ (علیہ السلام) پر ایمان نہیں لاتے اور نہ اس پر ایمان لانے والوں کو تسلیم کرتے ہیں۔'' اس پر اللہ تعالیٰ نے درج ذیل

---

1 حوار الرسول مع اليهود للدكتور محسن الناظر، ص: 101. 2 حوار الرسول مع اليهود للدكتور محسن الناظر، ص: 87.

آیت نازل فرمائی:

﴿قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ هَلْ تَنْقِمُوْنَ مِنَّآ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلُ وَاَنَّ اَكْثَرَكُمْ فٰسِقُوْنَ﴾

"(اے نبی!) کہہ دیجیے: اے اہل کتاب! کیا تم ہم سے صرف اس وجہ سے ناراض ہوتے ہو کہ ہم اللہ پر اور جو (چیز) ہماری طرف نازل کی گئی اور (ہم سے) پہلے نازل کی گئی کتابوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ اور بے شک تم میں سے اکثر نافرمان ہیں۔"[1]

قرآن سے بے ادبی کے بارے میں یہود کی طرف سے بے جا سوالوں اور بحث و تکرار کی نشستوں کا ایک طویل سلسلہ چلا ہے۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا بیان ہے: "اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ تشریف لائے تو یہودی علماء نے آ کر کہا: "اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ جو آپ نے کہا کہ

﴿وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ۭ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا﴾

"اور وہ آپ سے روح کے متعلق سوال کرتے ہیں۔ کہیے: روح میرے رب کے حکم سے ہے، اور تمھیں تو بہت ہی تھوڑا علم دیا گیا ہے۔"[2]

اس سے آپ کی مراد ہم ہیں یا آپ کی قوم؟" نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «كُلًّا» "سبھی مراد ہیں۔" بولے: "اگر ایسا ہے تو آپ (قرآن میں) یہ بھی تو پڑھتے ہیں کہ تورات میں ہر چیز کی وضاحت ہے؟" اس پر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «إِنَّهَا فِي عِلْمِ اللّٰهِ قَلِيلٌ وَّ عِنْدَكُمْ فِي ذٰلِكَ مَا يَكْفِيكُمْ لَوْ أَقَمْتُمُوهُ» "یہ اللہ کے علم کے اعتبار سے قلیل

---

[1] المآئدة 59:5. والسيرة النبوية لابن هشام :567/1، وتفسير الطبري:442/1. [2] بني إسرآءيل 85:17.

ہے، البتہ اگر تم اس کے مطابق زندگی گزارو تو تمھارے لیے اتنا علم ہی کافی ہے۔''[1]

راوی حدیث عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: ''اس حوالے سے اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

﴿ وَلَوْ اَنَّمَا فِی الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ یَمُدُّهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ○ ﴾

''اور بلاشبہ اگر زمین میں جتنے درخت ہیں سب قلم بن جائیں اور سمندر کی روشنائی بن جائے اور اس کے بعد سات سمندر (اس میں مزید روشنائی شامل کریں) تو بھی اللہ کے کلمات ختم نہ ہوں، بے شک اللہ نہایت غالب، بہت حکمت والا ہے۔''[2]

منافقین کی مدد اور اُن سے مل کر سازشوں کے جال بننا: قرآن کریم نے ہمیں بتایا ہے کہ منافقین کو یہود کی فکری رہنمائی حاصل تھی۔ منافقین کے انھی پیشواؤں کو قرآن کریم نے ''شیاطین'' کے لقب سے یاد کیا ہے۔ یہ رذیل لوگ منافقین کے لیے منصوبہ سازی کرتے، انھیں ہدایات دیتے اور دھوکا دہی، مکر و فریب اور فتنہ انگیزی کرنے کے مختلف طریقے سکھاتے تھے، فرمان الٰہی ہے:

﴿ وَاِذَا لَقُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚۖ وَاِذَا خَلَوْا اِلٰی شَیٰطِیْنِهِمْ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ○ ﴾

''اور جب وہ ان سے ملتے ہیں جو ایمان لائے تو کہتے ہیں: ہم ایمان لے آئے اور جب وہ اپنے شیطانوں کے پاس تنہا ہوتے ہیں تو کہتے ہیں: یقیناً ہم تمھارے ساتھ ہیں ان لوگوں سے تو ہم صرف مذاق کرتے ہیں۔''[3]

امام نسفی رحمہ اللہ نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا: ''آیت میں شیاطین سے مراد یہود ہیں جو

---

1 تفسیر ابن کثیر، سورۃ الإسراء، آیت: 85، والیھود في السنة المطھرة للدکتور عبداللہ الشقاري: 241/1. 2 لقمٰن 27:31. 3 البقرة 14:2.

سرکشی اور ہٹ دھرمی میں شیاطین کے مماثل ہیں۔"[1]

مدینہ میں یہود منافقین سے مل کر مسلمانوں کے خلاف دسیسہ کاری کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کے اس گٹھ جوڑ کا پول کھول دیا:

﴿بَشِّرِ الْمُنٰفِقِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝ الَّذِيْنَ يَتَّخِذُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۝﴾

"(اے نبی!) منافقوں کو خبردار کر دیجیے کہ ان کے لیے دردناک عذاب ہے، جو مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست بناتے ہیں، کیا وہ ان کافروں کے ہاں عزت تلاش کرتے ہیں؟ پھر بے شک عزت تو ساری اللہ ہی کے لیے ہے۔"[2]

پروفیسر محمد عزت دروزہ نے لکھا: "جمہور مفسرین اس امر پر متفق ہیں کہ آیت میں ﴿الْكٰفِرِيْنَ﴾ سے مراد یہود ہیں۔ اس آیت اور اس کے بعد والی آیت میں اس کے واضح قرائن موجود ہیں۔"

ظاہر ہے کہ منافقین کا یہود کو دوست بنانا اور ان کے ساتھ باہمی اعتماد کی فضا قائم کرنا دونوں گروہوں کے درمیان اُس مضبوط اتحاد کا نتیجہ تھا جو انھوں نے دعوت اسلامی کے خاتمے اور مسلم فوج کے مقابلے کے لیے تشکیل دیا۔[3]

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ ارْتَدُّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدَى الشَّيْطٰنُ سَوَّلَ لَهُمْ وَاَمْلٰى لَهُمْ ۝ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لِلَّذِيْنَ كَرِهُوْا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ سَنُطِيْعُكُمْ فِيْ بَعْضِ الْاَمْرِ ۖ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِسْرَارَهُمْ ۝﴾

"بے شک جو لوگ، بعد اس کے کہ ان پر ہدایت ظاہر ہوگئی، اپنی پیٹھوں کے بل

[1] تفسیر النسفي: 21/1. [2] النسآء 4:138,139. [3] سيرة الرسول لأستاذ محمد عزة دروزة: 180,179/2.

پلٹ گئے، شیطان نے ان کے لیے (ان کے عمل) مزین وخوشنما بنا دیے اور (اللہ نے) انھیں ڈھیل دے دی، یہ اس لیے کہ بے شک انھوں نے ان لوگوں (یہود) سے، جنھوں نے اس چیز (قرآن) کو ناپسند کیا جو اللہ نے نازل کی، کہا کہ بعض امور میں ہم آپ کی بات مانیں گے اور اللہ ان کے راز جانتا ہے۔"[1]

جمہور مفسرین کے نزدیک پہلی آیت میں منافقین کا تذکرہ ہے۔ اور ﴿ كَرِهُوْا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ ﴾ سے مراد یہود ہیں۔ دوسری آیت میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف منافقین اور یہود کے باہمی گٹھ جوڑ کا ذکر ہے۔ دوسری آیت کے مفہوم پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ منافقین کی طرف سے یہود کی اتباع اور ان کے تشکیل کردہ پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کا وعدہ کیا گیا ہے۔ ان آیات میں منافقین کے اندر یہودیوں کے اثر ورسوخ کی ہلکی سی تصویر کشی کی گئی ہے۔[2]

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مَّا هُمْ مِّنْكُمْ وَلَا مِنْهُمْ وَيَحْلِفُوْنَ عَلَى الْكَذِبِ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ؕ اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ اِتَّخَذُوْٓا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝ ﴾

"کیا آپ نے ان لوگوں (منافقین) کو نہیں دیکھا جنھوں نے اس قوم (یہود) سے دوستی کی جن پر اللہ غصے ہوا۔ نہ وہ تم میں سے ہیں اور نہ ان میں سے۔ اور وہ جھوٹ پر قسمیں کھاتے ہیں، حالانکہ وہ جانتے ہیں، اللہ نے ان کے لیے شدید عذاب تیار کیا ہے۔ بے شک یہ (لوگ) برے ہیں جو وہ عمل کرتے رہے ہیں، انھوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنا لیا ہے، پھر انھوں نے اللہ کی راہ سے روکا، لہٰذا

1 محمد 47:25، 26. 2 سیرۃ الرسول لأستاذ محمد عزۃ دروزۃ: 2/180.

ان کے لیے رسوا کن عذاب ہے۔‘‘ [1]

مفسر ماوردی رحمہ اللہ نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا: ’’مطلب یہ ہے کہ منافقین نے ایک قوم سے دوستی کی جن پر اللہ کو غصہ آیا تھا، جو یہود ہیں۔‘‘ ماوردی نے اللہ کے راستے سے روکنے کو یہود کی خوشنودی کے لیے منافقین کا جہاد سے رکنا قرار دیا ہے۔ [2]

یہود منافقین کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف جنگ کرنے پر اکساتے تھے۔ اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کا کہنا ہے: ’’غزوۂ بدر سے پہلے کا ذکر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گدھے پر فدک کی بنی ہوئی جھالر دار چادر ڈالے سوار تھے، میں آپ کے پیچھے سوار تھا۔ آپ بنو حارث بن خزرج کے ہاں سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کی عیادت کرنے جا رہے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک مجلس کے قریب سے گزرے جس میں عبداللہ بن ابی منافق بھی بیٹھا تھا۔ ابھی اس نے مسلمان ہونے کا دعویٰ نہیں کیا تھا۔ مجلس میں مسلمان، بت پرست مشرک اور یہودی سبھی بیٹھے ہوئے تھے۔ عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ بھی وہاں موجود تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سواری کے قدموں سے اٹھنے والا غبار مجلس پر پڑا تو عبداللہ بن ابی نے چادر سے ناک ڈھانپ کر کہا: ’’ہمیں غبار آلود نہ کرو۔‘‘ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سب کو سلام کیا، ٹھہرے، اترے، اصحاب مجلس کو اسلام کی دعوت دی اور قرآن پڑھ کر سنایا۔ عبداللہ بن ابی کہنے لگا: ’’اے آدمی! اگر یہ حق ہے تو تمھاری بات سے بہتر کوئی بات نہیں۔ لیکن تم ہماری مجلس میں آ کر ہمیں پریشان نہ کیا کرو۔ گھر جا کے بیٹھو۔ جو تمھارے پاس آئے اُسے یہ بیان سناؤ۔‘‘ اس پر عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ بولے: ’’کیوں نہیں اے اللہ کے رسول! آپ یہ پیغام لے کر ہماری مجالس میں ضرور تشریف لایا کریں۔ ہم اسے پسند کرتے ہیں۔‘‘ اس کے بعد مجلس میں موجود مسلمان، مشرکین اور یہود کے درمیان تو تو میں میں ہونے لگی اور قریب تھا کہ وہ ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں سمجھایا یہاں تک کہ وہ خاموش ہو گئے۔

[1] المجادلة 58:14-16. [2] النكت والعيون للماوردي: 4/203.

پھر آپ اپنی سواری پر بیٹھے اور انصار کے سردار سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کے ہاں پہنچے۔ آپ نے اُن سے شکایت کرتے ہوئے کہا: «يَا سَعْدُ! أَلَمْ تَسْمَعْ مَا قَالَ أَبُو حُبَابٍ؟- يُرِيدُ عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ أُبَيٍّ- قَالَ كَذَا وَ كَذَا» ''سعد! آپ نے نہیں سُنا کہ ابوحباب (عبداللہ بن ابی) نے کیا کہا؟ اُس نے یہ اور یہ بات کہی ہے۔''

سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ بولے: ''اے اللہ کے رسول! اسے معاف کر دیجیے۔ اس سے درگزر فرمائیے۔ اس ذات کی قسم جس نے آپ پر کتاب نازل کی، جن دنوں اللہ تعالیٰ نے اس شہر کو حق کی روشنی سے منور کیا، اہل شہر اس کی تاج پوشی و دستار بندی پر اتفاق کر چکے تھے لیکن اللہ کو منظور نہیں تھا۔ اُس نے ہمیں حق سے بہرہ مند کر دیا۔ تب سے یہ شخص غصے سے سرخ ہوا پھرتا ہے۔ اس نے مارے حسد کے ایسا کیا ہے۔'' سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کی یہ باتیں سُن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے معاف کر دیا۔[1]

یہود کی عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ پر طعن و تشنیع: عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کو جو یہود کے بہت بڑے عالم تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینہ آمد کی اطلاع ملی تو دوسرے افراد کے ساتھ وہ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور کہا: ''میں آپ سے تین باتیں پوچھتا ہوں کہ جنھیں نبی کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

① قیامت کی پہلی علامت کیا ہے؟

② اہل جنت سب سے پہلے کیا کھائیں گے؟

③ بچے کی مشابہت ماں یا باپ سے کیونکر ہوتی ہے؟

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «خَبَّرَنِي بِهِنَّ آنِفًا جِبْرِيلُ» ''مجھے ان باتوں کی جبریل علیہ السلام نے ابھی ابھی خبر دی ہے۔'' اس پر عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ فوراً بولے: ''یہ فرشتہ یہود کا دشمن ہے۔''

---

1 صحيح البخاري، حديث:4566.

آپ ﷺ نے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے فرمایا:

«أَمَّا أَوَّلُ أَشْرَاطِ السَّاعَةِ، فَنَارٌ تَحْشُرُ النَّاسَ مِنَ الْمَشْرِقِ إِلَى الْمَغْرِبِ، وَ أَمَّا أَوَّلُ طَعَامٍ يَأْكُلُهُ أَهْلُ الْجَنَّةِ فَزِيَادَةُ كَبِدِ حُوتٍ، وَ أَمَّا الشَّبَهُ فِي الْوَلَدِ، فَإِنَّ الرَّجُلَ إِذَا غَشِيَ الْمَرْأَةَ فَسَبَقَهَا مَاؤُهُ، كَانَ الشَّبَهُ لَهُ وَ إِذَا سَبَقَ مَاءُ هَا كَانَ الشَّبَهُ لَهَا»

''قیامت کی پہلی علامت ایک آگ ہے جو لوگوں کو مشرق سے ہانک کر مغرب کی طرف لے جائے گی۔ اہل جنت کا پہلا کھانا مچھلی کی کلیجی کا بڑھا ہوا حصہ ہوگا اور جب مرد عورت سے ہم بستر ہو اور اس کا پانی عورت کے پانی سے پہل کر جائے تو مشابہت باپ سے ہوتی ہے، ورنہ ماں سے ہوتی ہے۔''

جواب سُن کر عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے بے ساختہ کہا: ''میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔'' پھر بولے: ''اے اللہ کے رسول! یہود انتہائی جھوٹی قوم ہے۔ انھیں میرے بارے میں آپ کے دریافت کرنے سے قبل میرے اسلام لانے کی خبر ہوگئی تو آپ کی موجودگی میں مجھ پر طرح طرح کی تہمتیں دھرنی شروع کر دیں گے۔'' چنانچہ یہودی آئے تو عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اندر چلے گئے۔ نبی ﷺ نے یہود سے دریافت کیا: «أَيُّ رَجُلٍ فِيكُمْ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ سَلَامٍ» ''عبداللہ بن سلام تم میں کیسے آدمی ہیں؟'' سب نے کہا: ''وہ ہم میں سب سے بڑے عالم اور سب سے اچھے ہیں اور سب سے بڑے عالم اور سب سے اچھے انسان کے فرزند ارجمند ہیں۔'' پوچھا: «أَفَرَأَيْتُمْ إِنْ أَسْلَمَ عَبْدُ اللّٰهِ!» ''اگر عبداللہ مسلمان ہو جائیں تو؟'' یہود بولے: ''اللہ انھیں اس سے محفوظ رکھے۔'' اس پر عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کلمۂ شہادت پڑھتے ہوئے باہر تشریف لے آئے۔ یہود نے یہ سن کر فوراً کہا: ''یہ ہم میں بدترین شخص ہے اور بدترین باپ کا بیٹا ہے۔'' انھوں

نے عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کو سخت طعن و تشنیع کا نشانہ بنایا۔[1]

یوں یہود مسلمان ہونے والے یہودی علماء کو اذیت دیتے، ان کی شخصیت مشکوک بنانے کی کوشش کرتے اور اُن پر بے بنیاد الزامات دھرتے۔ قرآن کریم نے یہود کے اس بیہودہ اور منفی طرزِ عمل کو اپنے بے نظیر الفاظ میں بیان کیا ہے اور ان مومنین کا دفاع کیا ہے جن کی ذات پر یہود نے ایسے رکیک اور ظالمانہ حملے کیے۔[2]

قرآن کریم میں ارشادِ ربانی ہے:

﴿لَيْسُوْا سَوَآءً ۗ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآىِٕمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ ○ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ ؕ وَاُولٰٓىِٕكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ○ وَمَا يَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُّكْفَرُوْهُ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ ○﴾

”وہ سب برابر نہیں ہیں، اہل کتاب میں سے ایک گروہ حق پر قائم ہے، وہ رات کی گھڑیوں میں اللہ کی آیتیں تلاوت کرتے ہیں اور وہ سجدہ کرتے ہیں، وہ اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہیں اور وہ نیکی کا حکم دیتے اور برائی سے روکتے ہیں اور وہ بھلائی کے کاموں میں سبقت کرتے ہیں اور وہی نیکوکاروں میں سے ہیں، وہ جو بھی بھلائی کریں گے اس کی ناقدری نہیں کی جائے گی اور اللہ پرہیز گاروں کو خوب جانتا ہے۔“[3]

واحدی نے ”اسباب النزول“ میں لکھا: ”عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور مقاتل رحمہ اللہ کا کہنا ہے کہ عبداللہ بن سلام، ثعلبہ بن سعیہ، اُسید بن سعیہ، اُسید بن عبید رضی اللہ عنہم اور دیگر یہودی علماء ایمان لائے تو یہود کے دوسرے علماء نے کہا: ”محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر ہمارے بدترین لوگ ایمان لائے ہیں۔ اگر وہ ہم میں اچھے ہوتے تو آباء و اجداد کا دین نہ چھوڑتے۔“ انھوں

[1] صحيح البخاري، حديث: 3329. [2] الصراع مع اليهود لأبي فارس: 59/1. [3] آل عمرٰن 3:113-115.

نے اسلام قبول کر لینے والے یہودی علماء سے کہا: ''تم لوگوں نے اپنا دین بدل کر بڑے گھاٹے کا سودا کیا۔'' اس پر اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت نازل فرمائی۔ [1]

رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کی تکلیف پر خوشی کا اظہار اور ان کے بارے میں بدگمانیاں پھیلانا: یہود مسلمانوں کو ہر ممکن نقصان پہنچانے اور ان کا شیرازہ بکھیرنے کی کوشش میں رہتے تھے۔ اس قسم کا ایک موقع انھیں ابو امامہ اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ کی وفات پر ہاتھ آیا۔ اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ بیعت عقبہ میں شامل ہونے والے وفد کے اہم رکن تھے۔ موت سے قبل ان کا جسم سرخی مائل ہونا شروع ہو گیا۔ رسول اللہ ﷺ ان کی عیادت کو تشریف لائے اور دو مرتبہ فرمایا: «بِئْسَ الْمَيِّتُ لِيَهُودَ، سَيَقُولُونَ: لَوْلَا دَفَعَ عَنْهُ صَاحِبُهُ، وَلَا أَمْلِكُ لَهُ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا، وَّلَأَتَمَحَّلَنَّ لَهُ» ''وفات پانے والا یہ آدمی یہود کے لیے اچھا نہیں۔ وہ کہیں گے کہ پیغمبر نے اس کی بیماری دور کیوں نہ کر دی جبکہ میں اس کے نفع ونقصان کا مالک نہیں ہوں، البتہ میں اس کی شفایابی کے لیے کوئی حیلہ ضرور کروں گا۔'' آپ ﷺ نے ان کے سر پر دو لمبے داغ لگوائے لیکن وہ جانبر نہ ہو سکے اور انتقال کر گئے۔ [2]

ایک اور روایت میں ہے کہ نبی ﷺ نے اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ کی گردن پر گولائی میں داغ لگوایا لیکن وہ جانبر نہ ہوئے اور انتقال کر گئے۔ نبی ﷺ نے فرمایا:

«بِئْسَ الْمَيِّتُ لِلْيَهُودِ، يَقُولُونَ: قَدْ دَاوَاهُ صَاحِبُهُ، أَفَلَا نَفَعَهُ!»

''یہ وفات پانے والا آدمی یہود کے لیے اچھا نہیں۔ وہ کہیں گے: ''اس کے پیغمبر نے اسے دوا دی لیکن یہ جانبر نہ ہوا۔'' [3]

---

[1] أسباب النزول للواحدي، ص: 114. [2] مسند أحمد: 138/4، والمستدرك للحاكم: 214/4، ومجمع الزوائد: 98/5. [3] المعجم الكبير للطبراني، حديث: 5584، والمصنف لعبد الرزاق، حديث: 19515، ومجمع الزوائد: 98/5.

کینہ پروری کا صرف یہی ایک واقعہ نہیں۔ ہجرت کے ابتدائی ایام میں یہود نے مشہور کر دیا تھا کہ ہم نے مسلمانوں پر جادو کر دیا ہے۔ اب ان کی اولاد نہیں ہو گی۔ اس کا مقصد صرف مسلمانوں کو ذہنی اذیت دینا، ان کی خوشگوار زندگیوں میں زہر گھولنا اور محبت و الفت کی فضا کو مکدر کرنا تھا۔ مسلمانوں پر اس افواہ کی تاثیر اور اس کی وجہ سے ان کی پریشانی کا اندازہ اس واقعے سے ہوتا ہے کہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کی پیدائش پر مہاجرین خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے۔[1]

اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما بتاتی ہیں: ''میں مکہ مکرمہ میں امید سے تھی۔ ہجرت کے لیے نکلی تو مدت حمل تقریباً مکمل ہو چکی تھی۔ مدینہ پہنچی۔ قبا میں قیام کیا اور وہاں بچے کی پیدائش ہوئی۔ میں اسے گود میں اٹھائے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور آپ کی گود میں دے دیا۔ آپ نے ایک کھجور منگوائی، اسے چبایا، اپنا لعاب مبارک بچے کے منہ میں ڈالا۔ یوں سب سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بابرکت لعاب بچے کے پیٹ میں گیا۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اپنے دہن مبارک سے چبائی ہوئی کھجور کی گھٹی دی اور برکت کی دعا کی۔ یہ کسی مسلمان کا پہلا مولود تھا جو مدینہ میں پیدا ہوا۔ مسلمانوں کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔

دراصل مسلمانوں کے متعلق یہ بات مشہور ہو چکی تھی کہ ان پر یہود نے جادو کر رکھا ہے، اس لیے ان کی کوئی اولاد نہیں ہو گی۔''[2]

مسلم کی روایت میں یہ بھی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بچے کا نام عبداللہ رکھا۔ بعد ازاں وہ تقریباً سات یا آٹھ برس کی عمر میں زبیر رضی اللہ عنہ کے حکم پر بیعت کرنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسے دیکھ کر مسکرا دیے اور اس سے بیعت لی۔

---

1 اليهود في السنة المطهرة للدكتور عبد الله الشقاري: 1/265. 2 صحيح البخاري، حديث: 5469، و صحيح مسلم، حديث: (26,25)-2146.

رسول اللہ ﷺ کی مدینہ آمد کے بعد اسلام کا یہ پہلا مولود تھا۔ یہود کہا کرتے تھے: ''ہم نے مسلمانوں کو سزا دی ہے (اور ان پر جادو کر دیا ہے۔) مدینہ میں ان کی نرینہ اولاد نہیں ہوگی'' پھر جب عبداللہ پیدا ہوا تو مسلمانوں نے خوشی سے نعرۂ تکبیر بلند کیا۔[1]

تحویل قبلہ کے بارے میں یہود کا نقطۂ نظر: تحویل قبلہ کا حکم نو آموز مسلم ریاست کی بنیادیں ہلانے کی غرض سے جاری یہود کی سرد جنگ اور عام جنگ یا عملی طور پر دخل اندازی کے درمیان حد فاصل تھا۔[2]

براء بن عازب رضی اللہ عنہما کا بیان ہے کہ نبی ﷺ مدینہ تشریف لائے تو اپنے ننھیال کے ہاں ٹھہرے اور سولہ یا سترہ ماہ تک بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے رہے۔ آپ ﷺ کی دیرینہ خواہش تھی کہ بیت اللہ قبلہ قرار پا جائے۔ بیت اللہ کے قبلہ مقرر ہونے پر سب سے پہلی نماز جو رسول اللہ ﷺ نے بیت اللہ کے رخ پر ادا کی، عصر کی نماز تھی۔ آپ ﷺ کے ساتھ کئی افراد نے نماز ادا کی۔ انھی میں سے ایک آدمی نماز کے بعد وہاں سے نکلا اور ایک مسجد کے قریب سے گزرا۔ لوگ رکوع کی حالت میں تھے، اس نے کہا: ''میں اللہ کے نام پر گواہی دیتا ہوں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کی معیت میں بیت اللہ کے رخ پر نماز پڑھی ہے۔'' یہ سن کر تمام نمازی نماز ہی میں بیت اللہ کی طرف پھر گئے۔ یہود کو پسند تھا کہ مسلمانوں کا رسول بھی اہلِ کتاب کی طرح بیت المقدس کے رخ پر نماز ادا کرتا ہے، چنانچہ قبلے کی تبدیلی انھیں بہت ناگوار گزری۔[3]

تحویل قبلہ کے سلسلے میں عظیم الشان آیات نازل ہوئیں، جن میں مسلمانوں سے بہت سی حکمت کی باتیں بیان کی گئی تھیں اور انھیں مفید اسباق کا درس دیا گیا تھا، چنانچہ ارشاد ہوا:

﴿وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۖ وَإِنَّهُ لَلْحَقُّ مِن

[1] المستدرك للحاكم:3/548. [2] اليهود في السنة المطهرة للدكتور عبدالله الشقاري:1/258.
[3] صحيح البخاري، حديث:40، و صحيح مسلم، حديث:525.

رَّبِّكَ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغٰفِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ○ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ۙ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ ۙ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِيْ وَلِاُتِمَّ نِعْمَتِيْ عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ○ كَمَاۤ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ○ فَاذْكُرُوْنِيْۤ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ ○﴾

”اور (اے نبی!) آپ جہاں سے بھی نکلیں، اپنا منہ مسجد حرام کی جانب پھیر لیں اور بے شک وہ آپ کے رب کی طرف سے حق ہے اور اللہ اس سے غافل نہیں جو تم عمل کرتے ہو۔ آپ جہاں سے بھی نکلیں، اپنا منہ مسجد حرام کی جانب پھیر لیں اور (اے مسلمانو!) تم جہاں کہیں بھی ہو، اپنے منہ اسی کی جانب پھیر لو تاکہ تمھارے خلاف لوگوں کے لیے کوئی حجت نہ رہے۔ ہاں، ان میں سے جنھوں نے ظلم کیا (وہ باتیں کرتے رہیں گے)، پس تم ان سے مت ڈرو اور صرف مجھ سے ڈرو تاکہ میں تم پر اپنی نعمت پوری کروں اور شاید کہ تم ہدایت پاؤ۔ جیسے ہم نے تمھارے لیے تمھی میں سے ایک رسول بھیجا، وہ تم پر ہماری آیتیں تلاوت کرتا ہے اور تمھیں پاک کرتا ہے اور تمھیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور تمھیں وہ (باتیں) سکھاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے، چنانچہ تم مجھے یاد کرو، میں تمھیں یاد کروں گا اور تم میرا شکر کرو اور میری ناشکری نہ کرو۔“ [1]

① ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ كَانُوْا عَلَيْهَا﴾

”جلد ہی بے وقوف لوگ (یہ) کہیں گے کہ ان (مسلمانوں) کو ان کے اس قبلے

[1] البقرۃ2:149-152.

سے کس چیز نے پھیر دیا جس پر یہ تھے؟‘‘ [1]

اللہ تعالیٰ نے تحویل قبلہ کے سلسلے میں یہود کی طرف سے شکوک وشبہات پیدا کرنے اور اُلٹے سیدھے سوال اٹھانے کا تذکرہ پہلے ہی کر دیا۔ یہ امر بھی رسول اللہ ﷺ کی نبوت پر دلالت کرتا ہے۔ آپ ﷺ نے ایک واقعہ پیش آنے سے پہلے اس کی خبر دی اور وہ ہوبہو وقوع پذیر ہوا۔ اس سے پتا چلا کہ محمد ﷺ اللہ کے سچے رسول ہیں اور نبی ہیں اور بذریعۂ وحی مستقبل کی خبریں دیتے ہیں۔ رسول کی سچائی کے دلائل میں سے ایک دلیل یہ بھی ہے کہ وہ مستقبل میں پیش آمدہ واقعات کی خبر دے جو بعینہٖ وقوع پذیر ہو جائیں۔

آئندہ پیش آنے والی مشکلات کا شافی حل بھی ان آیات میں پیش کیا گیا ہے تاکہ مسلمان اپنے آپ کو ان مسائل کا سامنا کرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار کر لیں۔

بلاشبہ اچانک سر اٹھانے والی مشکل طبیعت کے لیے زیادہ گراں ہوتی ہے اور حادثے کی پیشگی اطلاع قدرے اطمینان کا باعث ہوتی ہے۔ آدمی اس کا مقابلہ کرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار ہو جاتا ہے۔ [2]

ابوالسعود رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ مذکورہ آیت میں ایک واقعے کی خبر اس کے وقوع سے پیشتر دی گئی ہے تاکہ نفس مطمئن اور اس کا مقابلہ کرنے کو تیار رہے۔ اچانک پیش آنے والا ناخوشگوار واقعہ طبیعت پر زیادہ شاق گزرتا ہے اور تیار شدہ جواب ہٹ دھرم مدمقابل کا منہ بند کرنے کے لیے زیادہ موثر ہوتا ہے۔ [3]

اللہ تعالیٰ نے تحویل قبلہ پر اعتراض کرنے اور رسول اللہ ﷺ کے خلاف سازش کرنے کی وجہ سے یہود کو بے وقوف کہا ہے۔

ابوالسعود لکھتے ہیں کہ ﴿السُّفَهَآءُ﴾ سے مراد وہ لوگ ہوتے ہیں جو بے وقوف اور کم عقل ہوں۔ ایسے لوگ بھیڑ چال چلتے ہیں اور عقل سے کام نہیں لیتے۔ عرب غلط

[1] البقرة 2:142. [2] الصراع مع اليهود لأبي فارس: 102/1. [3] تفسير أبي السعود: 171/1.

طریقے سے یا کچے دھاگے سے بنے گئے کپڑے پر ''سفیہ'' کا لفظ بولتے ہیں۔ آیت میں سفہاء سے مراد یہود ہیں۔'' [1]

② ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا﴾

''اور (جیسے تمھیں ہدایت دی) اسی طرح ہم نے تمھیں افضل اُمت بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہوں۔'' [2]

ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا: ''مطلب یہ کہ ہم نے تمھیں ابراہیم علیہ السلام کے قبلے کی طرف پھیر دیا ہے۔ یہ قبلہ اس لیے پسند کیا کہ تم سب سے بہتر امت قرار پاؤ اور قیامت کے دن دوسری امتوں کی گواہ بن جاؤ۔ وجہ یہی ہے کہ تمام لوگ تمھاری فضیلت کے معترف ہیں۔ ''وسط'' کے معنی بہترین اور عمدہ کے ہیں۔ قریش کو خاندانی شرف کی بنا پر اوسط العرب (بہترین یا افضل ترین عرب) کہا گیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اپنی قوم میں ''وسط'' یعنی بہترین تھے۔ نماز عصر کو بھی اسی لیے صلاۃِ وسطیٰ کہا گیا ہے کہ وہ افضل ترین نماز ہے۔'' [3]

گویا امت محمدیہ کرۂ ارض کے بہترین حصے میں عمدہ ترین عقیدے، اعلیٰ فکر و نظر، اچھے نظم و نسق اور تعلقات میں افضلیت کی حامل ہے۔

③ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَآ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ ۭ وَاِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ﴾

''اور (اے نبی!) جس قبلے (بیت المقدس) پر آپ پہلے تھے، اسے تو ہم نے

[1] تفسير أبي السعود: 170/1. [2] البقرة 2:143. [3] تفسير ابن كثير: 430/2.

صرف یہ جاننے کے لیے مقرر کیا تھا کہ کون رسول کی پیروی کرتا ہے اور کون اپنی ایڑیوں کے بل پھر جاتا ہے اور بے شک یہ (قبلہ کی تبدیلی) بہت بھاری ہے (کافروں پر) مگر اُن لوگوں پر (نہیں) جنھیں اللہ نے ہدایت دی۔''[1]

یہ آیت بتاتی ہے کہ ابتدا میں بیت المقدس کے رخ پر نمازوں کی ادائیگی اور پھر بیت اللہ کی طرف قبلہ کی تبدیلی بڑی آزمائش تھی۔ قاضی بیضاوی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں: ''ہم نے پہلے بیت المقدس کو قبلہ اس لیے مقرر کیا تھا کہ دیکھیں کون رسول کی اتباع کرے گا اور کون اپنی ایڑیوں پر پھرے گا، یعنی اس لیے کہ ہم لوگوں کا امتحان لیں یا اس لیے کہ ہم جان لیں کہ نماز میں کون رسول کی اتباع کرتا ہے اور کون قبائلی تعصب کی بنا پر اس طریقے سے انحراف کرتا ہے۔''[2]

ابتدا میں بیت اللہ اور بیت المقدس اور پھر دوبارہ بیت اللہ کی طرف رخ کرنا اور جب تک اللہ کا حکم ہو اس پر کاربند رہنا کوئی حرج والی بات نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ہر حال میں قبلہ رخ ہونا عبادت ہی ہے۔ اور لوگوں پر صرف اللہ تعالیٰ کا حکم ماننا لازم ہے، اسی لیے جو شخص تحویل قبلہ کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ کا حکم بجالاتا اور اطاعت شعاری کا ثبوت دیتا ہے وہی امتحان میں کامیاب سمجھا جائے گا۔ اس کے برعکس جو آدمی اپنے دل میں شرعی حکم کے متعلق تنگی پاتا ہے وہ ناکام و نامراد ہوگا۔ سچا ایمان وہی ہے جو صاحبِ ایمان کو خواہشِ نفس کی پیروی سے روکے اور اتباع کی راہ پر گامزن کرے۔[3]

④ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝ ﴾

''اور اللہ ایسا نہیں کہ تمھارا ایمان ضائع کر دے۔ بے شک اللہ لوگوں پر بہت نرمی

[1] البقرة 2:143. [2] الصراع مع اليهود لأبي فارس: 101/1. [3] الصراع مع اليهود لأبي فارس: 101/1.

کرنے والا، بڑا رحم کرنے والا ہے۔‘‘[1]

آیت کے اس حصے میں اپنے بھائیوں کے لیے اہل ایمان کے نیک جذبات کا اظہار کیا گیا ہے۔ تحویل قبلہ کی آیت نازل ہوئی اور بیت اللہ قبلہ قرار دیا گیا تو مومنین کو اپنے ان اسلامی بھائیوں کی عبادت کے ضائع ہونے کا ڈر رہا جو انھوں نے بیت المقدس کے رخ پر ادا کی تھی۔ اس فکر مندی کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ ان کی گزشتہ تمام نمازیں قبول ہیں۔

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا بیان ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بیت اللہ کے رخ پر نماز ادا کرنے کا حکم ہوا تو لوگوں نے دریافت کیا: ’’اے اللہ کے رسول! ہمارے ان بھائیوں کا کیا ہوگا جو وفات پا چکے ہیں اور انھوں نے بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نمازیں ادا کی تھیں؟‘‘ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہی آیت نازل فرمائی۔[2]

⑤ ارشاد ربانی ہے:

﴿قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا ۪ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ؕ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغٰفِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ۝ وَلَئِنْ اَتَيْتَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ بِكُلِّ اٰيَةٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ ۚ وَمَآ اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ ۚ وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ ؕ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ؕ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝ اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ۝ وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ؕ اَيْنَ

[1] البقرة 2:143. [2] سنن أبي داود، حديث: 4680، و جامع الترمذي، حديث: 2964، و مسند أحمد: 1/295 و 304 و 322 و 347.

مَا تَكُوْنُوْا يَاْتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا ۚ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴾

''ہم آپ کے چہرے کا بار بار آسمان کی طرف اُٹھنا دیکھ رہے ہیں تو ہم ضرور آپ کو اس قبلے کی طرف پھیر دیں گے جسے آپ پسند کرتے ہیں، پھر آپ اپنا منہ مسجد حرام کی طرف پھیر لیں اور جہاں کہیں بھی تم ہو اپنے منہ اس کی طرف پھیر لو اور بے شک وہ لوگ جنھیں کتاب دی گئی وہ ضرور جانتے ہیں کہ بے شک یہ ان کے رب کی طرف سے حق ہے اور اللہ اس سے غافل نہیں جو وہ عمل کرتے ہیں۔ اور (اے نبی!) اگر آپ ان لوگوں کے پاس ہر قسم کی نشانی لے آئیں جنھیں کتاب دی گئی تو بھی وہ آپ کے قبلے کی پیروی نہیں کریں گے اور نہ آپ ان کے قبلے کی پیروی کرنے والے ہیں۔ اور ان میں سے کوئی گروہ دوسرے گروہ کے قبلے کی پیروی کرنے والا نہیں۔ اور اگر آپ نے ان کی خواہشات کی پیروی کی، اس علم کے بعد جو آپ کے پاس آچکا ہے تو یقیناً اس وقت آپ ظالموں میں سے ہو جائیں گے۔ جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی وہ اس (رسول) کو ایسے پہچانتے ہیں جیسے وہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔ اور بے شک ان میں سے ایک گروہ ضرور حق کو چھپاتا ہے، حالانکہ وہ جانتے ہیں۔ یہ حق ہے تمھارے رب کی طرف سے، لہٰذا (اس کے متعلق) تم ہرگز شک میں نہ پڑنا۔ اور ہر ایک کے لیے ایک سمت ہے جس کی طرف وہ منہ پھیرتا ہے، لہٰذا تم نیکیوں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھو۔ تم جہاں کہیں بھی ہو گے، اللہ تم سب کو لے آئے گا، بے شک اللہ ہر چیز پر خوب قادر ہے۔''[1]

رسول اللہ ﷺ کی دیرینہ خواہش تھی کہ نماز میں اپنے والد ابراہیم (علیہ السلام) کے قبلے کا رخ کیا کریں۔ آپ ﷺ ابراہیم علیہ السلام کے تعلق دار ہونے کے لحاظ سے اس قبلے کے سب

[1] البقرۃ 2:144-148.

سے زیادہ مستحق تھے۔ آپ ابراہیم علیہ السلام کی دعاؤں کا ثمرہ تھے اور انھی کی طرح توحید کے علمبردار تھے۔ آپ چاہتے تھے کہ یہود و نصاریٰ اور دیگر اہلِ ادیان سے ممتاز حیثیت اختیار کریں جو دین کی کتابوں میں تحریف اور تبدیلیِ مطالب کے مرتکب ہوئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ یہود و نصاریٰ کی تقلید کرنے اور مشابہت اختیار کرنے سے روکتے تھے۔ یہی نہیں بلکہ آپ ان کی مخالفت کرنے کا حکم دیتے اور ان بے ضابطگیوں سے پرہیز کرنے کو کہتے جن میں پڑ کر یہود و نصاریٰ گمراہی اور انحراف کا شکار ہوئے تھے۔ اس بسا آرزو کا تقاضا تھا کہ رسول اللہ ﷺ نمازوں کے لیے مستقل طور پر قبلۂ ابراہیم کی طرف رخ کر لیں جو روئے زمین پر اللہ کا اولین گھر تھا۔[1]

تحویل قبلہ کا واقعہ نہایت دور رس سیاسی و عسکری اور دینی و تاریخی نتائج کا حامل تھا۔ سیاسی اعتبار سے دیکھا جائے تو اس نے جزیرہ نمائے عرب کو مختلف واقعات و حوادث کا محور و مرکز بنا دیا۔ تاریخی لحاظ سے اس نے دنیا کو ابراہیم علیہ السلام کی عربی وراثت سے منسلک کر دیا اور عسکری طور پر اس واقعے نے فتح مکہ کا راستہ ہموار کیا اور مسجدِ حرام کے مرکزِ توحید کو ناپسندیدہ صورتحال سے باہر نکالا جو ایک بت کدہ بن چکا تھا۔ دینی حوالے سے اس واقعے نے لوگوں کو دینِ حنیف سے جوڑ دیا اور امت مسلمہ کو دیگر ادیان و مذاہب کے مقابلے میں امتیازی حیثیت عطا کر دی۔[2]

⑥ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۖ وَإِنَّهُ لَلْحَقُّ مِن رَّبِّكَ ۗ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ○ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ وَحَيْثُ مَا كُنتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ إِلَّا الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِي وَلِأُتِمَّ نِعْمَتِي

[1] الصراع مع اليهود لأبي فارس: 1/100. [2] الأساس في السنة لسعيد حوّى: 1/440.

عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ۝ كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ۝ فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ ۝﴾

''اور (اے نبی!) آپ جہاں سے بھی نکلیں، اپنا منہ مسجد حرام کی جانب پھیر لیں اور بے شک وہ آپ کے رب کی طرف سے حق ہے اور اللہ اس سے غافل نہیں جو تم عمل کرتے ہو اور آپ جہاں سے بھی نکلیں، اپنا منہ مسجد حرام کی جانب پھیر لیں اور (اے مسلمانو!) تم جہاں کہیں بھی ہو، اپنے منہ اسی کی جانب پھیر لو تاکہ تمھارے خلاف لوگوں کے لیے کوئی حجت نہ رہے۔ ہاں، ان میں سے جنھوں نے ظلم کیا (وہ باتیں کرتے رہیں گے)، پس تم ان سے مت ڈرو اور صرف مجھ سے ڈرو تاکہ میں تم پر اپنی نعمت پوری کروں اور شاید کہ تم ہدایت پاؤ۔ جیسے ہم نے تمھارے لیے تمھی میں سے ایک رسول بھیجا، وہ تم پر ہماری آیتیں تلاوت کرتا ہے اور تمھیں پاک کرتا ہے اور تمھیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور تمھیں وہ (باتیں) سکھاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے۔ چنانچہ تم مجھے یاد کرو، میں تمھیں یاد کروں گا اور تم میرا شکر کرو اور میری ناشکری نہ کرو۔''[1]

رسول اللہ ﷺ جیسی شخصیت کی قیادت اور آپ کا مبارک وجود مسلمانوں کے لیے بلاشبہ خوش قسمتی کی بات تھی کہ جو افراد کی تربیت کا ذمہ دار تھا وہ لوگوں کی طبائع سے خوب واقف تھا۔ وہ ان کا روحانی طبیب اور ان کے قلب ونظر کا نور تھا۔ ﴿يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا﴾ امت محمدیہ کی تربیت کا بنیادی نصاب کتاب اللہ کی صورت میں موجود ہے۔ قرآن کریم بوقت نزول ملائمت اور تروتازگی سے بھرپور تھا، چنانچہ ایک بڑی جماعت قرآن سن کر متاثر ہوئی اور انسانی تاریخ میں ایک ممتاز قوم کی حیثیت سے ابھری۔

[1] البقرة2:149-152۔

﴿وَيُزَكِّيْكُمْ﴾ لوگوں کی تعلیم و تربیت کے ذمہ دار معلم و مربی نبی ﷺ تھے جن کی سیرت و اخلاق اور الٰہی احکامات کے نفاذ کو اللہ تعالیٰ نے ایسے جامع و مانع وصف سے بیان کیا ہے جو صرف آپ ﷺ ہی کا خاصہ ہے، چنانچہ فرمایا:

﴿وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ○﴾

''اور یقیناً آپ خُلقِ عظیم پر (کاربند) ہیں۔''[1]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے آپ ﷺ کے اخلاق کو اتنے خوبصورت پیرائے میں بیان کیا ہے کہ اس سے زیادہ خوبصورتی سے اسے اور کوئی آدمی بیان نہیں کرسکتا۔ فرماتی ہیں:

«كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآنَ»

''اللہ کے نبی کا اخلاق قرآن تھا۔''[2]

چنانچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نبی ﷺ کی لسان اطہر سے قرآن کریم کی تلاوت سنتے اور آپ ﷺ کے مبارک وجود کی صورت میں قرآن کو چلتا پھرتا دیکھتے۔

﴿وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ﴾ یہ رسول اللہ ﷺ کا تیسرا وصف ہے کہ آپ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتے تھے۔ قرآن کریم امت پر بہتر انداز میں اثرانداز ہو، اس کے لیے ضروری تھا کہ ایک معلمِ ربانی ہو جو نفوس کا تزکیہ کرے، قلوب کو پاک کرے اور امت کو قرآن کریم اور سنتِ نبوی کے ذریعے سے شریعت کے احکام بتلائے۔ وہ قرآن کریم کی مشکلات حل کر کے بتائے، اس کے احکام بیان کرے، اجمال کی تفصیل کرے، اُس سے اس کی تطبیق کے بارے میں سوال کیا جائے اور وہ قرآنِ کریم کے متعلق فکر و نظر کی گمراہیاں اور غلط فہمیاں دور کرے۔

رسول اللہ ﷺ نے اس ذمہ داری کو بطریقِ احسن نبھایا۔ آپ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم

1 القلم 68:4. 2 الأدب المفرد للبخاري: 308، و مسند أحمد: 91/6، و السنن الكبرٰى للنسائي: 11287.

کی تعلیم و تربیت ربانی منہج کے مطابق کی تا کہ آئندہ نسلوں میں یہ سلسلہ اسی انداز سے جاری رہے۔ صحابۂ کرام نے نبی ﷺ سے تعلیم و تربیت، دعوت اور امت کی قیادت کا طریق کار سیکھا۔ یوں نبی ﷺ ایک ایسی جماعت تیار کرنے میں کامیاب ہوئے جو انسانیت کی قیادت سنبھالنے کی پوری اہلیت رکھتی تھی۔ صحابہ کرام تعلیم و تربیت کے قرآنی و نبوی منہج کو لیے دنیا کے ہر گوشے میں پہنچے اور تمام لوگوں پر حجت قائم کر دی۔

﴿وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ﴾ وحی و رسالت سے قبل لوگ کیسے تھے اور بعد میں ان کے اندر کیا تبدیلی واقع ہوئی۔ وحی و رسالت سے پہلے لوگ جنگ و جدل اور اندھا دھند جاہلیت میں پڑے تھے۔ وحی و رسالت کی روشنی آ جانے کے بعد اللہ کے فضل و کرم سے وہ ایک عظیم امت کے روپ میں سامنے آئے جن کی زندگی کا ایک نصب العین تھا اور جو خدائی پیغام کے حامل تھے۔

اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی اور خوشنودی ان کی زندگی کا مطمحِ نظر ٹھہری۔ بندگی و اطاعت شعاری کا محور و مرکز انھوں نے اللہ تعالیٰ کی ذات کو قرار دیا۔ ذاتی مفادات و انا پرستی کے گمراہ کن جذبات اور خواہشِ نفس کے مضبوط شکنجے سے نکل کر وہ امت کی اجتماعی تعمیرِ نو اور اس کی تہذیبی و تمدنی ترقی کی راہ پر آ گئے۔ یوں وہ اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ کے فضل و کرم سے دو اعلیٰ ترین تمغوں کے مستحق قرار پائے۔[1]

پہلا تمغا یہ تھا:

﴿كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ﴾

"تم بہترین امت ہو جو لوگوں (کی اصلاح) کے لیے پیدا کی گئی ہے، تم نیک کاموں کا حکم دیتے ہو اور برے کاموں سے روکتے ہو اور تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔"[2]

1 التربية القيادية للدكتور الغضبان: 2/438-442. 2 آل عمرٰن 3:110.

اور دوسرا انعام یہ تھا:

﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا﴾

''اور (جیسے تمھیں ہدایت دی) اسی طرح ہم نے تمھیں افضل اُمت بنایا تا کہ تم لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہوں۔''[1]

⑦ ارشاد ربانی ہے:

﴿فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ ○﴾

''چنانچہ تم مجھے یاد کرو، میں تمھیں یاد کروں گا اور تم میرا شکر کرو اور میری ناشکری نہ کرو۔''[2]

یہ تمام احسانات اور یہ انعامات اور یہ بھلائیاں اس امر کی متقاضی ہیں کہ صبح و شام اللہ کا ذکر کیا جائے اور اس کا شکر بجا لایا جائے۔ مولیٰ عزوجل نے مسلمانوں کو اپنی یاد کی ترغیب دلائی ہے اور بتایا ہے کہ ان کا ذکر فرشتوں کی اعلیٰ ترین مجلس میں کیا جاتا ہے اور وہ غیر معمولی امتیاز حاصل کر چکے ہیں، جبکہ اس سے قبل ان کا کوئی پرسانِ حال نہیں تھا اور وہ کسمپرسی کے عالم میں دشتوں اور صحراؤں کو ناپتے پھرتے تھے، چنانچہ ان نعمتوں کی بدولت اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا حق ہے کہ نہایت انکسار سے اس کا شکر ادا کیا جائے۔[3]

قرآنِ کریم نے ایسے ہی عظیم واقعات کے حوالے سے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی تربیت کی اور ان میں مضبوط ایمانی تشخص ابھارا۔ اسلام کے سوا ان کی نگاہوں میں اب اور کوئی دین نہیں جچتا تھا۔ قرآنِ حکیم ہی کے ذریعے سے انھوں نے یہودیوں کا مزاج سمجھا۔ وہ بنظرِ غائر ان کے اطوار کا مطالعہ کرتے رہے۔ آخر کار اسی نتیجے پر پہنچے جس تک ان کی رہنمائی قرآنِ مجید نے کی تھی اور یہودیوں کی وہی تصویر ابھر کر ان کے سامنے آئی جو خود قرآنِ پاک نے

[1] البقرة2:143. [2] البقرة2:152 . [3] التربية القيادية للدكتور الغضبان:2/442.

پیش کی تھی، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ۗ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ۗ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِيْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴾

''اور یہودی اور عیسائی آپ سے ہرگز راضی نہ ہوں گے یہاں تک کہ آپ ان کی ملت کی پیروی کریں۔ کہہ دیجیے: بے شک اللہ کی ہدایت ہی حقیقی ہدایت ہے اور آپ کے پاس جو علم آ گیا اس کے بعد اگر آپ نے ان کی خواہشات کی پیروی کی تو آپ کو اللہ (کی پکڑ) سے (بچانے والا) نہ کوئی حمایتی ہوگا اور نہ کوئی مددگار۔''[1]

قرآن کریم میں بیان کردہ یہود کی بدعادتیں

یہود کی تاریخ اور نبیِ اسلام کے بارے میں ان کے خیالات ونظریات کا مطالعہ کرنے سے ان کی بدباطنی اور بہیمانہ سرشت آشکار ہوتی ہے اور ان کے گہرے سازشی ذہن کا پتا چلتا ہے۔ اور اس پر تعجب بھی نہیں ہونا چاہیے کہ وہ آدمی جو درست عقائد پر مشتمل دین صحیح سے الگ ہو چکا ہو، انھی صفات کا حامل ہوگا۔ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے ہمنواؤں کو یہود کی طرف سے سخت تکلیف دہ برتاؤ کا سامنا کرنا پڑا۔ قرآن کریم نے جستہ جستہ اس کا ذکر کیا ہے جبکہ احادیث، تاریخ اور سیرت کی کتابیں یہود کے منفی رویے کے متعلق واقعات سے بھری پڑی ہیں۔ قرآن و حدیث میں یہود کی جن صفات کا تذکرہ ملتا ہے ان میں منافقت، اللہ اور رسول کی شان میں گستاخی، دھوکا، فریب، چاپلوسی اور مفاد پرستی، علم سے عدم استفادہ، کینہ پروری، ناگواری، حسد، لالچ، بخیلی، احسان فراموشی، بے حیائی، غرور وتکبر، خود نمائی، شرک، انبیاء و صالحین کے خلاف محاذ آرائی، اندھی تقلید، کتمانِ علم، مسخِ حقائق، حرام اشیاء اپنانے کے لیے حیلہ جوئی، فرقہ واریت، قوانین کے نفاذ میں طبقاتی اونچ نیچ کا

[1] البقرۃ 2:120۔

لحاظ، رشوت خوری، جھوٹ اور غلاظت پسندی جیسی گھناؤنی عادات شامل ہیں۔

یہود کے جن مذموم اوصاف کا ذکر قرآنِ کریم نے کیا ہے، انھیں یہاں قدرے تفصیل سے پیش کیا جاتا ہے۔

① شرک: یہود کی عبادات باطل پرستی اور شرک پر مبنی ہیں۔ ان کا عقیدہ تھا کہ اللہ کی بھی اولاد ہے۔ وہ عبادات میں اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہراتے ہیں۔ قرآن کریم نے ان کے شرکیہ طرزِ عمل کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا:

﴿وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللَّهِ وَقَالَتِ النَّصَارَى الْمَسِيحُ ابْنُ اللَّهِ ۖ ذَٰلِكَ قَوْلُهُم بِأَفْوَاهِهِمْ ۖ يُضَاهِئُونَ قَوْلَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِن قَبْلُ ۚ قَاتَلَهُمُ اللَّهُ ۚ أَنَّىٰ يُؤْفَكُونَ ○ اتَّخَذُوا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِّن دُونِ اللَّهِ وَالْمَسِيحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا إِلَٰهًا وَاحِدًا ۖ لَّا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۚ سُبْحَانَهُ عَمَّا يُشْرِكُونَ ○﴾

''اور یہودیوں نے کہا: عزیر اللہ کا بیٹا ہے اور عیسائیوں نے کہا: عیسیٰ اللہ کا بیٹا ہے، یہ ان کے مونہوں کی بات ہے، یہ اس سے پہلے کے کافروں کی بات کی رِیس کرتے ہیں، اللہ انھیں ہلاک کرے یہ کہاں پھرے جاتے ہیں، انھوں نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے علماء اور درویشوں کو (اپنا) رب بنالیا اور مسیح ابن مریم کو (بھی)، حالانکہ انھیں یہی حکم دیا گیا تھا کہ وہ صرف ایک معبود (اللہ) کی عبادت کریں، جس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ اس شرک سے پاک ہے جو وہ کرتے ہیں۔''[1]

معلوم ہوا کہ یہود صرف شرک کی باتیں ہی نہیں کرتے تھے بلکہ انبیاء اور صالحین کی پوجا بھی کرتے تھے۔ انھوں نے انبیاء و صالحین کی قبروں کو سجدہ گاہیں اور آستانے بنا لیا تھا جن کی وہ اللہ کو چھوڑ کے پوجا کرتے تھے۔[2]

---

1 التوبة9:31,30. 2 اليهود في السنة المطهرة للدكتور عبد الله الشقاري:2/507.

نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«قَاتَلَ اللّٰهُ الْيَهُودَ اتَّخَذُوا قُبُورَ أَنْبِيَاءِ هِمْ مَسَاجِدَ»

''اللہ یہود کو تباہ کرے۔ انھوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا تھا۔''[1]

② **انبیاء و صالحین کے خلاف محاذ آرائی:** یہودیوں نے ایک طرف تو اپنے علماء و مشائخ کو معبود کا درجۂ تقدس دے رکھا تھا اور دوسری طرف ان کے خلاف محاذ آرائی سے بھی گریز نہ کرتے اور مختلف وسائل کو بروئے کار لاتے ہوئے ان پر حملے کرتے رہے۔ انھوں نے انبیائے کرام علیہم السلام کو قتل کرنے سے بھی دریغ نہ کیا۔ زکریا اور یحییٰ علیہما السلام سے انھوں نے یہی ظالمانہ سلوک کیا۔[2] اللہ تعالیٰ نے ان کا یہ سفاکانہ عمل ریکارڈ کیا ہے، چنانچہ ان پر نازل کردہ عذابوں کا تذکرہ کرنے کے بعد فرمایا:

﴿وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ۗ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۗ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۝﴾

''اور ان پر ذلت اور محتاجی مسلط کر دی گئی اور وہ اللہ کے غضب کے ساتھ لوٹے۔ یہ اس لیے ہوا کہ بے شک وہ اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے تھے اور قتل کرتے تھے نبیوں کو ناحق یہ اس سبب سے کہ انھوں نے نافرمانی کی اور وہ حد سے بڑھ جانے والے تھے۔''[3]

③ **کتمانِ علم اور حقائق میں تحریف:** کتمانِ علم اور حقائق میں ردو بدل کرنا قدیم زمانے سے یہود کی صفات چلی آتی ہیں۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «قِيلَ لِبَنِي إِسْرَائِيلَ: ﴿وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُوْلُوْا حِطَّةٌ﴾، فَبَدَّلُوا،

[1] صحيح البخاري، حديث: 437، و صحيح مسلم، حديث: 530. [2] اليهود في السنة المطهرة للدكتور عبد الله الشقاري:509/2. [3] البقرة61:2.

وَ دَخَلُوا يَزْحَفُونَ عَلٰى أَسْتَاهِهِمْ، وَ قَالُوا: حَبَّةٌ فِي شَعْرَةٍ»

''بنی اسرائیل سے کہا گیا: ''دروازے سے جھک کر داخل ہو جاؤ اور ''حطہ'' (مغفرت) کا کلمہ کہتے جاؤ۔''

انھوں نے کلمے کو بدل ڈالا اور دروازے سے سرین کے بل گھسٹتے ہوئے داخل ہوئے اور ''سٹے (بالی) میں دانہ'' کہتے رہے۔''[1]

سب سے بڑا علم جسے یہودی علماء نے چھپانے اور اس کی حقیقت مخفی رکھنے کی کوشش کی، نبی ﷺ کی نبوت و رسالت کا علم تھا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ہاں رافع بن حارثہ، سلام بن مشکم، مالک بن صیف اور رافع بن حریملہ آئے اور کہا: ''اے محمد! کیا آپ یہ نہیں سمجھتے کہ آپ ابراہیم (علیہ السلام) کے دین پر ہیں اور ہماری کتاب تورات پر بھی ایمان رکھتے ہیں کہ وہ اللہ کی طرف سے برحق ہے؟'' آپ نے فرمایا: «بَلٰى وَلٰكِنَّكُمْ أَحْدَثْتُمْ وَ جَحَدْتُّمْ مَّا فِيهَا، مِمَّا أَخَذَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْمِيثَاقِ فِيهَا، وَكَتَمْتُمْ مِّنْهَا مَا أُمِرْتُمْ أَنْ تُبَيِّنُوهُ لِلنَّاسِ فَبَرِئْتُ مِنْ إِحْدَاثِكُمْ» ''ہاں، بالکل۔ مگر تم نے اپنی طرف سے نئی باتیں ایجاد کر لی ہیں اور یہ کتاب جس پر عمل کرنے کا اللہ نے تم سے پکا وعدہ لیا تھا، اس کی خلاف ورزی کی۔ اور تم نے اس معاملے کو چھپا لیا جس کے متعلق حکم تھا کہ اسے واضح طور پر لوگوں کے سامنے لے آئیں، لہٰذا میں تمھارے اس فعل سے بری ہوں۔'' یہود ڈھٹائی سے کہنے لگے: ''ہمارے پاس اس وقت جو کچھ ہے ہم اسی کو تھامے رکھیں گے۔ بلاشبہ ہم ہدایت اور حق پر ہیں۔ ہم آپ پر ایمان نہیں لائیں گے اور نہ آپ کی اتباع کریں گے۔''[2] اس پر اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

[1] صحيح البخاري، حديث: 3403، و صحيح مسلم، حديث: 3015. [2] السيرة النبوية لابن هشام: 217/2، و تفسير الطبري: 310/6.

﴿قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّكُفْرًا ۚ فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝﴾

''(اے نبی!) کہہ دیجیے: اے اہل کتاب! تم ہرگز اصل دین پر کاربند نہیں ہو سکتے یہاں تک کہ تم تورات و انجیل اور اپنی طرف، اپنے رب کی طرف سے نازل کی گئی (دوسری) کتابوں کے احکام پر ٹھیک ٹھیک عمل کرنے لگو۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ (قرآن) جو آپ کے رب کی طرف سے نازل ہوا ہے، ان میں سے اکثر لوگوں کی سرکشی اور کفر میں اضافے کا باعث بنے گا اور آپ کافروں کی قوم کا غم نہ کھائیں۔''[1]

④ **فرقہ واریت:** یہودی آپس میں ہمیشہ سے مختلف افکار و نظریات کے حامل اور احکامِ شریعت کے بارے میں فرقہ واریت کا شکار رہے ہیں۔ وہ بظاہر ایک نظر آتے ہیں لیکن، جیسا کہ قرآن نے بتایا، ان کے دل الگ الگ ہیں۔ ارشاد ہے:

﴿لَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ جَمِيْعًا اِلَّا فِيْ قُرًى مُّحَصَّنَةٍ اَوْ مِنْ وَّرَآءِ جُدُرٍ ؕ بَاْسُهُمْ بَيْنَهُمْ شَدِيْدٌ ؕ تَحْسَبُهُمْ جَمِيْعًا وَّقُلُوْبُهُمْ شَتّٰى ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ ۝﴾

''وہ سب مل کر بھی تم سے نہیں لڑ سکیں گے مگر ایسی بستیوں میں جو قلعہ بند ہیں یا دیواروں کی اوٹ سے، ان کی آپس کی لڑائی (دشمنی) بہت سخت ہے، آپ انھیں اکٹھے سمجھتے ہیں جبکہ ان کے دل جدا جدا ہیں، یہ اس لیے کہ بے شک وہ ایسے لوگ ہیں جو عقل نہیں رکھتے۔''[2]

⑤ **رشوت خوری:** یہودیوں کی ایک خاص معاشرتی علامت یہ تھی کہ وہ اپنے مقاصد کے

[1] المآئدۃ 5:68. [2] الحشر 59:14.

حصول کے لیے ہر ممکن ذریعہ استعمال کرتے تھے۔ اس ذریعے کے استعمال سے خواہ ان کی شریعت نے روکا ہی ہو مگر وہ اس کی مطلق پروانہ کرتے تھے۔ انھی ذرائع میں سے ایک ذریعہ ان کے ہاں رشوت اور حرام خوری کا بھی تھا جسے کام میں لانا ان کی سرشت میں شامل تھا۔ حق تعالیٰ شانہ نے ان کی یہ عادت صراحت سے بیان کی ہے، فرمایا:

﴿سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ﴾

''وہ جھوٹی باتیں سننے کے عادی ہیں اور جی بھر کر حرام کھانے والے ہیں۔''[1]

⑥ منافقت: بعض یہودی زعماء نے مدینہ میں اسلامی شان وشوکت کو پروان چڑھتے دیکھا تو نمائشی طور پر اسلام قبول کرلیا اور منافقت کا لبادہ اوڑھ کر اندر کی بات چھپالی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ منافقانہ روش بھی نوٹ کی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَاۗءُ ۭ اَلَآ اِنَّھُمْ ھُمُ السُّفَهَاۗءُ وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ ○ وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ښ وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ○﴾

''اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ ایمان لاؤ جیسے اور لوگ ایمان لائے ہیں تو وہ کہتے ہیں: کیا ہم ایمان لائیں جیسے بیوقوف ایمان لائے ہیں؟ سن لو! بے شک وہی بیوقوف ہیں لیکن وہ نہیں جانتے۔ اور جب وہ ان سے ملتے ہیں جو ایمان لائے تو کہتے ہیں: ہم ایمان لے آئے اور جب وہ اپنے شیطانوں کے پاس تنہا ہوتے ہیں تو کہتے ہیں: یقیناً ہم تمھارے ساتھ ہیں ان لوگوں سے تو ہم صرف مذاق کرتے ہیں۔''[2]

⑦ چاپلوسی اور مفاد پرستی: یہود ہمیشہ ہوا کا رخ دیکھ کر اپنی ترجیحات کا تعین کرتے تھے۔ وہ برائی پر اعتراض نہیں کرتے تھے، یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں ملعون قرار دیا:

---

1 المآئدة 42:5۔ 2 البقرة 2:13، 14۔

﴿لُعِنَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ عَلٰی لِسَانِ دَاوٗدَ وَ عِیْسَی ابْنِ مَرْیَمَ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّ كَانُوْا یَعْتَدُوْنَ ۝ كَانُوْا لَا یَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ؕ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا یَفْعَلُوْنَ ۝﴾

''بنی اسرائیل میں سے جو لوگ کافر ہوئے ان پر داود اور عیسیٰ ابن مریم کی زبان سے لعنت کی گئی، یہ اس وجہ سے ہوا کہ انھوں نے نافرمانی کی اور وہ حد سے گزر جاتے تھے، وہ ایک دوسرے کو برے کام سے منع نہیں کرتے تھے کیونکہ انھوں نے وہ خود کیا ہوتا تھا، بہت برا تھا جو وہ کرتے تھے۔''[1]

⑧ علم سے عدمِ استفادہ: اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کی اس مذموم صفت کی بڑی صحیح تصویر کھینچی ہے۔[2] ارشاد فرمایا:

﴿مَثَلُ الَّذِیْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ یَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ یَحْمِلُ اَسْفَارًا ؕ بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ۝﴾

''ان لوگوں کی مثال، جنھیں حاملِ تورات بنایا گیا، پھر انھوں نے اسے نہیں اٹھایا (یعنی اس پر عمل نہیں کیا) اس گدھے کی سی ہے جو کتابیں اٹھاتا ہے، بری مثال ہے اس قوم کی جنھوں نے اللہ کی آیات کو جھٹلایا اور اللہ ظالم قوم کو ہدایت نہیں دیتا۔''[3]

⑨ کینہ پروری اور ناگواری: یہود کے دلوں کی گہرائی میں اتری ہوئی ایک صفت کینہ پروری اور ناگواری تھی۔ وہ ہر اس چیز سے کینہ رکھتے جس کا ان سے کوئی تعلق نہ ہوتا اور یہ اس آدمی کو ناپسند کرتے جو یہودی نہ ہوتا، اس بات سے قطع نظر وہ کیسا آدمی ہے اور کس مرتبے کا ہے۔ خاص طور پر جو چیز نبی ﷺ سے متعلق ہوتی، اس سے تو انھیں خدا واسطے کا بیر ہوتا تھا۔ تحویلِ قبلہ اور حرمتِ شراب کے واقعات اس امر کے شاہد ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ

[1] المائدة5:78,79. [2] اليهود في السنة المطهرة للدكتور عبد الله الشقاري:2/463-482.
[3] الجمعة62:5.

کہتے ہیں کہ حرمتِ شراب کے متعلق آیت نازل ہوئی تو یہود نے کہا کہ کیا تمھارے فوت شدگان شراب نہیں پیتے تھے؟ اس سوال کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی:

﴿لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْٓا اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاَحْسَنُوْا ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝﴾

”جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرنے لگے، انھوں نے جو کچھ (پہلے) کھایا، اس پر انھیں کوئی گناہ نہیں جبکہ وہ (آئندہ) پرہیز گاری اختیار کریں اور ایمان پر قائم رہیں اور نیک عمل کریں، پھر وہ پرہیز گار ہی رہیں اور ایمان پر جمے رہیں، پھر وہ پرہیز گاری ہی اپنائیں اور نیکی کریں اور اللہ نیکی کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔“ [1]

⑩ حسد: یہودیوں کو نبی ﷺ اور آپ کی رسالت سے شدید حسد تھا۔ ان کا گمان تھا کہ آئندہ نبی یہود میں سے ہوگا جس کے ارد گرد وہ جمع ہوں گے اور اس کے زیرِ قیادت دشمنوں سے لڑیں گے لیکن جب محمد ﷺ مبعوث ہوئے تو یہودی مارے حسد کے دیوانے ہو گئے۔ وہ ہوش و حواس سے بیگانہ ہو کر نبی ﷺ کی اندھا دھند مخالفت پر اڑ گئے۔ اصحابِ کرام سے انھیں یہ چڑ تھی کہ اللہ نے انھیں ایمان و ہدایت کی دولت سے کیوں نواز رکھا ہے اور ان کے سینے اسلام کے لیے کیوں کھول دیے ہیں۔ [2] اس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ ۝﴾

”اور (اللہ کی پناہ میں آتا ہوں) حسد کرنے والے کے شر سے جب وہ حسد کرے۔“ [3]

فرمانِ الٰہی ہے:

---

1 المآئدة 93:5. المستدرك للحاكم: 143/4، 144. 2 الصراع مع اليهود لأبي فارس: 70/1.
3 الفلق 5:113.

﴿وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾

''اہل کتاب میں سے بہت سے یہ چاہتے ہیں کاش کہ وہ تمھارے ایمان لانے کے بعد تمھیں پھیر کر کافر بنا دیں، اپنے دلوں میں حسد کرتے ہوئے، اس کے بعد کہ ان کے سامنے حق واضح ہو چکا، پس معاف کر دو اور جانے دو، یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم لے آئے، بے شک اللہ ہر چیز پر خوب قادر ہے۔''[1]

⑪ غرور و تکبر: غرور و تکبر یہودیوں کی پرانی عادت ہے۔ وہ خود کو تمام انسانوں سے بلند و برتر خیال کرتے اور کہتے تھے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی پسندیدہ قوم ہیں۔ ان کا عقیدہ تھا کہ جنت یہودیوں کے لیے ہے اور دنیا میں یہودیت ہی ہدایت کا واحد راستہ ہے۔ اس کے علاوہ ہر طرف گمراہی ہی گمراہی ہے۔[2] مولیٰ عزوجل نے قرآن مجید میں ان کی اس بری خصلت کو یوں بیان کیا ہے:

﴿وَقَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ﴾

''اور انھوں نے کہا: جنت میں صرف وہی جائے گا جو یہودی یا نصرانی ہوگا۔ یہ ان کی (باطل) آرزوئیں ہیں، (اے نبی!) کہہ دیجیے: لاؤ تم اپنی دلیل، اگر تم سچے ہو۔''[3]

یہود نے نبی ﷺ کے خلاف اس مذموم خصلت کا اظہار مختلف طریقوں سے کیا۔[4]

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے ہاں نعمان بن اَضاء، بحری بن عمرو اور شاس بن عدی آئے، انھوں نے آپ ﷺ سے گفتگو کی۔ آپ ﷺ نے ان سے گفتگو فرمائی، انھیں اللہ کی طرف بلایا اور اس کے عذاب سے ڈرایا۔ یہودیوں نے کہا:

1 البقرة 2:109. 2 اليهود في السنة المطهرة للدكتور عبد الله الشقاري: 2/495,496.
3 البقرة 2:111. 4 تفسير الطبري: 6/105.

''اے محمد! (ﷺ) ہمیں کوئی خوف نہیں، ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں۔'' اس پر اللہ تعالیٰ نے یوں تبصرہ فرمایا:

﴿وَقَالَتِ الْيَهُودُ وَالنَّصَارَىٰ نَحْنُ أَبْنَاءُ اللَّهِ وَأَحِبَّاؤُهُ ۚ قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُم بِذُنُوبِكُم ۖ بَلْ أَنتُم بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ﴾

''اور یہودیوں اور عیسائیوں نے کہا: ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے پیارے ہیں۔ (اے نبی!) کہہ دیجیے: پھر وہ تمھیں تمھارے گناہوں کی سزا کیوں دیتا ہے؟ (نہیں) بلکہ تم بھی اس کی مخلوق میں سے انسان ہو۔''[1]

⑫ بخیلی: بخیلی زمانۂ قدیم سے یہود کے طور اطوار میں شامل ہے۔ وہ نیکی اور رفاہِ عامہ کے کاموں میں مال خرچ نہ کرتے اور اس باب میں کنجوسی کا مظاہرہ کرتے تھے۔ وہ انصار سے کہا کرتے تھے کہ تم بھی اپنے اموال خرچ نہ کیا کرو۔ ہمیں ڈر ہے کہ کہیں تم کنگلے نہ ہو جاؤ اور اخراجات میں احتیاط سے کام لو، نامعلوم آئندہ حالات کیسے ہوں۔[2]

ان کے اس غیر اخلاقی رویے کے متعلق اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا:

﴿الَّذِينَ يَبْخَلُونَ وَيَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَيَكْتُمُونَ مَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ ۗ وَأَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ عَذَابًا مُّهِينًا ○﴾

''ایسے لوگ (بھی اللہ کو پسند نہیں) جو کنجوسی کرتے ہیں اور لوگوں کو بھی کنجوسی کرنے کا حکم دیتے ہیں اور اللہ نے اپنے فضل سے جو کچھ انھیں دیا ہے اسے چھپاتے ہیں اور ہم نے کافروں کے لیے رسوا کر دینے والا عذاب تیار کر رکھا ہے۔''[3]

''چھپانے'' سے مراد یہ ہے کہ وہ محمد ﷺ اور آپ کے دین کے متعلق تورات کے تصدیقی و تائیدی بیانات پوشیدہ رکھتے ہیں اور انھیں لوگوں کے سامنے نہیں لاتے۔ مزید

[1] المآئدة 18:5. [2] اليهود في السنة المطهرة للدكتور عبد الله الشقاري:488,487/2.
[3] النسآء 37:4.

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَاذَا عَلَيْهِمْ لَوْ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَكَانَ اللّٰهُ بِهِمْ عَلِيْمًا ○﴾

''اور ان لوگوں کا کیا جاتا، اگر وہ اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان لے آتے اور اللہ نے انھیں جو مال دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے؟ اور اللہ انھیں خوب جاننے والا ہے۔''[1]

⑬ **بغض و عناد:** محمد ﷺ کے سچے نبی ہونے پر واضح اور دوٹوک دلائل میسر آ جانے کے باوجود یہود اپنے بغض و عناد کے باعث ایمان لانے سے باز رہے اور کفر و تکذیب کی دلدل میں دھنستے چلے گئے۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ بغض و عناد اور سرکشی نے عقل پر خواہشات نفس کے تالے لگا دیے ہیں۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿وَلَئِنْ اَتَيْتَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ بِكُلِّ اٰيَةٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ ۚ وَمَآ اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ ۚ وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ ۚ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ مِّنْ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ○﴾

''اور (اے نبی!) اگر آپ ان لوگوں کے پاس ہر قسم کی نشانی لے آئیں جنھیں کتاب دی گئی تو بھی وہ آپ کے قبلے کی پیروی نہیں کریں گے اور نہ آپ ان کے قبلے کی پیروی کرنے والے ہیں۔ اور ان میں سے کوئی گروہ دوسرے گروہ کے قبلے کی پیروی کرنے والا نہیں۔ اور اگر آپ نے ان کی خواہشات کی پیروی کی، اس علم کے بعد جو آپ کے پاس آ چکا ہے تو یقیناً اس وقت آپ ظالموں میں سے ہو جائیں گے۔''[2]

یعنی اے محمد! آپ ان کے سامنے ایک ہزار ایک دلیل لے آئیں تب بھی وہ نہیں

[1] النسآء 4:39. [2] البقرۃ 2:145.

مانیں گے اور نہ اپنی روش میں ذرہ برابر تبدیلی کریں گے۔[1] اللہ تعالیٰ کا یہ قول ان پر صادق آتا ہے:

﴿قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَمَا تُغْنِي الْاٰيٰتُ وَالنُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ﴾

”(اے نبی!) کہہ دیجیے: دیکھو (اور غور کرو) جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور نشانیاں اور ڈراوے ان لوگوں کو کوئی فائدہ نہیں دیتے جو ایمان نہیں لاتے۔“[2]

یہ چند صفات کی تفصیل تھی جو یہودی قوم کا خاصہ تھیں اور غالباً اب بھی ہیں۔ قرآن کریم نے ان کے ان خصائص پر روشنی ڈالی ہے تاکہ مسلمان یہودیوں کی حقیقت جانیں اور کسی وقت، کسی جگہ ان سے دھوکا نہ کھائیں۔

فسادیوں کی اصلاح نہیں ہوتی

میثاق مدینہ اس امر پر شاہد عادل ہے کہ نبی ﷺ نے یہود کے ساتھ حسنِ معاملہ میں عدل و انصاف کے تقاضوں کا کس درجہ خیال رکھا تھا۔ اس دثیقے نے اسلامی ریاست کے باشندوں کو مذہبی آزادی کا حقیقی مفہوم سمجھایا۔ اس تحریر دلپذیر نے افکار و نظریات اور عقائد میں معاندانہ رویے اور تعصب پروری کا سختی سے رد کیا۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں تھا کہ رسول اللہ ﷺ بیرونی دشمنوں سے دو دو ہاتھ کرنے کے لیے مہلت چاہتے تھے تاکہ ان کا صفایا کر کے اندرونی دشمنوں کا خاتمہ شروع کر دیں جن سے آپ نے معاہدہ کیا ہے۔ ہرگز نہیں! بلکہ یہ بے نظیر اقدام سیاستِ اسلامی کے اصولوں کے عین مطابق تھا جس کے سوتے شریعتِ ربانی کے منبع سے پھوٹے تھے۔[3]

رسول اللہ ﷺ نے یہود کو اہلِ ذمہ قرار دے کر ان سے معاہدہ کیا کہ وہ اسلامی ریاست

[1] دراسات في السيرة النبوية للدكتور عماد الدين خليل، ص:151. [2] يونس 10:101. [3] العهد و الميثاق في القرآن الكريم للدكتور ناصر العمري، ص:121.

کے سایے تلے پر امن اور خوشگوار زندگی گزار سکیں۔ لیکن یہود جو فطری طور پر غدار، خائن اور بدعہد واقع ہوئے تھے، انھوں نے معاہدہ توڑ دیا۔ آخر کار ان کا انجام بھی وہی ہوا جو پیمان شکن لوگوں کا ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے بنوقینقاع اور بنونضیر کے یہودی قبائل کو مدینہ سے جلاوطن کر دیا اور بنوقریظہ کے جنگجو مردوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔[1]

یہود کی جلاوطنی اور قتل کے واقعات آئندہ اپنے مقام پر آئیں گے۔ قرآن کریم نے یہودیوں کی وعدہ شکن طبیعت اور بدنہادی کو بایں الفاظ بیان کیا ہے:

﴿الَّذِيْنَ عٰهَدْتَّ مِنْهُمْ ثُمَّ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَهُمْ فِيْ كُلِّ مَرَّةٍ وَّهُمْ لَا يَتَّقُوْنَ ۝﴾

''وہ جن سے آپ نے معاہدہ کیا، پھر وہ ہر بار اپنا عہد توڑ ڈالتے ہیں اور وہ (اللہ سے ذرا) نہیں ڈرتے۔''[2]

آیت میں عہد سے مراد باہمی جنگ و جدل نہ کرنا اور ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرنا ہے اور یہی جمہور مفسرین کی رائے ہے۔

یہودیوں نے نبی ﷺ اور اہلِ ایمان کے خلاف مکر وفریب کے کئی جال بچھائے اور مسلمانوں کا مقابلہ کرنے کے لیے مختلف تدابیر اختیار کیں مگر ان کی کوئی تدبیر کارگر ثابت نہ ہوئی اور وہ مطلوبہ نتائج حاصل کرنے میں ناکام رہے۔ ان کا مقصد دراصل مسلمانوں کی جمعیت کا شیرازہ بکھیرنا، ان کی ریاست تباہ کرنا اور ان کا سیاسی تشخص پامال کرنا تھا۔

اپنے گھناؤنے مقاصد کے حصول میں یہود کی ناکامی کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی تربیت سیدھے سادھے نبوی منہج کے مطابق ہوئی تھی جس نے ان کے دلوں میں ایمان کا بیج بویا، انھیں صرف اللہ کی بندگی کا ڈھنگ سکھایا اور شرک سے برسرپیکار ہونے کی ہمت عطا کی۔ نبوی تعلیم و تربیت ہی کے سبب صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم روحانی و مادی

[1] تفسير الطبري: 30/8، والتحرير والتنوير لابن عاشور: 48/10. [2] الأنفال 8:56.

ترقی کا راز جان پائے۔ رسول اللہ ﷺ نے صحابۂ کرام کی تربیت مردانگی، عزت نفس کے تحفظ، بڑے پن، بہادری، ترکِ اسبابِ ذلت، ظلم کا مقابلہ اور یہودی سازشوں کے آگے گردن خم نہ کرنے کے اصولوں پر کی تھی۔ صحابۂ کرام نے اسی تربیت کے پیشِ نظر اسلام کے اصولوں پر استقامت اختیار کی اور دشمنوں پر غلبہ پایا۔[1]

یہودیوں کے مکر وفریب اور چالاکی کی شدت کا یہ عالم تھا کہ پہاڑ بھی اپنی جگہ سے ہل جاتے لیکن نبی ﷺ کی قیادت اور منہجِ ربانی کی رہنمائی کے باعث اسلام کا ہراول دستہ یہودی مکر وفریب کے دام میں نہ آیا۔[2]

آج کے مسلمان یہودی سازشوں اور حیلہ سازیوں کے آگے بے بس ہیں تو اس کی وجہ یہی ہے کہ مسلمان امت کی تربیت اور یہودیوں سے معاملہ کرنے کے سلسلے میں منہاجِ نبوی سے دور جا چکے ہیں۔ امت مسلمہ کو ایسی دانش مندانہ قیادت کی فوری اور سخت ضرورت ہے جو اللہ تعالیٰ کے ودیعت کردہ علم وحکمت سے بہرہ مند ہو اور یہود کے اخلاق و کردار اور عادات و اطوار سے بخوبی واقف ہو۔ یہ قیادت یہودیوں سے معاملہ کرنے میں جن اصول وقوانین پر عمل کرے وہ سیاست نبوی سے ماخوذ ہوں۔

دورِ حاضر میں مختلف ممالک واقوامِ عالم کے ہر معاملے میں یہود کی ناروا پالیسیاں دخل اندازی کرتی نظر آتی ہیں۔ ان کا مقصد ایک ہی ہے جسے قرآنِ کریم نے یوں بیان کیا ہے:

﴿وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا﴾

''اور وہ زمین میں فساد کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔''[3]

آیت میں صیغۂ مضارع اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ اُن کا یہ عمل جاری وساری ہے۔ یہود کی فتنہ انگیزیاں کسی ایک تاریخی مرحلے کے ساتھ خاص نہیں تھیں بلکہ فساد فی الارض کا

[1] الصراع مع اليهود لأبي فارس:80/1. [2] الصراع مع اليهود لأبي فارس:79/1. [3] المآئدة 64:5.

خاصہ رہتی دنیا تک ان کی فطرت میں شامل رہے گا۔ یہود سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اقوام عالم کے وسائل پر قبضہ کرنے کے خواہش مند ہیں۔ انھیں یہ جرأت اسلامی تشخص کے ناپید ہونے کی وجہ سے ہوئی جو ان کے مکروفریب کا جال کاٹنے اور اُن کی ناروا پالیسیوں کو ناکام بنانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

فتنہ انگیزی اور تخریب کاری میں یہودیوں کی مہارت اور ہنرمندی شک وشبہ سے بالاتر ہے۔ اپنی اسی عبقریت کی بدولت وہ مواقع سے بھرپور فائدہ اٹھاتے اور انھیں اپنے مذموم مفادات کے حصول کا ذریعہ بناتے ہیں۔ دنیا کے بڑے ممالک میں یہودیوں کا سیاسی و اقتصادی اثر و رسوخ قائم ہے۔ وہ ان ممالک کے ذرائع ابلاغ پر قابض ہیں۔ دو بڑے عالمی اقتصادی نظاموں سرمایہ داری و اشتراکیت میں اُن کا برابر کا حصہ رہا ہے۔ دنیا کے بڑے انقلابات سے بھی وہ پیچھے نہیں رہے۔ اس وقت کئی ایک بین الاقوامی تنظیمیں یہودی مقاصد کے لیے کام کررہی ہیں جن میں فری میسن، انٹرنیشنل ایسوسی ایشن آف لائنز، روٹری کلب اور وِنس آف یہوہ سرفہرست ہیں۔

باب 4

تعلیم و تربیت کا تسلسل

مدنی دور میں پہلے پہل جو قرآنِ کریم نازل ہوا وہ سورۂ بقرہ کی ابتدائی آیات پر مشتمل تھا۔ اس حصے میں اہلِ ایمان، اہلِ کفر اور منافقین کی صفات بیان کی گئی ہیں اور یہود و نصاریٰ کے کردار و اطوار کا جائزہ لیا گیا ہے۔ بالخصوص یہود کی جبلت و حقیقت کو نہایت وضاحت سے زیرِ بحث لایا گیا ہے، اس لیے کہ اسلامی دعوت مدینہ پہنچی تو سب سے پہلے یہی گروہ اُس کی دشمنی کے درپے ہوا تھا۔ [1]

یہ امر قابلِ لحاظ ہے کہ سورۂ بقرہ نے جو مدنی دور کے اوائل میں نازل ہوئی تھی، سب لوگوں کو دینِ الٰہی کی طرف آنے اور عبادتِ الٰہی کی طرف متوجہ ہونے کی دعوت دی تھی۔

چنانچہ ارشاد ہوا:

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ○ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ فِرَاشًا وَالسَّمَاءَ بِنَاءً وَأَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجَ بِهِ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَكُمْ فَلَا تَجْعَلُوا لِلَّهِ أَنْدَادًا وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ ○﴾

”اے لوگو! تم اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تمھیں پیدا کیا اور ان لوگوں کو بھی جو تم سے پہلے تھے تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ۔ وہ (رب) جس نے تمھارے لیے زمین کو بچھونا بنایا اور آسمان کو چھت (بنایا) اور اس نے آسمان سے پانی نازل کیا،

[1] تفسير في ظلال القرآن لسيد قطب: 27/1.

پھر اس کے ذریعے سے (کئی قسم کے) پھلوں سے تمھارے لیے رزق نکالا، پس تم اللہ کے ساتھ شریک نہ ٹھہراؤ، اس حال میں کہ تم جانتے ہو۔''[1]

عہد مدنی میں نازل ہونے والی آیاتِ قرآنی نے مسلمانوں کو انتباہ کیا تھا کہ وہ منافقین کی صفات نہ اپنائیں۔ ان آیات نے نئے اسلامی معاشرے اور نو آموز اسلامی ریاست کے لیے نفاق کی سنگینی کو نہایت وضاحت سے بیان کیا تھا۔ یہ تاریخی حقیقت ہے کہ مسلم معاشرے کے خلاف تحریکِ نفاق کا آغاز عہد مدنی ہی میں ہوا تھا۔ مکہ میں مسلمان ایسی پوزیشن میں نہیں تھے اور نہ وہاں اُنھیں اتنا اثر و رسوخ حاصل تھا کہ کسی گروہ کو اُن کے دباؤ میں آ کر چاپلوسی یا خوشامد کرنے اور بظاہر اسلام قبول کر لینے کی ضرورت پیش آتی۔

ان آیات میں منافقین کے اوصاف، حالات و کردار اور اُن کے نقطہ ہائے نظر پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔ عہد مدنی کی کوئی متوسط اور طویل سورت اُن کے تذکرے سے خالی نہیں۔ اس کا صاف مطلب ہے کہ منافقین کی سرگرمیاں تقریباً پورے مدنی دور میں جاری رہیں، اگرچہ عہد مدنی کے آخر نصف میں اُن کا جوش ماند پڑ گیا تھا۔[2]

عہد مدنی میں نازل شدہ آیات قرآنی نے جن معاملات کو موضوع بحث بنایا اُن میں عظمتِ الٰہی، حقیقتِ کائنات اور ترغیب و ترہیب کے مضامین شامل ہیں۔ تربیتِ امت اور ریاست کے لوازم کی تکمیل کے لیے قانون سازی بھی اسی مرحلے میں کی گئی تھی۔ جوں جوں دعوت و تبلیغ، تعمیرِ معاشرہ اور تاسیس ریاستِ اسلامی کے مراحل طے ہوتے رہے، امتِ مسلمہ اپنے علمی سفر میں بھی نئی نئی منزلوں سے روشناس ہوتی رہی۔ قرآن کریم نے تحصیلِ علم پر زور دیا اور اس راہ میں تگ و دو کرنے والوں کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے بیشتر احادیث میں حصولِ علم کی ترغیب دلائی ہے۔ کتبِ حدیث میں بھی علم کے فضائل کے متعلق علیحدہ طور پر ابواب قائم کیے گئے ہیں۔

[1] البقرۃ 2:21، 22. [2] دراسات في عهد النبوية للدكتور عبدالرحمٰن الشجاع، ص: 172.

امت مسلمہ نے اس حقیقت کو باور کیا تھا کہ اقوام عالم میں نمایاں مقام اور خطے میں بالادستی حاصل کرنے کے لیے علم کا حصول ناگزیر ہے۔ اللہ تعالیٰ دنیا کی زمام اقتدار جاہل اور علم و ہنر کے اعتبار سے پس ماندہ قوموں کے ہاتھ میں نہیں دیتا۔ قرآن کریم کی بیشتر آیات میں حصول علم کی فضیلت بیان کی گئی ہے۔ اُس نے کفر کے مقابلے میں علم کو پیش کیا ہے۔[1] کفر جو جہالت اور گمراہی کا دوسرا نام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ۗ إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُولُو الْأَلْبَابِ﴾

''کیا جو لوگ علم رکھتے ہیں اور جو علم نہیں رکھتے، برابر ہو سکتے ہیں؟ بس عقل والے ہی نصیحت پکڑتے ہیں۔''[2]

علم ہی وہ واحد شے ہے جس کے متعلق رب تعالیٰ نے اپنے رسول کو حکم دیا کہ وہ اُس میں اضافے کی دعا کیا کریں۔ ارشاد فرمایا:

﴿وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِي عِلْمًا﴾

''اور کہیں: اے میرے رب! مجھے علم میں زیادہ کر۔''[3]

آدم علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے جن خصوصیات سے نوازا اور ممتاز کیا تھا اُن میں علم کی خصوصیت سرفہرست ہے۔ ارشاد فرمایا:

﴿وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلَائِكَةِ فَقَالَ أَنْبِئُونِي بِأَسْمَاءِ هَٰؤُلَاءِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ﴾

'' اور اس نے آدم کو سب کے سب نام سکھا دیے، پھر انھیں فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور کہا: اگر تم سچے ہو تو مجھے ان چیزوں کے نام بتاؤ۔''[4]

---

[1] التمكين للأمة الإسلامية لمحمد السيد، ص: 62. [2] الزمر 9:39. [3] طٰه 114:20. [4] البقرة 31:2.

نبی ﷺ نے اپنے مخصوص انداز میں صحابۂ کرام کی تعلیم و تربیت جاری رکھی۔ آپ اُنھیں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا خوف دلاتے، مکارمِ اخلاق پر کاربند رہنے کی تلقین کرتے، احکامِ شریعت کی تشریح بتاتے اور مبادیاتِ اسلامی کی وضاحت فرماتے تھے۔ صحابۂ کرام کی بہتر تعلیم و تربیت کے سلسلے میں آپ ﷺ ابلاغ کے مختلف وسائل و ذرائع استعمال میں لاتے تھے۔ [1]

تربیت کے اہم وسائل اور اصول وقواعد

سطورِ ذیل میں ان وسائل اور اصول وقواعد کا تفصیلی جائزہ پیش کیا جاتا ہے:

بات دُہرانا

متکلم اس اصول پر عمل کرے تو سامعین کے لیے بات سمجھنا، اُس کی تہ تک پہنچنا اور اُسے یاد رکھنا آسان ہوجاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ اکثر اوقات اپنی بات دُہرا دیا کرتے تھے۔ انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے بتایا کہ نبی ﷺ کوئی بات کرتے تو اُسے تین بار دہراتے تھے تاکہ خوب سمجھ میں آجائے۔ جب لوگوں کی محفل میں آتے اور اُنھیں سلام کرتے تو سلام کے الفاظ تین بار کہتے تھے۔ [2]

گفتگو میں ٹھہراؤ

رسول اللہ ﷺ ٹھہر ٹھہر کر اطمینان سے بات کرتے تھے۔ ہر لفظ الگ الگ سمجھ میں آتا تھا۔ یوں بات کو یاد رکھنا آسان ہوجاتا اور اُسے آگے پہنچانے میں کسی قسم کی تحریف یا تبدیلی کا شائبہ نہیں رہتا تھا۔ نبی ﷺ تو اس امر کا اتنا اہتمام کرتے تھے کہ سننے والا چاہتا تو آپ کے الفاظ بآسانی گن سکتا تھا۔ [3]

[1] مناهج و آداب الصّحابة للدكتور عبد الرحمٰن البر، ص: 60,59. [2] صحيح البخاري، حديث: 95. [3] صحيح البخاري، حديث: 3567.

میانہ رو گفتگو، اکتاہٹ سے اجتناب اور مناسب وقت کا انتخاب

رسول اللہ ﷺ گفتگو کی مقدار، اُس کی نوعیت اور وقت کے انتخاب میں میانہ روی اختیار کیا کرتے تھے تاکہ صحابۂ کرام اکتاہٹ کا شکار نہ ہوں اور بات سمجھ کر یاد رکھنے کے لیے تیار رہیں۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، اُنھوں نے کہا: ''نبی ﷺ اس اندیشے سے کہ ہم اکتاہٹ کا شکار ہو جائیں گے، موقع و محل کی مناسبت سے وعظ و نصیحت فرمایا کرتے تھے۔''[1]

مثال بیان کرنا

بات کو دل میں اتارنے کے لیے مثال بیان کرنے کی بڑی عجیب تاثیر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مثال غیر محسوس کو محسوس شکل میں پیش کرتی اور موجودہ صورتحال سے اُس کا ربط قائم کر کے اُسے ذہن کے قریب لے آتی ہے۔ مثال کی گوناگوں صورتوں میں ایسی زبردست بلاغت پائی جاتی ہے جو دلوں کے تار چھیڑتی اور عقل کو لبھاتی ہے۔ بالخصوص عرب کہ فصاحت و بلاغت جن کے گھر کی لونڈی تھی، تفہیم کا یہ طریق کار اُن کے دلوں پر براہِ راست اثر انداز ہوتا تھا۔ یہی باعث ہے کہ قرآنِ کریم نے مثال بیانی کے اسلوب کو جابجا استعمال کیا ہے اور کئی آیات میں اس طرزِ بیان کی حکمت پر بھی روشنی ڈالی ہے، چنانچہ فرمایا:

﴿وَتِلْكَ الْأَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ ۖ وَمَا يَعْقِلُهَا إِلَّا الْعَالِمُونَ ○﴾

''اور یہ مثالیں ہم لوگوں (کو سمجھانے) کے لیے بیان کرتے ہیں اور انھیں بس علم والے ہی سمجھتے ہیں۔''[2]

اور فرمایا:

---

1 صحيح البخاري، حديث: 68. 2 العنكبوت 43:29.

﴿وَ تِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ﴾

''اور یہ مثالیں ہم لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں شاید کہ وہ غور وفکر کریں۔'' [1]

رسول اللہ ﷺ نے یہی دلکش پیرایۂ بیان اختیار کیا اور جابجا ضرب الامثال سے کام لیا۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: ''میں نے ایک ہزار ضرب الامثال رسول اللہ ﷺ سے سُن کر یاد کیں۔'' [2]

احادیث نبویہ میں جو ضرب الامثال استعمال ہوئی ہیں اُن پر کئی کتب لکھی گئی ہیں۔ اُن میں قدیم ترین کتاب ''امثال الحدیث'' کے نام سے ہے جسے قاضی ابو محمد حسن بن عبدالرحمٰن بن خلاد رامہرمزی (متوفی 360ھ) نے تالیف کیا تھا۔ [3]

آزمائشی سوال

آزمائشی سوال کرنا تعلیم و تربیت کے اہم ترین وسائل میں شامل ہے۔ اس طریق کار کے ذریعے سے استاد اور طالب علم کے درمیان گہرا تعلق استوار ہونے میں مدد ملتی ہے، طالب علم کا ذہن کھلتا ہے، اسے یکسوئی میسر آتی ہے اور وہ ذہنی طور پر ہوشیار ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی ﷺ صحابۂ کرام کی تعلیم و تربیت کے سلسلے میں آزمائشی سوال و جواب کی متعدد صورتیں استعمال میں لاتے تھے۔

بعض اوقات سوال کرنے کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ کسی کام کی ترغیب دلائی جائے اور عنانِ توجہ اُس جانب موڑ دی جائے۔ اس صورت میں سوال کا آغاز عام طور پر أَلَا کے کلمۂ تنبیہ سے ہوتا تھا۔ جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، اُنھوں نے کہا کہ ایک دفعہ نبی ﷺ نے صحابۂ کرام سے مخاطب ہو کر فرمایا: «أَلَا أَدُلُّكُمْ عَلٰى مَا يَمْحُو اللّٰهُ بِهِ الْخَطَايَا وَ يَرْفَعُ بِهِ الدَّرَجَاتِ»

1 الحشر 21:59. 2 مناهج و آداب الصحابة للدكتور عبد الرحمٰن البر، ص: 65. 3 مناهج و آداب الصحابة للدكتور عبد الرحمٰن البر، ص: 65.

''میں آپ کو ایسے عمل نہ بتاؤں جن کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ خطائیں مٹاتا اور درجات بلند فرماتا ہے؟''

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے جواب دیا: ''ضرور بتایئے، اے اللہ کے رسول!''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «إِسْبَاغُ الْوُضُوءِ عَلَى الْمَكَارِهِ، وَكَثْرَةُ الْخُطَا إِلَى الْمَسَاجِدِ، وَانْتِظَارُ الصَّلَاةِ بَعْدَ الصَّلَاةِ، فَذٰلِكُمُ الرِّبَاطُ» ''تنگی اور مشقت میں کامل وضو کرنا، مساجد کی طرف زیادہ سے زیادہ چل کر آنا جانا اور نماز کے بعد نماز کا انتظار کرنا، یہی (نفس کی) پہریداری ہے۔''[1]

بعض دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابۂ کرام سے ایسا سوال کرتے تھے جس کے متعلق آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو علم ہوتا تھا کہ صحابۂ کرام اس کا جواب نہیں جانتے اور وہ یہی کہیں گے کہ اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ اس سے بھی آپ کی غرض یہی ہوتی تھی کہ صحابۂ کرام کا دھیان اس موضوع کی طرف ہو اور وہ اُس کے مختلف پہلوؤں پر غور کریں۔

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«أَتَدْرُونَ مَا الْمُفْلِسُ؟» ''کیا تم جانتے ہو کہ مفلس کون ہے؟''

صحابہ نے جواب دیا: ''ہم میں مفلس وہ ہے جس کے پاس مال و دولت اور ساز و سامان نہ ہو۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«إِنَّ الْمُفْلِسَ مِنْ أُمَّتِي، مَنْ يَّأْتِي يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِصَلَاةٍ وَّ صِيَامٍ وَّزَكَاةٍ، وَّ يَأْتِي قَدْ شَتَمَ هٰذَا وَ قَذَفَ هٰذَا وَ أَكَلَ مَالَ هٰذَا وَ سَفَكَ دَمَ هٰذَا، وَ ضَرَبَ هٰذَا، فَيُعْطٰى هٰذَا مِنْ حَسَنَاتِهِ وَ هٰذَا مِنْ حَسَنَاتِهِ، فَإِنْ فَنِيَتْ

---

[1] صحیح مسلم، حدیث: 251، و جامع الترمذي، حدیث: 51، و سنن ابن ماجه، حدیث: 428، و الموطأ للإمام مالك: 161/1، و السنن الكبرٰى للنسائي: 89/1.

حَسَنَاتُهُ قَبْلَ أَنْ يُّقْضٰى مَا عَلَيْهِ، أُخِذَ مِنْ خَطَايَاهُمْ فَطُرِحَتْ عَلَيْهِ ثُمَّ طُرِحَ فِي النَّارِ»

''میری امت میں سے مفلس وہ ہے جو روز قیامت نماز، روزوں اور زکاۃ کا سرمایہ لیے آئے گا لیکن اُس نے کسی کو گالی دی ہوگی تو کسی پر الزام تراشی کی ہوگی، کسی کا مال ہتھیایا ہوگا تو کسی کا خون بہایا ہوگا اور کسی کو زدوکوب کیا ہوگا۔ اب (مظلوم افراد میں سے) ہر ایک کو اُس (ظالم) کی نیکیوں میں سے حصہ دیا جائے گا۔ لوگوں کا حساب چکانے سے پیشتر اگر اُس کی نیکیاں ختم ہو جائیں گی تو لوگوں کی خطائیں اُس (ظالم) پر ڈال دی جائیں گی۔ بعد ازاں اُسے آگ کے حوالے کر دیا جائے گا۔''[1]

کبھی یوں بھی ہوتا کہ رسول اللہ ﷺ سوال سامنے رکھتے اور صحابۂ کرام میں سے کوئی ایک درست جواب دیتا تو آپ ﷺ اُس کی ستائش اور حوصلہ افزائی فرماتے تھے۔ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

«يَا أَبَا الْمُنْذِرِ! أَتَدْرِي أَيُّ آيَةٍ مِّنْ كِتَابِ اللّٰهِ مَعَكَ أَعْظَمُ؟»

''ابو المنذر! کیا آپ جانتے ہیں کہ آپ کے پاس کتاب اللہ کی سب سے عظیم آیت کون سی ہے؟''

میں نے کہا: ''اللہ اور اُس کا رسول ہی بہتر جانتے ہیں۔''

رسول اللہ ﷺ نے دوبارہ دریافت فرمایا:

''ابو المنذر! کیا آپ کو معلوم ہے کہ آپ کے پاس کتاب اللہ کی سب سے جلیل القدر آیت کون سی ہے؟''

میں نے جواب دیا: ﴿ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ﴾

[1] صحيح مسلم، حديث: 2581، و جامع الترمذي، حديث: 2418.

اس پر آپ ﷺ نے خوشی سے میرے سینے پر ہاتھ مار کر فرمایا: «وَاللّٰهِ! لِيَهْنِكَ الْعِلْمُ أَبَا الْمُنْذِرِ!» ''ابوالمنذر! آپ کو یہ علم مبارک ہو۔''[1]

ستائش اور حوصلہ افزائی کا یہ انداز طالب علم کے دل پر خوش کن اثرات چھوڑتا ہے۔ اُس میں خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے اور وہ طلب علم کی راہ میں آگے تک جانے کا آرزومند رہتا ہے۔[2]

توجہ طلب اور انوکھے مطالب کا بیان

اس سلسلے کی بہترین مثال وہ واقعہ ہے جسے حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ ایک روز رسول اللہ ﷺ بالائی راستے سے ہوتے ہوئے بازار سے گزرے۔ آپ ﷺ کے ساتھ صحابہ کرام بھی تھے۔ چلتے چلتے چھوٹے چھوٹے کانوں والے بکری کے ایک مردہ بچے پر نظر پڑی تو ٹھہر گئے۔ آگے بڑھ کر اُسے کان سے پکڑا اور پوچھا: «أَيُّكُمْ يُحِبُّ أَنَّ هٰذَا لَهُ بِدِرْهَمٍ؟» ''آپ میں سے کون پسند کرے گا کہ یہ مردار اُسے ایک درہم میں مل جائے؟''

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے جواب دیا: ''ہم اسے کسی بھی شے کے عوض نہیں لینا چاہیں گے، ہم اس کا کریں گے کیا؟''

آپ ﷺ نے دریافت کیا: «أَتُحِبُّونَ أَنَّهُ لَكُمْ؟» ''کیا آپ پسند کرتے ہیں کہ یہ مردار آپ کا ہو؟''

اصحاب النبی کہنے لگے: ''یہ زندہ بھی ہوتو اس میں عیب ہے کہ کان چھوٹے چھوٹے ہیں۔ اب تو یہ مردہ ہے۔ اس حالت میں تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «فَوَاللّٰهِ! الدُّنْيَا أَهْوَنُ عَلَى اللّٰهِ مِنْ هٰذَا عَلَيْكُمْ»

---

1 صحيح مسلم، حديث: 810، و سنن أبي داود، حديث: 1460، و مسند أحمد: 142/5.

2 مناهج و آداب الصحابة للدكتور عبد الرحمٰن البر، ص: 69.

’’اللہ کی قسم! یہ مردار آپ کے نزدیک جتنا بے وقعت ہے اُس سے کہیں زیادہ یہ دنیا اللہ کے نزدیک بے وقعت ہے۔‘‘[1]

تعلیم و تربیت کے جدید اسالیب کا استعمال

رسول اللہ ﷺ تعلیمی و تربیتی جدید اسالیب بھی استعمال کرتے تھے۔ ان اسالیب و ذرائع کو طلبہ کی توجہ ایک نقطے پر مرکوز کرنے اور بات کو اُن کے ذہن میں بٹھانے کی خاطر استعمال میں لایا جاتا ہے۔ ان تعلیمی اسالیب کی تفصیل حسب ذیل ہے:

اشاروں کی زبان: رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کے باہمی تعلق کی نوعیت بیان کرتے ہوئے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو باہم دگر ملایا تھا۔

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

«اَلْمُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِ كَالْبُنْيَانِ يَشُدُّ بَعْضُهُ بَعْضًا»

’’مومن آپس میں عمارت کی طرح ہیں جس کا ایک حصہ دوسرے کو مضبوط کرتا ہے۔‘‘ یہ کہہ کر آپ ﷺ نے اپنے ہاتھوں کی انگلیوں کو باہم دگر ملایا تھا۔‘‘[2]

خاکہ اتارنا: رسول اللہ ﷺ مطالب کی تشریح کے لیے زمین پر خاکہ اتارتے اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو اُس کی جزئیات سے آگاہ فرماتے تھے۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے کہا: ’’رسول اللہ ﷺ نے ہاتھ سے (زمین پر) ایک خط کھینچا اور فرمایا:

«هٰذَا سَبِيلُ اللّٰهِ مُسْتَقِيمًا» ’’یہ اللہ کا راستہ ہے، سیدھا سیدھا۔‘‘

پھر اُس خط کی دائیں اور بائیں جانب چند مزید خط کھینچے اور فرمایا:

«وَهٰذِهِ سُبُلٌ - قَالَ يَزِيدُ: مُتَفَرِّقَةٌ - عَلٰى كُلِّ سَبِيلٍ مِّنْهَا شَيْطَانٌ

---

[1] صحيح مسلم، حديث: 2957. [2] صحيح البخاري، حديث: 2446، و صحيح مسلم، حديث: 2585.

يَّدْعُو إِلَيْهِ»

''اور یہ راستے (یزید نے کہا:) علیحدہ علیحدہ ہیں۔ ان میں سے ہر راستے پر ایک شیطان ہے جو اُس کی طرف بلا رہا ہے۔''

پھر آپ ﷺ نے یہ آیت تلاوت کی:

﴿وَأَنَّ هَٰذَا صِرَاطِي مُسْتَقِيمًا فَاتَّبِعُوهُ ۖ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَن سَبِيلِهِ ۚ ذَٰلِكُمْ وَصَّاكُم بِهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۝﴾

''اور یقیناً یہ میرا راستہ ہے سیدھا، لہٰذا تم اسی کی پیروی کرو اور تم دوسرے راستوں کی پیروی مت کرو، وہ تمھیں اللہ کے راستے سے الگ کر دیں گے۔ اللہ نے تمھیں اس کی تاکید کی ہے تاکہ تم پرہیز گاری اختیار کرو۔'' [1]

متعلقہ اشیاء کو ناظرین کے سامنے پیش کرنا: سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، اُنھوں نے بتایا: ''اللہ کے نبی ﷺ نے تھوڑا ریشم لیا اور اپنے دائیں ہاتھ میں رکھا، تھوڑا سونا اٹھایا اور اسے اپنے بائیں ہاتھ میں رکھا، پھر فرمایا: «إِنَّ هٰذَيْنِ حَرَامٌ عَلٰى ذُكُورِ أُمَّتِي» ''یہ دونوں اشیا میری امت کے مردوں پر حرام ہیں۔'' اور ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ «حِلٌّ لِإِنَاثِهِمْ» ''یہ چیزیں امت کی عورتوں کے لیے حلال ہیں۔'' [2]

رسول اللہ ﷺ نے سونے اور ریشم کے بارے میں اپنے فرمان کے ساتھ ساتھ ان دونوں کی شکل وصورت کو بھی لوگوں کے سامنے واضح اور نمایاں کیا تاکہ بات بالکل واضح ہو جائے اور یاد رکھنے میں بھی مددگار ثابت ہو۔

عملی نمونہ پیش کرنا: حضرت سہل بن سعد ساعدی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، اُنھوں نے کہا: ''میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ آپ منبر پر کھڑے ہوئے، منہ قبلے کی طرف کیا اور

---

[1] الأنعام 153:6. مسند أحمد:435/1، و سنن الدارمي، حديث: 208، و مسند الطيالسي، حديث: 244، و صحيح ابن حبان، حديث: 7،6. [2] سنن أبي داود، حديث: 4057، والسنن الكبرٰى للنسائي: 160/8.

تکبیر کہی۔ لوگوں نے صفیں باندھ لیں۔ آپ ﷺ نے قراءت کی اور رکوع کیا۔ لوگوں نے بھی رکوع کیا۔ آپ ﷺ نے رکوع سے سر اٹھایا اور الٹے پاؤں زمین پر آ کر سجدہ کیا۔ سجدے کے بعد دوبارہ منبر پر تشریف لے گئے۔ قراءت کی۔ رکوع کیا۔ رکوع سے سر اٹھایا اور الٹے پاؤں زمین پر آ کر سجدہ کیا۔ آپ ﷺ جب نماز پڑھ چکے تو لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا:

«أَيُّهَا النَّاسُ! إِنَّمَا صَنَعْتُ هٰذَا لِتَأْتَمُّوا بِي وَ لِتَعَلَّمُوا صَلَاتِي»

''لوگو! میں نے یہ سب اِس لیے کیا کہ تم میری اقتدا کرو اور میری نماز اچھی طرح سیکھ لو۔''[1]

سخنِ نازک تر: سخنِ نازک تر کا استعمال دلوں کو ملاتا، اُنھیں حق کی طرف مائل کرتا اور سامعین کو اکساتا ہے کہ وہ بات یاد رکھیں۔ رسول اللہ ﷺ گفتگو کے آغاز میں تمہید کے طور پر نازک اور پاکیزہ وشستہ الفاظ استعمال میں لاتے تھے۔ بالخصوص جب کوئی ایسا معاملہ ہو جس کے ذکر سے حیا مانع ہو تو آپ ﷺ صاف، شگفتہ اور واضح الفاظ میں اُس کی تعلیم دیتے اور آغاز سے قبل تمہید کے طور پر کہتے کہ میں مومنین کے لیے والد کی طرح ہوں جو بچوں پر شفقت کرتے ہوئے اُنھیں تعلیم دیتا اور اُن کی غلطیوں کی اصلاح کرتا ہے۔[2]

چنانچہ ایک موقع پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: «إِنَّمَا أَنَا لَكُمْ بِمَنْزِلَةِ الْوَالِدِ أُعَلِّمُكُمْ، فَإِذَا أَتٰى أَحَدُكُمُ الْغَائِطَ فَلَا يَسْتَقْبِلِ الْقِبْلَةَ وَلَا يَسْتَدْبِرْهَا وَلَا يَسْتَطِبْ بِيَمِينِهِ» ''میں تو تمھارے لیے والد کے مقام پر ہوں۔ تمھیں تعلیم دیتا ہوں۔ تم میں سے کوئی قضائے حاجت کو آئے تو قبلہ رُو نہ بیٹھے، نہ قبلہ کی طرف پشت کرے اور نہ دائیں ہاتھ سے استنجا کرے۔''[3]

[1] صحيح البخاري، حديث: 917. [2] مناهج و آداب الصحابة للدكتور عبد الرحمٰن البر، ص: 74.
[3] سنن أبي داود، حديث: 8.

معلم اوّل ﷺ نے تعلیم و تربیت کے میدان میں تعلیمی اصول وقواعد کا پورا پورا خیال رکھا جو اخلاقی لحاظ سے بلند تر اور عقلی اعتبار سے جامع ترین مبادیات پر مشتمل تھے۔ رسول اللہ ﷺ کی ہدایات صحابۂ کرام کے دلوں میں گھر کر گئیں اور اُنھوں نے اُن معروضات کی روشنی میں اپنی زندگیوں کو خوب خوب سنوارا۔[1]

تعلیمی و تربیتی مبادیات

ذیل میں اُن عظیم الشان مبادیات کو قدرے تفصیل سے پیش کیا گیا ہے جنھیں رسول اللہ ﷺ بروئے کار لائے:

اچھائی کرنے والے کی حوصلہ افزائی: رسول اللہ ﷺ میدان علم وعمل میں صحابۂ کرام کی خوب حوصلہ افزائی فرماتے تھے۔ سیدنا ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے اُنھیں مخاطب کر کے فرمایا:

«لَوْ رَأَيْتَنِي وَ أَنَا أَسْتَمِعُ لِقِرَائَتِكَ الْبَارِحَةَ! لَقَدْ أُوتِيتَ مِزْمَارًا مِّنْ مَّزَامِيرِ آلِ دَاوُدَ»

''کاش! آپ دیکھتے جب رات میں آپ کی قراءت سُن رہا تھا۔ (سبحان اللہ!) آپ کو تو آلِ داود کے سُروں میں سے ایک سُر دیا گیا ہے۔''[2]

غلطی کرنے والے پر شفقت: رسول اللہ ﷺ لوگوں کے حال احوال کی خبر رکھتے اور اُن سے معاملہ کرنے میں اس امر کا لحاظ کرتے تھے۔ آپ ﷺ کی عادت تھی کہ (کم علمی یا) جہالت کی وجہ سے کسی سے غلطی سرزد ہو جاتی تو اس کا عذر قبول کرتے اور غلطی کا ازالہ کرتے وقت نرمی اور شفقت سے کام لیتے تھے۔ آپ ﷺ کے اسی طرزِ عمل کی بدولت

---

1 مناهج و آداب الصحابة في التعليم و التعلم للدكتور عبدالرحمٰن البر، ص: 85. 2 صحيح البخاري، حديث: 5048، و صحيح مسلم، حديث: 793.

لوگوں کے دل آپ ﷺ کی محبت سے معمور رہتے اور وہ آپ کی ہدایات پر جہاں خود عمل کرتے وہاں دوسروں تک بھی پہنچاتے تھے۔ حاضرین محفل بھی ایسے واقعات خصوصیت سے یاد رکھتے تھے۔[1]

حضرت معاویہ بن حکم سُلمی رضی اللہ عنہ کا بیان ہے: ''میں رسول اللہ ﷺ کی اقتدا میں نماز پڑھ رہا تھا، ایک آدمی کو چھینک آئی۔ میں نے يرحمك الله (اللہ تم پر رحم کرے) کہہ دیا۔لوگوں نے مجھے خشمگیں نگاہوں سے تاڑا۔ میں بولا: ''افسوس! میری ماں کا مجھے گم پانا تم لوگ میری طرف کیا دیکھتے ہو؟'' اب لوگ اپنے ہاتھ اپنی رانوں پر مارنے لگے۔ میں نے دیکھا کہ وہ مجھے خاموش ہونے کو کہہ رہے ہیں تو میں چپ ہوگیا۔ رسول اللہ ﷺ نماز پڑھ کر فارغ ہوئے۔ میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں! میں نے آپ سے قبل یا آپ کے بعد ایسا معلم نہیں دیکھا جو اتنے اچھے طریقے سے تعلیم دیتا ہو۔ واللہ! آپ ﷺ نے مجھے ڈانٹا نہ مارا اور نہ بُرا بھلا کہا۔ بس اتنا فرمایا:

«إِنَّ هٰذِهِ الصَّلَاةَ لَا يَصْلُحُ فِيهَا شَيْءٌ مِّنْ كَلَامِ النَّاسِ، إِنَّمَا هُوَ التَّسْبِيحُ وَالتَّكْبِيرُ وَ قِرَاءَةُ الْقُرْآنِ»

''نماز میں باتیں کرنا مناسب نہیں۔ یہ تو تسبیح و تکبیر اور تلاوتِ قرآن کا محل ہے۔''[2]

سبحان اللہ! رسول اللہ ﷺ کے حُسنِ تعلیم کے کیا ہی کہنے! معاویہ بن حکم رضی اللہ عنہ نے اس عمدہ برتاؤ کا جو مسرت انگیز تاثر لیا وہ آخر کیوں نہ لیا جاتا؟!

مذمت کے لیے نام لیے بغیر اشارے پر اکتفا: مذمت کا یہ انداز اپنانے سے بیچارے غلطی کرنے والے کے چہرے کی کچھ نہ کچھ آب باقی رہتی ہے اور انتباہ کا تقاضا بھی پورا ہوجاتا ہے۔ اس ضمن میں بہترین مثال حضرت عبداللہ بن لُتْبِيَّه رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے

---

[1] مناهج و آداب الصحابة للدكتور عبد الرحمٰن البر، ص: 86. [2] صحيح مسلم، حديث: 537، و سنن أبي داود، حديث: 930، 931، و مسند أحمد: 447/5.

اُنھیں صدقات و زکاۃ کا عامل بنایا تو اُنھوں نے اہل زکاۃ کی طرف سے تحفے تحائف قبول کر لیے تھے، چنانچہ سیدنا ابو حُمید ساعدی رضی اللہ عنہ نے بیان کیا: ''رسول اللہ ﷺ نے بنو سلیم کی زکاۃ پر ایک آدمی کو عامل بنایا جسے ابن لُتْبِیَّہ کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ وہ زکاۃ کی وصولی کر کے واپس آیا تو رسول اللہ ﷺ نے اُس سے حساب مانگا۔ وہ بولا: ''یہ رہا آپ کا مال اور یہ تحائف ہیں۔'' رسول اللہ ﷺ نے خفا ہو کر فرمایا:

«فَهَلَّا جَلَسْتَ فِي بَيْتِ أَبِيكَ وَ أُمِّكَ حَتّٰى تَأْتِيَكَ هَدِيَّتُكَ إِنْ كُنْتَ صَادِقًا؟»

''تم واقعی ان تحفوں کے حق دار تھے تو اپنے ماں باپ کے گھر کیوں نہ بیٹھ رہے کہ یہ تحفے تمھیں وہاں پہنچ جاتے؟''

پھر رسول اللہ ﷺ نے ہم سے خطاب کیا اور حمد و ثنا کے بعد فرمایا:

«أَمَّا بَعْدُ! فَإِنِّي أَسْتَعْمِلُ الرَّجُلَ مِنْكُمْ عَلَى الْعَمَلِ مِمَّا وَلَّانِيَ اللّٰهُ فَيَأْتِي فَيَقُولُ: هٰذَا مَالُكُمْ وَ هٰذَا هَدِيَّةٌ أُهْدِيَتْ لِي، أَفَلَا جَلَسَ فِي بَيْتِ أَبِيهِ وَ أُمِّهِ حَتّٰى تَأْتِيَهُ هَدِيَّتُهُ؟ وَاللّٰهِ! لَا يَأْخُذُ أَحَدٌ مِّنْكُمْ شَيْئًا بِغَيْرِ حَقِّهِ إِلَّا لَقِيَ اللّٰهَ يَحْمِلُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، فَلَأَعْرِفَنَّ أَحَدًا مِّنْكُمْ لَقِيَ اللّٰهَ يَحْمِلُ بَعِيرًا لَّهُ رُغَاءٌ، أَوْ بَقَرَةً لَّهَا خُوَارٌ، أَوْ شَاةً تَيْعَرُ»

''امابعد۔ اللہ نے مجھے جن امور کا ذمہ دار بنایا ہے اُن میں سے کوئی کام میں ایک آدمی کے سپرد کرتا ہوں۔ وہ کام نمٹا کر آتا اور کہتا ہے: ''یہ رہا آپ کا مال اور یہ تحائف ہیں جو مجھے پیش کیے گئے ہیں۔'' وہ اپنے ماں باپ کے گھر کیوں نہ بیٹھ رہا کہ یہ تحفے اُسے وہاں پہنچتے؟ واللہ! تم میں سے جو کوئی ایک چیز ناحق قبول کرے گا، وہ روز قیامت اُس شے کا بوجھ کندھوں پر اٹھائے اللہ کے روبرو آئے

گا۔ میں اُس شخص کو ضرور پہچان لوں گا جو ایک بلبلاتا اونٹ یا ڈکراتی گائے یا منمناتی بکری کندھوں پر اٹھائے اللہ کے دربار میں آئے گا۔'' یہ کہہ کر آپ ﷺ نے دونوں ہاتھ اس قدر بلند کیے کہ بغلوں کی سفیدی دکھائی دی۔ آپ ﷺ نے پکارا: «اَللّٰهُمَّ! هَلْ بَلَّغْتُ؟» ''اے اللہ! کیا میں نے (تیرا پیغام) پہنچا دیا؟'' (راوی کہتا ہے:) میری آنکھ نے دیکھا اور میرے کان نے سُنا۔''[1]

ضرورت پڑنے پر اظہار ناراضی: مثال کے طور پر صاحبِ حیثیت افراد ایسی غلطی کا ارتکاب کریں جس سے شریعت کے احکامات پر زد پڑتی ہو یا غلطی کا دائرۂ اثر وسیع ہو جائے اور وہ فتنے کی صورت اختیار کرنے لگے۔ ایسی صورتحال میں رسول اللہ ﷺ خفگی کا اظہار کیا کرتے تھے لیکن اس طرح کہ کسی فرد یا جماعت کے حق میں اسراف یا زیادتی کا عنصر شاملِ توبیخ نہ ہونے پائے۔ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے ہاں آئے۔ اُن کے ہاتھ میں تورات کی ایک تحریر تھی۔ آتے ہی کہنے لگے: ''اے اللہ کے رسول! یہ ایک تحریر ہے جو تورات سے ماخوذ ہے۔'' رسول اللہ ﷺ خاموش رہے اور کوئی جواب نہ دیا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ وہ تحریر پڑھنے لگے۔ رسول اللہ ﷺ کے چہرۂ انور کے تاثرات بدلنے لگے۔ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو ٹوکا: ''تجھے تیری ماں گم پائے! رسول اللہ ﷺ کا چہرہ نہیں دیکھتا؟'' عمر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کے چہرۂ مبارک کی طرف دیکھا تو عرض کیا: ''میں اللہ اور اُس کے رسول کی ناراضی سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں۔ ہم اللہ کے رب ہونے، اسلام کے دین ہونے اور محمد ﷺ کے نبی ہونے پر راضی ہیں۔'' اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«وَالَّذِي نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهِ! لَوْ بَدَا لَكُمْ مُّوسٰى فَاتَّبَعْتُمُوهُ وَتَرَكْتُمُونِي لَضَلَلْتُمْ عَنْ سَوَاءِ السَّبِيلِ، وَ لَوْ كَانَ حَيًّا وَّ أَدْرَكَ

[1] صحيح البخاري، حديث:6979، و صحيح مسلم، حديث:(27)-1832.

نُبُوَّتِي لَاتَّبَعَنِي»

''اُس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے! اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام تمھارے سامنے آجائیں اور تم مجھے چھوڑ کر اُن کے پیچھے چل پڑو تو تم یقیناً سیدھے راستے سے بھٹک جاؤ گے۔ اور اگر وہ زندہ ہوتے اور میری نبوت کا زمانہ پا لیتے تو میری ہی پیروی کرتے۔''[1]

رسول اللہ ﷺ سے بعض ائمہ مساجد کے متعلق شکایت کی گئی کہ وہ لمبی لمبی نمازیں پڑھاتے ہیں اور نمازی نماز چھوڑ کر بھاگ جاتے ہیں۔ آپ ﷺ کو اس بات کا سخت صدمہ ہوا۔

ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے کہ ایک آدمی نے بارگاہِ رسالت میں آ کر شکایت کی: ''اے اللہ کے رسول! فلاں صاحب بہت لمبی نمازیں پڑھاتے ہیں۔ میرے لیے نماز باجماعت پڑھنا بہت مشکل ہو گیا ہے۔''

ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو نصیحت کے وقت اس دن سے زیادہ غصے میں نہیں دیکھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

«أَيُّهَا النَّاسُ، إِنَّكُمْ مُنَفِّرُونَ، فَمَنْ صَلَّى بِالنَّاسِ فَلْيُخَفِّفْ، فَإِنَّ فِيهِمُ الْمَرِيضَ وَالضَّعِيفَ وَ ذَا الْحَاجَةِ»

''اے لوگو! تم متنفر کرتے ہو۔ جو شخص لوگوں کو نماز پڑھائے وہ ہلکی نماز پڑھائے کیونکہ نمازیوں میں بیمار، کمزور اور حاجت مند افراد بھی ہوتے ہیں۔''[2]

تقدیر کے متعلق صحابۂ کرام کی بحث و تکرار پر بھی رسول اللہ ﷺ ناراض ہوئے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما نے بتایا کہ رسول اللہ ﷺ صحابۂ کرام کی محفل میں

---

[1] سنن الدارمي: 126/1، وكنز العمال: 201/1. [2] صحيح البخاري، حديث: 90، و صحيح مسلم، حديث: 466.

تشریف لائے۔ وہاں تقدیر کے موضوع پر گرما گرم بحث ہو رہی تھی۔ آپ ﷺ کا چہرہ غصے سے یوں سرخ ہوگیا گویا اُس پر انار نچوڑا گیا ہو۔ دریافت فرمایا:

«بِهٰذَا أُمِرْتُمْ أَوْ لِهٰذَا خُلِقْتُمْ؟ تَضْرِبُونَ الْقُرْآنَ بَعْضَهُ بِبَعْضٍ، بِهٰذَا هَلَكَتِ الْأُمَمُ قَبْلَكُمْ»

''کیا تمھیں اس بات کا حکم دیا گیا ہے، کیا تمھیں اسی لیے پیدا کیا گیا ہے کہ تم قرآن کے بعض حصے کو بعض سے ٹکراتے ہو؟ تم سے پہلے والی امتیں اسی وجہ سے ہلاک ہوئی تھیں۔''[1]

رسول اللہ ﷺ نے اُس وقت بھی غصے کا اظہار فرمایا تھا جب بعض صحابۂ کرام نے نبی ﷺ کی حکم عدولی کرتے ہوئے اپنے آپ کو مشقت میں ڈالنے کی ٹھانی تھی اور گمان کیا تھا کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں افضل ہے اور اللہ کے نزدیک زیادہ مقرب ہے۔

ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے: ''رسول اللہ ﷺ لوگوں کو صرف اُن اعمال کا حکم دیتے تھے جنھیں وہ آسانی سے انجام دے سکیں۔ لوگوں نے کہا: ''اے اللہ کے رسول! ہمارے احوال تو آپ کے سے نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تو آپ کے اگلے پچھلے تمام گناہ معاف کردیے ہیں۔'' لوگوں کی یہ بات سن کر رسول اللہ ﷺ کو غصہ آیا۔ ناراضی کے آثار آپ کے چہرہ مبارک پر ظاہر ہوئے اور فرمایا: «إِنَّ أَتْقَاكُمْ وَ أَعْلَمَكُمْ بِاللّٰهِ أَنَا»

''تم سب سے زیادہ اللہ کو جاننے اور اُس سے ڈرنے والا میں ہی ہوں۔''[2]

ان مواقع پر رسول اللہ ﷺ کی ناراضی تربیتی عمل کا حصہ تھی۔ ناراضی کے اِس عمل میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے گویا یہ پیغام تھا کہ وہ آنکھیں کھلی رکھیں اور آئندہ ایسی غلطیوں کا ارتکاب نہ کریں۔ واعظ کے لیے ضروری ہے کہ غصہ اس کے چہرے سے عیاں ہو۔ وہ جس جگہ کھڑا ہے اُس کا تقاضا ہے کہ وہ بے چینی و بے قراری کا اظہار کرے۔ اُس

1 سنن ابن ماجه، حديث: 85. 2 صحيح البخاري، حديث: 20.

کی حیثیت قافلے کے پیش رو کی ہے جو اہل قافلہ کو راستے کی ممکنہ دشواریوں سے پیشگی آگاہ کرتا رہتا ہے۔ معلم کے لیے بھی یہی ہدایت ہے کہ طلبہ کے منفی اقدامات پر اُسے اظہار ناراضی کرنا چاہیے۔ غصے کی حالت میں کی گئی نصیحت کبھی کبھار بڑی موثر ثابت ہوتی ہے۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ معلم اپنے ہر طالب علم سے یہی سلوک روا رکھے۔ اُسے طلبہ کے مختلف مزاج کے موافق مختلف برتاؤ کا انتخاب کرنا چاہیے۔[1]

خاص مطالب کی تعلیم کے لیے تازہ ترین صورتحال کو بنیاد بنانا: کوئی خاص واقعہ پیش آتا یا آنکھیں کسی خاص عمل کو دیکھتیں تو نبی ﷺ صحابۂ کرام کو اُس واقعے یا عمل کی نسبت سے کوئی خاص مطلب سمجھانے کی کوشش کرتے تھے۔ اس طریقِ کار کا فائدہ یہ ہوتا کہ مطلب بہت اچھی طرح سمجھ میں آجاتا تھا۔ مثال کے طور پر عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے بیان کیا: ''چند جنگی قیدی نبی ﷺ کی خدمت میں لائے گئے۔ اُن میں سے ایک عورت اپنے گم شدہ بیٹے کو تلاش کر رہی تھی۔ اس کی چھاتی دودھ سے بھری ہوئی تھی۔ وہ اِدھر اُدھر بے چین پھرتی تھی۔ قیدیوں میں جو بچہ نظر آتا اُسے سینے سے لگا کر دودھ پلانے لگتی۔ رسول اللہ ﷺ نے صحابۂ کرام کو مخاطب کر کے دریافت کیا: «أَتُرَوْنَ هٰذِهِ طَارِحَةً وَّلَدَهَا فِي النَّارِ؟»

''کیا خیال ہے یہ عورت اپنے بچے کو آگ میں پھینک سکتی ہے؟''

ہم نے جواب دیا: ''نہیں، اگر اس کے بس میں ہو تو وہ کبھی بچے کو آگ میں نہیں پھینکے گی۔''

آپ ﷺ نے فرمایا: «لَلّٰهُ أَرْحَمُ بِعِبَادِهِ مِنْ هٰذِهِ بِوَلَدِهَا» ''جس قدر یہ عورت اپنے بچے کے لیے رحمدل ہے، اللہ اُس سے کہیں بڑھ کر اپنے بندوں پر رحم فرمانے والا ہے۔''[2]

یوں رسول اللہ ﷺ نے پیش آمدہ صورتحال کو بنیاد بنا کر صحابۂ کرام کو رحمتِ الٰہی کی

[1] فتح الباري: 187/1. [2] صحيح البخاري، حديث: 5999، و صحيح مسلم، حديث: 2754.

وسعت کا ایک گونہ تصور دے دیا۔ [1]

سماعتِ حدیث کے سلسلے میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا طرزِ عمل

مکمل خاموشی اور حُسنِ سماعت: صحابۂ کرام کی نظر میں رسول اللہ ﷺ کی قدر و منزلت اتنی تھی کہ وہ آپ ﷺ کی گفتگو کے دوران میں شور شرابا یا فضول گوئی کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ آپ بات کر رہے ہوں اور وہ دھیان نہ دیں۔ صحابۂ کرام آپ کی محفل میں پورے ہوش و حواس کے ساتھ گوش بر آواز ہو کر بیٹھا کرتے تھے۔سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے سیرت طیبہ کے اس پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے بیان کیا کہ آپ ﷺ جب بات کرتے تو ہم نشیں یوں سر جھکائے خاموش رہتے گویا سروں پر پرندے بیٹھے ہیں۔ آپ ﷺ خاموش ہوتے تب وہ بولتے۔'' [2]

عبدالفتاح ابو غدہ نے اس روایت کے ذیل میں لکھا: ''اس محاورے کی حقیقت یہ ہے کہ کوا اونٹ کے سر پہ آ کے بیٹھتا اور اس کی جوئیں اور چیچڑیاں چن لیتا ہے۔ اس دوران میں اونٹ حرکت نہیں کرتا کہ مبادا کوا مارے ڈر کے اُڑ جائے اور چیچڑیاں وہیں کی وہیں رہ جائیں اور اذیت کا باعث بنیں۔ اسی سے یہ محاورہ نکلا کہ فلاں تو یوں سر جھکائے خاموش ہے گویا سر پہ پرندے بیٹھے ہیں۔'' [3]

قطع کلامی سے گریز: آدابِ محفل کا تقاضا ہے کہ قطع کلامی سے گریز کیا جائے۔ اس سے ایک تو حاضرینِ محفل پُر سکون رہتے ہیں اور دوسرا بات کا مطلب سمجھنے میں سہولت رہتی ہے۔

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے: ''صحابۂ کرام محفل رسول میں قطع کلامی سے گریز کرتے۔ سب لوگ متکلم کی بات آخر تک نہایت توجہ اور خاموشی سے سنتے۔ بات اُسی کی ہوتی جو پہلے بات شروع کرتا۔'' [4]

---

[1] الرسول المعلّم ﷺ لعبد الفتاح أبي غدة، ص: 160. [2] الشمائل للترمذي، حديث: 351.

[3] الرسول المعلم ﷺ لعبد الفتاح أبي غدة، ص: 30. [4] الشمائل للترمذي، حديث: 351.

رفع اشکال کے لیے رسول اللہ ﷺ سے رجوع: صحابۂ کرام کو رسول اللہ ﷺ کی عظمت کا شدت سے احساس تھا۔ اُن کے قلوب پر آپ کی بارعب شخصیت کا پُروقار اور گہرا اثر تھا۔ اس کے باوجود انھیں دین کے معاملے میں کوئی اشکال پیش آتا تو فوراً آپ ﷺ سے رجوع کرتے اور تشفی پاتے تھے۔ ام المومنین حفصہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ ایک دفعہ نبی ﷺ نے فرمایا:

«إِنِّي لَأَرْجُو أَنْ لَّا يَدْخُلَ النَّارَ أَحَدٌ إِنْ شَاءَ اللّٰهُ، مِمَّنْ شَهِدَ بَدْرًا وَّ الْحُدَيْبِيَةَ»

''مجھے قوی امید ہے کہ بدر اور حدیبیہ کے شرکاء میں سے کوئی بھی آگ میں نہیں جائے گا۔''

میں نے اشکال ظاہر کیا: ''اے اللہ کے رسول! کیا اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا:

﴿وَإِنْ مِّنْكُمْ إِلَّا وَارِدُهَا ۚ كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا﴾

''اور تم میں سے جو بھی ہے وہ اس (جہنم) پر وارد ہونے والا ہے، یہ آپ کے رب کے ذمے حتمی (اور) طے شدہ بات ہے۔''[1]

آپ ﷺ نے جواب دیا: «أَلَمْ تَسْمَعِيهِ يَقُولُ: ﴿ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِينَ اتَّقَوْا وَّنَذَرُ الظّٰلِمِينَ فِيهَا جِثِيًّا﴾» ''تم نے یہ آیت نہیں سنی، فرمایا: ''پھر ہم متقی لوگوں کو نجات دیں گے اور ہم ظالموں کو اس میں گھٹنوں کے بل گرے ہوئے چھوڑ دیں گے۔''[2]

حضرت عبداللہ بن اُنیس رضی اللہ عنہ کی روایت بھی اس ضمن میں بطور مثال پیش کی جاسکتی ہے جسے حاصل کرنے کے لیے سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما نے لمبا سفر اختیار کیا تھا۔

ابن اُنیس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ''میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: «يَحْشُرُ اللّٰهُ الْعِبَادَ۔ أَوْ قَالَ: النَّاسَ۔ عُرَاةً غُرْلًا بُهْمًا» ''اللہ تعالیٰ لوگوں کو میدان حشر میں

[1] مریم 71:19. [2] مریم 72:19. سنن ابن ماجه، حديث: 4281، و مسند أحمد: 285/6 .

اکٹھا کرے گا۔ وہ عریاں، بے ختنہ اور خالی ہاتھ ہوں گے۔''

ہم نے کہا: ''«بُهْمًا» سے کیا مراد ہے؟'' فرمایا: «لَيْسَ مَعَهُمْ شَيْءٌ، ثُمَّ يُنَادِيهِمْ بِصَوْتٍ يَسْمَعُهُ مَنْ بَعُدَ كَمَا يَسْمَعُهُ مَنْ قَرُبَ: أَنَا الْمَلِكُ، أَنَا الدَّيَّانُ، لَا يَنْبَغِي لِأَحَدٍ مِّنْ أَهْلِ الْجَنَّةِ أَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ، وَ لَا يَنْبَغِي لِأَحَدٍ مِّنْ أَهْلِ النَّارِ أَنْ يَّدْخُلَ النَّارَ وَ عِنْدَهُ مَظْلِمَةٌ، حَتّٰى أَقُصَّهُ مِنْهُ حَتَّى اللَّطْمَةُ» ''ان کے پاس کوئی چیز نہیں ہوگی۔ پھر اللہ تعالیٰ ان سے ایسی آواز سے مخاطب ہوگا جسے دور کھڑے لوگ بھی اُسی وضاحت سے سنیں گے جس طرح قریب کھڑے لوگوں کو وہ آواز صاف طور پر سنائی دے گی، چنانچہ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: ''میں ہوں بادشاہ۔ بدلے چکانے والا زبردست حاکم۔ اہل جنت و اہل دوزخ کا کوئی فرد جس نے ظلم کیا ہو، خواہ ایک طمانچہ ہی مارا ہو، جنت و دوزخ میں نہیں جا سکتا، قبل اس سے کہ میں اُس سے قصاص دلوا دوں۔''

ہم نے پوچھا: ''ایسا کیسے ہوگا (قصاص میں کیا دیں گے) جبکہ ہم عریاں، بے ختنہ اور خالی ہاتھ اللہ کی خدمت میں حاضر ہوں گے؟''

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «بِالْحَسَنَاتِ وَالسَّيِّئَاتِ» ''نیکیوں اور گناہوں کے ذریعے سے (بدلے چکائے جائیں گے)۔'' پھر رسول اللہ ﷺ نے یہ آیت تلاوت کی:

﴿اَلْيَوْمَ تُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ ۗ لَا ظُلْمَ الْيَوْمَ ۗ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝﴾

''آج ہر نفس کو اس کا بدلہ دیا جائے گا جو اس نے کمایا۔ آج کوئی ظلم نہیں ہوگا، بلاشبہ اللہ جلد حساب لینے والا ہے۔''[1]

احادیث کی دہرائی: صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نبی ﷺ سے کوئی بات (حدیث) سنتے یا علم حاصل

[1] المؤمن 40:17. الأدب المفرد للبخاري: 970، و مسند أحمد: 495/3، والمستدرك للحاكم: 438,437/2، و مجمع الزوائد: 133/1.

کرتے تو بیٹھ کر اُسے آپس میں دہراتے تھے تا کہ وہ اچھی طرح ذہن میں اتر جائے۔ سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ہوتے اور آپ سے حدیث سنتے، پھر جب خدمت نبوی سے واپس آتے تو حدیث کو آپس میں دہراتے تھے تا کہ خوب یاد ہو جائے۔''[1]

صحابۂ کرام کے حلقوں میں علم کی دہرائی اور مذاکرے کا اصول وفات نبوی کے بعد بھی جاری رہا۔ ابونضرہ منذر بن مالک بن قطعہ رحمہ اللہ بتاتے ہیں کہ اصحابِ رسول کسی جگہ اکٹھے ہوتے تو علم کی باتیں ایک دوسرے کو سناتے اور قرآن کی سورتیں پڑھتے تھے۔[2]

حصولِ علم اور اشتیاقِ عمل کی غرض سے سوال کرنا: صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے سوال حصول علم اور شوق عمل کی غرض سے ہوتے تھے۔ اُن میں فضولیت کا شائبہ تک نہیں ہوتا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بے مقصد اور فضول سوالات کو ناپسند کرتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کثرتِ سوال سے بھی منع کیا تھا، چنانچہ سہل بن سعد رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سوال کرنے کو ناپسند کیا اور اُس امر پر نکتہ چینی بھی کی۔''[3]

امام نووی رحمہ اللہ نے لکھا: ''سیدنا سہل بن سعد رضی اللہ عنہ کی روایت سے مراد یہ ہے کہ ایسے سوال کرنا مکروہ (ناپسندیدہ) ہیں جو غیر ضروری ہوں۔ خاص کر وہ سوالات جن کا مقصد ایک مسلمان کی پردہ دری اور بے عزتی یا فحاشی کا فروغ ہوتا ہے۔ علمائے کرام کا کہنا ہے: ''البتہ اگر سوال ایسے شرعی مسئلے کے متعلق ہے جو واقعی پیش آیا ہے اور اُس کا حل معلوم کرنا بھی ضروری ہے تو اہل علم سے دریافت کر لینے میں کوئی حرج نہیں۔''[4]

بال کی کھال اتارنے اور متشابہ آیات کے متعلق سوال سے اجتناب: صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم

---

[1] الجامع لأخلاق الراوي وآداب السامع للخطيب البغدادي: 364,363/1. اس کی سند میں یزید رقاشی نامی ایک راوی ضعیف ہے۔ [2] الجامع لأخلاق الراوي وآداب السامع للخطيب البغدادي: 86/2، وأدب الإملاء والاستملاء للسمعاني، ص: 48. [3] صحيح البخاري، حديث: 5259، وصحيح مسلم، حديث: 1492. [4] شرح النووي على صحيح مسلم: 741/3، طبعة الشعب.

نے یہ اصول یوں اپنایا کہ نبی ﷺ نے ایسے لوگوں کی شدید مذمت کی تھی جو بال کی کھال اتارتے اور غیر ضروری مسائل کو تختۂ مشق بنائے رکھتے ہیں۔ آپ ﷺ نے ایسے لوگوں کی صحبت اختیار کرنے سے بھی منع فرمایا تھا۔ ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا بتاتی ہیں کہ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ نے یہ آیت پڑھی:

﴿هُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلَیْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰیٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ؕ فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ فَیَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِیْلِهٖ ؕ وَمَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ ؕ وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ یَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ وَمَا یَذَّكَّرُ اِلَّاۤ اُولُوا الْاَلْبَابِ۝﴾

”وہی ہے جس نے آپ پر کتاب نازل کی جس میں کچھ آیات محکم (واضح) ہیں جو اس کتاب کی اصل بنیاد ہیں اور کچھ دوسری متشابہات (غیر واضح) ہیں، پھر جن لوگوں کے دل میں ٹیڑھ ہے وہ ان میں سے انھی آیتوں کے پیچھے پڑے رہتے ہیں جو متشابہ (غیر واضح) ہیں، ان کا مقصد محض فتنے اور تاویل کی تلاش ہوتا ہے، حالانکہ اللہ کے سوا کوئی بھی ان کی تاویل نہیں جانتا اور جو لوگ علم میں پختہ ہیں وہ کہتے ہیں: ہمارا ان (متشابہات) پر ایمان ہے، یہ سب ہمارے رب ہی کی طرف سے ہیں اور نصیحت تو عقل مند ہی حاصل کرتے ہیں۔“ [1]

پھر آپ ﷺ نے فرمایا: «فَإِذَا رَأَیْتِ الَّذِینَ یَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ، فَأُولٰئِكَ الَّذِینَ سَمَّى اللّٰهُ فَاحْذَرُوهُمْ!» ”چنانچہ جب تو ایسے لوگوں کو دیکھے جو متشابہ آیات کا پیچھا کرتے ہیں تو (سمجھ لے کہ) یہی لوگ ہیں جن کو اللہ نے مراد لیا ہے۔ سو اُن سے دامن بچالے۔“ [2]

1 آل عمرٰن 3:7. 2 صحیح البخاري، حدیث: 4547، و صحیح مسلم، حدیث: 2665.

جہاں شارع نے خاموشی اختیار کی وہاں سوال سے احتراز: صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے ادب کے اس قرینے کو بھی بخوبی اپنایا تھا۔ شارع نے جہاں خاموشی اختیار کی وہاں سے یہ پاکباز و مطیع افراد بھی سر جھکائے خاموشی سے گزر گئے اور چون و چرا سے پرہیز کیا کہ مبادا اُن کے سوال سے جو چیز حرام نہیں اُسے حرام قرار دے دیا جائے اور جو کام واجب نہیں وہ واجب ٹھہرے۔ یوں اُن کا سوال مسلمانوں کے لیے پریشانی اور مشقت کا باعث بنے۔

صحابۂ کرام اللہ تعالیٰ کے درج ذیل ارشاد پر پوری طرح کار بند تھے:

﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْـَٔلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ وَاِنْ تَسْـَٔلُوْا عَنْهَا حِيْنَ يُنَزَّلُ الْقُرْاٰنُ تُبْدَ لَكُمْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهَا ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ○ قَدْ سَاَلَهَا قَوْمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ثُمَّ اَصْبَحُوْا بِهَا كٰفِرِيْنَ○﴾

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! ایسی باتوں کے بارے میں سوال نہ کرو کہ اگر وہ تم پر ظاہر کردی جائیں تو تمھیں بری لگیں اور اگر تم ان کے متعلق سوال کرو گے جبکہ قرآن نازل کیا جارہا ہو تو وہ تم پر ظاہر کردی جائیں گی، اللہ نے (تمھاری) اس حرکت کو معاف کردیا ہے اور اللہ بہت بخشنے والا، بہت حوصلے والا ہے۔ ان کے بارے میں تم سے پہلے بھی ایک قوم نے سوال کیا تھا، پھر ان (باتوں) کی وجہ سے وہ کافر ہوگئے۔''[1]

رسول اللہ ﷺ نے بھی ایسے سوال و جواب سے منع کیا تھا۔ سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«إِنَّ أَعْظَمَ الْمُسْلِمِينَ جُرْمًا مَّنْ سَأَلَ عَنْ شَيْءٍ لَّمْ يُحَرَّمْ فَحُرِّمَ مِنْ أَجْلِ مَسْأَلَتِهِ»

''مسلمانوں میں سب سے بڑا مجرم وہ ہے جس نے ایسی شے کے متعلق سوال کیا

[1] المآئدة 5:101، 102۔

جو حرام نہیں تھی اور اُس کے سوال کی وجہ سے حرام قرار دے دی گئی۔“ [1]

فرصت کے لمحات سے استفادہ اور مناسب وقت کا لحاظ: صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سوالات کے لیے مناسب وقت کا لحاظ رکھتے تھے۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرصت کے لمحات سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ یہ اہتمام اس لیے کرتے تھے کہ بے وقت کے سوالات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پریشانی اور دقت کا باعث نہ بنیں۔

سیدنا ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے بیان کیا: ”نبی صلی اللہ علیہ وسلم فجر کی نماز پڑھا کر فارغ ہوتے تو ہم جا کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھ جاتے۔ کوئی قرآن کے متعلق سوال پوچھتا تو کوئی فرائض (علم میراث) کے بارے میں استفسار کرتا اور کوئی خواب کی تعبیر دریافت کرتا تھا۔“ [2]

باصرار سوال کرنے سے پہلو تہی: صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو سوال کرنے سے منع کر دیا گیا تو اُنھوں نے اس امر کا اہتمام خاص طور پر کیا کہ باصرار سوال کرنے سے پہلو تہی کی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ سوال کرنے کے لیے اعرابیوں (بادیہ نشینوں) کو آگے کرتے اور اُن کے عقل مند اور باشعور افراد کی آمد کا انتظار کرتے رہتے تاکہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کریں اور صحابۂ کرام آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جوابات سے استفادہ کریں۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: ”ہمیں منع کر دیا گیا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی سوال نہ کریں۔ ہمیں بہت اچھا لگتا تھا کہ اہل بادیہ (صحرانشینوں) کا کوئی عقل مند آدمی آئے اور ہماری موجودگی میں آپ سے سوال کرے، چنانچہ ایک روز ایک بادیہ نشیں آیا اور اُس نے سوال کیا: ”اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)! تمھارا قاصد ہمارے ہاں آیا اور اُس نے بتایا کہ تمھارا دعویٰ ہے کہ اللہ نے تمھیں رسول بنا کر بھیجا ہے؟“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «صَدَقَ» ”اُس نے سچ کہا۔“ [3]

[1] صحيح البخاري، حديث: 7289، و صحيح مسلم، حديث: 2358. [2] مجمع الزوائد: 159/1. [3] صحيح مسلم، حديث: 12، و جامع الترمذي، حديث: 619، و مسند أحمد: 143/3 و 193، و السنن الكبرٰى للنسائي: 122,121/4.

یوں نئے مسلم معاشرے میں موثر عملی اقدامات کے ذریعے سے تربیتی تعمیر و ترقی کا عمل جاری رہا جس نے اس جدید معاشرے کے افراد میں فریضہ تعلیم و تعلم کی انجام دہی اور اُس کے گہرے احساس کی روح پھونک دی تھی۔ ان ہدایات پر عمل درآمد نے مسلم فرد، امّت اور اسلامی ریاست کی تیاری و تشکیل میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ اس مختصر جائزے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مسلم امہ میں علمی و تربیتی تعمیر و ترقی کا تسلسل نہایت ضروری ہے۔

باب 5

اصلاحات اور قانون سازی

اقتصادی بُحران کا حل

مسلمانوں کی ہجرت مدینہ کے نتیجے میں نو آموز اسلامی ریاست کی اقتصادی و معاشی ذمے داریوں میں اضافہ ہوا تھا۔ مسلمانوں کی اعلیٰ قیادت نے مختلف طریقوں سے اس بُحران کا حل نکالا۔ مہاجرین و انصار کے درمیان بھائی چارے (مواخات) کا قیام اور مسجدِ نبوی کے ایک گوشے میں فقراء مہاجرین کی رہائش کے لیے صفہ کی تعمیر انھی اقدامات کے سلسلے میں ہوئی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے مدینہ کے معاشی حالات کا بنظر غائر جائزہ لیا تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آئی کہ شہر کی معاشی باگ ڈور یہود کے ہاتھ میں ہے اور بازارِ مدینہ کی تجارت اور اُس کے مال و متاع پر بھی وہی قابض ہیں۔ اور وہ جب جی میں آئے قیمتیں گھٹاتے بڑھاتے رہتے ہیں، مزید برآں ذخیرہ اندوزی کرتے اور لوگوں کی ضروریات سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ صورتحال سنگین تھی۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ مسلمانانِ مدینہ الگ سے اپنا بازار قائم کریں، یہود کے بالمقابل خم ٹھونک کر میدانِ معیشت میں اتر آئیں اور تجارت کے سرچشموں سے اپنا قرار واقعی حصہ پائیں۔ یوں نمونے کا ایک ایسا بازار معرض وجود میں آئے جس میں اسلام کے معاشی اصول پوری طرح کارفرما ہوں اور وہ بازار اپنی اعلیٰ تجارتی اقدار کی بدولت عام معیشت میں نمایاں مقام حاصل کرے۔ بنا بریں رسول اللہ ﷺ نے مسجد نبوی کی مغربی جانب بازار کے لیے

جگہ کا انتخاب کیا اور اپنے پاؤں سے خط کھینچ کر اُس کی حدود کی نشاندہی کی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: «هٰذَا سُوقُكُمْ، فَلَا يُنْتَقَصَنَّ وَ لَا يُضْرَبَنَّ عَلَيْهِ خَرَاجٌ»

''یہ آپ لوگوں کا بازار ہے۔ اب (ناپ تول میں کمی کر کے) اس کا دائرہ کار محدود نہ کیا جائے اور نہ اس پر کوئی ٹیکس لگایا جائے۔''[1]

عہد نبوی میں اس بازار نے بہت ترقی کی۔ رسول اللہ ﷺ نے اسے اپنی خصوصی توجہ کا مرکز ٹھہرایا۔ آپ تواتر سے بازار کا دورہ کرتے اور اشیائے خور و نوش کا جائزہ لیتے تھے۔ مدینہ کے اس منفرد بازار میں اسلام کی لازوال معاشی اصلاحات عمل میں لائی گئیں اور دور جاہلیت کے طریق ہائے تجارت کو جو غبن، دھوکا دہی اور فریب کاری پر مبنی تھے، اس بازار میں ان سب طریقوں پر پابندی تھی۔ بازار مدینہ نے آزاد تجارت کو فروغ دیا اور عوام کے تمام طبقوں کو خرید و فروخت کے یکساں مواقع فراہم کیے۔[2]

تجارت کے اسلامی احکام و آداب

رسول اللہ ﷺ نے بازاروں میں تجارت اور خرید و فروخت کے متعلق جو آداب و اصول مقرر کیے، اُن کی تفصیل ذیل میں پیش کی جاتی ہے:

❁ جو شخص بازار جائے اُسے چاہیے کہ اللہ کا ذکر کرے اور اُس کے حضور حمد و ثنا کا نذرانہ پیش کرے۔ روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«مَنْ دَخَلَ السُّوقَ فَقَالَ: لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، وَحْدَهٗ، لَا شَرِيكَ لَهٗ، لَهُ الْمُلْكُ، وَلَهُ الْحَمْدُ، يُحْيِي وَيُمِيتُ، وَهُوَ حَيٌّ لَّا يَمُوتُ، بِيَدِهِ الْخَيْرُ، وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ۔ كَتَبَ اللّٰهُ لَهٗ أَلْفَ أَلْفِ حَسَنَةٍ

[1] سنن ابن ماجه، حديث: 2233، حدیث ضعیف ہے۔ [2] أحكام السوق في الإسلام لأحمد الدرويش، ص: 36,35.

وَ مَحَا عَنْهُ أَلْفَ أَلْفِ سَيِّئَةٍ وَّ رَفَعَ لَهُ أَلْفَ أَلْفِ دَرَجَةٍ وَّ بَنٰى لَهُ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ»

''جو آدمی بازار میں داخل ہوتے ہوئے یہ الفاظ کہتا ہے: ''اللہ کے سوا کوئی معبود (برحق) نہیں۔ وہ یکتا ہے۔ اُس کا کوئی شریک نہیں۔ اُسی کی بادشاہت ہے۔ اور اُسی کی حمد ہے۔ وہ زندہ کرتا اور مارتا ہے جبکہ وہ خود زندہ ہے، نہیں مرے گا۔ ساری خیر اُسی کے ہاتھ ہے۔ اور وہ ہر شے پر بخوبی قادر ہے۔'' اللہ اُس کی دس لاکھ نیکیاں لکھتا ہے، دس لاکھ گناہ مٹا دیتا ہے، دس لاکھ درجے بلند کرتا ہے اور جنت میں اُس کے نام کا ایک گھر بنا دیتا ہے۔''[1]

بازار میں خاص طور سے اللہ کے ذکر کی ترغیب دی گئی ہے کہ بازار غفلت کی جگہ ہے۔ وہاں لوگ تجارت اور لین دین میں مشغول ہوتے ہیں۔ شیطان اور اُس کے سپاہی بازاروں میں بے حد سرگرم ہوتے ہیں اور بنی آدم کو اپنے جال میں پھانسنے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں اور اکثر کامیاب رہتے ہیں۔ یہاں اللہ کے ذکر سے شیطان اور اُس کی فوج کو شکست دینے میں مدد ملتی ہے کہ شیطان اللہ کے ذکر سے بھاگتا ہے۔ بازار میں ذکرِ الٰہی کا ثواب بھی اسی لیے زیادہ رکھا گیا ہے کہ وہاں اس پر کاربند رہنا مشکل ہے اور جو آدمی بازار میں بھی اللہ کو نہ بھولے اُسے تو یہ ثواب ملنا ہی چاہیے۔[2]

❁ بازاروں میں لین دین کرتے وقت شور شرابے اور بیہودہ گوئی کو ناپسند کیا گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا یہ نمایاں وصف (تورات میں یوں) بیان کیا گیا ہے: ''آپ اکھڑ نہیں، نہ تندخو ہیں اور نہ بازاروں میں شور مچانے والے ہیں۔ برائی کا بدلہ برائی سے نہیں دیتے بلکہ درگزر سے کام لیتے اور معاف کر دیتے ہیں۔''[3]

---

[1] جامع الترمذي، حديث: 3428، و سنن ابن ماجه، حديث: 2235، والمستدرك للحاكم: 538/1. [2] تحفة الأحوذي شرح جامع الترمذي: 386/9. [3] صحيح البخاري، حديث: 2125.

شور وغوغا یوں بھی مذموم ہے اور بازاروں میں غل اٹھانا تو اور ہی ناپسندیدہ ہے۔[1]

❁ بازاروں کی صفائی ستھرائی کا خیال رکھنا ضروری ہے اور وہاں گند ڈالنے سے پرہیز کرنا چاہیے۔اس سے ایک تو چلنے پھرنے میں زحمت نہیں ہوگی، دوسرا اذیت ناک بدبو سے بچت رہے گی۔ رسول اللہ ﷺ نے عام راستوں اور بازاروں کو خاص طور سے صاف ستھرا رکھنے کی تاکید کی ہے، چنانچہ فرمایا: «اِتَّقُوا اللَّعَّانَيْنِ» ''لعنت کے دو کاموں سے بچو۔'' لوگوں نے پوچھا: ''اے اللہ کے رسول! لعنت کے دو کام کون سے ہیں؟

آپ ﷺ نے جواب دیا: «اَلَّذِي يَتَخَلّٰى فِي طَرِيقِ النَّاسِ، أَوْ فِي ظِلِّهِمْ» ''لوگوں کے راستے میں یا سایے میں (بیٹھنے کی جگہ) پاخانہ پھرنا اورگند ڈالنا۔''[2]

❁ بازاروں میں اسلحہ لے جانے یا اُس کی نمائش سے احتراز برتنا چاہیے۔ روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں سے مخاطب ہوکر فرمایا: «إِذَا مَرَّ أَحَدُكُمْ فِي مَسْجِدِنَا أَوْ فِي سُوقِنَا وَ مَعَهُ نَبْلٌ فَلْيُمْسِكْ عَلٰى نِصَالِهَا۔ أَوْ قَالَ: فَلْيَقْبِضْ بِكَفِّهِ۔ أَنْ يُّصِيبَ أَحَدًا مِّنَ الْمُسْلِمِينَ مِنْهَا بِشَيْءٍ» ''آپ میں سے کوئی تیر اٹھائے ہوئے ہماری مسجد یا ہمارے بازار سے گزرے تو وہ تیروں کے پھل ہاتھ میں رکھے۔ ایسا نہ ہو کہ تیر کسی مسلمان کی تکلیف کا باعث بنیں۔''[3]

آج کل کے جدید اسلحے کے حوالے سے اسی حدیث پر قیاس کرنا چاہیے کہ اس جدید ترین اسلحے سے بے احتیاطی میں کی گئی معمولی چھیڑ چھاڑ بھی بڑے اور یقینی نقصان کا باعث بن سکتی ہے۔[4]

❁ لین دین کے دوران میں طے پانے والے معاہدوں کو ہر صورت پورا کرنا چاہیے۔ یہ لازمی امر ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

---

1 أحكام السوق في الإسلام لأحمد الدرويش، ص:41. 2 صحيح مسلم، حديث: 269، و سنن أبي داود، حديث: 25. 3 صحيح البخاري ، حديث: 7075، و صحيح مسلم، حديث: 2615. 4 أحكام السوق في الإسلام لأحمد الدرويش، ص:44.

﴿وَأَوْفُوا بِعَهْدِ اللَّهِ إِذَا عَاهَدْتُمْ وَلَا تَنْقُضُوا الْأَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيدِهَا وَقَدْ جَعَلْتُمُ اللَّهَ عَلَيْكُمْ كَفِيلًا ۚ إِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا تَفْعَلُونَ ○﴾

''اور اللہ کا عہد پورا کرو جب تم آپس میں عہد کرلو اور قسمیں پکی کرنے کے بعد نہ توڑو جبکہ تم نے اللہ کو اپنا کفیل بنایا ہو۔ بے شک اللہ جانتا ہے جو تم کرتے ہو۔''[1]

❁ خرید و فروخت کے معاملات میں رواداری برتنی اور آسانی پیدا کرنی چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «رَحِمَ اللّٰهُ عَبْدًا سَمْحًا إِذَا بَاعَ، سَمْحًا إِذَا اشْتَرٰی، سَمْحًا إِذَا اقْتَضٰی» ''اللہ اُس بندے پر رحم فرمائے جو خرید وفروخت میں اور (قرض وغیرہ کی واپسی کا) تقاضا کرنے میں وسعتِ قلبی اور نرمی کا مظاہرہ کرے۔''[2]

❁ لگی لپٹی رکھے بغیر صاف اور سیدھی بات کرنا معاملاتِ تجارت کا اہم ترین اصول ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ایسے تاجر کی تعریف کی ہے جو بات کا پکا، قول کا سچا اور لین دین میں امانت دار ہو۔ آپ ﷺ نے فرمایا: «اَلتَّاجِرُ الصَّدُوقُ الْأَمِينُ مَعَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ» ''سچا اور ایمان دار تاجر انبیاء، صدیقین اور شہداء کے ساتھ ہوگا۔''[3] اور ابن ماجہ میں: «يَوْمَ الْقِيَامَةِ» ''قیامت کے دن'' کے الفاظ بھی ہیں۔[4]

❁ جھوٹی قسموں سے دور رہنا بھی لازم ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«اَلْحَلِفُ مَنْفَقَةٌ لِّلسِّلْعَةِ، مَمْحَقَةٌ لِّلرِّبْحِ»

''قسم کھانے سے سامان تو جلد بک جاتا ہے لیکن منافع سے برکت اُڑ جاتی ہے۔''[5]

ایک موقع پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: «إِيَّاكُمْ وَ كَثْرَةَ الْحَلِفِ فِي الْبَيْعِ فَإِنَّهُ يُنَفِّقُ ثُمَّ يَمْحَقُ» ''لین دین کے معاملات میں بکثرت قسم کھانے سے پرہیز کریں۔ یہ

[1] النّحل 16:91. [2] صحيح البخاري، حديث: 2076، و جامع الترمذي، حديث: 1320، و سنن ابن ماجه، حديث: 2203. [3] جامع الترمذي، حديث: 1209. [4] سنن ابن ماجه، حديث: 2139. [5] صحيح البخاري، حديث: 2087، و صحيح مسلم، حديث: 1606.

بکری ضرور بڑھاتی ہے لیکن برکت اڑا دیتی ہے۔"[1]

قسم کھانے والا اپنا سامان تو بیچ لیتا ہے مگر وہ برکت سے خالی ہوتا ہے اور یہ مالک چوری چکاری، بیماری، جلاؤ گھیراؤ، غرق اور غصب جیسے عوارض کی وجہ سے تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔[2]

یہ تجارت اور خرید و فروخت کے آداب و اصول ہیں جن کی وجہ سے اسلامی بازار ترقی پذیر ہوا اور یہودیوں کا بازار مندا پڑ گیا۔ اسی وجہ سے مسلمانوں نے مدینہ میں اقتصادی ترقی حاصل کی اور معاشی باگ ڈور سنبھال کر یہودیوں کو ان کی ممتاز خوبی میں مات دے دی۔[3]

اسلامی ریاست کی وسعت اور نزولِ شریعت نے علم اقتصادیات کو بتدریج ترقی دے کر ایک مستقل علم بنا دیا جو اپنے اصول و قواعد اور فقہ و مبادیات کا حامل ہے۔ اسی کی طرف سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا یہ قول اشارہ کرتا ہے: «لَا یَبِیْعُ فِي سُوقِنَا إِلَّا مَنْ تَفَقَّهَ فِي الدِّینِ» "ہمارے بازاروں میں صرف وہی تجارت کرے جو دین (خصوصاً اصول اقتصادیات) کی سمجھ رکھتا ہو۔"[4]

لوگوں کے مال اور تجارت کے پیش نظر اسلام نے بازاروں کو حد درجہ اہمیت دی ہے کیونکہ یہ لوگوں کے کاروباری معاملات اور لین دین کی جگہ ہے۔ ہر فرد یہاں سے اپنی تمام ضروریات کی چیزیں حاصل کرتا ہے، اس لیے بازاروں کو اہمیت بھی دی گئی اور انھیں نبوی منہج پر چلایا بھی گیا۔[5]

قرآن کریم نے ایک خطرناک اجتماعی اور اقتصادی آفت "ناپ تول میں کمی" کا تذکرہ بھی کیا ہے جو لوگوں کے دین و دنیا دونوں پر گہرے اثرات چھوڑتی ہے۔ یہ کام ایسے دستور اور منہج کی سراسر مخالفت ہے جسے اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

[1] صحیح مسلم، حدیث: 1607. [2] شرح السیوطي علی سنن النسائي: 246/7. [3] الهجرة النبویة لأبي فارس، ص: 70. [4] أحکام السوق في الإسلام لأحمد الدرویش، ص: 53. [5] أحکام السوق في الإسلام لأحمد الدرویش، ص: 586,585.

﴿اَللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ وَالْمِيْزَانَ ۭ وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ قَرِيْبٌ ○﴾

''اللہ ہی ہے جس نے حق کے ساتھ کتاب اور ترازو نازل کی اور آپ کو کیا معلوم شاید قیامت قریب ہی ہو۔''[1]

میزان سے مراد عدل ہے۔[2]

موازین اور مکیال سے مراد ایسے آلات ہیں جن سے ناپ تول اور وزن کیا جاتا ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ان پیمانوں کو پورا کرنے کا حکم دیا اور کمی کوتاہی سے منع فرمایا ہے:

﴿وَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ﴾

''اور تم ناپ اور تول کو انصاف کے ساتھ پورا دو۔''[3]

ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا:

﴿وَاَوْفُوا الْكَيْلَ اِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ○﴾

''اور جب ماپ کر دو تو تم ماپ پورا کرو اور سیدھی ترازو سے تولو، یہ بہترین اور انجام کار کے لحاظ سے بہت اچھا ہے۔''[4]

کم تولنے والوں کو اللہ تعالیٰ نے یوں وعید سنائی:

﴿وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ○ الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ○ وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ ○ اَلَا يَظُنُّ اُولٰۗىِٕكَ اَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ ○ لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ ○﴾

''ڈنڈی مارنے والوں کے لیے تباہی ہے، وہ کہ جب وہ لوگوں سے ناپ کر لیں تو پورا لیتے ہیں اور جب وہ انھیں ناپ کر یا تول کر دیں تو کم دیتے ہیں، کیا یہ لوگ

---

[1] الشوریٰ 17:42. [2] زاد المسیر لابن الجوزي: 77/7. [3] الأنعام 152:6. [4] بني إسرآء یل 35:17.

یقین نہیں رکھتے کہ بے شک وہ (قبروں سے) اٹھائے جائیں گے، ایک عظیم دن کے لیے۔"[1]

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حضرت شعیب علیہ السلام کے قصے سے یقین کر لیا کہ ناپ تول میں کمی کوتاہی، منہج الٰہی کو چھوڑنے اور امر ربانی کی مخالفت، رب جبار کی ناراضی اور دنیا و آخرت میں اس کے عذاب کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ ناپ تول کی کمی سے آسانی کی جگہ تنگی اور ارزانی کی جگہ مہنگائی لے لیتی ہے جس سے معیشت پر منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں، اسی لیے مدینہ منورہ میں اس کی کھل کر مخالفت کی گئی۔[2]

ناپ تول کی کمی قوم شعیب کی ہلاکت کے اسباب میں ایک بڑا سبب تھا۔ ان کی ہلاکت کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿كَأَن لَّمْ يَغْنَوْا فِيهَا ۗ أَلَا بُعْدًا لِّمَدْيَنَ كَمَا بَعِدَتْ ثَمُودُ﴾

"جیسے وہ ان (گھروں) میں کبھی بسے ہی نہ تھے۔ سنو! پھٹکار ہے (اہل) مدین پر جیسے ثمود پر پھٹکار پڑی۔"[3]

قوم شعیب کی تباہی کا تذکرہ دراصل صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی تربیت کے لیے تھا، اس لیے انھوں نے یہ بات اچھی طرح سمجھ لی کہ منہج ربانی کی مخالفت کا نتیجہ تباہی و بربادی ہے اور دین زندگی کے ہر گوشے کا حصہ بننا ضروری ہے۔ منہج ربانی نے اقتصادی مشکلات کا علاج قرآنی قصوں کے ذریعے کیا تاکہ لوگ گئی گزری اقوام کے حالات سے عبرت اور ان کے انجام کار سے سبق حاصل کریں اور ان قصوں میں ان شرعی اور تعبدی پہلوؤں کو بھی مدنظر رکھا گیا جو امت کی تربیت و تنظیم میں کارفرما ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس امت کی ہر حال میں نگہبانی فرمائی اور اسے امانت کا بوجھ اٹھانے اور پیغامِ رسالت دنیا تک پہنچانے کے قابل بنانے کے لیے قدم بقدم ترقی پذیر فرمایا۔

[1] المطففين 83:1-5. [2] أسباب هلاك الأمم السّالفة لسعيد محمد، ص:446. [3] هود 11:95.

اسلامی ریاست کے لیے چھوٹے اور بڑے امور میں کوئی فرق نہیں ہوتا کیونکہ یہ تمام امور اس کی ترقی کے ضامن ہوتے ہیں، اسے بلندیوں پر فائز کرتے ہیں اور آنے والے زمانے میں پیش آمدہ چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کے لیے معاون ثابت ہوتے ہیں۔ قرب الٰہی کی تلاش کے لیے ہجرت کے بعد پہلے دو سالوں میں زکاۃ، صدقات اور روزے جیسے احکامات نازل ہوئے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ اوامر اسلامی معاشرے میں لوگوں کی حقیقت حال کی رعایت رکھتے ہوئے، بغیر جلدی و سختی کے اپنے اپنے وقت پر آہستہ آہستہ منتقل کیے گئے۔ [1]

2 ہجری میں بعض احکام کی مشروعیت و فرضیت

روزوں کی فرضیت

شعبان 2 ھ کو سابقہ امتوں کی طرح امت محمدیہ پر بھی روزے فرض قرار دیے گئے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ○﴾

”اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تم پر روزہ رکھنا اسی طرح فرض کیا گیا ہے جس طرح ان لوگوں پر فرض کیا گیا تھا جو تم سے پہلے تھے تاکہ تم متقی بن جاؤ۔“ [2]

روزوں کی فرضیت کے موقع پر سابقہ امتوں کے ذکر سے روزوں کی اہمیت کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ماہ رمضان کی فضیلت اجاگر فرمائی، چونکہ رمضان نزول قرآن کا مہینہ ہے، اس لیے اسے تمام مہینوں میں سے امتیازی حیثیت عطا فرمائی، چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِنَ

---

[1] دراسات في عهد النبوة للدكتور عبدالرحمٰن الشجاع، ص: 166-168. [2] البقرة 2:183.

﴿ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۖ وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ۗ يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ○ ﴾

''رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا جو انسانوں کے لیے ہدایت ہے اور اس میں ہدایت کی واضح اور حق کو باطل سے جدا کرنے والی دلیلیں ہیں، پھر تم میں سے جو شخص اس مہینے کو پائے تو اسے چاہیے کہ اس کے روزے رکھے اور جو شخص بیمار ہو یا سفر پر ہو تو دوسرے دنوں میں گنتی پوری کرے۔ اللہ تمھارے لیے آسانی چاہتا ہے اور وہ تمھارے لیے تنگی نہیں چاہتا اور تاکہ تم گنتی پوری کرو اور اس پر اللہ کی بڑائی بیان کرو کہ اس نے تمھیں ہدایت دی اور تاکہ تم شکر کرو۔''[1]

مخلص روزے دار کو بطور انعام تقویٰ حاصل ہوگا۔ اس کا تذکرہ حسب ذیل آیت میں ہے:

﴿ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ○ ﴾

''تاکہ تم متقی بن جاؤ۔''[2]

روزہ اور تزکیۂ نفس

روزے سے مسلمان بہت کچھ سیکھتا ہے۔ روزہ پاکیزگی اور بالیدگی کی عملی مشق ہے جس کے ذریعے سے لوگ روحانی بیماریوں سے چھٹکارا حاصل کرتے، اپنے آپ کو خوبیوں سے آراستہ کرتے اور تقویٰ و اصلاحِ نفس کے بلند درجات پر فائز ہوتے ہیں۔[3]

مسلم معاشرے کی تربیت اور تزکیۂ نفس میں رمضان المبارک کے اثرات واضح ہیں، بنا بریں شارع علیہ السلام نے نفلی طور پر بھی مختلف دنوں اور تاریخوں میں روزہ رکھنے اور اللہ تعالیٰ سے اجر و ثواب حاصل کرنے کی ترغیب دلائی ہے اور روزے کی برکت حاصل کرنے کے لیے

[1] البقرة 2:185. [2] البقرة 2:183. [3] السيرة النبوية لأبي شهبة: 106/2، ومنهج الإسلام في تزكية النفس للدكتور أنس أحمد كرزون: 252,251/1.

سارا سال یہ مشق جاری رکھی جاسکتی ہے تاکہ جیسے ہی کوئی مسلمان اپنی نفسانی خواہشات کو کنٹرول اور دل کی سختی کو دور کرنے کی ضرورت محسوس کرے تو اللہ تعالیٰ سے اجر وثواب کے حصول کے لیے روزہ رکھ سکتا ہے۔ ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«مَنْ صَامَ يَوْمًا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ بَعَّدَ اللّٰهُ وَجْهَهُ عَنِ النَّارِ سَبْعِينَ خَرِيفًا»

''جس آدمی نے اللہ کی راہ میں ایک دن روزہ رکھا اللہ تعالیٰ اس کے چہرے کو جہنم کی آگ سے ستر سال کی مسافت کے بقدر دور فرما دیں گے۔''[1]

فطرانہ کی فرضیت

رمضان المبارک 2ھ میں اللہ تعالیٰ نے صدقہ (فطرانہ) فرض فرمایا۔ یہ مسلمانوں میں سے ہر آزاد، غلام، مرد، عورت، چھوٹے اور بڑے پر فرض قرار دیا گیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اس کی حکمت بیان فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقہ فطر روزہ دار کو کوتاہیوں سے پاک کرنے اور غریبوں اور مسکینوں کے لیے رزق کی فراہمی کی غرض سے فرض قرار دیا ہے۔ جس شخص نے اسے نماز عید سے پہلے ادا کیا وہ صدقہ فرض اور جس نے بعد میں ادا کیا وہ عام نفلی صدقہ کہلائے گا۔[2]

فطرانہ کے فوائد: اس حدیث میں صدقہ فطر کی فرضیت کی حکمت میں دو باتیں بیان کی گئی ہیں:[3]

- کوتاہیوں سے پاکیزگی: اس پہلی بات کا تعلق رمضان سے ہے۔ انسان فطرتاً غلطی، کوتاہی اور بے فائدہ یا نقصان دہ گفتگو وغیرہ کا ارتکاب کر بیٹھتا ہے۔ یہ وہ برائیاں ہیں

[1] صحيح البخاري، حديث: 2840، و صحيح مسلم، حديث: 1153. [2] سنن أبي داود، حديث: 1609، و سنن ابن ماجه، حديث: 1827. [3] منهج الإسلام في تزكية النفس للدكتور أنس أحمد كرزون، ص: 269,268.

جن سے عام طور پر کوئی بھی انسان بچ نہیں سکتا تو رمضان کے اختتام پر روزے دار کو ان آلائشوں سے پاک کرنے کے لیے اس پر فطرانہ فرض کر دیا گیا۔

❁ **مساکین کے لیے فراہمی رزق:** اس دوسری بات کا تعلق رمضان کے بعد آنے والی عید، عید الفطر کے ساتھ ہے۔ اس دن محتاجوں کے لیے رزق کی فراہمی سے اس دن کی خوشیاں تمام افرادِ امت تک پہنچ جاتی ہیں اور سارا مسلم معاشرہ خوش اور مسرور نظر آتا ہے۔ شریعتِ اسلامیہ نے اس مبارک دن میں کسی محتاج کو سوال اور کسی سے عطیہ مانگنے کی عار سے بچنے کے لیے ہر ایک مسلمان پر صدقہ فطر واجب کر دیا۔ اور یہ فقراء اور مساکین کے علاوہ کسی کا حق نہیں ہے۔ گزشتہ حدیث میں بھی اسی طرف اشارہ ہے کہ یہ «طُعْمَةً لِّلْمَسَاكِينِ» ''مساکین کے لیے بطور خوراک ہے۔''

نبی ﷺ نے صدقہ فطر کی مقدار زیادہ مقرر نہیں فرمائی مبادا لوگ ادا کرنے سے قاصر رہ جائیں بلکہ مقدار اتنی کم رکھی کہ ہر فرد سہولت سے اسے ادا کر سکے۔ اور یہ صدقہ فطر علاقے کی عام استعمال ہونے والی خوراک سے دینا مشروع ہے۔

بظاہر معمولی نظر آنے والی اس خوراک سے فقراء کم از کم عید کا دن تو بے فکری سے گزار سکتے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ دین کتنا عظیم ہے۔[1]

صدقہ فطر کی دیگر تفصیلات کتب احادیث اور کتب فقہ میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

نماز عید کی مشروعیت

اسی سال 2 ھ میں رسول اللہ ﷺ نے نماز عید ادا فرمائی۔ یہ وہ پہلی نماز عید تھی جسے نبی علیہ السلام نے اپنے صحابہ کے ہمراہ اللہ تعالیٰ کی مسلسل نازل ہونے والی نعمتوں پر شکرانے کے طور پر ادا فرمایا۔ آپ ﷺ تکبیر و تہلیل اور اللہ کی عظمت بیان کرتے ہوئے عید گاہ کی

1 المال في القرآن الكريم لسليمان الحصين، ص: 334.

طرف تشریف لے گئے۔

عید اہل اسلام کا ایسا تہوار ہے جس میں خیر و برکت، اتحاد و یگانگت، نرم دلی اور محبت جیسے جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔ آپ ﷺ نمازِ عید سے فارغ ہو کر خطبۂ عید ارشاد فرماتے اور مواعظ حسنہ سے نوازتے، اللہ کے عذاب سے ڈراتے، نیکی کی رغبت اور گناہ سے بچنے کا درس دیتے اور اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی ترغیب دیتے۔ بعدازاں مرد، عورتیں، چھوٹے اور بڑے سب بڑھ چڑھ کر اللہ کے راستے میں خرچ کرتے تھے حتیٰ کہ عورتیں اپنے زیورات اتار کر اللہ کی راہ میں دے دیتیں۔[1]

زکاۃ کی فرضیت

2 ھ ہی میں اہل اسلام پر زکاۃ فرض ہوئی۔ زکاۃ کو اسلام کا اہم رکن قرار دیا گیا۔ زکاۃ رمضان 2 ھ کے بعد فرض ہوئی کیونکہ اس امر پر اتفاق ہے کہ زکاۃ صدقہ فطر کے بعد فرض ہوئی اور صدقۂ فطر صیام رمضان کے بعد اور عید الفطر سے پہلے فرض ہوا تھا۔ جیسا کہ حدیث سے ثابت ہے۔ امام ابن خزیمہ، نسائی، ابن ماجہ اور حاکم کی حضرت قیس بن سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ سے مروی روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے زکاۃ کا حکم نازل ہونے سے پہلے ہمیں صدقہ فطر کا حکم دیا جبکہ زکاۃ کا حکم بعد میں نازل ہوا۔ بعد ازاں آپ ﷺ نے صدقہ فطر کے بارے میں نہ ہمیں حکم دیا اور نہ ہی منع کیا لیکن ہم مسلسل یہ صدقہ ادا کرتے رہے۔[2]

جمہور علمائے کرام متقدمین ہوں یا متاخرین اس بات پر متفق ہیں کہ زکاۃ مدینہ طیبہ میں 2 ھ کو فرض ہوئی۔[3]

---

[1] صحيح مسلم، حديث: 885، والسيرة النبوية لأبي شهبة: 109/2. [2] صحيح سنن النسائي، حديث: 2506، و صحيح ابن خزيمه، حديث: 2394، والمستدرك للحاكم: 568/1، و سنن ابن ماجه حديث: 1828. [3] السيرة النبوية لأبي شهبة: 111/2.

مکی دور میں انفاق: مکی دور میں اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کا حکم ہر قسم کی قید سے آزاد تھا۔ وہاں یہ حکم مسلمانوں کی ایمانی قوت، ان کی دلی خوشی اور اس میں رشتہ اخوت کو سامنے رکھ کر تھا جس میں تھوڑا مال خرچ کرنا بھی کفایت کر جاتا، کبھی ضرورت کے تحت اس سے زیادہ، بسا اوقات بہت زیادہ بھی خرچ کرنا پڑتا تھا۔[1]

مکی آیات میں زیادہ تر اصلاحی اور تربیت پر مشتمل احکامات پائے جاتے ہیں جن میں مختلف اسالیب میں فقراء و مساکین کی نگہداشت کا حکم بھی ہے۔ سورہ مدثر، جو قرآن کریم کی ابتدائی نازل ہونے والی سورت ہے، اس میں مساکین کو کھانا کھلانا ایمان کا جز قرار دیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں اس سورت میں قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے دائیں طرف کھڑے ہونے والے اہل ایمان کی منظر کشی بھی کی گئی ہے۔ اہل ایمان جنت کے باغوں میں ہوں گے اور عذاب میں گرفتار کافروں کے بارے میں سوال کریں گے کہ انھیں عذاب دیے جانے کا سبب کیا ہے۔ انھیں جواب ملے گا کہ وہ مسکینوں کے حق کا خیال رکھتے تھے نہ انھیں بھوک میں مبتلا اور بے لباس دیکھ کر ان کی اعانت کرتے تھے اور ہر طرح سے ان سے اعراض برتتے تھے۔[2]

جنتیوں اور جہنمیوں کے اس مکالمے کو اللہ تعالیٰ نے یوں بیان فرمایا ہے:

﴿كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ ۝ إِلَّآ أَصْحَٰبَ ٱلْيَمِينِ ۝ فِى جَنَّٰتٍ يَتَسَآءَلُونَ ۝ عَنِ ٱلْمُجْرِمِينَ ۝ مَا سَلَكَكُمْ فِى سَقَرَ ۝ قَالُوا۟ لَمْ نَكُ مِنَ ٱلْمُصَلِّينَ ۝ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ ٱلْمِسْكِينَ ۝ وَكُنَّا نَخُوضُ مَعَ ٱلْخَآئِضِينَ ۝ وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ ٱلدِّينِ ۝﴾

”ہر نفس نے جو کیا اس کے بدلے وہ گروی ہے، دائیں (ہاتھ) والوں کے سوا، وہ باغاتِ بہشت میں ہوں گے، باہم سوال کریں گے، مجرموں کے بارے میں، (ان

[1] فقه الزكاة للقرضاوي:1/77. [2] فقه الزكاة للقرضاوي:1/70.

سے پوچھیں گے:) تمھیں کس چیز نے جہنم میں ڈالا؟ وہ کہیں گے: ہم نمازیوں میں سے نہیں تھے اور ہم مسکین کو کھانا نہیں کھلاتے تھے اور ہم (باطل میں) مشغول ہونے والوں کے ساتھ مشغول ہوتے تھے اور ہم روزِ جزا کی تکذیب کرتے تھے۔''[1]

اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں اپنے بندوں کو باغ والوں کا قصہ بھی سنایا جنھوں نے اپنے باغ کا پھل راتوں رات اتارنے کا فیصلہ کیا تاکہ غرباء و مساکین کو کچھ نہ دیا جائے جو وہ کٹائی کے وقت وصول کرتے تھے، پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر عذاب نازل ہوا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

﴿فَطَافَ عَلَيْهَا طَآئِفٌ مِّنْ رَّبِّكَ وَهُمْ نَآئِمُوْنَ ○ فَاَصْبَحَتْ كَالصَّرِيْمِ ○ فَتَنَادَوْا مُصْبِحِيْنَ ○ اَنِ اغْدُوْا عَلٰى حَرْثِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰرِمِيْنَ ○ فَانْطَلَقُوْا وَهُمْ يَتَخَافَتُوْنَ ○ اَنْ لَّا يَدْخُلَنَّهَا الْيَوْمَ عَلَيْكُمْ مِّسْكِيْنٌ ○ وَّغَدَوْا عَلٰى حَرْدٍ قٰدِرِيْنَ ○ فَلَمَّا رَاَوْهَا قَالُوْٓا اِنَّا لَضَآلُّوْنَ ○ بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ ○ قَالَ اَوْسَطُهُمْ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ لَوْلَا تُسَبِّحُوْنَ ○ قَالُوْا سُبْحٰنَ رَبِّنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ○ فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَلَاوَمُوْنَ ○ قَالُوْا يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا طٰغِيْنَ ○ عَسٰى رَبُّنَآ اَنْ يُّبْدِلَنَا خَيْرًا مِّنْهَآ اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا رٰغِبُوْنَ ○ كَذٰلِكَ الْعَذَابُ ؕ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ○﴾

''تو آپ کے رب کی طرف سے کوئی پھرنے والا (عذاب) اس (باغ) پر پھر گیا، جبکہ وہ سو رہے تھے، پھر وہ (باغ) کٹی کھیتی کی طرح ہو گیا، پھر صبح ہوتے ہی انھوں نے ایک دوسرے کو پکارا، کہ تم اپنی کھیتی پر صبح سویرے چلو اگر تمھیں پھل توڑنا ہے، چنانچہ وہ چل پڑے اور آپس میں چپکے چپکے کہہ رہے تھے، کہ آج تمھارے پاس باغ میں کوئی مسکین داخل نہ ہونے پائے اور وہ صبح سویرے (یہ سوچ کر) لپکتے گئے

[1] المدثر74:38-46.

کہ وہ (مسکینوں کو) روکنے پر قادر ہیں، پھر جب انھوں نے باغ دیکھا تو کہا: یقیناً ہم (راہ) بھول گئے ہیں، (نہیں) بلکہ ہم تو محروم کر دیے گئے ہیں، ان کا بہترین کہنے لگا: کیا میں نے تمھیں نہیں کہا تھا کہ تم تسبیح کیوں نہیں کرتے؟ انھوں نے کہا: پاک ہے ہمارا رب، بے شک ہم ہی ظالم تھے، پھر وہ ایک دوسرے کی طرف منہ کر کے ملامت کرنے لگے، (اور) کہنے لگے: ہائے ہم پر افسوس! بے شک ہم ہی سرکش تھے، شاید ہمارا رب بدلے میں اس سے بہتر ہمیں دے، بے شک ہم اپنے رب کی طرف رغبت کرنے والے ہیں۔''[1]

مکی دور میں نازل ہونے والی آیات مساکین کے ساتھ شفقت، مہربانی اور ان کی خوراک ولباس کا خیال رکھنے کا درس دیتی ہیں اور قرآن نہ صرف ان کی ضرورتوں کو پورا کرنے کا حکم دیتا ہے بلکہ وہ تو حکم دیتا ہے کہ تمام مسلمان ایک دوسرے کو مسکینوں کا حق یاد دلائیں اور اس پر ابھاریں اور سب ان کے کھانے کا انتظام کریں اور مکمل دیکھ بھال کریں۔ اللہ تعالیٰ نے اس ذمہ داری سے عہدہ برآ نہ ہونے کو کفر کے ساتھ ملا کر بیان فرمایا ہے اور اس جرم کو اپنی ناراضی کا سبب اور آخرت میں عذاب کا موجب قرار دیا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے بائیں ہاتھ والوں کے بارے میں ارشاد فرمایا:

﴿خُذُوْهُ فَغُلُّوْهُ ○ ثُمَّ الْجَحِيْمَ صَلُّوْهُ ○ ثُمَّ فِيْ سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوْهُ ○﴾

''(حکم ہوگا:) اسے پکڑو، پھر طوق ڈال دو، پھر اسے جہنم (کی آگ) میں جھونک دو، پھر ایک زنجیر میں، جس کی پیمائش ستر گز ہے، اسے جکڑ (یا پرو) دو۔''[2]

پھر اس جرم کے سبب اس کی سرعام رسوائی کا تذکرہ اس طرح فرمایا:

﴿اِنَّهٗ كَانَ لَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ الْعَظِيْمِ ○ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ○﴾

[1] القلم 68:19-33. [2] الحآقّة 69:30-32.

”بے شک وہ اللہ عظیم پر ایمان نہیں لاتا تھا اور نہ مسکین کو کھانا کھلانے پر شوق دلاتا تھا۔“ [1]

یہی وہ دل ہلا دینے اور عذاب سے ڈرانے والی آیات ہیں جن کے سبب حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ نے اپنی بیوی سے کہا تھا: ”اے ام درداء! اللہ تعالیٰ نے جب سے جہنم کو پیدا کیا ہے اس وقت سے ایک زنجیر کو پیدا کیا ہے جو جہنم میں گرم کی جا رہی ہے، اسے قیامت کے دن لوگوں کی گردن میں ڈالا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے ہمارے ایمان لانے کی وجہ سے ہمیں اس کے آدھے حصے سے نجات عطا کر دی ہے۔ اے ام درداء! اب تو مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب دیا کر۔“ [2]

مدنی دور میں فرضیتِ زکاۃ کا سبب: قرآنِ کریم کی مدنی سورتیں ایسے حالات میں نازل ہوئیں جب مسلمان ایک امت بن چکے تھے، اپنی ریاست تھی، اپنا تشخص اور اپنا خطۂ ارض تھا، اس لیے مدنی آیات میں وارد احکامات حالات کے عین مطابق نازل ہوئے۔ ان آیات میں مطلق احکامات کی تقیید اور عمومی احکامات کی تخصیص کر دی گئی، جبکہ مکی احکامات صرف دعوتی اور اصلاحی امور پر مشتمل تھے۔ مدنی احکامات لازمی اور ضروری حیثیت کے حامل تھے، لہٰذا ایمان و یقین کی موجودگی میں انھیں قوانین کی شکل میں نافذ کیا گیا۔

زکاۃ اسی مدنی دور میں فرض ہوئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نصابِ زکاۃ کی حد بندی کی اور اس کی شرائط، واجب مقدار، مصارف زکاۃ اور زکاۃ وصول کرنے اور دیگر انتظامی امور کے سلسلے میں استعمال ہونے والے قوانین سے آگاہ فرمایا۔ [3]

زکاۃ کی اہمیت: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زکاۃ ادا کرنے کی تاکید فرمائی، اللہ کے دین میں

---

1 الحاقّة 69:33، 34. 2 الأموال لأبي عبيد، ص: 35، بحواله فقه الزكاة للقرضاوي: 70/1.
3 فقه الزكاة للقرضاوي: 78/1.

اس کی اہمیت بیان کی کہ وہ دین اسلام کا بنیادی رکن ہے۔ آپ ﷺ نے اس کی بروقت ادائیگی کی ترغیب دی اور مختلف اسالیب سے زکاۃ نہ دینے سے ڈرایا۔

نبی ﷺ نے فرمایا کہ اسلام کے پانچ رکن ہیں: پہلا رکن اللہ کی توحید اور رسول اللہ ﷺ کی رسالت کی گواہی ہے۔ دوسرا رکن نماز اور تیسرا رکن زکاۃ ہے۔ [1]

قرآن وسنت میں زکاۃ کو اسلام کا تیسرا ستون قرار دیا گیا ہے جس کے بغیر اسلام کی عمارت قائم نہیں رہ سکتی۔ [2]

اہل ایمان نے اللہ اور اس کے رسول کے حکم کے مطابق زکاۃ جیسے اہم رکن کو اہمیت دی اور نظام زکاۃ کو عملی شکل دی تو عمومی طور پر معاشرے میں اس کے گرانقدر فوائد سامنے آئے اور لوگوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی بہتر ہوتی چلی گئی۔

ادائے زکاۃ کے فوائد: زکاۃ کے فوائد درج ذیل ہیں:

❁ بخیلی سے نجات: اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ تَبَوَّءُو الدَّارَ وَالْإِيْمٰنَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۚ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝﴾

''اور (مالِ فَے ان کے لیے ہے) جنھوں نے (مدینہ کو) گھر بنا لیا تھا اور ان (مہاجرین) سے پہلے ایمان لا چکے تھے، وہ (انصار) ان سے محبت کرتے ہیں جو ان کی طرف ہجرت کرے اور وہ اپنے دلوں میں اس (مال) کی کوئی حاجت نہیں پاتے جو ان (مہاجرین) کو دیا جائے اور اپنی ذات پر (ان کو) ترجیح دیتے ہیں اگرچہ خود انھیں سخت ضرورت ہو اور جو کوئی اپنے نفس کے لالچ سے بچا لیا گیا تو وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔'' [3]

[1] صحيح البخاري، حديث: 8. [2] فقه الزكاة للقرضاوي: 79/1. [3] الحشر 9:59.

* مال میں اضافہ اور برکت: اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿قُلْ اِنَّ رَبِّیْ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَیَقْدِرُ لَهٗ ؕ وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَهُوَ یُخْلِفُهٗ ۚ وَهُوَ خَیْرُ الرّٰزِقِیْنَ ○﴾

''کہہ دیجیے: بے شک میرا رب اپنے بندوں میں سے جس کے لیے چاہے رزق کشادہ کرتا ہے اور تنگ کرتا ہے جس کے لیے (چاہے) اور تم کوئی چیز بھی خرچ کرتے ہو تو وہ اس کا عوض دیتا ہے اور وہ سب سے بہتر رزق دینے والا ہے۔''[1]

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے مزید ارشاد فرمایا:

﴿وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِیْدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِیْ لَشَدِیْدٌ ○﴾

''اور جب تمھارے رب نے آگاہ کر دیا کہ اگر تم شکر کرو گے تو یقیناً میں تمھیں مزید دوں گا اور اگر تم کفر کرو گے تو بلاشبہ میرا عذاب بہت شدید ہے۔''[2]

ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا:

﴿یَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَیُرْبِی الصَّدَقٰتِ ؕ وَاللّٰهُ لَا یُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِیْمٍ ○﴾

''اللہ سود کو مٹاتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے اور اللہ کسی ناشکرے گناہ گار کو پسند نہیں کرتا۔''[3]

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: «مَا نَقَصَتْ صَدَقَةٌ مِّنْ مَّالٍ» ''صدقہ کرنے سے مال میں کمی واقع نہیں ہوتی۔''[4]

نبی ﷺ نے مزید ارشاد فرمایا: «مَا مِنْ يَّوْمٍ يُّصْبِحُ الْعِبَادُ فِيهِ إِلَّا مَلَكَانِ يَنْزِلَانِ، فَيَقُولُ أَحَدُهُمَا: اَللّٰهُمَّ أَعْطِ مُنْفِقًا خَلَفًا، وَّ يَقُولُ الْآخَرُ: اَللّٰهُمَّ

---

[1] سبا 39:34. [2] إبراهيم 7:14. [3] البقرة 276:2. [4] صحيح مسلم، حديث: 2588، و جامع الترمذي، حديث: 2029، والموطأ للإمام مالك: 1000/2.

أَعْطِ مُمْسِكًا تَلَفًا» ''روزانہ صبح کے وقت دو فرشتے آسمان سے اترتے ہیں۔ ان میں سے ایک کہتا ہے: ''اے اللہ! ہر خرچ کرنے والے کو بہتر بدلہ عطا فرما'' اور دوسرا کہتا ہے: ''اے اللہ! ہر بخیل کا مال تباہ کر دے۔''[1]

صدقہ و خیرات کرنے سے مسلمان کا دل بخل اور حرص جیسے برے خیالات سے پاک ہو جاتا ہے اور وہ اللہ کی طرف سے دیے گئے وسیع رزق اور حصول خیر و برکت کے وعدے پر یقین رکھتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے اس کی راہ میں خرچ کرتا چلا جاتا ہے۔[2]

❁ **دنیا و آخرت میں امن کا حصول:** اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

﴿ اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ○﴾

''جو لوگ اپنے مال خرچ کرتے ہیں رات اور دن میں، چھپا کر اور ظاہر، ان کے رب کے ہاں ان کے لیے اجر ہے، نہ انھیں کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔''[3]

زکاۃ ادا کرنے والا امن اور خوش بختی میں رہتا اور سکونِ قلب محسوس کرتا ہے کیونکہ وہ اللہ کا حکم تسلیم کرنے والا اور منع کردہ امور سے اجتناب کرنے والا ہوتا ہے۔

❁ **معاشرے پر زکاۃ کے اثرات:** معاشرے پر قائم ہونے والے نظام زکاۃ کے اثرات بڑی اہمیت کے حامل ہیں جس سے امیر اور غریب کے درمیان رابطہ رہتا ہے اور محبت بڑھتی ہے۔ لوگوں کے درمیان کوئی خلیج حائل نہیں ہوتی اور ہر سو امن و آشتی کی فضا قائم ہوتی ہے اور سب یکجان ہو جاتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد گرامی اسی مسلم معاشرے کی عکاسی کرتا ہے: «مَثَلُ الْمُؤْمِنِينَ فِي تَوَادِّهِمْ وَ تَرَاحُمِهِمْ وَ تَعَاطُفِهِمْ مَثَلُ الْجَسَدِ الْوَاحِدِ، إِذَا اشْتَكَى مِنْهُ

---

[1] صحيح البخاري، حديث: 1442، و صحيح مسلم، حديث: 1010. [2] منهج الإسلام في تزكية النفس للدكتور أنس أحمد كرزون: 249/1. [3] البقرة 2:274.

عُضْوٌ، تَدَاعٰی لَهٗ سَائِرُ الْجَسَدِ بِالسَّهَرِ وَالْحُمّٰی» ''مسلمانوں کی باہمی محبت، رحمت اور الفت کی مثال ایک جسم کی سی ہے جیسے ہی جسم کا کوئی حصہ تکلیف زدہ ہوتا ہے تو سارا جسم بے قراری اور بخار میں مبتلا ہو جاتا ہے۔''[1]

زکاۃ کا نظام کچھ اس طرح سے ہے کہ یہ ہر صاحب نصاب سے وصول کی جائے اور شریعت کی طرف سے مقرر کردہ مصارف میں صرف کی جائے۔

یہی وجہ تھی کہ ابتدائے اسلام میں اس نظام پر چلتے ہوئے معاشرہ فارغ البالی، اطمینان اور بہتر رزق سے مستفید ہوا۔ دراصل یہی اس معاشرے کی خصوصیت تھی کہ اخوت والفت کے ساتھ ساتھ فارغ البالی بھی میسر آئی۔

بیان کیا جاتا ہے کہ خلیفہ خامس عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے دور خلافت میں لوگ اتنے خوش حال ہو گئے کہ انھیں زکاۃ ادا کرنے کے لیے کسی مستحق شخص کو تلاش کرنے میں سخت دشواری کا سامنا کرنا پڑتا اور غلام خرید کر آزاد کرنے کے سوا ان کے پاس کوئی چارہ نہ ہوتا۔ اسلام کے ابتدائی دور میں اسلامی معیشت اتنی مستحکم ہو گئی کہ اس کی نظیر ناپید نظر آتی ہے اور یہ سب نظام زکاۃ رائج کرنے کی برکت سے ممکن ہوا۔[2]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے نکاح

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت سے قبل حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد مکہ ہی میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے چھ سال کی عمر میں نکاح کیا تھا اور شوال 1 ھ کو مدینہ طیبہ میں نو سال کی عمر میں ان کی رخصتی عمل میں آئی۔[3]

نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مبارک دور میں دعوت و جہاد، تعلیم و تربیت اور اسلامی ریاست کی ترقی کا عمل بدستور جاری ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی ازدواجی زندگی کا نظام

[1] صحيح مسلم، حديث:2586، و مسند أحمد:270/4. [2] السيرة النبوية لأبي شهبة:115/2.
[3] من معين السيرة لصالح الشامي، ص:168.

قائم و دائم تھا۔ نکاح اور تعدد ازواج ان کی زندگی میں اس طرح داخل تھے جیسے کھانے پینے جیسے امور داخل ہوتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دینِ اسلام عین دین فطرت ہے اور فطری تقاضوں سے ہم آہنگ ہے، اس لیے نکاح کا عمل اسلامی معاشرے کا اہم ترین رکن قرار پایا۔[1]

رسول اللہ ﷺ کا جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے نکاح ہوا اس وقت آپ ﷺ کی عمر مبارک چون (54) برس تھی۔ عموماً اتنی عمر بڑھاپے، کمزوری اور بزرگی کی نشاندہی کرتی ہے۔ بلاشبہ وقت کا گزرنا عمر جانچنے کا پیمانہ ہے اور یہ ایک عمومی ضابطہ ہے لیکن اصل معیار جسم میں دوڑنے والی تروتازگی اور پھرتی ہے۔ بسااوقات ہم تیس سال کی عمر والے شخص کو پچاس اور پچاس برس والے شخص کو تیس برس والا خیال کر لیتے ہیں اور صحیح اندازہ نہیں کر پاتے۔ نبی ﷺ پچاس برس میں بھی عزم و ہمت، پیش قدمی اور مردانگی کے اعتبار سے بھرپور جوان نظر آتے تھے اور آپ کا کوئی ثانی نہ تھا۔

حسب ذیل واقعات رسول اللہ ﷺ کے اس وصف پر دلالت کرتے ہیں:

❁ نبی علیہ السلام مختلف قبائل کے پاس تبلیغ دین کے ضمن میں تشریف لے جایا کرتے تھے۔ اسی سلسلے میں آپ بنو عامر بن صعصعہ کے پاس پہنچے۔ اپنی آمد کا مقصد بیان فرمایا تو ان میں سے بیحرہ بن فراس نے کہا:

«وَاللّٰہِ! لَوْ أَنِّي أَخَذْتُ هٰذَا الْفَتٰی لَأَكَلْتُ بِهِ الْعَرَبَ» ''اگر میں اس قریشی نوجوان کو قابو کر لوں تو پورے عرب کو مغلوب کر سکتا ہوں۔''[2]

بیحرہ کا قول قابل التفات ہے کہ اس نے رسول اللہ ﷺ کو ''فتی'' کہا جس کا اطلاق ایسے نوجوان پر ہوتا ہے جو عنفوان شباب میں ہو اور قوت حیات سے مالا مال ہو۔ اسی طرح بیحرہ کی عرب پر غالب آنے کی سوچ ظاہر کرتی ہے کہ اس نے نبی ﷺ میں ایک جوش،

---

[1] الأساس في السنة لسعيد حوّى:420/1. [2] السيرة النبوية لابن هشام:424/1.

ہمت اور ولولہ محسوس کیا تھا جس کا کوئی مقابلہ نہیں تھا۔

یہ بیجرہ کا تجزیہ تھا جبکہ نبی ﷺ ان دنوں پچاس برس کے تھے۔ آپ ﷺ ظاہر، باطن، شکل وصورت، روحانیت اور عزم و ہمت کے اعتبار سے کامل جوان نظر آتے تھے۔[1]

❁ امام بخاری رحمہ اللہ نے ہجرت نبوی کے بارے میں سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی ﷺ جب عازم سفر ہوئے تو ابوبکر رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے پیچھے سواری پر سوار تھے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ بوڑھے اور نبی ﷺ جوان نظر آ رہے تھے۔ جب کوئی شخص ابوبکر رضی اللہ عنہ سے سوال کرتا کہ آپ کے آگے کون سوار ہے؟ تو آپ فرماتے: ''یہ آدمی مجھے راستہ دکھلاتا ہے۔'' سوال کرنے والا خیال کرتا کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ زمینی راستوں کی بات کر رہے ہیں لیکن وہ تو بھلائی اور جنت کا راستہ مراد لیتے تھے۔[2]

رسول اللہ ﷺ عمر میں ابوبکر رضی اللہ عنہ سے بڑے تھے لیکن نبی ﷺ پر بڑھاپے کے آثار نہ تھے۔[3]

حضرت انس رضی اللہ عنہ کے فرمان سے معلوم ہوتا ہے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ اپنی حقیقی عمر کے اعتبار سے بوڑھے اور نبی ﷺ زیادہ عمر رکھنے کے باوجود جوان نظر آتے تھے۔

مذکورہ حوالوں کی روشنی سے یہ معلوم ہوا کہ اس اعتبار سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے درمیان زیادہ بعد نہ تھا۔ اسی طرح ایک روایت میں ہے کہ نبی ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے دوڑ لگائی، ایک بار حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور دوسری مرتبہ نبی ﷺ سبقت لے گئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: «هٰذِهِ بِتِلْكَ» ''میری یہ سبقت تیری اس سبقت کے عوض ہے۔''[4]

ہر صاحب فکر ونظر نبی ﷺ کے اس نکاح میں پنہاں حکمتوں کا ادراک کر سکتا ہے جو نکاح

---

[1] من معين السيرة لصالح الشامي، ص: 171. [2] صحيح البخاري، حديث: 3911، و مسند أحمد: 287/3. [3] شرح المواهب اللدنية للزرقاني: 355/1. [4] مسند أحمد: 264/6، و سنن أبي داود، حديث: 2578، و سنن ابن ماجه، حديث: 1979.

آپ ﷺ نے مدنی زندگی کے ابتدائی دور میں کیا جو کہ ابھی ابتدائی تشریعی مراحل کا دور تھا۔

بلاشبہ انسان اپنی زندگی کا بیشتر حصہ اپنے گھر اور خاندان میں بسر کرتا ہے۔ نبی علیہ السلام نے بھی اپنے گھر ہی میں یہ حصہ گزارا اور آپ ﷺ کی گھریلو زندگی سے آگاہی انتہائی ضروری تھی تا کہ لوگ اپنی گھریلو زندگی میں آپ ﷺ کے اسوہ پر چل سکیں۔ گھریلو زندگی کو امت کے سامنے رکھنے کی یہ ذمہ داری تمام امہات المومنین رضی اللہ عنہن نے بالعموم اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بالخصوص اٹھائی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنی خداداد صلاحیت اور فہم و فراست سے یہ فریضہ بخوبی انجام دیا۔

سیرت طیبہ کی کوئی بھی کتاب ہو بنظرِ غائر مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کی یہی حکمت تھی اور اس فریضے کی انجام دہی کے لیے اللہ تعالیٰ نے انھیں نبی علیہ السلام کی وفات کے بعد تقریباً پچاس برس عطا فرمائے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی اس بابرکت عمر نے لوگوں تک آپ ﷺ کی گھریلو زندگی کے مختلف پہلوؤں کو واضح کرنے اور جملہ فرامین امت تک پہنچانے میں اہم کردار ادا کیا۔[1]

[1] من معين السيرة لصالح الشامي، ص: 173.

باب 6

سنتِ مزاحمت اور جنگی مہمات کی تحریک

وہ جاری قوانین جنھیں نبی ﷺ نے اختیار کیا اور ان کے ساتھ معاملہ کیا، ان میں سے ایک ''سنت مزاحمت'' ہے۔ اس طریقۂ کار کا اظہار واضح طور پر مدنی دور میں ہوا جب رسول اللہ ﷺ نے مشرکین کے خلاف مزاحمتی تحریک کا آغاز کیا تھا۔ غلبۂ دین سے اس ربانی سنت کا گہرا تعلق ہے۔ جسے کتاب عزیز نے یوں بیان کیا ہے:

﴿وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝﴾

''اور اگر اللہ انسانوں کے ایک (گروہ) کو دوسرے (گروہ) کے ذریعے سے ہٹاتا نہ رہتا تو یقیناً ساری زمین کا نظام بگڑ جاتا لیکن اللہ دنیا والوں پر بڑا فضل کرنے والا ہے۔''[1]

اور فرمایا:

﴿اَلَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ۭ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ۭ وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝﴾

''وہ لوگ جنھیں ان کے گھروں سے ناحق نکال دیا گیا، صرف اس لیے کہ وہ کہتے

[1] البقرة 2:251.

ہیں: ہمارا رب اللہ ہے اور اگر اللہ لوگوں میں سے بعض کو بعض کے ذریعے سے دفع نہ کرتا تو بلاشبہ خانقاہیں اور گرجے اور (یہودی) عبادت خانے اور مسجدیں ڈھا دی جاتیں جن میں اللہ کا نام بکثرت ذکر کیا جاتا ہے اور اللہ ضرور اس کی مدد کرے گا جو اس (کے دین) کی مدد کرے گا، بے شک اللہ یقیناً بہت قوت والا، خوب غالب ہے۔"[1]

یہاں یہ بات نوٹ کرنے کی ہے کہ سورۂ بقرہ کی مذکورہ آیت سے قبل طالوت و جالوت کی شکل میں کشاکشِ حق و باطل کی مثال پیش کی گئی ہے جس کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے بات ختم کرتے ہوئے فرمایا:

﴿وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ○﴾

"لیکن اللہ دنیا والوں پر بڑا فضل کرنے والا ہے۔"[2]

معلوم ہوا کہ "سنت مزاحمت" کے ذریعے سے فساد کا خاتمہ اہلِ دنیا کے لیے بڑا انعام ہے۔[3]

آیتِ حج سے پہلے بھی اللہ تعالیٰ نے اعلان کیا ہے کہ وہ اپنے مومن دوستوں کا وفاع کرتا ہے۔ اس آیت میں حق تعالیٰ نے مومنین کو دشمنوں سے قتال کی اجازت دینے کے بعد بات ایک بنیادی قاعدے پر ختم کی، چنانچہ فرمایا:

﴿وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ○﴾

"اور اللہ ضرور اس کی مدد کرے گا جو اس (کے دین) کی مدد کرے گا، بے شک اللہ یقیناً بہت قوت والا، خوب غالب ہے۔"[4]

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے اس سنت الٰہی کا بخوبی ادراک کیا اور جان لیا کہ باطل کا قلع قمع کرنے کے لیے ایک امت کی ضرورت ہے جو اعلیٰ قیادت، خاص منہج اور قوت کی حامل ہو

[1] الحج 40:22. [2] البقرة 251:2. [3] مفاتيح الغيب للرازي: 514/3. [4] الحج 40:22.

جس کی مدد سے اللہ تعالیٰ باطل کو نیست و نابود کرے۔ انھیں یہ بھی معلوم تھا کہ حق کو کامیابی کی منزل تک پہنچنے کے لیے بلند عزائم، وفادار ساتھیوں، محبت کرنے والے دلوں اور مضبوط اعصاب کی ضرورت ہوتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے صحابۂ کرام کو اس سنت الٰہی کے ساتھ حسن معاملہ کی تعلیم دی، چنانچہ انھوں نے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں جہاد کا فریضہ سرانجام دیا۔

حق تعالیٰ نے جہاد کو امت مسلمہ کے لیے تا قیامت جاری رہنے والا فریضہ قرار دیا جسے کسی ظالم کا ظلم اور عادل کا عدل کالعدم نہیں کر سکے گا۔ جس قوم نے اسے چھوڑا وہ ذلیل ہوئی اور باری تعالیٰ نے اس پر اس کا دشمن مسلط کر دیا۔ اللہ رب العزت نے جہاد فی سبیل اللہ کو مرحلہ وار فرض بنایا تا کہ انسانی نفس کو اس سے مانوس ہونے میں زیادہ دقت کا سامنا نہ کرنا پڑے، طبیعت اسے آسانی سے قبول کر لے اور دعوتی عمل اور جہاد دوش بدوش آگے بڑھیں۔[1]

فرضیت جہاد کے مراحل

عدمِ اجازت: مسلمان جب مکہ میں تھے، نبی ﷺ سے جہاد کی اجازت طلب کرتے تو آپ ﷺ جواب دیتے: «اِصْبِرُوا! فَإِنِّي لَمْ أُؤْمَرْ بِالْقِتَالِ»

''صبر کرو! ابھی مجھے قتال کا حکم نہیں دیا گیا۔''[2]

اجازت: جہاد کرنے کی اجازت دی گئی لیکن اسے واجب قرار نہیں دیا گیا اور یہ آیت نازل ہوئی:

﴿أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقٰتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا ۚ وَإِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ ۝﴾

1 الهجرة في القرآن الكريم لأحزمي سامعون جزولي، ص:438. 2 الكشاف للزمخشري: 4/199.

''جن لوگوں سے لڑائی کی جاتی ہے انھیں (جہاد کی) اجازت دی گئی ہے، اس لیے کہ ان پر ظلم ہوا اور یقیناً اللہ ان کی مدد پر ضرور قادر ہے۔''[1]

اُن لوگوں سے جنگ کرنے کا واجبی حکم جو مسلمانوں سے لڑیں: ارشاد ربانی ہوا:

﴿ وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ ۝ ﴾

''اور تم اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو (جہاد کرو) جو تم سے لڑتے ہیں اور تم زیادتی نہ کرو، بے شک اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔''[2]

فرضیت: اس مرحلے میں مسلمانوں پر تمام کافروں سے لڑنا فرض قرار دے دیا گیا۔ فرمایا:

﴿ وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِينَ كَافَّةً كَمَا يُقَاتِلُونَكُمْ كَافَّةً ۚ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ ۝ ﴾

''اور تمام مشرکین سے لڑو جیسے وہ سارے تم سے لڑتے ہیں۔ اور جان لو کہ بے شک اللہ متقیوں کے ساتھ ہے۔''[3]

فرضیت جہاد کا بتدریج واقع ہونا نو آموز اسلامی ریاست کے حالات کا تقاضا تھا جس کی فوج تعداد، اسلحہ اور تربیت کے لحاظ سے بالکل ابتدائی مراحل طے کر رہی تھی۔ اس صورت حال میں ضروری تھا کہ جہاد اختیاری رکھا جائے، تاوقتیکہ اسلامی فوج استحکام حاصل کر لے اور اگر کفر کی قوتیں یکبارگی بھی حملہ کر دیں تو اُن کے سامنے ڈٹ جانے کی صلاحیت سے بہرہ ور ہو۔ جہاد کو اختیاری رکھنے کے مقاصد پورے ہوئے تو اسے فرض قرار دے دیا گیا۔ لیکن یہ بھی اُس صورت میں جبکہ مسلمانوں پر اُن کے علاقے میں حملہ کیا جائے۔ جارحیت اب بھی واجب نہیں ہوئی تھی۔ بیعت عقبہ ثانیہ نے جو بعد میں بیعتِ حرب کہلائی، انصار پر واجب کر دیا تھا کہ وہ اسلامی دعوت اور نبی ﷺ کے دفاع کی خاطر

---

[1] الحج 39:22. [2] البقرة 190:2. [3] التوبة 36:9.

ساری دنیا سے ٹکرا جائیں۔[1]

قتال کی اجازت ملتے ہی رسول اللہ ﷺ نے صحابۂ کرام کے لیے فنون حرب وضرب کی تربیت کا اہتمام کیا اور جنگی مشقوں میں بنفس نفیس شریک ہوتے رہے۔ آپ ﷺ نے میدانِ جہاد میں سرگرمی دکھانے کو مقدس ترین عبادت شمار کیا۔ آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے اس حکم کی پوری تعمیل کی:

﴿وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ اللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ۝﴾

"اور ان (کافروں کے مقابلے) کے لیے تم مقدور بھر قوت اور بندھے ہوئے گھوڑے تیار رکھو جن سے تم اللہ کے دشمنوں اور اپنے دشمنوں کو اور ان کے علاوہ دوسروں کو ڈرائے رکھو جنھیں تم نہیں جانتے (مگر) اللہ انھیں جانتا ہے اور تم اللہ کی راہ میں جو کچھ خرچ کرو گے تمھیں (اس کا) پورا پورا ثواب دیا جائے گا۔ اور تم پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔"[2]

تربیت مسلم

مسلمان مجاہد کی تعلیم و تربیت کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کا طریق کار دو متوازی پہلوؤں پر مشتمل تھا۔ ایک روحانی تربیت اور دوسرا عملی مشق۔

① روحانی تربیت: رسول اللہ ﷺ مجاہدین اسلام کا حوصلہ بلند رکھنے اور اُن میں خود اعتمادی پیدا کرنے کی بھرپور کوشش کرتے تھے۔ آپ نے انھیں یقین دلایا تھا کہ جنگ کے اختتام پر فتح حاصل ہوگی یا شہادت کی صورت میں جنت ملے گی۔ تب سے اب تک یہی خوشگوار

[1] الجهاد و القتال لمحمد هيكل: 464,463/1. [2] الأنفال 60:8.

یقین مسلمان مجاہد کو میدان قتال میں لاتا اور اسے آخری دم تک اپنی جسمانی و نفسیاتی اور فنی طاقتوں کو آزمانے پر اُکساتا رہا ہے۔[1]

اس سلسلے کے چند نبوی ارشادات ذیل میں دیے جاتے ہیں:

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ! لَوْلَا أَنَّ رِجَالًا مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ لَا تَطِيبُ أَنْفُسُهُمْ أَنْ يَّتَخَلَّفُوا عَنِّي وَلَا أَجِدُ مَا أَحْمِلُهُمْ عَلَيْهِ مَا تَخَلَّفْتُ عَنْ سَرِيَّةٍ تَغْدُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ، وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ! لَوَدِدْتُّ أَنِّي أُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ، ثُمَّ أُحْيَا، ثُمَّ أُقْتَلُ، ثُمَّ أُحْيَا، ثُمَّ أُقْتَلُ، ثُمَّ أُحْيَا، ثُمَّ أُقْتَلُ»

''اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! اگر مومنین کی جماعت کے کچھ افراد ایسے نہ ہوتے جن کا دل مجھے چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہوتا اور مجھے خود اتنی سواریاں میسر نہیں کہ انھیں سوار کر کے اپنے ساتھ لے چلوں تو میں کسی لشکر سے پیچھے نہ رہتا جو اللہ کی راہ میں جہاد کے لیے نکلے۔ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! میری دلی تمنا ہے کہ اللہ کی راہ میں شہید کیا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں، پھر شہید کیا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں، پھر شہید کیا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں، پھر شہید کیا جاؤں۔''[2]

رسول اللہ ﷺ نے دوسرے موقع پر ارشاد فرمایا:

«مَا أَحَدٌ يَّدْخُلُ الْجَنَّةَ يُحِبُّ أَنْ يَّرْجِعَ إِلَى الدُّنْيَا وَ لَهُ مَا عَلَى الْأَرْضِ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا الشَّهِيدُ يَتَمَنّٰى أَنْ يَّرْجِعَ إِلَى الدُّنْيَا فَيُقْتَلَ

---

1 دراسات في السيرة النبوية للدكتور عماد الدين خليل، ص: 161. 2 صحيح البخاري، حديث: 2797، و السنن الكبرٰى للنسائي: 8/6.

عَشْرَ مَرَّاتٍ لِّمَا يَرٰى مِنَ الْكَرَامَةِ»

”جو شخص جنت میں جائے گا وہ دنیا میں آنا پسند نہیں کرے گا، چاہے اسے دنیا کی ساری دولت مل جائے، البتہ شہید نے (جنت میں) جس عزت واکرام کا مشاہدہ کیا اس بنا پر وہ دنیا میں آنے کی اور اللہ کی راہ میں دس بار قتل ہونے کی آرزو کرے گا۔“ [1]

② **عملی مشق:** اس ضمن میں رسول اللہ ﷺ نے امت کے تمام افراد کی ممکنہ صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کی بھرپور کوشش کی اور نیزہ بازی، تیراندازی، شمشیرزنی اور گھڑسواری جیسے فنونِ حرب وضرب کی عملی مشق کا اہتمام کیا۔ آپ ﷺ نے عسکری تربیت کے مختلف پہلوؤں پر پوری توجہ صرف کی اور فوج کی جسمانی تربیت کے علاوہ اُنھیں فتح یا شہادت کے حصول کا یقین دلایا، اُن کا حوصلہ بلند کیا اور مجاہدین کے دلوں میں یہ جذبہ پیدا کیا کہ وہ میدانِ قتال میں خوب خوب دادِ شجاعت دیں گے۔ آپ ﷺ نے مسلمانوں کو فنونِ حرب وضرب میں کامل مہارت بہم پہنچانے کی تاکید کی اور فرمایا:

«مَنْ عَلِمَ الرَّمْيَ ثُمَّ تَرَكَهُ فَلَيْسَ مِنَّا، أَوْ قَدْ عَصٰى»

”جس نے نشانہ بازی سیکھی، پھر اسے ترک کردیا وہ ہم میں سے نہیں، یا فرمایا: اس نے نافرمانی کی۔“ [2]

یہ کہہ کر گویا رسول اللہ ﷺ نے بلا استثنا تمام افرادِ امت کو اس امر کی دعوت دی تھی کہ وہ نشانہ بازی کی عملی مشق کا اہتمام کریں، جسمانی طور پر چاق و چوبند رہیں اور سستی و کاہلی چھوڑ کر چستی اور سرگرمی کو اپنی عادت بنائیں۔ بلاشبہ اسلام اپنے پیروکاروں کو قوتیں مجتمع رکھنے اور بلندیوں کے سفر پر کمر بستہ رہنے کی تعلیم دیتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ مسلمانوں کو موقع محل کی مناسبت سے جنگی تیاری کرنے کی تلقین کرتے اور انھیں ابھارتے کہ وہ اس

1 صحيح البخاري، حديث: 2817. 2 صحيح مسلم، حديث: 1919، وسنن ابن ماجه، حديث: 2814، و مسند أحمد: 4/148.

سلسلے کے تمام وسائل و ذرائع استعمال میں لا کر اپنے تئیں فنونِ حرب کو ترقی دینے کی سعی کریں۔ چنانچہ فرمایا: ﴿وَ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ﴾ أَلَا إِنَّ الْقُوَّةَ الرَّمْيُ! أَلَا إِنَّ الْقُوَّةَ الرَّمْيُ! أَلَا إِنَّ الْقُوَّةَ الرَّمْيُ!»

''اور ان کے مقابلے کو مقدور بھر قوت تیار کر رکھو۔ اور خوب جان لو کہ قوت نشانہ بازی میں ہے۔ ہاں ہاں! قوت نشانہ بازی میں ہے۔ بلاشبہ قوت نشانہ بازی میں ہے۔'' [1]

قرآن کریم اور سنت نبوی نے مسلمانوں کو نفسیاتی و مادی دونوں محاذوں پر بھرپور طریقے سے تیاری کا درس دیا اور انتباہ کیا ہے کہ اپنے بچاؤ کا سامان تیار رکھیں۔ قرآن کریم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا خُذُوْا حِذْرَكُمْ فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ اَوِ انْفِرُوْا جَمِيْعًا ۝﴾

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تم اپنے بچاؤ کا سامان لے لو، پھر تم الگ الگ دستوں کی شکل میں یا اکٹھے ہو کر نکلو۔'' [2]

یہ قرآنی حکم نہایت وضاحت سے اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ مسلمانوں کے لیے دشمن کی چالوں سے بچاؤ کا سامان کرنا ضروری ہے۔ اسلحے کی تیاری، فوج کے لیے اُس کے استعمال کی مشق اور جسمانی تربیت سب اسی بچاؤ کے سامان کا حصہ ہیں۔ یہاں یہ نکتہ قابلِ بیان ہے کہ حق تعالیٰ شانہ نے اسلحے اور قوت کی تیاری کا عام حکم دیا ہے جس میں کسی قید یا شرط کا شائبہ نہیں۔ آیت میں خاص نوع کے اسلحے یا خاص قسم کے حالات کا ذکر نہیں کیا گیا۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ حالات مختلف ہو سکتے ہیں، ہتھیاروں کی نوعیت بدل سکتی ہے، دشمن کی تعداد اور قوت میں کمی بیشی کا امکان بھی ہے لیکن مسلمانوں کو ہر قسم کی صورتحال سے نمٹنے کے لیے تیار رہ کر میسر اسلحے کو کام میں لانا چاہیے۔

[1] صحيح مسلم، حديث: 1917، و سنن أبي داود، حديث: 2514، و جامع الترمذي، حديث: 3083، و سنن ابن ماجه، حديث: 2813. [2] النسآء 4:71 .

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے نزدیک جہاد کی حیثیت ایک عظیم روحانی درس گاہ کی تھی جس میں انھیں تزکیۂ نفس کی تربیت دی جاتی تھی۔ انھیں اس امر کا بخوبی ادراک تھا کہ جہاد کے مطلوبہ ثمرات حاصل کرنے کے لیے اللہ کی خاطر مخلص ہونا اور اُن تعلیمات پر عمل کرنا پڑے گا جنھیں وہ دل و جان سے تسلیم کر چکے تھے اور انھوں نے لوگوں کو اُن روشن آیات پر ایمان لانے کی دعوت دی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ رسول اللہ ﷺ نے انھیں اعمال میں ریا کاری کی سنگین نوعیت سے پوری طرح آگاہ کر دیا تھا۔ آپ ﷺ نے انھیں صاف صاف بتا دیا تھا:

«إِنَّ أَوَّلَ النَّاسِ يُقْضٰى يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَلَيْهِ، رَجُلٌ اسْتُشْهِدَ، فَأُتِيَ بِهِ فَعَرَّفَهُ نِعْمَتَهُ فَعَرَفَهَا، قَالَ: فَمَا عَمِلْتَ فِيهَا؟ قَالَ: قَاتَلْتُ فِيكَ حَتَّى اسْتُشْهِدْتُّ، قَالَ: كَذَبْتَ، وَ لٰكِنَّكَ قَاتَلْتَ لِأَنْ يُّقَالَ جَرِيءٌ، فَقَدْ قِيلَ، ثُمَّ أُمِرَ بِهِ فَسُحِبَ عَلٰى وَجْهِهِ حَتّٰى أُلْقِيَ فِي النَّارِ، وَرَجُلٌ تَعَلَّمَ الْعِلْمَ وَ عَلَّمَهُ وَ قَرَأَ الْقُرْآنَ، فَأُتِيَ بِهِ، فَعَرَّفَهُ نِعَمَهُ فَعَرَفَهَا. قَالَ: فَمَا عَمِلْتَ فِيهَا؟ قَالَ: تَعَلَّمْتُ الْعِلْمَ وَ عَلَّمْتُهُ وَقَرَأْتُ فِيكَ الْقُرْآنَ. قَالَ: كَذَبْتَ وَ لٰكِنَّكَ تَعَلَّمْتَ الْعِلْمَ لِيُقَالَ عَالِمٌ، وَّ قَرَأْتَ الْقُرْآنَ لِيُقَالَ هُوَ قَارِئٌ، فَقَدْ قِيلَ، ثُمَّ أُمِرَ بِهِ فَسُحِبَ عَلٰى وَجْهِهِ حَتّٰى أُلْقِيَ فِي النَّارِ، وَ رَجُلٌ وَسَّعَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ أَعْطَاهُ مِنْ أَصْنَافِ الْمَالِ كُلِّهِ، فَأُتِيَ بِهِ فَعَرَّفَهُ نِعَمَهُ فَعَرَفَهَا، قَالَ: فَمَا عَمِلْتَ فِيهَا؟ قَالَ: مَا تَرَكْتُ مِنْ سَبِيلٍ تُحِبُّ أَنْ يُّنْفَقَ فِيهَا إِلَّا أَنْفَقْتُ فِيهَا لَكَ، قَالَ: كَذَبْتَ، وَ لٰكِنَّكَ فَعَلْتَ لِيُقَالَ هُوَ جَوَادٌ، فَقَدْ قِيلَ، ثُمَّ أُمِرَ بِهِ فَسُحِبَ عَلٰى وَجْهِهِ، ثُمَّ أُلْقِيَ فِي النَّارِ»

’’روزِ قیامت سب سے اوّل جس آدمی کا حساب چکتا کیا جائے گا وہ ایک شہید ہوگا۔ اُسے لایا جائے گا۔ رب تعالیٰ اُسے اپنے انعامات یاد دلائے گا۔ وہ اقرار کرے گا۔ اللہ رب العزت دریافت فرمائے گا: ’’تو نے اس کے بدلے میں کیا عمل کیا؟‘‘ شہید جواب دے گا: ’’میں نے تیری راہ میں جنگ کی اور شہید کردیا گیا۔‘‘ حق تعالیٰ شانہٗ فرمائے گا: ’’جھوٹ بولتے ہو تم۔ بلکہ تم اس لیے لڑتے رہے کہ تمھیں جری اور بہادر کے القابات دیے جائیں۔ اور یہ ہوچکا۔ تمھیں لوگوں کی طرف سے یہ خطاب مل گیا۔‘‘ پھر اُس کے متعلق حکم دیا جائے گا اور اُسے منہ کے بل گھسیٹ کر آگ میں پھینک دیا جائے گا۔

اس کے بعد دوسرا آدمی لایا جائے گا جس نے قرآن پڑھا اور علم سیکھا اور سکھایا تھا۔ اللہ تعالیٰ اُس کے سامنے اپنی نعمتوں کا ذکر فرمائے گا۔ پس وہ اعتراف کرے گا۔ اب اللہ تعالیٰ پوچھے گا: ’’اس کے بدلے میں تو نے کیا عمل کیا؟‘‘ قاریِ قرآن جواباً کہے گا: ’’میں نے علم سیکھا اور سکھایا اور تیرے لیے قرآن کی تلاوت کرتا رہا۔‘‘

اللہ تعالیٰ فرمائے گا: ’’تو نے جھوٹ بولا۔ تو نے تو علم اس لیے حاصل کیا کہ عالم کہلایا جائے اور قرآن اس واسطے پڑھا کہ تمھیں قاری کہا جائے۔ پس یہ کہہ دیا گیا۔‘‘ پھر حکم ہوگا اور اُسے بھی چہرے کے بل کھینچ کر دوزخ میں ڈال دیا جائے گا۔

اب تیسرا شخص حاضر کیا جائے گا جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے مال و دولت فراواں کردیا تھا۔ رب تعالیٰ اُسے اپنے انعام و اکرام یاد دلائے گا۔ وہ سرِتسلیم خم کرے گا۔ حق تعالیٰ شانہ دریافت فرمائے گا: ’’اس کے بدلے میں تم نے کیا عمل کیا؟‘‘ وہ بولے گا: ’’میں نے اپنا مال ہر اُس مد میں صرف کیا جس میں خرچ کرنا تجھے پسند ہے۔‘‘ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: ’’تم غلط کہتے ہو۔ تم تو بس اتنا چاہتے تھے کہ

تمھاری سخاوت کے چرچے ہوں۔ اور یہ ہو چکا۔" رب تعالیٰ کے اذن سے اُسے بھی منہ کے بل گھسیٹ کر جہنم میں جھونک دیا جائے گا۔"[1]

یہی باعث تھا کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین جہاد کی راہ میں اخلاص کے خوشنما زیور سے آراستہ تھے۔ اُن کی گفتار اللہ تعالیٰ کے لیے تھی۔ رضائے الٰہی کی خاطر وہ اپنا مال بے دریغ لٹاتے تھے۔ اعلائے کلمۃ اللہ اور دین اسلام کے دفاع میں انھوں نے اپنا تن من دھن نچھاور کر دیا تھا۔ تزکیۂ نفس کے باب میں جہاد فی سبیل اللہ نے صحابۂ کرام کے قلوب پر گہرے اثرات مرتب کیے تھے۔ درج ذیل سطور میں ان اثرات کے مختلف پہلوؤں کا تذکرہ قدرے تفصیل سے کیا جاتا ہے:

جہاد فی سبیل اللہ کے اثرات

دنیاوی محبت اور اُس کے علائق سے نجات: جہاد فی سبیل اللہ زہد و تقویٰ، فکر آخرت اور جنت کی ہمیشہ رہنے والی نعمتوں کے شوق کی عملی مشق کا نام ہے۔ تزکیۂ نفس کے سلسلے میں منہج اسلامی کا مطمح نظر بھی یہی ہے۔ مجاہد حصول رضائے الٰہی کی خاطر اپنی متاع گراں مایہ" جان" کا سودا کرتا ہے اور اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ جو جاں آفریں ہے، اُس کی نوازشوں کے بھی کیا کہنے! وہ اپنے مجاہد بندوں کا یوں اکرام کرتا ہے کہ وہی شے اُن سے خرید لیتا ہے جو خود اُنھیں بخشی تھی۔ جبکہ بندے اُسے فروخت کرنے پر آمادہ ہو جائیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُم بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ۚ﴾

"بے شک اللہ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور ان کے مال جنت کے بدلے میں خرید لیے ہیں۔"[2]

تزکیہ نفس، صبر اور جاں نثاری کی تربیت: نبی کریم ﷺ کے فیضِ تعلیم و تربیت سے

---

1 صحيح مسلم، حديث: 1905، و مسند أحمد: 322/2، و السنن الكبرىٰ للنسائي: 23/6.

2 التوبة 111:9. منهج الإسلام في تزكية النفس للدكتور أنس أحمد كرزون: 293/1.

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو گہرا احساس تھا کہ جنت کا راستہ مشکلات و مصائب کے کانٹوں سے پُر ہے۔ اُنھیں علم تھا کہ ایسی پر خار راہ گزر پر چل کر منزل مقصود تک رسائی پانا اس کے بغیر ناممکن ہے کہ راحت و آرام کی قطعی پروانہ کی جائے۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ نفس و بدن کو مشقت برداشت کرنے اور کٹھن راہوں پر چلتے رہنے کا عادی بنایا جائے تاکہ اُس کی عمارت مضبوط ہو، وہ سستی، کاہلی اور سہل انگاری ترک کردے اور آزمائشوں اور صعوبتوں کے طوفان میں جم کر کھڑے رہنے کی صلاحیت سے بہرہ یاب ہو۔

صحابۂ کرام نے قرآن مجید سے یہ سبق سیکھا تھا کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی بے پایاں حکمت کا تقاضا ہے کہ انسانی نفس کو ابتلاء و آزمائش کی بھٹی سے گزار کر کندن کیا جانا چاہیے اور یہ کہ جانچ پرکھ کی اس کارروائی کے لیے میدان جہاد سب سے زیادہ موزوں ہے۔[1]

ارشاد ربانی ہے:

﴿إِن يَمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهُ ۚ وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَيَتَّخِذَ مِنكُمْ شُهَدَاءَ ۗ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ ○ وَلِيُمَحِّصَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَيَمْحَقَ الْكَافِرِينَ ○ أَمْ حَسِبْتُمْ أَن تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللَّهُ الَّذِينَ جَاهَدُوا مِنكُمْ وَيَعْلَمَ الصَّابِرِينَ ○ وَلَقَدْ كُنتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِن قَبْلِ أَن تَلْقَوْهُ فَقَدْ رَأَيْتُمُوهُ وَأَنتُمْ تَنظُرُونَ ○﴾

”اگر تمھیں (احد میں) زخم لگے ہیں تو ایسے ہی زخم (بدر میں) کافروں کو بھی لگ چکے ہیں۔ ہم ان دنوں کو لوگوں کے درمیان ادل بدل کرتے رہتے ہیں۔ اور (تمھیں یہ زخم اس لیے لگے کہ) اللہ جاننا چاہتا تھا کہ کون ایمان والے ہیں؟ اور وہ تم میں سے بعض کو شہادت کا مرتبہ دینا چاہتا تھا اور اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔

1 منهج الإسلام في تزكية النفس للدكتور أنس أحمد كرزون:1/294.

اور (ایک وجہ یہ تھی کہ) اللہ ایمان والوں کو پاک صاف کردینا اور کافروں کو مٹا دینا چاہتا تھا۔ کیا تم یہ سمجھ بیٹھے ہو کہ تم (سیدھے) جنت میں داخل ہوجاؤ گے، حالانکہ ابھی اللہ نے یہ تو دیکھا ہی نہیں کہ تم میں سے کون لوگ اس کی راہ میں جانیں لڑانے والے اور صبر کرنے والے ہیں، تحقیق تم جنگ سے پہلے ہی موت (شہادت) کی خواہش کرتے تھے، چنانچہ پس اب تم نے اسے اپنی آنکھوں سے اپنے سامنے دیکھ لیا ہے۔" [1]

جہاد عزت نفس کا محافظ: صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے نبوی تعلیمات کی روشنی میں یہ علم حاصل کیا کہ جہاد فی سبیل اللہ مسلمان کی عزت نفس کی بڑھوتری، تقویت اور اسے ذلت وحقارت کے احساس سے نکالنے کا باعث ہے۔ یہ امر شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ احساس کمتری فرد اور معاشرے کے لیے زہر قاتل کا درجہ رکھتا ہے، چنانچہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے اپنی کتابِ عزیز میں اعلان کیا ہے کہ ایک مسلمان عزت نفس کے معاملے میں غیور ہوتا ہے، اس لیے کہ اُس نے یہ عزت اپنے ایمان اور دین حق پر اپنی ثابت قدمی کی بدولت حاصل کی ہوتی ہے۔ کتابِ عزیز میں صاف صاف ارشاد ہے:

﴿وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝﴾

"اور عزت اللہ ہی کے لیے ہے اور اس کے رسول کے لیے اور مومنوں کے لیے لیکن منافق (اس حقیقت کو) نہیں جانتے۔" [2]

لیکن نہایت تاسف سے کہنا پڑتا ہے کہ مسلمانوں نے جہاد سے کنارہ کشی کر لی اور آخرت کی فکر چھوڑ کر دنیا کی رنگینیوں میں کھو گئے جس کا لازمی اور بھیانک نتیجہ یہ نکلا کہ سارے جہان کی ذلت ورسوائی اُن کا مقدر ٹھہری اور اُن کا قومی مورال اس حد تک گر گیا کہ وہ ذلت وپستی کے خوگر ہوگئے۔ رسول اللہ ﷺ نے اسی کیفیت کی پیش گوئی کرتے

[1] آل عمرٰن 3:140-143۔ [2] المنٰفقون 63:8۔

ہوئے فرمایا تھا:

«إِذَا تَبَايَعْتُمْ بِالْعِينَةِ وَ أَخَذْتُمْ أَذْنَابَ الْبَقَرِ وَ رَضِيتُمْ بِالزَّرْعِ وَتَرَكْتُمُ الْجِهَادَ سَلَّطَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ ذُلًّا، لَا يَنْزِعُهُ حَتّٰى تَرْجِعُوا إِلٰى دِينِكُمْ»

''جب تم عینہ [1] کی بیع کرنے لگو گے، بیلوں کی دُمیں پکڑ لو گے، کھیتی باڑی ہی پر مطمئن ہو جاؤ گے اور جہاد چھوڑ بیٹھو گے تو اللہ تم پر ایسی ذلت مسلط کر دے گا جو کسی طرح زائل نہیں ہوگی حتی کہ تم اپنے دین کی طرف لوٹ آؤ۔'' [2]

جو آدمی حصولِ دنیا کو اپنا نصب العین قرار دے اور متاعِ دنیا ہی اُس کی علمی و عملی جدوجہد کا مرکز ومحور ٹھہرے تو وہ کتاب اللہ کی اس آیت کا صحیح مصداق ہے:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا وَرَضُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاطْمَاَنُّوْا بِهَا وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنْ اٰيٰتِنَا غٰفِلُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمُ النَّارُ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝﴾

''بے شک وہ لوگ جو ہماری ملاقات کی امید نہیں رکھتے اور وہ دنیاوی زندگی پر راضی اور اسی پر مطمئن ہیں اور وہ لوگ جو ہماری نشانیوں سے غافل ہیں، وہی ہیں جن کا ٹھکانا دوزخ ہے ان (عملوں) کی وجہ سے جو وہ کماتے تھے۔'' [3]

اور اسی طرح ارشادِ نبوی بھی ہے:

«مَنْ مَّاتَ وَ لَمْ يَغْزُ، وَ لَمْ يُحَدِّثْ بِهِ نَفْسَهُ، مَاتَ عَلٰى شُعْبَةٍ مِّنْ نِّفَاقٍ»

[1] بیع عینہ کی صورت یہ ہے کہ کوئی شخص کسی کو ادھار قیمت پر مال حوالے کر دے مگر قیمت وصول کرنے سے پہلے ہی اس سے وہی مال دوبارہ خرید لے اور اپنی قیمت فروخت سے کم میں خرید لے اور پھر زائد قیمت وصول کر لے۔ [2] سنن أبي داود، حديث: 3462، و مسند أحمد: 42/2 و 84. [3] يونس 10:7، 8.

''جو شخص اس حال میں مرا کہ اس نے جہاد نہ کیا، نہ دل میں کبھی جہاد کا خیال آیا، وہ نفاق کی ایک شاخ پر مرا۔'' [1]

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے جہادِ فی سبیل اللہ کا راستہ اختیار کیا اور اس عظیم خوشخبری کے مستحق ہوئے:

﴿وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝﴾

''اور جو لوگ ہماری راہ میں جہاد کریں ہم انھیں اپنی راہیں ضرور دکھاتے ہیں اور یقیناً اللہ نیکی کرنے والوں کے ساتھ ہے۔'' [2]

جہادِ فی سبیل اللہ کے اہداف و مقاصد

اسلامی عقیدے کی آزادی کا تحفظ

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَوْلٰىكُمْ ۭ نِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ ۝﴾

''اور تم ان سے لڑو حتی کہ فتنہ (شرک) نہ رہے اور (ہر کہیں) سارے کا سارا دین اللہ ہی کا ہو، پھر اگر وہ (کافر) باز آ جائیں تو بے شک اللہ ان کے کاموں کو خوب دیکھ رہا ہے۔ اور اگر وہ پھریں تو جان لو کہ یقیناً اللہ ہی تمھارا کارساز ہے، وہ بہترین کارساز اور بہترین مددگار ہے۔'' [3]

سید قطب اس آیت کریمہ کی تفسیر میں لکھتے ہیں: ''مسلم امہ کے لیے ایک اور بات بھی ضروری ہے کہ وہ اسلامی دعوت کی راہ میں حائل ہر قوت کا قلع قمع کرے جو دینِ حق

[1] صحیح مسلم، حدیث: 1910، وسنن أبي داود، حدیث: 2502، ومسند أحمد: 374/2، والسنن الکبرٰی للنسائي: 8/6. [2] العنکبوت 69:29. [3] الأنفال 40,39:8.

کی آزادانہ تبلیغ میں رکاوٹ بنتی ہو یا اس نے عوام الناس کو دین حق کی قبولیت سے روک رکھا ہو اور لوگ اس کے ڈر سے دین اسلامی کے فیوض و برکات سے محروم ہوں۔ یہ امر یقینی بنانے کے لیے لازم ہے کہ مسلمان جہاد کرتے رہیں، حتیٰ کہ روئے زمین پر کسی باطل قوت کے لیے ممکن نہ ہو کہ وہ اہلِ ایمان کو دین کی تبلیغ یا اُس کے احکامات نافذ کرنے سے روک دے یا عامۃ الناس کو دین میں داخل ہونے سے منع کردے۔ یوں ہر سُو اسلام کا بول بالا ہوگا۔ لیکن بالادستی ان معنوں میں نہیں ہونی چاہیے کہ لوگوں کو دین اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا جائے بلکہ ان معنوں میں ہو کہ زمین پر اللہ کا دین سر بلند ہو، اس طرح کہ جو آدمی دین کے دائرے میں آنا اور اس پر ثابت قدم رہنا چاہے اُسے زمین کی کسی جھوٹی قوت کا خوف نہ ہو۔ اور کرۂ ارض پر کوئی قانون اور نظام ایسا باقی نہ رہے جو اللہ کے نور ہدایت کو پھیلنے سے روکے اور لوگوں کو حق کے راستے سے بھٹکانے کی کوشش کرے۔ اسلام کا تصورِ جہاد انھی اصول و مبادی کے تابع ہے۔ یہ جہاد عقیدۂ اسلامی کے تحفظ و بقا کی خاطر ہے۔ یہ جدوجہد شریعتِ اسلامی کے نفاذ کے لیے ہے۔ یہ تگ ودو زمین پر دین اسلامی کا پرچم سر بلند کرنے کی غرض سے ہے۔ اس دوڑ دھوپ کی غایت یہ ہے کہ شیطانی قوتوں کو دینِ حق اور اس کے پیروکاروں سے دست درازی کرنے کی ہمت نہ ہو۔ جو شخص دین کے سایے تلے آنے کا آرزومند ہو اُسے زمین کی کسی قوت سے یہ خدشہ نہیں ہونا چاہیے کہ وہ اس کے آڑے آئے گی یا قبولیت دین کے بعد اُسے اذیت رسانی کا نشانہ بنائے گی۔

یہ ہے وہ جہاد جس کا اسلام پر چار کرتا ہے۔ اسی پر وہ قائم ہے اور اسی کا حکم دیتا ہے۔ اسی جہاد میں جان دینے والے ''شہداء'' کے رتبے پر فائز ہوتے ہیں اور اسی کا بار اٹھانے والے اُس کے دوست ہیں۔[1]

[1] تفسیر في ظلال القرآن لسید قطب: 187/1.

عبادات اور مقاماتِ مقدسہ کا تحفظ

ارشادِ الٰہی ہے:

﴿إِنَّ اللَّهَ يُدَافِعُ عَنِ الَّذِينَ آمَنُوا ۗ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ خَوَّانٍ كَفُورٍ ○ أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا ۚ وَإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ ○ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِم بِغَيْرِ حَقٍّ إِلَّا أَن يَقُولُوا رَبُّنَا اللَّهُ ۗ وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَصَلَوَاتٌ وَمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللَّهِ كَثِيرًا ۗ وَلَيَنصُرَنَّ اللَّهُ مَن يَنصُرُهُ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ ○ الَّذِينَ إِن مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنكَرِ ۗ وَلِلَّهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ ○﴾

’’یقیناً اللہ ایمان والوں کا دفاع کرتا ہے، بے شک اللہ ہر خائن (اور) ناشکرے کو پسند نہیں کرتا۔ جن لوگوں سے لڑائی کی جاتی ہے انھیں (جہاد کی) اجازت دی گئی ہے، اس لیے کہ ان پر ظلم ہوا اور یقیناً اللہ ان کی مدد پر ضرور قادر ہے۔ وہ لوگ جنھیں ان کے گھروں سے ناحق نکال دیا گیا، صرف اس لیے کہ وہ کہتے ہیں: ہمارا رب اللہ ہے اور اگر اللہ لوگوں میں سے بعض کو بعض کے ذریعے سے دفع نہ کرتا تو بلاشبہ خانقاہیں اور گرجے اور (یہودی) عبادت خانے اور مسجدیں ڈھادی جاتیں جن میں اللہ کا نام بکثرت ذکر کیا جاتا ہے اور اللہ ضرور اس کی مدد کرے گا جو اس (کے دین) کی مدد کرے گا، بے شک اللہ یقیناً بہت قوت والا، خوب غالب ہے۔ (یہ) وہ لوگ (ہیں) کہ جنھیں اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں (تو) وہ نماز قائم کریں اور زکاۃ دیں اور نیکی کا حکم دیں اور برائی سے روکیں اور تمام امور کا انجام اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔‘‘ [1]

[1] الحج 22:38-41.

مفسر نسفی رحمہ اللہ نے اِن آیات کی تفسیر میں لکھا: ''مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جہاد کے ذریعے سے مسلمانوں کو کافروں پر غالب نہ کرتا تو ہر دور کے مشرکین دیگر اہل مذاہب پر تسلط جما لیتے اور اُن کی عبادت گاہیں پامال کر دیتے۔ وہ نصاریٰ کا کوئی گرجا، اُن کے راہبوں کی کوئی خانقاہ اور یہود کا کوئی معبد باقی نہ چھوڑتے اور نہ مسلمانوں کی مساجد کھڑی رہنے دیتے۔

یا پھر مراد ہے کہ امت محمدیہ کے مشرکین اہل ذمہ اور توحید پرست مسلمانوں پر غالب آ جاتے اور اُن کی عبادت گاہیں مسمار کر دیتے۔

آیت میں خانقاہوں، گرجوں اور یہود کے عبادت خانوں کا ذکر مساجد سے پہلے کیا گیا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ یہ عبادت گاہیں مساجد سے قبل موجود تھیں یا پھر یہ کہ وہ مساجد سے پہلے منہدم ہوئی تھیں۔''[1]

فساد فی الارض کا خاتمہ

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝﴾

''اور اگر اللہ انسانوں کے ایک (گروہ) کو دوسرے (گروہ) کے ذریعے سے ہٹاتا نہ رہتا تو یقیناً ساری زمین کا نظام بگڑ جاتا لیکن اللہ دنیا والوں پر بڑا فضل کرنے والا ہے۔''[2]

امام ابن کثیر رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں: ''اگر اللہ تعالیٰ ایک قوم کے ذریعے دوسروں کو نہ ہٹاتا تو وہ تباہ و ہلاک ہو جاتے جیسے اس نے بنی اسرائیل سے ان کے دشمن کو

---

[1] تفسیر النسفي: 106/3، و الكشاف للزمخشري: 16/3، و تفسیر المراغي: 119/6. [2] البقرة 251:2.

طالوت کے جہاد اور داود علیہ السلام کی شجاعت سے دور ہٹایا۔''[1]

اسی آیت کی تفسیر صاحب کشاف علامہ زمخشری نے یوں کی ہے: ''اگر ایسا نہ ہوتا کہ حق تعالیٰ شانہٗ بعض لوگوں کے ذریعے سے دوسروں کو ہٹاتا اور بعض کے واسطے سے بعض کی فساد انگیزی کا خاتمہ کرتا ہے تو دنیا پر فسادی چھا جاتے، زمین بگاڑ کا شکار ہوجاتی اور اُس کی منفعت جاتی رہتی۔ کھیت کھلیان ویران ہوجاتے، مخلوقات کی نشوونما متاثر ہوتی، افزائش نسل کا سلسلہ رک جاتا اور زمین کی سرسبزی و شادابی ختم ہوکر رہ جاتی۔''[2]

مفسر عبدالرحمٰن سعدی رحمہ اللہ نے آیت کے اہم نکات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا:

''اس آیت میں امت کے لیے کئی اسباق پوشیدہ ہیں۔ آیت میں جہاد کی فضیلت اور اُس کے فوائد و ثمرات کی ہلکی سی جھلک دکھائی گئی اور یہ بتایا گیا ہے کہ جہاد دین، وطن، جسم و جاں اور مال و متاع کے تحفظ کا واحد ذریعہ ہے۔ اس امر کا اظہار بھی کیا گیا ہے کہ مجاہدین اگرچہ کٹھن راہوں کی جادہ پیمائی کرتے ہیں لیکن بالآخر کامیابی اُن کے قدم چومتی ہے اور وہ اچھے انجام سے ہمکنار ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس جہاد سے کنارہ کشی کرنے والے بزدل لوگ وقتی طور پر آرام ضرور کرتے ہیں لیکن آخر میں نہ ختم ہونے والی تھکن اور پشیمانی اُن کا مقدر ٹھہرتی ہے۔''[3]

آزمائش، تربیت اور اصلاح

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ذٰلِكَ ۛ وَلَوْ يَشَآءُ اللّٰهُ لَانْتَصَرَ مِنْهُمْ وَلٰكِنْ لِّيَبْلُوَاْ بَعْضَكُمْ بِبَعْضٍ ۗ وَالَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَلَنْ يُّضِلَّ اَعْمَالَهُمْ ○﴾

''(حکم) یہی ہے اور اگر اللہ چاہتا (تو خود ہی) ان سے بدلہ لے لیتا لیکن (اس

---

[1] تفسير ابن كثير:1/262. [2] تفسير الكشاف للزمخشري:1/382، وتفسير أبي السعود:1/245.
[3] تفسير السعدي:1/309.

نے تمھیں حکم دیا ہے) تاکہ وہ تمھیں ایک دوسرے سے آزمائے اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل (شہید) کیے گئے تو اللہ ان کے اعمال ہرگز ضائع نہیں کرے گا۔'' [1]

امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے ﴿ وَلٰكِنْ لِّيَبْلُوَاْ بَعْضَكُمْ بِبَعْضٍ ﴾ کی تفسیر میں لکھا ہے:
''مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جہاد و قتال کو احکام شریعت کی فہرست میں شامل کیا تاکہ تمھارا امتحان کرلے اور تمھیں آزمائے۔ باری تعالیٰ نے دین میں جہاد کو فرض قرار دینے کی حکمت اس آیت میں بھی بیان فرمائی ہے:

﴿ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ ○ ﴾

''کیا تم یہ سمجھ بیٹھے ہو کہ تم (سیدھے) جنت میں داخل ہو جاؤ گے، حالانکہ ابھی اللہ نے یہ تو دیکھا ہی نہیں کہ تم میں سے کون لوگ اس کی راہ میں جانیں لڑانے والے اور صبر کرنے والے ہیں۔'' [2]

سید قطب رقم طراز ہیں: ''اللہ رب العزت نے اہل ایمان کو یہ حکم دیا کہ وہ کافروں کی گردنیں مارنے اور اچھی طرح خونریزی کرنے کے بعد انھیں قیدی بنائیں تو گویا اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے اہل ایمان کو اپنی قدرت کے لیے حجاب بنایا۔ وہ چاہتا تو کافروں سے بذات خود انتقام لے لیتا لیکن وہ اپنے مومن بندوں کی بہتری اور بھلائی کا ارادہ کرتا ہے، چنانچہ ارشاد فرمایا:

﴿ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۗ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ○ ﴾

''تم پر جہاد فرض کر دیا گیا ہے اور وہ تمھارے لیے ناگوار ہے اور ممکن ہے کہ تم کسی

---

[1] محمد 47:4. [2] آل عمرٰن 3:142، و تفسیر ابن کثیر: 4/154.

چیز کو ناپسند کرو اور وہ تمھارے لیے بہتر ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو پسند کرو اور وہ تمھارے لیے بری ہو اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔'' [1]

دراصل رب تعالیٰ شانہٗ اپنے بندوں کو آزماتا، اُن کی تربیت و اصلاح کرتا اور اُن کے لیے کار ہائے نمایاں انجام دینے کی راہیں ہموار کرتا ہے۔ اس اجمال کی قدرے تفصیل ذیل میں لکھی جاتی ہے:

آزمائش: اللہ تعالیٰ آزمائش کے ذریعے سے مومنین کے دلوں میں ایک ایسا جذبہ پیدا کرنا چاہتا ہے جس سے عظیم تر جذبہ کسی انسان کے دل میں پیدا نہیں ہوسکتا۔ اس سے بڑھ کر پُرعظمت جذبہ اور کیا ہوگا کہ آدمی جس بات کو حق جانتے ہوئے اُس پر ایمان لے آئے، وہ اُس کی زندگی میں ایسی اہمیت اختیار کر جائے کہ آدمی اُس کی بقا کے لیے مرنے مارنے پر اتر آئے۔ اُس کے علاوہ اور کوئی بات آدمی کی نظروں میں نہ جچے۔ وہ اُس پر دل و جان سے نچھاور ہو اور اُس کے بغیر زندگی کا تصور محال ہو۔

تربیت: اللہ تعالیٰ مومنین کے دلوں سے فانی دنیا کے مال و متاع کی رغبت اور نفسانی خواہش نکال باہر کرتا ہے۔ یوں اُن کے قلوب تمام نقائص سے پاک ہوجاتے ہیں اور حالت یہ ہو جاتی ہے کہ میزان کے ایک پلڑے میں اُن کی آرزوئیں رکھی جائیں اور دوسرے میں شوق جہاد، حصول رضائے الٰہی کے جذبے اور اللہ تعالیٰ سے ملاقات کی تمنا کو رکھا جائے تو یقیناً دوسرا پلڑا ہی بھاری ہوگا۔ اُنھیں نیکی اور بدی کے دونوں راستے دکھائے گئے ہیں لیکن انھوں نے نیکی کے راستے کا انتخاب کیا۔ اُنھیں یہ عرفان تربیت الٰہی کے طفیل حاصل ہوا ہے۔ اب وہ بنا سوچے سمجھے ایک راہ پر نہیں چل پڑیں گے بلکہ اوّل غور و فکر کریں گے، تدبر سے کام لیں گے، پھر انتخاب کریں گے۔

اصلاح: جہاد فی سبیل اللہ میں موت سے پنجہ آزمائی کا عمل نفسِ انسانی کو خطرات سے

[1] البقرۃ 2:216.

کھیلنے کا عادی بنا دیتا ہے۔ جنگ کی خوفناکیاں اُس کے نزدیک بے معنی ہو کر رہ جاتی ہیں۔ معرکہ آرائی کے نازک لمحوں میں اللہ کی مدد کا خیال قلب و روح کو بالیدگی بخشتا اور انھیں صدق و صفا اور اخلاص کے نئے سانچے میں ڈھال دیتا ہے۔

یہ بات طے ہے کہ نوع انسانی کی اصلاح کے لیے یہی طریقے کارگر ہیں۔ لیکن شرط یہ ہے کہ قیادت مجاہدین کے ہاتھ میں ہو جن کے قلوب دنیا اور اُس کے مال و متاع کی محبت سے خالی ہوتے ہیں۔ وہ اللہ کی راہ میں چلتے ہوئے موت کی وادیوں میں اترتے ہیں۔ اُن کے دل اللہ کی یاد سے غافل نہیں ہوتے۔ اُس کی رضا جوئی اُن کا مطمحِ نظر ٹھہرتی ہے۔ بنی آدم کی قیادت ایسے افراد کے ہاتھوں میں آئے گی تو روئے زمین پر اصلاح اور فلاح و بہبود کا عمل جاری و ساری ہوگا اور لوگوں کے حالات میں بہتری آئے گی۔ ایسے قائدین کو کسی طرح گوارا نہیں ہوگا کہ وہ زمام اقتدار کافروں اور گمراہان ملت کے ہاتھوں میں جانے دیں جبکہ اُنھوں نے اُسے نقد جاں کی قربانی دے کر حاصل کیا تھا۔"[1]

کافروں کو دہشت زدہ، مرعوب و رسوا کرنا اور اُن کی تدابیر کو ناکارہ کرنا

ارشادِ ربانی ہے:

﴿وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ اللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ۝﴾

"اور ان (کافروں کے مقابلے) کے لیے تم مقدور بھر قوت اور بندھے ہوئے گھوڑے تیار رکھو جن سے تم اللہ کے دشمنوں اور اپنے دشمنوں کو اور ان کے علاوہ دوسروں کو ڈرائے رکھو جنھیں تم نہیں جانتے (مگر) اللہ انھیں جانتا ہے اور تم اللہ کی راہ میں جو کچھ خرچ

1 تفسير في ظلال القرآن لسيد قطب:3286/6.

کروگے تمھیں (اس کا) پورا پورا ثواب دیا جائے گا۔اور تم پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔‘‘ [1]

اللہ جل شانہٗ نے دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿قٰتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ وَيُخْزِهِمْ وَيَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَيَشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ وَيُذْهِبْ غَيْظَ قُلُوْبِهِمْ ۭ وَيَتُوْبُ اللّٰهُ عَلٰي مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝﴾

’’ان سے (خوب) لڑائی کرو، اللہ انھیں تمھارے ہاتھوں سے عذاب دے گا اور انھیں رسوا کرے گا اور ان کے خلاف تمھاری مدد کرے گا اور مومنوں کے سینوں کو شفا (ٹھنڈک) بخشے گا۔ اور وہ ان کے دلوں کا غصہ دور کرے گا اور اللہ جس پر چاہے توجہ فرماتا ہے۔ اور اللہ خوب جاننے والا، خوب حکمت والا ہے۔‘‘ [2]

مزید ارشادِ الٰہی ہے:

﴿فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ ۠ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ۚ وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِيْنَ مِنْهُ بَلَاۗءً حَسَنًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ ذٰلِكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ مُوْهِنُ كَيْدِ الْكٰفِرِيْنَ ۝﴾

’’چنانچہ تم نے انھیں قتل نہیں کیا بلکہ اللہ ہی نے انھیں قتل کیا اور (اے نبی!) جب آپ نے (مٹھی بھر خاک ان کی طرف) پھینکی تو وہ آپ نے نہیں پھینکی بلکہ اللہ نے پھینکی اور تاکہ وہ مومنوں کو اپنی طرف سے اچھے انعام سے نوازے، بے شک اللہ خوب سننے والا، خوب جاننے والا ہے۔ یہ تھی بات (ہماری حکمت) اور بے شک اللہ کافروں کی چال کمزور کرنے والا ہے۔‘‘ [3]

منافقین کی پردہ دری

رب تعالیٰ نے فرمایا:

---

[1] الأنفال 8:60. [2] التوبة 9:14,15. [3] الأنفال 8:17,18.

﴿مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَلَكُمْ اَجْرٌ عَظِيْمٌ۝﴾

''اللہ مومنوں کو اس حالت میں ہرگز نہ رہنے دے گا جس میں تم اس وقت ہو، یہاں تک کہ وہ پاک کو ناپاک سے علیحدہ کردے اور اللہ کا یہ طریقہ نہیں کہ وہ تم پر غیب ظاہر کرے لیکن اللہ اپنے رسولوں میں سے جسے چاہتا ہے (غیب کی باتیں بتانے کے لیے) چن لیتا ہے، پس تم ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسولوں پر اور اگر تم ایمان لاؤ گے اور پرہیزگاری اختیار کرو گے تو تمھارے لیے بہت بڑا اجر ہے۔'' [1]

امام ابن کثیر رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں: ''مطلب یہ ہے کہ ابتلاء و آزمائش کا سلسلہ قائم کرنا ضروری ہے تاکہ اللہ کے دوست اور دشمن کھل کر سامنے آ جائیں۔ باصبر مومن اور منافق فاجر بھی آشکار ہو جائیں۔ اس سے مراد یوم احد ہے جس روز اللہ تعالیٰ نے مومنین کا امتحان لیا۔ یوں اُن کا ایمان اور صبر و ثبات ظاہر ہوگیا اور معلوم ہوا کہ یہی سعادت مند افراد اللہ تعالیٰ کے سچے اطاعت گزار ہیں۔ اُس دن حق تعالیٰ شانہٗ نے منافقین کا پردہ چاک کیا، چنانچہ دین کے لیے اُن کے مخالفانہ عزائم عیاں ہوگئے اور یہ بات شیشہ ہوئی کہ وہ جہاد سے کنی کتراتے ہیں اور اللہ و رسول سے مخلص نہیں ہیں۔'' [2]

اقامتِ دین

زمین پر اللہ کے دین کی حکمرانی قائم کرنا جہاد کے اہداف میں شامل ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ﴾

[1] آل عمرٰن 3:179. [2] تفسیر ابن کثیر: 371/1.

﴿ وَلَا تَكُنْ لِّلْخَآئِنِيْنَ خَصِيْمًا ۝﴾

''(اے نبی!) بے شک ہم نے آپ کی طرف یہ کتاب حق کے ساتھ نازل کی ہے تا کہ آپ کو اللہ نے جو سیدھی راہ دکھائی ہے اس کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلہ کریں اور آپ خیانت کرنے والوں کے حمایتی نہ بنیں۔''[1]

کافروں کے ظلم وستم کا خاتمہ

اسلام میں جہاد کی ایک غرض و غایت یہ بھی ہے کہ کافروں کے ظلم وستم کا خاتمہ کیا جائے۔

(ا) اُن کے ظلم وستم کی ایک جہت یہ ہے کہ وہ اپنے علاقے میں رہنے والی مجبور و بے بس مسلم اقلیت پر ظلم ڈھاتے ہیں۔ بالخصوص جبکہ مسلم اقلیت کے لیے ممکن نہ ہو کہ وہ ہجرت کر کے کسی اور علاقے میں منتقل ہو جائے جہاں اُس کا دین و ایمان سلامت رہے۔ ایسی صورتحال میں اسلامی ریاست کا فریضہ ہے کہ وہ ظالموں سے جہاد کرے اور مسلم اقلیت کو اُن کے چنگل سے چھڑائے۔[2] ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ فَلْيُقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يَشْرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ؕ وَمَنْ يُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيُقْتَلْ اَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝ وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۚ وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا ۝﴾

''پھر جو لوگ آخرت کے بدلے دنیا کی زندگی بیچ چکے ہیں، انھیں چاہیے کہ وہ اللہ کے راستے میں لڑیں اور جو شخص اللہ کے راستے میں لڑے، پھر وہ قتل کر دیا جائے یا غالب آ جائے تو ہم جلد اسے بہت بڑا اجر دیں گے۔ اور (اے مسلمانو!) تمھیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ کے راستے میں کمزور مردوں، عورتوں اور بچوں کی

---

1 النسآء 4:105. 2 الجهاد في سبيل الله للدكتور عبدالله القادري: 2/162.

خاطر نہیں لڑتے، جو کہتے ہیں: ”اے ہمارے رب! ہمیں اس بستی سے نکال کہ اس کے باشندے ظالم ہیں اور ہمارے لیے اپنی طرف سے کوئی حمایتی بھیج اور ہمارے لیے اپنی طرف سے کوئی مددگار بھیج۔“ [1]

امام قرطبی رحمہ اللہ نے آیت کے ذیل میں لکھا: ”یہ جہاد کی ترغیب ہے۔ کمزور و بے بس افراد کو کافروں اور مشرکین کے خونیں پنجے کی گرفت سے آزاد کرانا بھی اسی میں شامل ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اعلائے کلمۃ اللہ، غلبۂ دین اور بے بس مسلمانوں کو ظالم کافروں کے ستم سے بچانے کے لیے جہاد فرض قرار دیا۔ ہر چند اس راہ میں جانیں تلف ہوتی ہیں، امت مسلمہ پر واجب ہے کہ وہ مسلم قیدیوں کی بازیافت کے سلسلے میں کوشش کرے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے جنگ کرنی پڑے تو دریغ نہ کیا جائے، مال خرچ کرنا پڑے تو تردد نہ ہو، ویسے بھی انسانی جان کے مقابلے میں مال و متاع کی حیثیت ہی کیا ہے؟“ [2]

(ب) اور یہ کہ کافروں کے لشکر مسلم علاقوں پر حملہ آور ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ ○ وَاقْتُلُوهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ وَأَخْرِجُوهُم مِّنْ حَيْثُ أَخْرَجُوكُمْ ۚ وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۚ وَلَا تُقَاتِلُوهُمْ عِندَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتَّىٰ يُقَاتِلُوكُمْ فِيهِ ۖ فَإِن قَاتَلُوكُمْ فَاقْتُلُوهُمْ ۗ كَذَٰلِكَ جَزَاءُ الْكَافِرِينَ ○ فَإِنِ انتَهَوْا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ○﴾

”اور تم اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو (جہاد کرو) جو تم سے لڑتے ہیں اور تم زیادتی نہ کرو، بے شک اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اور تم انھیں جہاں بھی پاؤ ان کو قتل کر دو اور تم انھیں نکال دو جہاں سے انھوں نے تمھیں نکالا اور فتنہ قتل سے زیادہ سخت (گناہ) ہے اور تم ان سے مسجد حرام کے پاس نہ لڑو یہاں تک کہ

[1] النسآء 4:75,74. [2] تفسير القرطبي: 279/5.

وہ اس میں تم سے لڑیں، پھر اگر وہ تم سے لڑیں تو تم انھیں قتل کرو، ایسے کافروں کی یہی سزا ہے۔ پھر اگر وہ باز آ جائیں تو بے شک اللہ بہت بخشنے والا، بہت رحم کرنے والا ہے۔''[1]

فقہاء کا کہنا ہے کہ کافروں کے لشکر مسلم علاقوں پر حملہ آور ہوں تو اپنی سرزمین کے دفاع میں مسلمانوں پر جہاد فرضِ عین قرار پاتا ہے۔ اس لیے کہ اگر دشمن مسلم علاقوں پر قابض ہو گیا تو وہاں کے باسیوں پر ظلم کرے گا، کفر کی حکومت قائم کرے گا اور مسلمانوں کو مجبور کرے گا کہ وہ باطل نظام قبول کریں۔ یوں دارالاسلام، دارالکفر کی حیثیت اختیار کر جائے گا۔

فقیہ ابن قدامہ رحمہ اللہ نے لکھا: ''تین موقعوں پر جہاد فرض عین ہو جاتا ہے۔...... دوسرا موقع: کافروں کی فوجیں مسلم علاقے پر دھاوا بول دیں تو اہل علاقہ پر فرض ہے کہ وہ جنگ کر کے اُنھیں وہاں سے دفع کریں۔''[2]

احناف کے ایک عالم لکھتے ہیں: ''ہر وہ جگہ جہاں دشمن کے حملے کا خطرہ ہو، خلیفہ پر یا اُس جگہ کے مکینوں پر فرض ہے کہ اُس کی حفاظت کریں۔ اگر وہ اس پر قادر نہ ہوں تو قریب ترین علاقے کے لوگوں پر واجب ہے کہ اُن کی مدد کریں تاکہ وہ ڈٹ کر دشمن کا مقابلہ کر سکیں۔''[3]

(ج) اور یہ کہ دشمن اپنی رعایا کو، خواہ وہ غیر مسلم ہی ہو، تعذیب کا نشانہ بنائے۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے اپنے بندوں پر ظلم کو حرام قرار دیا ہے۔ عدل و انصاف انسان کا بنیادی حق ہے۔ مسلم امہ کے لیے ضروری ہے کہ وہ مظلوموں کی داد رسی کرے اور انھیں ظلم و ستم سے نجات دلائے۔ ورنہ سب مسلمان گناہ گار ہوں گے۔ جہاد کرنے کا حکم بھی اسی وجہ سے دیا گیا ہے کہ روئے زمین پر عدل و انصاف کا دور دورہ ہو، ظلم کا خاتمہ ہو، حق غالب آئے اور باطل مٹ جائے۔ امتِ مسلمہ کے لیے دنیا و آخرت کی کامیابی کا راز جہاد ہی میں مضمر ہے۔

[1] البقرة2:190-192. [2] المغني لابن قدامة:279/9. [3] حاشية ابن عابدين:124/4.

یہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ایک صورت ہے۔ مسلمان جب تک یہ فریضہ انجام نہیں دیتے، بہترین امت کے منصب پر فائز نہیں ہو سکتے۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۗ وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ۚ مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَاَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ ○﴾

''تم بہترین امت ہو جو لوگوں (کی اصلاح) کے لیے پیدا کی گئی ہے، تم نیک کاموں کا حکم دیتے ہو اور برے کاموں سے روکتے ہو اور تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو اور اگر اہل کتاب ایمان لے آتے تو ان کے حق میں بہت بہتر ہوتا۔ ان میں بعض ایمان والے بھی ہیں مگر ان کے اکثر نافرمان ہیں۔''[1]

اسی طرح ایک اور مقام پر ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ ۖ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰۤى اَلَّا تَعْدِلُوْا ۚ اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۚ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ○﴾

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تم اللہ کے لیے (حق پر) قائم رہنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بنو اور کسی قوم کی دشمنی تمھیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم عدل نہ کرو، عدل کرو، یہی بات تقویٰ کے زیادہ قریب ہے اور اللہ سے ڈرو، بے شک تم جو عمل کرتے ہو اللہ اس سے خوب آگاہ ہے۔''[2]

غیر مسلم مظلوم کو ظلم سے نجات دلانا بھی عدل و انصاف کے تقاضوں میں شامل ہے۔

فقیہ سرخسی نے تحریر کیا: ''غیر مسلم سلطنت (جو مسلمانوں کے زیرِ نگیں آ چکی ہو) کا بادشاہ یہ اجازت چاہے کہ اُسے اپنی رعایا کے متعلق کھلی چھٹی دے دی جائے اور وہ اُن سے

1 آل عمرٰن 3:110۔ 2 المآئدة 5:8۔

جیسا چاہے سلوک کرے تو اس کا مطالبہ منظور نہیں کیا جائے گا۔ ظلم کو روکنے کی طاقت ہو تو اُسے دیکھ کر خاموش تماشائی بنے رہنا حرام ہے۔''[1]

(د) اور یہ کہ کافر مملکتیں داعیانِ اسلام کو دین کی تبلیغ سے روکیں اور اُن کی سرگرمیوں میں خلل انداز ہونے کی کوشش کریں۔ رب تعالیٰ شانہٗ نے مسلمانوں پر واجب کیا ہے کہ وہ اُس کا پاک پیغام ساری دنیا تک پہنچائیں۔ ارشاد فرمایا:

﴿وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۚ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝﴾

''اور تم میں سے ایک جماعت ایسی ہونی چاہیے جو خیر کی طرف بلائے اور نیک کاموں کا حکم دے اور برے کاموں سے روکے۔ اور وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔''[2]

اللہ کے دشمن اُس کے دوستوں کو لوگوں تک دین کا پیغام پہنچانے سے روکتے ہیں۔ وہ اُن کی راہ میں حائل ہوتے ہیں۔ وہ نہیں چاہتے کہ لوگ اللہ کا پیغام سنیں۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ جل شانہٗ نے اپنے مومن بندوں پر یہ ذمہ داری عائد کی ہے کہ وہ اس قوت سے جنگ کریں جو لوگوں کو دین کے راستے پر چلنے سے روکے۔[3] ارشادِ الٰہی ہے:

﴿اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ ۝ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّهُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ كَفَّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَاَصْلَحَ بَالَهُمْ ۝ ذٰلِكَ بِاَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوا اتَّبَعُوا الْبَاطِلَ وَاَنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّبَعُوا الْحَقَّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ اَمْثَالَهُمْ ۝ فَاِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ حَتّٰٓى اِذَآ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا ۚ ذٰلِكَ ۛ

1. المبسوط للسَّرخسي: 85/10. 2. آل عمرٰن 3:104. 3. فقه التمكين في القرآن الكريم للصلابي، ص: 488.

وَلَوْ يَشَآءُ اللّٰهُ لَانْتَصَرَ مِنْهُمْ وَلٰكِنْ لِّيَبْلُوَا۟ بَعْضَكُمْ بِبَعْضٍ ؕ وَالَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَلَنْ يُّضِلَّ اَعْمَالَهُمْ ۝ ﴾

’’جن لوگوں نے کفر کیا اور (دوسروں کو) اللہ کی راہ سے روکا، اللہ نے ان کے عمل ضائع کردیے۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے اور وہ اس (قرآن) پر بھی ایمان لائے، جو محمد (ﷺ) پر نازل کیا گیا اور وہ ان کے رب کی طرف سے حق ہے، اللہ نے ان سے ان کی برائیاں دور کردیں اور ان کے حال کی اصلاح کردی۔ یہ اس لیے کہ بے شک جن لوگوں نے کفر کیا انھوں نے باطل کی پیروی کی اور بلاشبہ جو لوگ ایمان لائے انھوں نے اپنے رب کی طرف سے حق کی پیروی کی، اللہ اسی طرح لوگوں کے لیے ان کی مثالیں بیان کرتا ہے۔ چنانچہ جب تم (جہاد میں) ان لوگوں سے ملو جنھوں نے کفر کیا تو (ان کی) گردنیں مارو، حتی کہ جب تم انھیں خوب قتل کرچکو تو (قیدیوں کو) بیڑیوں میں مضبوطی سے باندھ دو، پھر یا تو اس کے بعد ان پر احسان کرنا ہے یا فدیہ (تاوان) لینا ہے، حتی کہ لڑائی اپنے ہتھیار ڈال دے، (حکم) یہی ہے اور اگر اللہ چاہتا (تو خود ہی) ان سے بدلہ لے لیتا لیکن (اس نے تمھیں حکم دیا ہے) تاکہ وہ تمھیں ایک دوسرے سے آزمائے اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل (شہید) کیے گئے تو اللہ ان کے اعمال ہرگز ضائع نہیں کرے گا۔‘‘[1]

درج بالا نکات سے واضح ہوا کہ جہاد عظیم تر اہداف و مقاصد کا حامل ہے۔ مسلمان تو مسلمان غیر مسلم بھی اُس کے فوائد و ثمرات سے محروم نہیں رہتے۔ جہاد ہجرت کے چند ضروری نتائج میں سے ایک ہے۔ یہ اسلامی ریاست کی پرشکوہ عمارت کا مضبوط اور ناقابلِ شکست ستون ہے۔ اسلام کے دیگر ارکان اُس کے سہارے اپنا وجود قائم رکھتے ہیں۔[2]

---

1 محمد47:1-4. 2 الهجرة في القرآن الكريم لأحزمي سامعون جزولي، ص:453.

اس امر کی سچائی میں دو رائیں نہیں کہ دنیا کی کوئی قوم توانا فوج کے بغیر اپنی ساکھ برقرار نہیں رکھ سکتی۔ سپاہ کی عدم موجودگی میں وہ دشمن کی سازشوں کا نشانہ بنی رہے گی اور لوگ اُس پر چڑھ دوڑنے کو تیار رہیں گے۔ جس قوم کے ہاں معقول تعداد میں فوج دستیاب ہو، دنیا کی نظروں میں اُس کا احترام بڑھ جاتا ہے اور دشمن کو اُس سے دست درازی کی جرأت نہیں ہوتی۔[1]

جنگِ بدرِ کبریٰ سے قبل اہم سَرایا اور فوجی مہمات

مدینہ میں رسول اللہ ﷺ کے زیرِ قیادت مسلمانوں کو استحکام ملا اور جدید معاشرے میں اہل ایمان کی جماعت تشکیل پا گئی۔ اب مسلمانوں کے لیے ضروری تھا کہ وہ چوکنے رہیں، اردگرد کے حالات اور دشمن کی حرکات وسکنات پر کڑی نظر رکھیں۔ یہ بھی ضروری تھا کہ دعوت کا سفر جاری رہے۔ رب تعالیٰ نے محمد ﷺ اور آپ کے اصحاب کے کندھوں پر جو ذمہ داری ڈالی تھی، اُس سے کما حقہ عہدہ برآ ہونے کی کوشش کی جائے۔

مدینہ کی قیادت پر سب سے پہلے یہ لازم تھا کہ وہ قریش مکہ کے حالات سے درست طور پر واقف ہو۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے اوّلین دشمن وہی تھے اور وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ اسلام کی عمارت اپنی بنیادوں پر استوار ہو۔ اسلام کی عمارت کی تعمیر ان کی اپنی عمارت کی تباہی کا پیش خیمہ تھی۔ اُنھیں معلوم تھا کہ اسلام کے قیام کا مطلب ہے جاہلیت اور اُس کے تمام لوازمات کا اختتام۔ اور یہ خسارہ وہ کسی صورت برداشت نہیں کر سکتے تھے۔

اہلِ مکّہ نے بہت کوشش کی تھی کہ رسول اللہ ﷺ ہجرت کر کے مدینہ نہ پہنچ پائیں۔ اسلام کا دائرہ اثر تنگ کرنے اور مسلمانوں کا خاتمہ کرنے کے لیے اُنھوں نے نہایت ظالمانہ

1 الحركات العسكرية للرسول الأعظم ﷺ لسيف الدين، ص: 62.

اقدامات کیے تھے۔[1] ہجرتِ نبوی کے بعد بھی اُن کی عداوت میں کمی نہ آئی بلکہ بغض و حسد کی آگ اور بھی بھڑکی۔

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے متعلق بیان کیا ہے کہ امیہ بن خلف سے اُن کی گہری دوستی تھی۔ امیہ جب کبھی مدینہ آتا، سعد رضی اللہ عنہ کے ہاں ٹھہرتا اور سعد رضی اللہ عنہ جب مکہ جاتے تو امیہ کے ہاں قیام کرتے تھے۔ ہجرتِ نبوی کے بعد سعد رضی اللہ عنہ عمرہ کرنے مکہ گئے اور حسبِ معمول امیہ کے پاس ٹھہرے۔ اُنھوں نے امیہ سے کہا:

''مجھے تنہائی کا ایسا وقت بتانا کہ بیت اللہ کا طواف کرسکوں۔'' امیہ سعد رضی اللہ عنہ کو لیے دوپہر کے وقت باہر نکلا۔ راستے میں اُن کی ملاقات ابوجہل سے ہوئی۔ اُس نے امیہ کو مخاطب کر کے کہا: ''ابوصفوان! یہ کون ہے آپ کے ساتھ؟'' امیہ نے جواب دیا: ''یہ سعد ہیں۔'' اُس نے سعد کی طرف دیکھا اور نتھنے پُھلا کر کہا: ''اچھا تو تم مکہ میں بڑے آرام سے طواف کررہے ہو۔ اُدھر تم نے بے دینوں کو پناہ دے رکھی ہے اور سمجھتے ہو کہ اُن کی مدد کررہے ہو؟ واللہ! اگر تم ابوصفوان (امیہ کی کنیت) کے ہمراہ نہ ہوتے تو صحیح سلامت گھر نہ لوٹتے۔''

سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے ابوجہل کی دھونس کا ذرّہ برابر اثر نہ لیا اور الٹا غصّے سے چلّا کر کہا: ''کان کھول کر سن لو، اگر تم نے مجھے یہاں آنے اور طواف کرنے سے روکا تو میں تم سے ایسا بدلہ لوں گا جو تمھارے لیے بہت زیادہ سخت ہے۔ میں تمھارے لیے مدینے کی شاہراہ بند کردوں گا۔''

اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں:

''واللہ! اگر تم نے مجھے بیت اللہ کا طواف کرنے سے روکا تو میں شام کی طرف تمھاری تجارت کا راستہ کاٹ دوں گا۔''[2]

[1] مرويات غزوة بدر لأحمد باوزير، ص:79. [2] صحيح البخاري، حديث:3950و3632.

اس واقعے سے پتا چلتا ہے کہ ابوجہل، سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کو قریش کا دشمن سمجھتا تھا۔ اُن کی مکہ آمد سردارِ قریش امیہ بن خلف کی امان میں نہ ہوتی تو یقیناً اُن کی جان خطرے میں پڑ جاتی۔ اہلِ مدینہ کے معاملے میں رؤسائے مکہ کا یہ برتاؤ بالکل نیا تھا۔ ہجرتِ نبوی سے قبل مکہ میں اہلِ مدینہ سے کبھی یہ سلوک نہیں ہوا تھا۔ اس سے پہلے یثرب کے باشندوں کو مکہ میں داخلے کے لیے اجازت یا امان کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ اس نئی صورتحال سے پیشتر اہل مکہ، یثرب والوں سے دشمنی کرنا تو درکنار، اُس کی بابت سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ اُنھوں نے اہل یثرب سے کہہ رکھا تھا: ''ہمیں جس قدر آپ لوگوں سے جنگ ناپسند ہے، اُس قدر کسی اور سے نہیں۔''[1]

سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ اور ابوجہل کے اس مکالمے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس سے قبل قریش کے تجارتی قافلے بلا خوف وخطر شام کی طرف جاتے تھے اور اسلامیانِ مدینہ اُن کے راستے میں نہیں آئے تھے، نہ اُنھوں نے قریشِ مکہ سے عداوت کا معاملہ رکھا تھا۔ مسلمانوں نے اُن کا اقتصادی گھیراؤ نہیں کیا تھا۔ ایک بھی تجارتی قافلے کو ہاتھ تک نہیں لگایا تھا۔ اس کا سیدھا سادا مطلب یہ ہے کہ مکہ کے اصحابِ بست وکشاد ہی نے پہل کرتے ہوئے مدینہ کی اسلامی ریاست کے خلاف اعلانِ جنگ کیا اور اُنھیں اپنا دشمن گردانا تھا کہ مکہ میں آنے کے لیے اُنھیں اجازت یا امان لینی ہوگی۔[2]

اعلان جنگ کرنے میں پہل رؤسائے مکہ ہی نے کی، اس کی ایک اور دلیل وہ واقعہ ہے جو سنن ابی داود میں عبدالرحمٰن بن کعب بن مالک کی روایت سے بیان ہوا ہے۔ ایک صحابی نے بتایا کہ قریشِ مکہ نے عبداللہ بن ابی اور اوس وخزرج سے تعلق رکھنے والے دوسرے بت پرستوں کو خط لکھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ پہنچ چکے تھے اور یہ غزوہ بدر سے پہلے کی بات ہے۔ اُنھوں نے لکھا کہ تم لوگوں نے ہمارے آدمی کو پناہ دے

[1] الروض الأنف للسهيلي: 192/2. [2] الجهاد والقتال لمحمد هيكل: 476/1.

رکھی ہے۔ ہم اللہ کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ تمھیں اُس سے لڑائی کرنی ہوگی یا اُسے یثرب سے نکال باہر کرنا ہوگا، ورنہ ہم یکبارگی تم پر حملہ آور ہوں گے، تمھارے جنگجو افراد کو قتل کردیں گے اور تمھاری عورتوں کو اپنے قبضے میں لے آئیں گے۔

عبداللہ بن اُبی اور اُس کے بت پرست ساتھیوں کو یہ خط ملا تو وہ نبی ﷺ سے لڑائی کرنے کے لیے جمع ہوگئے۔ رسول اللہ ﷺ کو اطلاع ملی تو آپ فوراً وہاں پہنچے اور اُن سے مخاطب ہوکر فرمایا: «لَقَدْ بَلَغَ وَعِيدُ قُرَيْشٍ مِّنْكُمُ الْمَبَالِغَ مَا كَانَتْ تَّكِيدُكُمْ بِأَكْثَرَ مِمَّا تُرِيدُونَ أَنْ تَكِيدُوا بِهِ أَنْفُسَكُمْ، تُرِيدُونَ أَنْ تُقَاتِلُوا أَبْنَائَكُمْ وَإِخْوَانَكُمْ!» ''قریش کی دھمکی سے تم لوگ بہت زیادہ متاثر ہوگئے ہو اور وہ تمھارا اس سے زیادہ نقصان نہیں کرسکتے جتنا کہ تم اپنے ہاتھوں خود کر بیٹھنا چاہتے ہو۔ کیا تم اپنے بیٹوں اور اپنے بھائیوں سے لڑنا چاہتے ہو؟''

رسول اللہ ﷺ کی یہ باتیں سُن کر اُن کے ہوش ٹھکانے آئے اور وہ تتر بتر ہوگئے۔[1]

اس نازک موقع پر عظمتِ رسالت کا خوب اظہار ہوا اور قائد و مربی حضرت محمد ﷺ کی عبقریت ابھر کر سامنے آئی۔ آپ نے فتنے کو وہیں دبا دیا جہاں سے وہ پھوٹا تھا۔ اس مقصد کے لیے آپ نے قبائلی حمیت اور عزت نفس کے تاروں کو ذرا سا چھیڑا تھا۔ آپ کا ادراک بلاشبہ نفس کی گہرائیوں میں اترا ہوا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مشرکین یثرب کے دلوں پر آپ کی رقت انگیز باتوں کا عجیب اثر ہوا۔ آج ہمیں اس طریق کار کو اپنانے کی جتنی ضرورت ہے اُتنی شاید پہلے کبھی نہ تھی۔ مسلمانوں کی وحدت پارہ پارہ کرنے اور اسلام کی عمارت ہلا کر گرا دینے کے سلسلے میں مشرکین کی فضول کوشش کو اسی طریقے سے ناکام بنانا ہوگا۔

اب جبکہ قریش مکہ مدینے کی اسلامی سلطنت کے خلاف اعلانِ جنگ کر چکے تھے اور

[1] سنن أبي داود، حديث: 3004، و المصنف لعبد الرزاق، حديث: 9733، و دلائل النبوة للبيهقي: 3/180,179.

اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکمِ قتال نازل ہو چکا تھا، یہ ناگزیر تھا کہ ریاستِ مدینہ قریش سے معاملہ کرنے میں حالت جنگ کے تقاضوں کو پیش نظر رکھے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے اسلامی ریاست کا عام تاثر درست رکھنے کی خاطر اور مشرکین کے اعلان جنگ کے ردعمل میں اپنی سرگرمیوں کا رخ فوجی مہمات کی طرف موڑ دیا۔[1]

غزوۂ بدر کبریٰ سے قبل کی فوجی مہمات (سَرَایا) اور غزوات کی تفصیل حسب ذیل ہے:

غزوۂ ابواء

پہلا غزوہ جس میں نبی کریم ﷺ نے شرکت کی، غزوۂ ابواء ہے۔ یہ معرکہ غزوۂ وڈّان کے نام سے بھی معروف ہے۔ ابواء اور وڈّان دو ہمسایہ علاقے ہیں۔ دونوں کا درمیانی فاصلہ چھ یا آٹھ میل ہے (ابواء مدینے سے جنوب مغرب کی طرف تہامہ والے علاقے میں 23 میل کے فاصلے پر واقع ہے۔) اس غزوے میں لڑائی کی نوبت نہیں آئی اور مسلمانوں نے کنانہ کے قبیلے بنوضمرہ سے صلح کر لی۔ غزوۂ ابواء صفر 2 ہجری میں پیش آیا۔ مسلمان سوار و پیادہ سپاہیوں کی تعداد دوسو (200) تھی۔[2]

سریۂ عبیدہ بن حارث رضی اللہ عنہ

رسول اللہ ﷺ نے اس مہم کے سالار کو اسلام کا پہلا عَلَم باندھ کر دیا۔[3] مجاہدین کی تعداد ساٹھ تھی جو تمام مہاجرین تھے۔ (200) مشرک سوار و پیادہ سپاہیوں سے اُن کی مڈبھیڑ ہوئی جو ابوسفیان بن حرب کی سرکردگی میں آئے تھے۔ وادیِ رابغ (یہ بحیرۂ قلزم کے ساحل پر جدہ سے ینبع کے تقریباً وسط میں ہے۔ مدینہ منورہ سے رابغ کا فاصلہ تقریباً 240 کلومیٹر ہے۔ (اٹلس سیرت نبوی (اردو) ص:194) کے ایک چشمے پر فریقین کے

[1] الجهاد والقتال لمحمد هيكل:477/1. [2] جيش النبي ﷺ لمحمود شيت خطاب، ص:54.
[3] الطبقات الكبرىٰ لابن سعد:7/2.

درمیان جھڑپیں ہوئیں۔ اس لڑائی کے دوران سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے اسلام کا اولین تیر برسایا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ مہم غزوۂ ابواء سے واپسی پر روانہ کی تھی۔ [1]

سریۂ حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ

ابن اسحاق کا بیان ہے: ”نبی صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ ابواء سے لوٹ کر مدینہ پہنچے تو حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کو تیس مہاجر شہ سواروں کے ہمراہ عیص کی جانب ساحلِ قلزم پر بھیجا۔ (یہ مقام رابغ کے شمال میں 30 کلومیٹر کے فاصلے پر ینبع کی طرف واقع ہے۔ اٹلس سیرت نبوی (اردو) ص:194) ساحل پر ابوجہل بن ہشام سے اُن کا ٹاکرا ہوا جس کے ساتھ تین سو گھڑ سوار تھے۔ مجدی بن عمرو جہنی آڑے آیا جو فریقین کا حلیف تھا۔ اُس نے دونوں لشکروں میں صلح کرادی اور وہ بغیر کسی کشاکش کے واپس آ گئے۔ [2]

غزوۂ بواط

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ماہ ربیع الاوّل 2 ہجری میں اپنے دوسو(200) اصحاب کو لیے بواط کی طرف روانہ ہوئے۔ (یہ مقام مدینہ سے ینبع کی طرف تقریباً 100 کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ اٹلس سیرت نبوی (اردو) ص:204) مقصد یہ تھا کہ قریش کے ایک قافلے کو جالیں۔ قافلے کا سردار امیہ بن خلف تھا۔ سو آدمی اُس کے ہمراہ تھے۔ یہ قافلہ خوراک سے لدے پھندے ڈھائی ہزار اونٹوں پر مشتمل تھا لیکن لڑائی نہیں ہوئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ لوٹ آئے۔

غزوۂ عُشَیرہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کی ذمہ داری ابوسلمہ بن عبدالاسد کو سونپی اور خود قریش سے

---

1 حديث القرآن عن غزوات الرسول لأبي بدر محمد بكر آل عابد:40/1. 2 السيرة النبوية لابن هشام:595/1.

دو دو ہاتھ کرنے عشیرہ کی جانب چل پڑے۔ (عُشَیرہ مکہ اور مدینہ کے درمیان ینبع کی جانب بحیرہ احمر کے ساحل پر واقع ہے۔ مراصد الاطلاع:2/943، یہ مدینہ سے 130 کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ اٹلس سیرت نبوی (اردو) ص:208) وہاں آپ ﷺ نے جمادی الاولیٰ کا پورا مہینہ اور جمادیٰ الثانیہ کی چند راتیں قیام کیا۔ اس دوران آپ نے بنومدلج اور اُن کے دوست قبیلے بنوضمرہ سے حلیفانہ معاہدے کیے اور مدینہ واپس آ گئے۔ جنگ وجدل سے واسطہ نہیں پڑا۔ وجہ یہ ہوئی کہ سامان تجارت اٹھائے شام کی طرف جانے والا قافلہ جس کا آپ ﷺ نے قصد کیا تھا، چند دن پہلے یہاں سے گزر چکا تھا۔ واپسی پر قافلے نے ساحلِ سمندر کا راستہ اپنایا۔

قریش کو خبر ہوئی کہ قافلہ مسلمانوں کی گرفت میں آنے ہی والا ہے تو وہ اُس کے دفاع کے لیے نکلے اور رسول اللہ ﷺ سے اُن کا آمنا سامنا ہوگیا۔ بدر کی بڑی لڑائی اسی موقع پر ہوئی۔[1]

سریۂ سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ

غزوۂ عشیرہ کے بعد نبی کریم ﷺ نے سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو آٹھ مہاجرین کی کمان دے کر ایک فوجی مہم پر روانہ کیا۔ وہ سرزمین حجاز میں خرار تک گئے تھے۔ (یہ جحفہ کے نزدیک ایک جگہ کا نام ہے۔)، پھر واپس آئے اور جھڑپ نہیں ہوئی۔[2]

غزوۂ بدر اولیٰ

اس غزوے کا باعث یہ ہوا کہ کرز بن جابر فہری نے مدینے کی چراگاہ پر ڈاکا ڈالا اور کچھ اونٹ اور مویشی ہانک کر لے گیا۔ رسول اللہ ﷺ اُس کے تعاقب میں بدر کی طرف وادی سفوان تک گئے۔ (جو مدینہ سے 150 کلومیٹر کی مسافت پر ہے) لیکن کرز بن جابر

[1] الطبقات الکبریٰ لابن سعد: 11/2. [2] السیرۃ النبویۃ لابن ہشام: 600/2.

غزوۂ بدر سے
پہلے کی جنگی مہمیں
وادی عیص
جبل رضوی
وادی القریٰ
بواط
مدینہ منورہ
غزوۂ بواط (ربیع الاول 2ھ)
سریہ حمزہ بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ (رمضان 1ھ)
غزوہ ذی العشیرہ (جمادی الاخریٰ 2ھ)
غزوۂ بدر اولیٰ
حمراء الاسد
غزوۂ ابواء / ودان (صفر 2ھ)
سریہ عبیدہ بن حارث رضی اللہ عنہ (شوال 2ھ)
سریہ سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ (ذوالقعدہ 1ھ)
سریہ عبداللہ بن جحش اسدی رضی اللہ عنہ (رجب 2ھ)
حرہ
ابواء
خرار
رابغ
حرہ بنی سلیم
بحیرۂ احمر (قلزم)
الجحفہ
قدید
ذات عرق
عسفان
قرن المنازل
نخلہ
مکہ مکرمہ
حدیبیہ
نقشہ: 10

فہری ہاتھ نہ آیا۔ آپ ﷺ وہاں سے مدینہ لوٹ آئے۔[1]

سریۂ عبداللہ بن جحش اسدی رضی اللہ عنہ

رسول اللہ ﷺ نے ماہِ رجب کے آخری روز عبداللہ بن جحش اسدی رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں آٹھ مہاجرین کو جنوبی مکہ میں وادیِ نخلہ کی جانب بھیجا کہ قریش کے حالات کا پتہ لگائیں۔ (یہ وادی مکہ سے طائف کے راستے پر واقع ہے۔ اٹلس سیرت نبوی (اردو) ص: 212) گئے تو یہ لوگ اسی کام سے تھے لیکن راستے میں قریش کے ایک تجارتی قافلے سے ٹکر ہوگئی۔ عبداللہ بن جحش اور اُن کے ساتھیوں نے قافلے کے سردار عمرو بن حضرمی کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور قافلے کا سامان لوٹ لیا۔ واپسی پر دو آدمیوں عثمان بن عبداللہ اور حکم بن کیسان کو قیدی بنا کر ساتھ لیتے آئے۔ مدینہ پہنچے تو رسول اللہ ﷺ نے غنائم کی طرف نظر اُٹھا کر بھی نہ دیکھا، یہاں تک کہ اُن کے متعلق اللہ تعالیٰ کا اذن اترا:

﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ؕ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ ؕ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَكُفْرٌۢ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَاِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ؕ وَلَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا ؕ وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ○﴾

''(اے نبی!) لوگ آپ سے حرمت والے مہینے کے بارے میں پوچھتے ہیں کہ اس میں لڑائی کیسی ہے؟ کہہ دیجیے: اس میں لڑائی کرنا بہت بڑا گناہ ہے اور لوگوں کو اللہ کے راستے سے روکنا اور اللہ کے ساتھ کفر کرنا اور مسجد حرام سے (روکنا)

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 601/2.

اور حرم کے رہنے والوں کو وہاں سے نکالنا اللہ کے نزدیک اس سے بھی بڑا (گناہ) ہے اور فتنہ انگیزی قتل سے کہیں بڑا گناہ ہے۔ اور وہ (کافر) تو ہمیشہ تم سے لڑتے رہیں گے یہاں تک کہ اگر ان کا بس چلے تو وہ تمھیں تمھارے دین سے پھیر دیں اور تم میں سے جو شخص اپنے دین سے پھر جائے، پھر وہ حالت کفر ہی پر مر جائے تو انھی لوگوں کے اعمال دنیا اور آخرت (دونوں) میں برباد ہو گئے اور وہ لوگ دوزخی ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔''[1]

حکم الٰہی نازل ہوا تو نبی ﷺ نے قافلے کا سامان اور دونوں قیدی قبضے میں لے لیے۔ اس مہم میں مسلمانوں کو پہلی بار مالِ غنیمت حاصل ہوا۔ عمرو بن حضرمی اہل ایمان کی طرف سے قریش کا پہلا مقتول تھا۔ عثمان بن عبداللہ اور حکم بن کیسان بھی اسلامیانِ مدینہ کے اولین قیدی تھے۔[2]

یہ مہم حرمت کے مہینے رجب میں روانہ کی گئی تھی۔ رجب کا آخری دن تھا۔ اچانک قافلہ اُن کے سامنے آ گیا تو اُنھوں نے مشاورت کی کہ آج رجب کا آخری دن ہے۔ ہم ان سے لڑتے ہیں تو حرمت کے مہینے کی بے حرمتی ہوتی ہے اور اگر چھوڑ دیتے ہیں تو یہ لوگ حرم میں داخل ہو جائیں گے۔ بہر حال سب کا اتفاق اسی پر ہوا کہ لڑائی کی جائے، چنانچہ اُنھوں نے قافلے پر ہلا بول دیا اور لڑائی کی اور قیدی بھی بنا لائے۔ رسول اللہ ﷺ نے عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ اور اُن کے ساتھیوں کی اس کارروائی کو درست نہ جانا اور فرمایا:

«مَا أَمَرْتُكُمْ بِقِتَالٍ فِي الشَّهْرِ الْحَرَامِ»

''میں نے تمھیں حرمت والے مہینے میں لڑائی کرنے کا حکم نہیں دیا تھا۔''

اس پر مذکورہ آیت نازل ہوئی۔[3]

---

1 البقرة 2:217. 2 السيرة النبوية لابن هشام: 2/604. 3 السيرة النبوية لابن هشام: 2/604، ودلائل النبوة للبيهقي: 3/19.

دروس اور حکمتیں

جہاد کو حکم شریعت کا درجہ کب ملا؟

ڈاکٹر ابوشہبہ کے بقول جہاد کو 2 ھ کے اوائل میں فرض کا درجہ ملا تھا۔ اُن کا کہنا ہے کہ ہجرت کے پہلے سال مسلمانانِ مدینہ اپنے دینی و دنیاوی امور کو منظّم کرنے میں مصروف رہے۔ اُنھوں نے مسجد نبوی تعمیر کی۔ اُن کا پورا دھیان مدینے کے سماجی و سیاسی استحکام کی طرف رہا۔ مواخات عمل میں آئی اور مدینہ کے یہودی مکینوں کے شر سے محفوظ رہنے کے لیے اُن سے معاہدے کیے گئے۔[1]

اس کے برعکس پروفیسر صالح شامی نے لکھا: ''جہاد کی اجازت 1 ہجری کے اواخر میں دی گئی تھی۔''[2]

سَرِیّہ اور غزوہ میں فرق

تقریباً تمام سیرت نگاروں نے مسلمانوں کی اُس فوجی مہم کو ''غزوہ'' کا نام دیا ہے جس کی عنان قیادت رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ میں ہوتی تھی۔ دشمن سے ٹکراؤ چاہے ہوتا یا نہ ہوتا اور مجاہدین کی تعداد بھی تھوڑی ہوتی یا زیادہ، اسے غزوہ ہی کہا جاتا تھا۔

اور اکثر سیرت نگاروں نے مسلمانوں کی اُس فوجی مہم کو ''سریہ'' یا ''بعث'' لکھا ہے جسے رسول اللہ ﷺ روانہ کرتے اور اُس میں بنفس نفیس شریک نہیں ہوتے تھے۔ اس میں کبھی لڑائی ہوتی اور کبھی نہ ہوتی۔ بعض اوقات ایسے دستے دشمن کے حالات معلوم کرنے کے لیے بھی روانہ کیے جاتے تھے۔ عربی میں ''سریہ'' کی جمع ''سرایا'' آتی ہے۔ سرایا میں شمولیت کرنے والے سپاہیوں کی تعداد عموماً تھوڑی ہوتی تھی۔

---

[1] السيرة النبوية لأبي شهبة: 76,75/1. [2] من معين السيرة لصالح الشامي، ص: 175.

دراصل سرایا میں کوئی باقاعدہ جنگ نہیں لڑی جاتی تھی۔ اُن کا مقصد اتنا ہوتا تھا کہ دشمن سے نوک جھونک کر کے اُسے الجھن میں ڈالا جائے اور ڈرایا دھمکایا جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے ستائیس غزوات کی قیادت کی اور اڑتیس فوجی مہمیں (سرایا) روانہ کیں۔ یہ تمام غزوات و سرایا دس برس کے قلیل عرصے میں وقوع پذیر ہوئے جو قوموں کی زندگی میں نہایت مختصر وقت شمار ہوتا ہے۔[1]

اہل مدینہ کی مردم شماری اور سرایا سے اُس کا تعلق

ہجرت کے پہلے سال مواخات کے فوراً بعد رسول اللہ ﷺ نے اہل مدینہ کی مردم شماری کرائی۔ صرف مسلمانوں کو شمار کیا گیا۔ روایت کے مطابق آپ ﷺ نے حکم دیا تھا: «اُكْتُبُوا لِي مَنْ تَلَفَّظَ بِالْإِسْلَامِ مِنَ النَّاسِ» ''جن افراد نے اسلام کا کلمہ پڑھا ہے اُن کے نام لکھ دیں۔''[2] جنگ کے قابل افراد کی تعداد پندرہ سو (1500) نفوس تک پہنچی۔[3] مردم شماری مکمل ہوئی تو مسلمانوں کی محفلوں میں ایک سوال کا بڑا چلن ہوا۔ مسلمان حیرت کا اظہار کرتے ہوئے ایک دوسرے سے پوچھا کرتے: ''ارے واہ! ہم پندرہ سو ہیں اور پھر بھی خوفزدہ ہیں؟''

اس سے قبل مسلمان اسلحے کے بغیر نہیں سوتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے اُنھیں منع کر رکھا تھا کہ کوئی آدمی رات کو اکیلا باہر نہ نکلے۔[4]

مردم شماری کے فوراً بعد سرایا کا سلسلہ شروع ہوا۔ مردم شماری کا عمل اُن انتظامی اقدامات کا حصہ تھا جو نوآموز ریاست کی ترقی وتطویر کے لیے عمل میں لائے گئے تھے۔[5]

1 في ظلال السيرة النبوية، غزوة بدر، لأبي فارس، ص: 12. 2 ملاحظہ کیجیے: صحيح مسلم، حديث: 149. 3 مجموعة الوثائق السياسية لمحمد حميد الله، ص: 65. 4 الروض الأنف للسهيلي: 43/5. 5 دراسات في عهد النبوة للدكتور عبدالرحمٰن الشجاع، ص: 163.

نبی ﷺ کی حفاظت کے لیے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا پہرہ

صحابۂ کرام نبی ﷺ کی حفاظت کے لیے پہرہ دیا کرتے تھے۔ ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا بتاتی ہیں: ''ایک رات نبی ﷺ کو بے چینی کے باعث نیند نہیں آئی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: «لَيْتَ رَجُلًا صَالِحًا مِّنْ أَصْحَابِي يَحْرُسُنِي اللَّيْلَةَ» '' کاش! میرے اصحاب میں سے کوئی مردِ صالح آج رات یہاں پہرہ دے۔'' ابھی یہ بات ہو رہی تھی کہ باہر سے ہمیں اسلحے کی آواز سنائی دی۔ رسول اللہ ﷺ نے دریافت کیا: «مَنْ هٰذَا» ''یہ کون ہے؟'' باہر سے آواز آئی: ''یارسول اللہ! سعد ہوں۔ آپ کا پہرہ دینے آیا ہوں۔'' اب نبی ﷺ ایسے مطمئن ہو کر سوئے کہ خراٹے لینے لگے۔[1]

یہ غزوۂ بدر کبریٰ سے پہلے کا واقعہ ہے۔[2] ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا کی اس روایت سے حسب ذیل فقہی نکات پر روشنی پڑتی ہے:

① دشمن کے ناگہانی حملوں سے محفوظ رہنے کے لیے پہرے (حراسہ) کا نظام قائم کرنا شرعی اعتبار سے درست ہے۔

② جہاں احتیاط کی ضرورت ہو وہاں غفلت سے احتراز کرنا ضروری ہے۔

③ رعایا پر لازم ہے کہ وہ حاکم وقت کے تحفظ کی خاطر پہرے کا انتظام کرے۔

④ کارِ خیر میں رضا کارانہ طور پر حصہ لینے والے شخص کی تعریف کرنا اور اُس کا نام بتا دینا درست ہے۔[3]

⑤ بنو ضمرہ سے طے شدہ معاہدۂ صلح کی تحریر اور اُس پر تبصرہ

''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ یہ محمد رسول اللہ (ﷺ) کی جانب سے بنو ضمرہ بن بکر بن عبد مناۃ بن کنانہ کے لیے ایک تحریر ہے کہ اُن کے جان و مال محفوظ ہیں۔ جو

---

[1] صحیح البخاري، حدیث: 2885و 7231، و صحیح مسلم، حدیث: 2410. [2] تفسیر القرطبي: 230/6. [3] ولاية الشرطة في الإسلام لنمر بن محمد الحميداني، ص: 63.

شخص اُن پر حملہ آور ہوگا اُس کے خلاف اُن کی مدد کی جائے گی، الا یہ کہ وہ اللہ کے دین سے جنگ کریں۔ یہ معاہدہ تا ابد قائم رہے گا۔ نبی (ﷺ) اُنھیں جب بھی مدد کے لیے پکاریں گے وہ اُن کی آواز پر لبیک کہیں گے۔ اس کے بدلے میں اُنھیں اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی ضمانت حاصل رہے گی۔ مسلمانوں کا ہر وہ فرد جو نیکی اور تقویٰ اختیار کرے، اُس پر لازم ہے کہ ضرورت پڑنے پر اُن کی مدد کو آئے۔'' [1]

رسول اللہ ﷺ نے غزوۂ ابواء کے سنہری موقع سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے بنوضمرہ کے سردار سے سیاسی اتحاد کر لیا۔ بنوضمرہ کا علاقہ تزویراتی (سٹرٹیجک، جنگی حکمتِ عملی) اعتبار سے بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ اہل مکہ اور اہل مدینہ کی سرد جنگ میں اس علاقے کی اہمیت دو چند ہوگئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اوّلین فرصت میں اس امر کو یقینی بنایا کہ اہل مدینہ اور اہل مکہ کا مسلح تصادم ہو تو بنوضمرہ غیر جانبداری کا مظاہرہ کریں۔ غزوۂ بدر کبریٰ سے پہلے تک رسول اللہ ﷺ کی حکمت عملی یہی رہی کہ مجاہدین اپنی کارروائیوں کے ذریعے سے قریش کے تجارتی قافلوں کو زچ کیے رکھیں۔ بالخصوص جبکہ تجارتی قافلوں کے ہمراہ فوج کے حفاظتی دستے نہیں ہوتے تھے اور قریش نے قافلوں کی حفاظت کے لیے اب تک کوئی موثر اقدام نہیں کیا تھا۔ [2]

بنوضمرہ اور اُن کے حلیفوں کی آبادیاں مدینہ سے قریب تھیں اور بازارِ مدینہ اُن کے لیے واحد تجارتی منڈی کی حیثیت رکھتا تھا جہاں وہ اپنی معاش کا بندوبست کرنے آیا کرتے تھے۔ اُن کے سامنے سوائے اس کے اور کوئی راستہ نہیں تھا کہ وہ مدینہ میں قائم نوآموز اسلامی ریاست کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھائیں۔ اصطلاح جدید میں اس معاہدے

[1] مجموعة الوثائق السياسية لمحمد حميد الله، ص: 220. [2] نشأة الدولة الإسلامية للدكتور عون الشريف قاسم، ص: 43.

کو ’’معاہدۂ عدمِ جارحیت‘‘ کہتے ہیں۔[1]

مدینہ اور بنوضمرہ کے درمیان دوستی کے اس معاہدے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ بعض حالات میں مسلم ریاست کا دیگر طاقتوں سے سیاسی یا اقتصادی اتحاد کر لینا سیاستِ شرعی کے اصولوں کا تقاضا ہے۔ شریعت اسلامی میں غیر مسلم قوتوں سے سیاسی اتحاد کرنے کی بنیاد موجود ہے۔ موجودہ یا ممکنہ نقصان کی تباہ کاریوں سے محفوظ رہنے کے لیے بھی سیاسی اتحاد ایک ضرورت بن جاتی ہے۔[2]

اس کے علاوہ یہ بھی ضروری ہے کہ سیاسی اتحاد کا عمل فریقین کے مشترکہ مفادات اور عدمِ ایذارسانی کے اصول پر مبنی ہو۔ سیاسی اتحاد کے اہداف و مقاصد معلوم و متعین اور شرعی قوانین کے مطابق ہونے چاہئیں۔ یہ بھی لازم ہے کہ اتحاد میں مسلمانوں کی رائے یا تجویز کا برابری کی سطح پر پورا پورا احترام کیا جائے۔ اس کے برعکس سیاسی اتحاد میں مسلمانوں کی حیثیت ثانوی ہو، جیسے کہ عصرِ حاضر کے سیاسی اتحادوں میں ہوتا ہے اور اُن کا کردار دوسروں کے کیے ہوئے فیصلے نافذ کرنے تک محدود ہو تو یہ طرزِ عمل شریعت کے کسی قاعدے قانون کے تحت نہیں آتا۔ شریعت کے مبادی ایسے سیاسی اتحاد کی تائید نہیں کرتے۔ امت کی قیادت پر فرض ہے کہ وہ سیاسی سرگرمیوں میں نبوی تعلیمات کو پیشِ نظر رکھے اور شریعت کے عام قاعدے: لَا ضَرَرَ وَ لَا ضِرَارَ[3] پر عمل درآمد کو یقینی بنائے، جس سے مراد یہ ہے کہ اپنے فائدے کے لیے کسی کو ضرر پہنچانا اور تکلیف دینا درست نہیں۔

شیخ مصطفیٰ زرقانے حدیث کی تشریح میں اس اصول کے متعلق لکھا: ’’یہ اصول شریعت کے ارکان میں سے ہے۔ کتاب و سنت کی بیشتر نصوص اس قاعدے کی تائید کرتی ہیں۔

---

1 الفقه السياسي لخالد الفهداوي، ص: 119. 2 الفقه السياسي لخالد الفهداوي، ص: 124.

3 سنن ابن ماجه، حديث: 2340، و مسند أحمد: 313/1، و المعجم الأوسط للطبراني، حديث: 3789.

حدیث میں جس ''ضرر'' کا ذکر ہے اُس سے مراد انفرادی ضرر بھی ہے اور اجتماعی بھی۔ ضرر کو واقع ہونے سے روکنا اور واقع ہو جائے تو اُس کا مناسب تدارک اور آئندہ کے لیے سدباب کرنا ضروری ہے۔ یہ مبدا اس امر پر بھی دلالت کرتا ہے کہ اگر کسی صورت میں ضرر کو اختیار کرنا پڑے تو ہلکے ترین ضرر کا انتخاب کرنا چاہیے۔''[1]

مسلمانوں کے لیے یہ معاہدہ عسکری اور سیاسی اعتبار سے بے حد مفید ثابت ہوا۔

اللہ کی راہ میں برسایا گیا پہلا تیر

سرایا کی تاریخ میں سریۂ عبیدہ بن حارث رضی اللہ عنہ پہلی فوجی مہم ہے جس میں مسلمانانِ مدینہ اور مشرکین مکہ کے درمیان دو بدو لڑائی ہوئی۔ لڑائی کے دوران میں فریقین ایک دوسرے پر تیر برساتے رہے۔ اس معرکے میں جو زیادہ دیر جاری نہ رہا، سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ پہلے عرب تھے جنھوں نے اللہ کی راہ میں تیر برسایا۔[2] معرکے کے دوران ہی میں فریقین نے میدانِ جنگ سے پسپائی اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا، تاہم مسلمانوں کی پسپائی نہایت منظّم طریقے سے ہوئی جس کا سہرا حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے سر ہے۔ اُنھوں نے تیروں کی بارش کر دی اور دشمن کو اس قابل نہ چھوڑا کہ وہ جوابی حملہ کر سکے۔ یوں اُنھوں نے مسلمانوں کے لیے محفوظ اور منظّم پسپائی کی راہ ہموار کی۔ اُس روز عتبہ بن غزوان اور مقداد بن اسود رضی اللہ عنہما مسلمانوں کے کیمپ میں بھاگ آئے۔ یہ دونوں مسلمان ہو چکے تھے۔ اس ناقابلِ فراموش مہم میں اسلامیان مدینہ کی طرف سے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ بازی لے گئے۔ اس کارنامے نے اُن کی عسکری تاریخ کے سنہرے اوراق میں نمایاں جگہ پائی۔ اس شاندار سریہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جنگی پالیسی مزید واضح کر دی جس کے مطابق آپ نے بیعت عقبہ ثانیہ کے معاہدے کی پاسداری میں غزوۂ بدر سے پہلے صرف

---

1 المدخل الفقهي للشيخ الزرقا، ص:972. 2 السرايا والبعوث النبوية للدكتور بريك محمد بريك، ص:91.

مہاجرین کی سپاہیانہ صلاحیتوں سے فائدہ اٹھالیا۔[1]

سریہ حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ سے ماخوذ دروس وعبرتیں

جہینہ سے طے پانے والے معاہدۂ صلح کی تحریر درج ذیل ہے:

''جُہینہ کے جان و مال محفوظ ہیں۔ جو اُن پر ظلم کرے گا یا اُن سے برسر پیکار آئے گا، اُس کے خلاف اُنھیں مدد حاصل رہے گی، الا یہ کہ وہ دین (اسلام) یا اہلِ ایمان کے خلاف جنگ کریں۔ اُن کے خانہ بدوشوں میں سے جو شخص نیکی اور تقویٰ اختیار کرے گا، اُس سے بھی صلح کا ویسا ہی عہد کیا جاتا ہے جیسا اُن کے اہل شہر سے کیا گیا ہے۔''[2]

اس مفید معاہدے کے نیک اثرات اُس وقت ظاہر ہوئے جب مجدی بن عمرو جہنی حضرت حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کے فوجی دستے اور قریشی قافلے کے بیچ میں آ پڑا جس کی کمان ابوجہل بن ہشام کے ہاتھ میں تھی اور قریش کے تین سو شہ سوار جس کی حفاظت کے لیے مامور تھے۔[3]

''عیص'' کے ایک گوشے میں دونوں جنگجو گروہوں کا آمنا سامنا ہوا جو جہینہ کی عمل داری میں واقع تھا اور لڑائی کے لیے صف بندی ہوئی۔[4] قبل اس سے کہ فریقین گتھم گتھا ہو جاتے، سردار جہینہ مجدی بن عمرو جو دونوں جماعتوں کا دوست تھا، صلح کا پھریرا لہرائے آڑے آ گیا۔ اُس کی صلح جویانہ مساعی رنگ لائیں اور دونوں گروہ کسی تاخت و تاز کے بغیر اپنے اپنے علاقوں کو واپس ہو گئے۔[5]

---

1 السرايا والبعوث النبوية للدكتور بريك محمد بريك، ص: 92. 2 مجموعة الوثائق السياسية لمحمد حميد الله، ص: 62. 3 المواهب اللدنية للزرقاني: 75/1. 4 الطبقات الكبرٰى لابن سعد: 6/2، والسرايا والبعوث النبوية للدكتور بريك محمد بريك، ص: 85. 5 السرايا والبعوث النبوية للدكتور بريك محمد بريك، ص: 86.

معاہدے سے پتہ چلتا ہے کہ اسلامی ریاست کے نزدیک معاہداتِ صلح کو فوجی کارروائیوں کے مقابلے میں اوّلیت حاصل تھی۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ قریشِ مکہ کے خلاف تحریک سرایا کے آغاز سے قبل ریاست مدینہ اور بحیرۂ احمر کے ساحل پر آباد قبیلۂ جُہینہ کے درمیان صلح کا معاہدہ طے پاچکا تھا۔ جُہینہ کی طرف سے مدینہ اور مکہ کے درمیان جنگ بندی کی کوششیں اسی معاہدے کے بل بوتے پر کی گئی تھیں۔

اہل مدینہ اور جہینہ کے درمیان طے پانے والے اس معاہدۂ صلح سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اسلامی ریاست ایسے ملک سے معاہدۂ صلح کرسکتی ہے جو اسلامی ریاست کے دُشمنوں سے مصالحانہ تعلقات رکھتا ہو۔ شرط یہ ہے کہ مسلمان اپنے دشمنوں سے برسر پیکار ہوں تو یہ ملک اُن کے دشمنوں سے تعاون نہ کرے۔ اسلامی ریاست کے لیے جائز ہے کہ وہ معاہدہ کیے گئے ملک کی بات مان کر جنگ سے ہاتھ کھینچ لے جبکہ اس اقدام سے مسلمانوں کے اجتماعی مفاد کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہ ہو۔[1]

سیدنا حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کی فوجی مہم لشکرِ قریش کے لیے نہایت نقصان دہ ثابت ہوئی۔ اس سریہ نے قریش کو اندر سے ہلا کر رکھ دیا اور اُن کے بہادروں کے دلوں پر ایسا رعب جمایا جس کی نظیر اس سے قبل نہیں ملتی۔ اب جا کے اُن کی آنکھیں کھلیں اور اُنھیں خطرے کی سنگینی کا اندازہ ہوا جو اُن کی تجارت اور معاشی قوت کا راستہ روکنے کے درپے تھا۔[2]

ابوجہل لشکر حمزہ رضی اللہ عنہ کا سامنا کر کے مکہ واپس آیا تو اُس نے رجال قریش کو مخاطب کر کے کہا: ”اے معشرِ قریش! محمد یثرب میں پاؤں جما چکا ہے۔ اُس نے اپنے دستے ہر طرف پھیلا دیے ہیں۔ اُس کا ارادہ صرف تمھیں گزند پہنچانا ہے۔ اُس کے قریب بھی نہ پھٹکیں اور نہ اُس کا راستہ اپنائیں۔ وہ خونخوار شیر کی مانند بھرا ہوا ہے۔ تم پر اُسے غصہ بھی

1 الجهاد والقتال لمحمد هيكل: 479,478/1. 2 السرايا والبعوث النبوية للدكتور بريك محمد بريك، ص: 86.

بہت ہے کہ تم نے اُسے شہر سے نکال باہر کیا تھا۔ واللہ! اُس کے پاس بڑے ماہر جادوگر ہیں۔ میں نے اُس کے اور اُس کے اصحاب کے ہمراہ جنوں کو دیکھا ہے۔ بنو قیلہ (اوس و خزرج) کی عداوت سے تو تم واقف ہی ہو۔ یہ (محمد ﷺ) ایسا دشمن ہے جس نے دوسرے دشمن سے تعاون لیا ہے۔"[1]

سریۂ عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ سے ماخوذ دروس اور عبرتیں

سریۂ عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کے نہایت اچھے نتائج برآمد ہوئے۔ مسلمانوں کے لیے اس مہم میں کئی اہم اسباق اور نکات پنہاں ہیں جن کی قدرے تفصیل ذیل میں پیش کی جاتی ہے:

(ا) روایات میں آتا ہے کہ نبی ﷺ نے اس دستے کے امیر کو ایک تحریر لکھ کر دی تھی اور کہا تھا کہ اسے دو دن کی مسافت طے کرنے کے بعد کھول کر پڑھیں۔

رسول اللہ ﷺ کی یہ بات ایک اہم جنگی اصول پر عمل درآمد کی عمدہ مثال ہے۔ اور وہ اصول یہ ہے جنگی منصوبوں کو صیغۂ راز میں رکھنا اور لشکر کی پیش قدمی کا راستہ پوشیدہ رکھنا بھی اسی میں شامل ہے۔ یہ اس لیے ضروری ہے کہ لشکر دشمن کی گھات سے محفوظ رہے۔ اُن دنوں مدینہ میں یہود اور مشرکین بھی آباد تھے۔ عین ممکن تھا کہ یہ لوگ بھاگم بھاگ اہلِ مکہ کو باخبر کرتے کہ اُن کے خلاف روانہ کیے گئے دستے کا رخ فلاں طرف ہے۔ سریہ روانہ ہوگیا اور خود اُس کے سپاہیوں کو بھی علم نہیں تھا کہ کہاں جانا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کو اب یہ خوف نہیں رہا تھا کہ لشکر کی منزلِ مقصود کے متعلق کسی کو خبر ہو جائے گی۔[2]

اس مبارک مہم میں تربیتِ نبوی کا خوش کن اثر بھی صاف نظر آتا ہے کہ مجاہدین نے رسول اللہ ﷺ کی بات سنی اور اُس پر عمل کرتے ہوئے دشمن کے علاقے تک چلتے چلے گئے بلکہ اُسے پیچھے چھوڑ دیا۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا یہ طرزِ عمل اُن کے مضبوط ایمان اور اللہ تعالیٰ

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 219,218/1. [2] التاريخ الإسلامي للحميدي: 71/4.

کی راہ میں موت سے بے خوفی کی علامت ہے۔[1]

(ب) اہل سریہ کی طرف سے دشمن کو حرمت کے مہینے میں قتل کردیا گیا تھا۔ قریش نے مسلمانوں کی اس غلطی سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے ریاستِ مدینہ کے خلاف زوردار پروپیگنڈا مہم کا آغاز کردیا۔ اس سلسلے میں اُنھوں نے ابراہیمی تعلیمات کا سہارا لیا جن کی چند باقیات جاہلی معاشرے میں ابھی تک موجود تھیں۔ ابراہیمی تعلیمات کے مطابق حرمت کے مہینوں میں لڑائی حرام قرار پاتی تھی۔ قریش نے اس بات کا خوب ڈھنڈورا پیٹا کہ محمد (ﷺ) اور اُن کے ساتھی دینِ ابراہیمی کی حدود سے تجاوز کرنے والے لوگ ہیں جو مقدس مہینوں کی پروا بھی نہیں کرتے۔[2]

قریش نے بڑا شور مچایا کہ محمد (ﷺ) اور اُن کے ساتھیوں نے حرمت کے مہینوں کو حلال سمجھ لیا ہے۔ اُنھوں نے حرمت کے مہینے میں خون کیا، مال لوٹا اور لوگوں کو قیدی بنایا ہے۔[3]

بظاہر قریش اپنے منصوبے میں کامیاب رہے تھے۔ اُن کے پروپیگنڈے کی گونج سے عرب کے در و دیوار لرز اٹھے تھے۔ اور تو اور خود مدینہ بھی اُس کے زہریلے اثرات سے محفوظ نہ رہ سکا تھا۔ مسلمان حلقوں میں اس معاملے کے متعلق خوب بحث ہوئی۔ اُن کی طرف سے اہل سریہ پر سخت نکتہ چینی کی گئی کہ انھوں نے ماہ حرام میں خونریزی کیوں کی ہے۔ یہود نے صورتحال کی سنگینی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے فتنہ برپا کرنے کی ناکام کوشش کی۔[4] اُنھوں نے کہا: ''اب تو قریش مکہ اور مسلمانوں کے درمیان لڑائی ہوکر رہے گی۔ اور قریش ہی پہ کیا موقوف، ان مسلمانوں کو تو سارے عرب سے جنگ مول لینی پڑے گی۔ اُنھوں نے ماہِ حرام کی حرمت کو جو پامال کیا ہے!'' یہودیوں نے اس بات کو اپنی طرف سے نئے معنی پہنا لیے۔ وہ کہنے لگے:

1 التاريخ الإسلامي للحميدي: 71/4. 2 مكة والمدينة لأحمد الشريف، ص:445. 3 السيرة النبوية لابن هشام: 254/2، والسنن الكبرٰى للبيهقي: 59/9، و دلائل النبوة للبيهقي: 19/3.
4 مكة والمدينة لأحمد الشريف، ص:445.

"واقد بن عبداللہ نے عمرو بن حضرمی کو قتل کیا ہے۔ عمرو کا مطلب ہے کہ جنگ بھڑک اٹھی۔ حضرمی کے معنی ہیں جنگ حاضر ہوئی اور واقد سے مراد یہ ہے کہ جنگ کو وقود (ایندھن) فراہم کیا گیا۔"[1]

یہود کی یہ باتیں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اُن کے سینے میں چھپے ہوئے شدید اور ناقابل علاج حسد اور خباثت بھرے کینے کی آئینہ دار ہیں۔[2]

اہل سریہ اپنے کیے پر بہت پشیمان اور نہایت افسردہ ہوئے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے قریش و یہود کے پروپیگنڈے کا ایسا منہ توڑ جواب دیا گیا جس نے مشرکین کے دانت کھٹے کر دیے اور اُن کی زبانیں کاٹ ڈالیں۔ قرآن کریم نے مجرمانِ قریش کا بھانڈا بیچ چوراہے میں پھوڑ دیا اور اُن کے دلائل کو باطل قرار دیتے ہوئے کہا کہ اللہ کی راہ پر چلنے سے روکنا، اُس کی وحدانیت اور رسول اللہ کی رسالت کا انکار کرنا اور مسجد حرام کے باسیوں کو وہاں سے نکال باہر کرنا ماہِ حرام میں لڑائی کرنے سے کہیں بڑے جرائم ہیں۔ آدمی کو اُس کے دین کے متعلق آزمائش میں ڈال دینا بھی بڑا گناہ ہے۔ قریش نے ان جرائم کا ارتکاب کیا ہے لیکن وہ ان گناہوں کو جان بوجھ کر بھلا چکے ہیں یا انھیں معمولی سمجھتے ہیں اور صرف ماہِ حرام کی بے حرمتی کا رونا روتے ہیں، جبکہ وہ ماہِ حرام کے لیے بھی مخلص نہیں ہیں۔ اُن کے شور شرابے کا ہدف بس یہی ہے کہ عرب کے لوگ اکٹھے ہو کر مسلمانوں پر چڑھ آئیں اور اُن کا خاتمہ کر دیں۔ لیکن قریش اس مقصد میں کامیاب نہیں ہوں گے، اس لیے کہ اصل مجرم وہ خود ہیں نہ کہ مسلمان۔[3]

(ج) سپاہ کے متعلق سپہ سالار کی فکر مندی: واپسی کے سفر پر سعد بن ابی وقاص اور عتبہ بن غزوان رضی اللہ عنہما ایک گمشدہ اونٹ کی تلاش میں لشکر سے پیچھے رہ گئے۔ اس دوران میں قریش

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 604,603/1. [2] التاريخ الإسلامي للحميدي: 72/4. [3] السرايا والبعوث النبوية للدكتور بريك محمد بريك، ص: 100.

اپنے دو قیدی بازیاب کرانے مدینہ آئے۔ رسول اللہ ﷺ کو سعد اور عتبہ رضی اللہ عنہما کی فکر ہوئی۔ آپ ﷺ نے قریش کو انکار کرتے ہوئے کہا: «أَخَافُ أَنْ تَكُونُوا قَدْ أَصَبْتُمْ سَعْدَ بْنَ مَالِكٍ وَّ عُتْبَةَ بْنَ غَزْوَانَ» ''مجھے خوف ہے کہ کہیں تم لوگوں نے سعد اور عتبہ کو گزند نہ پہنچایا ہو۔'' چنانچہ جب تک سعد اور عتبہ رضی اللہ عنہما واپس نہ آئے، آپ نے قیدی اُن کے حوالے نہیں کیے۔[1] دونوں قیدیوں میں سے حکم بن کیسان رضی اللہ عنہ مسلمان ہوگئے اور رسول اللہ ﷺ کے پاس رہے، جبکہ عثمان بن عبداللہ بن مغیرہ نے اسلام قبول نہ کیا اور قریش کے ہمراہ مکہ لوٹ گیا۔[2]

منہج نبوی سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ سپہ سالار کے لیے ضروری ہے کہ وہ سپاہیوں کی سلامتی اور حفاظت کا بندوبست کرے اور اُن کے لیے فکر مند رہے، اس لیے کہ یہ سپاہی تو ہوتے ہیں جو اقامت دین کی راہ میں نقد جاں کے نذرانے پیش کرتے ہیں۔

عصر حاضر کی فوجی درس گاہوں میں بھی یہ سبق دیا جاتا ہے کہ سپاہی جب دیکھتا ہے کہ قیادت اُس کے لیے فکر مند اور اُس کی سلامتی کی خواہاں ہے تو وہ میدانِ کارزار میں بڑی بے جگری سے فن حرب کا مظاہرہ کرتا ہے۔[3]

(د) میدان جنگ میں راز داری کی تربیت: سریہ عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ نے اپنے اہداف حاصل کر لیے تھے۔ چھاپہ مار کارروائیوں کے سلسلے میں اہل سریہ کی صلاحیتیں اُبھر کر سامنے آئی تھیں۔ اُن کے اس فداکارانہ طریقِ کار نے قریش کے ہاتھوں کے طوطے اڑا دیے تھے۔ جس راز داری اور احتیاط سے سریہ نے اپنی مہم انجام دی تھی اُس نے قریش کی پریشانی اور بدحواسی میں بھرپور اضافہ کر دیا تھا، قریشِ مکہ کے جاسوسوں نے چاہا تھا کہ سریہ ابن جحش کی گھات میں بیٹھیں لیکن وہ اپنے ارادوں میں کامیاب نہیں ہوئے۔ اُنھیں

---

[1] دلائل النبوة للبيهقي: 2/496. [2] السرايا والبعوث النبوية للدكتور بريك محمد بريك، ص: 100. [3] غزوة بدر الكبرٰى لأبي فارس، ص: 23.

یہ تک معلوم نہ ہوسکا کہ سریہ کا رخ کس طرف ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی بھی یہی خواہش تھی جو حسب توقع پوری بھی ہوئی۔ اس ضمن میں آپ نے رازداری کا انوکھا طریقہ اختیار کیا اور لشکر کو مہر بند تحریر کی صورت میں اپنے منصوبے سے آگاہ کیا۔ یوں دشمن کو کانوں کان خبر نہ ہوئی کہ سریہ کی پیش قدمی کی رفتار کیا ہے اور اُس نے کس علاقے کا قصد کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ چھاپہ مار کارروائیوں میں ''رازداری'' کے اصول کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ [1]

سریہ عبداللہ بن جحش نے یہ بھی ثابت کر دیا کہ رسول اللہ ﷺ نے جو سرایا روانہ کیے تھے وہ نہایت زور آور تھے۔ اُنھوں نے مشکل ترین محاذوں پر کامیابی کے جھنڈے گاڑے اور ایسے ایسے کارنامے انجام دیے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ اہل سرایا اعلیٰ سپاہیانہ صلاحیتوں کے مالک تھے جنھیں بھرپور طریقے سے کام میں لاتے ہوئے وہ اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوئے۔

بلند پایہ فوجی نظم و نسق جس سے اہل سریہ اور اُن کا قائد بہرہ یاب تھے، اُس میں بھی نبوی تربیت کے اثرات نظر آئے۔ انھوں نے نبوی احکامات کی بے چون و چرا تعمیل کی۔ سپہ سالار نے نبوی تحریر پڑھتے ہی سر تسلیم خم کر دیا اور سپاہیوں کے لیے اپنی ذات کا نمونہ پیش کرتے ہوئے کہا: ''آپ میں سے جو شہادت کی تڑپ رکھتا اور اُس کا شائق ہے وہ میرے ساتھ چلے۔ اور جسے یہ امر اچھا نہیں لگتا وہ لوٹ جائے۔ میں تو رسول اللہ ﷺ کے احکامات کے مطابق آگے چلوں گا۔'' [2]

سرایا کے اغراض و مقاصد

غزوۂ بدر سے قبل کی تحریکِ سرایا کا بنظر غائر مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس میں شرکت کرنے والے تمام سپاہی مہاجرین کے طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ انصار کے کسی فرد

[1] الرسول القائد ﷺ لمحمود شيت خطاب، ص: 94. [2] السيرة النبوية لابن هشام: 602/2.

نے اس میں حصہ نہیں لیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ قریش مکہ کے ظلم و ستم کی وجہ سے مہاجرین کے لیے جو مسائل پیدا ہوئے تھے، ملکی سطح پر اُن مشکلات کا شعور اجاگر ہو۔ تحریکِ سرایا نے جو اہداف حاصل کیے اُن میں سے چند اہم نکات کی تفصیل حسبِ ذیل ہے:

(ا) دشمنان دین کو مسلمانوں کی قوت کا اندازہ ہوا اور اُن کے دلوں پر اہل مدینہ کی دھاک بیٹھ گئی۔ اب مشرکین عرب اور یہود میں سے ہر ایک مدینہ کا رخ کرنے سے پہلے ہزار بار اپنے انجام پر غور کرتا تھا۔ قریش کی تجارت و معیشت پر ضرب پڑی اور تجارتی قافلوں کے لیے پہرے داروں کی فراہمی سے اُن کے اخراجات میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔[1]

(ب) رسول اللہ ﷺ نے قبیلۂ جہینہ اور بعض دیگر جنگجو قبائل سے حلیفانہ معاہدے کیے تاکہ وہ مکہ و مدینہ کی جنگ میں غیر جانبدارانہ رویہ اپنائیں۔ یہ قبائل قریش کے پرانے حلیف تھے۔ قرآن نے اُن کے حلیفانہ تعلقات کو ''ایلاف'' کے نام سے یاد کیا ہے، ان معاہدوں سے قریش کی تجارت کو مستقل خطرات لاحق ہوئے اور علاقائی سطح پر مسلمانوں کا اثر و رسوخ بڑھا۔[2] تحریک سرایا کے ذریعے سے اعرابی قزاقوں کا ناطقہ بند کیا گیا جنھوں نے عرب کی تجارتی شاہراہوں پر اودھم مچا رکھا تھا۔ وہ قافلوں کو لوٹتے اور ہر آنے جانے والے سے بھتا وصول کرتے تھے۔ مدینہ کی چراگاہ پر حملہ کر کے اُنھوں نے اس شہر کے نئے باسیوں سے بھی اپنا حصہ وصول کرنا چاہا لیکن رسول اللہ ﷺ نے اعرابی ڈاکو کرز بن جابر فہری کا بدر کے مضافاتی علاقے سفوان تک تعاقب کیا جو مدینہ سے تقریباً 150 کلومیٹر کی مسافت پر ہے۔ اہل سیر نے اس تعاقب کو غزوۂ بدر صغریٰ کا نام دیا ہے، چنانچہ اعرابی قزاقوں کو کان ہو گئے اور اُنھیں عافیت اسی میں نظر آئی کہ یثرب کے نئے باشندوں سے حلیفانہ تعلقات استوار کر لیے جائیں۔ یوں مسلمان اُن ڈاکوؤں کی شرارتوں سے محفوظ ہو گئے۔[3]

---

1 دولة الرسول من التكوين إلى التمكين للدكتور كامل سلامة، ص: 532. 2 دراسات في السيرة لمؤنس، ص: 19. 3 دراسات في عهد النبوة للدكتور عبدالرحمٰن الشجاع، ص: 131.

(ج) تحریکِ سرایا مسلم سپاہ کے لیے ایک طرح سے جنگی مشقوں کا سلسلہ تھا جس میں انھیں مستقبل کی فوجی سرگرمیوں کے لیے تیاری کے مواقع میسر آئے۔ رسول اللہ ﷺ کی قیادت میں مسلمانانِ مدینہ چھتے میں شہد کی مکھیوں کے مانند جہد مسلسل کی زندہ تصویر تھے۔ تحریکِ سرایا نے مسلمانوں کو ایسے رجالِ کار فراہم کیے جنھوں نے فتوحاتِ اسلامی کے دائرے کو وسعت دینے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ سپہ سالار فتوحاتِ شام امین الامہ ابوعبیدہ بن جراح، فاتح قادسیہ و مدائن سعد بن ابی وقاص، فاتح یرموک خالد بن ولید اور فاتح مصرو لیبیا عمرو بن العاص رضی اللہ عنہم کے اسمائے گرامی قائدین اسلام کی فہرست میں شامل ہوئے۔

سرایا کے اہداف و مقاصد حالات کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ بدلتے رہے۔ ابتدائی سرایا جاسوسی مقاصد کے پیش نظر روانہ کیے جاتے رہے۔ پھر اُن کی حیثیت چھاپہ مار کارروائیوں کی ہوگئی۔ مسلمانوں کو شان و شوکت حاصل ہوئی تو چیدہ چیدہ بدمعاشوں کا صفایا سرایا کا مطمحِ نظر قرار پایا۔ کعب بن اشرف، عصماء بنت مروان اور ابوعفک کا قتل اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ غزوۂ احد کے بعد حالات ناسازگار ہوئے تو اعرابی قزاقوں کو ایک بار پھر مدینہ کی طمع ہوئی اور وہ اس قدر دلیر ہوگئے کہ انھوں نے مسلمانوں کے پُر امن تبلیغی مشن پر حملہ کرنے سے دریغ نہ کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے جنگی حکمتِ عملی تبدیل کرتے ہوئے عنانِ سرایا قریشِ مکہ سے اعراب کی طرف موڑ دی اور انھیں خوب سبق سکھایا۔

فتح مکہ کے بعد آپ ﷺ نے عزیٰ، منات، لات، سواع، ذی خلصہ اور شرک و بت پرستی کے دیگر مظاہر کو نیست و نابود کرنے کی خاطر صحابۂ کرام کے دستے (سرایا) روانہ کیے تھے۔

غرضیکہ جزیرہ نمائے عرب میں اسلامی تحریکِ سرایا کے نہایت مثبت اور فوری نتائج سامنے آئے۔ اس تحریک نے مستقبل کی فتوحاتِ اسلامی کے لیے مستحکم بنیاد فراہم کی جن کے سبب اسلام کی روشنی چار دانگِ عالم میں پھیل گئی۔ [1]

[1] السرایا والبعوث النبویة للدکتور بریك محمد بریك، ص:61-66.

حصہ 10

غزوۂ بدر کبریٰ

كَمَآ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْۢ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ وَ اِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ ○ يُجَادِلُوْنَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ وَ هُمْ يَنْظُرُوْنَ ○ وَ اِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآئِفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ

’’جیسے (بدر کے موقع پر) آپ کے رب نے آپ کو آپ کے گھر (مدینہ) سے حق (بہترین تدبیر) کے ساتھ نکالا تھا اور بے شک (اس وقت) مومنوں کا ایک گروہ (اس نکلنے کو) ناپسند کرتا تھا، وہ آپ سے حق (کے معاملے) میں اس کے واضح ہو جانے کے بعد جھگڑتے تھے، گویا کہ انھیں موت کی طرف ہانکا جا رہا تھا اور وہ (اسے) دیکھ رہے تھے اور جب اللہ تم سے دو گروہوں میں سے ایک کا وعدہ کر رہا تھا کہ یقیناً وہ تمھارے لیے ہے اور تم چاہتے تھے کہ جو غیر مسلح (تجارتی قافلہ) ہے وہی تمھارے ہاتھ لگے اور اللہ کا ارادہ یہ تھا کہ وہ اپنے فرامین کے ساتھ حق کو ثابت کر دکھائے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے تاکہ وہ حق کو حق کر دکھائے اور باطل کو باطل کر دکھائے اگرچہ مجرم لوگ (اسے) ناپسند ہی کریں۔‘‘

(الأنفال 8:5-8)

باب 1

میدانِ کارزار میں پہنچنے سے پہلے کے حالات

غزوۂ بدر کا پس منظر و اسباب

مسلمانوں کو قریش کے ایک تجارتی قافلے کے بارے میں علم ہوا جو ابوسفیان (رضی اللہ عنہ) کی قیادت میں تجارتی ساز و سامان سے لیس شام سے مکہ روانہ ہو چکا تھا اور اتنے بڑے قافلے کے لیے صرف تیس سے چالیس افراد پر مشتمل حفاظتی دستہ متعین تھا۔[1]

رسول اللہ ﷺ نے بسبس[2] بن عمرو رضی اللہ عنہ کو قافلے کی معلومات حاصل کرنے کے لیے روانہ فرمایا۔ وہ جب مصدقہ خبر لے کر واپس پہنچے تو نبی ﷺ نے صحابۂ کرام کو کوچ کا حکم دیا اور فرمایا: «هٰذِهِ عِيرُ قُرَيْشٍ فِيهَا أَمْوَالُهُمْ فَاخْرُجُوا إِلَيْهَا لَعَلَّ اللّٰهَ يُنْفِلُكُمُوهَا»

''یہ قریش کا تجارتی قافلہ ہے جس میں ان کا تجارتی ساز و سامان ہے۔ اس کی طرف نکلو، ممکن ہے اللہ تمھیں بطور غنیمت وہ قافلہ عطا فرما دے۔''[3]

نبی علیہ السلام بارہ (12) رمضان المبارک 2 ھ میں مدینہ طیبہ سے عازم سفر ہوئے اور بلاشبہ وہ اس وقت قطعاً لڑائی کی نیت سے روانہ نہیں ہوئے تھے۔ وہ تو صرف قریش کے تجارتی

---

1 جوامع السيرة لابن حزم، ص: 107. 2 مسلم میں یہ نام بُسیسہ ذکر کیا گیا ہے دیکھیے: صحیح مسلم، حديث: 1901، علامہ نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مسلم کے تمام نسخوں میں اسی طرح ہے لیکن سیرت کی کتب میں بسبس کا لفظ ملتا ہے۔ ہوسکتا ہے ایک اس کا نام اور دوسرا اس کا لقب ہو۔ 3 السيرة النبوية لابن هشام: 61/2.

قافلے کو روکنے کے لیے روانہ ہوئے تھے۔ مسلمانوں اور کفار کے درمیان دشمنی کی فضا بدستور قائم تھی۔ ایسے حالات میں دشمن کے مال اور خون مباح سمجھے جاتے ہیں اور خصوصاً جب یہ علم ہو کہ اس تجارتی قافلے میں وہ اموال بھی شامل تھے جو مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کرنے والے مسلمانوں کی ملکیت تھے اور مشرکین نے ظلم و زیادتی سے ان پر قبضہ جما رکھا تھا۔ [1]

اس سفر میں نبی ﷺ نے عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کو مدینہ میں امام مقرر فرمایا اور ابولبابہ کو روحاء سے واپس لوٹا کر مدینہ کا امیر مقرر فرمایا۔ [2]

نبی ﷺ نے دو آدمی تجارتی قافلے کی جاسوسی کے لیے روانہ فرمائے اور وہ قافلے کی خبر لے کر واپس پہنچے۔ [3]

شرکائے بدر کی تعداد

غزوۂ بدر میں شرکت کرنے والوں کی تعداد کے بارے میں مصادر صحیحہ میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے براء بن عازب رضی اللہ عنہما کے حوالے سے شرکائے بدر کی تعداد تین سو دس سے کچھ زائد بتائی ہے۔ [4]

امام مسلم رحمہ اللہ نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی طویل روایت کے حوالے سے یہ بیان کیا ہے کہ ان کی تعداد تین سو انیس (319) تھی۔ [5]

اور بعض دیگر مصادر تین سو چالیس (340) کی تعداد کا تذکرہ کرتے ہیں۔ [6]

---

1 حديث القر ن عن غزوات الرسول ﷺ لأبي بدر محمد بكر آل عابد: 43/1. 2 البداية والنهاية: 260/3، و المستدرك للحاكم: 632/3. 3 الطبقات الكبرٰى لابن سعد: 42/1. 4 صحيح البخاري، حديث: 3958,3957. 5 صحيح مسلم، حديث: 1763. 6 البداية والنهاية: 314/3. بہر حال تین سو دس (310) سے کچھ اوپر اور تین سو انیس (319) میں کوئی تضاد نہیں کیونکہ صحیح بخاری کی حدیث میں ''بِضْعَۃَ عَشَرَ'' کے الفاظ ہیں اور یہ تیرہ سے انیس تک کے لیے بولے جا سکتے ہیں اور جن مصادر میں تین سو چالیس کا تذکرہ ہے وہ اس پایے کے نہیں ہیں۔

بدر میں شریک ہونے والے یہ افراد اسلامی ریاست کی مکمل عسکری قوت نہ تھے کیونکہ وہ تو صرف قافلے کو روکنے اور گھیرنے کی غرض سے روانہ ہوئے تھے اور انھیں قطعاً یہ علم نہ تھا کہ انھیں قریش اور ان کے حلیفوں کا سامنا کرنا پڑے گا جن کی تعداد ایک ہزار تھی۔[1]

کفار قریش کے ساتھ دو سو گھوڑے تھے جو ان کے اونٹوں کے پہلو بہ پہلو رواں دواں تھے اور گلوکارائیں دف بجا بجا کر اشعار میں نبی ﷺ اور صحابہ کرام کی ہجو کر رہی تھیں۔[2]

جبکہ مسلمانوں کے پاس صرف دو گھوڑے اور ستر اونٹ تھے جس پر وہ باری باری سوار ہوتے۔[3]

بدر کی طرف سفر کے دوران پیش آنے والے واقعات

اس سفر کے دوران میں چند ایسے واقعات پیش آئے جن میں بہت سے پند و نصائح پائے جاتے ہیں:

بعض نو عمر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا واپس کیا جانا: رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جب ابوسفیان (رضی اللہ عنہ) کے لشکر کا سامنا کرنے کے لیے مدینہ سے عازم سفر ہوئے تو مدینہ سے باہر ''بیوت سقیا'' جگہ پر فروکش ہوئے۔ یہاں آپ ﷺ نے قافلے میں شریک ہر فرد کا جائزہ لیا اور ان میں سے انھیں واپس بھیج دیا جو اسلامی لشکر کے ساتھ سفر کرنے اور لڑائی کی نوبت آنے پر اس میں شرکت کرنے کی بظاہر ہمت نہ رکھتے تھے، چنانچہ حضرت براء بن عازب اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو کم عمر ہونے کی وجہ سے واپس لوٹا دیا گیا۔[4] حالانکہ وہ بڑے ذوق و شوق سے نکلے تھے اور جذبے سے سرشار تھے۔

مشرک سے عدم استعانت: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی ﷺ بدر کی جانب روانہ ہوئے اور ابھی حرہ وبرہ ہی پہنچے تھے کہ ایک آدمی آیا جس کی بہادری اور جرأت کے

---

1 صحيح مسلم، حديث: 1763. 2 البداية والنهاية: 3/260. 3 مسند أحمد: 1/411، و مجمع الزوائد: 6/69. 4 صحيح البخاري، حديث: 3956,3955.

چرچے زبان زد عام تھے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جب اسے دیکھا تو بہت خوش ہوئے۔ وہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچا تو بولا: ”میں بھی آپ کے ساتھ شریک ہونا چاہتا ہوں تاکہ کچھ مال حاصل کرسکوں؟“ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے سوال کیا: «تُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ رَسُولِهٖ؟» ”کیا تو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتا ہے؟“ اس نے کہا: ”نہیں۔“ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «فَارْجِعْ فَلَنْ أَسْتَعِينَ بِمُشْرِكٍ» ”لوٹ جا! میں مشرک سے ہرگز مدد نہیں لیتا۔“

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم آگے بڑھ گئے۔ جب مقامِ شجرہ کے قریب پہنچے تو وہی شخص دوبارہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور اپنی بات دہرائی۔ جواب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر وہی سوال دہرا دیا۔ تیسری دفعہ وہ بیداء نامی جگہ میں سامنے آیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے پھر دریافت فرمایا کہ کیا تو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتا ہے؟ اس نے عرض کیا: ”جی ہاں۔“ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «فَانْطَلِقْ» ”اب تو ہمارے ساتھ شریک ہوسکتا ہے۔“[1]

مشکل گھڑی میں باہمی تعاون: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ”بدر کے دن ایک ایک اونٹ پر ہمارے تین تین آدمی باری باری سوار ہوتے تھے۔ ابولبابہ اور علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہما نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے (ابولبابہ رضی اللہ عنہ کو مدینہ کا امیر بنا کر واپس لوٹانے سے پہلے کی بات ہے)۔ دونوں فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پیدل چلنے کی باری تھی۔ ہم نے عرض کیا: ”آپ سوار ہو جائیں ہم پیدل چلتے ہیں۔“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«مَا أَنْتُمَا بِأَقْوٰى مِنِّي، وَلَا أَنَا بِأَغْنٰى عَنِ الْأَجْرِ مِنْكُمَا»

”نہ تم مجھ سے زیادہ طاقتور ہو اور نہ ہی میں تمھاری نسبت اجر و ثواب سے

---

[1] صحیح مسلم، حدیث: 1817، و سنن أبي داود، حدیث: 2732، و سنن الترمذي، حدیث: 1558، و مسند أحمد: 3/149,148.

مستغنی ہوں۔'' [1]

کفار کی مسلمانوں سے جنگ کرنے کی ضد

قریش کے تجارتی قافلے کے قائد ابوسفیان (رضی اللہ عنہ) کو جب خبر ملی کہ نبی ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تجارتی قافلے کو روکنے کی غرض سے روانہ ہو چکے ہیں تو اس نے فوراً قافلے کا رخ ساحل سمندر کی طرف موڑ دیا اور اس وقت ضمضم بن عمرو غفاری کو قافلے کی حفاظت کی غرض سے نفری طلب کرنے کے لیے مکہ روانہ کر دیا۔ [2]

ابوسفیان (رضی اللہ عنہ) سمجھدار اور ہوشیار آدمی تھے۔ وہ لحہ بہ لحہ مسلمانوں کی پیش قدمی سے باخبر تھے اور بذات خود جاسوسی کر رہے تھے۔ خود بدر کے مقام تک پہنچے اور وہاں کے لوگوں سے سوال کیا: ''کیا تم نے یہاں کسی کو دیکھا ہے؟'' انھوں نے کہا: ''ہاں، دو آدمیوں کو دیکھا ہے۔'' ابوسفیان نے کہا: ''مجھے ان کے پڑاؤ کی جگہ دکھاؤ۔'' انھوں نے اسے وہ جگہ دکھا دی۔ ابوسفیان نے وہاں پڑا اونٹ کا مینگنا اٹھایا اور اسے توڑا تو اندر سے کھجور کی گٹھلی نکلی۔ بولا: ''اللہ کی قسم! یہ تو یثرب کا چارہ ہے۔'' [3]

ابوسفیان نے مسلمانوں کی نقل و حرکت پر نظر رکھنے کی بھرپور کوشش کی یہاں تک کہ اس نے اسلامی ہراول دستے کی معلومات ان کے جانوروں کی غذا سے حاصل کر لیں اور یہ اطلاع اونٹوں کے فضلات سے نکلنے والی گٹھلی سے حاصل ہوئی۔ یہ دونوں مدینہ کے مسلمان تھے۔ ابوسفیان نے محسوس کر لیا کہ اس کا قافلہ خطرے میں ہے۔ اس نے فوراً ضمضم بن عمرو کو قریش کی طرف مکہ روانہ کیا اور احتیاطاً قافلے کا رخ تبدیل کر کے ساحل سمندر کی طرف موڑ دیا۔ [4]

قافلۂ تجارت کو پیش آنے والے ممکنہ حادثے کی خبر قریش پر انتہائی گراں گزری۔ تمام

---

1 مسند أحمد: 411/1، احمد شاکر رحمہ اللہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ 2 نضرة النعيم: 287/1. 3 السيرة النبوية لابن هشام: 230/2. 4 غزوة بدر الكبرى لأبي فارس، ص: 34,33.

سردارانِ قریش غصے میں آ گئے کیونکہ یہ ان کی رسوائی کا باعث تھا۔ اور ان کے اقتصادی مفادات کو چیلنج کرنے کے ساتھ ساتھ دیگر قبائل کے ہاں ان کے مقام و مرتبہ کو ختم کرنے کے مترادف تھا، اس لیے وہ اپنی پوری جنگی طاقت کے ساتھ ان سنگین حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے فوراً نکل کھڑے ہوئے۔ [1]

ضمضم بن عمرو غفاری اشتعال انگیز حالت میں مکہ پہنچا۔ ہر دیکھنے والا اور اس کی بات سننے والا متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس نے اپنے اونٹ کی ناک کاٹ ڈالی تھی، کجاوے کا رخ الٹا کیا ہوا تھا اور اپنی قمیص سامنے اور پیچھے سے پھاڑ رکھی تھی۔ اور چیختا چلاتا اور یہ کہتا ہوا مکہ میں داخل ہوا: ''اے قریش کی جماعت! اپنے تجارتی قافلے کی خبر لو! اسے بچا لو! تمھارے اموال جو ابوسفیان لے کر آ رہا تھا اسے محمد (ﷺ) اور اس کے ساتھیوں نے گھیر لیا ہے۔ میرا نہیں خیال کہ تم بروقت وہاں پہنچ سکو! جلدی مدد کو پہنچو، جلدی مدد کو پہنچو۔'' [2]

ابوسفیان جب جحفہ پہنچا اور قافلہ خطرے سے نکل آیا تو اس نے قریشی سرداروں کو پیغام بھیجا کہ وہ اور قافلہ بچ نکلے ہیں، لہٰذا آپ سب واپس مکہ چلے جائیں۔ اس سے قریشی زعماء کے درمیان اختلاف رائے پیدا ہو گیا۔ اکثریت نے مسلمانوں کی سرکوبی کو مستقبل کے خطرات سے اپنے تجارتی راستوں کو محفوظ بنانے اور دیگر عرب قبائل میں اپنی ساکھ برقرار رکھنے کی غرض سے مقام بدر کی طرف آگے بڑھنے کا فیصلہ کیا۔ بنوزہرہ نے اس کی مخالفت کی اور مکہ کی جانب واپس پلٹ آئے۔

بہر حال قریش اور ان کے حلیفوں کی اکثریت آگے بڑھتی چلی گئی تا آنکہ انھوں نے مقام بدر میں پڑاؤ کیا۔ [3]

رسول اللہ ﷺ کا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ

جب نبی ﷺ کو تجارتی قافلے کے بچ نکلنے اور قریشی سرداروں کی لڑائی پر ضد کرنے کی

[1] نضرة النعيم: 287/1. [2] السيرة النبوية لابن هشام: 221/2. [3] نضرة النعيم: 287/1.

خبر پہنچی تو آپ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ طلب فرمایا۔[1]

بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے قریش کے ساتھ مسلح تصادم سے بچنے کا مشورہ دیا کیونکہ انھیں ایسی کسی پیش آنے والی صورت حال کی قطعی توقع نہ تھی اور نہ ہی وہ اس کے لیے تیار ہو کر آئے تھے۔ انھوں نے اپنے نقطۂ نظر کے مطابق رسول اللہ ﷺ کو جنگ نہ کرنے پر قائل کرنے کی کوشش کی۔ قرآن کریم نے ان چند لوگوں کی اس رائے اور ان کے علاوہ دیگر تمام اہل ایمان کے احوال کی یوں منظر کشی کی ہے:

﴿ كَمَآ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْۢ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ ○ يُجَادِلُوْنَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ ○ وَاِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآئِفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ وَيُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ ○ لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ○ ﴾

”جیسے (بدر کے موقع پر) آپ کے رب نے آپ کو آپ کے گھر (مدینہ) سے حق (بہترین تدبیر) کے ساتھ نکالا تھا اور بے شک (اس وقت) مومنوں کا ایک گروہ (اس نکلنے کو) ناپسند کرتا تھا، وہ آپ سے حق (کے معاملے) میں اس کے واضح ہو جانے کے بعد جھگڑتے تھے، گویا کہ انھیں موت کی طرف ہانکا جا رہا تھا اور وہ (اسے) دیکھ رہے تھے اور جب اللہ تم سے دو گروہوں میں سے ایک کا وعدہ کر رہا تھا کہ یقیناً وہ تمھارے لیے ہے اور تم چاہتے تھے کہ جو غیر مسلح (تجارتی قافلہ) ہے وہی تمھارے ہاتھ لگے اور اللہ کا ارادہ یہ تھا کہ وہ اپنے فرامین کے

1 صحيح البخاري، حديث: 3952، تفصیل کے لیے فتح الباری میں مذکورہ حدیث کے ذیل میں ملاحظہ کیجیے۔

ساتھ حق کو ثابت کر دکھائے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے تاکہ وہ حق کو حق کر دکھائے اور باطل کو باطل کر دکھائے اگرچہ مجرم لوگ (اسے) ناپسند ہی کریں۔"[1]

ایسی صورت حال میں مہاجرین کی قیادت دشمن سے مقابلہ کرنا چاہتی تھی اور آگے بڑھنے کے لیے تیار تھی۔[2]

اس وقت مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ نے دوٹوک موقف اختیار کیا، چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: "میں نے مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ کا ایک ایسا اعزاز دیکھا ہے اگر وہ اعزاز مجھے حاصل ہو جاتا تو دنیا کی کوئی قیمتی چیز بھی اس کے عوض قبول نہ کرتا۔ وہ اعزاز یہ تھا کہ حضرت مقداد مشرکین کو بددعائیں دیتے ہوئے نبی علیہ السلام کے پاس حاضر ہوئے اور عرض گزار ہوئے: "ہم اس طرح نہیں کہیں گے جس طرح موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے کہا تھا:

﴿فَاذْهَبْ اَنْتَ وَ رَبُّكَ فَقَاتِلَاۤ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ﴾

"تو اور تیرا رب جائے، پھر تم دونوں ان سے لڑو، ہم تو یہیں بیٹھے ہیں۔"[3]

بلکہ ہم تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دائیں بائیں اور آگے پیچھے سے آپ کا دفاع کرتے ہوئے مشرکین سے جنگ کریں گے۔" نبی علیہ السلام کا چہرۂ مبارک مقداد رضی اللہ عنہ کی یہ بات سن کر خوشی سے دمکنے لگا۔"[4]

ایک اور روایت میں ہے: "حضرت مقداد رضی اللہ عنہ نے کہا: "اے اللہ کے رسول! ہم آپ سے وہ بات نہیں کریں گے جو بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام سے کی تھی کہ "آپ اور آپ کا رب جائیں اور لڑائی کریں ہم یہاں بیٹھے ہیں۔" بلکہ آپ قدم بڑھایئے ہم آپ کے ساتھ ہیں۔" نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسا محسوس ہوا جیسے بہت بڑا بوجھ سر سے اتر گیا ہو۔"[5]

اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دوبارہ فرمایا: «أَشِيرُوا عَلَيَّ أَيُّهَا النَّاسُ!» "اے لوگو!

---

[1] الأنفال 8:5-8. [2] نضرة النعيم: 288/1. [3] المآئدة 5:24. [4] صحيح البخاري، حديث: 3952. [5] صحيح البخاري، حديث: 4609.

مجھے مشورہ دو۔'' آپ کا اشارہ انصار کی طرف تھا کیونکہ لشکر کا اکثر حصہ انصار پر مشتمل تھا اور بیعت عقبہ ثانیہ میں بظاہر کوئی ایسی شق موجود نہ تھی کہ انصار مدینہ سے باہر بھی آپ ﷺ کی نصرت وحمایت کریں گے۔

انصار کے علمبردار حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے نبی علیہ السلام کے اشارے کو سمجھا اور عرض کرنے لگے: ''اللہ کی قسم! شاید آپ ہم انصار کی طرف اشارہ کر رہے ہیں؟'' نبی ﷺ نے فرمایا: «أَجَلْ» ''ہاں'' تو حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ''بلاشبہ اے اللہ کے رسول! ہم آپ پر ایمان لائے، آپ کی تصدیق کی اور گواہی دی کہ جو پیغام آپ لے کر آئے ہیں وہ برحق ہے۔ اسی طرح ہم نے سمع و طاعت پر آپ سے عہد و میثاق کیے۔ اے اللہ کے رسول! آپ اپنی مرضی کے مطابق آگے قدم بڑھایئے ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو برحق مبعوث فرمایا! اگر ہمارے راستے میں سمندر بھی آ جائے تو ہم آپ کے ساتھ اس میں کود جانے سے بھی گریز نہ کریں گے۔ ہمارا کوئی آدمی بھی پیچھے نہ رہے گا۔ ہم دشمن کے ساتھ جنگ کرنے کو برا خیال نہیں کرتے۔ ہم تو جنگ میں ڈٹ جانے والے اور دشمن کے مقابلے میں ثابت قدم رہنے والے ہیں۔ ممکن ہے اللہ ہم سے ایسا کام لے جس سے آپ کی آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں۔ آپ اللہ تعالیٰ کی طرف سے خیر و برکت پر آگے بڑھیے۔''[1]

حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کی یہ گفتگو نبی ﷺ کے لیے انتہائی خوش کن تھی۔ اس سے آپ کے اندر تروتازگی کی لہر دوڑ گئی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: «سِيرُوا وَ أَبْشِرُوا، فَإِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى قَدْ وَعَدَنِي إِحْدَى الطَّائِفَتَيْنِ، وَاللّٰهِ! لَكَأَنِّي الْآنَ أَنْظُرُ إِلٰى مَصَارِعِ الْقَوْمِ» ''آگے بڑھو اور خوش ہو جاؤ یقیناً اللہ تعالیٰ نے مجھ سے (کفار کے

---

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 267/2، اس سے ملتے جلتے الفاظ سے امام مسلم رحمہ اللہ نے بھی اس واقعے کو بیان کیا ہے، دیکھیے: صحيح مسلم، حديث: 1779.

تجارتی قافلے یا جنگی گروہ) دونوں میں سے ایک کا وعدہ فرمایا ہے۔ اللہ کی قسم! مجھے اب ایسا لگ رہا ہے کہ میں کفار کی قتل گاہیں دیکھ رہا ہوں۔''[1]

سیدنا سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کی یہ باتیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ولولہ انگیز اور حوصلہ افزا ہونے کے ساتھ ساتھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے ہمت اور جوش کا باعث تھیں۔ ان جذبات سے صحابہ کرام کا حوصلہ بلند ہوا اور ان میں دشمن سے تصادم کا جذبہ پیدا ہوا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جہاد کے میدانوں میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ طلب کرنا مشورے کی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے۔ جنگیں قوموں کی منزل متعین کرتی ہیں یا تو انھیں بلندیوں پر فائز کر دیتی ہیں یا پستیوں میں دھکیل دیتی ہیں۔[2]

دشمن سے متعلقہ معلومات کی فراہمی اور پیش قدمی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کے جذبۂ اطاعت، شجاعت اور لڑائی کرنے پر اتفاق کا بخوبی جائزہ لیا اور پھر صفوں کو ترتیب دی۔ جنگ کے لیے سفید رنگ کا جھنڈا مقرر فرمایا اور جھنڈا مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو عطا کیا۔ علاوہ ازیں دو سیاہ جھنڈے تیار فرمائے۔ ایک سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ اور دوسرا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو عطا فرمایا اور پیچھے والے دستے پر قیس بن ابی صعصعہ رضی اللہ عنہ کو مقرر فرمایا۔[3]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابو بکر رضی اللہ عنہ کو ساتھ لیے اس علاقے کا جائزہ لے رہے تھے اور قریشی لشکر کے بارے میں معلومات بھی فراہم کر رہے تھے۔ اسی دوران ان کی ملاقات ایک بوڑھے آدمی سے ہوئی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے قریشی لشکر اور اسلامی لشکر دونوں کے بارے میں سوال کیا۔ اس نے جواب دیا: ''میں اس وقت تک تمھیں کچھ نہیں بتاؤں گا جب تک تم مجھے اپنے بارے میں نہ بتاؤ گے کہ تم کون ہو۔'' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «إِذَا أَخْبَرْتَنَا،

[1] دلائل النبوة للبيهقي: 34/3، والسيرة النبوية لابن هشام: 267/2، وفقه السيرة للألباني: 223/1. [2] غزوة بدر الكبرٰى لأبي فارس، ص: 37. [3] زاد المعاد: 172/3.

أَخْبَرْنَاكَ» ”پہلے تم ہمیں معلومات فراہم کرو، پھر ہم بھی تمھیں اپنے بارے میں بتا دیں گے۔“ اس نے کہا: ”گویا کہ یہ تبادلہ ایک دوسرے کے عوض ہوگا؟“ نبی ﷺ نے فرمایا: «نَعَمْ» ”ہاں“ وہ کہنے لگا: ”مجھے یہ خبر ملی ہے کہ محمد (ﷺ) اور اس کے ساتھی فلاں دن مدینہ سے روانہ ہوئے تھے۔ اگر خبر دینے والے نے مجھ سے سچ بولا ہے تو وہ لوگ آج فلاں مقام پر ہوں گے۔ اور اس شخص نے بعینہ اس جگہ کی نشاندہی کی جہاں اسلامی لشکر خیمہ زن تھا۔ اور مجھے خبر ملی ہے کہ قریشی لشکر فلاں دن مکہ سے روانہ ہوا اور اگر بتانے والے نے مجھے صحیح بتایا ہے تو وہ آج فلاں جگہ پر ہوں گے۔“ اور بعینہٖ اس جگہ کی نشاندہی کی جہاں مشرکین نے پڑاؤ ڈال رکھا تھا۔

اب بوڑھے نے کہا: ”میں نے تمھاری ضرورت کے مطابق معلومات فراہم کر دیں اب تم بتاؤ کہ تم کون ہو؟“ نبی ﷺ نے فرمایا: «نَحْنُ مِنْ مَّاءٍ» ”ہم پانی سے ہیں۔“ نبی ﷺ اور ابوبکر رضی اللہ عنہ یہ کہہ کر فوراً واپس چل دیے۔ وہ بوڑھا یہی الفاظ دہرا رہا تھا کہ کون سا پانی؟ کیا عراق کے پانیوں سے؟ [1]

اسی رات آپ ﷺ نے علی بن ابی طالب، زبیر بن عوام اور سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہم پر مشتمل صحابہ کرام کی مختصر جماعت کو بدر کے کنویں کی طرف روانہ کیا تاکہ قریشی لشکر کے بارے میں مزید معلومات اکٹھی کی جائیں۔ وہاں انھوں نے دو لڑکوں کو دیکھا جو قریشی لشکر کے لیے پانی لینے آئے تھے۔ وہ ان دونوں کو پکڑ کر نبی ﷺ کے پاس لے آئے۔ آپ ﷺ نے ان دونوں سے پوچھا: «أَخْبِرَانِي عَنْ جَيْشِ قُرَيْشٍ» ”مجھے قریش کے لشکر کے بارے میں خبر دو!“ انھوں نے کہا: ”اللہ کی قسم! وہ اُس دور والے کنارے پر واقع ٹیلے کے پیچھے ہیں۔“ نبی علیہ السلام نے دریافت فرمایا: «كَمِ الْقَوْمُ؟» ”کتنے لوگ ہیں؟“ انھوں نے کہا: ”وہ بہت زیادہ ہیں۔“ آپ ﷺ نے فرمایا: «مَا عِدَّتُهُمْ؟» ”ان کی تعداد

1 السيرة النبوية لابن هشام: 2/268، 269.

کتنی ہے؟'' ان دونوں نے کہا: ''تعداد ہمیں معلوم نہیں۔'' نبی ﷺ نے پھر فرمایا: «کَمْ يَنْحَرُونَ كُلَّ يَوْمٍ؟» ''وہ روزانہ کتنے اونٹ ذبح کرتے ہیں؟'' دونوں نے جواب دیا: ''کبھی نو اور کبھی دس۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: «اَلْقَوْمُ مَا بَيْنَ التِّسْعِ مِئَةٍ وَّالْأَلْفِ» ''ان کی تعداد نو سو سے ہزار تک ہے۔'' پھر نبی ﷺ نے پوچھا: «فَمَنْ فِيهِمْ مِّنْ أَشْرَافِ قُرَيْشٍ؟» ''ان میں قریش کے بڑے سردار کون کون سے ہیں؟'' انھوں نے ربیعہ کے بیٹے عتبہ اور شیبہ، ابوجہل اور امیہ بن خلف کے علاوہ چند دیگر سردارانِ قریش کا نام لیا۔ آپ ﷺ صحابہ کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا:

«هٰذِهِ مَكَّةُ قَدْ أَلْقَتْ إِلَيْكُمْ أَفْلَاذَ كَبِدِهَا»

''مکہ نے تمھارے سامنے اپنے جگر گوشے ڈال دیے ہیں۔''[1]

غزوات میں رسول اللہ ﷺ کا طریقہ کار یہ ہوتا تھا کہ پہلے آپ ﷺ دشمن کے بارے میں مکمل معلومات فراہم کرتے اور ان کے تمام مقاصد و اہداف جاننے کی کوشش فرماتے تاکہ کوئی مناسب اور مربوط منصوبہ بندی کی جا سکے۔

غزوۂ بدر میں نبی ﷺ نے بلاواسطہ اور بالواسطہ دونوں طریقوں سے قریش کی حرکات و سکنات کا جائزہ لیا اور اپنی خبر کو حد درجہ چھپائے رکھا۔ یہ ایک جنگی اصول ہے۔ قرآن کریم میں اس قانون کی اہمیت اجاگر کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَإِذَا جَآءَهُمْ أَمْرٌ مِّنَ الْأَمْنِ أَوِ الْخَوْفِ أَذَاعُوا بِهِۦ ۖ وَلَوْ رَدُّوهُ إِلَى الرَّسُولِ وَإِلَىٰٓ أُولِي الْأَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِينَ يَسْتَنۢبِطُونَهُۥ مِنْهُمْ ۗ وَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُۥ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطَٰنَ إِلَّا قَلِيلًا ۝﴾

''اور جب ان کے پاس کوئی امن یا خوف کی خبر آتی ہے تو اسے مشہور کر دیتے ہیں، حالانکہ اگر وہ اسے رسول اور اپنے میں سے کسی ذمہ دار حاکم کے حوالے کر

[1] صحيح مسلم، حديث: 1779، والسيرة النبوية لابن هشام: 269/2.

دیتے تو ایسی باتوں کی تہہ تک پہنچنے والے اس کی حقیقت جان لیتے اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو چند ایک کے سوا تم ضرور شیطان کے پیچھے لگ جاتے۔‘‘ [1]

رسول اللہ ﷺ نے عمومی طور پر تمام غزوات میں اپنی خبروں اور ارادوں کو چھپائے رکھا۔ حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب کسی غزوے کا ارادہ فرماتے تو جس طرف جانا ہوتا اس کے سوا کسی اور طرف جا کر ظاہر کرتے کہ ہم اس طرف جا رہے ہیں۔ [2]

غزوۂ بدر میں نبی ﷺ نے دشمن کی سرگرمیوں سے آگاہ ہونے اور اپنے سے متعلقہ تمام خبروں کو چھپانے کے جو اقدامات کیے وہ مندرجہ ذیل تھے:

- بدر میں ملنے والے بوڑھے شخص سے اپنے لشکر اور قریشی لشکر کے بارے میں سوال کرنا۔
- اس بزرگ کے سوال: ’’تم کون ہو؟‘‘ کے جواب میں آپ ﷺ کا فرمان کہ ہم پانی سے ہیں۔ یہ توریہ تھا اور یہی جواب موقع کے مطابق تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس طریقے سے دشمن سے اسلامی لشکر کے حالات مخفی رکھے۔
- بوڑھے آدمی کو جواب دینے کے بعد فوراً واپس پلٹنا بھی رازداری کا ایک انداز تھا اور آپ ﷺ کی حکمت و دانائی کا ثبوت تھا۔ اگر بالفرض آپ ﷺ اس جواب کے بعد وہاں رکتے تو وہ بزرگ لازمی طور پر آپ کے جواب: ’’ہم پانی سے ہیں۔‘‘ کی تفصیل طلب کرتا۔
- اونٹوں کی گردنوں سے گھنٹیاں اتارنے کا حکم: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ’’نبی علیہ السلام

1 النسآء 4:83. 2 صحيح البخاري، حديث: 2948,2947. اس حدیث میں بیان کردہ اس فعل کو ’’توریہ‘‘ کہا جاتا ہے۔

نے بدر کے دن اونٹوں کی گردنوں سے گھنٹیاں اتارنے کا حکم صادر فرمایا تھا۔" [1]

❁ بدر کی طرف روانگی کے وقت منزل مقصود کو مکمل صیغۂ راز میں رکھنا جیسا کہ نبی علیہ السلام نے فرمایا تھا: «إِنَّ لَنَا طَلِبَةً، فَمَنْ كَانَ ظَهْرُهُ حَاضِرًا فَلْيَرْكَبْ مَعَنَا»

"ہم کسی کی طلب میں جارہے ہیں جس کے پاس سواری ہو وہ ہمارے ساتھ چلے۔" [2]

علامہ نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرامین سے جنگ میں "توریہ" کرنے کا ثبوت ملتا ہے جسے استحباب پر محمول کیا جائے گا کہ امام اپنے لشکروں کی پیش قدمی کی اطلاع اور منزلِ مقصود کی نشاندہی نہ کرے تاکہ یہ خبر عام نہ ہو اور خبر پا کر دشمن متنبہ نہ ہو جائے۔ [3]

سیرت طیبہ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ مکہ میں سری اور جہری دعوت کا دور ہو یا مدینہ منورہ میں اسلامی ریاست کے وجود کے بعد کا، ہر جگہ حفاظتی اقدامات کو ملحوظ خاطر رکھا گیا جو وقت کے ساتھ ساتھ خصوصاً غزوات میں ترقی کرتا چلا گیا۔

حباب بن منذر رضی اللہ عنہ کا مشورہ

لشکر کفار کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کر لینے کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو مقام بدر کی طرف پیش قدمی کا حکم فرمایا تاکہ دشمن سے پہلے بدر کے چشمے پر قبضہ کر لیں اور مشرکین کو اس پر قبضہ نہ کرنے دیں، چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کے چشمے کے قریب پڑاؤ ڈالا۔ اس موقع پر حباب بن منذر رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور عرض کیا: "اے اللہ کے رسول! کیا آپ اللہ کے حکم سے اس مقام پر ٹھہرے ہیں کہ اب ہمارے لیے اس سے آگے یا پیچھے ہونے کی گنجائش نہیں ہے یا محض جنگی حکمت عملی اختیار فرمائی ہے؟" نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «بَلْ هُوَ الرَّأْيُ وَالْحَرْبُ وَالْمَكِيدَةُ» "یہ جگہ محض جنگی نقطہ نظر سے اختیار کی

---

1 مسند أحمد: 150/6، و صحيح ابن حبان، حديث: 4699و 4702، و مجمع الزوائد: 174/5. 2 صحيح مسلم، حديث: 1901. 3 شرح صحيح مسلم للنووي، تحت الحديث: 1901.

گئی ہے۔'' حباب بن منذر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! پھر یہ جگہ مناسب معلوم نہیں ہوتی۔ آپ مزید کچھ آگے تشریف لے جائیں اور جو چشمہ قریش کی جانب بالکل قریب ہے وہاں فروکش ہوں، پھر ہم باقی تمام چشمے پاٹ دیں گے اور اپنے والے چشمے پر حوض بنالیں گے اور پانی بھرلیں گے۔ جب جنگ ہوگی تو ہمارے لیے پانی میسر ہوگا اور دشمن کو پانی نہ مل سکے گا۔'' نبی ﷺ نے حباب بن منذر رضی اللہ عنہ کا مشورہ قبول فرمایا۔ آپ ﷺ تمام لشکر کے ساتھ آگے بڑھے اور دشمن کے قریب ترین چشمے پر پڑاؤ فرمایا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے وہاں حوض بنایا اور باقی تمام چشموں کو بند کر دیا۔[1]

حباب بن منذر رضی اللہ عنہ کا مشورہ دینا اور آپ ﷺ کا اسے قبول کرنا نبی ﷺ کی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ تعلقات کی عمدہ مثال تھی۔ حالات چاہے کیسے ہی کیوں نہ ہوں معاشرے کے ہر فرد کو اظہار رائے کا حق حاصل تھا۔ رائے کا اظہار کرنے والے کو اپنے سالار اعلیٰ کی ناراضی کا کوئی اندیشہ نہ تھا۔ اسی طرح اس پر مرتب ہونے والے امور جیسے قائد کی رائے کے خلاف مشورہ دینے والے کی اچھی شہرت کو داغدار کرنا، اس کے مرتبے کو کم کرنا یا قائد کی طرف سے اُس کے جان و مال کو ضرر پہنچنا وغیرہ اسے اِن میں سے کسی بات کا کوئی اندیشہ تک نہ ہوتا تھا۔

یہی وہ آزادی اظہار تھا جس پر نبی ﷺ نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی تربیت فرمائی۔ اسی تربیت کے سبب معاشرے کے تمام معقول رائے رکھنے والے اور باشعور افراد کی ذہانت و فطانت سے استفادہ ممکن ہوا۔ اور معلوم ہوا کہ سالار اعلیٰ شورائی نظام کی بدولت عظیم کامیابی حاصل کر سکتا ہے۔ قائد کو چاہیے کہ وہ صرف اپنی یا کسی ایسے خاص طبقے کی طرف سے مسلّط کردہ رائے پر نہ چلے جس سے ان کے ذاتی مفادات کا مسئلہ کھڑا ہو جائے۔ جس میں عوام الناس کی مصلحتوں کا خیال نہ رکھا گیا ہو۔ قائد تو اپنے تمام سپاہیوں اور

[1] السيرة النبوية لابن هشام:2/272، ودلائل النبوة للبيهقي: 3/35.

کارکنوں کی رائے کا احترام کرنے والا ہوتا ہے۔ چاہے کوئی درست مشورہ دینے والا گمنام اور کم درجے کا حامل ہی کیوں نہ ہو۔ ایسے آدمی اور سالارِ اعلیٰ کے درمیان کسی قسم کی کوئی رکاوٹ نہیں ہونی چاہیے۔[1]

حضرت حباب بن منذر رضی اللہ عنہ کے اس مشورے میں ہم ان کی شخصیت میں نبوی تربیت کا گہرا اثر بھی محسوس کر سکتے ہیں۔ حباب بن منذر رضی اللہ عنہ نے انتہائی مؤدبانہ انداز اختیار کیا۔ وہ اگرچہ طلب کیے بغیر مشورہ دینے کے لیے آگے بڑھے تھے لیکن انھوں نے اظہارِ رائے سے پہلے ایک شاندار سوال کیا: ''اے اللہ کے رسول! کیا اس مقام پر ٹھہرنے کا حکم اللہ کی طرف سے نازل ہوا ہے کہ ہم آگے یا پیچھے نہیں ہو سکتے یا آپ نے اسے محض جنگی مصلحت کی خاطر اختیار فرمایا ہے؟''

ایسا سوال کسی بھی آدمی کی انفرادیت اور اعلیٰ قیادت سے متعلقہ ادبی صلاحیتوں کا پتا دیتا ہے کہ اپنے عظیم قائد کے سامنے گفتگو کب اور کیسے کی جاتی ہے۔

حضرت حباب رضی اللہ عنہ کا مقصد یہ تھا کہ اگر یہ مقام بذریعہ وحی منتخب ہوا ہے تو زبان سے ایک لفظ بولنے سے بہتر ہے کہ جان چلی جائے لیکن اگر یہ بشری تقاضوں کے مطابق ہے تو جنگی نقطہ نظر سے ان کے پاس اس سے زیادہ مناسب لائحہ عمل موجود ہے۔

بلاشبہ اس بلند پایہ مشورے نے اظہار رائے کے نئے اور عمدہ اصول متعارف کروائے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سمع و طاعت، آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے گفتگو اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے کے خلاف رائے کی حدود کو متعین کیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عظیم قائدانہ صلاحیتوں کا ظہور بھی ہوا کہ آپ نے اس نئی رائے کو بغور سنا اور اپنے اس عظیم فوجی کمانڈر کی پیش کردہ تجویز کو عملی شکل دی۔[2]

قرآن کریم میں مشرکین کی پیش قدمی کا تذکرہ

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

[1] التاريخ الإسلامي للحميدي: 4/110. [2] التربية القيادية للدكتور الغضبان: 3/21.

﴿وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ خَرَجُوا مِن دِيَارِهِم بَطَرًا وَرِئَاءَ النَّاسِ وَيَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ ۚ وَاللَّهُ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطٌ﴾

''اور ان لوگوں کی طرح مت ہو جاؤ جو اپنے گھروں سے اتراتے اور لوگوں کو دکھلاتے اور اللہ تعالیٰ کی راہ سے لوگوں کو روکتے ہوئے نکلے، حالانکہ اللہ تعالیٰ ان کے سب کاموں کو گھیرے ہوئے ہے۔''[1]

اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو ان کافروں کی مشابہت اختیار کرنے سے روکا ہے جو اپنے گھروں سے تکبر اور دکھلاوے کی غرض سے روانہ ہوئے۔ آیتِ مذکور کی تفسیر حسب ذیل ہے:

﴿بَطَرًا﴾ علامہ قرطبی فرماتے ہیں کہ لغت میں ''بطر'' تقویت کو کہا جاتا ہے، یعنی اللہ عزوجل کی نعمتوں اور عطا کردہ عافیت کی بدولت اسی کی معاصی کو تقویت دینا۔[2]

﴿وَرِئَاءَ﴾ سے مراد ہر وہ قول اور فعل ہے جو اخلاص سے خالی ہو اور اس کا مقصد صرف نمود و نمائش اور تعریف کا حصول ہو۔

﴿وَيَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ ۚ﴾ اس کا عطف ﴿بَطَرًا﴾ پر ہے۔ ﴿سَبِيلِ﴾ کا لفظ ہر اس راستے پر بولا جاتا ہے جس میں آسانی ہو اور سبیل اللہ سے مراد اللہ کا دین اور اس کا راستہ ہے جس میں لوگوں کی بھلائی اور اصلاح مضمر ہے۔

اللہ تعالیٰ نے یہاں مشرکین کے تین عیب بیان فرمائے ہیں:

① اترانا۔ ② ریاکاری۔ ③ اللہ کے راستے سے روکنا۔

اللہ تعالیٰ نے ان کے تکبر اور اترانے کو صیغۂ اسم ﴿بَطَرًا وَرِئَاءَ﴾ سے بیان فرمایا ہے جو ثبوت اور دوام پر دلالت کرتا ہے اور اللہ کے راستے سے روکنے کو صیغۂ فعل ﴿وَيَصُدُّونَ﴾ سے بیان فرمایا ہے جس میں دوام نہیں ہوتا بلکہ وہ کسی کام کے بار بار

1 الأنفال 8:47. 2 تفسير القرطبي: 8/25.

واقع ہونے پر دلالت کرتا ہے۔[1]

امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''یقیناً ابو جہل اور اس کا گروہ فطرتاً خود پسندی اور تکبر میں مبتلا تھے۔ اور ان کی طرف سے اللہ کے راستے سے روکنے والی خرابی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نبوت سے سرفراز ہونے کے بعد شروع ہوئی تھی، اس لیے تکبر اور ریاکاری کو صیغۂ اسم اور اللہ کے راستے سے روکنے کو صیغۂ فعل سے بیان فرمایا گیا ہے۔ واللّٰہ أعلم.[2]

علامہ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ابو جہل اور اس کے دیگر رفقاء بدر کے دن اپنے تجارتی قافلے کی مدد کے لیے آئے اور اپنے ساتھ گانے بجانے کا سامان اور گانے والیاں بھی لے کر آئے تھے۔ جب وہ جحفہ پہنچے تو خُفاف الکنانی، جو ابو جہل کا دوست تھا، اس نے اپنے بھائی کو تحائف دے کر ابو جہل کی طرف روانہ کیا اور کہلا بھیجا: ''اگر تم پسند کرو تو میں تمھاری مدد کے لیے کچھ آدمی بھیج دیتا ہوں یا خود اپنی قوم کے ہمراہ تمھاری مدد کے لیے آجاتا ہوں؟'' ابو جہل نے جواب دیا: ''اللہ کی قسم! اگر ہم، محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے گمان کے مطابق، اللہ سے جنگ کر رہے ہیں تو اس ذات سے مقابلہ کرنے کی ہم میں طاقت نہیں اور اگر ہم لوگوں سے لڑتے ہیں تو اللہ کی قسم! ہمارے پاس ان سے لڑنے کی طاقت موجود ہے۔ اللہ کی قسم! ہم کبھی بھی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے لڑائی کے میدان میں پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ ہم ہر حال میں مقام بدر تک پہنچیں گے۔ وہاں ہم شراب پئیں گے۔ گلوکارائیں گانا گائیں گی۔ بلاشبہ مقامِ بدر عرب کا میلہ ٹھہرے گا اور عرب کا ایک بڑا بازار ہو گا۔ سارا عرب ہمارے مکہ سے یہاں آنے کا حال سنے گا اور ہمیشہ کے لیے ان پر ہماری دھاک بیٹھ جائے گی۔''[3]

روانگی کے وقت مشرکین کے خیالات

اللہ تعالیٰ نے روانگی کے وقت مشرکین کے خیالات کو اس طرح بیان فرمایا ہے:

---

[1] حديث القرآن عن غزوات الرسول ﷺ لأبي بدر محمد بكر آل عابد:1/65,66. [2] تفسير الرازي:15/173. [3] تفسير القرطبي:8/25.

﴿إِن تَسْتَفْتِحُوا فَقَدْ جَاءَكُمُ الْفَتْحُ ۖ وَإِن تَنتَهُوا فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۖ وَإِن تَعُودُوا نَعُدْ وَلَن تُغْنِيَ عَنكُمْ فِئَتُكُمْ شَيْئًا وَلَوْ كَثُرَتْ وَأَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُؤْمِنِينَ ۝﴾

''(کافروں سے کہہ دیجیے:) اگر تم فیصلہ مانگتے تھے تو فیصلہ تمھارے سامنے آ گیا۔ اور اگر تم باز آ جاؤ تو وہ تمھارے حق میں بہتر ہے اور اگر تم دوبارہ (پہلے کی طرح) کرو گے تو ہم بھی پھر اسی طرح کریں گے (تمھیں سزا دیں گے) اور تمھاری جماعت اگرچہ زیادہ ہی ہو وہ تمھیں ہرگز کچھ فائدہ نہ دے گی اور بے شک اللہ مومنوں کے ساتھ ہے۔''[1]

امام احمد رحمہ اللہ عبداللہ بن ثعلبہ سے بیان فرماتے ہیں کہ ابوجہل نے معرکۂ بدر کے بارے میں یہ دعا کی: ''اے اللہ! ہم میں سے جو بہت زیادہ قطع رحمی کرنے والا اور ہمارے پاس غیر معروف (اجنبی) چیزیں لانے والا ہے اسے تو کل کو ہلاک کر دینا۔ ابوجہل ہی وہ شخص تھا جو فیصلہ مانگنے والا تھا۔''[2]

آیت کریمہ کا مطلب یوں ہوگا: ''اگر تم محمد ﷺ کے خلاف اللہ سے مدد مانگتے ہو تو سن لو تمھارے پاس اس کا فیصلہ آ گیا۔ مکہ سے روانہ ہوتے وقت انھوں نے اللہ سے دعا کی تھی کہ جو جماعت حق پر ہو اے اللہ! اس کی مدد فرما۔ اللہ تعالیٰ نے بطور استہزا مدد آنے کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ اور ان پر نازل ہونے والی ہلاکت کو مدد سے تعبیر کیا ہے۔ اور اس بنا پر باقی ماندہ آیت کا ترجمہ یوں ہوگا: ﴿وَإِن تَنتَهُوا﴾ ''اور اگر تم کفر اور پیغمبر کی عداوت سے باز آ گئے'' ﴿فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ﴾ ''تو یہ رکنا اور باز آنا تمھارے لیے بہتر ہوگا۔'' ﴿وَإِن تَعُودُوا﴾ ''اور اگر تم دوبارہ کفر و عناد کی طرف پلٹ گئے تو'' ﴿نَعُدْ﴾ ''ہم بھی

1 الأنفال 19:8. 2 مسند أحمد: 431/5، والسيرة النبوية لابن هشام: 280/2، و دلائل النبوة للبيهقي: 74/3.

اہل ایمان کو تم پر دوبارہ مسلط کر دیں گے۔ اور ان کی تمھارے خلاف مدد کریں گے جس طرح بدر میں کی تھی۔ ﴿ وَلَنْ تُغْنِيَ عَنْكُمْ فِئَتُكُمْ شَيْئًا وَّلَوْ كَثُرَتْ ﴾ ''چاہے تمھاری جماعت کتنی ہی کثرت میں کیوں نہ ہو، کسی حالت میں بھی تمھارے کام نہ آسکے گی۔'' ﴿ وَاَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ ''اور یقیناً اللہ مومنوں کے ساتھ ہے۔'' اور اللہ جس کے ساتھ ہو گویا وہ اللہ کی طرف سے مدد کیا گیا ہے اور جس کے خلاف ہو وہ رسوا ہو گا۔[1]

مکی لشکر میں پھوٹ: مکی لشکر جب مقام بدر میں خیمہ زن ہوا تو ان کا آپس میں اختلاف ہو گیا اور ان کی صفوں میں دراڑیں پیدا ہو گئیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ جب مسلمان مقامِ بدر میں پہنچے اور مشرکین بھی وہاں خیمہ زن ہو گئے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عتبہ بن ربیعہ کو سرخ اونٹ پر سوار دیکھا تو فرمایا: «إِنْ يَّكُنْ عِنْدَ أَحَدٍ مِّنَ الْقَوْمِ خَيْرٌ فَهُوَ عِنْدَ صَاحِبِ الْجَمَلِ الْأَحْمَرِ، إِنْ يُّطِيعُوهُ يَرْشُدُوا» ''اگر آج کے دن ان لوگوں میں سے کسی کے پاس بھلائی ہے تو وہ سرخ اونٹ والے کے پاس ہے۔ اگر لوگ اس کی بات مان لیں تو فائدے میں رہیں گے۔'' دراصل عتبہ بن ربیعہ یہ کہہ رہا تھا: ''اے میری قوم کے لوگو! ان کے بارے میں میری بات مان لو! اگر تم نے ان سے جنگ کی تو ساری عمر تمھارے دل میں یہ لڑائی کھٹکتی رہے گی۔ ہر آدمی اپنے بھائی یا باپ کے قاتل کو بھی دیکھتا رہے گا۔ اس معرکے کا بوجھ میرے سر چھوڑو اور واپس چلے جاؤ۔'' ابوجہل نے کہا: ''اللہ کی قسم! یہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور اس کے ساتھیوں کو دیکھ کر بزدل ہوا جا رہا ہے، حالانکہ یہ لوگ جب ہمارے مقابل آئیں گے تو اونٹنی کا لقمہ ثابت ہوں گے۔'' عتبہ نے کہا: ''عنقریب تجھے علم ہو جائے گا کہ کون بزدل اور اپنی قوم کو ہلاکت میں ڈالنے والا ہے۔ اللہ کی قسم! میں دیکھ رہا ہوں وہ تمھیں بہت زیادہ مار رہے ہیں۔ کیا تمھیں نظر نہیں آرہا کہ ان کے سر سانپوں کی طرح اٹھے ہوئے اور چہرے تلواروں کی طرح چمک

[1] حديث القرآن عن غزوات الرسول ﷺ لأبي بدر محمد بكر آل عابد: 68/1.

رہے ہیں۔''[1]

حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''اسلام لانے سے قبل بدر کے دن میں مشرکوں کی صفوں میں تھا۔ ہم مکہ سے آئے اور اس کنارے پر پڑاؤ کیا جس کا قرآن نے تذکرہ کیا ہے۔ میں عتبہ بن ربیعہ کے پاس آیا اور کہا: ''اے ابو ولید! کیا یہ ممکن نہیں کہ آپ ایک ایسا کام کریں کہ آپ کا ذکر خیر تاحیات جاری رہے؟'' عتبہ نے پوچھا: ''وہ کون سا کام ہے؟'' میں نے کہا: ''آپ لوگ محمد (ﷺ) سے عمرو بن حضرمی کا قصاص لینا چاہتے ہو کیونکہ وہ تمھارا حلیف تھا۔ ایسے کرو کہ تم اس کی دیت اپنے ذمے لے لو اور لوگوں کو واپس لے جاؤ۔'' عتبہ نے کہا: ''مجھے منظور ہے۔ میری طرف سے اس کی ضمانت لے لو میں اس کی دیت کا ذمہ دار ہوں۔ اب تم ابن حنظلیہ (ابوجہل) کے پاس جاؤ اور اسے کہو: ''کیا تم اپنے چچیرے بھائی کے خون سے دستبردار ہو کر لوگوں کو واپس نہیں لوٹا سکتے؟'' اس وقت ابوجہل کے پاس بہت سے لوگ جمع تھے اور عمرو بن حضرمی کا بھائی عامر بن حضرمی اس کے قریب ہی کھڑا تھا۔ ابوجہل کہنے لگا: ''میں عبدشمس اور بنو مخزوم سے اپنا معاہدہ توڑتا ہوں۔'' میں نے اس سے کہا: ''میں تیرے لیے عتبہ بن ربیعہ کا پیغام لے کر آیا ہوں کہ کیا تو اپنے چچیرے بھائی کے خون سے دستبردار ہو کر لوگوں کو واپس نہیں لوٹا سکتا؟'' وہ بولا: ''کیا تیرے علاوہ اسے کوئی سفیر نہیں ملا؟'' میں نے کہا: ''نہیں، میں کسی اور کا سفیر بننا بھی نہیں چاہتا'' پھر میں جلدی سے عتبہ کی طرف واپس گیا تاکہ مجھے اس معاملے کی باقی خبریں بھی حاصل ہو سکیں۔''[2]

قریشی سردار عتبہ بن ربیعہ محمد ﷺ کے ساتھ جنگ کی کوئی وجہ خیال نہیں کرتا تھا۔ اس نے محمد ﷺ کے خلاف جنگ نہ کرنے کی نصیحت کرتے ہوئے لوگوں سے کہا: ''اگر وہ اپنی

1 مجمع الزوائد: 76/6، و مسند البزار: 176/2. 2 السيرة النبوية لابن هشام: 275,274/2، و دلائل النبوة للبيهقي: 66,65/3.

دعوت میں سچا ہے تو اس کی عزت قریش کی عزت اور اس کی حکمرانی قریش کی حکمرانی ہوگی اور اس وجہ سے قریش سب سے زیادہ خوش بخت بن سکتے ہیں اور اگر وہ بالفرض جھوٹا ہوا تو خود بخود عرب میں پگھل کر ختم ہو جائے گا۔

لیکن جاہلیت کا تکبر اور ہٹ دھرمی ہمیشہ ہی سے حق کو پنپتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی کیونکہ حق کا ساتھ دینے کا واضح مطلب تھا کہ آج کے بعد جاہلیت اور اس کا تکبر و غرور ختم ہو گیا اور اس کی جگہ حق نے لے لی۔[1]

قریش نے اسلامی قوت کا اندازہ لگانے کے لیے عمیر بن وہب جمحی کو روانہ کیا۔ عمیر نے گھوڑے پر سوار ہو کر لشکر کا چکر لگایا، پھر واپس آ کر اطلاع دی کہ اسلامی لشکر میں تین سو سے کچھ کم یا زیادہ افراد ہیں۔ لیکن میں پھر بھی دیکھ لوں کہ ان کی کوئی کمین گاہ یا کمک تو نہیں؟ وہ وادی میں گھوڑا دوڑاتا ہوا دور نکل گیا لیکن اسے کچھ دکھائی نہ پڑا۔ اس نے واپس آ کر بتایا کہ مجھے تو کچھ نظر نہیں آیا لیکن اے قریش کے لوگو! میں نے بلائیں دیکھی ہیں جو موت کی نشاندہی کرتی ہیں اور یثربی اونٹ اپنے اوپر یقینی اور دائمی موت لادے ہوئے ہیں۔ یہ ایسے لوگ ہیں جن کا ملجا و ماویٰ اور مکمل دفاع خود ان کی تلواریں ہیں۔ اور میں یہ خیال کرتا ہوں کہ ان کا کوئی آدمی بھی تمھارے آدمی کو قتل کیے بغیر نہیں مرے گا۔ اور بالفرض اگر انھوں نے تمھارے چیدہ افراد کو مار لیا تو اس کے بعد جینے کا مزہ نہیں رہے گا، اس لیے ذرا اچھی طرح سوچ بچار کر لو۔[2]

امیہ بن خلف نے مکہ سے جنگ کے لیے روانہ ہونے سے انکار کر دیا تھا۔ ابوجہل اس کے پاس آیا اور بولا: ''اے ابوصفوان! تو اس علاقے کا سردار ہے۔ لوگ جب سنیں گے کہ تو نے جنگ میں شریک ہونے سے انکار کر دیا ہے تو وہ بھی انکار کر دیں گے۔'' پھر ابوجہل نے اس قدر اصرار کیا کہ امیہ کہنے لگا: ''اگر تو یہ لازمی سمجھتا ہے تو پھر میں مکہ کا سب سے

[1] مرویات غزوة بدر لأحمد باوزير، ص: 155. [2] البداية والنهاية: 269/3.

عمدہ اونٹ اس سفر کے لیے خریدوں گا۔'' بعدازاں اپنی بیوی سے مخاطب ہوا: ''اے ام صفوان! میرا سامان سفر تیار کردے۔'' اس نے کہا: ''اے ابوصفوان! شاید آپ کو اپنے یثربی بھائی سعد بن معاذ (رضی اللہ عنہ) کے الفاظ بھول گئے ہیں؟ اس نے کہا تھا: ''میں نے نبی ﷺ سے سنا ہے کہ تجھے مسلمان قتل کردیں گے۔'' امیہ نے کہا: ''میں تو صرف ان کے ہمراہ تھوڑی دور تک جاؤں گا۔'' جب وہ روانہ ہوا تو ہر منزل پر اپنے اونٹ کا گھٹنا باندھ دیتا۔ چلتے چلتے اسی طرح آگے بڑھتا گیا تا آنکہ اللہ کے حکم سے بدر میں قتل ہوگیا۔ [1]

ابوجہل نے ایک چالاکی یہ بھی دکھائی کہ عقبہ بن ابی معیط سے امیہ بن خلف کو جنگ پر ابھارنے کا کام لیا۔ عقبہ ایک انگیٹھی میں عود رکھے اور آگ روشن کیے اس کے پاس پہنچا اور انگیٹھی اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہنے لگا: ''تو عورتوں کی طرح بزدل ہے۔ یہاں بیٹھا رہ اور عود کی خوشبو لے۔'' امیہ نے کہا: ''تجھے اور جو تو لایا ہے اسے اللہ برباد کرے، پھر وہ اٹھا، سفر کی تیاری کی اور لشکر کے ساتھ روانہ ہوا۔' [2]

مکی لشکر اگرچہ بظاہر طاقت، عزم اور پختگی سے لبریز نظر آتا تھا لیکن ان کے دلوں میں خوف اور بزدلی ثبت ہوکر رہ گئی تھی اور وہ اندر سے بری طرح تذبذب کا شکار تھے۔ [3]

عاتکہ بنت عبدالمطلب کا خواب: عاتکہ بنت عبدالمطلب کے خواب نے اہل مکہ پر بہت گہرا اثر ڈالا۔ اس کا خواب یہ تھا کہ ایک آدمی نے قریش کو مدد کے لیے پکارا اور جبل ابوقبیس کی چوٹی سے ایک بڑا پتھر نیچے پھینکا۔ وہ پتھر ریزہ ریزہ ہوکر تمام قریش کے گھروں میں گرا۔ اس خواب کی وجہ سے عباس اور ابوجہل کے درمیان کچھ تکرار بھی ہوئی، پھر ضمضم آیا اور اس نے قافلہ تجارت کے بارے میں خبر دی۔ عاتکہ مکہ ہی میں رہیں حتی کہ اس خواب کی تعبیر اپنی آنکھوں سے دیکھی۔ [4]

---

[1] صحيح البخاري، حديث: 3950، و دلائل النبوة للبيهقي: 3/25-27. [2] السيرة النبوية لابن هشام: 2/610. [3] مرويات غزوة بدر لأحمد باوزير، ص: 138. [4] المجتمع المدني في عصر النبوة للدكتور العمري، ص: 138، و السيرة النبوية لابن هشام: 2/607,608.

جہیم بن صلت کا خواب: جب قریش جحفہ پہنچے تو جہیم بن صلت بن مطلب بن عبد مناف نے بھی ایک خواب دیکھا کہ ایک گھڑ سوار آدمی آیا۔ اس کے ساتھ ایک اونٹ بھی تھا۔ وہ آ کر وہاں رکا اور کہا: عتبہ بن ربیعہ، شیبہ بن ربیعہ، ابو الحکم بن ہشام، امیہ بن خلف اور فلاں فلاں سردار سب مارے گئے، پھر اس نے اپنے اونٹ کے حلق میں تیر مارا اور اسے لشکر کی طرف ہانک دیا۔ اور اس کے خون کے چھینٹے ہر خیمے میں پہنچ گئے۔

جب ابو جہل کو اس خواب کا علم ہوا تو کہنے لگا: ''محسوس ہوتا ہے بنو مطلب سے کوئی دوسرا نبی مبعوث ہو گیا ہے۔ جب ہم کل میدان میں اتریں گے اسے معلوم ہو جائے گا۔''[1]

اس خواب نے درحقیقت مشرکین کو اندر سے کھوکھلا اور کمزور کر دیا تھا۔

مسلمانوں اور مشرکوں کے ٹھکانوں کا قرآن میں ذکر

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿اِذْ اَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا وَهُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوٰى وَالرَّكْبُ اَسْفَلَ مِنْكُمْ ۚ وَلَوْ تَوَاعَدْتُّمْ لَاخْتَلَفْتُمْ فِي الْمِيْعٰدِ ۙ وَلٰكِنْ لِّيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا ۙ لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْۢ بَيِّنَةٍ ۗ وَاِنَّ اللّٰهَ لَسَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝﴾

''جبکہ تم (میدان بدر کے) قریب والے کنارے پر تھے اور وہ (کافر) دور والے کنارے پر تھے اور (قریش کا تجارتی) قافلہ تم سے بہت نیچے (بحیرہ قلزم کے ساحل کی طرف) تھا۔ اور اگر تم (دونوں فریق جنگ کے لیے) آپس میں وعدہ کرتے تو مقررہ وقت پر ضرور اختلاف کرتے اور لیکن (ہوا یہ کہ دونوں گروہ آمنے سامنے آ گئے) تاکہ اللہ اس کام کو پورا کر دے جو ہونے والا تھا تاکہ جو ہلاک ہو وہ

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 618/2.

حجت (قائم ہونے) سے ہلاک ہو اور جو زندہ رہے وہ دلیل سے (حق پہچان کر) زندہ رہے اور بے شک اللہ خوب سننے والا، خوب جاننے والا ہے۔"[1]

اس آیت کریمہ میں غزوۂ بدر کے دونوں لشکروں کی تفصیل ہے۔ اور یہ ان کی حالت کی بھرپور عکاسی کرتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کو اپنی نعمت یاد دلائی اور فرمایا: ﴿اِذْ اَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْیَا﴾ (اے اہل ایمان) وہ وقت یاد کرو جب تم مدینہ سے روانہ ہوئے اور سفر طے کرتے ہوئے وادی کے مدینہ منورہ سے قریب والے کنارے پر پہنچے۔ جبکہ کفار دور والے کنارے پر تھے۔ اسے دور والا کنارہ اس لیے کہا گیا کیونکہ یہ مدینہ کی نسبت دور تھا۔ اور ابوسفیان (رضی اللہ عنہ) کا قافلۂ تجارت اور قافلے کے شرکا تم سے تین میل کے فاصلے پر بحر احمر کے ساحل پر تھے۔ یہ قافلہ تمھارے پڑاؤ سے نیچے کی جانب تھا۔

آیت میں غزوۂ بدر کے مقاصد کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔ اور ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے کی جانے والی تدبیر کا تذکرہ بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿لِیَقْضِیَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا﴾ تاکہ اللہ اپنے دین کو عزت اور کلمے کو سربلندی سے نوازے۔

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے ساتھ دو گروہوں میں سے ایک کا وعدہ فرمایا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مدینہ طیبہ سے قافلۂ تجارت حاصل کرنے کی غرض سے روانہ ہوئے تھے۔ قریش کو مسلمانوں کے اس اقدام نے مضطرب کر دیا جس کے نتیجے میں وہ مکہ سے قافلے کی حفاظت کے لیے نکلے، پھر اللہ نے ایسے اسباب فراہم کر دیے کہ مسلمان وادی کے ایک کنارے اور کفار دوسرے کنارے پر خیمہ زن ہوئے اور قافلہ ان سے ہٹ کر تھا جس کی حفاظت کے لیے وہ آئے تھے اور معرکہ بدر پیش آیا۔[2]

---

[1] الأنفال 8:42. [2] تفسير الكشاف للزمخشري: 2/160.

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَلَوْ تَوَاعَدْتُّمْ لَاخْتَلَفْتُمْ فِي الْمِيْعٰدِ ﴾

’’اور اگر تم (دونوں فریق جنگ کے لیے) آپس میں وعدہ کرتے تو مقررہ وقت پر ضرور اختلاف کرتے۔‘‘

اس میں حکمت والی ذات کی تدبیر اور اس کے لامحالہ نافذ ہونے والے ارادے کا بیان ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تم اور کفار پہلے سے جنگ کے لیے کوئی وقت اور جگہ متعین کرتے تو متفق نہ ہو پاتے کیونکہ تم قلتِ تعداد اور جنگی ساز و سامان کی عدم دستیابی اور ساری توجہ کا انحصار تجارتی قافلے کی طرف کرنے کی وجہ سے جنگ کرنے کو ناپسند کرتے تھے۔

اسی طرح قریش کے اکثر افراد کا ارادہ بھی بغیر جنگ کے محض قافلے کی حفاظت تھا کیونکہ وہ درحقیقت رسول اللہ ﷺ سے جنگ کرنے سے گریز کرتے تھے۔ انھیں یقین تھا کہ اللہ اپنے رسول کی مدد ضرور فرمائے گا۔ وہ تو صرف تکبر اور سرکشی کی وجہ سے نبوت کے منکر بنے تھے نہ یہ کہ ان کا اعتقاد بھی یہی تھا۔

﴿ وَلٰكِنْ لِّيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْۢ بَيِّنَةٍ ﴾

’’اور لیکن (ہوا یہ کہ دونوں گروہ آمنے سامنے آگئے) تاکہ اللہ اس کام کو پورا کر دے جو ہونے والا تھا تاکہ جو ہلاک ہو وہ حجت (قائم ہونے) سے ہلاک ہو اور جو زندہ رہے وہ دلیل سے (حق پہچان کر) زندہ رہے۔‘‘ [1]

یعنی تمھارا تصادم بنا کسی پیشگی چیلنج یا بغیر کسی لڑائی کے ارادے کے پیش آیا تاکہ اللہ تعالیٰ اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دے جو اس کے علم اور حکمت کے مطابق لامحالہ ہونے والا تھا۔ اور یہ کام کفار کی رسوائی، مسلمانوں کی مدد، اسلام کا غلبہ اور اللہ کے رسول سے کیے ہوئے وعدے کا ایفاء تھا۔ [2]

1 الأنفال 42:8. 2 تفسير الطبري: 11/10.

﴿لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ﴾

''تاکہ جو ہلاک ہو وہ حجت (قائم ہونے) سے ہلاک ہو اور جو زندہ رہے وہ دلیل سے (حق پہچان کر) زندہ رہے۔''

علامہ آلوسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس آیت کا مطلب یہ ہوگا: ''جو مرے اور اپنی جان دے تو کسی ایسی حجت سے مرے جسے وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لے اور جو زندہ رہے وہ بھی بصیرت پر زندہ رہے اور اسے یقین ہو کہ کثرت تعداد ہی صرف کامیابی کا راز نہیں ہے۔ معرکہ بدر اللہ تعالیٰ کی طرف سے واضح، نمایاں اور روشن برہان تھا۔''[1]

﴿وَاِنَّ اللّٰهَ لَسَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝﴾ آیت کا یہ حصہ خاتمے کی حیثیت رکھتا ہے جس میں ایمان لانے کی ترغیب اور کفر سے اجتناب کا درس دیا گیا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ اہلِ ایمان کے تمام اقوال سے واقف ہے اور ان کے دل جو سوچتے ہیں اللہ وہ سب جانتا ہے۔ اور عنقریب اللہ تعالیٰ اپنے علم کے سبب ہر انسان کو جزا یا سزا میں سے جس کا بھی وہ مستحق ہوگا اسے عطا فرمائے گا۔[2]

[1] تفسير الآلوسي: 10/7. [2] تفسير الآلوسي: 10/7.

باب 2

رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میدانِ کارزار میں

نبی ﷺ کے لیے چھپر کی تعمیر

جب نبی ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بدر کے چشمے پر قرآن کریم کے ذکر کردہ کنارے ''عدوۃ دنیا'' پر پڑاؤ کیا تو سعد رضی اللہ عنہ نے تجویز پیش کی کہ آپ ﷺ کے لیے علیحدہ ایک چھپر تعمیر کیا جائے۔ وہ سب کے لیے مرکزی قیادت گاہ کی حیثیت کا حامل ہو جس میں آپ ﷺ دشمن سے محفوظ ہوں گے۔ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ''اے اللہ کے نبی! کیوں نہ ہم آپ کے لیے ایک چھپر تعمیر کر دیں جس میں آپ تشریف فرما ہوں۔ وہاں آپ کے پاس سواری بھی مہیا ہو گی۔ بعد ازاں ہم دشمن سے ٹکرائیں گے۔ اگر اللہ نے ہمیں عزت بخشی اور دشمن پر غلبہ عطا فرمایا تو یہی ہمارا مطلوب ہے اور اگر بالفرض کوئی دوسری صورت سامنے آئی تو آپ سواری پر سوار ہو کر قوم کے ان لوگوں میں تشریف لے جانا جو پیچھے رہ گئے ہیں۔ آپ کے پیچھے (مدینہ منورہ میں) ایسے لوگ ہیں کہ ہم آپ کی محبت میں ان سے بڑھ کر نہیں ہیں۔ انھیں اگر اندازہ ہوتا کہ جنگ کی نوبت پیش آئے گی تو وہ ہرگز پیچھے نہ رہتے۔ آپ ان کے پاس چلے جانا۔ اللہ تعالیٰ ان کے ذریعے سے آپ کی حفاظت فرمائے گا۔ وہ آپ کے سچے خیر خواہ ثابت ہوں گے اور آپ کے ہمراہ جہاد کریں گے۔''

یہ بات سن کر نبی ﷺ نے سعد رضی اللہ عنہ کی تعریف اور دعائے خیر فرمائی۔ مسلمانوں نے

ایک اونچے ٹیلے پر چھپر تعمیر کیا جہاں سے میدانِ کارزار کی منظر کشی ہو رہی تھی۔ آپ ﷺ کے ساتھ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ تھے۔ اس مرکزی قیادت کے دفاع اور حفاظت کے لیے حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کی زیر قیادت انصاری نوجوانوں کا ایک دستہ متعین ہوا۔[1]

چھپر کی تعمیر سے ماخوذ دروس درج ذیل ہیں:

① سالارِ اعلیٰ کے لیے ایک ایسا مرکز ہونا چاہیے جہاں سے وہ میدان جنگ کا مشاہدہ کر سکے تاکہ جنگ کے انتظامی امور میں دشواری نہ ہو۔

② مرکز قیادت کے لیے مناسب پہرے کا انتظام ہو تاکہ مرکزِ قیادت محفوظ رہ سکے۔

③ سالارِ اعلیٰ کی جان کی فکر کرنا اور ہر ممکنہ خطرے سے اسے تحفظ فراہم کرنا۔

④ سالارِ اعلیٰ کے لیے ایک احتیاطی عسکری قوت کا ہونا تاکہ اگر مبادا جنگ میں نقصان ہو تو قیادت کی نگرانی میں اس کی تلافی کی جا سکے۔[2]

شرکائے بدر پر اللہ تعالیٰ کے انعامات

بدر کے دن اللہ تعالیٰ کی طرف سے اہل ایمان پر چند نعمتوں کا ظہور ہوا جن میں دشمن کے ساتھ لڑائی سے پیشتر اونگھ کا طاری ہونا اور بارش کا نزول وغیرہ شامل ہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿إِذْ يُغَشِّيكُمُ النُّعَاسَ أَمَنَةً مِّنْهُ وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُم مِّنَ السَّمَاءِ مَاءً لِّيُطَهِّرَكُم بِهِ وَيُذْهِبَ عَنكُمْ رِجْزَ الشَّيْطَانِ وَلِيَرْبِطَ عَلَىٰ قُلُوبِكُمْ وَيُثَبِّتَ بِهِ الْأَقْدَامَ ۝﴾

”(یاد کرو) جب وہ (اللہ) اپنی طرف سے تمھیں امن و سکون دینے کے لیے تم پر اونگھ طاری کر رہا تھا اور آسمان سے تم پر بارش برسا رہا تھا تاکہ تمھیں اس کے ذریعے

---

1 السيرة النبوية لابن هشام: 273,272/2، ودلائل النبوة للبيهقي: 44/3. 2 غزوة بدر الكبرىٰ لأبي فارس، ص: 66.

سے پاک کر دے اور تم سے شیطانی وسوسوں کو لے جائے اور تاکہ تمھارے دلوں کو مضبوط کر دے اور تاکہ اس کی وجہ سے (تمھیں) ثابت قدم رکھے۔''[1]

علامہ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''معرکہ بدر سے ایک رات پہلے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر اونگھ طاری ہو گئی۔ اگرچہ جنگ کے بادل منڈلا رہے تھے۔ لیکن اللہ نے ان پر اونگھ طاری کرکے ان کے دلوں کو تقویت بخشی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''غزوۂ بدر کے موقع پر مقداد رضی اللہ عنہ کے سوا کسی کے پاس گھوڑا نہ تھا۔ ان کا گھوڑا سفید اور سیاہ رنگ کا تھا۔ میں نے غور کیا کہ ہم سب سوئے ہوئے تھے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم جاگ رہے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک درخت کے نیچے روتے ہوئے نماز ادا کر رہے تھے اور اسی حالت میں صبح ہو گئی۔''

اس رات اونگھ طاری ہونے کے فوائد یہ تھے:

① اس لیے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اگلی صبح پیش آنے والے معرکے کے لیے تازہ دم ہو جائیں۔

② اسی طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دلوں سے رعب ختم کرنے کے لیے کیونکہ مثل مشہور ہے: «اَلْأَمْنُ مُنِيمٌ، وَالْخَوْفُ مُسْهِرٌ» ''امن نیند اور خوف بیداری کا موجب ہے۔''[2]

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ میں نے ایک خاص موقع پر اہل ایمان پر بارش نازل کر کے عزت بخشی جبکہ وہ دن برسات کے نہیں تھے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی خصوصی کرم نوازی تھی۔ نزول کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کرنا اس امر کا ثبوت ہے کہ یہ اللہ کا خصوصی فضل تھا۔

علامہ رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''طبعی طور پر مومن جنابت کی حالت کو ناپسند خیال کرتا ہے اگر اسے پانی میسر نہ آئے تو رنجیدہ خاطر ہو جاتا ہے اور اس کا دل مضطرب رہتا ہے، بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے انھیں پانی عطا فرمایا اور طہارت کے مواقع بہم پہنچائے۔ اور اسے اپنا خصوصی انعام قرار دیا۔''[3]

[1] الأنفال 8:11. [2] تفسير القرطبي: 7/327. [3] تفسير الرازي: 15/133.

﴿وَ يُذْهِبَ عَنْكُمْ رِجْزَ الشَّيْطٰنِ﴾ کی تفسیر میں علامہ ابن جریر رحمہ اللہ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا: ''جب نبی ﷺ اور مسلمان غزوۂ بدر کے دن مقام بدر کی طرف بڑھے تو ان کے اور پانی کے درمیان ریت کا بہت بڑا تودہ حائل ہوگیا۔ جس کی وجہ سے انھیں بڑی دقت کا سامنا کرنا پڑا۔ شیطان نے مسلمانوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالا کہ تم اللہ کے پسندیدہ ہو، پیغمبر بھی تمھارے ساتھ ہیں اور پانی کا ایک قطرہ بھی تمھیں میسر نہیں۔ تم جنابت کی حالت میں نماز پڑھتے ہو۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان پر موسلادھار بارش نازل فرمائی۔ مسلمانوں نے پانی پیا اور طہارت حاصل کی۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے انھیں شیطان کے پراگندہ خیالات سے نجات دی۔ بارش کی وجہ سے ریتلی زمین پختہ ہوگئی۔ صحابۂ کرام اور ان کے جانوروں کے پاؤں جم گئے اور بآسانی پیش قدمی ممکن ہوئی۔''[1]

اللہ تعالیٰ نے وضاحت فرمائی کہ میں نے معرکہ پیش آنے سے قبل اپنے مومن بندوں پر بارش نازل فرمائی جس سے انھوں نے ظاہری اور باطنی دونوں طہارتیں حاصل کر لیں اور ان کے دلوں میں یکسوئی اور قدموں میں مضبوطی پیدا ہوگئی۔

مقام بدر کا مشاہدہ کرنے والا آج بھی دیکھ سکتا ہے کہ وہاں ریت کے ذرے اڑتے رہتے ہیں اور اتنی غبار ہوتی ہے کہ چلنا مشکل ہو جاتا ہے۔ بدر کے دن جب بارش نازل ہوئی تو ریت کے یہ ذرے تھم گئے، غبار بیٹھ گئی اور اس پر چلنا آسان ہوگیا۔ اور یہ سب اللہ کا اپنے بندوں پر احسان تھا۔[2]

نبی ﷺ کی جنگی حکمت عملی

نبی ﷺ نے بدر کے دن دشمن کے خلاف ایسی حکمت عملی اور طریقہ اختیار فرمایا جو اس

[1] تفسیر الطبري: 195/9. [2] حديث القرآن عن غزوات الرسول ﷺ لأبي بدر محمد بكر آل عابد: 91/1.

سے قبل عرب میں متعارف نہ تھا۔ آپ ﷺ نے صف بندی کا اسلوب اپنایا۔[1] قرآن کریم نے اس اسلوب کی طرف اشارہ کیا ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ○﴾

''بے شک اللہ ان لوگوں کو پسند کرتا ہے جو اس کی راہ میں صفیں باندھے لڑتے ہیں، گویا وہ سیسہ پلائی ہوئی عمارت ہیں۔''[2]

تفصیل اس کی اس طرح ہوگی کہ پورا لشکر نماز کی طرح صف بندی کرے جبکہ صفوں کی کثرت یا قلت تعداد پر منحصر ہوگی۔ پہلی صف میں نیزہ باز ہوں گے جو گھڑسواروں کے حملے کو روکنے کے لیے ہوں گے۔ باقی دوصفوں میں تیر انداز ہوں گے جو دور سے حملہ آور کو روکیں گے تاکہ حملہ آوروں کے حملے سے صفوں میں انتشار پیدا نہ ہو۔ غزوۂ بدر میں یہ اسلوب اختیار کر کے مندرجہ ذیل فوائد حاصل کیے:

① مسلمانوں کے عمدہ عسکری نظام اور بہترین تربیت کی وجہ سے دشمن کا مرعوب ہونا۔

② ایسی حکمت عملی سے چیف کمانڈر کے پاس ریزرو فوجی دستے باقی رہتے ہیں جو پلٹ کر حملہ کرنے والوں اور گھات لگا کر حملہ کرنے والوں کا مقابلہ کرتے ہیں۔ اور عمومی طور پر دشمن کے پیادہ اور شہسواروں کی طرف سے لشکر کے مختلف اطراف میں پیش آنے والے ممکنہ خطرات سے نبٹنے کے لیے بھی کارآمد ثابت ہوتے ہیں۔

یہ طریقۂ کار جنگ بدر میں پہلی مرتبہ اپنایا گیا۔ اسلامی تربیت گاہ کی بدولت متعارف ہونے والے اس طریقۂ جنگ کو چودہ صدیاں بیت جانے کے بعد بھی امتیازی حیثیت حاصل ہے۔[3]

[1] القيادة العسكرية للدكتور محمد الرشيد، ص:401. [2] الصف4:61. [3] الرسول القائد ﷺ لمحمود شيت خطاب، ص: 111 و 117,116.

سیرت طیبہ کا مطالعہ کرنے والا یہ بات بھی بخوبی جانتا ہوگا کہ رسول اللہ ﷺ بعض اوقات جدید ترین جنگی حکمت عملی کے تحت دشمن پر اچانک حملہ کرتے۔ خصوصاً وہ طریقہ کار اختیار فرماتے جو عرب میں متعارف نہ ہوتا۔ بدر و احد اور دیگر غزوات میں نبی ﷺ نے اسی طرح کی حکمت عملی اختیار فرمائی تھی۔

عرب والے یکبارگی حملہ کرنے اور پھر پلٹ کر دوبارہ حملہ کرنے کا اسلوب اختیار کیے ہوئے تھے۔ جنرل محمود شیت خطاب ان دونوں جنگی اسالیب کی وضاحت اس طرح فرماتے ہیں: ''عرب کا اسلوبِ جنگ یہ تھا کہ تیرانداز، نیزہ باز اور تلوار سے لڑنے والے خواہ پیادہ ہوں یا گھڑ سوار، سارا لشکر یکبارگی مدمقابل لشکر پر حملہ آور ہوتا۔ اگر مدمقابل گروہ کے پاؤں جمے رہتے یا ان حملہ آوروں کو اپنے اندر کچھ کمزوری نظر آتی تو دوبارہ پلٹتے اور تنظیم نو کے ساتھ دوبارہ حملہ کرتے اور یہ تسلسل برقرار رہتا تاآنکہ فتح یا ہزیمت کا فیصلہ ہوجاتا۔ جبکہ صف بندی کے اسلوب میں سارے لشکر کی پہلے صف بندی کی جاتی اور سب کو تعداد کے مطابق تین یا اس سے زیادہ صفوں میں تقسیم کر دیا جاتا۔ پہلی صف میں نیزہ بازوں کو کھڑا کیا جاتا تاکہ گھڑ سواروں کے حملے کو روک سکیں اور باقی تمام صفوں میں تیرانداز ہوتے جو مسلسل دشمنوں پر تیر برساتے۔''

اس حکمت عملی کی بدولت سارا لشکر سالار اعلیٰ کی قیادت اور اس کے کنٹرول میں ہوتا۔ تاآنکہ دشمن کی حکمت عملی مکمل ناکام ہوجاتی اور ان کی شدت میں کمی واقع ہوجاتی۔ کمزوری کو دیکھتے ہی نیزوں والی صف پے در پے دشمن پر حملہ کرتی یا دشمن کے ہزیمت کھانے پر ان کا تعاقب کرتی۔

محمود شیت خطاب کا نظریہ یہ ہے کہ صف بندی کا اسلوب عرب میں رائج جنگی اسلوب سے کہیں بہتر ہے۔ کیونکہ اس اسلوب میں لشکر ترتیب میں رہتا ہے اور ایک ریزرو فوج ہمیشہ سالارِ اعلیٰ کے کنٹرول میں رہتی ہے جس کے ساتھ وہ غیر متوقع پیش آنے والے

حالات جیسے دشمن کا اچانک حملہ، گھات لگا کر حملہ کرنے والوں کا مقابلہ، دشمن کے پیادہ اور گھڑسوار لشکر کا اسلامی لشکر میں گھبراہٹ پیدا کرنا اور دشمن کے تازہ دم لشکر، ان سب کا مقابلہ کرتا ہے۔ اس طرح ریزرو فوج سے کامیابی کا حصول ممکن ہو جاتا ہے۔ [1]

علامہ ابن خلدون رحمہ اللہ رسول اللہ ﷺ کی اس غیر متعارف جنگی حکمت عملی کے بارے میں فرماتے ہیں: ''ابتدائے اسلام میں جنگی اسلوب مکمل طور پر مربوط اور اجتماعی تھا نہ کہ پلٹ کر دوبارہ حملہ کرنے کا وہ انداز جو عرب کے ہاں متعارف تھا۔'' [2]

علامہ ابن خلدون نبی ﷺ کی اس جدید جنگی حکمت عملی کے بارے میں فرماتے ہیں:

''اجتماعی طور پر صف بندی کے ساتھ پیش قدمی زیادہ مربوط اور واپس آکر دوبارہ حملہ کرنے سے زیادہ مؤثر ثابت ہوتی ہے۔ اس طریقہ جنگ میں صفوں کو مرتب و منظّم کیا جاتا ہے اور انھیں تیر کی طرح یا نماز کی صفوں کی طرح سیدھا رکھا جاتا ہے، پھر سارا لشکر صفوں کی شکل میں آگے بڑھتا ہے، اس لیے یہ جنگی اسلوب تصادم کے وقت زیادہ مؤثر، لڑائی میں کارگر اور دشمن کے دل میں رعب پیدا کرنے والا ہوتا ہے کیونکہ فوج ایک لمبی اور مضبوط دیوار یا قلعے کے مانند ہو جاتی ہے جسے توڑنا تقریباً ناممکن ہو جاتا ہے۔'' [3]

آج کل کے جنگی اسالیب کے تناظر میں رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ گرامی کا مشاہدہ کرنے سے آپ کی اعلیٰ عسکری قابلیت اور جنگی مہارت کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ کیونکہ آج جدید اسلحہ کے دور میں بھی وہی قوانین استعمال ہو رہے ہیں جو آپ ﷺ نے دوران معرکہ نافذ اور صادر فرمائے تھے۔ [4]

اس کی تفصیل اس طرح ہے کہ نبی علیہ السلام نے قریش کے لشکر پر چڑھائی نہیں کی بلکہ دفاعی انداز اختیار فرمایا۔ آپ ﷺ کی میدان کارزار میں بہترین جنگی پلاننگ، جسے صحابۂ کرام

---

[1] غزوة بدر الكبرىٰ لمحمود شيت خطاب، ص:24,23. [2] المقدمة لابن خلدون، ص:273.
[3] المقدمة لابن خلدون، ص:271. [4] المدخل إلى العقيدة والإستراتيجية العسكرية لمحمد جمال الدين، ص:121.

نے من وعن نافذ کیا تھا، نے دشمن کی مرکزی قیادت کو ہلا کر رکھ دیا اور انھیں ذہنی طور پر انتہائی کمزور کر دیا۔ اور اللہ کی توفیق سے دشمن کے خلاف ایک فیصلہ کن فتح حاصل ہوئی، حالانکہ دیکھا جائے تو ایک مسلمان مجاہد کا مقابلہ مشرکین کے تین آدمیوں سے تھا۔[1]

رسول اللہ ﷺ دوران معرکہ ہر مرحلے میں حسب مصلحت حکم صادر فرماتے کیونکہ جنگ میں حالات و واقعات مختلف ہوتے رہتے ہیں۔ نبی ﷺ نے اپنی قائدانہ صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے حالات کی مناسبت سے خصوصی راہنمائی فرمائی۔

رسول اللہ ﷺ اپنی افواج کو اعتماد میں لینے کے لیے مختلف اقدامات فرماتے جیسا کہ آپ ﷺ نے غزوۂ بدر میں تمام صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے جنگ کے بارے میں مشورہ کیا۔ نبی ﷺ برابری اور خود اعتمادی کی فضا میں کمان فرماتے نہ کہ زبردستی ان پر احکامات صادر فرماتے۔ آپ ﷺ اپنی رائے مسلط کرنے کے بجائے مشاورت کے نتیجے میں سامنے آنے والی قابل عمل رائے اور تجویز پر عمل فرما لیتے۔

نبی ﷺ نے غزوۂ بدر میں مجاہدین کو راہ نمائی دیتے ہوئے جنگی حکمت عملی میں اصلاحات کا تسلسل جاری رکھا۔ بطور سالار اعلیٰ آپ ﷺ نے جو ارشادات فرمائے ان میں سے چند ایک یہ ہیں:

❁ نبی علیہ السلام نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو یہ حکم فرمایا کہ تیر اس وقت چلائیں جب دشمن قریب آجائے۔ کیونکہ ایسی حالت میں تیر اندازی سودمند ثابت ہوتی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

«إِنْ دَنَا الْقَومُ مِنْكُمْ، فَانْضِحُوهُم بِالنَّبْلِ»

''اگر دشمن تمھارے قریب آرہا ہو تو اپنے تیروں سے انھیں دور رکھو۔''[2]

❁ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے آپ ﷺ کا دوسرا فرمان یہ تھا کہ جب تک گھمسان کی جنگ

---

1 مقومات النصر للدكتور أحمد أبي الشباب: 154/2. 2 السيرة النبوية لابن هشام: 278/2، و دلائل النبوة للبيهقي: 81/3، اسی مفہوم کی ایک دوسری روایت میں۔

”بے شک وہ اللہ عظیم پر ایمان نہیں لاتا تھا اور نہ مسکین کو کھانا کھلانے پر شوق دلاتا تھا۔“ [1]

یہی وہ دل ہلا دینے اور عذاب سے ڈرانے والی آیات ہیں جن کے سبب حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ نے اپنی بیوی سے کہا تھا: ”اے ام درداء! اللہ تعالیٰ نے جب سے جہنم کو پیدا کیا ہے اس وقت سے ایک زنجیر کو پیدا کیا ہے جو جہنم میں گرم کی جا رہی ہے، اسے قیامت کے دن لوگوں کی گردن میں ڈالا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے ہمارے ایمان لانے کی وجہ سے ہمیں اس کے آدھے حصے سے نجات عطا کر دی ہے۔ اے ام درداء! اب تو مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب دیا کر۔“ [2]

مدنی دور میں فرضیتِ زکاۃ کا سبب: قرآنِ کریم کی مدنی سورتیں ایسے حالات میں نازل ہوئیں جب مسلمان ایک امت بن چکے تھے، اپنی ریاست تھی، اپنا تشخص اور اپنا خطۂ ارض تھا، اس لیے مدنی آیات میں وارد احکامات حالات کے عین مطابق نازل ہوئے۔ ان آیات میں مطلق احکامات کی تقیید اور عمومی احکامات کی تخصیص کر دی گئی، جبکہ مکی احکامات صرف دعوتی اور اصلاحی امور پر مشتمل تھے۔ مدنی احکامات لازمی اور ضروری حیثیت کے حامل تھے، لہٰذا ایمان و یقین کی موجودگی میں انھیں قوانین کی شکل میں نافذ کیا گیا۔

زکاۃ اسی مدنی دور میں فرض ہوئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نصابِ زکاۃ کی حد بندی کی اور اس کی شرائط، واجب مقدار، مصارف زکاۃ اور زکاۃ وصول کرنے اور دیگر انتظامی امور کے سلسلے میں استعمال ہونے والے قوانین سے آگاہ فرمایا۔ [3]

زکاۃ کی اہمیت: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زکاۃ ادا کرنے کی تاکید فرمائی، اللہ کے دین میں

---

1 الحاقّة 69:33، 34. 2 الأموال لأبي عبيد، ص: 35، بحوالہ فقه الزكاة للقرضاوي: 70/1.

3 فقه الزكاة للقرضاوي: 78/1.

”رسول اللہ ﷺ مکی لشکر سے پہلے صبح سویرے ہی میدان جنگ میں اتر آئے۔ آپ ﷺ نے طلوع شمس کے وقت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی صف بندی فرمائی۔ صحابہ کے چہرے مغرب کی طرف کیے اور سورج کو ان کے پیچھے کی جانب رکھا جبکہ کفار کا رخ سورج کی طرف تھا۔ [1]

آپ ﷺ کا یہ اقدام آپ کی حسن تدبیر اور بہتر قدرتی وسائل سے فائدہ اٹھانے کی بھرپور صلاحیتوں پر دلالت کرتا ہے۔ مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ نے بھی اس حسنِ تدبیر کا ذکر کیا ہے۔ [2]

معلوم ہوا کہ قدرتی وسائل، مثلاً: سورج، ہوا اور جغرافیائی طور پر ناہموار زمین ان سب کا جنگ میں اہم کردار ہوتا ہے۔ یہ ان اسباب میں شامل ہیں جن کا اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم فرمایا ہے کہ اگر تم اللہ کی نصرت اور کامیابی حاصل کرنا چاہتے ہو تو انھیں اختیار کرو۔ [3]

سواد بن غَزِیَّہ رضی اللہ عنہ کا واقعہ

رسول اللہ ﷺ جنگ کے لیے صف بندی فرما رہے تھے تاکہ صفیں سیدھی اور سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح مضبوط ہو جائیں۔ نبی ﷺ کے ہاتھ میں بغیر پر کے ایک تیر تھا جس سے آپ مجاہدین کی صفیں درست فرما رہے تھے کہ سواد بن غزیہ رضی اللہ عنہ صف سے کچھ آگے بڑھے ہوئے تھے۔ آپ ﷺ نے تیر ان کے پیٹ پر رکھا اور فرمایا: «اِسْتَوِ يَاسَوَّادُ!» ”سواد برابر ہو جاؤ۔“ سواد نے عرض کیا: ”اے اللہ کے رسول! آپ نے مجھے تکلیف پہنچائی ہے، مجھے اس کا قصاص دیں۔“ نبی ﷺ نے اپنے بطن مبارک سے کپڑا ہٹایا اور فرمایا: «اِسْتَقِدْ» ”بدلہ لے لو۔“ سواد بن غزیہ رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے بطن مبارک سے چمٹ گئے اور پیٹ کو بوسہ دیا۔ نبی ﷺ نے فرمایا: «مَا حَمَلَكَ عَلٰى هٰذَا يَا سَوَّادُ؟» ”سواد تمھیں اس ادا پر کس نے ابھارا؟“ سواد نے عرض کیا: ”اے اللہ کے رسول! حالات

[1] القيادة العسكرية للدكتور محمد الرشيد، ص:453. [2] تحفة الأحوذي شرح جامع الترمذي: 175/7. [3] القيادة العسكرية للدكتور محمد الرشيد، ص:454.

آپ دیکھ رہے ہیں، میری خواہش تھی کہ ایسے موقع پر میرا جسم آپ کے مبارک جسم سے لگنے کی سعادت حاصل کرلے۔'' یہ سن کر آپ ﷺ نے ان کے حق میں دعا فرمائی۔[1]

قصۂ مذکور سے حاصل ہونے والے فوائد درج ذیل ہیں:

① اسلام نظم ونسق کا داعی ہے۔

② بلاتفریق عدل وانصاف کا قیام۔ نبی ﷺ خود قصاص دینے کے لیے تیار ہو گئے۔

③ ایک مجاہد اور فوجی کی سالارِ اعلیٰ سے وارفتگی۔

④ رتبہ شہادت پانے کا جذبہ۔

⑤ نبی ﷺ کا جسد مبارک بابرکت تھا، اسی لیے حضرت سواد نے آپ ﷺ کے جسد اطہر کو چھونے کا بہانا کیا۔

⑥ مرد کے پیٹ کا پردہ نہیں ہے۔ نبی ﷺ نے اس موقع پر بطن مبارک سے کپڑا ہٹایا۔ اگر پیٹ پردے کی جگہ ہوتا تو آپ ﷺ ہرگز کپڑا نہ ہٹاتے۔[2]

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو جنگ پر ابھارنا

رسول اللہ ﷺ کی انتہائی کوشش تھی کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی تربیت ایسے نہج پر فرمائیں کہ وہ بلند و بالا اور مضبوط چٹانوں کی طرح ٹھوس ارادے کے حامل بن جائیں۔ ان کے دل بہادری اور دلیری سے لبریز اور دشمن کے خلاف اللہ تعالیٰ کی نصرت و حمایت سے سرشار ہوں۔ آپ ﷺ نے اس مقصد کے حصول کے لیے ترغیب وترہیب کا اصول اپنایا۔ آپ ﷺ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو ثابت قدمی پر اجر اور غنیمت کی نوید سناتے۔ پیٹھ پھیرنے اور لڑائی کے دن میدان جنگ سے بھاگنے والے کو برے انجام سے ڈراتے۔ آپ ﷺ ان کے سامنے نصرت الٰہی کے حصول کے اسباب و ذرائع بیان فرماتے تاکہ انھیں اختیار کیا جاسکے۔ اسی طرح شکست کے اسباب سے ڈراتے تاکہ ان سے مکمل طور پر اجتناب

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 279,278/2. [2] غزوة بدر الكبرىٰ لأبي فارس، ص: 52.

کیا جائے۔[1]

نبی ﷺ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو جہاد پر ابھارتے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِينَ عَلَى الْقِتَالِ﴾

''اے نبی! مومنوں کو جہاد پر ابھاریں۔''[2]

مزید ارشاد فرمایا:

﴿فَقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَا تُكَلَّفُ إِلَّا نَفْسَكَ ۚ وَحَرِّضِ الْمُؤْمِنِينَ ۖ عَسَى اللَّهُ أَنْ يَكُفَّ بَأْسَ الَّذِينَ كَفَرُوا ۚ وَاللَّهُ أَشَدُّ بَأْسًا وَأَشَدُّ تَنْكِيلًا﴾

''چنانچہ (اے نبی!) آپ اللہ کی راہ میں لڑیں، آپ کو اپنی ذات کے سوا کسی کا ذمہ دار نہیں بنایا گیا۔ اور آپ مومنوں کو (لڑائی پر) آمادہ کریں۔ امید ہے کہ اللہ ان لوگوں کو لڑائی سے روک دے جنھوں نے کفر کیا اور اللہ لڑائی میں بہت سخت ہے اور سزا دینے میں بہت سخت ہے۔''[3]

غزوۂ بدر کے دن نبی ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے فرمایا: «قُومُوا إِلٰى جَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْأَرْضُ» ''تم ایسی جنت کے حصول کے لیے اٹھ کھڑے ہو جاؤ جس کی پہنائیاں آسمان و زمین کے برابر ہیں۔'' عمیر بن حمام انصاری رضی اللہ عنہ نے پوچھا: ''اے اللہ کے رسول! کیا اس کی چوڑائی آسمان اور زمین جتنی ہے؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: «نَعَمْ» ''ہاں!'' عمیر رضی اللہ عنہ نے خوشی سے تعجب کا اظہار کیا۔ آپ ﷺ نے دریافت فرمایا: «مَا يَحْمِلُكَ عَلٰى قَوْلِكَ: بَخٍ بَخٍ؟!» ''تمھارے اس طرح اظہار تعجب کا سبب کیا ہے؟'' عمیر رضی اللہ عنہ کہنے لگے: ''اللہ کی قسم! اے اللہ کے رسول! صرف یہ امید کرتے ہوئے کہ میں بھی ان جنت والوں سے ہو جاؤں۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: «فَإِنَّكَ مِنْ أَهْلِهَا» ''تم ان میں سے ہی ہو۔'' پھر عمیر رضی اللہ عنہ نے اپنے توشہ دان سے چند کھجوریں نکالیں

1 المدرسة النبوية العسكرية لأبي فارس، ص: 140. 2 الأنفال 8:65. 3 النسآء 4:84.

اور کھانے لگے، پھر بولے: ''اگر میں کھجوریں کھانے کے لیے زندہ رہا تو زندگی بڑی لمبی ہو جائے گی۔'' انھوں نے کھجوریں وہیں چھوڑیں اور لڑنا شروع کر دیا حتی کہ لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔[1]

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''عمیر رضی اللہ عنہ نے کھجوریں چھوڑیں اور یہ کہتے ہوئے میدان جنگ میں کود پڑے:

رَكْضًا إِلَى اللّٰهِ بِغَيْرِ زَادِ ۔۔۔ إِلَّا التُّقٰى وَعَمَلَ الْمَعَادِ

وَالصَّبْرَ فِي اللّٰهِ عَلَى الجِهَادِ ۔۔۔ وَكُلُّ زَادٍ عُرْضَةُ النَّفَادِ

غَيْرَ التُّقٰى وَالبِرِّ وَالرَّشَادِ

''اللہ کے راستے میں بغیر توشے کے نکلنا ہے مگر تقوی اور اخروی عمل کا توشہ ساتھ ہونا چاہیے، اسی طرح اللہ کے راستے میں جہاد پر صبر کرنے کی صورت میں بھی توشہ ساتھ ہونا چاہیے، جبکہ تقویٰ، نیکی اور بھلائی کے سوا ہر توشہ آخر کار ختم ہونے والا ہے۔''

اور عمیر رضی اللہ عنہ آخر کار لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔''[2]

اسلامی فوج کا مورال بلند کرنے اور ان کی ذہن سازی کرنے اور ان کے جوش و خروش میں اضافہ کرنے کے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مشرکین کے سرداروں کے مارے جانے کی پیشگی خوشخبری بھی سنا رہے تھے اور مزید اطمینان کے لیے ان کی قتل گاہوں کی نشاندہی بھی فرما رہے تھے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ بدر سے ایک رات قبل ہمارے سامنے اہل بدر کی قتل گاہوں کی نشاندہی فرمائی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «هٰذَا مَصْرَعُ

[1] صحیح مسلم، حدیث:1901۔ [2] صفة الصفوة لابن الجوزي:488/1، و زاد المعاد: 182/3۔

فُلَانٍ غَدًا إِنْ شَاءَ اللّٰهُ» ''ان شاء اللہ کل یہ فلاں کی اور یہ فلاں کی قتل گاہ ہوگی۔'' عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو برحق نبی بنا کر مبعوث فرمایا! نبی ﷺ نے ان کی قتل گاہوں کی جونشاندہی کی تھی اس سے کوئی بھی آگے یا پیچھے نہ ہٹا۔''[1]

نبی ﷺ نے جنگ سے قبل تائید الٰہی کی بشارت دیتے ہوئے اہل ایمان سے فرمایا: «أَبْشِرْ أَبَابَكْرٍ» ''ابوبکر! خوش ہو جاؤ۔'' بعدازاں سب لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: «وَالَّذِي نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهِ! لَا يُقَاتِلُهُمُ الْيَوْمَ رَجُلٌ، فَيُقْتَلُ صَابِرًا مُّحْتَسِبًا، مُقْبِلًا غَيْرَ مُدْبِرٍ إِلَّا أَدْخَلَهُ اللّٰهُ الْجَنَّةَ» ''اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد (ﷺ) کی جان ہے! آج کے دن جو شخص جم کر، اجر وثواب کی امید رکھتے ہوئے، آگے بڑھ کر اور پیچھے نہ ہٹتے ہوئے لڑے گا اور شہید ہو جائے گا اللہ تعالیٰ ضرور اسے جنت میں داخل فرمائے گا۔''[2]

اس روحانی جوش وخروش نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر اور ان کے بعد انھی کے راستے پر چلنے والوں پر گہرا اثر چھوڑا۔[3]

رسول اللہ ﷺ جب تک خود آگے نہ بڑھتے کسی کو پیش قدمی کی اجازت نہ دیتے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مقام بدر میں مشرکین سے پہلے پہنچ گئے جبکہ مشرکین بعد میں پہنچے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

«لَا يَتَقَدَّمَنَّ أَحَدٌ مِّنْكُمْ إِلٰى شَيْءٍ حَتّٰى أَكُونَ أَنَا دُونَهُ»

''تم میں سے کوئی بھی کسی طرف کوئی پیش قدمی نہ کرے جب تک میں خود آگے نہ بڑھوں۔''

اور جب مشرکین اسلامی صفوں کی طرف بڑھے تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

1 صحيح مسلم، حديث: 2873. 2 السيرة النبوية لابن هشام: 279/2. 3 المدرسة النبوية العسكرية لأبي فارس، ص: 143.

«قُومُوا إِلٰى جَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْأَرْضُ»

”اس جنت کے حصول کے لیے کمر بستہ ہو جاؤ جس کی پہنائیاں آسمان و زمین کے برابر ہیں۔“ [1]

نصرتِ الٰہی کے لیے گریہ وزاری

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿إِذْ تَسْتَغِيثُونَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ أَنِّي مُمِدُّكُم بِأَلْفٍ مِّنَ الْمَلَائِكَةِ مُرْدِفِينَ﴾

”(یاد کرو) جب تم اپنے رب سے فریاد کر رہے تھے تو اس نے تمھاری فریاد قبول کر لی (اور کہا) کہ بے شک میں ایک دوسرے کے پیچھے آنے والے ایک ہزار فرشتوں سے تمھاری مدد کروں گا۔“ [2]

رسول اللہ ﷺ جب صف بندی کرا چکے، مناسب حال احکامات جاری فرما چکے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو جنگ پر ابھار چکے تو ابو بکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ چھپر کی صورت میں بنے ہوئے مرکزِ قیادت میں تشریف لے آئے۔ سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ چھپر کے دروازے پر تلوار سونتے پہرہ دے رہے تھے۔ آپ ﷺ اللہ کی طرف متوجہ ہو کر نصرت الٰہی کا وعدہ یاد دلاتے ہوئے ان الفاظ سے دعا کرنے لگے:

«اَللّٰهُمَّ! أَنْجِزْ لِي مَا وَعَدْتَنِي، اَللّٰهُمَّ! آتِ مَا وَعَدْتَنِي، اَللّٰهُمَّ! إِنْ تَهْلِكْ هٰذِهِ الْعِصَابَةُ مِنْ أَهْلِ الْإِسْلَامِ لَا تُعْبَدْ فِي الْأَرْضِ»

”اے اللہ! تو نے مجھ سے جو وعدہ فرمایا تھا وہ پورا فرما۔ اے اللہ! تو نے مجھ سے جس چیز کا وعدہ فرمایا تھا وہ عطا فرما۔ اے اللہ! اگر آج اہل اسلام کا یہ مٹھی بھر گروہ

[1] صحيح مسلم، حديث:1901. [2] الأنفال 8:9.

ہلاک ہو گیا تو زمین پر تیری عبادت نہ کی جائے گی۔"

نبی ﷺ قبلہ رخ ہو کر، ہاتھ پھیلائے ہوئے اللہ کے سامنے گڑگڑا رہے تھے۔ اسی دوران آپ ﷺ کے دونوں کندھوں سے چادر گر گئی، ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے چادر درست کی اور عرض کی: "اے اللہ کے رسول! بس کیجیے! آپ نے اپنے رب سے بڑے اصرار اور تضرّع سے دعا فرمالی ہے۔ اب اللہ ضرور اپنا وعدہ پورا فرمائیں گے۔" [1]

پھر مذکورہ آیت مبارکہ نازل ہوئی۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ نے بدر کے دن یہ دعا فرمائی تھی:

«اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَنْشُدُكَ عَهْدَكَ وَوَعْدَكَ، اَللّٰهُمَّ إِنْ شِئْتَ لَمْ تُعْبَدْ بَعْدَ الْيَوْمِ»

"اے اللہ! بے شک میں تجھے تیرے عہد اور وعدے یاد دلاتا ہوں۔ اے اللہ! اگر تو چاہے تو آج کے بعد تیری عبادت نہ کی جائے؟"

ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کے دست مبارک کو پکڑا اور عرض کی: "آپ کو اتنا ہی کافی ہے۔" پھر آپ ﷺ چھپر سے باہر تشریف لائے اور زبان پر یہ کلمات جاری تھے:

﴿سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّونَ الدُّبُرَ﴾

"عنقریب یہ جتھا شکست کھا جائے گا اور پیٹھ پھیر کر بھاگ جائے گا۔" [2]

ابن اسحاق رحمہ اللہ کی روایت کے مطابق نبی ﷺ نے ان الفاظ سے دعا فرمائی:

«اَللّٰهُمَّ هٰذِهِ قُرَيْشٌ، قَدْ أَقْبَلَتْ بِخُيَلَائِهَا وَ فَخْرِهَا، تُحَادُّكَ وَ تُكَذِّبُ رَسُولَكَ، اَللّٰهُمَّ فَنَصْرُكَ الَّذِي وَعَدْتَنِي، اَللّٰهُمَّ أَحِنْهُمُ الْغَدَاةَ!»

"اے اللہ! یہ قریش تکبر اور غرور کا اظہار کرتے ہوئے تیری دشمنی پر اتر آئے ہیں،

---

1 صحيح مسلم، حديث: 1763، و جامع الترمذي، حديث: 3081، و مسند أحمد: 30/1.

2 القمر 45:54. صحيح البخاري، حديث: 3953، و مسند أحمد: 329/1.

تیرے رسول کو جھٹلاتے ہیں۔ اے اللہ! میں تجھ سے وہ مدد مانگتا ہوں جس کا تو
نے وعدہ فرمایا ہے، اے اللہ صبح انھیں ہلاک کر دینا۔‘‘ [1]

دنیا کے ہر مسلمان قائد، حاکم اور سردار حتی کہ ہر فرد کے لیے شرعی حکم ہے کہ وہ اپنے آپ پر کلی اعتماد کرنے کے بجائے خالص نیت کرتے ہوئے اللہ وحدہ لاشریک کی پناہ میں آئے، اس کے سامنے دوزانو ہو کر بیٹھے اور سجدہ ریز ہو تاکہ مالک الملک کی مدد شامل حال ہو۔

نبی ﷺ کے کندھوں سے چادر مبارک گر گئی اور آپ ﷺ ہاتھ پھیلائے انتہائی عاجزی سے اللہ سے مدد طلب کر رہے تھے۔ آپ ﷺ کی یہ حالت ہمارے تصور اور دل و دماغ میں سرایت کر جانی چاہیے۔ اور ہمیں ایسے حالات، مواقع اور اوقات میں آپ ﷺ کے اسوہ کو اختیار کرنا چاہیے اور یہی ہم سب کی ذمہ داری اور قیادت کا تقاضا ہے۔ [2]

رسول اللہ ﷺ جب اللہ کے سامنے التجاؤں سے فارغ ہو گئے اور اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کر لی تو چھپر سے باہر تشریف لائے اور مٹھی بھر کنکریاں اٹھائیں اور مشرکین کے چہروں کی طرف پھینک دیں اور فرمایا: «شَاهَتِ الْوُجُوهُ» ’’چہرے بگڑ جائیں۔‘‘ [3]

بعدازاں آپ ﷺ نے فوراً دلجمعی سے حملے کا حکم فرمایا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے فوراً عمل کیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کنکریوں کے ذرات ہر مشرک کی آنکھ تک پہنچا دیے جس سے ان کی توجہ لڑائی سے قدرے ہٹ گئی۔

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ﴾

’’اور (اے نبی!) جب آپ نے (مٹھی بھر خاک ان کی طرف) پھینکی تو وہ آپ نے نہیں پھینکی بلکہ اللہ نے پھینکی۔‘‘ [4]

اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے کنکریاں پھینکنے کا جو اثبات فرمایا ہے

---

1 السيرة النبوية لابن هشام:273/2، ودلائل النبوة للبيهقي: 110/3، والبداية والنهاية:267/3.
2 التربية القيادية للدكتور الغضبان: 36/3. 3 السيرة النبوية لابن هشام:280/2. 4 الأنفال 17:8.

اس سے مراد یہ ہے کہ آپ ﷺ نے پھینکنے کا آغاز کیا۔ اور پھینکنے کی جو نفی کی گئی ہے اس سے مراد مشرکین کی آنکھوں تک کنکریوں کے پہنچانے کی نفی ہے جو محض آپ ﷺ کے پھینکنے سے حاصل نہیں ہوئی تھی۔''[1]

یہ بات قابل ذکر ہے کہ نبی ﷺ نے تمام مادی اور روحانی اسباب اختیار کیے اور بعدازاں اللہ پر بھروسا کیا جس کے نتیجے میں اللہ کی طرف سے نصرت وحمایت کا نزول ہوا۔

غزوۂ بدر میں حتی المقدور جملہ اسباب اختیار کیے گئے، پھر اللہ کی توفیق سے پے در پے نصرت حاصل کرنے کے تمام اسباب فراہم ہوتے گئے۔ اس معرکے میں خرق عادت باتوں اور چند غیبی امور کا ظہور بھی ہوا۔

اسباب اختیار کرنے کے سلسلے میں کسی بھی غزوے میں میدان جنگ اور اس کے موسمی حالات کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ اسی طرح قیادت کا مضبوط ہونا، پھر اس کا قابل اعتماد ہونا اور روحانی طاقت کا موجود ہونا جنگ میں ثابت قدمی کے لیے ضروری سمجھے جاتے ہیں۔

بدر کی سرزمین مسلمانوں کے لیے جنگ کے اعتبار سے موزوں اور حالات اور موسم کے لحاظ سے خوشگوار ثابت ہوئی۔ اس کے ساتھ ساتھ روحانیت کے نقطہ عروج کی حامل قیادت بھی موجود تھی۔

غزوۂ بدر میں بعض چیزیں اللہ کی توفیق سے بلاواسطہ میسر آئیں اور بعض نبی ﷺ کی طرف سے ظاہری اسباب اختیار کرنے سے حاصل ہوئیں، الغرض اللہ تعالیٰ کی توفیق سے مسلسل نعمتوں اور معجزوں کا ظہور ہوتا رہا جس کا نتیجہ سب کے سامنے ہے۔

یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اہل ایمان کو دیے جانے والے انعامات کا ایک نمونہ تھا۔ اہل ایمان آج بھی یہ انعامات حاصل کر سکتے ہیں بشرطیکہ فوج اور قائد کی نیت خالص ہو اور اللہ کے حکم پر قائم دائم رہتے ہوئے ظاہری اسباب بھی اختیار کیے گئے ہوں۔[2]

---

1 المستفاد من قصص القرآن لعبد الكريم زيدان: 125/2. 2 الأساس في السنة و فقهها لسعيد حوّى: 474/1.

باب 3

گھمسان کی جنگ اور فتح کے بعد کے حالات

انفرادی مقابلے

فریقین کے درمیان لڑائی کی ابتدا انفرادی مقابلوں سے ہوئی۔ مشرکین کی طرف سے عتبہ بن ربیعہ، اس کا بھائی شیبہ بن ربیعہ اور عتبہ کا بیٹا ولید تینوں میدان میں اترے اور دعوت مبارزت دی۔ مسلمانوں کی طرف سے انصار کے تین نوجوان فوراً مقابلے کے لیے میدان میں آئے لیکن نبی ﷺ نے ان تینوں کو واپس بھیج دیا کیونکہ آپ ﷺ چاہتے تھے کہ ان کے مقابلے میں خود انھی کے رشتے دار آئیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: «قُمْ يَا عُبَيْدَةُ بْنَ الْحَارِثِ! وَقُمْ يَا حَمْزَةُ! وَقُمْ يَا عَلِيُّ!» ''عبیدہ بن حارث! اٹھو، حمزہ! آپ بھی اٹھیے، علی! تم بھی اٹھو۔''[1] حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے شیبہ کا مقابلہ کیا اور اسے فوراً مار گرایا۔ علی رضی اللہ عنہ نے ولید کا کام تمام کیا اور عبیدہ بن حارث رضی اللہ عنہ نے عتبہ کا مقابلہ کیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو گہرا زخم لگایا لیکن اسی اثنا میں حضرت حمزہ اور علی رضی اللہ عنہما عتبہ پر پلٹے اور اس کا کام تمام کر دیا اور حضرت عبیدہ کو اٹھائے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ عبیدہ رضی اللہ عنہ اسی طرح زخمی حالت میں رہے تا آنکہ شہادت پا گئے۔[2]

آغازِ جنگ کے انفرادی مقابلوں میں شریک ان چھ افراد کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے:

---

1 سنن أبي داود، حديث: 2665. اس حدیث کی سند ضعیف ہے۔ 2 المستفاد من قصص القرآن لعبد الكريم زيدان: 126/2.

﴿هٰذٰنِ خَصْمٰنِ اخْتَصَمُوْا فِيْ رَبِّهِمْ ۫ فَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا قُطِّعَتْ لَهُمْ ثِيَابٌ مِّنْ نَّارٍ ۭ يُصَبُّ مِنْ فَوْقِ رُءُوْسِهِمُ الْحَمِيْمُ ۝ يُصْهَرُ بِهٖ مَا فِيْ بُطُوْنِهِمْ وَالْجُلُوْدُ ۝ وَلَهُمْ مَّقَامِعُ مِنْ حَدِيْدٍ ۝ كُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ اُعِيْدُوْا فِيْهَا ۤ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ۝ اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّلُؤْلُؤًا ۭ وَلِبَاسُهُمْ فِيْهَا حَرِيْرٌ ۝ وَهُدُوْٓا اِلَى الطَّيِّبِ مِنَ الْقَوْلِ ۚ وَهُدُوْٓا اِلٰى صِرَاطِ الْحَمِيْدِ ۝﴾

''یہ دو جھگڑنے والے (گروہ) ہیں جنھوں نے اپنے رب کے بارے میں جھگڑا کیا، چنانچہ جن لوگوں نے کفر کیا ان کے لیے آگ کے کپڑے کاٹے جائیں گے، ان کے سروں کے اوپر سے کھولتا پانی انڈیلا جائے گا،اس سے وہ سب کچھ گل جائے گا جو ان کے پیٹوں میں ہے اور (ان کی) کھالیں بھی، ان (کو مارنے) کے لیے لوہے کے ہتھوڑے ہوں گے اور وہ جب بھی مارے غم کے اس سے باہر نکلنے کا ارادہ کریں گے، اسی میں لوٹا دیے جائیں گے اور (کہا جائے گا:) بے شک جلانے والا عذاب چکھو! جولوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے یقیناً اللہ ان کو (ایسے) باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں جاری ہیں، وہاں انھیں سونے کے کنگن اور موتی پہنائے جائیں گے اور وہاں ان کا لباس ریشم کا ہوگا اور (دنیا میں) انھیں پاکیزہ بات (توحید) کی ہدایت دی گئی اور قابل تعریف (اللہ کی) راہ دکھائی گئی۔''[1]

گھمسان کا رن

مشرکین نے جب اپنے تین سرداروں کا انجام اپنی آنکھوں سے دیکھا تو غصے سے

1 الحج 22:19-24. صحيح البخاري، حديث:3966.

بھڑک اٹھے اور یکبارگی مسلمانوں پر حملہ آور ہوئے۔ مسلمانوں نے دفاعی انداز اختیار کیا اور اپنے قدموں پر جمے رہے اور رسول اللہ ﷺ کے حکم کے پیش نظر ضرورت کے مطابق تیر پھینکتے رہے۔ غزوۂ بدر کے موقع پر مسلمانوں کا شعار (کوڈورڈ Code Word) [أَحَد، أَحَد] تھا۔

بعدازاں اللہ کے رسول ﷺ نے جوابی حملے کا حکم صادر فرمایا کہ اب تم فوراً دشمن پر چڑھائی کر دو۔ نبی ﷺ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو لڑائی پر ابھار رہے تھے اور فرما رہے تھے کہ جو آدمی جم کر اور ثواب کے حصول کی نیت سے لڑتے ہوئے شہید ہو گیا تو اس کے لیے جنت ہو گی۔ آپ ﷺ کا یہ فرمان صحابہ کے لیے مزید گرمجوشی کا سبب بنا اور لڑائی میں تیزی آ گئی، اسی طرح مدد کے لیے فرشتوں کا نزول، مشرکین کو مسلمانوں کی آنکھ میں تھوڑا دکھانا اور نبی ﷺ کا زرہ میں ملبوس ہو کر لشکر کی قیادت کرنا باعث ہمت ثابت ہوا۔ آپ ﷺ دوسرے مسلمانوں کی نسبت مشرکین سے قریب تر تھے اور یہ آیت تلاوت فرما رہے تھے:
﴿سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ﴾ ”عنقریب لشکر شکست کھائے گا اور لوگ پیٹھ پھیر کر بھاگیں گے۔“[1]

جس وقت رسول اللہ ﷺ نے جوابی حملے کا حکم صادر فرمایا، دشمن کے حملوں کی تیزی جا چکی تھی اور ان کا جوش و خروش سرد پڑ رہا تھا، اس لیے یہ مبنی برحکمت منصوبہ مسلمانوں کی پوزیشن مضبوط کرنے میں بہت موثر ثابت ہوا کیونکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو جب حملہ آور ہونے کا حکم ملا اور ابھی ان کا جوشِ جہاد شباب پر تھا تو انھوں نے سخت تند اور صفایا کن حملہ کیا۔ وہ صفوں کی صفیں درہم برہم کرتے اور گردنیں کاٹتے آگے بڑھے۔ ان کے جوش و خروش میں یہ دیکھ کر مزید تیزی آ گئی کہ رسول اللہ ﷺ بنفسِ نفیس زرہ پہنے تیز تیز چلتے تشریف لا رہے ہیں۔[2]

1 القمر 45:54. صحيح البخاري، حديث: 4875، والرحيق المختوم، ص: 116-118. 2 الرحيق المختوم (اردو)، ص: 298.

نقشہ: 11
غزوۂ بدرالکبریٰ
(یوم الفرقان، یوم التقی الجمعان)
17 رمضان 2ھ، 13 مارچ 624ء
﴿اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِہٖ صَفًّا کَاَنَّھُمْ بُنْیَانٌ مَّرْصُوْصٌ﴾ "بلاشبہ اللہ پسند کرتا ہے ان لوگوں کو جولڑتے ہیں اس کی راہ میں صف بستہ گویا کہ وہ ایک دیوار ہیں سیسہ پلائی ہوئی۔" (الصف 4:61)
﴿وَلَقَدْ نَصَرَکُمُ اللّٰہُ بِبَدْرٍ وَّ اَنْتُمْ اَذِلَّۃٌ فَاتَّقُوا اللّٰہَ لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ﴾ "اور البتہ تحقیق مدد کی تمہاری اللہ نے بدر میں جب کہ تم کمزور تھے پس ڈرو تم اللہ سے تاکہ تم شکر کرو۔" (آل عمران 123:3)
کھجوروں کے باغ
مسلمانوں کا پڑاؤ
اَلْعُدْوَۃُ الدُّنْیَا
(قریب والا کنارہ)
صفوں کی ترتیب
تیغ زن
نیزہ باز
تیر انداز
بدر کا کنواں
زبیر بن عوام کا گھوڑا
مقداد بن عمرو کا گھوڑا
عبیدہ
علی
حمزہ
جنگِ مبارزت
ولید
شیبہ
عتبہ
مسلمان مشرکین کے تعاقب میں
مشرکین کی صفیں بکھر گئیں
950
مشرکین کے لشکر کا دھاوا
اَلْعُدْوَۃُ الْقُصْوٰی
(دور والا کنارہ)
مشرکین کا فرار
مکہ مکرمہ کا راستہ
مدینہ منورہ کا راستہ
مدینہ منورہ
حجاز
بدر
ابواء
الجحفہ
رابغ
بحیرۂ احمر
0
50
100
150
کلومیٹر
مقام بدر

تفسیر طبری (209/11) میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے غزوۂ بدر کی رات خواب میں مشرکین کو قلیل مقدار میں دیکھا۔ جب آپ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو یہ خواب سنایا تو سب نے اسے نیک شگون خیال کیا۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿إِذْ يُرِيكَهُمُ اللَّهُ فِي مَنَامِكَ قَلِيلًا ۖ وَلَوْ أَرَاكَهُمْ كَثِيرًا لَّفَشِلْتُمْ وَلَتَنَازَعْتُمْ فِي الْأَمْرِ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ سَلَّمَ ۗ إِنَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ۝﴾

''(اے نبی! یاد کریں) جب اللہ نے آپ کے خواب میں آپ کو ان کی تعداد کم دکھائی اور اگر وہ آپ کو ان کی تعداد زیادہ دکھاتا تو آپ ضرور ہمت ہار دیتے اور اس معاملے میں آپس میں اختلاف کرتے لیکن اللہ نے (تمھیں) بچا لیا۔ بے شک وہ سینوں کے بھید خوب جانتا ہے۔''[1]

آیت کا مطلب یوں ہوگا کہ بلاشبہ نبی ﷺ نے خواب میں مشرکین کی تعداد تھوڑی دیکھی۔ اور یہ خواب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو سنایا تو یہ خواب ان کے لیے مزید استقامت کا باعث بنا۔ امام مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر اللہ کے رسول ﷺ مشرکین کو خواب میں کثیر تعداد میں دیکھتے تو یہ سن کر صحابہ کرام گھبرا جاتے، ہمت ہار جاتے اور سستی دکھاتے۔ اور یہ بحث شروع ہو جاتی کہ لڑائی ہونی چاہیے یا نہیں؟ آیت میں ذکر کردہ مضارع کا صیغہ ماضی کے معنی میں ہوگا کیونکہ یہ آیت خواب دیکھ لینے کے بعد نازل ہوئی تھی۔ ﴿وَلَٰكِنَّ اللَّهَ سَلَّمَ﴾ ''لیکن اللہ نے (تمھیں) بچالیا'' یعنی اللہ نے انھیں پھسلنے اور جنگ کرنے یا نہ کرنے کی بحث میں پڑنے سے بچا لیا اور نبی ﷺ کو ان کی تعداد تھوڑی دکھائی۔[2]

جب رسول اللہ ﷺ نے اپنا خواب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو سنایا تو یہ خواب بلاشبہ ان کے لیے ثابت قدمی، بہادری اور دشمن کے خلاف جرأت مندی کا سبب بنا لیکن لڑائی کا وقت آیا تو دونوں گروہوں ہی نے ایک دوسرے کو قلیل تعداد میں دیکھا جیسا کہ اللہ تعالیٰ

[1] الأنفال 8:43. [2] المستفاد من قصص القرآن لعبد الكريم زيدان: 125/2.

نے ارشاد فرمایا:

﴿ وَاِذْ يُرِيْكُمُوْهُمْ اِذِ الْتَقَيْتُمْ فِيْٓ اَعْيُنِكُمْ قَلِيْلًا وَّيُقَلِّلُكُمْ فِيْٓ اَعْيُنِهِمْ لِيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا ۭ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۝ ﴾

''اور (اے مسلمانو یاد کرو!) جب تم (کافروں کے) آمنے سامنے ہوئے تو اللہ نے انھیں تمھاری نظروں میں تھوڑا دکھایا اور تمھیں ان کی نظروں میں تھوڑا دکھایا تاکہ اللہ اس کام کو پورا کردے جو ہونے والا تھا۔ اور سب کام اللہ ہی کی طرف لوٹتے ہیں۔''[1]

اہل ایمان کو جنگ کے وقت کفار کی تعداد کم نظر آئی جس سے ایک طرف تو نبی ﷺ کا خواب حقیقت بن کر سامنے آیا، دوسری طرف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو یقینِ محکم حاصل ہوا اور انھوں نے جاں نثاری سے قدم آگے بڑھائے اور ثابت قدم رہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے پہلو میں کھڑے ایک شخص سے دریافت کیا کہ تمھارے خیال کے مطابق ان کفار کی تعداد ستر کے قریب ہوگی؟ تو اس نے کہا: ''نہیں بلکہ سو کے قریب ہوگی۔'' بعدازاں ہم نے ایک آدمی کو قید کیا تو اس سے سوال کیا کہ تمھاری تعداد کتنی ہے؟ تو اس نے بتایا کہ ہم ایک ہزار ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَيُقَلِّلُكُمْ فِيْٓ اَعْيُنِهِمْ ﴾ ''اور تمھیں ان کی نظروں میں تھوڑا دکھلاتا تھا۔'' اسی لیے تو کفار میں سے ایک کہنے والے نے کہہ بھی دیا تھا کہ یہ مسلمان تو ایک اونٹنی کا نوالہ ہیں۔

اہل ایمان کے لیے مشرکین کی تعداد کم ظاہر کرنے میں حکمت اور نکتے کی بات یہ تھی کہ مسلمان مستعد ہو جائیں اور ثابت قدم رہیں اور ایسا ہی ہوا کہ مسلمانوں کے دلوں سے مشرکین کا خوف جاتا رہا اور وہ ان کے خلاف لڑائی پر آمادہ ہو گئے۔

[1] الأنفال 8:44.

مشرکین کے لیے اہل ایمان کی تعداد کم ظاہر کرنے میں حکمت یہ تھی کہ وہ جب مسلمانوں کو قلیل تعداد میں دیکھیں گے تو بلاخوف پیش قدمی کریں گے اور کسی کی پروا بھی نہ کریں گے، نتیجتاً وہ قدرے بے احتیاط ہو جائیں گے۔ اور اپنی استعداد اور حاضر دماغی کو بالائے طاق رکھ کر پیش قدمی کریں گے لیکن جب وہ آگے بڑھے تو ان کو مسلمانوں کی تعداد زیادہ نظر آنے لگی۔ وہ ششدر رہ گئے اور ڈر گئے اور ان کا اندازہ غلط ثابت ہوا اور اس وجہ سے ان کا غرور وتکبر خاک میں مل گیا۔ اور وہ رسوا ہوئے اور مسلمان نصرت الٰہی سے سرفراز ہوئے۔[1]

مسلمانوں کی مدد کے لیے فرشتوں کا نزول

قرآن کریم، احادیثِ مبارکہ اور بہت سے بدری صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کفار کے دل میں رعب ڈالنے کے لیے فرشتوں کا نزول فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿اِذْ يُوْحِيْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ اَنِّيْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۭ سَاُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ وَاضْرِبُوْا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ ۝﴾

"(اے نبی!) جب آپ کا رب فرشتوں کی طرف وحی کر رہا تھا کہ بے شک میں تمھارے ساتھ ہوں، چنانچہ تم ان کو ثابت (قدم) رکھو جو ایمان لائے ہیں، میں جلد ہی ان لوگوں کے دلوں میں رعب ڈال دوں گا جنھوں نے کفر کیا، چنانچہ تم (ان کی) گردنوں پر وار کرو اور ان کے ہر (ہر) پور پر ضرب لگاؤ۔"[2]

اللہ تعالیٰ نے مزید ارشاد فرمایا:

---

1 تفسیر الکشاف للزمخشري: 225/2، وتفسیر ابن کثیر: 315/2. 2 الأنفال 12:8.

﴿ وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللَّهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ ۚ فَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ○ اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ اَنْ يُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُنْزَلِيْنَ ○ بَلٰٓى ۙ اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا وَيَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ ○ وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى لَكُمْ وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ ۗ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ○ ﴾

”اور اللہ نے بدر میں عین اس وقت تمھاری مدد کی جب تم کمزور تھے۔ پس تم اللہ سے ڈرو تا کہ تمھیں شکر ادا کرنے کی توفیق ہو، (اے نبی!) جب آپ مومنوں سے کہہ رہے تھے: کیا تمھارے لیے کافی نہ ہوگا کہ اللہ آسمان سے تین ہزار فرشتے اتار کر تمھاری مدد کرے؟ کیوں نہیں! اگر تم صبر کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو اور دشمن تم پر فوراً چڑھ آئے تو اسی لمحے تمھارا رب پانچ ہزار فرشتوں سے تمھاری مدد کرے گا جو (خاص) نشان والے ہوں گے۔ اور اللہ نے اسے تمھارے لیے خوشخبری بنا دیا تا کہ اس سے تمھارے دلوں کو تسلی ہو۔ اور مدد تو اللہ ہی کی طرف سے ہوتی ہے جو بہت زبردست، نہایت حکمت والا ہے۔“[1]

صحیح بخاری و مسلم اور مسند احمد بن حنبل میں بہت سی صحیح احادیث موجود ہیں جن میں معرکۂ بدر میں مسلمانوں کے ساتھ فرشتوں کے شریک ہونے اور بالفعل مشرکین کے خلاف جنگ کرنے کا تذکرہ اور ان کے ذریعے مشرکوں کے قتل ہونے کا اشارہ بھی پایا جاتا ہے۔[2]

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ”ایک مسلمان بدر کے دن اپنے آگے جانے والے مشرک کے تعاقب میں بھاگ رہا تھا۔ اچانک اس نے اوپر سے کوڑے کی آواز سنی اس کے ساتھ ہی ایک گھڑ سوار کی آواز بھی سنی جو یہ کہہ رہا تھا: ”حیزوم! آگے بڑھو۔“ مسلمان نے اچانک دیکھا کہ وہ مشرک چت گرا ہوا تھا۔ مسلمان نے لپک کر دیکھا

1 آل عمرٰن 3:123-126. 2 نضرة النعيم:291/1.

تو اس کی ناک زخمی اور چہرہ پھٹا ہوا تھا۔ جیسے کسی نے کوڑا مارا ہو اور (کوڑے کے زہر آلود ہونے کی وجہ سے) اس کا سارا جسم سبز ہو چکا تھا۔ اس انصاری مسلمان نے یہ قصہ نبی ﷺ کے گوش گزار کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: «صَدَقْتَ، ذٰلِكَ مِنْ مَّدَدِ السَّمَاءِ الثَّالِثَةِ» ”تم سچ کہتے ہو یہ تیسرے آسمان سے مدد آئی تھی۔“ [1]

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت میں ہے کہ نبی ﷺ نے بدر کے دن ارشاد فرمایا: «هٰذَا جِبْرِيلُ آخِذٌ بِرَأْسِ فَرَسِهِ عَلَيْهِ أَدَاةُ الْحَرْبِ» ”یہ جبریل ہیں جو اپنے گھوڑے کو سر سے پکڑے ہوئے ہیں اور ہتھیار بند ہیں۔“ [2]

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک انصاری صحابی حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو اس دن قید کر کے لایا۔ عباس رضی اللہ عنہ کہنے لگے: ”اللہ کی قسم! اس نے مجھے قید نہیں کیا۔ مجھے تو ایک ایسے خوبصورت آدمی نے قید کیا ہے جس کے سر کے سامنے کی طرف سے دونوں طرفوں کے بال نہیں تھے اور وہ ایک چتکبرے گھوڑے پر سوار تھا۔ اب وہ مجھے ان لوگوں میں نظر بھی نہیں آ رہا۔“ انصاری کہنے لگا: ”نہیں، اللہ کے رسول! اسے میں نے ہی قید کیا ہے۔“ آپ ﷺ نے فرمایا: «اُسْكُتْ، فَقَدْ أَيَّدَكَ اللّٰهُ بِمَلَكٍ كَرِيمٍ» ”تم چپ رہو۔ اللہ نے ایک معزز فرشتے سے تمھاری مدد فرمائی ہے۔“ [3]

ابو داود مازنی رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ میں ایک مشرک کے تعاقب میں تھا کہ اسے مار گراؤں مگر میری تلوار کے اس تک پہنچنے سے پہلے ہی اس کا کام تمام ہو گیا۔ اس کا سر تن سے جدا ہو کر گر گیا۔ میں سمجھ گیا کہ اسے میرے سوا کسی اور ہی نے قتل کیا ہے۔ [4]

بلاشبہ معرکہ بدر میں فرشتوں کا نزول یقینی امر ہے جس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ اس امداد کی حکمت یہ تھی کہ مسلمانوں کے لیے کامیابی کے اسباب مہیا ہوں، چنانچہ

---

[1] صحيح مسلم، حديث: 1763. [2] صحيح البخاري، حديث: 3995. [3] مسند أحمد: 117/1.
[4] مسند أحمد: 450/5.

فرشتوں نے یہ اسباب فراہم کیے، مثلاً: مدد آنے کی خوشخبری دینا، ان کے دلوں میں مدد کی آمد کا احساس پیدا کرنا تاکہ انھیں جنگ میں ثابت قدمی حاصل رہے اور لڑائی میں جوش و خروش پیدا ہو۔

بعض فرشتوں نے بالفعل لڑائی میں حصہ بھی لیا اور بلاشبہ اس شراکت سے صحابہ کرام کے دل مضبوط ہو گئے اور لڑائی میں تیزی اور گرمجوشی آ گئی۔ اس پر بہت سی آیات اور احادیث دلالت کرتی ہیں۔[1]

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کئی ایک فرشتوں سے مسلمانوں کی امداد کی کیا حکمت ہے، حالانکہ یہ کام تو ایک فرشتہ بھی کر سکتا تھا، جیسے جبرئیل علیہ السلام ہیں، وہ اکیلے ہی کفار کو برباد کر سکتے تھے۔ اس کا جواب دیتے ہوئے استاد عبدالکریم زیدان فرماتے ہیں کہ ازل سے حق کا باطل سے اور اہل حق کا اہل باطل سے تصادم رہا ہے۔ غلبہ ہمیشہ اہل حق کو حاصل ہوا لیکن اس کائنات میں اسباب اختیار کرنے کا قانون جاری اور ساری ہے، لہٰذا مدد حاصل کرنے کے لیے اسی طرح کوشش کرنا لازمی ہے جس طرح حق پر کار بند رہنا اور اس کے تمام تقاضے پورے کرنا ضروری ہے جس سے اللہ کی تائید و نصرت حاصل ہوتی ہے۔

یاد رہے کہ حق و باطل کا ٹکراؤ اسباب اختیار کرنے کے قدرتی قانون کا حصہ ہے اور اس میں وہ جانب ہی کامیاب ہوتی ہے جو ہمہ اسباب کو اختیار کرنے والی ہو۔

غزوۂ بدر میں فرشتوں کی امداد مجاہدین کے ایمان محکم کے نتیجے میں آئی جس کی بنا پر غلبہ ممکن ہوا۔ علاوہ ازیں اہل ایمان کا بالفعل لڑائی کرنا، شہادت پانا، جنگ میں ثابت قدمی دکھانا، اللہ پر کامل بھروسا اور یقین کرنا، مادی اسبابِ جنگ کی تیاری، افراد کی فراہمی اور جنگی فنون سے واقفیت حاصل کرنا جیسے ظاہری اسباب کا ہونا بھی ضروری تھا اور یہی وہ امور ہیں جنھیں اختیار کرنے پر اللہ تعالیٰ نے کامیابی کی ضمانت دی ہے۔

[1] المستفاد من قصص القرآن لعبد الکریم زیدان: 2/132,131.

اہل ایمان کو ان کا دین دعوت دیتا ہے کہ وہ آگے بڑھیں اور باطل اور باطل پرستوں کا قلع قمع کرنے میں اپنا کردار ادا کریں۔ کامیابی اور اللہ کی مدد حاصل کرنے کے لیے مادی اور ایمانی اسباب اختیار کریں۔ اس طرح اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا تو باطل کے پرستار اپنے انجام کو پہنچ جائیں گے۔[1]

اسی کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿قَٰتِلُوهُمْ يُعَذِّبْهُمُ ٱللَّهُ بِأَيْدِيكُمْ وَيُخْزِهِمْ وَيَنصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَيَشْفِ صُدُورَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِينَ ۝ وَيُذْهِبْ غَيْظَ قُلُوبِهِمْ ۗ وَيَتُوبُ ٱللَّهُ عَلَىٰ مَن يَشَآءُ ۗ وَٱللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ۝﴾

''ان سے (خوب) لڑائی کرو، اللہ انھیں تمھارے ہاتھوں سے عذاب دے گا اور انھیں رسوا کرے گا اور ان کے خلاف تمھاری مدد کرے گا اور مومنوں کے سینوں کو شفا (ٹھنڈک) بخشے گا اور وہ ان کے دلوں کا غصہ دور کرے گا اور اللہ جس پر چاہے توجہ فرماتا ہے۔ اور اللہ خوب جاننے والا، خوب حکمت والا ہے۔''[2]

آسمان سے فرشتوں کا نزول اور اہل ایمان کی نصرت ایک عظیم واقعہ ہے۔ فرشتوں کا نزول اہل ایمان کے لیے ثابت قدمی کا باعث تھا کیونکہ انھیں یقین ہو گیا تھا کہ وہ اس میدان میں اکیلے نہیں ہیں۔ انھوں نے حصول مدد کے تقاضے پورے کیے ہیں اور راستے کی ہر رکاوٹ کو دور کیا ہے جس کے نتیجے میں وہ آسمانی مدد کے مستحق ٹھہرے ہیں۔ اس احساس نے انھیں بلاخوف و خطر دشمن کی صفوں میں داخل کر دیا، حالانکہ دیکھا جائے تو دونوں لشکروں کے درمیان کوئی تناسب نہ تھا۔ کفار کا لشکر تعداد میں (تین گنا) زیادہ اور اسلحہ میں خود کفیل تھا، جبکہ اسلامی لشکر تعداد میں کم اور جنگی ساز و سامان میں تہی دامن تھا۔

فرشتوں کا نزول دوسری طرف کفار کے حوصلوں کو پست اور ان کے یقین کو متزلزل کر

---

1 المستفاد من قصص القرآن لعبد الکریم زیدان: 132,131/2۔ 2 التوبۃ 9: 15,14۔

رہا تھا کیونکہ ان کی صفوں میں مسلمانوں کے لیے نزول ملائکہ کا مسلسل تذکرہ ہو رہا تھا۔ اور بعض کفار ملائکہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے۔ مسلمانوں کی تعداد اور طاقت کے مقابلے میں وہ کتنے ہی طاقتور اور مسلمانوں کو ختم کرنے کی دسترس کیوں نہ رکھتے ہوں لیکن ایک نظر نہ آنے والی طاقت کے تصور نے انھیں ہلا کر رکھ دیا تھا اور ان کے دلوں میں مسلمانوں کا رعب بیٹھ گیا۔ اور انھیں اس غیبی لشکر کی تعداد کا علم ہو سکا نہ استعداد کا اندازہ۔ مسلمانوں کا یہ رعب و دبدبہ عہد نبوی، خلافت راشدہ اور بعد کے کئی ادوار تک جنگ میں قائم رہا اور دشمن پر ہونے والے مسلسل اور فیصلہ کن حملوں میں یہ احساس بھی کارفرما رہا۔ [1]

اہل ایمان کی فتح اور کنویں میں پڑے کفار کو سرزنش

معرکۂ بدر اہل ایمان کی فتح پر ختم ہوا۔ مشرکین کے مقتولین کی تعداد ستر تھی اور ستر ہی قید ہوئے۔ ان مقتولوں اور قیدیوں کی اکثریت قریش کے لیڈروں اور سرداروں پر مشتمل تھی، جبکہ مسلمانوں کے کل چودہ افراد شہید ہوئے۔ ان میں سے چھ مہاجرین اور آٹھ انصاری تھے۔ جب مکمل طور پر فتح ہوگئی اور دشمن کو شکست فاش کا سامنا کرنا پڑا تو نبی ﷺ نے مدینہ میں موجود مسلمانوں کو فتح کی خوشخبری اور مشرکین کی ہزیمت کی خبر دینے کے لیے عبداللہ بن رواحہ اور زید بن حارثہ رضی اللہ عنہم کو روانہ فرمایا۔ [2]

رسول اللہ ﷺ نے تین دن تک مقام بدر میں قیام فرمایا۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ ابوطلحہ سے بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ جب کسی قوم پر فتح یاب ہوتے تو میدان جنگ میں تین راتیں قیام فرماتے۔ [3]

تین دن تک میدانِ جنگ میں قیام کی مندرجہ ذیل حکمتیں ہوسکتی ہیں:

- میدان جنگ سے دشمن کا مکمل صفایا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی باقی ماندہ قوت بھاگنے

---

1 التاريخ الإسلامي للحميدي: 145/4. 2 المستفاد من قصص القرآن لعبد الكريم زيدان: 133/2. 3 صحيح البخاري، حديث: 3976.

والے شکست خوردہ دشمن کا سہارا بن سکے۔

❁ شہیدوں کی تدفین۔ کم و بیش ہر معرکے میں اہلِ ایمان شہادت سے سرفراز ہوتے ہیں۔ بدر کے دن بھی شہدائے معرکہ کو مقام بدر میں دفن کیا گیا۔ اوران پر نماز جنازہ یا کسی شہید کو بدر سے باہر دفن کرنے کا تذکرہ نہیں ملتا۔[1]

❁ مال غنیمت اکٹھا کرنا اور اسے کسی محافظ کے سپرد کرنا یہاں تک کہ مکمل طور پر اسے حق داروں کے درمیان تقسیم کر دیا جائے۔ بدر کے دن مال غنیمت عبداللہ بن کعب رضی اللہ عنہ کے سپرد ہوا جو بنو مازن سے تعلق رکھتے تھے۔[2]

❁ اسلامی لشکر کو آرام کا موقع فراہم کرنا۔ جسمانی اور روحانی جدوجہد کے بعد راحت و آرام حاصل کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اس دوران زخمیوں کی مرہم پٹی بھی کر لی جاتی ہے، اسی طرح اس موقع پر اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ایسی زبردست مدد پر اس کا شکر بھی ادا کرلیا جائے جو بظاہر ناممکن نظر آرہی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ انفرادی اور اجتماعی طور پر معرکہ میں پیش آمدہ ان واقعات و مسائل کا تذکرہ بھی کیا جاسکے جن کی وجہ سے مدد کا حصول ممکن ہوا۔

علاوہ ازیں انفرادی طور پر بہادری اور فدا کاری کے تذکرے، مشکل حالات میں پیش قدمی کرنے والوں کا تذکرہ، پلٹنے اور حملہ کرنے کے سلسلے میں حاصل ہونے والے اسباق، دشمن کی منصوبہ بندی پر نظر، اس سے حاصل ہونے والے فوائد کا احاطہ، سالار اعلیٰ کی راہ نمائیوں کے ان مٹ نقوش، اعلیٰ قیادت کی جنگی حکمت عملی کا تذکرہ اور بالفعل ان کے جنگ میں شریک ہونے کا تذکرہ کرنا بھی اس تین روزہ قیام کی حکمت میں داخل ہوتا ہے۔

ان تمام امور کو زیر بحث لانے کا مقصد یہی ہوتا کہ مستقبل میں پیش آنے والے ممکنہ حالات میں تجربوں سے فائدہ اٹھایا جائے اور انتہائی کٹھن جہادی راہوں کے لیے ایسے اصول اخذ کیے جائیں جن کی بدولت نصرتِ الٰہی شامل حال ہو اور ہر طرف سے کامیابیاں

[1] نضرة النعيم: 291/1. [2] محمد رسول الله ﷺ لصادق عرجون: 453/3.

قدم چومیں۔

❁ مقتول اور میدان کارزار میں پڑے ہوئے زخم خوردہ دشمنوں کی پہچان۔ اس دوران کیفرِ کردار تک پہنچنے والے دشمنوں کا مکمل تعارف اور قوم میں ان کا مقام و مرتبہ بھی پہچانا جاتا اور زخمی افراد کا پتا بھی چلایا جاتا کہ دشمن کا جو فرد ابھی موت و حیات کی کشمکش میں ہے سالارِ اعلیٰ کے حکم کے مطابق اس کے شر سے محفوظ رہنے کی غرض سے اسے ختم کرنا، اسی طرح دشمن کے مقتولین کو کہیں ٹھکانے لگانا۔ اس سلسلے میں امت کے فرعون ابوجہل، عالم کفر کے لیڈر امیہ بن خلف اور ان جیسے دیگر سرکردہ ناپاک افراد کو بدر کے ایک پرانے گندے کنویں میں پھینکوا دیا گیا،[1] پھر آپ ﷺ اس کنویں کے کنارے پر کھڑے ہوئے اور ایک روایت کے مطابق ان مقتولین کے قریب کھڑے ہوئے اور فرمایا:

«بِئْسَ عَشِيرَةُ النَّبِيِّ كُنْتُمْ لِنَبِيِّكُمْ، كَذَّبْتُمُونِي وَصَدَّقَنِي النَّاسُ وَخَذَلْتُمُونِي وَنَصَرَنِي النَّاسُ، وَأَخْرَجْتُمُونِي وَآوَانِي النَّاسُ»

''تم لوگ اپنے نبی کے لیے کتنا برا خاندان ثابت ہوئے۔ تمھاری بدقسمتی کہ تم نے مجھے جھٹلایا جبکہ دیگر لوگوں نے میری تصدیق کی۔ تم نے مجھے بے یارومددگار چھوڑا جبکہ دوسرے لوگوں نے میری تائید کی اور تم نے مجھے ہجرت پر مجبور کر دیا، جبکہ انصار نے مجھے پناہ دی۔''[2]

صحیح بخاری کی ایک روایت ہے کہ نبی ﷺ کے حکم کے مطابق ان سب کفار کو گھسیٹ کر ایک کنویں میں پھینک دیا گیا، پھر آپ ﷺ وہاں کھڑے ہو کر ان سے یوں گویا ہوئے:

«يَا عُتْبَةُ بْنُ رَبِيعَةَ! وَيَا شَيْبَةُ بْنُ رَبِيعَةَ! وَيَا أُمَيَّةُ بْنُ خَلَفٍ! وَيَا أَبَاجَهْلِ بْنَ هِشَامٍ! وَيَا فُلَانُ! وَيَا فُلَانُ! هَلْ وَجَدْتُّمْ مَّا وَعَدَكُمْ

---

[1] صحيح البخاري، حديث: 3976، معاً. [2] السيرة النبوية لابن هشام: 293,292/2، و زادالمعاد: 187/3.

رَبُّكُمْ حَقًّا؟ فَإِنِّي وَجَدْتُّ مَا وَعَدَنِي رَبِّي حَقًّا»

''اے عتبہ بن ربیعہ! اے شیبہ بن ربیعہ! اے امیہ بن خلف! اے ابوجہل بن ہشام! اے فلان! اے فلان! کیا تم سے تمھارے رب نے جو وعدہ کیا تھا تم نے اسے برحق پایا؟ مجھ سے میرے رب نے جو وعدہ کیا تھا میں نے تو اسے برحق ہی پایا۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کی: ''اے اللہ کے رسول! آپ ایسے جسموں سے باتیں کر رہے ہیں جن میں روح نہیں؟''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «وَالَّذِي نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهِ! مَا أَنْتُمْ بِأَسْمَعَ لِمَا أَقُولُ مِنْهُمْ، غَيْرَ أَنَّهُمْ لَايَسْتَطِيعُونَ أَنْ يَرُدُّوا عَلَيَّ شَيْئًا» ''اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جان ہے! میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اسے تم ان سے زیادہ نہیں سن رہے لیکن یہ لوگ جواب نہیں دے سکتے۔''[1]

حضرت قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ نے انھیں زندہ کر دیا تھا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی گفتگو بطور سرزنش اور پشیمانی ان کو سنوائی تھی۔''[2]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس گفتگو سے واضح ہوتا ہے کہ وہ ایک نئی زندگی، یعنی عالم برزخ میں داخل ہو چکے ہیں جہاں وہ زندہ لوگوں کا کلام سن تو سکتے ہیں لیکن جواب دے سکتے ہیں نہ کلام کر سکتے ہیں۔ اس برزخی زندگی پر ایمان رکھنا اہل ایمان کا عقیدہ ہے۔

قبر کی نعمتیں اور سزائیں صحیح احادیث سے ثابت ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک دفعہ دو قبروں کے قریب سے گزرے اور فرمایا: «إِنَّهُمَا لَيُعَذَّبَانِ، وَ مَا يُعَذَّبَانِ فِي كَبِيرٍ، أَمَّا أَحَدُهُمَا فَكَانَ لَا يَسْتَتِرُ مِنَ الْبَوْلِ، وَ أَمَّا الْآخَرُ فَكَانَ يَمْشِي بِالنَّمِيمَةِ»

''بلاشبہ یہ دونوں قبر والے عذاب میں مبتلا ہیں اور انھیں یہ عذاب کسی بڑی بات کی وجہ

---

[1] صحيح البخاري، حديث: 3976، وصحيح مسلم، حديث:2874,2873. [2] صحيح البخاري، حديث:3976.

سے نہیں ہو رہا۔ ان میں سے ایک پیشاب کی چھینٹوں سے نہیں بچتا تھا اور دوسرے کا جرم یہ تھا کہ وہ چغلی کھاتا تھا۔''[1]

رسول اللہ ﷺ کے واضح فرامین کی موجودگی میں اس جیسی ان دیکھی حقیقتوں کو تسلیم کرنا ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آل فرعون کو عالم برزخ میں عذاب ہونے کی نشاندہی فرمائی ہے:

﴿ اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا ۚ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ ۣ اَدْخِلُوْٓا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ ﴾

''(وہ دوزخ کی) آگ ہے جس پر انھیں صبح و شام پیش کیا جاتا ہے اور جس دن قیامت قائم ہوگی (کہا جائے گا:) آل فرعون کو سخت ترین عذاب میں داخل کرو۔''[2]

اسی طرح شہداء کے لیے عالم برزخ میں نعمتوں کا ذکر ہے، چنانچہ شہداء کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ﴾

''ان لوگوں کو مردہ خیال نہ کرو جو اللہ کے راستے میں مارے گئے ہیں بلکہ وہ زندہ ہیں، انھیں ان کے رب کے ہاں رزق دیا جاتا ہے۔''[3]

سردارانِ کفار کا قتل اور مسلمان شہیدوں کے یادگار واقعات

سرکشوں کی ہلاکتیں

ابوجہل بن ہشام مخزومی کی ہلاکت: حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں غزوۂ بدر کے دن صف میں کھڑا تھا کہ میں نے اپنے دائیں اور بائیں دو نوعمر لڑکوں کو

---

1 صحيح البخاري، حديث: 218، و صحيح مسلم، حديث: 292. 2 المؤمن 46:40.
3 آل عمرٰن 169:3.

دیکھا۔ میرے دل میں خیال آیا: ''کاش! میں مضبوط اور جوان آدمیوں کے درمیان ہوتا۔'' اسی اثنا میں ان میں سے ایک نے مجھ سے کہا: ''چچا جان! آپ ابوجہل کو جانتے ہیں؟'' میں نے کہا: ''ہاں! تم اسے کیا کرو گے؟'' وہ کہنے لگا: «أُخْبِرْتُ أَنَّهُ يَسُبُّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ، وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ! لَئِنْ رَأَيْتُهُ لَا يُفَارِقُ سَوَادِي سَوَادَهُ حَتّٰى يَمُوتَ الْأَعْجَلُ مِنَّا» ''میں نے سنا ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے بارے میں نازیبا الفاظ کہتا ہے۔ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! اگر میں نے اسے دیکھ لیا تو میرا وجود اس کے وجود سے الگ نہیں ہوگا تاآنکہ ہم میں سے جس کی موت پہلے لکھی ہے وہ مر نہ جائے۔'' عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھے اس کی بات سن کر تعجب ہوا۔ اتنے میں دوسرے نوجوان نے مجھ سے یہی سوال کیا۔ میں نے دیکھا کہ ابوجہل لوگوں کے درمیان چکر لگا رہا ہے۔ میں نے کہا: ''ارے! دیکھو، یہ رہا تمھارا شکار جس کے بارے میں تم پوچھ رہے تھے۔'' یہ کہنے کی دیر تھی وہ دونوں اپنی اپنی تلوار لے کر اس پر جھپٹ پڑے اور اسے قتل کر دیا۔ اور پلٹ کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: «أَيُّكُمَا قَتَلَهُ؟» ''تم میں سے کس نے اسے قتل کیا ہے؟'' دونوں نے کہا: ''میں نے اسے قتل کیا ہے۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: «هَلْ مَسَحْتُمَا سَيْفَيْكُمَا» ''کیا تم اپنی تلواریں صاف کر چکے ہو؟'' وہ بولے: ''نہیں۔'' نبی ﷺ نے ان دونوں کی تلواریں دیکھیں اور فرمایا: «كِلَاكُمَا قَتَلَهُ» ''تم دونوں نے اسے قتل کیا ہے۔'' البتہ ابوجہل کا سامان معاذ بن عمرو بن جموح رضی اللہ عنہ کے لیے ہے۔ دونوں حملہ آور نوجوانوں کے نام معاذ بن عمرو بن جموح رضی اللہ عنہ اور معاذ ابن عفراء رضی اللہ عنہ تھے۔[1]

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے بدر کے دن اعلان فرمایا: «مَنْ يَنْظُرُ لَنَا مَا صَنَعَ أَبُو جَهْلٍ؟» ''کون ہے جو ہمیں ابوجہل کے بارے میں آگاہ کرے

[1] صحيح البخاري، حديث: 3141 و 3988، وصحيح مسلم، حديث: 1752.

کہ اس کا کیا بنا؟'' حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اس کام کے لیے روانہ ہوئے۔ انھوں نے اسے اس حال میں پایا کہ عفراء کے دونوں بیٹوں [1] نے اسے مار گرایا تھا لیکن ابھی اس میں زندگی کی رمق موجود تھی۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اسے ڈاڑھی سے پکڑا اور کہا: ''تو ہی ابوجہل ہے؟'' اس نے کہا: ''کیا جس شخص کو اس کی قوم نے قتل کیا، یا تم نے قتل کیا، اس سے بلند رتبے والا آدمی کوئی اور بھی ہے؟'' [2]

ایک اور روایت میں ہے کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''میں نے بدر کے دن ابوجہل کو زخمی حالت میں گرا ہوا پایا۔ میں نے کہا: ''او اللہ کے دشمن! آخر اللہ نے تجھے رسوا کردیا۔'' وہ کہنے لگا: ''مجھے کاہے کو رسوا کردیا۔ کیا جس شخص کو تم نے قتل کیا اس سے بلند پایہ آدمی بھی کوئی ہے؟'' حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میرے پاس اپنی تلوار تھی، میں بلاخوف آگے بڑھا۔ میں نے دیکھا کہ اس کا ہاتھ اس کی تلوار پر ہے۔ میں

1 ابوجہل کے قتل کے سلسلے میں پیچھے یہ گزرا ہے کہ اسے معاذ بن عمرو بن جموح اور معاذ ابن عفراء رضی اللہ عنہما نے قتل کیا تھا جبکہ یہاں یہ ذکر ہے کہ عفراء کے دونوں بیٹوں نے اسے قتل کیا اور یہ بھی آرہا ہے کہ انجام کار ابوجہل کو موت کے گھاٹ اتارنے والے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ تھے۔ ان اقوال کے درمیان تطبیق دیتے ہوئے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ ممکن ہے صحیح بخاری کی (گزشتہ) روایت کے مطابق معاذ ابن عفراء کے ساتھ حملے میں معاذ بن عمرو بن جموح شریک ہوئے ہوں۔ اور بعد میں معوذ ابن عفراء نے بھی ضرب لگائی اور اسے ڈھیر کردیا ہو۔ (لیکن ابھی کچھ رمق باقی تھی) انجام کار ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس کا سر کاٹ دیا۔ (فتح الباري: 369/7) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوجہل کا سامان اکیلے معاذ بن عمرو بن جموح کو اس لیے عطا فرمایا کیونکہ اس نے قتل کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا تھا، جبکہ اس کا دوسرا ساتھی صرف ضرب لگانے میں شریک ہوا تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کی دلجوئی کے لیے فرمایا تھا کہ تم دونوں نے اسے قتل کیا ہے کیونکہ وہ بھی اس قتل میں شریک تو تھا۔ معوذ ابن عفراء رضی اللہ عنہ اسی معرکے میں شہید ہو گئے تھے، نیز معاذ ابن عفراء رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بارے میں اختلاف ہے، جبکہ معاذ بن عمرو بن جموح رضی اللہ عنہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور تک زندہ رہے۔ (أسد الغابة: 190/5، 194 و 231) 2 صحيح البخاري، حديث: 3962 و 3963، وصحيح مسلم، حديث: 1800.

نے اس کے ہاتھ پر وار کیا تو اس کی تلوار دور جا گری جو میں نے قبضے میں لے لی، پھر اس کا خود اتارا اور اس کی گردن کاٹ لی اور نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو گیا اور آپ ﷺ کو خبر دی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: «اَللّٰهُ الَّذِي لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ!» ''تجھے اللہ وحدہ لا شریک کی قسم (کیا واقعی تو نے اسے قتل کیا ہے؟'') میں نے عرض کیا: ''مجھے اس اللہ کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں! (میں نے واقعی اسے قتل کیا ہے۔'') آپ ﷺ نے فرمایا کہ جاؤ اور تحقیق کرو۔ میں پرندے کی طرح اڑتا ہوا گیا اور اسی طرح اڑتا ہوا اور ہنستا ہوا واپس آیا اور اطلاع دی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «اِنْطَلِقْ» ''میرے ساتھ چلو۔'' میں آپ ﷺ کے ساتھ روانہ ہوا اور آپ ﷺ کو دکھایا۔ آپ ﷺ نے اسے دیکھتے ہی فرمایا: «كَانَ هٰذَا فِرْعَوْنَ هٰذِهِ الْأُمَّةِ» ''یہ اس امت کا فرعون تھا۔''[1]

دونو عمر انصاری نوجوانوں کو ابوجہل کے قتل پر ابھارنے کا باعث یہ بنا کہ ابوجہل نبی ﷺ کی شان میں ہرزہ سرائیاں کرتا تھا۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انصاری نوجوان اللہ کے رسول ﷺ سے کس حد تک محبت کرتے تھے۔ اور جو بھی بدنصیب آپ ﷺ کو ایذا رسانی کی کوشش کرتا اس سے بدلہ لینے کی خاطر وہ اپنی جان کی بازی بھی لگا دیتے تھے۔

ابوجہل جب اپنی زندگی کی آخری سانسیں لے رہا تھا، اس دوران حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور ابوجہل کے درمیان ہونے والی گفتگو میں عبرت کا عظیم پہلو ہے۔ سرزمین مکہ میں مسلمانوں کو سخت تکالیف سے دوچار کرنے والا یہ سرکش انسان اسی شخص کے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچا جسے وہ اذیتیں دیا کرتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے یہی فیصلہ فرمایا تھا کہ اسے آخری لمحات میں ان لوگوں میں سے ایک شخص ختم کرے گا جن پر اہل مکہ ابوجہل کی سرکردگی میں ظلم کے پہاڑ توڑا کرتے تھے۔

ابوجہل ایک متکبر اور خود غرض انسان تھا جس کا ثبوت اُس کے اُن الفاظ سے ملتا ہے

[1] مسند أحمد: 403/1 و 444، ومعجم الكبير للطبراني: 477/7. روایت ضعیف ہے۔

جو اس نے مرنے سے پہلے کہے تھے۔[1] ابن اسحاق کی ایک روایت کے مطابق جب عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس کا سر اتارنا چاہا تو اس نے کہا: ''او بکریوں کے حقیر سے چرواہے! تو بڑی اونچی اور مشکل جگہ چڑھ گیا ہے۔''[2]

ابو جہل کے قتل کے اسی واقعے کی وضاحت کرتے ہوئے سیرت نگار صادق عرجون کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ابو جہل کو دو انصاری نوجوانوں کے ہاتھوں شدید زخمی کروایا مگر اس کی موت واقع نہیں ہونے دی۔ وہ ابدی ہلاکت کے کنارے پہنچ چکا تھا لیکن اس کی دماغی صلاحیت تا حال کام کر رہی تھی۔ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ تھا کہ وہ اپنی ذلت و رسوائی اور قتل کو اپنی آنکھوں سے دیکھے کہ ایسا شخص جسے وہ مکہ میں کمزور اور ناتواں خیال کرتے ہوئے تکالیف دیتا اور ظلم کرتا رہا وہی آج اس کا خاتمہ کر رہا ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا شمار ان خوش نصیب افراد میں ہوتا ہے جنھوں نے آغازِ اسلام ہی میں اسلام کے سایۂ عاطفت میں جگہ پائی اور اپنے عقیدے کو پاک کیا اور اللہ کے نازل کردہ شفقت بھرے پاکیزہ احکامات پر عمل پیرا ہو کر اللہ کا قرب حاصل کیا۔ یہی عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اس موقع پر ابو جہل کے سینے پر چڑھ گئے۔ اسے اپنے قدموں تلے روندا، اسے مزید حقارت سے دوچار کرنے کے لیے اس کی داڑھی پکڑی اور سخت الفاظ کہے جن سے اس کا سارا غرور اور تکبر خاک میں مل گیا۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے تلوار ہاتھ میں لی اور اسے غصہ دلانے کے لیے خبر دی کہ اللہ تعالیٰ نے اسلام اور اسلامی لشکر کو فتح سے نوازا ہے اور ایک ذلت آمیز شکست کی صورت میں رسوائی اور عار اس مغرور لشکر کے حصے میں آئی ہے جس کی قیادت ابو جہل جیسا خبیث النفس آدمی کر رہا تھا۔[3]

امیہ بن خلف کا قتل: حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے امیہ بن خلف

---

[1] التاريخ الإسلامي للحميدي: 4/158-160. [2] السيرة النبوية لابن هشام: 2/289. [3] محمد رسول الله ﷺ لصادق عرجون: 3/431,432.

سے ایک تحریری معاہدہ کر رکھا تھا کہ وہ مکہ میں میرے اہل اور مال کی حفاظت کرے گا اور میں مدینہ میں اس کے اہل اور مال کی حفاظت کروں گا۔ جب میں نے معاہدے میں اپنے نام کا ایک حصہ ''الرحمٰن'' لکھنا چاہا تو اس نے کہا: ''میں رحمٰن کو نہیں جانتا، میرے ساتھ معاہدہ اپنے جاہلی نام ''عبد عمرو'' کو لکھ کر کرو۔'' میں نے اس کی بات مان لی۔

بدر کے دن جب سب لوگ سو گئے تو میں اسے لیے ایک پہاڑ کی طرف بڑھا تاکہ اسے محفوظ مقام تک پہنچاؤں۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے اسے دیکھ لیا۔ وہ انصار کی ایک مجلس کے پاس پہنچے اور بلند آواز سے بولے: ''وہ رہا امیہ بن خلف! اب یا تو میں رہوں گا یا امیہ۔'' یہ سن کر انصار کے ایک گروہ نے ہمارا تعاقب شروع کر دیا۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ وہ ہم تک پہنچ جائیں گے تو میں نے اس کے بیٹے کو پیچھے چھوڑ دیا تاکہ وہ اسی میں مگن ہو جائیں اور ہمارا تعاقب نہ کریں لیکن انصاریوں نے اسے فوراً قتل کر ڈالا اور دوبارہ ہمارا پیچھا شروع کر دیا۔

امیہ بن خلف بھاری بھرکم آدمی تھا۔ جب انھوں نے ہمیں آلیا تو میں نے اس سے کہا کہ تم گھٹنوں کے بل بیٹھ جاؤ۔ وہ بیٹھ گیا۔ میں رضی اللہ عنہ نے اس کی حفاظت کی غرض سے اپنے آپ کو امیہ پر ڈال دیا لیکن پھر بھی لوگوں نے نیچے سے تلواریں مار مار کر اسے قتل کر دیا حتی کہ اسی اثنا میں کسی کی تلوار سے میرا پاؤں بھی زخمی ہو گیا۔

راوی کہتے ہیں کہ عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ اپنے پاؤں کا زخم ہمیں دکھلایا کرتے تھے۔[1]

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ ایک دوسری روایت میں فرماتے ہیں کہ مکہ میں امیہ بن خلف میرا گہرا دوست تھا۔ میرا نام عبد عمرو تھا۔ جب میں مسلمان ہوا تو میں نے اپنا نام عبدالرحمٰن رکھ لیا۔ مکہ قیام کے دوران امیہ مجھ سے ملتا رہتا تھا اور اکثر مجھ سے کہا کرتا تھا: ''اے عبد عمرو! کیا تم نے اس نام سے منہ پھیر لیا ہے جو تمھارے ماں باپ نے تجویز کیا

[1] صحيح البخاري، حديث:2301.

تھا؟'' میں جواب دیتا: ''ہاں'' تو وہ کہتا: ''میں کسی رحمٰن کو نہیں جانتا۔ کوئی دوسرا ایسا نام بتاؤ جس سے میں تمھیں بلا لیا کروں کیونکہ ''عبدعمرو'' پکارنے سے تم مجھے جواب نہیں دیتے اور اس نئے غیر معروف نام سے میں تمھیں نہیں آواز دے سکتا۔'' حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''وہ جب بھی مجھے میرے پرانے نام سے آواز دیتا تو میں اس کی طرف متوجہ ہی نہ ہوتا تھا۔'' ایک دن میں نے اس سے کہا: ''اے ابوعلی! جو تیرے جی میں آئے میرا نام تجویز کر لے۔'' تو اس نے کہا: ''پھر تو عبدالالٰہ ہے۔'' میں نے تسلیم کر لیا کہ یہ ٹھیک ہے۔ اس کے بعد جب وہ میرے قریب سے گزرتا اور مجھے عبدالالٰہ کہہ کر پکارتا تو میں اس کا جواب دیتا اور پھر وہ میرے ساتھ گفتگو کا آغاز کرتا۔

بدر کے دن میں اس کے قریب سے گزرا تو دیکھا کہ وہ اور اس کا بیٹا علی بن امیہ کھڑے ہیں۔ میرے پاس کچھ زرہیں تھیں جو میں دشمن سے چھین کر لا رہا تھا۔ جب امیہ نے مجھے دیکھا تو بولا: ''اے عبدِ عمرو!'' میں نے کوئی جواب نہ دیا، پھر اس نے کہا: ''اے عبدالالٰہ!'' تو میں متوجہ ہوا۔ وہ کہنے لگا: ''کیا تمھیں میری ضرورت نہیں ہے؟ کیا میں تمھاری ان زرہوں سے بہتر نہیں ہوں؟'' میں نے کہا: ''اللہ کی قسم! ہاں'' پھر میں نے زرہیں وہیں پھینک دیں اور اسے اور اس کے بیٹے کو لے کر چل دیا۔ وہ کہہ رہا تھا: ''آج جیسا منظر تو میں نے کبھی دیکھا ہی نہیں۔ کیا تمھیں دودھ کی حاجت نہیں ہے؟'' حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''پھر میں ان دونوں کو لیے چل دیا۔'' ابن ہشام فرماتے ہیں: ''دودھ سے مراد یہ تھا کہ جو مجھے قید کرے گا اسے فدیے میں خوب دودھ والی اونٹنیاں دوں گا۔''[1]

اس واقعے سے مندرجہ ذیل حقائق واضح ہیں:

❁ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے جب اپنے سخت جانی دشمن امیہ بن خلف کو عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کی قید میں دیکھا تو بلند آواز سے کہا: ''اب یا تو میں زندہ رہوں گا یا امیہ۔'' کیونکہ امیہ

1 السيرة النبوية لابن هشام: 2/284,283.

سیدنا بلال رضی اللہ عنہ کو مکہ میں انتہائی سخت اور کربناک تکالیف سے دوچار کیا کرتا تھا۔

سیدنا بلال رضی اللہ عنہ کا یہ طرز عمل اللہ کے دشمنوں کو ملیا میٹ کر کے کامل اطمینان حاصل کرنے کے لیے تھا جس کا مقصد یہ تھا کہ دنیا کی زندگی میں بڑے بڑے کافروں سے نجات مل جائے اور سکون حاصل ہو جائے۔ اس احسان کی بدولت اللہ تعالیٰ نے سرکش کفار کے ہاتھوں ظلم و جبر کی چکی میں پیسے جانے والے اور حقارت و ذلت کا نشانہ بننے والے مومنوں کو راحت بخشی۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

﴿قَاتِلُوهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِأَيْدِيكُمْ وَيُخْزِهِمْ وَيَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَيَشْفِ صُدُورَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِينَ ۝ وَيُذْهِبْ غَيْظَ قُلُوبِهِمْ ۗ وَيَتُوبُ اللّٰهُ عَلَىٰ مَنْ يَّشَاءُ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ۝﴾

”ان سے (خوب) لڑائی کرو، اللہ انھیں تمھارے ہاتھوں سے عذاب دے گا اور انھیں رسوا کرے گا اور ان کے خلاف تمھاری مدد کرے گا اور مومنوں کے سینوں کو شفا (ٹھنڈک) بخشے گا اور وہ ان کے دلوں کا غصہ دور کرے گا اور اللہ جس پر چاہے توجہ فرماتا ہے۔ اور اللہ خوب جاننے والا، خوب حکمت والا ہے۔“[1]

❁ امیہ بن خلف کا دردناک انجام متکبر اور سرکش لوگوں کے لیے درسِ عبرت اور ایسے لوگوں کے لیے عمدہ نصیحت ہے جو اپنی طاقت کے نشے میں چُور اور مقام و مرتبہ کی غلط فہمیوں کا شکار ہو کر کمزور لوگوں پر ظلم کرتے اور ان کے حقوق سلب کرتے ہیں۔ ان کا آخرت میں انتہائی برا انجام ہونے والا ہے۔ اور کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کمزور افراد کو ان ظالموں پر قدرت عطا فرما دیتے ہیں جیسا کہ امیہ بن خلف اور اس جیسے دیگر کفر کے سرغنے تھے جن پر اللہ تعالیٰ نے کمزور اہلِ اسلام کو تسلط عطا فرمایا۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَنُرِيدُ أَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا فِي الْأَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ أَئِمَّةً وَّنَجْعَلَهُمُ الْوَارِثِينَ ۝﴾

[1] التوبۃ 9:14، 15.

''اور ہم چاہتے تھے کہ ان لوگوں پر احسان کریں جنھیں زمین میں ضعیف جان (کر دبا) لیا گیا تھا اور انھیں پیشوا بنائیں اور انھیں (ملک مصر کے) وارث بنائیں۔''[1]

❀ سیدنا بلال رضی اللہ عنہ نے انصاری صحابہ سے مدد لے کر حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کی مزاحمت بھی کی اور ان کے قیدی بھی چھین لیے اس کے باوجود حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کے یہ ریمارکس: ''اللہ تعالیٰ بلال رضی اللہ عنہ پر رحم فرمائے میری زرہیں بھی ضائع ہوئیں اور میرے قیدی کے بارے میں بھی انھوں نے مجھے تڑپا دیا۔'' ان کے آپس کے تعلقات اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی باہمی اخوت ایمانی کا عظیم مظہر ہیں۔[2]

❀ امیہ بن خلف کی بیوی ام صفوان رضی اللہ عنہا اسلام لانے کے بعد ایک دن مکہ مکرمہ میں حباب بن منذر رضی اللہ عنہ کی طرف دیکھ رہی تھیں کہ ان سے کہا گیا: یہ ''حباب وہی شخص ہیں جنھوں نے بدر کے دن آپ کے لخت جگر علی کے پاؤں کاٹ ڈالے تھے۔'' وہ کہنے لگیں: ''ہمیں حالت شرک میں مرنے والوں کے تذکرے سے کیا حاصل؟ اللہ تعالیٰ نے میرے بیٹے علی کو حباب بن منذر کے وار سے ذلت سے دوچار اور اسی سے حباب کو عزت سے نوازا۔ علی درحقیقت جب مکہ سے نکلا تو اس کا دل مسلمان تھا لیکن افسوس کہ اس نے جان کسی اور دین پر فدا کر دی۔''[3]

ام صفوان رضی اللہ عنہا کے یہ الفاظ ان کی ایمانی قوت اور یقین کامل کا پتا دیتے ہیں کہ وہ ولاء اور براء کا نظریہ پختگی سے اپنائے ہوئے تھیں۔ اب وہ مسلمانوں سے محبت رکھتی تھیں اگرچہ وہ ان کے قبیلے سے نہیں تھے اور کافروں سے نفرت کرتی تھیں اگرچہ وہ ان کے قبیلے کے لوگ تھے۔

ام صفوان رضی اللہ عنہا کا یہ کہنا کہ علی جب مکہ سے نکلا تو مسلمان تھا مگر اس نے جان کسی اور

[1] القصص 28:5. [2] التاريخ الإسلامي للحميدي: 153/4. [3] التاريخ الإسلامي للحميدي: 154/4.

دین پر فدا کر دی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ علی بن امیہ بھی ان لوگوں میں سے تھا جن کے بارے میں یہ معروف ہو چکا تھا کہ وہ مسلمان ہیں۔ یہ وہ لوگ تھے جنھیں کفار بدر کے دن زبردستی اپنے ساتھ لائے تھے، پھر جب غزوۂ بدر کے دن دونوں لشکر آمنے سامنے ہوئے تو ان مجبوراً ہمرکاب ہونے والوں نے مسلمانوں کو تعداد میں کم سمجھا تو یہ فتنے میں مبتلا ہو گئے اور کہنے لگے کہ ان مسلمانوں کو ان کے دین نے دھوکے میں مبتلا کر رکھا ہے، لہٰذا ان کے بارے میں اللہ کا یہ فرمان نازل ہوا:

﴿اِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ غَرَّ هٰٓؤُلَآءِ دِيْنُهُمْ ۭ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝﴾

”جب منافق اور وہ لوگ جن کے دلوں میں روگ تھا، یہ کہتے تھے کہ ان (مسلمانوں) کو ان کے دین نے دھوکے میں ڈال دیا ہے۔ اور جو کوئی اللہ پر بھروسا کرے تو بے شک اللہ زبردست خوب حکمت والا ہے۔“ [1]

عبیدہ بن سعید بن عاص کی ہلاکت: حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ بدر کے دن میں عبیدہ بن سعید بن عاص کے مقابلے میں آیا۔ عبیدہ کا سارا بدن دفاعی اسلحے میں چھپا ہوا تھا صرف اس کی آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔ اس کی کنیت ابو ذات الکرش تھی۔ اس نے کہا کہ میں ابو ذات الکرش ہوں۔ میں نے تاک کر اس کی آنکھ میں نیزہ مارا جس سے وہ ہلاک ہو گیا۔

حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا: ”میرا نیزہ اس کی زرہ میں پھنس گیا۔ میں نے اپنا پاؤں اس کی گردن پر رکھا اور نیزے کو زور سے کھینچنے کے لیے ہاتھ آگے بڑھائے اور بمشکل اس سے اپنا نیزہ نکالا۔ اس سے نیزے کی دونوں دھاریں مڑ گئی تھیں۔“ [2]

عروہ بن زبیر فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ نیزہ ان سے طلب فرمایا تو انھوں نے وہ

---

1 الأنفال 8:49. تفسير ابن كثير: 4/76. 2 التاريخ الإسلامي للحميدي: 4/154.

نیزہ آپ ﷺ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ نبی ﷺ کی وفات کے بعد انھوں نے یہ نیزہ واپس لے لیا، پھر سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اسے طلب کیا تو انھوں نے نیزہ ابو بکر رضی اللہ عنہ کے حوالے کر دیا۔ سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ کے انتقال کے بعد نیزہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مانگا تو انھوں نے نیزہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو دے دیا۔ جب وہ بھی شہید ہو گئے تو حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے وہ نیزہ واپس لے لیا، پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اسے طلب کیا تو حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے یہ یادگار نیزہ ان کے حوالے کر دیا اور ان کی شہادت کے بعد یہ نیزہ آل علی کے پاس رہا، پھر یہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کے قبضے میں آ گیا اور یہ نیزہ انھی کے پاس رہا تا آنکہ وہ فتنہ حجاج بن یوسف میں شہید ہو گئے۔ [1]

مذکورہ قصے سے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کی نشانہ بازی میں مہارت کا پتا چلتا ہے۔ انھوں نے ناممکن نظر آنے والا ہدف حاصل کیا اور نیزہ دشمن کی آنکھ میں اتار دیا، حالانکہ ان کی صلاحیت میدانِ کارزار میں رزم آرائی اور اپنے دفاع پر بھی برابر صرف ہو رہی تھی۔ اسلحہ سے لیس اس انسان کو قتل کرنا انتہائی مشکل تھا۔ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کی یہ ضرب بہت گہری تھی۔ اس سے زبیر رضی اللہ عنہ کی نشانہ بازی میں مہارت کے ساتھ ساتھ ان کی جسمانی قوت کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔ [2]

اسود مخزومی کی ہلاکت: ابن اسحاق کہتے ہیں کہ اسود مخزومی ایک بدخلق اور اڑیل مزاج آدمی تھا۔ وہ یہ کہتے ہوئے میدان میں نکلا کہ میں ان کے حوض کا پانی پی کر رہوں گا یا اسے پاٹ دوں گا چاہے جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔ جب وہ اپنے ارادے کی تکمیل کے لیے آگے بڑھا تو حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ اس کے سامنے آئے جب دونوں نے ایک دوسرے پر وار کیا تو حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے تلوار کی ایسی ضرب لگائی کہ اس کی ٹانگ نصف پنڈلی سے کٹ گئی۔ وہ ابھی حوض سے پیچھے تھا اور اس کے پاؤں سے اسی کے ساتھیوں کی

1 صحيح البخاري، حديث: 3998. 2 التاريخ الإسلامي للحميدي: 4/163.

جانب خون کا فوارہ پھوٹ رہا تھا اس کے باوجود وہ گھٹنوں کے بل گھسٹ کر حوض کی طرف بڑھا اور اپنی قسم پوری کرنے کے لیے حوض میں داخل ہو گیا۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے اس کا تعاقب کیا اور ایک اور کاری ضرب لگائی اور اسے حوض ہی میں ڈھیر کر دیا۔[1]

امیہ بن خلف نے عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ سے سوال کیا تھا کہ آپ میں سے وہ کون تھا جو اپنے سینے پر شتر مرغ کا پر لگائے ہوئے تھا؟ حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: ''وہ حمزہ رضی اللہ عنہ تھے۔'' امیہ نے کہا: ''یہی وہ شخص ہے جس نے بڑے عجیب وغریب انداز سے ہمارے لشکر میں تباہی مچائی تھی۔''[2]

یہ جنگ بدر میں شریک کافروں کے ایک سرغنے کی گواہی تھی اور امیہ کی اس گواہی سے مراد یہ تھی کہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے قتل کر کے دشمنوں کا خون بھی خوب بہایا تھا اور ان کا شیرازہ بھی بکھیر دیا تھا۔[3]

اللہ کے شیر حمزہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں قتل ہونے والا معرکے کا پہلا ایندھن یہی اسود مخزومی تھا۔ یہ بدخلق اور اڑیل آدمی مسلمانوں کو چیلنج دیتے ہوئے آگے بڑھا۔ سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ نے اس کا مقابلہ کیا اور اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اور اس کی موت بہت سے اسلام دشمن، کینہ پرور اور متکبر لوگوں کے لیے درس عبرت بن گئی۔[4]

عتبہ بن ربیعہ کی ہلاکت اور بیٹے کے جذبات: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب مشرکین کی لاشوں کو کنویں میں ڈالنے کا حکم دیا گیا اور عتبہ بن ربیعہ کو کنویں کی طرف گھسیٹ کر لایا جانے لگا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بیٹے ابو حذیفہ رضی اللہ عنہ کے چہرے کی طرف دیکھا تو اس پر ناپسندیدگی کے اثرات نمایاں تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «يَا أَبَا حُذَيْفَةَ! وَاللّٰهِ لَكَأَنَّهُ سَائَكَ مَا كَانَ فِي أَبِيكَ» ''اے ابوحذیفہ! شاید اپنے باپ کے بارے

---

1 السيرة النبوية لابن هشام: 237/2. 2 التاريخ الإسلامي للحميدي: 151/4. 3 التاريخ الإسلامي للحميدي: 152/4. 4 التاريخ الإسلامي للحميدي: 121/4.

میں تمھارے دل میں کچھ ناگوار احساسات ہیں؟'' انھوں نے عرض کیا: ''نہیں، اللہ کی قسم اے اللہ کے رسول! مجھے اللہ اور اس کے رسول کے بارے میں کسی قسم کا کوئی شک نہیں ہے۔ ہاں البتہ میں اپنے باپ کو سوجھ بوجھ کا حامل، دور اندیش اور صاحب رائے خیال کرتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ یہ خوبیاں ان کی وفات سے پہلے ضرور ان کے لیے اسلام کی راہ ہموار کریں گی لیکن اب ان کا انجام سامنے دیکھ کر اور خلاف توقع کفر پر ان کا خاتمہ دیکھ کر مجھے افسوس ہوا ہے۔'' یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ کے حق میں دعائے خیر فرمائی۔ [1]

ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ کا ایمان یقین کی بلندیوں کو چھو رہا تھا اور وہ نبی ﷺ کے ساتھ حد درجہ وفادار تھے۔ بشری تقاضوں کے مطابق کچھ احساسات ان میں دیکھے گئے۔ ایمان بشری تقاضوں کو ختم نہیں کرتا بلکہ انھیں مہذب بنا دیتا ہے۔ ایمان لوگوں کو جاہلی تعصب سے نکال کر وفا کا ایسا پیکر بنا دیتا ہے جو عملی صورت میں قانونِ الٰہی کی ہرگز مخالفت نہیں کرتا۔

ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ کا ایمان اتنا پختہ تھا کہ حوادثاتِ زمانہ اسے ہلا نہیں سکے اور جب انھوں نے اپنے باپ کو مقتولین کے درمیان پایا اور اسے بھی ان کے ساتھ گھسیٹ کر کنویں میں پھینکا جانے لگا تو باپ ہونے کے ناطے بشری احساسات جاگ اٹھے لیکن ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ کا ایمان بلند ترین پہاڑوں کی طرح مضبوط تھا۔ صرف اپنی توقع کے خلاف اپنے باپ کی کفر پر موت کا انھیں رنج ہوا۔ [2]

یہ عظیم مقصد جس کی بنا پر سیدنا ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ کے چہرے پر غم و حزن کے اثرات نمایاں ہونے لگے تھے انھیں ہلکا کرنے کے لیے نبی ﷺ نے ان کے حق میں دعائے خیر فرمائی۔ [3]

---

1 المستدرك للحاكم: 224/3. 2 محمد رسول الله ﷺ لصادق عرجون: 446/3. 3 التاريخ الإسلامي للحميدي: 174/4.

غزوۂ بدر کے شہداء

حارثہ بن سراقہ رضی اللہ عنہ کی شہادت: حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حارثہ رضی اللہ عنہ ابھی چھوٹی عمر کے تھے کہ بدر میں شہید ہو گئے۔ ان کی ماں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کرنے لگی: ''اے اللہ کے رسول! آپ بخوبی جانتے ہیں کہ حارثہ سے مجھے کتنا پیار تھا اگر وہ جنت میں ہے تو میں صبر کرتی ہوں اور ثواب کی امید رکھتی ہوں اور اگر وہ کسی اور جگہ ہے تو آپ دیکھیں کہ میں کیا کرتی ہوں؟'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «وَيْحَكِ! أَوَ هَبِلْتِ! أَوَجَنَّةٌ وَّاحِدَةٌ هِيَ؟ إِنَّهَا جِنَانٌ كَثِيرَةٌ، وَّ إِنَّهُ فِي جَنَّةِ الْفِرْدَوْسِ» ''اللہ تجھ پر رحم کرے! کیوں دیوانی ہوئی جارہی ہے؟ محض ایک جنت نہیں کئی جنتیں ہیں۔ اور تیرا بیٹا تو جنت الفردوس میں ہے۔''[1]

ایک روایت میں ہے: «يَا أُمَّ حَارِثَةَ! إِنَّهَا جِنَانٌ فِي الْجَنَّةِ، وَ إِنَّ ابْنَكَ أَصَابَ الْفِرْدَوْسَ الْأَعْلٰى» ''اے ام حارثہ! حقیقت یہ ہے کہ جنت میں بہت سے باغات ہیں اور تیرا بیٹا تو فردوسِ بریں میں ہے۔''[2]

عوف بن حارث رضی اللہ عنہ کی شہادت: ابن اسحاق بیان کرتے ہیں کہ مجھے عاصم بن عمرو بن قتادہ نے بیان کیا کہ عفراء کے بیٹے عوف بن حارث نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے کون سے عمل پر مسکراتا ہے؟'' تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «غَمْسَةُ يَدِهِ فِي الْعَدُوِّ حَاسِراً» ''جب بندہ بغیر زرہ پہنے دشمن سے ٹکرا جائے۔'' یہ سن کر عوف بن حارث رضی اللہ عنہ نے اپنی زرہ اتار پھینکی، اپنی تلوار پکڑی اور دشمن سے لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔[3]

معلوم ہوا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا آخرت سے کتنا گہرا تعلق اور اللہ کی رضا حاصل کرنے

---

1 صحيح البخاري، حديث:3982. 2 الأساس في السنة لسعيد حوّى:475/1. 3 صحيح السيرة النبوية لإبراهيم العلي، ص:245، والمصنف لابن أبي شيبة:338/5. روایت منکر ہے۔

کی کتنی تمنا تھی۔ یہی وجہ تھی کہ عوف بن حارث رضی اللہ عنہ زرہ کے بغیر تیر کی طرح دشمن کی صفوں میں گھس گئے اور لڑتے لڑتے دشمنوں کا خون بہاتے رہے، بالآخر اللہ تعالیٰ نے انھیں شہادت کے رتبے سے سرفراز فرمایا۔

اسلامی معاشرے نے لوگوں کے خیالات تبدیل کر دیے تھے اور انھیں آخرت سے منسلک کر دیا تھا۔ اب وہ صرف رضائے الٰہی کے طلبگار بن گئے تھے جبکہ اس سے قبل ان کی خواہش صرف یہی تھی کہ ان کی بہادری کے قصے عورتوں کی زبان پر ہوں، ان کے قبیلے کا سردار ان سے راضی ہو اور ان کی شجاعت و دلیری پر اشعار کہے جائیں۔[1]

سعد رضی اللہ عنہ کی بدر میں اور ان کے والد خیثمہ رضی اللہ عنہ کی احد میں شہادت: حافظ ابن حجر رحمہ اللہ موسیٰ بن عقبہ اور ابن شہاب رحمہما اللہ سے بیان فرماتے ہیں کہ بدر کے دن سعد رضی اللہ عنہ اور ان کے والد گرامی خیثمہ رضی اللہ عنہ نے بدر میں شریک ہونے کے لیے آپس میں قرعہ اندازی کی۔ قرعہ سعد کے نام نکلا۔ باپ نے کہا: ”اے میرے پیارے بیٹے! آج تو بدر میں شریک نہ ہو بلکہ میرے حق میں دستبردار ہو جا۔“ سعد رضی اللہ عنہ نے عرض کی: ”اے میرے اباجان! اگر جنت کے علاوہ کوئی اور معاملہ ہوتا تو میں ضرور آپ کو ترجیح دیتا۔“

حضرت سعد رضی اللہ عنہ بدر میں شریک ہوئے اور شہادت سے سرفراز ہوئے۔ اس کے بعد ان کے والد خیثمہ رضی اللہ عنہ غزوۂ احد میں شریک ہوئے اور جام شہادت نوش فرمایا۔[2]

یہ قصہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے گھریلو حالات کی روشن مثال پیش کرتا ہے کہ ان کے گھروں میں اللہ کے راستے میں جہاد کرنے کی کس قدر رغبت اور مسابقت پائی جاتی تھی۔ سعد بن خیثمہ رضی اللہ عنہما اور ان کے والد گرامی دونوں اکٹھے بدر میں شریک نہ ہو سکتے تھے کیونکہ دونوں میں سے ایک کا گھر کی دیکھ بھال کے لیے گھر رہنا ضروری تھا۔ کوئی بھی دوسرے کے حق میں دستبردار ہونے کے لیے تیار نہ ہوا۔ نوبت قرعہ اندازی تک جا پہنچی، بالآخر یہ

1 التربية القيادية للدكتور الغضبان: 31/2۔ 2 الإصابة: 24,23/2، رقم: 3118۔

سعادت بیٹے کے حصے میں آئی، حالانکہ وہ اپنے باپ کا غایت درجہ احترام کرتے تھے لیکن حصولِ جنت کے شوق نے انھیں یہ جواب دینے پر مجبور کر دیا: ''ابا جان! اگر جنت کے علاوہ کوئی اور معاملہ ہوتا تو میں ضرور آپ کو ترجیح دیتا۔''[1]

عمیر بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی شہادت: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مقام بدر کی طرف روانہ ہونے لگے تو اسلامی لشکر کے شرکاء آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کیے گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمیر بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو کم عمر ہونے کی بنا پر ساتھ لے جانے سے منع فرما دیا۔ حضرت عمیر رضی اللہ عنہ رونے لگے تو آپ نے اجازت مرحمت فرما دی اور اس کی تلوار کا پرتلا اپنے دست مبارک سے باندھا۔

عمیر رضی اللہ عنہ لشکر میں چھپنے کی کوشش کر رہے تھے مبادا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ ان پر نہ پڑ جائے۔ عمیر رضی اللہ عنہ کے بھائی سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے عمیر کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش ہونے سے پہلے چھپتے ہوئے دیکھا تو پوچھا: ''میرے بھائی! تمھیں کیا ہوا ہے؟'' تو اس نے کہا: ''میں اس بات سے ڈرتا ہوں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اگر مجھے دیکھ لیا تو مجھے کم عمر خیال کر کے واپس نہ لوٹا دیں، جبکہ میں اللہ کی راہ میں نکلنا چاہتا ہوں۔ ممکن ہے اللہ مجھے شہادت سے سرفراز فرما دے۔'' اور بالآخر عمیر رضی اللہ عنہ غزوۂ بدر میں شہید ہو گئے۔[2]

غنیمت اور قیدیوں کے بارے میں اختلاف

غنائم میں اختلاف اور سورۂ انفال کا نزول

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ چلے اور میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بدر میں شریک ہوا۔ مسلمانوں اور کفار کے مابین رزم آرائی

1 التاریخ الإسلامي للحمیدي: 87/4. 2 السیرة النبویة لأبي فارس، ص: 317، بحوالہ صفة الصفوة لابن الجوزي:294/1، والمستدرك للحاکم: 188/3، والإصابة:35/3.

ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے دشمن کو شکست سے دوچار کیا۔ لشکر کا ایک حصہ دشمن کو قتل کر کے شکست دینے میں مشغول تھا جبکہ ایک گروہ دشمن کے لشکریوں کو قابو میں لا کر قیدی بنا رہا تھا اور ایک جماعت رسول اللہ ﷺ کی نگرانی کر رہی تھی کہ کہیں دشمن اچانک آپ ﷺ کو نقصان نہ پہنچا دے۔ اسی اثنا میں رات چھا گئی اور تمام مسلمان شرکائے جنگ اکٹھے ہو گئے۔ ان میں سے غنیمتیں جمع کرنے والوں نے کہا: ''یہ ہم نے اکٹھی کی ہیں، لہٰذا ان پر ہمارے سوا کسی کا حق نہیں۔'' جو گروہ دشمن کی سرکوبی کرتے ہوئے اس کا پیچھا کر رہا تھا اس نے کہا: ''تم ہرگز ہم سے زیادہ حق دار نہیں ہو، ہم نے ہی تو دشمن کو غنیمت سے دور بھگایا اور اسے مات دی۔'' رسول اللہ ﷺ کی حفاظت پر مامور دستہ کہنے لگا: ''تم ہرگز ہم سے زیادہ حق نہیں رکھتے۔ آپ ﷺ کی حفاظت ہم نے کی اور ہم آپ ﷺ پر دشمن کے اچانک حملوں سے بچاؤ کے لیے حفاظت پر مامور تھے۔'' اس دوران قرآن پاک کی یہ آیت نازل ہوئی:

﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ ۭ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ ۠ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗٓ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝﴾

''(اے نبی!) وہ آپ سے مال غنیمت کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ کہہ دیجیے: مال غنیمت اللہ اور اس کے رسول کے لیے ہے، لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اور باہمی تعلقات درست کرو اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اگر تم مومن ہو۔''[1]

بعد ازاں آپ ﷺ نے غنیمتیں ہم میں برابر تقسیم فرما دیں۔[2]

ایک حدیث میں اس طرح ہے کہ جب حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے سورۂ انفال کے متعلق پوچھا گیا تو وہ کہنے لگے: ''یہ آیات ہمارے، یعنی اصحاب بدر کے متعلق ہی اتری تھیں۔ جب ہم نے غنیمتوں کے متعلق اختلاف کیا اور اس میں اخلاقی پستی کا مظاہرہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ غنیمتیں ہم سے لے کر رسول اللہ ﷺ کے اختیار میں دے دیں، تب

1 الأنفال 1:8. 2 مسند أحمد:324/5، و تفسير ابن كثير:283/2.

آپ ﷺ نے وہ غنیمتیں ہم میں برابر تقسیم فرما دیں۔ [1]

سورۂ انفال میں غزوۂ بدر کا تذکرہ فرما کر اللہ تعالیٰ نے اسے دوام بخش دیا ہے۔ اس سورت میں یہ واقعہ اسباب و نتائج کے ساتھ مکمل طور پر مذکور ہے۔ آیات مبارکہ نے نفسِ انسانی کا علاج، گہرے ایمان پر اس کی تربیت اور بڑے لطیف انداز سے اس کی کردار سازی فرمائی ہے۔ مال غنیمت کا پایا جانا چونکہ جنگ کا نتیجہ ہے، لہٰذا اس کے متعلق احکام سے کلام کا آغاز کیا اور واضح فرما دیا کہ یہ غنیمتیں اللہ تعالیٰ اور رسولِ مکرم ﷺ کے لیے ہیں۔ ہر چیز کا مالک اللہ تعالیٰ ہے اور رسول اللہ ﷺ اس کے حکم کے تابع ہیں۔

بعد ازاں اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو تین احکام صادر فرمائے:

① تقویٰ

② باہمی جھگڑوں کی اصلاح

③ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت

جہاد کے موضوع سے متعلق یہ تینوں اہم ترین احکام ہیں کیونکہ جہاد کی بنیاد اگر تقویٰ پر نہیں تو جہاد، جہاد ہی نہیں۔ اسی طرح جہاد اتحاد و یگانگت کا متقاضی ہے، لہٰذا آپس کے جھگڑوں اور اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں۔ اور اسی طرح احکام اور قوانین کی پابندی جہاد کی روح اور اساس ہے۔ اس کے بغیر جہاد کا وجود ناممکن ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے واضح فرما دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی اتباع ہی ایمان کی علامت ہے۔

سورۂ انفال کے تناظر میں مومنوں کی صفات: اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں مومنوں کی بنیادی صفات کا تذکرہ بھی فرمایا ہے اور مومنوں کی ان صفات کا تذکرہ اور ان کی حد بندی یہ دونوں اسلامی جہاد کے باب میں بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ دراصل حقیقی ایمان ہی وہ بنیاد ہے جس پر جہادِ اسلامی کی عمارت استوار ہو سکتی ہے۔

1 مسند أحمد: 322/5.

اللہ تعالیٰ نے مومنوں کی صفات کی حد بندی کرتے ہوئے فرمایا ہے:

① مومن وہ ہیں جن کے پاس اللہ تعالیٰ کا تذکرہ ہوتو ان کے دل سہم جاتے ہیں، خوف زدہ ہوتے ہیں اور ان پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔

② مومنوں کی دوسری صفت یہ ہے کہ جب کلام الٰہی کی تلاوت ہوتی ہے تو ان کے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے اور وہ بڑھتا چلا جاتا ہے۔

③ مومنوں کی تیسری صفت توکل بیان کی گئی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے امید نہیں لگاتے اور نہ ہی کسی کا قصد کرتے ہیں۔ اسی کی جناب میں پناہ ڈھونڈتے اور اسی سے اپنی ضروریات کا تقاضا کرتے ہیں۔ ان کی رغبت و چاہت بھی اسی سے ہے۔ وہ یہ بات خوب سمجھتے ہیں:

«مَاشَاءَ اللّٰهُ كَانَ وَ مَالَمْ يَشَأْ لَمْ يَكُنْ»

''جو اللہ تعالیٰ چاہے وہ ہوتا ہے اور جو نہ چاہے وہ ہرگز نہیں ہوتا۔''

اس کا حکم بلا شرکتِ غیرے مخلوق میں کارفرما ہے۔ اس کے فیصلے پر کوئی گرفت کرنے والا نہیں، وہ جلد حساب چکانے والا ہے۔

④ چوتھی صفت نماز قائم کرنا ہے۔ جو وقت کی پابندی کرتے ہوئے مکمل طہارت، وضو، تلاوت قرآن، رکوع و سجود، تشہد اور آپ ﷺ پر درود وسلام کے ساتھ ساتھ تمام امورِ نماز کو سنت کے عین مطابق ادا کرنے کا نام ہے۔

⑤ اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے رزق میں سے اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا تذکرہ بھی بطور صفت شامل ہے۔ اس میں زکاۃ کی ادائیگی اور بندوں کے تمام حقوق شامل ہیں، خواہ وہ مستحب ہوں یا واجب۔ ساری مخلوق خالق کی ہے، لہٰذا اس کے ہاں زیادہ پسندیدہ وہی ہے جو اس کی مخلوق کو سب سے زیادہ نفع پہنچائے۔

ان صفات کا تذکرہ کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان صفات کے حاملین کو حقیقی طور پر ایمان سے متصف قرار دیا ہے اور یہی ہیں جن کے لیے جنت میں اعلیٰ مقام اور درجات ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی نیکیوں کی قدر کرتا ہے اور کوتاہیوں سے صرفِ نظر فرماتا ہے۔

اس سورۂ مبارکہ نے اطاعت اور ایمان کامل کی اعلیٰ منازل تک رسائی کی دعوت دیتے ہوئے جہاد کے تمام لوازمات کو اختیار کرنے کے لیے ارادوں کو مہمیز لگائی ہے۔ اور غنیمتوں کے بارے میں اختلاف یا کسی بھی حکم کی ممانعت کے نتیجے میں حاصل ہونے والی رسوائی کے عوامل کی نفی کی ہے۔ اور اسی پر اس سورت کا مقدمہ اختتام پذیر ہوا ہے۔ [1]

ارشاد ربانی ہے:

﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ ؕ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ ۪ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗۤ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ○ الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ○ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ؕ لَهُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ○﴾

”(اے نبی!) وہ آپ سے مال غنیمت کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ کہہ دیجیے: مال غنیمت اللہ اور اس کے رسول کے لیے ہے، لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اور باہمی تعلقات درست کرو اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اگر تم مومن ہو، (سچے) مومن تو صرف وہ لوگ ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں اور جب ان پر اس کی آیتوں کی تلاوت کی جائے تو وہ ان کا ایمان بڑھا دیتی ہیں اور وہ اپنے رب ہی پر توکل کرتے ہیں، وہ لوگ جو نماز قائم کرتے

[1] الأساس في التفسير لسعيد حوّى: 4/2113، 2114.

ہیں اور ہم نے انھیں جو رزق دیا ہے اس میں سے وہ خرچ کرتے ہیں، یہی لوگ سچے مومن ہیں، ان کے لیے اپنے رب کے ہاں درجے ہیں اور بخشش ہے اور باعزت رزق ہے۔''[1]

سورۂ مبارکہ کے آغاز میں غنیمتوں کا تذکرہ، ان کی تقسیم میں باہمی اختلاف اور انھی کے بارے میں صحابہ کے سوال کا ذکر ہے۔ اس سیاق کی مسلسل چار آیات نے مومنوں کو اس اختلاف سے بھی پاک کر دیا ہے جو دولت کی محبت و چاہت اور دیگر مادی اشیا پر نظر رکھنے سے دل میں پیدا ہو جاتا ہے۔[2]

اہل ایمان کی زندگیوں میں باہمی اتفاق و اتحاد کی اہمیت کے پیش نظر اسی بات سے سورت کی ابتدا ہوئی ہے وگرنہ یہ مسئلہ بدر کی طرف نکلنے اور کفار سے قتال کے بعد پیش آیا تھا۔ قرآن مجید کا اسلوب یہ ہے کہ اس میں واقعات و حقائق کو بیان کرنے کے لیے ان کی زمانی ترتیب کو پیش نظر نہیں رکھا گیا بلکہ اہمیت اور ضرورت کے تحت ان میں تقدیم و تاخیر کی گئی ہے۔[3]

اور ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗٓ﴾ ''اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔'' اس موقع پر پہلی اطاعت تو یہی تھی کہ غنیمتوں کے معاملے میں اللہ کے فیصلے کے سامنے سر جھکایا جائے۔ اس فیصلے کی رو سے غنیمتیں مجاہدین کے قبضے سے باہر ہو گئیں۔ اور ان کی ملکیت ابتدائی طور پر اللہ اور پھر اس کے رسول کے لیے ثابت ہو گئی اور ان میں تصرف کا حق اللہ اور اس کے رسول کو حاصل ہو گیا۔ مومنوں کے ہاں اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں کہ وہ اللہ کے حکم اور رسول اکرم ﷺ کی تقسیم کو خوش دلی سے تسلیم کریں، باہمی تعلقات کی اصلاح کریں اور ایک دوسرے کے جذبات کا خیال رکھیں اور اپنے دلوں میں

---

1 الأنفال 8:1-4. 2 من هدي سورة الأنفال لمحمد أمين المصري، ص: 67. 3 من هدي سورة الأنفال لمحمد أمين المصري، ص: 68,67.

ایک دوسرے کا احترام اور مقام و مرتبہ بڑھائیں۔[1]

یہ اندازِ ربانی اس حقیقت کو واضح کر رہا ہے کہ مشرکوں پر فتح سے بھی اہم چیز آپس میں اختلافات اور جھگڑے ختم کرنا ہے۔ اسی طرح دل میں پیدا ہونے والے خیالات و رجحانات پر کنٹرول حاصل کرنا اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں گراں تر ہے۔ بے فائدہ ہے ایسی فتح جس کے نتیجے میں وحدت پارہ پارہ ہوجائے اور دل جدا جدا ہوجائیں۔ آیاتِ مبارکہ نے یہ بات واضح فرمادی ہے کہ ایمان و تقویٰ کو ایک مسلمان کی مکمل زندگی میں کارفرما رہنا چاہیے۔ یہیں سے زندگی کی شاہراہ پر کامیابی کی تحریکیں اٹھتی اور دین کی سربلندی کے لیے جہاد کی راہیں پھوٹتی ہیں۔[2]

صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اس ربانی نصیحت و رہنمائی پر لبیک کہا اور ساتھ ہی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو تقسیم غنیمت کا طریقہ کار بتادیا گیا۔ جب یہ طے پاچکا کہ غنائم اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حق ہیں تو ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے ان کی تقسیم کا طریقہ اور مدات واضح کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ اِنْ کُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا یَوْمَ الْفُرْقَانِ یَوْمَ الْتَقَی الْجَمْعٰنِ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝﴾

''اور (اے مسلمانو!) جان لو کہ تم جو کچھ بھی مال غنیمت حاصل کرو، اس میں سے پانچواں حصہ یقیناً اللہ کے لیے ہے اور رسول کے لیے اور (آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے) رشتے داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے۔ اگر تم اللہ پر ایمان لائے ہو اور اس پر جو ہم نے اپنے بندے پر فیصلے کے دن اتارا جس دن دو فوجوں میں ٹکراؤ ہوا تھا اور اللہ ہر چیز پر خوب قدرت رکھتا ہے۔''[3]

1 تفسیر في ظلال القرآن لسید قطب: 3/1473، 1474. 2 المنهج التربوي للسیرة النبویة للدکتور الغضبان: 1/52. 3 الأنفال 8:41.

یہ ربانی توجیہ تب نازل ہوئی جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دل علام الغیوب کی اطاعت و فرماں برداری قبول کر چکے تھے اور ان میں خالصتاً اللہ تعالیٰ کی عبودیت کا جذبہ بھر گیا تھا۔ غنیمتوں کے متعلق صاف صاف بتا دیا گیا کہ پانچ میں سے چار حصے تمھارے ہیں اور پانچواں حصہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کے لیے ہے۔ اور یہ پانچواں حصہ بھی بالآخر تمھیں لوٹا دیا جائے گا۔ اور آیت میں مذکورہ اقسام و اصناف میں اسے تقسیم کیا جائے گا، جیسا کہ اس کی مکمل تفصیل حدیث میں مذکور ہے۔

غنیمتوں کے متعلق سوال کے جواب کو فوراً نازل نہیں کیا گیا بلکہ اسے مؤخر کیا گیا۔ اس میں اس تربیتی پہلو کی طرف اشارہ ہے کہ شرعی احکام کے لیے پہلے مناسب روحی و قلبی فضا پیدا کرنا ضروری ہے تاکہ یہ احکام عقل و ضمیر میں مناسب مقام پا کر جاگزیں ہو سکیں اور ان کا عمدہ نتیجہ حاصل ہو۔

اللہ تعالیٰ نے اولاً مسلمانوں کی عبادت کو تعلق بالغیر سے پھیرا اور ثانیاً مال غنیمت کے ساتھ تعلق سے پھیرا تاکہ یہ لوگ مخلص بن کر اس کی مدد و حمایت اور مکمل نعمت کے حقدار بن جائیں، پھر جب وہ صرف اپنے خالق کے ہو گئے اور جہاد میں اخلاص سے کام لیا تو اس نے انھیں اپنی خاص مدد سے نوازا اور ان کی چاہت سے بڑھ کر ان پر اپنا فضل فرمایا۔[1]

رسول اللہ ﷺ کی دعا اور غنائم کی تقسیم

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما بیان فرماتے ہیں کہ بدر کے دن رسول اللہ ﷺ 315 رفقاء کے ہمراہ نکلے اور مقام بدر پر پہنچ کر آپ ﷺ نے دعا کی: «اَللّٰهُمَّ! إِنَّهُمْ حُفَاةٌ فَاحْمِلْهُمْ، اَللّٰهُمَّ! إِنَّهُمْ عُرَاةٌ فَاكْسُهُمْ اَللّٰهُمَّ! إِنَّهُمْ جِيَاعٌ فَأَشْبِعْهُمْ» ''اے میرے اللہ!

1 صور و عبر من الجهاد النبوي في المدينة للدكتور فوزي فيض الله، ص:62,61.

یہ ننگے پاؤں (پیادہ) ہیں تو انھیں سوار فرما، یہ ننگے جسم ہیں تو انھیں پہنا۔ یہ بھوکے ہیں تو انھیں سیر فرما۔" تو اللہ تعالیٰ نے بدر کے دن فتح عطا کی، لہٰذا جب لوٹے تو ہر کسی کے پاس ایک یا دو اونٹ تھے اور سب نے پہن لیا اور سیر ہو گئے۔"[1]

عدلِ رسول ﷺ کی ایک زندہ مثال یہ بھی ہے کہ آپ ﷺ نے غنیمتوں میں انھیں بھی شریک رکھا جنھیں آپ ﷺ نے جنگ کے علاوہ کوئی اہم کام سونپ رکھا تھا، لہٰذا انھیں غنیمت و اجر میں برابر شریک قرار دیا، گویا کہ وہ جنگ میں حاضر ہی تھے۔[2]

رسول اللہ ﷺ نے ان مجاہدین کی مجبوریوں کا مکمل خیال رکھا جو جنگ میں شرکت سے معذور تھے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انسانی طاقت سے بڑھ کر اپنے بندوں کو مکلّف ہی نہیں ٹھہرایا۔ ارشادِ ربانی ہے: ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾

"اللہ کسی کو اس کی طاقت سے بڑھ کر مکلّف نہیں ٹھہراتا۔"[3]

جنگ ہو یا امن رسول اللہ ﷺ صحابہ کرام کو ان کی استطاعت سے بڑھ کر کوئی حکم نہ دیتے۔ جنگ بدر کے موقع پر بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ناگزیر گھریلو مجبوریاں تھیں آپ ﷺ نے انھیں جنگ میں شرکت سے معذور قرار دیا۔ جیسا کہ حضرت عثمان کی زوجہ محترمہ حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا مریضہ تھیں۔ ان کی تیمار داری کے لیے آپ ﷺ نے انھیں رخصت مرحمت فرما دی۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت بیان کی ہے جس میں انھوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے غزوۂ بدر سے غیر حاضر رہنے کا سبب ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے عقد میں رسول گرامی ﷺ کی لختِ جگر تھیں جو اس موقع پر بیمار تھیں، لہٰذا آپ ﷺ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

«إِنَّ لَكَ أَجْرَ رَجُلٍ مِّمَّنْ شَهِدَ بَدْرًا وَّ سَهْمَهُ»

---

[1] سنن أبي داود، حديث: 2747. [2] من معين السيرة لصالح الشامي، ص: 215. [3] البقرة 2:286.

''تمھارے لیے بدر میں شریک ہونے والے کے برابر اجر اور غنیمت کا حصہ ہے۔''[1]

اسی طرح آپ ﷺ نے حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ کو اپنی والدہ کے پاس رہنے کی اجازت دی جو بیمار تھیں اور انھیں بیٹے کی طرف سے دیکھ بھال کی ضرورت تھی۔ ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کو بدر کی طرف نکلنے کی اطلاع دی تو خود ابوامامہ رضی اللہ عنہ نے بھی آپ ﷺ کے ساتھ نکلنے کا پورا عزم کیا۔ انھیں ان کے ماموں جان ابوبردہ بن نیار رضی اللہ عنہ نے کہا: ''میرے بھانجے! یہاں رہ کر اپنی والدہ کی خبر گیری کرو۔'' ابوامامہ نے کہا: ''بلکہ آپ اپنی بہن کا خیال رکھیں۔'' جب یہ معاملہ آپ ﷺ کے سامنے پیش کیا گیا تو آپ ﷺ نے ابوامامہ کو اپنی والدہ کے پاس رہنے کا حکم دیا۔ جب آپ ﷺ واپس تشریف لائے تو وہ فوت ہو چکی تھیں، چنانچہ آپ ﷺ نے ان کی نماز جنازہ ادا کی۔[2]

اخلاقِ عالیہ کا یہ مظاہرہ اور مجاہدین کے احساسات اور خاندانی معاملات کا خیال رکھنا لشکر اور سپہ سالار کے مابین تعلق کو مضبوط کر دیتا ہے اور ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھنے کا موقع فراہم کرتا ہے، جس کا آپ ﷺ نے مکمل پاس رکھا۔

علاوہ ازیں درج ذیل صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو خاص مجبوری، کسی اہم معاملے یا راستے میں پیش آمدہ مشکلات کے باعث واپس بھیج دیا گیا:

① ابولبابہ رضی اللہ عنہ: انھیں آپ ﷺ نے مدینہ منورہ پر اپنا نائب مقرر فرمایا تھا۔

② عاصم بن عدی رضی اللہ عنہ: مدینہ منورہ میں عوالی کے علاقے کے مسکینوں کی ضرورت کے پیش نظر انھیں رسول اللہ ﷺ نے ان کی طرف روانہ فرمایا۔

③ حارث بن حاطب رضی اللہ عنہ: کسی ضروری کام کے لیے بنوعمرو بن عوف کی طرف بھیجا۔

④ حارث بن صمّہ رضی اللہ عنہ: راستے میں گرنے کی وجہ سے ہڈی ٹوٹ گئی، لہٰذا انھیں واپس بھیج دیا گیا۔

[1] صحیح البخاري، حدیث: 3699. [2] المعجم الکبیر للطبراني: 273,272/1، حدیث: 792، و مجمع الزوائد: 32,31/3.

⑤ خوّات بن جبیر رضی اللہ عنہ: دوران سفران کی پنڈلی پر پتھر لگنے سے زخم آ گیا تو آپ ﷺ نے صفراء کے مقام سے انھیں واپس بھیج دیا۔[1]

اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے شہداء کے ورثا اور اقارب کو غنیمت میں سے حصہ دیا، گویا تقریباً 1400 سال سے شہداء کی عزت افزائی، ان کی اولاد اور خاندانوں کی نگرانی اور حفاظت صرف اسلام کا طرۂ امتیاز ہے۔[2]

غزوۂ بدر کے قیدی

قیدیوں کے بارے میں مشورہ اور حکمِ الٰہی: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما ذکر کرتے ہیں کہ جب قیدی قید کر لیے گئے تو آپ ﷺ نے ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما سے دریافت فرمایا:

«مَا تَرَوْنَ فِي هٰؤُلَاءِ الْأُسَارىٰ؟»

''ان قیدیوں کے متعلق تمھاری کیا رائے ہے؟''

ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ''اے اللہ کے نبی! یہ برادری کے لوگ اور خاندان والے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان سے فدیہ لے کر انھیں رہا کر دیں جس سے ہمیں کافروں پر قوت حاصل ہو۔ شاید انھیں اللہ تعالیٰ اسلام کی ہدایت بھی دے دے۔'' اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا:

«مَا تَرٰى يَا ابْنَ الْخَطَّابِ؟!»

''ابن خطاب! تمھاری کیا رائے ہے؟''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ''میں نے عرض کیا: ''نہیں، اللہ کی قسم! میری وہ رائے نہیں جو ابوبکر کی ہے۔ میری رائے یہ ہے کہ آپ انھیں ہمارے حوالے کر دیں ہم ان کی گردنیں مار دیں۔ عقیل کو حضرت علی کے حوالے کیجیے وہ اس کی گردن ماریں اور میرا فلاں عزیز مجھے

[1] من معين السيرة لصالح الشامي، ص: 215. [2] السيرة النبوية لأبي شهبة: 176/2.

دیجیے۔ میں اسے قتل کروں۔ یہ کفر کے سرغنے اور سردار ہیں۔" لیکن آپ ﷺ ابوبکر رضی اللہ عنہ کی رائے کی طرف مائل ہوگئے اور میری رائے پسند نہ فرمائی۔"

دوسرے دن میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا کہ آپ ﷺ اور ابوبکر دونوں بیٹھے رو رہے تھے۔ میں نے عرض کیا: "اے اللہ کے رسول! آپ ﷺ اور آپ کے دوست کس بنا پر رو رہے ہیں؟ آپ دونوں کے رونے کی وجہ سے اگر مجھے بھی رونا آئے گا تو رولوں گا، ورنہ کم از کم رونے جیسی صورت تو بنالوں گا۔" آپ ﷺ نے فرمایا:

«أَبْكِي لِلَّذِي عَرَضَ عَلَيَّ أَصْحَابُكَ مِنْ أَخْذِهِمُ الْفِدَاءَ، لَقَدْ عُرِضَ عَلَيَّ عَذَابُهُمْ أَدْنٰى مِنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ»

"میں اس واقعے پر رو رہا ہوں جو تمھارے ساتھیوں کے مشورے پر قیدیوں کا فدیہ لینے کی وجہ سے پیش آیا۔ (آپ ﷺ نے ایک قریبی درخت کی طرف اشارہ کر کے فرمایا:) میرے سامنے ان کا عذاب اس درخت سے بھی زیادہ نزدیک لایا گیا۔"

پھر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری:

﴿مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗٓ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ ۭ تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا ڰ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ○ لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَآ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ○ فَكُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَيِّبًا ڮ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○﴾

"کسی نبی کے لائق نہیں کہ اس کے پاس قیدی ہوں یہاں تک کہ وہ زمین میں خوب خون ریزی (انھیں قتل) کرے۔ (مسلمانو!) تم سامان دنیا چاہتے ہو اور اللہ (تمھاری) آخرت چاہتا ہے اور اللہ زبردست، خوب حکمت والا ہے۔ اگر اللہ کی طرف سے پہلے ہی (ایک بات) لکھی ہوئی نہ ہوتی تو تم نے (بدر کے قیدیوں سے) جو (فدیہ) لیا اس کے بدلے تمھیں بڑا عذاب آ پکڑتا، پھر جو حلال، پاکیزہ

غنیمت تم نے حاصل کی ہے اس میں سے کھاؤ اور اللہ سے ڈرتے رہو، بے شک اللہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔'' [1]

لہٰذا اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے غنیمت حلال کر دی۔ [2]

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ بدر کے دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیدیوں کے متعلق دریافت فرمایا تو ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! آپ ہی کی قوم اور آپ ہی کے اہل ہیں۔ ان کو باقی رکھیے اور مہلت دیجیے، کیا عجب اللہ تعالیٰ ان کی توبہ قبول کر لے!'' اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس موقع پر عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! انھوں نے آپ کو نکال باہر کیا اور آپ کی تکذیب کی۔ ان کی گردنیں اڑا دیجیے۔'' حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کہنے لگے: ''اے اللہ کے رسول! وافر ایندھن والی وادی دیکھیے پھر انھیں اس میں داخل کر کے آگ لگا دیجیے۔'' عباس رضی اللہ عنہ نے کہا: ''آپ نے تو قطع رحمی والی بات کی ہے!'' اس دوران رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے گئے اور انھیں کوئی جواب نہ دیا۔ کچھ لوگ کہنے لگے: ''آپ صلی اللہ علیہ وسلم ابوبکر کی رائے اختیار فرمائیں گے۔'' کچھ نے کہا: ''عمر رضی اللہ عنہ کی رائے لیں گے۔'' کسی نے کہا: ''عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کی بات مانیں گے۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لائے اور فرمایا:

«إِنَّ اللّٰهَ لَيُلَيِّنُ قُلُوبَ رِجَالٍ فِيهِ حَتّٰى تَكُونَ أَلْيَنَ مِنَ اللَّبَنِ، وَ إِنَّ اللّٰهَ لَيَشُدُّ قُلُوبَ رِجَالٍ فِيهِ حَتّٰى تَكُونَ أَشَدَّ مِنَ الْحِجَارَةِ، وَ إِنَّ مَثَلَكَ يَا أَبَا بَكْرٍ، كَمَثَلِ إِبْرَاهِيمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ، إِذْ قَالَ: ﴿فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ ۚ وَمَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ وَمَثَلَكَ يَا أَبَا بَكْرٍ كَمَثَلِ عِيسٰى عَلَيْهِ السَّلَامُ، إِذْ قَالَ: ﴿اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ﴾ وَإِنَّ مَثَلَكَ يَا عُمَرُ كَمَثَلِ نُوحٍ عَلَيْهِ

1 الأنفال8:67-69. 2 صحيح مسلم، حديث:1763، و سنن أبي داود، حديث:2690.

السَّلَامُ، إِذْ قَالَ: ﴿رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا ۝﴾ وَإِنَّ مَثَلَكَ يَا عُمَرُ! كَمَثَلِ مُوسٰى عَلَيْهِ السَّلَامُ، إِذْ قَالَ: ﴿رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰٓى اَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْا حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ۝﴾

''اللہ تعالیٰ بعض لوگوں کے دلوں کو اتنا نرم کر دیتا ہے حتی کہ وہ دودھ سے بھی زیادہ نرم ہو جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ بعض کے دلوں کو اتنا سخت کر دیتا ہے یہاں تک کہ وہ پتھر سے بھی زیادہ سخت ہو جاتے ہیں۔ ابوبکر! تمھاری مثال ابراہیم علیہ السلام کی سی ہے۔ انھوں نے کہا تھا: ''پس جو کوئی میری پیروی کرے تو تحقیق وہ مجھ سے ہے اور جس نے میری نافرمانی کی تو تو بخشنے والا مہربان ہے۔''[1] اور تمھاری مثال اے ابوبکر! عیسیٰ علیہ السلام جیسی ہے، جب انھوں نے کہا تھا: ''اگر تو انھیں عذاب دے تو وہ تیرے بندے ہیں اور اگر تو ان کو بخش دے تو یقیناً تُو غالب، حکمت والا ہے۔''[2] اور تمھاری مثال اے عمر! نوح علیہ السلام جیسی ہے۔ انھوں نے کہا تھا: ''اے میرے رب! زمین پر بسنے والا کافروں میں سے کوئی نہ چھوڑ۔''[3] اور تمھاری مثال اے عمر! حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سی ہے جب انھوں نے کہا: ''اے ہمارے رب! مٹا دے ان کے مال اور ان کے دلوں کو سخت کر دے پس اس وقت تک ایمان نہ لائیں جب تک تکلیف دینے والا عذاب نہ دیکھیں۔''[4]

پھر فرمایا: «أَنْتُمْ عَالَةٌ، فَلَا يَنْفَلِتَنَّ مِنْهُمْ أَحَدٌ إِلَّا بِفِدَاءٍ، أَوْ ضَرْبَةِ عُنُقٍ»
''تم اس وقت کنگال ہو، تمھیں ضرورت ہے، لہٰذا ان میں سے کوئی بھی ہرگز بلا فدیہ رہا نہ ہو یا پھر اس کی گردن ماری جائے۔''

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: ''یا رسول اللہ! سہیل بن

[1] إبراهيم 36:14. [2] المآئدة 118:5. [3] نوح 26:71. [4] يونس 88:10.

بیضاء کو اس سے مستثنیٰ کرلیا جائے۔ میں نے اسے اسلام کا تذکرہ کرتے سنا ہے۔'' (یہ سن کر) آپ ﷺ خاموش ہوگئے۔ ابن مسعود کہتے ہیں: ''اس دن سے زیادہ مجھے اپنے اوپر آسمان سے پتھر گرائے جانے کا کبھی ڈر نہیں لگا۔'' یہاں تک کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ٹھیک ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمادی:

﴿مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗٓ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ ۭ تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا ڰ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ﴾

''کسی نبی کے لائق نہیں کہ اس کے پاس قیدی ہوں یہاں تک کہ وہ زمین میں خوب خون ریزی (انھیں قتل) کرے۔ (مسلمانو!) تم سامان دنیا چاہتے ہو اور اللہ (تمھاری) آخرت چاہتا ہے اور اللہ زبردست، خوب حکمت والا ہے۔'' [1]

یہ آیت مبارکہ حکومت سازی کا ایک اہم ترین قاعدہ فراہم کررہی ہے۔ جب حکومت ابھی ابتدائی اور اساسی مراحل میں ہو اور وہ خواہ کتنی ضرورت مند کیوں نہ ہو اسے ایسا نرم پہلو نہیں رکھنا چاہیے کہ دشمن اسے مرعوب کرسکیں۔ اس آیت میں اس قاعدہ کلیہ کی جزئیات تک بیان کردی گئی ہیں۔ [2]

جب صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے مشرکین کو قیدی بنانا شروع کیا تو حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کو یہ بات ناگوار گزری۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کے چہرے پر ناگواری کے اثرات دیکھے تو فرمایا: «وَاللّٰهِ! لَكَأَنَّكَ يَا سَعْدُ! تَكْرَهُ مَا يَصْنَعُ الْقَوْمُ؟»

''اے سعد! لوگوں کا یہ عمل شاید تمھیں اچھا محسوس نہیں ہورہا؟''

عرض کیا: ''اللہ کی قسم! ایسا ہی ہے۔ اے اللہ کے رسول! اہل شرک پر (غلبے کا) اللہ تعالیٰ نے پہلا موقع عطا کیا ہے، لہٰذا میرے نزدیک مشرکین کو زندہ رکھنے کے

1 الأنفال 8:67. مسند أحمد: 1/384,383، و تفسير ابن كثير: 2/325، و جامع الترمذي، حديث: 1714 و 3084. اس حدیث کی سند ضعیف ہے۔ 2 من معين السيرة لصالح الشامي، ص: 209.

بجائے انھیں قتل کرنا زیادہ پسندیدہ ہے۔'' [1]

مطعم بن عدی کی پناہ کی پاسداری: رسول اللہ ﷺ نے اسیرانِ بدر کے متعلق فرمایا:

«لَوْ كَانَ مُطْعِمُ بْنُ عَدِيٍّ حَيًّا، ثُمَّ كَلَّمَنِي فِي هٰؤُلَاءِ النَّتْنٰى لَأَطْلَقْتُهُمْ لَهُ»

''اگر مطعم بن عدی زندہ ہوتا اور ان بدبودار لوگوں کی رہائی کے لیے مجھ سے سفارش کرتا تو میں اس کی خاطر انھیں چھوڑ دیتا۔'' [2]

یہ حدیث احسان کے اعتراف اور وفاداری کی اعلیٰ مثال پیش کرتی ہے۔ مطعم بن عدی وہ شخص تھا جس نے کئی ایک موقعوں پر قابل تحسین موقف اپنایا تھا۔ طائف سے واپسی پر آپ ﷺ اسی کی پناہ میں مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے۔ بنو ہاشم اور مسلمانوں کے خلاف قریش نے جو معاہدہ کیا تھا اسے توڑنے کے لیے بھی اس نے سخت موقف اختیار کیا تھا۔ [3]

ایسے معاملات لوگوں کے ساتھ وفا کی اعلیٰ مثال قائم کرنے پر دلالت کرتے ہیں، خواہ وہ مشرک ہی کیوں نہ ہوں۔ [4]

عقبہ بن ابی معیط اور نضر بن حارث کا قتل

جہاں مطعم بن عدی جیسے شخص کے ساتھ وفا کا یہ انداز اپنایا گیا وہاں عقبہ اور نضر جیسے فتنہ پردازوں اور جنگی مجرموں سے احتیاط بھی از حد لازمی تھی۔ یہ دونوں اسلام کے خلاف جنگ کی آگ بھڑکانے والوں اور مسلمانوں پر مصائب و آلام کے پہاڑ توڑنے والے

1 السيرة النبوية لابن هشام:281,280/2، و المنهج التربوي للسيرة النبوية للدكتور الغضبان: 141/1. 2 صحيح البخاري، حديث:4024، و سنن أبي داود، حديث:2689. 3 من معين السيرة لصالح الشامي، ص:208. 4 التربية القيادية للدكتور الغضبان:54/3.

سرغنوں میں سے تھے۔ ان دونوں کا باقی رہنا اسلام کے خلاف ریشہ دوانیوں کو جاری رہنے دینے کے مترادف تھا۔ خاص طور پر ان حالات میں جب اسلامی دعوت پُرخطر حالات سے گزر رہی تھی، اگر ان دونوں کو آزاد چھوڑ دیا جاتا تو یہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف مکارانہ رویہ اختیار کرنے سے بالکل گریز نہ کرتے۔ دعوت اسلام ان ایام میں جس انداز سے جاری وساری تھی مصلحت کا تقاضا تھا کہ انھیں راستے سے دور ہٹا دیا جائے۔[1]

عقبہ بن ابی معیط نے اپنے متعلق قتل کا فیصلہ سنا تو کہنے لگا: ''میرے لیے تباہی ہو، اے گروہ قریش! ان موجود لوگوں میں سے مجھے ہی کیوں قتل کیا جا رہا ہے؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: «لِعَدَاوَتِكَ لِلّٰهِ وَلِرَسُولِهِ» ''اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ سے تیری عداوت اور دشمنی کی بنا پر۔'' اس نے کہا: ''مجھ پر آپ کا احسان بہتر ہوگا۔ مجھے بھی میری قوم کا ایک فرد سمجھیے۔ اگر ان کو قتل کریں تو مجھے بھی قتل کر دینا اور اگر ان پر احسان کریں تو مجھ پر بھی احسان کر دینا۔ اگر ان سے فدیہ قبول کریں تو مجھے بھی ان جیسا شمار کریں۔ اے محمد ﷺ! میرے بچوں کے لیے کون ہوگا؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: «اَلنَّارُ، قَدِّمْهُ يَاعَاصِمُ! فَاضْرِبْ عُنُقَهُ» ''آگ ہوگی، عاصم! اسے آگے کرو اور اس کی گردن مار دو۔''[2]

عاصم رضی اللہ عنہ نے اسے آگے کیا اور اس کی گردن اڑا دی۔[3]

نضر بن حارث قریش کے سرکشوں اور شیاطین میں سے تھا۔ رسول اللہ ﷺ کو رنج پہنچانا اور علمِ عداوت بلند رکھنا اس کا شیوہ تھا۔ یہ حیرہ کے علاقے میں سے ایرانی حکمرانوں کے قصے اور رستم واسفند یار کی کہانیاں یاد کر آیا، لہٰذا جس جگہ بھی آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کی یاد دلانے کی مجلس کا اہتمام فرماتے اور اپنی قوم کو سابقہ امم پر اللہ تعالیٰ کے غضب کی بنا پر عذاب سے ڈراتے تو جب آپ ﷺ وہاں سے تشریف لے جاتے یہ اسی جگہ پہنچ جاتا اور

---

[1] غزوۃ بدر الکبریٰ لأحمد باشمیل، ص: 162. [2] مجمع الزوائد: 89/6، والمستدرك للحاكم: 124/2. [3] التربیة القیادیة للدکتور الغضبان: 60/3.

کہتا: ''اے قریشیو! اللہ کی قسم! میں اس شخص سے بہتر بات کرسکتا ہوں۔ میرے قریب آؤ میں اس سے اچھی بات سناتا ہوں۔'' اور پھر ایرانی حکمرانوں رستم و اسفندیار کے بارے میں باتیں شروع کردیتا۔ بعدازاں کہتا: ''محمد (ﷺ) کی باتیں میری باتوں سے بھلا کس بنا پر اچھی ہوسکتی ہیں؟'' [1]

یہ اللہ تعالیٰ پر غرور و تکبر کرنے والا شخص، اللہ تعالیٰ کے متعلق قسمیں اٹھانے والا، جس کا گمان یہاں تک پہنچا ہوا تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کتاب سے بہتر لائے گا۔ اس کے جی کا خیال تھا کہ اس کا کلام محمد (ﷺ) کے کلام سے بہتر ہے۔ جو شخص اس طرح کے خیالات و نظریات کا حامل ہو اور اب رسول اللہ ﷺ کے سامنے موجود ہو، اس سے بدلہ لینا رسول اللہ ﷺ کے لیے ضروری ٹھہرتا ہے۔ اس بنا پر آپ ﷺ نے اسے ان قیدیوں میں شمار نہیں فرمایا جن کے بارے میں مشورہ ہو رہا تھا۔ [2]

آپ ﷺ نے اس کے قتل کا حکم جاری فرمایا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اسے قتل کردیا۔ [3]

ان دونوں مجرموں کے قتل سے مسلمان یہ بات اچھی طرح سمجھ گئے کہ ایسے سرکشوں کے ساتھ نرمی کا کوئی جواز نہیں۔ یہ شر کے محافظ اور گمراہی کے سرغنے ہیں۔ ان کے ساتھ شفقت اور نرمی کا کوئی پہلو روا نہیں۔ یہ اپنی بے ہودہ سرگرمیوں کی وجہ سے معافی اور درگزر کی تمام حدود پار کرچکے ہیں۔ یہ دونوں ساری مخلوق میں سب سے زیادہ بدطینت، کفر و عناد اور بغاوت میں حد سے بڑھے ہوئے اور اسلام اور مسلمانوں کی ہجو اور مذمت میں پیش پیش تھے۔ [4]

قیدیوں سے حسنِ سلوک کی وصیت اور فدیہ

قیدیوں کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کا سلوک رحمت، عدل، احتیاط اور دعوتی مقاصد کے

1 السيرة النبوية لابن هشام:440,439/1. 2 التربية القيادية للدكتور الغضبان:57/3. 3 السيرة النبوية لابن هشام:255/2. 4 البداية والنهاية:306/3.

مرہون منت تھا۔ اسی بنا پر آپ ﷺ نے اس بارے میں مختلف انداز اختیار فرمائے۔ کچھ کو قتل کیا، کچھ سے فدیہ قبول کیا۔ کسی کو احسان کا مستحق گردانا اور بعض قیدیوں پر احسان کرتے ہوئے مسلمانوں کے دس، دس بچوں کو تعلیم دینے کی شرط عائد فرمائی۔ [1]

رسول اللہ ﷺ جب بدر سے مدینہ منورہ واپس پہنچ گئے تو آپ ﷺ نے قیدیوں کو صحابہ کرام میں تقسیم کردیا اور ساتھ ہی فرمایا: «اِسْتَوْصُوا بِهِمْ خَيْرًا» ''ان کے متعلق بھلائی کی وصیت قبول کرو!'' [2]

یہ نبوی نصیحت قرآن کے ان الفاظ کی عکاسی کرتی ہے:

﴿وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا﴾

''اور وہ کھانا، اس کی محبت کے باوجود، مسکینوں اور یتیموں اور قیدیوں کو کھلاتے ہیں۔'' [3]

مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کے بھائی ابوعزیز بن عمیر رضی اللہ عنہ اپنا آنکھوں دیکھا حال بیان کرتے ہیں: ''میں بدر کے قیدیوں میں سے تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: «اِسْتَوْصُوا بِالْأُسَارٰى خَيْرًا» ''قیدیوں کے ساتھ بھلائی اختیار کرنے کے بارے میں میری وصیت قبول کرو۔'' میں انصار کے ایک گروہ کی قید میں تھا، وہ جب صبح و شام کھانا پیش کرتے تو خود کھجور کھاتے مگر مجھے گندم (کی روٹی) دیتے کیونکہ قیدیوں کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے وصیت فرمائی تھی۔'' [4]

ایک اور قیدی ابوالعاص بن ربیع بیان کرتے ہیں: ''میں انصار کے ایک گروہ میں تھا، اللہ تعالیٰ انھیں بہتر بدلہ عطا فرمائے۔ صبح یا شام جب بھی کھانا کھاتے وہ مجھے روٹی دیتے خود کھجور کھاتے جبکہ روٹی بہت کم پائی جاتی تھی اور مدینہ میں عموماً کھجور ہی میسر ہوتی تھی۔

1 التربية القيادية للدكتور الغضبان:3/74. 2 البداية والنهاية:3/307. 3 الدهر76:8. 4 المعجم الصغير للطبراني، حديث:401، والمعجم الكبير للطبراني:22/393، و تاريخ الطبري:2/460، و مجمع الزوائد:6/86.

بلکہ کبھی کبھار ایسا بھی ہوا کہ کسی کے حصے میں روٹی کا ٹکڑا آ گیا تو اس نے وہ بھی مجھے عطا کر دیا۔

ولید بن ولید بن مغیرہ بھی بدر کے قیدیوں میں سے تھے۔ ان کا بیان بھی اس سے ملتا جلتا ہے۔ مزید ان کا کہنا ہے کہ جن کے پاس ہمیں بطور قیدی رکھا گیا تھا وہ خود پیدل چلتے اور ہمیں سواری کی سہولت فراہم کرتے۔[1]

یہ کریمانہ خلق تھا جس کی بنیاد قرآن نے مسلمانوں کی تعریف کرتے ہوئے رکھی اور آپ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اسی کی تذکیر کی اور انھوں نے اسی خلق کو اپنا لیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ قیدی سرداروں کی اکثریت بہت جلد حلقہ بگوشِ اسلام ہوگئی، مثلاً: ابوعزیز بن عمیر رضی اللہ عنہ قیدیوں کے بارے میں آپ ﷺ کی وصیت کا نفاذ دیکھ کر قیدیوں کے مدینہ منورہ پہنچنے کے کچھ عرصہ بعد ہی اسلام کی دولت سے مالا مال ہوگئے اور ان کے ساتھ ہی سائب بن عبید رضی اللہ عنہ اپنا فدیہ دینے کے بعد مسلمان ہوگئے۔[2]

جب قیدی اپنے اپنے شہروں اور گھروں کو واپس آئے تو اسلام کی دعوت ان کے قلوب میں سرایت اور اذہان پر اثر انداز ہو چکی تھی، لہٰذا رسول اللہ ﷺ کی اعلیٰ سیرت، بلند اخلاق، محبت اور کرم نوازی کا تذکرہ اور آپ ﷺ کی دعوت اور اس میں پائی جانے والی صفات، مثلاً: نیکی، تقویٰ، اصلاحِ عامہ اور بھلائی ان سب کے ذکر سے وہ رطب اللسان رہنے لگے۔[3]

قیدیوں کے ساتھ یہ مشفقانہ سلوک اسلام کی اخلاقی برتری کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اسلام کے دشمن بھی صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے عمدہ سلوک سے کیسے متاثر ہوئے۔ یہ سلوک پیار و محبت کا بہترین عکس تھا۔[4]

[1] المغازي للواقدي: 119/1. [2] محمد رسول اللهﷺ لصادق عرجون: 474/3. [3] محمد رسول اللهﷺ لصادق عرجون: 474/3. [4] التاريخ الإسلامي للحميدي: 176,175/4.

رسول اللہ ﷺ کے چچا عباس رضی اللہ عنہ کا فدیہ

قریش نے اپنے قیدیوں کا فدیہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں روانہ کیا۔ ہر کسی کا فدیہ اس کی قوم کی رضامندی کے مطابق تھا۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے کہا: ''اے اللہ کے رسول! میں تو پہلے ہی مسلمان تھا۔'' آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: «اَللّٰهُ أَعْلَمُ بِإِسْلَامِكَ، فَإِنْ يَكُنْ كَمَا تَقُولُ، فَإِنَّ اللّٰهَ يُجْزِيكَ، وَ أَمَّا ظَاهِرُكَ فَقَدْ كَانَ عَلَيْنَا، فَافْتَدِ نَفْسَكَ وَابْنَيْ أَخَوَيْكَ» ''اللہ تعالیٰ آپ کے اسلام کو خوب جانتا ہے۔ اگر بات ایسے ہی ہے جیسا کہ آپ کہہ رہے ہیں تو اللہ تعالیٰ آپ کو اس کا بدل عطا فرمائے گا۔ رہا آپ کا ظاہر (جس کے مطابق ہمیں فیصلہ کرنا تھا) تو وہ ہمارے خلاف تھا، لہٰذا اپنا اور اپنے دونوں بھتیجوں (نوفل بن حارث اور عقیل بن ابی طالب اور اپنے حلیف عتبہ بن عمرو) کا بھی فدیہ ادا کرو۔'' حضرت عباس رضی اللہ عنہ عرض پرداز ہوئے: ''اے اللہ کے رسول! مال تو میرے پاس نہیں ہے۔'' آپ ﷺ نے فرمایا:

«فَأَيْنَ الْمَالُ الَّذِي دَفَنْتَهُ أَنْتَ وَأُمُّ الْفَضْلِ، فَقُلْتَ لَهَا: إِنْ أُصِبْتُ فِي سَفَرِي هٰذَا فَهٰذَا الْمَالُ الَّذِي دَفَنْتُهُ لِبَنِيَّ الْفَضْلِ وَ عَبْدِ اللّٰهِ وَ قُثَمَ؟»

''جو مال آپ نے ام فضل کے ساتھ مل کر دفن کیا تھا وہ کہاں ہے؟ جسے زمین میں چھپانے کے بعد آپ نے کہا تھا: ''اگر میں اس سفر میں کام آ وں تو یہ مال فضل، عبداللہ اور قثم کا ہے؟'' عباس رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ''اللہ کی قسم، اے اللہ کے رسول! میں خوب جانتا ہوں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں کیونکہ اس دفینے کا میرے اور ام فضل کے سوا کسی کو علم نہ تھا۔ میرے پاس جو مال تھا وہ آپ کو مل چکا ہے، اس میں سے 20 اوقیے شمار کر کے رکھ لیجیے!'' آپ ﷺ نے فرمایا: «ذَاكَ شَيْءٌ أَعْطَانَاهُ اللّٰهُ تَعَالٰى مِنْكَ» ''یہ تو وہ مال ہے جو اللہ تعالیٰ نے تمھاری طرف سے ہمیں دیا ہے۔'' پھر عباس رضی اللہ عنہ نے اپنا، دونوں

بھتیجوں اور حلیف کا فدیہ ادا کیا۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیات اتاریں:

﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُل لِّمَن فِي أَيْدِيكُم مِّنَ الْأَسْرَىٰ إِن يَعْلَمِ اللَّهُ فِي قُلُوبِكُمْ خَيْرًا يُؤْتِكُمْ خَيْرًا مِّمَّا أُخِذَ مِنكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۗ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ○ وَإِن يُرِيدُوا خِيَانَتَكَ فَقَدْ خَانُوا اللَّهَ مِن قَبْلُ فَأَمْكَنَ مِنْهُمْ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ○﴾

''اے نبی! جو قیدی تمھارے ہاتھوں گرفتار ہیں، آپ ان سے کہہ دیں: اگر اللہ تمھارے دلوں میں بھلائی جان لے گا تو تمھیں اس (فدیے) سے کہیں بہتر عطا کرے گا جو تم سے لیا گیا ہے اور تمھیں بخش دے گا اور اللہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے اور (اے نبی!) اگر وہ آپ سے خیانت (دغا) کرنا چاہیں تو وہ پہلے ہی اللہ سے خیانت کر چکے ہیں، پھر اس نے انھیں تمھارے قبضے میں دے دیا اور اللہ خوب جاننے والا، خوب حکمت والا ہے۔''[1]

حضرت عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ''پھر اللہ تعالیٰ نے اسلام میں مجھے بیس اوقیہ کی جگہ بیس غلام عطا کر دیے۔ ہر غلام کے پاس اتنا مال تھا کہ وہ اس سے تجارت کرتا تھا۔ مزید یہ کہ میں اللہ عزوجل سے بخشش کی امید بھی رکھتا ہوں۔''[2]

یہ آیات کریمہ اگرچہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے متعلق اتری تھیں لیکن «اَلْعِبْرَةُ بِعُمُومِ اللَّفْظِ لَا بِخُصُوصِ السَّبَبِ» ''قرآن مجید کے الفاظ کا اعتبار ہوتا ہے نہ کہ کسی خاص سبب نزول کا۔'' اس قاعدے کے تحت لفظ کے عمومی مفہوم کے اعتبار سے یہ حکم تمام قیدیوں سے متعلق تھا۔

بعض انصار نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت طلب کی کہ ہمیں اپنے بھانجے (آپ صلی اللہ علیہ وسلم

---

1 الأنفال 8:70، 71. 2 دلائل النبوة للبيهقي: 3/142، 143. اس سے ملتی جلتی روایت امام احمد رحمہ اللہ نے بھی ذکر کی ہے، دیکھیے: مسند أحمد: 1/353، اس حدیث کی شرح فتح الباري، شرح الحديث: 4018 میں ملاحظہ کیجیے۔

کے چچا) عباس رضی اللہ عنہ کا فدیہ چھوڑنے کی اجازت دیجیے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «وَاللّٰهِ! لَاتَذَرُونَ مِنْهُ دِرْهَمًا» ''اللہ کی قسم! عباس کے فدیے سے ایک درہم بھی نہ چھوڑنا۔''[1]

انصار کے ہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ادب اور مقام کا اندازہ اس بات سے بخوبی ہو رہا ہے کہ انھوں نے کہا: ''ہمارا بھانجا'' نہ کہ یہ کہا: ''آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا'' تاکہ فدیہ لیے بغیر چھوڑنا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بجائے ان (انصار) پر احسان خیال کیا جائے۔ اگر وہ کہتے: ''آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا'' تو گویا آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر احسان ظاہر ہوتا۔ حسنِ ادب اور عقل مندی کا یہ کیسا عمدہ نمونہ ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا یہ مطالبہ قبول نہ فرمایا تھا کہ دین میں کسی اور نوعیت کے انداز محبت کی مثال قائم نہ ہو۔[2]

یہاں قیدیوں کے لیے اور ان کے ساتھ مسلمانوں کے لیے ایک جامع پیغام بھی قابل ذکر ہے کہ انھوں نے رشتہ داروں سے محبت قائم نہیں رکھی بلکہ معاملہ اس کے برعکس تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چچا کا فدیہ اور زیادہ گراں کر دیا تھا۔[3]

حضرت عباس رضی اللہ عنہ مکہ واپس آئے۔ اپنا اور اپنے دونوں بھتیجوں کا فدیہ دیا، تاہم اپنا اسلام پوشیدہ رکھتے ہوئے بڑی مہارت سے بے مثال صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے مکہ میں قائم ہونے والی اسلامی حکومت کے لیے تانا بانا تیار کرتے رہے۔ آخر کار فتح مکہ کے موقع پر یہ کردار اختتام پذیر ہوا۔ سیدنا عباس رضی اللہ عنہ نے فتح مکہ سے تھوڑی مدت قبل اسلام کا اعلان کر دیا۔[4]

زینب بنت النبی کے خاوند ابوالعاص بن الربیع کا فدیہ

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ جب اہل مکہ نے اپنے قیدیوں کا فدیہ بھیجا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی زینب نے بھی ابوالعاص کا فدیہ بھیجا۔ اس میں سیدہ زینب رضی اللہ عنہا کا وہ ہار

1 صحيح البخاري، حديث: 4018. 2 سبل الهدٰى والرشاد للصالحي: 135/4. 3 السيرة النبوية لأبي شهبة: 176/2. 4 التربية القيادية للدكتور الغضبان: 68/3.

بھی تھا جو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے ابوالعاص سے عقد کے وقت زینب رضی اللہ عنہا کو دیا تھا۔ جب آپ ﷺ نے ہار دیکھا تو آپ ﷺ کو ان پر انتہائی ترس آیا اور فرمانے لگے:

«إِنْ رَأَيْتُمْ أَنْ تُطْلِقُوا لَهَا أَسِيرَهَا وَ تَرُدُّوا عَلَيْهَا الَّذِي لَهَا»

''اگر تمھاری رائے ہو تو زینب کا قیدی آزاد کر دو اور اس کا بھیجا ہوا فدیہ بھی واپس کر دو۔''

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ بالکل بجا اور ابوالعاص کو آزاد کر دیا اور فدیہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو لوٹا دیا۔ آپ ﷺ نے ابوالعاص پر شرط عائد کی تھی یا عہد لیا تھا کہ وہ زینب کو آپ ﷺ کے پاس آنے کی اجازت دے دیں، پھر انھیں لانے کے لیے آپ ﷺ نے زید بن حارثہ رضی اللہ عنہما کے ساتھ ایک انصاری کو روانہ کیا اور فرمایا:

«كُونَا بِبَطْنِ يَأْجِجَ حَتّٰى تَمُرَّ بِكُمَا زَيْنَبُ فَتَصْحَبَاهَا حَتّٰى تَأْتِيَا بِهَا»

''تم دونوں یأجج وادی میں جا ٹھہرو! وہاں تمھارے پاس زینب آئے گی۔ تم اسے ساتھ لے آنا۔''[1]

ابوالعاص نے کسی بھی طریقے سے کبھی اسلامی دعوت کا راستہ روکنے کی جسارت نہیں کی تھی۔ انھوں نے اپنی زبان اور ہاتھ سے اصحاب رسول ﷺ کو کوئی اذیت نہیں پہنچائی تھی۔ آپ ﷺ کی حیا اور اپنی تجارت میں مشغولیت کی وجہ سے ابوالعاص قریش کی طرح دعوتِ اسلام کی راہ میں رکاوٹ کھڑی کرنے سے کنارہ کش رہے۔ معرکہ بدر میں دامادِ پیغمبر ابوالعاص ان قیدیوں میں سے ایک تھے جنھوں نے معرکے میں کوئی خاص مشورہ دیا نہ ہی کوئی خاص کردار ادا کیا۔

قریش نے جب اپنے قیدیوں کا فدیہ ارسال کرنا شروع کیا تو سیدہ زینب رضی اللہ عنہا

---

1 سنن أبي داود، حديث: 2692، و مسند أحمد: 276/6، و صحيح السيرة النبوية لإبراهيم العلي، ص: 261.

نے بھی بطورِ فدیہ مال بھیجا۔ اس فدیے میں سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کا اپنی بیٹی کو عقد کے موقع پر دیا ہوا ہار بھی تھا۔ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اپنی پیاری بیٹی کا ہار دیکھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان پر بہت ترس آیا۔ یہ قابل قدر ہار پدری محبت، باوفا بیوی اور خاندانی یادوں کا ایک بہتا ہوا مظہر بن گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک باپ ہیں۔ اور انسانیت میں پائی جانے والی پدری محبت و عاطفت کے بلند تر وصف کے حامل ہیں۔ اب تو گویا رحمت و شفقت کے در پردہ زاویے بھی نمایاں ہونے لگے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب اطہر میں شفقت و محبت کی موجیں بے کنار ہونے لگیں اور ایک انتہائی معزز و محترم شخص کے انداز میں شفقت طلب نگاہیں صحابہ کی جانب امیدیں لیے اٹھیں۔ ایسی امیدیں جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو عطا و سخا پر ابھار رہی تھیں لیکن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو جو فدیے کا حق حاصل تھا اس طلب میں اس کی نفی بھی نہ تھی، یعنی اگر وہ حقِ فدیہ استعمال کرنا چاہتے تو انھیں کوئی مانع نہیں تھا، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«إِنْ رَأَيْتُمْ أَنْ تُطْلِقُوا لَهَا أَسِيرَهَا وَ تَرُدُّوا عَلَيْهَا الَّذِي لَهَا»

''اگر تم پسند کرو تو اس کا قیدی آزاد اور فدیہ واپس کر دو۔''

یہ شریف النفس انسانوں کے دلوں میں گھر کر جانے والا ایک عمدہ اسلوب ہے جو انھیں برضا و رغبت ماننے پر ابھارتا ہے اور دلوں میں خوشی و راحت کو بھی جنم دیتا ہے۔[1]

بیٹی کے لیے یہ شفقت بھرا لہجہ در پردہ کچھ اور بھی مقاصد لیے ہوئے تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا داماد ایک عمدہ اور صائب رائے رکھنے والا انسان تھا۔ باوجود اس کے کہ وہ مشرک تھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے عمدہ سلوک کو بارہا سراہا تھا اور اس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں اسلام کی طرف راغب کرنے کی کوشش بھی کی۔ ابوالعاص بن ربیع رضی اللہ عنہ 6 ھ میں مسلمان ہو گئے۔[2]

ابوعزہ عمرو بن عبداللہ جُمحی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت اور احتیاط کی کشمکش میں

عمرو بن عبداللہ غریب ہونے کے ساتھ ساتھ متعدد بیٹیوں کا باپ بھی تھا۔ عرض کرنے

[1] محمد رسول اللہ ﷺ لصادق عرجون: 3/480-487. [2] التاريخ الإسلامي للحميدي: 4/183.

لگا: ''اے اللہ کے رسول! آپ بخوبی جانتے ہیں کہ میں محتاج، قلاش اور پھر بڑے کنبے والا ہوں۔ مجھ پر احسان فرمایئے۔'' رحمۃ للعالمین ﷺ نے احسان فرماتے ہوئے یہ وعدہ لیا کہ آئندہ ہمارے خلاف کسی سے تعاون نہ کرنا۔ ابوعزہ اس پر آپ ﷺ کی تعریف میں لب کشا ہوا:

«مَنْ مُّبْلِغٌ عَنِّي الرَّسُولَ مُحَمَّدًا — بِأَنَّكَ حَقٌّ وَّ الْمَلِيكُ حَمِيدُ
وَ أَنْتَ امْرُؤٌ بُوِّئْتَ فِينَا مَبَائَةً — لَّهَا دَرَجَاتٌ سَهْلَةٌ وَّ صُعُودُ
فَإِنَّكَ مَنْ حَارَبْتَهُ لَمُحَارَبٌ — شَقِيٌّ وَّ مَنْ سَالَمْتَهُ لَسَعِيدُ
وَ لٰكِنْ إِذَا ذُكِّرْتُ بَدْرًا وَّ أَهْلَهُ — تَأَوَّبَ مَا بِي حَسْرَةٌ وَّ قُعُودُ

''محمد رسول اللہ ﷺ کو میری طرف سے یہ بات کون پہنچائے گا کہ آپ سچے اور قابلِ ستائش حاکم ہیں۔''

''آپ ہماری نسبت ایسے بلند مقام پر فائز ہیں جو بلند درجات اور عظمت وعروج کا حامل ہے۔''

''آپ جس سے جنگ کرتے ہیں وہ دشمن بڑا بدبخت ٹھہرتا ہے اور جس سے صلح کرلیں وہ خوش قسمت ہوتا ہے۔''

''لیکن میرے سامنے جب بھی جنگ بدر اور اس میں شریک ہونے والوں کا تذکرہ ہوگا تو حسرت وافسوس میں میرے تمام خیالات ختم ہوجائیں گے۔''

ابن کثیر رحمہ اللہ کا بیان ہے کہ مشرکین نے ابوعزہ کو جھانسا دیا اور اس نے رسول اللہ ﷺ سے کیا ہوا عہد توڑ ڈالا، لہٰذا وہ ان میں واپس لوٹ گیا اور غزوۂ احد میں دوبارہ قیدی بنا۔ اب وہ ایک بار پھر آپ ﷺ سے احسان کا سوال کرنے لگا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«لَا أَدَعُكَ تَمْسَحُ عَارِضَيْكَ بِمَكَّةَ وَ تَقُولُ: خَدَعْتُ مُحَمَّدًا مَرَّتَيْنِ»

''کہیں ایسا نہ ہو کہ تو مکہ جا کر منہ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے یہ بات کہے: ''میں نے محمد (ﷺ) کو دوبارہ دھوکا دیا۔ میں تمھیں ہرگز ایسا نہیں کرنے دوں گا۔''
اس کے بعد آپ ﷺ نے حکم صادر فرمایا تو اس کی گردن تن سے جدا کر دی گئی۔ [1]

ابوعزہ نے جب اپنے فقر اور بیٹیوں کی کفالت کا تذکرہ کیا تو آپ ﷺ نے اس پر رحم کرتے ہوئے درگزر فرمایا اور فدیہ لیے بغیر ایک وعدہ لے کر اسے چھوڑ دیا۔ لیکن جب وہ صلح پر کاربند رہا نہ ہی جنگ میں عدم شرکت کے وعدے پر پورا اترا، لہٰذا غزوۂ احد میں قیدی بنا تو آپ ﷺ نے محتاط رویہ اپناتے ہوئے اس کے قتل کا حکم صادر فرمایا۔

سہیل بن عمرو کا قید میں آنا اور حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کی گفتگو

عبدالرحمٰن بن اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب بدر کے قیدیوں کو مدینہ منورہ لایا گیا تو اس وقت ام المومنین حضرت سودہ رضی اللہ عنہا آل عفراء کے محلے میں تھیں، یہ بات احکام پردہ سے پہلے کی ہے۔ حضرت سودہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ''میں وہیں تھی کہ قیدیوں کی آمد کا پتا چلا، چنانچہ میں گھر واپس آئی۔ رسول اللہ ﷺ تشریف فرما تھے۔ میں نے دیکھا کہ ابویزید سہیل بن عمرو کے ہاتھ گردن سے بندھے ہوئے ہیں اور وہ کمرے کے ایک کونے میں پڑا ہے۔ ابویزید کی یہ حالت دیکھ کر میری زبان سے بے ساختہ کلمات نکلے:

''اے ابویزید! اس قید کے بجائے عزت کی موت کیوں نہ مر گئے؟''

اسی وقت مجھے اچانک آپ ﷺ کی آواز سنائی دی:

«يَا سَوْدَةُ! أَعَلَى اللّٰهِ وَرَسُولِهِ تُحَرِّضِينَ؟»

''اے سودہ! اسے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے خلاف ابھار رہی ہو؟''

میں نے عرض کیا: ''اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا!

---

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 110/3، ودلائل النبوة للبيهقي: 281,280/3، والبداية والنهاية: 313/3.

ابویزید کو اس حال میں دیکھ کر بے ساختہ زبان سے یہ الفاظ نکل گئے ہیں۔''[1]

سہیل بن عمرو کے فدیے کے لیے مکرز بن حفص بن اخیف آ گیا اور مسلمانوں سے سہیل کے فدیے کے متعلق بات چیت کرنے لگا حتی کہ مسلمانوں نے رضامندی کا اظہار کر دیا۔ اب مسلمانوں نے اس سے کہا: ''طے شدہ فدیہ پیش کرو۔'' مکرز نے کہا: ''اس کی جگہ مجھے بیڑیاں ڈال دو اور اسے چھوڑ دو تاکہ یہ اپنا فدیہ بھیج سکے۔'' مکرز کو قید کر کے سہیل بن عمرو کو چھوڑ دیا گیا۔

ایک مرسل روایت میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سہیل کے سامنے کے دانت نکالنے کی اجازت طلب کی تاکہ اس کی زبان بے قابو ہو جائے اور وہ کبھی بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف بیان نہ کر سکے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«لَا أُمَثِّلُ بِهٖ فَيُمَثِّلَ اللّٰهُ بِي وَ إِنْ كُنْتُ نَبِيًّا»

''میں اس کا مثلہ نہیں کروں گا کہ کہیں اللہ تعالیٰ میرا مثلہ نہ کر دے اگرچہ میں نبی ہوں۔''[2]

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا: «إِنَّهٗ عَسٰى أَنْ يَّقُومَ مَقَامًا لَّا تَذُمُّهٗ»

''امید ہے یہ کبھی ایسا کردار بھی ادا کرے گا جسے تم ناپسند نہیں کرو گے۔''[3]

امام ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: ''یہ وہی کردار ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے موقع پر سہیل بن عمرو رضی اللہ عنہ نے مکہ مکرمہ میں اس وقت ادا کیا جب عرب عموماً ارتداد کا شکار ہو گئے تھے اور مدینہ اور گردونواح میں نفاق بھڑک اٹھا تھا۔ سہیل بن عمرو رضی اللہ عنہ نے مکہ میں دینِ حنیف پر قائم رہنے پر خطبہ ارشاد فرماتے ہوئے کہا:

1 السنن الكبرىٰ للبيهقي: 89/9، و المستدرك للحاكم: 22/3، و السيرة النبوية لمحمد الصوياني: 200/2. 2 البداية والنهاية: 311/3. امام ابن کثیر کے بقول یہ روایت مرسل بلکہ معضل (ضعیف) ہے۔ 3 البداية والنهاية: 311/3.

''اے قریشیو! تم ایسے نہ بنو کہ اسلام لانے میں تو تم نے تاخیر کی مگر ارتداد کا شکار ہونے میں تم سبقت لے جاؤ۔ جس شخص نے ہمیں اپنے دین کے متعلق شک و شبہ میں ڈالا ہم اس کی گردن اڑا دیں گے۔''[1]

رسول اللہ ﷺ نے سہیل بن عمرو رضی اللہ عنہ کے دانت اکھاڑنے سے انکار فرمایا اور اس بات کا اظہار فرمایا کہ یہ انسان کی طبعی صورت بگاڑنے اور مثلہ کرنے کے مترادف ہے۔

یہ آپ ﷺ کے منہاج نبوت کا ایک نمونہ ہے جسے آپ ﷺ نے اپنی امت کو دشمن پر غلبہ پانے کے لیے بطورِ چراغ عنایت فرمایا۔[2]

تعلیم بمقابلہ فدیہ

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا بیان ہے کہ بدر کے دن کئی قیدیوں کے پاس فدیہ نہیں تھا، لہٰذا آپ ﷺ نے ان کا فدیہ یہ قرار دیا کہ انصار کے بچوں کو لکھائی سکھائیں۔[3]

چنانچہ قیدی مدینہ منورہ کے بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھانے لگے۔ جو قیدی بھی دس بچوں کو تعلیم دے دیتا وہ آزاد ہو جاتا۔[4]

اس وقت رسول اللہ ﷺ کو مال کی اشد ضرورت تھی اس کے باوجود آپ ﷺ کا تعلیم کو فدیہ کے طور پر قبول کر لینا اسلام کی عالی نظر میں تعلیم کی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے۔ اور یہ کوئی انوکھی بات نہ تھی، قرآن کریم کی پہلی وحی تعلیم ہی کے متعلق تھی۔ ارشادِ باری ہے:

﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ○ خَلَقَ الْاِنْسٰنَ مِنْ عَلَقٍ ○ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ○ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ○﴾

---

1 التاريخ الإسلامي للحميدي: 181/4. 2 محمد رسول الله ﷺ لصادق عرجون: 474/3.
3 مسند أحمد: 247/1، وصحيح السيرة النبوية لإبراهيم العلي، ص: 261. 4 التربية القيادية للدكتور الغضبان: 74/3.

''اپنے رب کے نام سے پڑھیے جس نے پیدا کیا۔اس نے انسان کو جمے ہوئے خون سے پیدا کیا۔ پڑھیے اور آپ کا رب بڑا کریم ہے۔ وہ ذات جس نے قلم کے ذریعے سے علم سکھایا۔''[1]

علم کی ترغیب اور علماء کی فضیلت کے بارے میں قرآن وسنت میں ان گنت ارشادات موجود ہیں۔ اس لحاظ سے آپ ﷺ پہلی ہستی ہیں جنھوں نے جہالت مٹانے اور تعلیم عام کرنے کی بنیاد رکھی۔ اس باب میں بھی اسلام ہی کو سبقت حاصل ہے۔[2]

قیدیوں کا حکم

اسلام میں قیدیوں کا معاملہ حاکم وقت کے اختیار میں ہے۔ وہ چار امور میں سے جو چاہے اختیار کر لے، البتہ امام کی ذمہ داری ہے کہ مصلحتِ عامہ کا خیال رکھے۔ وہ چار امور درج ذیل ہیں:

① قتل: آپ ﷺ نے عقبہ بن ابی معیط اور نضر بن حارث کے قتل کا حکم صادر فرمایا۔

② احسان: یعنی بغیر کسی عوض کے قیدی آزاد کرنا جیسا کہ آپ ﷺ نے ابوعزہ جمحی پر احسان فرمایا تھا۔

③ فدیہ: مال یا کسی بھی صورت میں فدیے لے کر قیدی آزاد کرنا جیسا کہ آپ ﷺ کے چچا عباس رضی اللہ عنہ، نوفل بن حارث اور عقیل بن ابی طالب وغیرہ سے معاملہ ہوا۔

④ غلام بنا لینا: جیسا کہ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے قریظہ کے متعلق فیصلہ سنایا تھا کہ جنگجوؤں کو قتل کر دیا جائے، بچوں اور عورتوں کو قیدی بنا لیا جائے اور اموال بانٹ دیے جائیں۔[3]

---

1 العلق 96:1-4۔ 2 السيرة النبوية لأبي شهبة: 2/164،165۔ 3 غزوة بدر الكبرىٰ لأبي فارس، ص: 101۔

غزوۂ بدر کے نتائج اور رسول اللہ ﷺ پر اچانک حملے کا پروگرام

جنگ بدر کے نتائج

اسلام کی شان و شوکت: غزوۂ بدر کا نتیجہ یہ نکلا کہ کفار پر مسلمانوں کا رعب و دبدبہ بیٹھ گیا۔ مدینہ منورہ اور اس کے اردگرد کے لوگ سہم گئے۔ مدینہ منورہ یا مسلمانوں پر حملے کا ارادہ رکھنے والے سوچنے پر مجبور ہو گئے۔ اور کسی بھی عملی اقدام سے قبل اس کا بھرپور جائزہ لینے لگے۔ مدینہ منورہ میں رسولِ گرامی ﷺ کی عظمت کا پھریرا لہرانے لگا اور ہر سُو اسلام کا بول بالا ہونے لگا۔ اس نئی تحریک کے متعلق شک وشبہ میں مبتلا رہنے والے کفار و مشرکین اسلام کے خلاف اپنی دشمنی اور کفر کے اظہار کی جرأت سے باز آ گئے۔ اسی لیے مدینہ میں نفاق، دھوکے اور مکاری نے جنم لیا۔ وہ آپ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سامنے اسلام کا اظہار کر کے بظاہر مسلمانوں میں شمار ہونے لگے مگر باطنی طور پر کفر اختیار کیے رکھا اور اسی لحاظ سے وہ کفار میں سے شمار ہوئے۔ یہ نہ تو مسلمان تھے کہ اسلام میں مخلص ہوں اور نہ کافر تھے کہ کفر و عداوت سامنے نظر آئے، ارشادِ الٰہی ہے:

﴿مُّذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ۝﴾

''وہ کفر اور ایمان کے درمیان ڈانواں ڈول ہیں، نہ (پورے) اس طرف نہ (پورے) اس طرف اور (اے نبی!) جسے اللہ گمراہ کرے، آپ اس کے لیے ہرگز کوئی راہ نہیں پائیں گے۔'' [1]

ان کے اس متردد موقف کی اللہ تعالیٰ نے انتہائی مذمت فرمائی اور متعدد آیات کریمہ میں ان کا یہ قبیح موقف واضح کیا ہے اور سخت ترین عذاب کی وعید سنائی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

[1] النسآء 4:143.

﴿إِنَّ الْمُنٰفِقِينَ فِي الدَّرْكِ الْأَسْفَلِ مِنَ النَّارِ وَلَن تَجِدَ لَهُمْ نَصِيرًا ۝﴾

”بے شک منافقین دوزخ کے سب سے نچلے طبقے میں جائیں گے اور وہاں آپ ان کے لیے ہرگز کوئی مددگار نہیں پائیں گے۔“[1]

جنگ بدر کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ پر مسلمانوں کے ایمان میں مزید پختگی آ گئی، ہر لحاظ سے استحکام ملا اور قوت میں اضافہ ہوا۔ قریش کے کئی ایک سرداروں نے اسلام قبول کیا جس سے مکہ مکرمہ میں موجود کمزور مسلمانوں کو حوصلہ اور ولولہ ملا۔ انھیں اللہ تعالیٰ کی نصرت پر دلی خوشی نصیب ہوئی۔ عقیدے کی پختگی اور ایمان میں اضافے کے ساتھ ساتھ یہ یقین مستحکم ہونے لگا کہ مشکل دن ختم ہونے کو ہیں۔

مزید یہ کہ مسلمانوں کو جنگی مہارت حاصل ہوئی۔ جنگ کے نئے اسلوب سامنے آئے۔ جزیرہ نمائے عرب اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں مسلمانوں کا چرچا ہونے لگا کیونکہ مسلمان بلادِ عرب میں ایک نمایاں اور ایک نامور قوت بن کر ابھرے تھے جو قریش ہی نہیں بلکہ عرب میں پھیلے ہوئے تمام قبائل کی چودھراہٹ کو چیلنج کر سکتے تھے۔ اسی طرح نئی قائم ہونے والی اسلامی حکومت کو جہاد کی بدولت غنیمت کے طور پر آمدنی کا ایک مؤثر ذریعہ حاصل ہوا جس کی بنا پر مسلمانوں کی مادی و اقتصادی حالت بہتر ہوئی اور انیس ماہ کی مسلسل تنگی پر اچھا اثر پڑا۔[2]

قریش کا اقتصادی نقصان: قریش کو اس جنگ سے اتنا نقصان ہوا کہ ان کی کمر ٹوٹ گئی۔ ابوجہل بن ہشام، امیہ بن خلف، عتبہ بن ربیعہ وغیرہ جو کفر کے سرغنے اور جنگ اور بہادری میں اپنی نظیر آپ تھے، ان کا قتل ہونا صرف جنگی خسارہ نہ تھا بلکہ معنوی طور پر بھی گھاٹا تھا۔ وہ اس طرح کہ مدینہ منورہ کی اس صورتِ حال سے نہ صرف قریش کی تجارت کو خطرہ لاحق تھا بلکہ انھیں پورے حجاز میں اپنی سرداری اور اس کے اثر و رسوخ کا مسئلہ

---

1 النسآء 145:4. 2 التاريخ السياسي والعسكري للدكتور علي المعطي، ص:275,274.

بھی درپیش تھا۔[1]

مکہ مکرمہ میں جنگِ بدر کی شکست کی خبر: اہل مکہ پر شکست کی خبر بجلی بن کر گری۔ ابتدائی طور پر جب شکست کی خبر مکہ پہنچی تو کسی نے بھی اس کی تصدیق نہ کی۔ ابن اسحاق کا بیان ہے: ''مکہ مکرمہ میں سب سے پہلا قریشی حیسُمان بن عبداللہ الخزاعی[2] ہزیمت کی خبر لے کر پہنچا تو لوگوں نے پوچھا کہ میدانِ کارزار کی صورتِ حال کیا ہے؟ اس نے کہا: ''عتبہ بن ربیعہ، شیبہ بن ربیعہ، ابو الحکم بن ہشام، امیہ بن خلف، زمعہ بن اسود، نُبَیہ بن حجاج، منبہ بن حجاج اور ابو البختری بن ہشام یہ سب قتل ہو چکے ہیں۔'' جب حیسُمان نے قریش کے سارے سردار شمار کر ڈالے تو صفوان بن امیہ نے کہا: ''اللہ کی قسم! اگر اس کے ہوش وحواس قائم ہیں تو اس سے میرے متعلق دریافت کرو۔'' لوگوں نے پوچھا کہ صفوان بن امیہ نے کیا کردار ادا کیا؟ وہ کہنے لگا: ''وہ ادھر حطیم میں بیٹھا ہے۔ اللہ کی قسم! میں نے اس کے باپ اور بھائی کو دیکھا، دونوں قتل ہو چکے ہیں۔''[3]

رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام ابورافع رضی اللہ عنہ اس شکست کا ابولہب پر اثر یوں بیان کرتے ہیں: ''میں حضرت عباس بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ کا غلام تھا۔ ان کے گھرانے سے ام الفضل اور میں مسلمان ہو چکے تھے۔ عباس رضی اللہ عنہ اپنی قوم سے بچتے تھے۔ وہ ان کی مخالفت مول لینا نہیں چاہتے تھے لیکن اسلام چھپائے ہوئے تھے۔ اپنی قوم میں ان کا خاصا مال بکھرا ہوا تھا۔

اللہ تعالیٰ کا دشمن ابولہب غزوۂ بدر سے پیچھے رہ گیا تھا اور اپنی جگہ پر اس نے عاص بن ہشام بن مغیرہ کو بھیج دیا تھا۔ جب بدر میں قریش کو انتہائی صدمہ پہنچا اور اس کی خبریں مکہ میں پہنچیں تو اللہ تعالیٰ نے اسے ذلیل ورسوا کر دیا، جبکہ ہم نے دلی طور پر قوت وعزت محسوس کی۔''

---

1 التاريخ السياسي والعسكري للدكتور علي المعطي، ص:276,275. 2 سیرت ابن ہشام میں ''حیسُمان'' ہے۔ 3 السيرة النبوية لابن هشام:246/2، و صحيح السيرة النبوية لإبراهيم العلي، ص:275.

ابورافع رضی اللہ عنہ مزید کہتے ہیں کہ میں ایک کمزور شخص تھا۔ اس وقت حجرۂ زمزم میں بیٹھا اپنے پیشے کے مطابق پتھر سے پیالے گھڑ رہا تھا۔ سیدنا عباس رضی اللہ عنہ کی زوجہ محترمہ ام الفضل میرے پاس تشریف فرما تھیں۔ اس خبر پر ہم شاداں و فرحاں تھے۔ اسی دوران شریر فطرت ابولہب پاؤں گھسیٹتا ہوا آیا اور حجرے کی ایک جانب میری پیٹھ کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھ گیا۔ اسی وقت لوگوں کی آواز سنائی دی کہ ابوسفیان بن حارث بن عبد المطلب آ گیا ہے۔ ابولہب نے کہا: ''میری طرف آؤ، تمھارے پاس یقیناً معلومات ہوں گی۔'' لہٰذا وہ بھی اس کے پاس بیٹھ گیا۔ لوگ اردگرد کھڑے تھے۔ ابولہب نے کہا: ''بھتیجے! مجھے بتاؤ کیسے واقعہ پیش آیا؟'' اس نے کہا: ''اللہ کی قسم! مڈھ بھیڑ ہوتے ہی ہم پیٹھ پھیر گئے۔ وہ جسے چاہتے قتل کرتے اور جسے چاہتے قید کرتے تھے۔ لیکن اللہ کی قسم! اس پر بھی میں اپنے لوگوں کو ملامت نہیں کرتا۔ ہمارا واسطہ ہی ایسے سفید آدمیوں سے پڑا جو آسمان و زمین کے وسط میں چتکبرے گھوڑوں پر سوار تھے۔ اللہ کی قسم! وہ کسی چیز کو نہ چھوڑتے اور نہ ان کے سامنے کوئی چیز ٹھہر سکتی تھی۔''

ابورافع رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ''میں نے خیمے کی رسیوں کو اپنے ہاتھ سے اوپر اٹھا کر کہا: ''اللہ کی قسم! وہ فرشتے تھے!'' یہ سننا تھا کہ ابولہب نے میرے منہ پر زوردار تھپڑ مارا۔ میں اس پر کود پڑا۔ اس نے مجھے اٹھایا اور زمین پر پٹخ دیا۔ میں کمزور تھا، چنانچہ وہ میرے اوپر بیٹھ گیا اور مارنے لگا۔ یہ دیکھ کر ام الفضل اٹھیں اور خیمے کی ایک لکڑی پکڑ کر اس کے سر پر ایسے زور سے ماری کہ وہ گر پڑا اور اس کے سر پر گہرا زخم آ گیا، پھر ام الفضل کہنے لگیں: ''اس کے مالک (عباس رضی اللہ عنہ) کی عدم موجودگی پر اسے کمزور سمجھتے ہو۔'' اب وہ ذلیل ہو کر وہاں سے چلتا بنا۔ اس کے بعد سات راتیں ہی گزری تھیں کہ طاعون نما پھنسی سے مر گیا۔''[1]

غزوۂ بدر نے مشرکین مکہ کے دلوں میں شکست، مقتولین اور قیدیوں کی بنا پر انتہائی

1 السيرة النبوية لابن هشام: 258/2.

رنج وغم اور حزن و ملال چھوڑا، مثلاً: ابولہب چند ہی دن بعد بیماری کی لپیٹ میں آ گیا۔ ابوسفیان (رضی اللہ عنہ) کا ایک بیٹا قید اور ایک قتل ہو گیا۔ مکہ مکرمہ کے ہر گھر میں صف ماتم بچھی ہوئی تھی۔ کسی کا رشتے دار قتل ہوا تھا اور کسی کا عزیز یا قریبی گرفتار تھا۔ ایسی صورتِ حال میں مشرکین کے اندر بدلہ چکانے کا عزم پیدا ہونا بعید از قیاس نہ تھا۔ بعض نے تو اپنے وڈیروں اور سرداروں کے قاتلوں سے بدلہ لیے بغیر اپنے اوپر غسل کرنا حرام قرار دے لیا۔ (ابوسفیان بن حرب (رضی اللہ عنہ) نے نذر مانی کہ مسلمانوں سے جنگ تک غسل جنابت کی نوبت نہ آئے گی۔)

اب اہل مکہ مسلمانوں سے ٹکرانے اور ان سے بدلہ لینے کے منتظر رہنے لگے۔ جنگ احد اسی کے نتیجے میں بپا ہوئی۔[1]

یہودیوں کی اسلام دشمنی: جہاں تک یہودیوں کا تعلق ہے انھیں بدر میں مسلمانوں کی فتح کا بڑا قلق ہوا۔ مسلمانوں کی ابھرتی ہوئی طاقت، اسلام کی شان وشوکت اور یہودیت پر اس کا غالب ہونا، رسول اللہ ﷺ کی خوش بختی اور بلند مقام و مرتبہ یہ سب باتیں انھیں پریشان کر رہی تھیں، لہٰذا انھوں نے آپ ﷺ کی آمدِ مدینہ کے موقع پر کیے ہوئے معاہدے کو توڑنے کا پختہ عزم کر لیا اور دلوں میں چھپی دشمنی کا علی الاعلان اظہار کرنے لگے۔ اسلام اور پیغمبر اسلام کے خلاف ریشہ دوانیوں میں مصروف ہو گئے۔ اور اپنے تمام تر وسائل بروئے کار لاتے ہوئے فیصلہ کن مرحلے تک پہنچنے کے لیے کوشاں ہو گئے۔[2]

رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کے خلاف دشمنوں کو ابھارنے لگے۔

رسول اللہ ﷺ سے یہود کی منفی سرگرمیاں پوشیدہ نہیں تھیں۔ آپ ﷺ بڑے محتاط انداز اور حاضر دماغی سے ان پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ بالآخر یہود نے مسلمانوں میں رائج

[1] السيرة النبوية لأبي شهبة: 171/2. [2] التاريخ السياسي والعسكري للدكتور علي المعطي، ص: 274.

اخلاقی قدروں اور وہ امور، جن کی بدولت مسلمانوں کو عزت ملی تھی، انھیں حقارت کا نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ اور علانیہ دشمنی پر اتر آئے۔ ایسے حالات میں یہود سے جنگ اور مدینہ سے ان کی جلا وطنی کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ اس کی تفصیل بعد والے صفحات میں آئے گی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ [1]

رسول اللہ ﷺ پر اچانک حملے کا پروگرام اور عمیر بن وہب کا قبولِ اسلام

حضرت عروہ بن زبیر بیان کرتے ہیں کہ بدر میں شکست پہنچنے کے چند دن بعد عمیر بن وہب جمحی حطیم میں صفوان بن امیہ کے ساتھ بیٹھا تھا۔ عمیر قریش کے ان شر پسند عناصر میں سے ایک تھا جو آپ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اذیت پہنچاتے تھے۔ مکہ مکرمہ میں مسلمانوں کو اس کے ہاتھوں بڑا دکھ پہنچا تھا، اب عمیر کا بیٹا وہب [2] بدر کے قیدیوں میں سے تھا۔ بہر حال صفوان اور عمیر کی مجلس میں بدر کے کنویں میں ڈالے گئے کفار مقتولین اور پہنچنے والے دیگر نقصانات کا تذکرہ چل نکلا۔ صفوان نے کہا: ''اللہ کی قسم! ان کے بعد زندگی میں کوئی لطف باقی نہیں رہا!'' عمیر نے کہا: ''سچ کہتے ہو لیکن اللہ کی قسم! اگر مجھ پر ان قرضوں کا بوجھ نہ ہو جن کی ادائیگی کے لیے میرے پاس کچھ نہیں اور ان بچوں کا غم بھی نہ ہو، میرے بعد جن کے ضائع ہونے کا خدشہ ہے تو میں سفر کر کے (نعوذ باللہ) محمد ﷺ کو قتل کر دوں کیونکہ وہاں جانے کے لیے میرے پاس بہانہ بھی موجود ہے کہ ان کے ہاں میرا بیٹا قیدی ہے۔''

عروہ کہتے ہیں کہ صفوان نے یہ موقع غنیمت جانا اور فوراً کہا: ''تیرا قرض میرے ذمے رہا۔ رہے تیرے بچے تو میں تا زندگی ان کی کفالت کا ذمہ اٹھاتا ہوں کہ جو چیز مجھے میسر ہوگی وہ قطعًا اس سے محروم نہ ہوں گے۔'' عمیر نے کہا: ''یہ معاملہ راز میں رکھو۔'' اس نے کہا: ''ایسا ہی کروں گا۔''

1 السيرة النبوية لأبي شهبة: 171/2۔ 2 یاد رہے عمیر کے بیٹے اور باپ دونوں کا نام وہب تھا۔

بقول عروہ، پھر عمیر نے اپنی تلوار تیز اور زہر آلود کرنے کے بعد سفر کا آغاز کیا اور مدینہ منورہ جا پہنچا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ مسلمانوں کی مجلس میں تشریف فرما تھے۔ اس مجلس میں بدر اور اس موقع پر اللہ تعالیٰ کی کرم نوازی اور دشمنوں کی ذلت کا تذکرہ چل رہا تھا۔ اسی دوران عمر رضی اللہ عنہ کی نگاہ عمیر پر پڑی۔ اس نے گلے میں ننگی تلوار ڈالے ہوئے مسجد کے دروازے پر اپنی سواری بٹھا دی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بولے: ''اللہ کی قسم! اللہ کا دشمن، یہ درندہ لازماً برے ارادے سے پہنچا ہے! اس نے بدر کے موقع پر ہماری تعداد کم بتا کر دشمن کو ہمارے خلاف بھڑکایا تھا۔'' عمر رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کرنے لگے: ''میرے آقا! یہ اللہ کا دشمن عمیر بن وہب گلے میں تلوار لٹکائے ہوئے آیا ہے۔'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «فَأَدْخِلْهُ عَلَيَّ» ''اسے میرے پاس لے آؤ۔''

عمر رضی اللہ عنہ نے واپس آ کر اس کی گردن میں لٹکے تلوار کے پرتلے سے پکڑا اور اپنے ساتھ بیٹھے انصاریوں سے کہا: ''آپ سب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں چلے جائیں اور وہیں بیٹھ جائیں اور اس خبیث سے محتاط رہیں کہ کہیں یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی نقصان نہ پہنچائے کیونکہ اس پر کوئی اعتبار نہیں۔'' پھر عمیر کو پکڑے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں چلے آئے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ اس پر پڑی کہ عمر رضی اللہ عنہ نے اس کے گلے میں لٹکے ہوئے تلوار کے پرتلے سے پکڑ رکھا ہے تو فرمایا: «أَرْسِلْهُ يَا عُمَرُ! اُدْنُ يَا عُمَيْرُ!» ''عمر! تم اسے چھوڑ دو اور عمیر! تم نزدیک آ جاؤ۔''

عمیر نے قریب ہوتے ہوئے کہا: ''صبح بخیر'' یہ اہل جاہلیت کا آپس میں سلام (دعائیہ کلمہ) تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواباً فرمایا: «أَكْرَمَنَا اللّٰهُ بِتَحِيَّةٍ خَيْرٍ مِّنْ تَحِيَّتِكَ يَا عُمَيْرُ! بِالسَّلَامِ تَحِيَّةِ أَهْلِ الْجَنَّةِ» ''اے عمیر! اللہ تعالیٰ نے ہمیں تمھارے اس سلام سے بہتر سلام سے نوازا ہے، یعنی ''السلام'' جو اہل جنت کا سلام ہے۔''

عمیر کہنے لگا: ''اللہ کی قسم! مجھے اس کا پہلے علم نہ تھا۔''

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «فَمَا جَاءَ بِكَ يَا عُمَيْرُ؟» ''عمیر! کیسے آنا ہوا؟''

عمیر: ''آپ کے پاس ایک قیدی ہے اس کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ اس پر احسان فرمائیے۔''

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «فَمَا بَالُ السَّيْفِ فِي عُنُقِكَ؟» ''یہ تمھارے گلے میں تلوار کیسی ہے؟''

عمیر: ''اللہ اسے ضائع کرے، یہ گھٹیا تلواروں میں سے ہے۔ یہ ہمارے کسی کام کی نہیں۔''

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «اُصْدُقْنِي، مَاالَّذِي جِئْتَ لَهُ؟» ''میرے سامنے سچ بولو، کس کام کے لیے آئے ہو؟''

عمیر: ''صرف اپنا قیدی چھڑانے ہی کے لیے حاضر ہوا ہوں۔''

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«بَلْ قَعَدْتَّ أَنْتَ وَ صَفْوَانُ بْنُ أُمَيَّةَ فِي الْحِجْرِ، فَذَكَرْتُمَا أَصْحَابَ الْقَلِيبِ مِنْ قُرَيْشٍ، ثُمَّ قُلْتَ: لَوْلَا دَيْنٌ عَلَيَّ وَ عِيَالٌ عِنْدِي، لَخَرَجْتُ حَتّٰى أَقْتُلَ مُحَمَّدًا فَتَحَمَّلَ لَكَ صَفْوَانُ بْنُ أُمَيَّةَ بِدَيْنِكَ، وَ عِيَالِكَ عَلٰى أَنْ تَقْتُلَنِي لَهُ، وَاللّٰهُ حَائِلٌ بَيْنَكَ وَ بَيْنَ ذٰلِكَ»

''بلکہ تم اور صفوان حطیم میں بیٹھے بدر کے کنویں میں پھینکے گئے قریشیوں کا تذکرہ کر رہے تھے، پھر تم نے کہا: ''مجھ پر اگر قرض اور بچوں کا بوجھ نہ ہو تو میں جا کر محمد (ﷺ) کو لازماً قتل کر دوں۔'' تب صفوان نے میرے قتل کے بدلے تمھارے قرض اور بچوں کی کفالت کی ضمانت دی۔ اللہ نے تمھارے اور تمھارے اس منصوبے کے درمیان رکاوٹ ڈال دی ہے۔''

عمیر: ''میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔ اے اللہ کے رسول! آپ جو آسمانی خبریں ہمارے پاس لاتے رہے ہم ان کا انکار کرتے تھے اور وحی کے بھی منکر تھے۔ مگر اس مشورے میں میرے اور صفوان کے علاوہ کوئی موجود ہی نہ تھا۔ اللہ کی قسم! مجھے

یقین ہے کہ یہ خبر آپ کو صرف اور صرف اللہ ہی نے دی ہے۔ تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہیں جس نے مجھے اسلام کی ہدایت عطا کی اور مجھے اس مقام پر لے آیا۔'' یہ کہتے ہی عمیر رضی اللہ عنہ نے کلمۂ شہادت پڑھ کر حق کی گواہی دے دی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «فَقِّهُوا أَخَاكُمْ فِي دِينِهِ، وَ أَقْرِئُوهُ الْقُرْآنَ، وَ أَطْلِقُوا لَهُ أَسِيرَهُ» ''اپنے بھائی کو دین سکھاؤ، قرآن پڑھاؤ اور اس کے قیدی کو رہا کر دو۔''

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس پر عمل درآمد شروع کر دیا۔

عمیر رضی اللہ عنہ کہنے لگے: ''اے اللہ کے رسول! میں دین کی شمع گل کرنے کی کوشش کرتا رہا، اللہ تعالیٰ کا دین اختیار کرنے والوں کو سخت تکلیف پہنچاتا رہا۔ میری آرزو ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے اجازت دیں میں مکہ مکرمہ جاؤں اور وہاں کے باسیوں کو اللہ تعالیٰ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کی طرف دعوت دوں۔ ممکن ہے اللہ تعالیٰ انھیں ہدایت عطا فرمائے۔ بصورت دیگر میں انھیں اس طرح تکالیف سے دوچار کروں جس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں کو ان کے دین کی بنا پر اذیتیں پہنچایا کرتا تھا۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں اجازت دے دی۔ اس کے بعد عمیر رضی اللہ عنہ مکہ مکرمہ کی طرف چل دیے۔ دوسری طرف عمیر کی مکہ مکرمہ سے روانگی کے بعد صفوان نے لوگوں سے یہ کہنا شروع کر رکھا تھا کہ چند دنوں میں تمھیں ایک بڑے کارنامے کی خوشخبری ملنے والی ہے جو تمھیں بدر کا غم بھلا دے گی۔ اور ہر آنے والے قافلے سے اس کے متعلق پوچھتا رہتا۔ بالآخر وہ دن آ گیا جب وہ مسافر (عمیر بن وہب رضی اللہ عنہ) آ گئے۔ اور انھوں نے اپنے بارے میں بتایا کہ میں اسلام قبول کر چکا ہوں۔ یہ سننا تھا کہ صفوان نے قسم اٹھالی کہ عمیر سے نہ کبھی کلام کروں گا اور نہ اسے کسی قسم کا نفع پہنچاؤں گا۔ [1]

[1] المعجم الكبير للطبراني: 58/17، ومجمع الزوائد: 286/8، وصحيح السيرة النبوية لإبراهيم العلي، ص: 260.

عمیر رضی اللہ عنہ کے قبول اسلام کے واقعے سے ماخوذ اسباق اور نصیحتیں: اس قصے کے نتائج اور اسباق درج ذیل ہیں:

❁ مذموم مقاصد کی تکمیل کے لیے کفار کی ہر ممکن کوشش: مشرکین داعیانِ اسلام کا نسلی صفایا چاہتے تھے۔ صفوان اور عمیر کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو شہید کرنے پر اتفاق بتاتا ہے کہ مشرکین صرف دعوت ترک کرنے، اس میں طرح طرح کی رکاوٹیں کھڑی کرنے اور لوگوں کو اس سے دور رکھنے ہی پر اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ داعیان اسلام کو اچانک قتل کرنے کے منصوبے بھی بناتے اور ان کے خلاف گٹھ جوڑ بھی کیے ہوئے تھے۔ اور وہ اس گھٹیا مقصد کے لیے اجرتی قاتل بھی حاصل کر لیتے تھے۔[1] اسی طرح مالدار لوگ فقراء کی ضرورت اور مجبوری سے فائدہ اٹھاتے۔ انھیں اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کے لیے گرانقدر دولت کا لالچ دیتے، بھلے اس میں ان کی اپنی جان بھی خطرے میں پڑے۔ صفوان نے عمیر رضی اللہ عنہ کے ضرورت مند، مجبور اور مقروض ہونے سے فائدہ اٹھا کر کیسے اسے ہلاکت کی راہ پر ڈالا تھا؟[2]

❁ امن وسلامتی کے متعلق صحابہ کا شعور: امن وسلامتی اور تحفظ سے متعلق شعور اور دور اندیشی صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا خصوصی وصف تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ، عمیر کے آنے پر انتہائی محتاط ہو گئے اور بآواز بلند کہہ دیا کہ یہ شر پسند ہے اور شر ہی کے لیے آیا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے اس کا ماضی گواہ تھا کہ مکہ مکرمہ میں یہ مسلمانوں کو اذیت دیتا تھا۔ بدر میں مسلمانوں کے خلاف جنگ پر ابھارنے والا بھی یہی شخص تھا۔ اور اسی نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اعداد وشمار اہل مکہ کو فراہم کیے تھے، اس لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کا بندوبست شروع کر دیا تھا اور اس کی گردن میں پڑا تلوار کا پرتلہ بھی اسی لیے زور سے تھام لیا تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف تلوار کا ممکنہ استعمال ناممکن بنا دیا جائے۔ اس سلسلے میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے صحابہ کی ایک جماعت کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کا کہہ دیا تھا۔

1 المستفاد من قصص القرآن لعبد الكريم زيدان: 159/2. 2 غزوة بدر الكبرىٰ لأبي فارس، ص:82.

❁ **اسلام کی تعلیمات اور اقدار کی روشنی میں عزت و وقار کا حصول:** رسول اللہ ﷺ نے زمانۂ جاہلیت کے دعائیہ کلمات کو ٹھکرا دیا، جیسا کہ جب عمیر نے ''صبح بخیر'' کہا تو آپ ﷺ نے اس کا جواب نہ دیا بلکہ بتا دیا کہ میں اہل جاہلیت کے دعائیہ طریقے پر دعا نہیں دیتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اہل جنت کے دعائیہ کلمات سے مشرف فرمایا ہے۔

❁ **معلم انسانیت ﷺ کے اخلاق عالیہ:** رسول اللہ ﷺ نے عمیر سے اچھا برتاؤ کیا، درگزر فرمایا اور معاف کیا، حالانکہ وہ آپ ﷺ کو قتل کرنے آیا تھا۔[1] بلکہ اس کے اسلام لانے کے بعد اس کے بیٹے کو بھی آزاد کر دیا اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو حکم دیا کہ وہ اپنے بھائی کو دین سمجھائیں، قرآن سکھائیں اور اس کے قیدی کو آزاد کر دیں۔[2]

❁ **عمیر بن وہب رضی اللہ عنہ کی ایمانی قوت:** عمیر رضی اللہ عنہ نے سارے مکہ میں اپنے اسلام کے اظہار کا پختہ عزم کیا تو آپ ﷺ نے انھیں اظہار کی اجازت دے دی، چنانچہ انھوں نے مکہ مکرمہ پہنچ کر ایسا ہی کیا۔ سب کے سامنے اعلان کیا اور چیلنج دیا جس کی صدائے بازگشت مدینہ منورہ تک بھی پہنچی۔ مکہ میں کافی لوگ ان کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہوئے۔ جب لوگوں کا موازنہ ہوتا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ انھیں ان لوگوں میں شمار کرتے جو ایک ہزار کے قائم مقام سمجھے جاتے تھے۔ حضرت عمیر رضی اللہ عنہ ان چار آدمیوں میں سے تھے جن کے ذریعے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی مدد کی۔ وہ چاروں ہی ایک ایک ہزار کے بالمقابل سمجھے جاتے تھے۔[3]

---

1 غزوة بدر الكبرىٰ لأبي فارس، ص: 83. 2 صحيح السيرة النبوية لإبراهيم العلي، ص: 260.
3 التربية القيادية للدكتور الغضبان: 73/3.

باب 4

غزوۂ بدر کے بعض اسباق، نصائح اور فوائد

مدد حقیقت میں اللہ ہی کی طرف سے ہوتی ہے

بدر میں اصل مدد اللہ تعالیٰ ہی کی جانب سے تھی۔ اللہ تعالیٰ نے یہ بات واضح فرمائی ہے کہ اصل مدد تو اس کی جانب سے ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى لَكُمْ وَلِتَطْمَىِٕنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ ۗ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ۝﴾

"اور اللہ نے اسے تمھارے لیے خوشخبری بنادیا تا کہ اس سے تمھارے دلوں کو تسلی ہو۔ اور مدد تو اللہ ہی کی طرف سے ہوتی ہے جو بہت زبردست، نہایت حکمت والا ہے۔"[1]

یہی ارشاد سورۂ انفال (آیت: 10) میں بھی موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں آیات میں یہ بات تاکید سے واضح فرمادی کہ مدد صرف اللہ تعالیٰ ہی کی جانب سے ہوتی ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کے سوا سے مدد ناممکن ہے۔ اور ﴿الْعَزِيْزِ﴾ کے معنی ہیں: ایسا غالب جسے زیر کرنے کا قصد بھی نہ کیا جائے۔[2] ﴿الْحَكِيْمِ﴾ سے یہاں مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کفار کو ملیامیٹ کرنے اور ہلاک کرنے کی طاقت رکھتا ہے اس کے باوجود اس نے کفار کو مٹانے کا حکم دے رکھا ہے، لہٰذا وہ بڑا حکیم و دانا ہے۔[3]

ان دونوں آیات میں یہ عقیدہ سمجھایا گیا ہے کہ مومنوں کو صرف اکیلے اللہ تعالیٰ پر اعتماد

[1] آل عمرٰن 3:126۔ [2] تفسیر ابن کثیر: 1/411۔ [3] تفسیر ابن کثیر: 2/303۔

کرنا چاہیے، اپنے معاملات اس کے سپرد کرنے چاہئیں اور یہ مدد فرشتوں وغیرہ سے نہیں بلکہ اللہ ہی کی طرف سے ہوتی ہے۔

مسلمانوں کے لیے اسباب اختیار کرنا ضروری ہے لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ ان اسباب سے دھوکے میں مبتلا نہ ہو جائیں بلکہ اعتماد صرف مسبب الاسباب پر ہونا چاہیے کہ وہی اپنی خاص توفیق سے مدد فرماتا ہے۔ بعد ازاں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر اپنے فضل و کرم کی بارش کا تذکرہ فرمایا اور یہ بات واضح کی کہ بدر کے دن ان کی مدد، مشرکوں کا قتل اور آپ ﷺ کا مشرکین پر مٹی پھینکنا یہ سب اللہ تعالیٰ کی توفیق، فضل اور اسی کی نصرت سے تھا۔ اس آیت کریمہ کے ساتھ قرآن پاک مسلمانوں کی تربیت اور اللہ تعالیٰ پر اعتماد کی تعلیم دے رہا ہے۔ ارشاد ہے:

﴿فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ ۠ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ۚ وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِيْنَ مِنْهُ بَلَآءً حَسَنًا ۚ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝﴾

”چنانچہ تم نے انھیں قتل نہیں کیا بلکہ اللہ ہی نے انھیں قتل کیا اور (اے نبی!) جب آپ نے (مٹھی بھر خاک ان کی طرف) پھینکی تو وہ آپ نے نہیں پھینکی بلکہ اللہ نے پھینکی اور تاکہ وہ مومنوں کو اپنی طرف سے اچھے انعام سے نوازے، بے شک اللہ خوب سننے والا، خوب جاننے والا ہے۔“[1]

اور جب یہ بات واضح فرمائی کہ نصرت اسی کی طرف سے تھی تو اس مدد کی کچھ حکمتیں بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿لِيَقْطَعَ طَرَفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْ يَكْبِتَهُمْ فَيَنْقَلِبُوْا خَآئِبِيْنَ ۝ لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ اَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَاِنَّهُمْ ظٰلِمُوْنَ ۝﴾

[1] الأنفال 8:17.

''اس (اللہ) کا مقصد یہ تھا کہ وہ کافروں کے ایک گروہ کو ہلاک کر دے یا انھیں ذلیل کر دے، پھر وہ نامراد ہوکر لوٹ جائیں، (اے نبی!) آپ کا اس معاملے میں کچھ اختیار نہیں، اللہ چاہے تو ان کی توبہ قبول کرے، چاہے تو انھیں عذاب دے کیونکہ وہ ظالم ہیں۔'' [1]

اور اس عظیم نعمت کو ہمیشہ یاد رکھنے کا حکم دیتے ہوئے نصیحت فرمائی کہ بدر میں مدد کی فراہمی سے پہلے کی زبوں حالی کبھی دل و دماغ سے نہ اترنے پائے، لہٰذا ارشاد ہے:

﴿وَاذْكُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِي الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَاٰوٰىكُمْ وَاَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ○﴾

''اور یاد کرو جب تم بہت تھوڑے تھے، زمین میں کمزور سمجھے جاتے تھے، تم اس بات سے ڈرتے تھے کہ کہیں لوگ تمھیں اچک (نہ) لے جائیں تو اللہ نے تمھیں ٹھکانا دیا اور اپنی نصرت کے ساتھ تمھاری تائید کی اور تمھیں پاکیزہ چیزوں سے رزق دیا تاکہ تم (اس کا) شکر کرو۔'' [2]

یوم الفرقان (فیصلہ کن دن)

بدر کے دن کا نام ''یوم الفرقان'' رکھا گیا۔ مسلمانوں کی زندگی میں اسے اس نام سے موسوم کرنے کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ○﴾

''اور (اے مسلمانو!) جان لو کہ تم جو کچھ بھی مال غنیمت حاصل کرو، اس میں سے

1 آل عمرٰن 3:127، 128۔ 2 الأنفال 8:26۔

پانچواں حصہ یقیناً اللہ کے لیے ہے اور رسول کے لیے اور (اس کے) رشتے داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے۔ اگر تم اللہ پر ایمان لائے ہو اور اس پر جو ہم نے اپنے بندے پر فیصلے کے دن اتارا جس دن دو فوجوں میں ٹکراؤ ہوا تھا اور اللہ ہر چیز پر خوب قدرت رکھتا ہے۔‘‘ [1]

اس آیت میں یوم بدر کو اللہ تعالیٰ نے یوم الفرقان قرار دیا ہے۔ اس کے متعلق سید قطب رقمطراز ہیں: ’’غزوۂ بدر جس کی ابتدا و انتہا اللہ تعالیٰ کی تدبیر، رہنمائی، نگرانی اور مدد سے ہوئی، یہ معرکہ حق و باطل میں فرق کردینے والا تھا مگر فرقان کے معنی صرف وہ اجمالی نہیں جیسا کہ بالعموم مفسرین کا خیال ہے۔ بلکہ یہاں فرقان اس عمومی معنی سے زیادہ شامل، زیادہ لطیف، زیادہ وسیع اور زیادہ گہرائی کا حامل ہے۔

یہ معرکہ عملاً حق و باطل میں فرق کردینے والا تھا مگر اس معرکے نے اس حق کو باطل سے ممتاز کیا جو حقیقی اور بنیادی طور پر حق ہے جس پر آسمان و زمین قائم ہیں۔ جو ہر ذی روح اور دیگر اشیا کی بنیاد ہے، وہ حق جو اللہ تعالیٰ کے الوہیت، بادشاہی اور تدبیر و تقدیر میں یکتائی کی صورت میں ہے۔ وہ حق جو تمام جہاں بشمول ارض و سما، جاندار و بے جان سب کی عبودیت کو شامل ہے۔ ایسی الوہیت و عبودیت جو بلاشراکت ہو اور اس بلاشریک بادشاہ کے لیے ہو جس کا کوئی حصہ دار ہو اور نہ فیصلے کو چیلنج کرنے والا۔ اور وہ کھوٹا، ڈگمگاتا اور پھسلنے والا باطل جو اُس وقت ساری زمین کو لپیٹ میں لیے ہوئے تھا اور اصل حق کو ڈھانپ چکا تھا، انسانوں پر ان کی زندگیوں میں مرضی کرنے والے شیاطین کو ساری زمین میں تسلط فراہم کرچکا تھا، انسانوں اور زندگیوں پر باطل خواہشات کو غالب کرچکا تھا، یہی وہ بدر کے دن عظیم اور فیصلہ کن معرکہ تھا جس نے حق اور حد سے متجاوز باطل کے درمیان لکیر کھینچ دی تاکہ اس کے بعد کبھی بھی کسی بھی صورت میں حق کے ساتھ باطل کا اختلاط و التباس ناممکن ہوجائے۔

[1] الأنفال 41:8.

غزوۂ بدر اسی وسیع و عمیق مفہوم کو شامل حق و باطل کے درمیان فیصلہ کن معرکہ تھا۔

غزوۂ بدر اپنی تمام تر پہنائیوں، گہرائیوں اور درازیوں کے ساتھ حق و باطل کے درمیان ''فرقان'' ہے۔ یہ معرکہ ضمیر و شعور کی اتھاہ گہرائیوں، توحید کی تمام حقیقی صورتوں، شعور کی بالیدگی، مخلوق و خالق اور خالق کی بندگی کے ساتھ ساتھ شرک کی تمام غیر حقیقی علامتوں اور صورتوں، خواہشات پرستی، بندوں اور ضمیر کی غلامی، معاملات وعلامات اور شعائر کے مقابلے میں رسوم و رواج کے درمیان واضح اور صریح حق اور باطل میں تمیز کنندہ تھا۔

یہ فرقان تھا شخصی غلامی، خواہش پرستی، رسوم پرستی، خودساختہ قوانین و عادات میں اور ان تمام امور کو اس اللہ معبودِ برحق کے لیے خالص کر دینے میں جس کے سوا کوئی معبود اور حاکم و شارع نہیں ہے۔ اس دن وہ سربلند ہوگئے جو غیر اللہ کے لیے جھکتے نہ تھے۔ اس دن وہ سرقدر و قیمت والے ہوگئے جو اللہ تعالیٰ کی حاکمیت و قانون کے علاوہ کسی کے لیے پست نہ ہوتے۔ انسانوں کے وہ گروہ جو شیاطین نے غلام بنا رکھے تھے اس دن آزاد ہوگئے۔ یہ فیصلہ کن دن تھا۔

اسلامی تحریک کی تاریخ میں یہ واقعہ ایک یادگار عہد ہے۔ یہ تاریخ ہے باہم صبر کی تلقین و رضا کی، خاص گروہ بندی و انتظار کی، قوت و تحریک اور ایک سفر کے آغاز کی، انقلابی بہاؤ اور اسلام کے زیر سایہ زندگی گزارنے کے نئے ڈھنگ کی۔ انسانیت کے لیے ایک نئے نظام کے وجود میں آنے کی، زمین میں انسانوں کی گردن سے طوقِ غلامی اتارنے کی اور خالصتاً اللہ وحدہ لاشریک کی الوہیت و حاکمیت قائم کرنے کی۔ اور یہ الوہیت پر غاصبانہ قبضہ جما رکھنے والے طاغوتوں اور شیطانوں کو مار بھگانے اور ذلت و رسوائی ان کا مقدر بنانے کی تاریخ ہے۔''[1]

سید صاحب مزید لکھتے ہیں: ''بلاشبہ غزوۂ بدر ایک اور انداز سے بھی فرقان تھا جس کا

[1] تفسیر في ظلال القرآن لسید قطب:1522,1521/3۔

اشارہ اس آیت کریمہ میں موجود ہے:

﴿وَاِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآىِٕفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ وَيُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ ۝ لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ۝﴾

''اور جب اللہ تم سے دو گروہوں میں سے ایک کا وعدہ کررہا تھا کہ یقیناً وہ تمھارے لیے ہے اور تم چاہتے تھے کہ جو غیر مسلح (تجارتی قافلہ) ہے وہی تمھارے ہاتھ لگے اور اللہ کا ارادہ یہ تھا کہ وہ اپنے فرامین کے ساتھ حق کو ثابت کردکھائے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے۔ تاکہ وہ حق کو حق کردکھائے اور باطل کو باطل کردکھائے اگرچہ مجرم لوگ (اسے) ناپسند ہی کریں۔''[1]

جو مسلمان معرکے کے لیے گئے وہ درحقیقت ابوسفیان کے تجارتی قافلے کے ارادے سے نکلے تھے۔ مگر اللہ تعالیٰ کا ارادہ یہ تھا کہ ابوسفیان کی سرکردگی میں تجارتی قافلہ (بے ہتھیار) ان سے نکل جائے اور لشکرِ ابوجہل (ہتھیار والا) سے مٹھ بھیڑ ہوجائے تاکہ جنگ، قتل اور قیدی بنانا وقوع پذیر ہو، نہ کہ قافلے پر ہاتھ ڈال کر محض غنیمت حاصل ہو اور پُر امن سفر ہو۔ ارشاد باری تعالیٰ بھی یہی ہے: ﴿لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ﴾ ''تاکہ اللہ سچ کو سچ اور باطل کو جھوٹا کردے۔''

اس میں ایک بہت بڑی حقیقت ذہن نشین کرانے کی طرف اشارہ تھا کہ معاشرے میں حق کا حق ہونا اور باطل کا باطل قرار پانا صرف حق و باطل کے متعلق استدلالی وضاحت اور استدلالی عقیدے سے حق ہونا یا باطل ہونا قرار نہیں پاجاتا بلکہ حق کا غالب ہونا اور باطل کا غلط ہونا اور دنیا سے مٹنا، باطل کی بیخ کنی اور حق کی سربلندی قائم کیے بغیر ناممکن ہے۔ یہ تمام صرف اس صورت میں ممکن ہے کہ حق پرست لشکر غالب آئیں اور فتح پائیں

[1] الأنفال 8:7,8.

اور اسی طرح باطل کا لشکر شکست خوردہ ہو اور دھتکار دیا جائے۔ یہ دین محض منفی اعتقادات اور معرفت و استدلالات کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک حقیقت پسند، متحرک اور واضح رستہ ہے۔

بلاشک وشبہ میدان میں حق واضح اور باطل غلط قرار پایا۔ اس اعتبار سے یہ عملی و فعلی مدد واقعی حق و باطل میں فرقان و فیصل تھی۔ جس کی طرف فرمانِ الٰہی نے اس واقعے کا مقصد بیان کرتے ہوئے اشارہ کیا ہے۔ اور رسول گرامی کو گھر سے حق کے ساتھ نکالنے، تجارتی قافلہ چھڑانے اور لشکر سے ملاقات کرانے میں یہی حکمت بیان کی گئی ہے۔ بلاشک وشبہ یہ سب اس دین کے واضح رستے کی تمیز و وضاحت ہے جس سے اس منہج کی اصلیت و حقیقت مسلمانوں کے شعور و احساس میں واضح ہو جاتی ہے۔

یہی فرقان ہے جس کی ضرورت ہم آج محسوس کر رہے ہیں۔ مسلمان کہلوانے والوں کے دلوں میں آج کس طرح اس کے اصل مفہوم کو پارہ پارہ کر دیا گیا ہے۔ اس سے بھی بڑی آفت یہ ہے کہ دین کی طرف بلانے والوں کے ذہن بھی معاشرتی بہاؤ کی نذر ہو گئے ہیں۔ بدر کا دن انھی گوناں گوں، متنوع، عمیق اور پھیلے ہوئے مفاہیم کے اعتبار سے یوم الفرقان تھا۔

﴿ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴾ ''اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔'' اس دن میں اللہ تعالیٰ کی قدرت شاملہ کی ایک جھلک تھی جس میں کوئی اس کے ساتھ نہ جھگڑا کھڑا کرنے والا اور نہ شک و شبہ میں پڑنے والا تھا۔ ایسی جھلک جس کا ہر کسی نے مشاہدہ کیا۔ اور اس کی ''قدرت الٰہی'' کی اس تعبیر اور تفسیر کے علاوہ کوئی تعبیر و تفسیر نہ تھی۔[1]

دوستی و دشمنی کا ضابطہ ایمان کی سمجھ بوجھ سے ہے

غزوۂ بدر نے مسلم اقوام کے لیے دوستی و دشمنی کا ایک واضح اصول متعین کر کے حق و باطل کے درمیان واضح خط کھینچ دیا ہے۔ اس اعتبار سے غزوۂ بدر روحانیت اور مادیت کے

[1] تفسیر في ظلال القرآن لسيد قطب: 3/1523، 1524.

درمیان حد فاصل تھا۔ اس نے حق و باطل میں مکمل تمیز کر دی اور ان حقائق کا عملی مشاہدہ ہوا۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے اس معیار ایمان کو دلی طور پر قبول کیا اور عملی جامہ پہنایا۔ دورِ جاہلیت کی قدریں دم توڑ گئیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اسلام کو اولیت دیتے ہوئے بیٹا باپ کے اور بھائی بھائی کے مقابل آ کھڑا ہوا۔ دوستی اور دشمنی کے اس اسلامی معیار کے چند نمونے ملاحظہ فرمائیے:

① ابو حذیفہ بن عتبہ بن ربیعہ رضی اللہ عنہ بدر کے دن مسلمانوں کی جماعت میں شامل تھے جبکہ ان کا بھائی ولید بن عتبہ، باپ عتبہ بن ربیعہ اور چچا شیبہ بن ربیعہ مشرکین کے گروہ میں تھے۔ یہ تینوں جنگ کے آغاز ہی میں انفرادی رزم آرائی میں قتل ہو گئے تھے۔

② سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ مسلمانوں کی جماعت اور ان کا بیٹا عبدالرحمٰن مشرکین مکہ کے گروہ میں تھا۔

③ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ مسلمانوں کے علمبردار تھے جبکہ ان کا بھائی ابوعزیز بن عمیر مشرکوں کے جتھے میں تھا۔ وہ ایک انصاری صحابی کے ہاتھوں قید ہوا تو حضرت مصعب رضی اللہ عنہ نے انصاری بھائی سے کہا: ''اس کی والدہ مالدار ہے، اس لیے تم اس کے عوض وافر دولت لینا۔''

ابوعزیز نے کہا: ''میرے برادر! میرے متعلق آپ کا یہ مشورہ؟'' حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''تم نہیں، یہ انصاری میرا بھائی ہے۔'' یہ محض باتیں نہیں حقائق تھے کہ ''یہ میرا بھائی ہے تم نہیں۔''[1]

یہ ہیں وہ اقدار جنھیں امت کے سامنے رکھا گیا تا کہ ان پر انسانیت کی عمارت استوار ہو۔ اس سے واضح ہوا کہ عقیدہ ہی نسب اور رشتے داری کو ملانے والا ہے اور یہی اجتماعیت کا بندھن ہے۔[2]

[1] البداية والنهاية: 307/3. [2] من معين السيرة لصالح الشامي، ص: 213.

④ بدر میں مسلمانوں کا شعار (آپس میں پہچان کا کوڈ ورڈ) ''أحد، أحد'' تھا۔ اس کا مفہوم یہ تھا کہ جنگ ایک ہی اللہ کی عبودیت کا عقیدہ اپنانے کی عملی صورت ہے۔ یہ جنگ نہ ہی عصبیت اور برادری ازم کا شاخسانہ ہے اور نہ ہی کسی دشمنی اور کینے کا نتیجہ اور نہ کوئی اور بدلہ ہی اس کا محرک بنا بلکہ صرف اللہ وحدہ لاشریک پر ایمان ہی اس کا محرک ومقصد تھا۔

مشرکین کے لشکر میں شامل مسلمانوں کا مواخذہ: ایمان کے اس وسیع مفہوم کی بنا پر مختلف اوقات میں مختلف اسالیب اختیار کیے گئے، جبکہ مقصد ایک ہی تھا۔[1] ایمان بہت زیادہ سمجھ بوجھ اور عقل و دانش کا متقاضی ہے، اس لیے جب آپ ﷺ نے مدینہ منورہ ہجرت کی تو اسی دور اندیشی کی بدولت ہر وہ مسلمان جو ہجرت کرسکتا تھا اس نے بھی مکہ مکرمہ سے ہجرت کرلی۔ اور صرف وہ مسلمان مکہ مکرمہ میں رہ گئے جنھیں قید میں رکھ کر ظلم و ستم کا نشانہ بنایا جارہا تھا۔ اور وہ ہجرت نہ کرسکتے تھے۔ ان میں سے کئی ایک بدر کے دن مشرکین کے لشکر میں شامل تھے، مثلاً: عبداللہ بن سہیل بن عمرو، حارث بن زمعہ بن اسود، ابوقیس بن فاکہ، ابوقیس بن ولید بن مغیرہ، علی بن امیہ بن خلف اور عاص بن منبّہ۔

حضرت عبداللہ بن سہیل رضی اللہ عنہ تو لشکرِ کفر سے الگ ہوکر آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوگئے اور جنگ میں شریک ہوئے اور ان صحابہ میں سے بن گئے جنھیں بدر میں شریک ہونے کا عظیم شرف حاصل ہوا۔[2]

حضرت عبداللہ بن سہیل رضی اللہ عنہ کے سوا باقی تمام ہجرت نہ کرنے والے مسلمان مشرکین کے لشکر میں شامل ہوئے اور سب کے سب قتل ہوگئے۔

علمِ کفر کے تحت قتل ہونے پر درج ذیل آیت مبارکہ نازل ہوئی:

﴿إِنَّ الَّذِينَ تَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ ظَالِمِي أَنفُسِهِمْ قَالُوا فِيمَ كُنتُمْ ۖ قَالُوا كُنَّا مُسْتَضْعَفِينَ فِي الْأَرْضِ ۚ قَالُوا أَلَمْ تَكُنْ أَرْضُ اللَّهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوا

1 من معين السيرة لصالح الشامي، ص: 213. 2 من معين السيرة لصالح الشامي، ص: 217.

فِيهَا ۚ فَأُولَٰئِكَ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ ۖ وَسَاءَتْ مَصِيرًا ○﴾

''جن لوگوں کی اس حالت میں فرشتے جان قبض کرتے ہیں کہ وہ (جان بوجھ کر کافروں میں رہ کر) اپنی جانوں پر ظلم کرتے رہے ہوں تو فرشتے پوچھتے ہیں کہ تم کس حال میں تھے؟ وہ کہتے ہیں: ''ہم زمین میں کمزور تھے۔'' تب فرشتے کہتے ہیں: ''کیا اللہ کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کر جاتے؟'' چنانچہ یہی لوگ ہیں جن کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے۔''[1]

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ کچھ مسلمان اسلام کو چھپائے ہوئے مکہ مکرمہ میں رہائش پذیر تھے۔ بدر کے دن مشرکوں نے انھیں بھی ساتھ لیا۔ ان میں سے بعض معرکے میں کام آگئے تو مسلمانوں نے کہا: ''یہ ہمارے مسلمان ساتھی تھے جنھیں کفار نے اپنے ساتھ نکلنے پر مجبور کیا۔'' تو یہ آیت نازل ہوئی۔

ان کا عذر اس لیے قبول نہیں کیا گیا کہ ان کے پاس مسلمانوں کے لشکر میں شامل ہونے کے امکانات وافر تھے اور پھر دونوں لشکروں میں کوئی زیادہ فاصلہ بھی نہ تھا۔ اور اگر وہ چاہتے تو عبد اللہ بن سہیل رضی اللہ عنہ کی طرح بآسانی مسلمانوں کے لشکر سے مل سکتے تھے۔[2]

ایمان کے کچھ تقاضے ہیں جن کی بدولت اسلام کی صداقت اور قوت کا اظہار ہوتا ہے۔ ان تقاضوں میں سے ایک یہ ہے کہ باقی تمام قدروں اور تہذیبوں سے اسے بلند مقام دیا جائے۔ اور جب ایسا ہوگا تو ایسے حامل ایمان کا بڑا مؤثر کردار ہوگا، اسے نیکی اور بھلائی کے کاموں کی قوت میسر آئے گی جس کا اللہ تعالیٰ نے ارادہ کیا ہے کیونکہ ایمان کی یہ خوبی ہے کہ مسلمان کے طرز عمل پر اس کا نمایاں رنگ ہوتا ہے، اس کے اعمال و کردار سے ایمان کی جھلک نظر آتی ہے، اس کی گفتار حتی کہ مسکراہٹ سے بھی ایمان کی عکاسی ہوتی ہے، ایک ایک ادا سے ایمان جھلکتا ہے اور اثر قبول کرنے کا جذبہ دکھائی دیتا ہے۔ یہی

[1] النسآء 4:97. [2] من معين السيرة لصالح الشامي، ص: 217.

وجہ ہے کہ مشرکوں کی صفوں میں شامل ہونے والے مسلمانوں کا عذر غیر مقبول ہوا کیونکہ جس ایمان کے وہ مدعی تھے اس کے تقاضوں سے وہ عاری تھے، اس لیے وہ ایمان کے ثمرات و نتائج سے بھی بہرہ ور نہ ہوسکے۔[1]

ایمان کے اس نظریے کی گہرائی میں اتر کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے صداقتِ ایمان کی عالی مثالیں قائم کیں، جو اس بات کی قطعی دلیل تھیں کہ انھوں نے خاندان، قبیلہ، باپ اور بیٹے کی محبت پر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی رضا کو مقدم رکھا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اس سچے طرزِ عمل پر اللہ تعالیٰ کا مدح فرمانا کوئی تعجب خیز بات نہیں۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿ لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ ؕ اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ وَاَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ ؕ وَيُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ؕ اُولٰٓئِكَ حِزْبُ اللّٰهِ ؕ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ ﴾

”(اے نبی!) آپ (ایسی) کوئی قوم نہیں پائیں گے جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہوں، کہ وہ ان سے دوستی کریں جو اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرتے ہوں، اگرچہ وہ ان کے باپ یا ان کے بیٹے یا ان کے بھائی یا ان کا کنبہ قبیلہ ہو۔ یہی لوگ ہیں کہ اللہ نے ان کے دلوں میں ایمان لکھ دیا ہے اور ان کی تائید کی ہے اپنی طرف سے ایک روح کے ساتھ اور وہ انھیں ایسی جنتوں میں داخل کرے گا کہ جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے، اللہ ان سے راضی ہے اور وہ اس سے راضی ہیں، یہی لوگ اللہ کا گروہ ہیں، جان لو! بے شک (جو) اللہ کا گروہ ہے، وہی فلاح پانے والا ہے۔“[2]

[1] من معين السيرة لصالح الشامي، ص: 218. [2] المجادلة 58:22.

بدر سے متعلقہ معجزات نبوی

بدر کے موقع پر رسول اللہ ﷺ سے کئی ایک معجزات رونما ہوئے۔ ان میں سے ایک آپ ﷺ کا غیبی امور کی خبر دینا ہے۔ اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں کہ علم غیب اللہ تعالیٰ ہی کا خاصہ ہے۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے اسے کئی ایک آیات میں صرف اپنی طرف منسوب فرمایا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ ۚ وَمَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ ۝﴾

''کہہ دیجیے: آسمانوں اور زمین میں اللہ کے سوا کوئی بھی غیب (کی بات) نہیں جانتا اور وہ (خود ساختہ معبود) تو یہ بھی نہیں جانتے کہ وہ (قبروں سے) کب اٹھائے جائیں گے۔''[1]

دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا:

﴿وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ ۚ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۚ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِيْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۝﴾

''اور اسی کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں، انھیں اس کے سوا کوئی نہیں جانتا اور وہ جانتا ہے جو کچھ خشکی اور تری میں ہے اور کوئی پتا ایسا نہیں گرتا جسے وہ جانتا نہ ہو اور زمین کے اندھیروں میں کوئی دانہ (ایسا) نہیں (پھوٹتا جسے وہ جانتا نہ ہو) اور کوئی تر چیز اور کوئی خشک چیز ایسی نہیں جو واضح کتاب میں (لکھی ہوئی) نہ ہو۔''[2]

اور یہ بات بھی مسلّمہ ہے کہ انبیاء ؊ غیب نہیں جانتے اور نہ ہی انھیں اس میں سے کسی بات کی خبر ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

[1] النمل 65:27. [2] الأنعام 59:6.

﴿قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآىِٕنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّيْ مَلَكٌ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ۭ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ۭ اَفَلَا تَتَفَكَّرُوْنَ ؀﴾

''(اے نبی!) کہہ دیجیے: میں تم سے نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ میں غیب جانتا ہوں اور نہ میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں، میں تو اسی چیز کی پیروی کرتا ہوں جو میری طرف وحی کی جاتی ہے۔ کہہ دیجیے: کیا نابینا اور بینا برابر ہو سکتے ہیں؟ پھر کیا تم غور نہیں کرتے؟'' [1]

جس طرح اس کے متعلق دلائل ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے علم غیب اپنے ہی لیے مخصوص فرمایا ہے اور کسی مخلوق کو یہ عطا نہیں فرمایا، ایسے ہی اس کے متعلق دلائل بھی وارد ہوئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق میں سے کئی ایک پیغمبروں کو مستثنیٰ کرتے ہوئے انھیں جس قدر چاہا وحی کے ذریعے سے غیبی امور کے متعلق باخبر کیا۔ اور اسے ان کے لیے معجزہ بنا دیا تاکہ وہ ان کی نبوت کی صداقت پر دلیل بن جائے۔ اس بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰي مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ ۭ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَي الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِىْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ ۖ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۚ وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَلَكُمْ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ؀﴾

''اللہ مومنوں کو اس حالت میں ہرگز نہ رہنے دے گا جس میں تم اس وقت ہو، یہاں تک کہ وہ پاک کو ناپاک سے علیحدہ کر دے اور اللہ کا یہ طریقہ نہیں کہ وہ تم پر غیب ظاہر کرے لیکن اللہ اپنے رسولوں میں سے جسے چاہتا ہے (غیب کی باتیں بتانے کے لیے) چن لیتا ہے، پس تم ایمان لاؤ، اللہ اور اس کے رسولوں پر اور اگر تم ایمان لاؤ گے اور پرہیزگاری اختیار کرو گے تو تمھارے لیے بہت بڑا اجر ہے۔'' [2]

[1] الأنعام 6:50. [2] آل عمرٰن 3:179.

دوسرے مقام پر اسی بات کو یوں بیان فرمایا:

﴿عٰلِمُ الْغَیْبِ فَلَا یُظْهِرُ عَلٰی غَیْبِهٖۤ اَحَدًا ۝ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ یَسْلُكُ مِنْۢ بَیْنِ یَدَیْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا ۝﴾

''(وہی) عالم الغیب ہے، وہ اپنا غیب کسی پر ظاہر نہیں کرتا، سوائے کسی رسول کے جسے وہ پسند کرے، پھر بے شک وہ اس (رسول) کے آگے اور پیچھے نگہبان لگا دیتا ہے۔''[1]

ہم اس کا یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک پر جو کوئی غیبی خبر کا اظہار ہوتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی وحی کی بدولت ہے جس کا مقصد نبوت و رسالت کی صداقت پر دلیل فراہم کرنا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کی اطلاع پر آپ ﷺ کی متعدد امورِ غیبیہ کی خبر دینے کی وجہ سے شہرت ہوگئی۔[2]

ان غیبی معجزات میں سے چند ایک کا ظہور غزوۂ بدر کے موقع پر یا غزوۂ بدر کے بارے میں کسی اور موقع پر ہوا تھا جو حسب ذیل ہیں:

امیہ بن خلف کے قتل کی پیشگوئی: حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ عمرہ کرنے کی غرض سے مکہ پہنچے اور امیہ بن خلف کے ہاں اترے۔ امیہ کی بھی عادت تھی کہ وہ جب کبھی شام جاتے ہوئے مدینہ سے گزرتا تو سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے ہاں ٹھہرتا۔ امیہ نے (طواف کے بارے میں) سعد رضی اللہ عنہ سے کہا: ''آپ نصف النہار تک انتظار کرلیں۔ جب لوگ بے خبر ہوجائیں گے تو آپ جا کر طواف کر لینا۔'' عین اس وقت جب حضرت سعد رضی اللہ عنہ طواف کر رہے تھے ابوجہل آ پہنچا اور کہنے لگا: ''یہ کون شخص کعبے کا طواف کر رہا ہے؟''

حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے کہا: ''سعد۔''

ابوجہل: ''محمد (ﷺ) اور اس کے ساتھیوں کو جگہ دے کر بے خوف کعبے کا طواف کر رہے ہو؟''

---

[1] الجنّ 72:26، 27. [2] نضرة النعيم:1/453.

سعد رضی اللہ عنہ: ''ہاں۔''

پھر دونوں آپس میں ایک دوسرے کو برا بھلا کہنے لگے۔ اسی اثنا میں امیہ نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ سے کہا: ''ابوالحکم سے آواز بلند نہ کرو، وہ اس وادی کا سردار ہے۔''

حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے کہا: ''اگر تم مجھے کعبے سے روکو گے تو میں ملک شام سے تمھاری تجارت (کا راستہ) روک دوں گا۔''

اتنے میں امیہ نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو پکڑ لیا اور کہنے لگا: ''آواز پست رکھو۔''

حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو غصہ آگیا اور وہ کہنے لگے: ''امیہ بس کر۔ میں نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے کہ وہ تجھے قتل کریں گے۔''

امیہ: ''مجھے؟'' سعد رضی اللہ عنہ: ''ہاں۔''

امیہ: ''اللہ کی قسم! محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جب بات کرتا ہے تو جھوٹ نہیں بولتا۔''

امیہ فوراً بیوی سے جا کر کہنے لگا: ''تمھیں معلوم ہے میرے یثربی بھائی (سعد رضی اللہ عنہ) نے کیا کہا؟''

بیوی: ''کیا کہا ہے؟''

امیہ: ''اس کا کہنا ہے کہ اس نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو یہ کہتے سنا ہے کہ وہ مجھے قتل کردے گا۔''

بیوی: ''اللہ کی قسم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کبھی جھوٹ نہیں بولتا!''

راوی کا کہنا ہے کہ جب مکہ میں اعلان عام ہوا اور لوگ بدر کی طرف چلنے لگے تو امیہ کی بیوی نے کہا: ''آپ کو اپنے یثربی بھائی کی بات یاد ہے؟'' تو (یہ سوچ کر) امیہ نے جنگ سے پیچھے رہنے کا ارادہ کرلیا۔ ابوجہل اس سے کہنے لگا: ''تم یہاں کے سردار ہو، لہٰذا ایک دو دن ہمارے ساتھ چلو۔'' وہ دو دن کے لیے ساتھ ہولیا تو اللہ تعالیٰ نے (بدر میں) اسے ہلاک کردیا۔[1]

[1] صحيح البخاري، حديث:3632.

سرکشوں کے مقتل کی نشاندہی: حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم مکہ و مدینہ کے درمیان حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ جا رہے تھے اس دوران ہم چاند دیکھنے لگے۔ میری نگاہ تیز تھی، لہٰذا میں نے چاند دیکھ لیا۔ میرے سوا کسی کو نظر نہ آیا۔ میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے عرض کرنے لگا: ''آپ چاند کو نہیں دیکھ پا رہے؟'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسے دیکھ ہی نہیں رہے تھے۔ بلکہ انھوں نے یہ کہا: ''(اسے دیکھنا اب کونسا ضروری ہے بعد میں کبھی) اپنے بستر پر سیدھا لیٹ کر اسے دیکھ لوں گا۔'' بعد ازاں وہ اہل بدر کے متعلق ہمیں بتانے لگے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ بدر سے ایک دن پہلے ہمیں جنگ کا ایندھن بننے والے کفار کی قتل گاہوں سے آگاہ کر دیا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے:

«هٰذَا مَصْرَعُ فُلَانٍ غَدًا إِنْ شَاءَ اللّٰهُ»

''کل ان شاء اللہ یہاں فلاں شخص قتل ہو کر گرے گا۔''

پھر عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''اللہ کی قسم! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو نشاندہی فرمائی تھی مشرکین ان سے ذرا بھی ادھر ادھر نہ گرے۔''[1]

سیدنا عباس رضی اللہ عنہ کو ان کے مدفون مال کی اطلاع: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ سے فدیے کا تقاضا کیا تو عباس رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! میرے پاس تو رقم نہیں ہے۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا:

«أَيْنَ الْمَالُ الَّذِي دَفَنْتَهُ أَنْتَ وَأُمُّ الْفَضْلِ فَقُلْتَ لَهَا: إِنْ أُصِبْتُ فِي سَفَرِي هٰذَا، فَهٰذَا الْمَالُ الَّذِي دَفَنْتُهُ لِبَنِيَّ الْفَضْلِ وَ عَبْدِ اللّٰهِ وَ قُثَمَ؟»

''کہاں گیا وہ مال جو تم نے اور ام الفضل نے زمین میں دبایا تھا اور تم نے ام الفضل سے کہا تھا: ''اس سفر میں اگر میں مارا جاؤں تو یہ مال جو میں نے دفن کیا ہے میرے بیٹوں فضل، عبداللہ اور قثم کے لیے ہے۔''

[1] صحیح مسلم، حدیث: 2873.

عباس رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ''اللہ کی قسم! اے اللہ کے رسول! مجھے یقین آ گیا کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔ اس دفن شدہ مال کا میرے اور ام الفضل کے سوا کسی کو علم نہ تھا۔''[1]

عمیر بن وہب کو اس کے بُرے ارادے کی اطلاع: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمیر بن وہب کو اس وقت اطلاع دی جب وہ یہ ظاہر کر رہا تھا کہ وہ بارگاہِ رسالت میں اپنے بیٹے کی رہائی کے لیے آیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اس کی سازش کی مکمل تفصیل بتا دی۔ اور یہی اطلاع اس کے اسلام اور سچے ایمان کا سبب بن گئی۔[2]

کچھ دیگر معجزات: امام ابن قیم رحمہ اللہ نے زاد المعاد میں ذکر کیا ہے کہ بدر کے دن عکاشہ بن محصن رضی اللہ عنہ کی تلوار ٹوٹ گئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں لکڑی کی ایک چھڑی مرحمت فرمائی اور کہا: «دُونَكَ هٰذَا» ''اسے اچھی طرح پکڑ لو۔''

عکاشہ رضی اللہ عنہ نے جب اسے مضبوطی سے پکڑ کر لہرایا تو یہ لکڑی ان کے ہاتھ میں ایک طویل اور انتہائی چمکدار تلوار کی شکل اختیار کر گئی۔ یہ تلوار ان کے پاس رہی اور وہ اس سے جنگیں کرتے رہے یہاں تک کہ وہ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں فتنۂ ارتداد میں شہید ہو گئے۔[3]

رفاعہ بن رافع رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ بدر کے دن مجھے تیر آ لگا جس سے میری آنکھ زخمی ہو گئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں لعاب مبارک ڈالا اور دعا فرمائی تو مجھے اس تیر سے ذرہ برابر بھی تکلیف نہ ہوئی۔[4]

ڈاکٹر ابوشہبہ کہتے ہیں: ''یہ خیال مناسب نہیں کہ قرآن پاک کے بعد حسی معجزات کی اب ضرورت نہیں۔ کیونکہ معجزات کے واضح اثرات نظر آ رہے ہیں۔ کچھ لوگ تو ان کا مشاہدہ کر کے ایمان کی دولت سے آراستہ ہوتے ہیں تو کچھ کا ایمان قوت و استحکام سے

---

1 دلائل النبوة للبيهقي:143,142/3، و مسند أحمد:353/1، و فتح الباري شرح الحديث: 4018. 2 المعجم الكبير للطبراني:58/17، و مجمع الزوائد:286/8، و السيرة النبوية لأبي شهبة: 178/2. 3 زاد المعاد:186/3. محقق کے بقول یہ واقعہ ابن اسحاق نے بلاسند ذکر کیا ہے، دیکھیے: السيرة النبوية لابن هشام:637/2. 4 زاد المعاد:186/3.

مالا مال ہوتا ہے۔ ان معجزات سے یہ عقیدہ بھی پختہ ہوگیا کہ رسول اللہ ﷺ برحق پیغمبر ہیں جن کی طرف وحی آتی تھی۔ آپ ﷺ نے ایسے غیبی امور کی اطلاع دی جن کی اطلاع آسمانی وحی کے بغیر ناممکن تھی۔

کسی شخص کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی لکڑی یا کھجور کی چھڑی کا قاطع تلوار بن جانا اس کے ایمان و یقین میں کتنا بڑا انقلاب بپا کر دے گا! وہ کسی تردد اور بزدلی کے بغیر جہاد کرے گا اور اس کی مکمل چاہت ہوگی کہ وہ اس خلاف عادت تلوار کو لے کر میدانِ جنگ میں کود پڑے اور اس دور کے لوگوں اور بعد میں آنے والوں کے لیے ایک مثال اور یادگار بن جائے۔ (یہ معجزات کا کوئی کم فائدہ و حکمت نہیں ہے۔)[1]

مشرک سے تعاون لینے کا حکم

بدر کا معرکہ شروع ہونے سے قبل کے واقعات میں یہ بھی تھا کہ ایک مشرک نے مسلمان لشکر کے ساتھ ملنا چاہا اور رسول اللہ ﷺ سے موافقت طلب کی کہ آپ ﷺ جس مہم پر جا رہے ہیں میں بھی اس میں شریک ہو جاؤں؟ ارشاد ہوا:

«اِرْجِعْ فَلَنْ أَسْتَعِينَ بِمُشْرِكٍ»

''واپس ہو جاؤ میں ہرگز مشرک سے مدد نہ لوں گا۔''[2]

حدیث نے یہ بات واضح کردی ہے کہ شرعی اصول اور قاعدہ یہی ہے کہ عمومی معاملات میں مشرک سے تعاون لینا جائز نہیں لیکن اس قاعدے کا ایک استثنائی پہلو بھی ہے کہ معینہ شروط کے تحت غیر مسلم سے تعاون لینا درست ہے۔ جس کی تفصیل یہ ہے:

غیر مسلم سے استعانت اس صورت میں درست ہے جب کوئی مصلحت پیش نظر ہو یا کم از کم مصلحت کے امکانات پائے جاتے ہوں۔ لیکن یہ بات یاد رہے کہ یہ استعانت اسلامی

[1] السيرة النبوية لأبي شهبة: 178/2. [2] صحيح مسلم، حديث: 1817.

دعوت اور اس کی معنویات پر اثر انداز نہ ہو۔ اسی طرح جس سے معاونت مطلوب ہو وہ مکمل طور پر قابل اعتماد ہو، پھر وہ اسلامی قیادت کے تابع ہو نہ کہ اس کی تابع داری کی جارہی ہو۔ وہ مسلمان قیادت کے تحت ہو نہ کہ قائد ہو۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اس استعانت سے مسلمانوں میں شبہات نہ جنم لے رہے ہوں۔ اور جس سے مدد لی جارہی ہو اور جو مدد مطلوب ہو اس کی واقعی ضرورت محسوس کی جارہی ہو۔ یہ جملہ شروط موجود ہوں تو استثنائی صورت میں غیر مسلم سے مدد لی جاسکتی ہے۔ بصورت دیگر نہیں۔ اس اصول کی روشنی میں رسول اللہ ﷺ نے قریش کے تجارتی قافلے کی طرف سفر کے دوران مسلمانوں کے ساتھ مشرک کی شمولیت کو ٹھکرا دیا، جبکہ مذکورہ استثنائی صورت اور اس کی شروط کی موجودگی میں رسول اللہ ﷺ نے ایک مشرک گائیڈ عبداللہ بن اُریقط سے مدد لی تھی۔ اسے آپ ﷺ اور ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ہجرت مدینہ کے وقت اجرت پر ساتھ لیا تھا تاکہ مدینہ کا راستہ بتائے۔

اس استثنائی صورت اور شروط کے پائے جانے کی صورت میں آپ ﷺ نے اپنے چچا ابوطالب کی تحفظ فراہم کرنے کی پیشکش کو قبول فرمایا، جیسا کہ آپ ﷺ نے طائف سے واپسی پر مطعم بن عدی کے امان کی پیشکش قبول فرمائی۔ اسی طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی ان مشرکوں کی امان قبول کی تھی جو انھیں تکلیف پہنچانے والوں سے تحفظ فراہم کرتے تھے۔[1]

زندگی کے کسی بھی موقع پر اس قاعدے کو اپنی تمام شرطوں سمیت عملی جامہ پہنانے کے لیے گہری سمجھ بوجھ اور راسخ ایمان کی ضرورت ہے۔

ایفائے عہد اور جذبات کی قدر

حذیفہ رضی اللہ عنہ اور ان کے والد گرامی یمان رضی اللہ عنہ کا وعدہ: حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ہم بدر میں صرف اس لیے شریک نہ ہوسکے کہ میں اور میرے والد گرامی

[1] المستفاد من قصص القرآن لعبد الکریم زیدان: 2/144، 145.

رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونے کے لیے آ رہے تھے۔ راستے میں ہمیں کفار مکہ نے پکڑ لیا اور کہنے لگے: ''تم محمد (ﷺ) کا قصد کیے ہوئے ہو!'' ہم نے کہا: ''ان کے پاس نہیں مدینہ جانا چاہتے ہیں۔'' انھوں نے ہم سے اللہ تعالیٰ کا عہد لے لیا کہ مدینہ جانا اور محمد (ﷺ) کے ساتھ مل کر جنگ نہ کرنا۔ ہم کفار مکہ سے آگے آگے چلے آئے اور آپ ﷺ کی خدمت میں حاضری دی اور اپنی اور مشرکوں کی گفتگو آپ ﷺ کے سامنے رکھ کر آپ ﷺ کی رائے طلب کی۔

آپ ﷺ نے فرمایا: «نَسْتَعِينُ اللّٰهَ عَلَيْهِمْ، وَ نَفِي بِعَهْدِهِمْ» ''ہم ان کے خلاف اللہ تعالیٰ کی مدد کے خواستگار ہیں اور ان کا عہد پورا کرتے ہیں۔'' پھر ہم مدینہ کی جانب چل دیے۔ یہ ہے وہ سبب جس نے ہمیں بدر میں حاضری سے روک دیا۔[1]

یہ ایفائے عہد کی ایک درخشندہ مثال ہے۔ رسول اللہ ﷺ عہد کی پاسداری کا انتہائی خیال فرماتے۔ اور اسی اخلاقِ عالیہ پر اپنے ساتھیوں کی تربیت فرماتے، خواہ اس میں مسلمانوں کو نقصان اٹھانا پڑے اور اپنے ہی بعض مجاہدین کو جنگ میں شمولیت سے محروم رہنا پڑے۔

سیدنا اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ کے جذبات: غزوۂ بدر کے بعد جب رسول اللہ ﷺ مدینہ منورہ واپس تشریف لا رہے تھے تو ''روحاء'' مقام پر مختلف قبائل کے نمائندے فتح کی مبارک باد دینے کے لیے آپ ﷺ سے ملے تو اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! حمد و ستائش اس ذات الٰہی کے لیے ہے جس نے آپ کو فتح سے ہمکنار کیا اور آپ کی آنکھیں ٹھنڈی فرمائیں۔ اللہ کی قسم! اے اللہ کے رسول! میں اس لیے آپ سے پیچھے نہ رہا کہ آپ دشمن سے جنگ کریں گے بلکہ اس لیے پیچھے رہ گیا کہ میرا خیال تھا کہ بس آپ کا ارادہ تجارتی قافلے ہی کا ہے اور اگر میرے وہم میں بھی ہوتا کہ دشمن (سے مقابلہ) ہے تو ہرگز پیچھے نہ رہتا۔''

[1] المستدرك للحاكم: 202,201/3.

آپ ﷺ نے فرمایا: «صَدَقْتَ» ''تم نے سچ کہا۔''[1]

بدر کی ابلاغی جنگ (میڈیا وار)

حضرت حسان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

فَمَا نَخْشَى بِحَوْلِ اللّٰهِ قَوْمًا   وَإِنْ كَثُرُوا وَأَجْمَعَتِ الزُّحُوفُ

إِذَا مَا أَلَّبُوا جَمْعًا عَلَيْنَا   كَفَانَا حَدَّهُمْ رَبٌّ رَؤُوفُ

سَمَوْنَا يَوْمَ بَدْرٍ بِالْعَوَالِي   سِرَاعًا مَّا تُضَعْضِعُنَا الْحُتُوفُ

فَلَمْ تَرَ عُصْبَةً فِي النَّاسِ أَنْكٰى   لِمَنْ عَادُوا إِذَا لَقِحَتْ كُشُوفُ

وَلٰكِنَّا تَوَكَّلْنَا وَقُلْنَا   مَآثِرُنَا وَمَعْقِلُنَا السُّيُوفُ

لَقِينَاهُمْ بِهَا لَمَّا سَمَوْنَا   وَنَحْنُ عِصَابَةٌ وَّهُمْ أُلُوفُ

''اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہم کسی قوم سے نہیں ڈرتے اگرچہ وہ زیادہ ہوں اور ان کے لشکر جمع ہوں۔

جب کسی گروہ کو انھوں نے ہمارے خلاف ابھارا تو مہربان پروردگار ہمارے لیے ان کے غیظ و غضب کے مقابلے میں کافی ہو گیا۔

ہم بدر کے دن بلند سے بلند نیزے لے کر تیزی سے چھا گئے اس حالت میں کہ اموات ہمیں کمزور نہ کر سکیں۔

جب خواہش نہ رکھنے والی اونٹنی حاملہ ہو گئی (ان کی مرضی کے خلاف نتیجہ نکلا) تو جن لوگوں سے انھوں نے دشمنی کی تھی وہ اتنے مقہور و مغلوب ہوئے کہ تو نے اتنا مقہور کسی کو نہ دیکھا ہو گا۔

[1] دلائل النبوة للبيهقي: 33/3، و البداية والنهاية: 305/3.

اور ہم نے اللہ تعالیٰ پر بھروسا کیا اور کہا: ''ہمارے قابل تعریف کام اور ہماری پناہ گاہ تلواریں ہیں۔''

جب ہم نے انھیں دور سے دیکھا تو ان سے مقابلہ کیا، حالانکہ ہم ایک چھوٹی سی جماعت اور وہ ہزاروں تھے۔''[1]

حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

وَمَا حَامَتْ فَوَارِسُكُمْ بِبَدْرٍ ... وَّلَا صَبَرُوا بِهٖ عِنْدَ اللِّقَاءِ

وَرَدْنَاهُ بِنُورِ اللّٰهِ يَجْلُو ... دُجَى الظَّلْمَاءِ عَنَّا وَالْغِطَاءِ

رَسُولُ اللّٰهِ يَقْدُمُنَا بِأَمْرٍ ... مِّنْ أَمْرِ اللّٰهِ أُحْكِمَ بِالْقَضَاءِ

فَمَا ظَفِرَتْ فَوَارِسُكُمْ بِبَدْرٍ ... وَمَا رَجَعُوا إِلَيْكُمْ بِالسَّوَاءِ

فَلَا تَعْجَلْ أَبَا سُفْيَانَ وَارْقُبْ ... جِيَادَ الْخَيْلِ تَطْلُعُ مِنْ كَدَاءِ

بِنَصْرِ اللّٰهِ رُوحُ الْقُدُسِ فِيهَا ... وَمِيكَالُ، فَيَا طِيبَ الْمَلَاءِ

''اور بدر میں تمھارے سواروں نے تمھاری کوئی مدد نہ کی اور نہ جنگ کے وقت وہ ڈٹ کر دشمن سے لڑ سکے۔

ہم وہاں اللہ تعالیٰ کے نور کے ساتھ پہنچے جو اندھیری رات کی تاریکی اور پردے دور کر رہا تھا۔

اللہ تعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہمارے آگے چل رہے تھے جن کا فیصلہ مستحکم کر دیا گیا تھا۔

تمھارے سواروں نے بدر میں نہ فتح پائی اور نہ تمھاری جانب صحیح و سالم واپس ہوئے۔

ابوسفیان! جلدی نہ کرو بلکہ کداء مقام سے بہترین گھوڑوں کے چڑھ آنے کا انتظار کرو!

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 3/26.

وہ سوار اللہ تعالیٰ کی مدد ساتھ لیے ہوئے ہوں گے ان میں روح القدس اور میکائیل بھی ہوں گے۔ غرض یہ کیسی بہترین جماعت ہے!''[1]

رسول اللہ ﷺ مسلسل شعرائے اسلام کو ابھارتے کہ وہ اشعار سے مسلمانوں کا دفاع کریں اور دشمن کو مرعوب کرنے کا فریضہ انجام دیں۔ عرب دنیا میں شعر میڈیائی جنگ کا ایک موثر ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔ شعر ہی کئی اقوام کی بلندی اور کئی کی پستی کا سبب بن جاتا۔ جنگوں کی آگ جلانا بجھانا اسی کی بدولت عام تھا۔[2]

میڈیا وار کی چنگاریاں تو ہجرت کے ساتھ ہی بھڑک اٹھی تھیں لیکن غزوۂ بدر سے قبل چھوٹے چھوٹے فوجی دستوں کی روانگی کے ساتھ ساتھ اس میں بھی تیزی آتی گئی۔ اور بدر کے بعد تو یہ لاوے کی طرح پھوٹ پڑی۔

دونوں کے پڑوس میں واقع قبائل فریقین کے مابین میڈیا وار کا اہم ہدف تھے۔ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کی طرف آنے جانے والے قافلوں کے ساتھ یہ قصائد بھی بڑی تیزی سے فریقین کے پاس پہنچتے اور فریق مخالف کی طرف سے فوراً جواب آجاتا۔ فتح پر فاتح گروہ کے اشعار اور مفتوح کے مرثیے زور پکڑتے۔ مسلمانوں میں کعب بن مالک رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ جیسے ماہر شعراء، جبکہ کفار پر کوہِ گراں بن کر گرنے والے شاعر حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ بھی موجود تھے۔[3]

---

1 السيرة النبوية لابن هشام: 30/3. 2 التاريخ الإسلامي للحميدي: 199/4. 3 المنهج الحركي للسيرة النبوية للدكتور الغضبان، ص: 355,354.

حصہ 11

غزوۂ بدر سے غزوۂ احد تک

وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ حَتّٰٓى اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ

”اور تحقیق سچا کر دکھایا تم سے اللہ نے اپنا وعدہ جب کاٹتے تھے تم ان کو ساتھ اس کے حکم کے یہاں تک کہ جب تم پست ہمت ہو گئے اور باہم جھگڑا کیا تم نے حکم (رسول) میں اور نافرمانی کی تم نے بعد اس کے کہ دکھلایا اس نے تم کو وہ جسے تم پسند کرتے تھے۔“

(آل عمران 3:152)

إِنْ رَأَيْتُمُونَا تَخْطَفُنَا الطَّيْرُ، فَلَا تَبْرَحُوا مَكَانَكُمْ هٰذَا حَتّٰى أُرْسِلَ إِلَيْكُمْ، وَإِنْ رَأَيْتُمُونَا هَزَمْنَا الْقَوْمَ وَأَوْطَأْنَاهُمْ فَلَا تَبْرَحُوا حَتّٰى أُرْسِلَ إِلَيْكُمْ

”اگر تم دیکھو کہ پرندے ہمیں اچک رہے ہیں تو بھی اپنی جگہ نہ چھوڑنا یہاں تک کہ میں تمھیں بلا بھیجوں اور اگر تم دیکھو کہ ہم نے دشمن کو شکست دے دی ہے اور انھیں کچل دیا ہے تو بھی میرا پیغام آنے تک وہیں رہنا۔“

(صحیح البخاری، حدیث:3039)

باب 1

بدر اور احد کے مابین رونما ہونے والے اہم واقعات

غزوۂ بدر میں کامیابی سے جزیرہ نمائے عرب کی وسعتوں میں مسلمانوں کی مایۂ ناز جنگی ہیبت پھیل گئی۔ کمزور مشرکین خطرہ محسوس کرنے لگے۔ جبکہ طاقتور مشرک بھی اسلام کے غلبے کو محسوس کر رہے تھے۔ عام دلوں میں اسلام کی طرف رغبت پیدا ہوگئی اور اسلام میں داخل ہونے والوں کا دائرہ وسیع ہونے لگا۔ بہت سے لوگوں نے چاہا کہ ہم نفاق یا دھوکے سے اسلام میں داخل ہو جائیں۔ ان احوال میں یہ نئی اسلامی حکومت مکر و فریب اور دشمنوں کے باہمی اکٹھ اور ریشہ دوانیوں کی زد میں آگئی۔ لیکن اس کے بالمقابل اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت اور اس کے بعد حکومت کی چاک و چوبند تحفظ پالیسی نے اسلام دشمنوں کے تمام داؤ پیچ ناکام بنا دیے۔[1]

بدر و احد کے مابین رسول اللہ ﷺ کی زیر قیادت ہونے والے غزوات درج ذیل ہیں:

غزوۂ ماء الکدر

ماء الکدر نجد میں بنوسُلیم کے ایک چشمے کا نام ہے۔ غزوۂ بدر سے مدینہ واپسی کے سات دن بعد رسول اللہ ﷺ اس جنگی مہم پر روانہ ہوئے۔ بنوسلیم کے علاقے میں ''ماء الکدر'' پر پہنچے۔ آپ ﷺ بنوسلیم کے ارادے سے وہاں گئے مگر جنگ کی نوبت نہ آئی۔ آپ ﷺ اس چشمے پر تین دن تک فروکش رہے اور پھر مدینہ منورہ تشریف لے آئے۔[2]

1 الأساس في السنة لسعيد حوّى: 512/1. 2 نضرة النعيم: 296/1.

اس غزوے کا سبب یہ تھا کہ جنگ بدر کے فوراً بعد بنو سلیم کے جنگجو اکٹھے ہو کر مسلمانوں پر چڑھائی کا پروگرام بنا رہے تھے لیکن رسول اللہ ﷺ غیر متوقع طور پر تیز رفتاری سے اچانک وہاں پہنچ گئے تو بنو سلیم بھاگ کھڑے ہوئے اور پہاڑوں میں بکھر گئے۔ ''یسار'' نامی چرواہے کے پاس ان کے اونٹ تھے۔ آپ ﷺ نے اونٹ بمع چرواہا ساتھ لیے اور مدینہ منورہ سے تین میل پہلے ''صرار'' مقام پر پہنچ کر یہ اونٹ، جن کی تعداد پانچ سو تھی، اپنے ساتھیوں میں تقسیم فرما دیے۔ ہر ایک کو دو دو اونٹ ملے جبکہ آپ ﷺ نے غنیمت کا پانچواں حصہ لیا اور یسار چرواہا بھی آپ کے حصے میں آیا لیکن بعد ازاں آپ ﷺ نے اسے آزاد کر دیا۔ [1]

غزوۂ سویق

ابوسفیان دو سو جنگجو لے کر نجد کے راستے رات کے وقت یہودِ بنونضیر کے پاس پہنچا۔ بنونضیر کے سردار سلام بن مِشکم نے ان کا استقبال کیا۔ انھیں کھلایا پلایا اور مسلمانوں کے راز افشا کیے، پھر ان کے ساتھ مل کر مسلمانوں کو ایذا رسانی پہنچانے کے بارے میں مذاکرات کیے۔ اور ان مذاکرات کے نتیجے میں ابوسفیان مدینہ منورہ سے قریب ''عُرَیض'' [2] کی جانب حملے کے لیے چل نکلا۔ یہاں اس نے دو آدمی قتل کیے، کھجور کے کچھ درخت جلائے اور دوڑتا ہوا واپس مکہ جا پہنچا۔ رسول اللہ ﷺ نے انصار و مہاجرین کے دو سو افراد پر مشتمل دستے کے ساتھ اس کا تعاقب کیا مگر ابوسفیان ساتھیوں سمیت انتہائی تیزی سے بھاگ گیا، اس طرح ابوسفیان اور اس کے ساتھی آپ ﷺ کے ہاتھ نہ لگ سکے۔ وہ بھاگتے ہوئے اپنا ساز و سامان اور وہ ستو بھی راستے میں گراتے جا رہے تھے جو وہ کھانے کے لیے ساتھ لائے تھے۔ مسلمان ان کا تعاقب کرتے ہوئے ستو کے یہ تھیلے جمع کرتے

[1] التاريخ السياسي والعسكري للدكتور علي المعطي، ص: 277. [2] عریض: حرۂ واقم کی طرف مدینہ منورہ کی ایک وادی ہے۔

رہے اور کافی مقدار میں ستو ساتھ لے آئے۔ اس بنا پر اس غزوے کا نام ہی ''غزوۂ سویق'' (ستو والا غزوہ) پڑ گیا۔ آپ ﷺ جنگ کیے بغیر واپس تشریف لے آئے۔ اس مہم کا مکمل دورانیہ 5 دن پر مشتمل تھا۔[1]

غزوۂ ذی امر

رسول اللہ ﷺ کو اپنے خبر رساں افراد کی طرف سے یہ اطلاعات موصول ہوئیں کہ ثعلبہ اور محارب قبیلے کے کچھ لوگ دُعثور بن حارث محاربی کی قیادت میں ذی امر جگہ میں اکٹھے ہوئے ہیں اور وہ رسول اللہ ﷺ سے جنگ اور مدینہ منورہ پر حملہ آور ہونا چاہتے ہیں۔ آپ ﷺ نے مدینہ منورہ پر سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو اپنا نائب مقرر کیا اور چار سو پچاس سواروں اور پیادہ افراد کے ساتھ اس سفر کا آغاز کیا۔ آپ کو ذی القصہ مقام پر بنو ثعلبہ کا ایک آدمی ''جُبار'' ملا جو در پردہ مسلمان تھا اور اپنی قوم کے راز آپ ﷺ کو پہنچایا کرتا تھا، یہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہولیا تاکہ دین کے معاملات سمجھ سکے۔[2]

دونوں قبائل کے مشرکین کو جب مسلمانوں کی آمد کا علم ہوا تو وہ پہاڑوں کی چوٹیوں پر بھاگ گئے۔ آپ ﷺ وہاں نجد میں تقریباً ایک ماہ رہے لیکن کسی جانب سے بھی دشمن کو کسی جنگی یا مشکوک سرگرمی میں ملوث نہ پایا تو مدینہ منورہ لوٹ آئے۔[3]

اس غزوے میں رسول اللہ ﷺ کے ہاتھوں معجزے کا ظہور دیکھ کر ایک قابل قدر سردار دُعثور بن حارث مسلمان ہوا۔ دعثور بن حارث رضی اللہ عنہ کے قبولِ اسلام کا واقعہ اس طرح ہے کہ اس غزوے میں سخت بارش ہوئی۔ رسول اللہ ﷺ کے کپڑے بھیگ گئے۔ آپ ﷺ نے ایک درخت تلے اتر کر کپڑے خشک کرنے کے لیے پھیلا دیے۔ اسی دوران دعثور اپنی

1 السيرة النبوية لابن هشام: 51/3، و التاريخ السياسي والعسكري للدكتور علي المعطي، ص: 279,278. 2 البداية والنهاية: 3/4، والتاريخ السياسي والعسكري للدكتور علي المعطي، ص: 279. 3 التاريخ السياسي والعسكري للدكتور علي المعطي، ص: 279.

تلوار لیے آپ ﷺ کے پاس ایسی حالت میں پہنچا کہ آپ اکیلے تھے، اور کہنے لگا: ''اے محمد (ﷺ)! آج تجھے مجھ سے کون بچائے گا؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ'' اور ساتھ ہی جبریل امین نے اس کے سینے کو دھکیلا تو اس کے ہاتھ سے تلوار گر گئی، تب آپ نے اس تلوار کو پکڑا اور فرمایا: «مَنْ يَّمْنَعُكَ مِنِّي» ''تجھے مجھ سے کون بچائے گا؟'' اس نے کہا: ''کوئی نہیں «وَ أَنَا أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، وَ أَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُولُ اللّٰهِ»'' اور میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔'' اللہ کی قسم! میں آپ کے خلاف کبھی کوئی گروہ اکٹھا نہ کروں گا۔'' آپ ﷺ نے اس کی تلوار اسے دے دی۔ اس واقعے کے بعد جب وہ اپنے ساتھیوں کی طرف لوٹا تو انھوں نے کہا: ''تو ہلاک ہو! کیا ہوا تجھے؟'' وہ بولا: ''میں نے ایک طویل القامت آدمی دیکھا اس نے مجھے سینے سے دھکیلا تو میں سرین کے بل گر پڑا۔ میں نے پہچان لیا کہ یہ فرشتہ ہے اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ اللہ کی قسم! میں کبھی آپ ﷺ کے خلاف کوئی گروہ اکٹھا نہ کروں گا۔'' بعدازاں وہ اپنی قوم کو اسلام کی طرف دعوت دینے لگا۔[1]

اس واقعے کے پس منظر میں حسبِ ذیل فرمانِ باری تعالیٰ نازل ہوا:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ هَمَّ قَوْمٌ اَنْ يَّبْسُطُوْۤا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ فَكَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ ۚ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ۠﴾

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اپنے اوپر اللہ کی نعمت یاد کرو، جب ایک قوم نے ارادہ کیا تھا کہ تمھاری طرف اپنے ہاتھ بڑھائیں تو اللہ نے انھیں تم پر ہاتھ ڈالنے سے روک دیا اور اللہ سے ڈرو اور ایمان والوں کو چاہیے کہ اللہ ہی پر بھروسا کریں۔''[2]

---

[1] البداية والنهاية: 3/4، و صحيح البخاري، حديث:4136,4135. اس کا آخری حصہ فتح الباری میں ہے۔ اس آیت کا شان نزول تفسیر ابن کثیر میں بھی ہے۔ [2] المآئدة 11:5.

غزوۂ بَحران

یہ غزوہ جمادی الأولی 3 ھ میں وقوع پذیر ہوا۔ رسول اللہ ﷺ تین سو مسلمانوں کا لشکر لے کر نکلے اور مکہ و مدینہ کے راستے میں مقام ''بحران'' [1] پہنچے۔ آپ ﷺ بنو سلیم سے جنگ کرنا چاہتے تھے مگر وہ بکھر چکے تھے، لہٰذا آپ ﷺ مدینہ منورہ سے دس دن باہر رہنے کے بعد واپس تشریف لے آئے۔ [2]

ان غزوات سے یہ بات ہمارے سامنے آتی ہے کہ اسلامی قیادت دشمن کی سرگرمیوں پر نظر رکھنے، ان کی استعداد سے آگاہ رہنے، ان کے منصوبوں سے باخبر رہنے اور ان کی نقل و حرکت کی کڑی نگرانی کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتی تھی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ اس نئی اسلامی حکومت کے خلاف اٹھنے والے عناصر کو ایک خطرہ بننے اور باہم متحد ہونے سے قبل ہی پارہ پارہ کر دیا جائے۔

وسیع و عریض صحرا میں یہ غزوات گویا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے جنگی مشقیں تھیں جنھیں نبی مکرم ﷺ جیسے سپہ سالار کی سعادت حاصل تھی۔ یہ عملی، تربیتی اور جنگی مشقیں مسلسل جاری رہتی تھیں جن کا دورانیہ پانچ دن سے ایک ماہ تک ہوتا تھا۔ ان میں معاشرتی اور قومی زندگی کے لیے اسباق، لشکر کو سمع و اطاعت کا جذبہ اور بڑی ماہرانہ تربیت فراہم کی جاتی تھی۔ اسی سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم باطل کا سر کچلنے اور حق کو غالب کرنے کے نت نئے تجربے حاصل کرتے رہتے تھے۔

رسول اللہ ﷺ ساتھیوں کی میدانِ کارزار میں اترنے کی تربیت کے ساتھ ساتھ دلوں کو جلا بخشنے، شعور کو بیدار کرنے اور اخلاق سنوارنے والی مسجد نبوی میں قائم کردہ تربیتی نشستوں کی طرف بھرپور توجہ دیتے تھے۔ اور یہ عظیم مربی کی موجودگی کا لازمی حصہ ہوتا ہے۔

---

[1] بحران: اسے ''باء'' پر زبر یا پیش دونوں طرح سے پڑھا گیا ہے۔ [2] المجتمع المدني للدكتور العمري، ص:61، و التاريخ السياسي والعسكري للدكتور علي المعطي، ص:280.

خشوع وخضوع سے اللہ تعالیٰ کی عبادت اور عملی نمونہ ہونے کے اعتبار سے آپ ﷺ کی تعلیمات معاشرے میں روشنی کی طرح پھیل رہی تھیں۔ آپ کے اس طریقۂ کار نے مسجد کی تربیتی حیثیت اور مضبوط جنگی مشقوں کی اہمیت کو یکجا کر دیا تاکہ یہ نیا معاشرہ مضبوط اور سیسہ پلائی دیوار کی طرح قوی بن کر نئے تجربات حاصل کر کے چہار دانگِ عالم میں اسلام کا ڈنکا بجا سکے۔[1]

حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہما کی قیادت میں ''قَردہ'' کی طرف مہم جوئی

بدر میں شکست کے بعد مشرکین مکہ شام کے ساتھ تجارت کے لیے کسی دوسرے راستے کی تلاش میں تھے۔ کچھ لوگوں نے نجد عراق کے راستے کو اختیار کرنے کا مشورہ دیا۔ مکہ کے تاجر، جن میں ابوسفیان بن حرب، صفوان بن امیہ، حویطب بن عبد العزّٰی بھی تھے، ایک لاکھ درہم کی چاندی اور دیگر ساز و سامان لے کر اس مشورے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اس راہ پر چل نکلے۔ اسلامی حکومت کے شعبۂ امن و سلامتی کے ذمہ داران میں سے ایک شخص سُلَیط بن نعمان رضی اللہ عنہ کے ذریعے سے رسول اللہ ﷺ کو اس کی اطلاع مل گئی۔[2]

رسول اللہ ﷺ نے اس قافلے کا راستہ روکنے کے لیے زید بن حارثہ رضی اللہ عنہما کو ایک سو (100) اہلکاروں پر مشتمل افراد کا دستہ دے کر روانہ فرمایا۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ نے انھیں نجد کے ''قَردہ'' نامی چشمے پر پالیا۔ قافلے کے تمام افراد مارے خوف کے بھاگ کھڑے ہوئے۔ مسلمانوں نے قافلے کو ساز و سامان سمیت قبضے میں کر لیا اور ان کے گائیڈ (راستے کی نشاندہی کرنے والے فرد) فرات بن حیان کو قید کر لیا جو آپ ﷺ کی خدمت میں پہنچ کر مشرف بہ اسلام ہو گئے۔ اس طرح حضرت زید رضی اللہ عنہ ساتھیوں سمیت واپس آگئے۔ آپ ﷺ نے اس غنیمت کا پانچواں حصہ لے لیا۔ اور بقیہ ساز و سامان اس جنگی مہم کے شرکاء میں تقسیم کر دیا۔[3]

---

[1] التربية القيادية للدكتور الغضبان: 119,118/3. [2] التربية القيادية للدكتور الغضبان: 132/3.

[3] السيرة النبوية لابن هشام: 56/3.

غزوۂ بنی قینقاع

غزوۂ بنی قینقاع امام زہری رحمہ اللہ کے بیان کے مطابق دو ہجری میں وقوع پذیر ہوا۔ واقدی اور ابن سعد نے مزید وضاحت کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ غزوہ دو ہجری، نصف شوال بروز ہفتہ وقوع پذیر ہوا تھا۔[1]

سیرت نگار اور اہلِ مغازی اس پر متفق ہیں کہ یہ بدر کے بعد اس وقت واقع ہوا جب یہود کے قبیلے بنو قینقاع نے رسول اللہ ﷺ کے عہد کا خیال نہ رکھا اور ان شروط پر پورے نہ اترے جو ان سے طے ہو چکی تھیں بلکہ انھوں نے رحمتِ عالم ﷺ اور مسلمانوں کے متعلق خفیہ طور پر دشمنی پر مبنی پالیسی اپنائے رکھی۔ جب بدر میں مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی تو انھوں نے غیظ و غضب اور حسد و کینہ کا برملا اظہار شروع کر دیا اور علانیہ دشمنی پر اتر آئے۔[2]

نبی اکرم ﷺ نے انھیں مدینہ منورہ کے ایک بازار میں جمع کر کے نصیحت کی اور اسلام کی طرف دعوت دی اور بدر میں قریش جیسے انجام سے باخبر کیا۔[3]

یہود کو چاہیے تو یہ تھا کہ اطاعت کو اپنا شعار بنا لیتے یا کم از کم اس عہد کی دفعات کی پاسداری کرتے جس کی بنا پر وہ نبی ﷺ کی سربراہی میں رہ رہے تھے مگر وہ چیلنج اور دھمکیاں دیتے ہوئے مقابلے پر اتر آئے اور یہ جواب آپ ﷺ کے سامنے رکھا:

''اے محمد (ﷺ)! لڑائی سے ناواقف اور ناتجربہ کار قریش کے کچھ لوگوں کو قتل کرنا تم کو دھوکے میں مبتلا نہ کر دے۔ اگر تم ہم سے لڑو گے تو تم جان لو گے کہ ہم کیسے لوگ ہیں اور تم پر یہ بھی واضح ہو جائے گا کہ ہم جیسے کسی جنگجو سے تمھیں واسطہ نہیں پڑا۔''[4]

اس طرح رفتہ رفتہ یہ بحران شدت اختیار کرتا چلا گیا کیونکہ ان کے جواب میں عہد کی

1 السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري:1/299. 2 نضرة النعيم:1/269. 3 اليهود في السنة المطهرة للدكتور عبد الله الشقاري:1/276. 4 اليهود في السنة المطهرة للدكتور عبدالله الشقاري:1/276.

پاسداری یا اسے نبھانے کا کوئی اشارہ تک نہ تھا۔ اس کے برعکس انھوں نے دشمنی پر مبنی ذہنیت، مقابلے کی دعوت، اپنی برتری اور لڑائی کی تیاری کا اظہار کر دیا۔ تب اللہ تعالیٰ نے ان کے متعلق یہ آیات نازل فرمائیں:

﴿قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ وَتُحْشَرُوْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ ۭ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ۝ قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰيَةٌ فِيْ فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا ۭ فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاُخْرٰى كَافِرَةٌ يَّرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَاْيَ الْعَيْنِ ۭ وَاللّٰهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ ۝﴾

”(اے نبی!) جن لوگوں نے کفر کیا، ان سے کہہ دیجیے: عنقریب تم مغلوب ہو جاؤ گے اور تم جہنم کی طرف اکٹھے کیے (ہانکے) جاؤ گے اور وہ برا ٹھکانا ہے، تحقیق تمھارے لیے ان دو گروہوں میں ایک بڑی نشانی ہے جو (بدر میں) باہم ٹکرائے۔ ایک گروہ اللہ کی راہ میں لڑ رہا تھا اور دوسرا گروہ کافر تھا۔ مسلمان ظاہری آنکھوں سے اُن کو اپنے سے دوگنا دیکھ رہے تھے اور اللہ اپنی مدد سے جس کو چاہتا ہے قوت دیتا ہے، بے شک اس میں بصیرت والوں کے لیے عبرت ہے۔“ [1]

غزوۂ بنی قینقاع کے اسباب: جب مسلمانوں کو بدر میں فتح حاصل ہوئی اور آپ ﷺ نے یہود سے گفتگو فرمائی تو بنو قینقاع نے مسلمانوں کے ساتھ کیے ہوئے عہد کو توڑنے کا خفیہ ارادہ کر لیا اور مسلمانوں پر حملہ کرنے کے لیے موزوں وقت اور بہانے کی تلاش میں رہنے لگے۔ بالآخر ایک انتہائی گھٹیا بہانہ ان کے ہاتھ آ گیا۔ عرب ہی کے کسی علاقے سے آئی ہوئی عورت نے اپنا سامان تجارت بنو قینقاع کے بازار میں فروخت کیا۔ اور ایک یہودی سنار کے پاس بیٹھ گئی۔ یہودیوں نے اس کا چہرہ ننگا کرنا چاہا مگر عورت نے ایسا نہ کرنے دیا۔ سنار نے اس کے کپڑے کا ایک کنارہ اس کی پیٹھ کے ساتھ باندھ دیا۔ وہ جب

1 آل عمرٰن 3:12، 13.

کھڑی ہوئی تو اس کی شرمگاہ ننگی ہوگئی۔ یہود اس پر قہقہے لگانے لگ گئے۔ عورت زور سے چلائی تو ایک مسلمان نے اس سنار پر حملہ کر کے اسے قتل کر دیا۔ وہ سنار یہودی تھا۔ یہود اس مسلمان پر چڑھ دوڑے اور اسے شہید کر دیا۔ اس مسلمان کے ساتھیوں نے یہود کے خلاف مسلمانوں کو مدد کے لیے پکارا۔ مسلمانوں کا پیمانہ صبر لبریز ہوا اس طرح بنو قینقاع اور ان کے درمیان لڑائی ٹھن گئی۔[1]

رسول اللہ ﷺ کو علم ہوا تو آپ ﷺ مہاجرین و انصار کے لشکر کے ہمراہ ان کی طرف چلے۔ یہ دو ہجری نصف شوال، ہفتے کا دن تھا۔[2]

مسلمانوں کے علم بردار حضرت حمزہ بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ تھے، آپ نے مدینہ منورہ پر ابولبابہ بشیر بن عبد المنذر العمری رضی اللہ عنہ کو نائب مقرر کیا۔[3] اور نکلتے وقت ان سے معاہدہ ختم کر دیا جیسا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا تھا:

﴿وَإِمَّا تَخَافَنَّ مِن قَوْمٍ خِيَانَةً فَانبِذْ إِلَيْهِمْ عَلَىٰ سَوَاءٍ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْخَائِنِينَ ۝﴾

''اور اگر آپ کو کسی قوم کی طرف سے خیانت (بدعہدی) کا خوف ہو تو برابری (کی سطح) پر ان کا عہد ان کے منہ پر دے ماریں۔ بے شک اللہ خیانت (بدعہدی) کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔''[4]

یہود کا محاصرہ: یہود کو رسول اللہ ﷺ کی آمد کا علم ہوا تو وہ قلعہ بند ہوگئے۔ ابن ہشام کے بیان کے مطابق آپ ﷺ نے پندرہ راتوں تک ان کا محاصرہ جاری رکھا۔[5]

محاصرہ جاری تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا۔ وہ رسول اللہ ﷺ کے فیصلے پر قلعے سے اترنے پر مجبور ہوگئے۔ در اصل آپ ﷺ نے انھیں اچانک گھیر لیا۔

---

1 السيرة النبوية لابن هشام: 54/3. 2 المغازي للواقدي: 176/1، والطبقات الكبرىٰ لابن سعد: 29,28/2. 3 تاريخ الطبري: 481/2، و اليهود في السنة المطهرة للدكتور عبد الله الشقاري: 279/1. 4 الأنفال 58:8. 5 السيرة النبوية لابن هشام: 55/3.

اس طرح ان کے طے شدہ امور و معاملات میں ایسی گڑ بڑ پیدا ہوگئی کہ وہ حیرت زدہ ہوگئے کہ کیا کریں۔ آپ ﷺ نے ان کی ہر قسم کی خارجی امداد روک دی۔ ان کی نقل و حرکت معطل ہو کر رہ گئی، الغرض وہ جیل کی سی زندگی گزارنے پر مجبور ہوگئے۔ بالآخر ان حالات نے انھیں ڈٹ جانے اور مقابلہ کرنے سے مایوس کر دیا۔ یہی یہودی کچھ دن پہلے تک آپ ﷺ کو دھمکیاں دے رہے تھے کہ ہم قوت، جنگ اور بہادری میں قریشی مشرکوں سے مختلف ہیں لیکن اب آپ ﷺ کے حکم پر قلعے سے اترنے پر مجبور تھے۔[1]

اس کے بعد رسول اللہ ﷺ کے حکم پر انھیں باندھ دیا گیا۔ ان کی مشکیں کس دی گئیں۔ اس کام کے لیے آپ ﷺ نے منذر بن قدامہ سلمی اوسی رضی اللہ عنہ کو مقرر فرمایا۔[2]

بنوقینقاع کے یہود کا انجام: منافقوں کے سرغنے عبداللہ بن ابی ابن سلول نے چاہا کہ اپنے حلیفوں کو رہائی دلوائے، چنانچہ وہ منذر بن قدامہ رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور کہنے لگا: ''انھیں کھول دو۔'' منذر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''ان لوگوں کی رہائی کا مطالبہ کر رہے ہو جنھیں رسول اللہ ﷺ نے باندھ رکھنے کا حکم فرمایا ہے۔ اللہ کی قسم! جو شخص انھیں کھولنے کی کوشش کرے گا میں اس کی گردن اڑا دوں گا۔''[3]

یہ صورت حال دیکھ کر عبداللہ بن ابی واپس ہولیا اور انھیں قید سے چھڑوانے کے لیے آپ ﷺ سے حکم جاری کروانے پر مجبور ہوگیا۔[4]

پھر وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور عرض کرنے لگا: ''اے محمد (ﷺ)! میرے دوستوں کے ساتھ احسان کیجیے۔'' دراصل بنوقینقاع قبیلۂ خزرج کے حلیف تھے۔ آپ ﷺ نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے پھر کہا: ''اے محمد (ﷺ)! میرے دوستوں کے متعلق احسان برتیے۔'' راوی کہتا ہے کہ آپ ﷺ نے اس سے منہ پھیر لیا۔ اب ابن ابی نے

---

[1] الصراع مع اليهود لأبي فارس: 144/1. [2] اليهود في السنة المطهرة للدكتور عبد الله الشقاري: 280/1. [3] التاريخ الإسلامي للحميدي: 33,32/5. [4] التاريخ الإسلامي للحميدي: 33,32/5.

آپ ﷺ کی زرہ کے گریبان میں ہاتھ ڈالا تو آپ ﷺ نے فرمایا: «أَرْسِلْنِي» ''مجھے چھوڑ دے۔'' آپ ﷺ سخت ناراض ہوئے حتی کہ آپ ﷺ کے چہرۂ انور پر غصے کے آثار نمایاں ہونے لگے۔

آپ ﷺ نے پھر فرمایا: «وَيْحَكَ أَرْسِلْنِي» ''تو تباہ ہو مجھے چھوڑ دے۔'' اس نے کہا: ''ہرگز نہیں، اللہ کی قسم! جب تک آپ میرے ساتھیوں پر احسان نہیں کریں گے آپ کو نہیں چھوڑوں گا۔ یہ چار سو زرہ پوش اور تین سو بغیر زرہ افراد ہی نے تو مجھے ہر سیاہ و سرخ سے محفوظ کر رکھا ہے۔ آپ انھیں ایک ہی صبح میں ختم کر دینا چاہتے ہیں؟ اللہ کی قسم! میں حوادثِ زمانہ سے ڈرتا ہوں۔'' تب آپ ﷺ نے فرمایا: «هُمْ لَكَ» ''یہ سب تیرے لیے (آزاد چھوڑے)۔''[1]

رسول اللہ ﷺ نے انھیں آزاد کر کے جلاوطنی کا حکم دے دیا۔ ان کے اموال بطور غنیمت آپ ﷺ اور مسلمانوں کے ہاتھ آئے۔ ان کے اموال کی نگرانی اور اعداد و شمار محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کے سپرد تھے۔

اب پھر ابن ابی نے بنوقینقاع کو اپنی جگہ بحال اور برقرار رکھنے کے لیے رسول اللہ ﷺ سے بات چیت کرنا چاہی۔ دیکھا تو رسول اللہ ﷺ کے دروازے پر حضرت عویم بن ساعدہ انصاری اوسی رضی اللہ عنہ بطور دربان موجود تھے۔ حضرت عویم رضی اللہ عنہ نے اسے واپس کرتے ہوئے کہا: ''بغیر اجازت داخل نہیں ہو سکتے۔'' تو ابن ابی نے انھیں دھکا دیا۔ جواباً حضرت عویم رضی اللہ عنہ نے بھی سختی سے کام لیا حتی کہ ابن ابی کا چہرہ دیوار سے لگ کر زخمی ہو گیا اور خون بہنے لگا۔[2]

اس واقعے سے نبی ﷺ کی عظیم سیاسی بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ آپ ﷺ نے ابن ابی کے مطالبے کو تسلیم کر لیا کہ شاید یہ مشفقانہ سلوک اس کے دل کو صاف کر کے گمراہی

---

1 اليهود في السنة المطهرة للدكتور عبد الله الشقاري: 281/1. 2 التاريخ الإسلامي للحميدي: 30/5.

کے پردے زائل کر دے اور اسے ہدایت نصیب ہو جائے۔ آپ ﷺ نے اس سے فرمایا: «هُمْ لَكَ» ”یہ تمام تیرے لیے (آزاد ہیں)۔“ ابن ابی کے راہ راست پر آنے سے شاید وہ لوگ بھی سدھر جائیں جو ابن ابی کی چودھراہٹ کا دم بھرتے ہیں، نتیجتاً مسلمانوں کو دشمنانِ اسلام کے مکر وفریب کی زد میں آنے کے بجائے اتفاق و اتحاد حاصل ہو سکے گا۔[1]

یہاں آپ ﷺ کی ایک اور دور اندیشی بھی کارفرما تھی کہ اسلامی معاشرے میں ممکنہ طور پر وقوع پذیر ہونے والے فتنے کی روک تھام کے لیے کسی چیز کی قربانی دے دیں۔ وہ فتنہ یوں سر اٹھاتا نظر آرہا تھا کہ بعض انصار جو ابھی نئے نئے اسلام لائے تھے ابن ابی اپنے اثر ورسوخ سے ان پر اثر انداز ہو سکتا تھا۔[2]

رسول اللہ ﷺ نے اس کی بدسلوکی کے باوجود نرمی اور صبر کا انداز اپنایا تاکہ فتنے سے تحفظ مل جائے اور جنھیں ناواقفیت کی بنا پر اس سے ہمدردی ہے وہ اس کے برے کردار سے آگاہ ہو جائیں اور اس سے نرمی کے بجائے نفرت کا اظہار کر کے علیحدہ ہو جائیں۔ آپ ﷺ کے اس اسلوب نے عملی طور پر بھرپور کامیابی حاصل کی اور سب لوگ ابن ابی کی اصلیت جان گئے۔ اس کے انتہائی قریبی ساتھی جن میں اس کے بیٹے عبداللہ رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ اس واقعے کے بعد جب کبھی ابن ابی گفتگو کرتا تو وہ اسے خاموش کرا دیتے۔ اور اس گفتگو سن کر بیزاری ظاہر کرتے۔[3]

بلکہ انھوں نے اسے قتل کرنے کا ارادہ بھی کر لیا تھا۔ جس کی تفصیل ان شاء اللہ آئندہ آرہی ہے۔

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کا یہود سے اظہار براءت: جب بنوقینقاع نے معاہدہ توڑ دیا تو حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی طرفداری میں اپنے حلیفوں سے بیزاری کا اعلان کیا اور ان

[1] المنهج الحركي للسيرة النبوية للدكتور الغضبان، ص:247. [2] التاريخ الإسلامي للحميدي: 32/5. [3] الصراع مع اليهود لأبي فارس:148/1.

کی دوستی کو اتار پھینکا۔ ان کا تعلق بنوعوف سے تھا۔ بنوعوف کا بھی بنوقینقاع سے ایسا ہی معاہدہ تھا جیسا ابن ابی کا تھا۔ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ عرض پرداز ہوئے: ''اے اللہ کے رسول! میں اللہ، اس کے رسول اور مومنوں سے دوستی رکھتا ہوں اور ان کفار کے حلف، معاہدے اور دوستی سے بیزاری کا اظہار کرتا ہوں۔''[1]

جب بنوقینقاع کی جلاوطنی کا فیصلہ ہوا تو آپ ﷺ نے حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ کو انھیں جلاوطن کرنے کا حکم صادر فرمایا۔ بنوقینقاع کہنے لگے: ''اے ابو ولید! اوس وخزرج میں سے آپ کا ہمارے ساتھ یہ سلوک؟ حالانکہ ہم آپ کے حلیف ہیں۔'' حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''تم نے جب جنگ کی ابتدا کی تھی میں نے اس وقت نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کیا تھا: اے اللہ کے رسول! میں ان سے اور ان کے عہد و پیمان سے اظہارِ لاتعلقی کر کے آپ سے ناطہ جوڑتا ہوں۔'' ابن ابی اور عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ دونوں کا ان سے ایک ہی طرح کا معاہدہ تھا۔ یہ سن کر عبداللہ بن ابی کہنے لگا: ''اپنے حلیفوں سے بیزاری کرتے ہو؟ تمھارے ساتھ ان کا ایسا سلوک نہ تھا۔'' پھر اس نے مشکل اوقات میں بنوقینقاع کے آزمائشوں میں پورے اترنے کے مواقع حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ کو یاد دلائے۔ حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ نے جواباً فرمایا: ''اے ابوالحباب! اب دل پہلے سے نہیں رہے اور اسلام نے سابقہ معاہدے مٹا دیے ہیں۔ رہے تم تو اللہ کی قسم! ایسے معاملے پر اڑے ہوئے ہو جس کی قباحت ہم مستقبل قریب میں دیکھ لیں گے۔''

بنوقینقاع نے کہا: ''اے محمد (ﷺ)! لوگوں کے ساتھ ہمارا لین دین اور قرض وغیرہ باقی ہے؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: «تَعَجَّلُوا وَ ضَعُوا» ''جلدی کرو اور کمی کرو۔'' حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ نے انھیں نکالنا اور جلاوطن کرنا شروع کر دیا تو وہ کچھ مہلت کا تقاضا کرنے لگے۔ حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''تمھارے لیے تین دن ہیں۔ ان سے زیادہ تمھیں ایک

[1] اليهود في السنة المطهرة للدكتور عبد الله الشقاري:1/283,282.

لمحے کی مہلت بھی نہیں ملے گی۔ اور یہ رخصت نبی ﷺ کی طرف سے تھی۔ اگر یہ بات میرے اختیار میں ہوتی تو قطعاً یہ مہلت نہ دیتا۔ جب تین دن کی مہلت گزر گئی تو حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ ان کے پیچھے چلے یہاں تک کہ وہ شام کا راستہ اختیار کر گئے۔ آپ ان سے کہہ رہے تھے: ''کہیں دور اونچی جگہ اختیار کرلو۔'' یہ کہتے ہوئے خلف الزباب تک ان کے پیچھے گئے، پھر واپس آگئے جبکہ یہود ''اذرعات'' چلے گئے۔[1]

بنوقینقاع مدینہ سے اس طرح ذلیل وخوار ہوکر نکلے کہ اپنا مال اور اسلحہ مسلمانوں کے لیے غنیمت کے طور پر چھوڑ گئے۔ جبکہ یہ یہودی قبائل میں سے سب سے بہادر اور جنگجو ہونے کے ساتھ ساتھ جنگی سامان اور زیادہ نفری کے مالک تھے، اس لیے اس اعصاب شکن سزا کے بعد کافی عرصہ تک یہودی قبائل پر سناٹا طاری رہا، ان کے دلوں پر مسلمانوں کا رعب چھایا رہا اور ان کا سارا غرور خاک میں مل گیا۔

یہود دوستی اور یہود بیزاری پر اترنے والی آیات: عبداللہ بن ابی بن سلول کی یہود دوستی اور حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کے یہود بیزاری پر یہ آیات نازل ہوئیں:

﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰٓى اَوْلِيَآءَ ۘ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۚ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ○ فَتَرَى الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يُّسَارِعُوْنَ فِيْهِمْ يَقُوْلُوْنَ نَخْشٰٓى اَنْ تُصِيْبَنَا دَاۗىِٕرَةٌ ۭ فَعَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَ بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِهٖ فَيُصْبِحُوْا عَلٰي مَآ اَسَرُّوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ نٰدِمِيْنَ ○ وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَهٰٓؤُلَاۗءِ الَّذِيْنَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ ۙ اِنَّهُمْ لَمَعَكُمْ ۭ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَاَصْبَحُوْا خٰسِرِيْنَ ○ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ ۙ اَذِلَّةٍ عَلَي

[1] اليهود في السنة المطهرة للدكتور عبدالله الشقاري:1/285,284.

الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ ؕ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝ اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ ۝ وَمَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ ۝﴾

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! یہودیوں اور عیسائیوں کو دوست نہ بناؤ، وہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں اور تم میں سے جو کوئی ان سے دوستی رکھے گا تو بے شک وہ انھی میں سے ہوگا۔ یقیناً اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔ (اے نبی!) پس آپ ان لوگوں کو دیکھتے ہیں جن کے دلوں میں (منافقت کا) روگ ہے کہ وہ دوڑ کر ان (یہودیوں) میں جاتے ہیں اور (ان سے) کہتے ہیں: ہم ڈرتے ہیں کہ ہمیں کوئی مصیبت (نہ) پہنچے، پھر قریب ہے کہ اللہ (تمھیں) فتح عطا کرے یا اپنی طرف سے کوئی اور بات ظاہر کرے تو یہ لوگ (اپنی منافقت پر) پچھتائیں گے جسے وہ اپنے دلوں میں چھپائے ہوئے ہیں۔ اور (اس وقت) وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں، کہیں گے: کیا یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے بڑی شدو مد سے اللہ کی قسمیں کھائی تھیں کہ بے شک وہ تمھارے ساتھ ہیں؟ ان کے عمل برباد ہوگئے، چنانچہ وہ خسارہ اٹھانے والوں میں ہوگئے۔ اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تم میں سے جو کوئی اپنے دین سے پھر جائے تو پھر اللہ جلد ایسے لوگ لائے گا کہ وہ ان سے محبت کرتا ہوگا اور وہ اس سے محبت کرتے ہوں گے، وہ مومنوں پر نرمی کرنے والے ہوں گے اور کافروں پر سختی کرنے والے، وہ اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈریں گے، یہ اللہ کا فضل ہے، وہ جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔ اور اللہ (بڑی) وسعت والا، خوب جاننے والا ہے۔ تمھارے

دوست تو صرف اللہ اور اس کا رسول اور وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے، جو نماز قائم کرتے ہیں اور زکاۃ دیتے ہیں اور وہ رکوع کرنے والے ہیں۔ اور جو کوئی اللہ سے اور اس کے رسول سے دوستی رکھتا ہے اور ان لوگوں سے دوستی رکھتا ہے جو ایمان لائے ہیں تو (وہ اللہ کا گروہ ہیں اور) یقیناً اللہ کا گروہ ہی غالب آنے والا ہے۔''[1]

ان آیات کے متعلق ابن عطیہ کہتے ہیں: ''جب بدر کا معاملہ اپنے اختتام کو پہنچا تو بنوقینقاع کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا۔ آپ ﷺ نے انھیں قتل کرنے کا ارادہ فرمالیا تو عبداللہ بن ابی انھیں بچانے کے لیے آگے بڑھا۔ یہ ان کا حلیف تھا۔ ابن ابی کے حلف جیسا حلف ان کے ساتھ عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کا بھی تھا۔ تو جب عبادہ رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ نے یہود سے ہاتھ کھینچ لیا ہے اور یہود نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ سے معاندانہ رویہ اختیار کر رکھا ہے تو انھوں نے آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! میں اللہ تعالیٰ کی طرفداری کرتے ہوئے یہود کے معاہدے اور دوستی سے بیزاری کا اظہار کرتا ہوں۔'' اور عبداللہ بن ابی نے کہا: ''میں تو یہود کی دوستی وتعلق سے قطعاً بیزار نہیں ہوں۔ میرا تو ان کے بغیر گزارہ نہیں۔ میرے لیے تو وہ ضروری ہیں کیونکہ مجھے گردش ایام کا ڈر ہے۔''[2]

ایک طرف ابن سلول تھا جو نفاق میں ڈوبا ہوا تھا اور دوسری طرف عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ تھے جنھوں نے نبوی طریقے پر تربیت پائی تھی۔ دونوں میں بڑا واضح فرق ہے۔ سیدنا عبادہ رضی اللہ عنہ کا دل پاک، روح شفاف، ایمان مضبوط اور عقل روشن تھی۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ یہ دورِ جاہلیت کی عصبیت کے اثرات، خواہشات اور ذاتی مصلحتوں سے مبرّا تھے اور خالص عقیدہ رکھنے والے سچے مسلمان کے لیے ایک زندہ مثال تھے۔[3]

---

[1] المآئدة5:51-56. [2] المحرر الوجيز لابن عطية:478,477/1. [3] السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري:302/1.

اسلامی حکومت کے خلاف اکسانے والوں کا صفایا

فتنہ و جنگ پر ابھارنے والوں سے خطرہ علانیہ طور پر مسلمانوں سے جنگ کرنے والوں اور تلوار لہرانے والوں سے کسی صورت بھی کم نہیں کیونکہ اگر مسلمانوں کے خلاف یہ برانگیختہ کرنے والے نہ ہوتے تو فتنہ بپا ہی نہ ہوتا۔ اسی لیے حق کو غالب کرنے اور فتنے کی آگ بجھانے کے لیے رسول اللہ ﷺ نے ایسے شر پسند عناصر کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر قتل کرنا شروع کر دیا۔ جنگ بدر کے بعد ان فتنہ پردازوں کی خاصی تعداد قتل ہوئی۔[1]

ان شر پسند عناصر میں سے چند ایک یہ ہیں:

عصماء بنت مروان: یہ اسلام کی عیب جوئی کرتی اور رسول اللہ ﷺ کے خلاف ابھارا کرتی تھی۔ اسے عمیر بن عدی الخطمی رضی اللہ عنہ نے ٹھکانے لگا دیا۔ بعد ازاں انھوں نے اس (قتل) کے بارے میں نبی ﷺ سے دریافت کیا کہ مجھ پر اس کا کوئی گناہ تو نہیں؟ آپ ﷺ نے ان سے فرمایا: «نَصَرْتَ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ يَا عُمَيْرُ!» ''عمیر! تم نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی مدد کی ہے۔'' اور پھر فرمایا: «لَا يَنْتَطِحُ فِيهَا عَنْزَانِ» ''اس عورت کے (قتل کے) معاملے میں قطعاً دو رائے نہیں ہو سکتیں۔ (تم نے درست کیا ہے)''[2]

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بنو خطمہ سے کئی لوگ مسلمان ہو گئے اور جو اسلام چھپائے بیٹھے تھے وہ اسلام ظاہر کرنے لگے۔[3]

ابو عَفک یہودی کا قتل: یہ بنو عمرو بن عوف کا ایک بوڑھا یہودی شاعر تھا جو لوگوں کو رسول اللہ ﷺ کے خلاف اکساتا تھا۔ آپ ﷺ نے اس کے بارے میں فرمایا: «مَنْ لِّي بِهٰذَا الْخَبِيثِ؟» ''اس خبیث سے مجھے کون محفوظ کرے گا؟'' حضرت سالم بن عمیر رضی اللہ عنہ اس مہم پر روانہ ہوئے اور اسے قتل کر دیا۔[4]

---

[1] قراءة سياسية للسيرة النبوية للدكتور قلعجي، ص: 138. [2] السيرة النبوية لابن هشام: 285/4، اور دیکھیے: تاريخ بغداد: 99/13. [3] نضرة النعيم: 295/1. [4] نضرة النعيم: 296/1.

کعب بن اشرف کا قتل: غزوۂ بدر و احد کے درمیانی عرصے میں اسلامی حکومت کے خلاف ابھارنے والوں کو قتل کرنے کے واقعات میں سے ایک اہم ترین واقعہ کعب بن اشرف کے قتل کا ہے۔

کعب بن اشرف کا تعلق قبیلۂ طے کی شاخ بنو نبہان سے تھا۔ زمانۂ جاہلیت میں اس کا والد ایک شخص کو قتل کرنے کے بعد مدینہ آ کر یہود بنو نضیر کا حلیف بن گیا۔ اور ابوالحقیق کی بیٹی عقیلہ سے شادی رچالی جس نے کعب کو جنم دیا۔[1]

کعب بن اشرف شاعر تھا اور اسلام دشمنی میں پیش پیش تھا۔ معرکۂ بدر میں مسلمانوں کی فتح یابی سے اس کے اندر غیظ و غضب کی آگ بھڑکنے لگی۔ یہ فوراً مکہ پہنچا اور رسول اللہ ﷺ کی شان میں ہرزہ سرائی کے ساتھ ساتھ قریش کو اپنے مقتولین کا بدلہ لینے پر ابھارنے لگا۔ اپنے اشعار میں ان کا نوحہ کرتا اور انھیں اسلام اور مسلمانوں پر فیصلہ کن وار کی دعوت دیتا۔[2]

بدر میں قتل کیے گئے مشرکوں پر کہے گئے کعب کے چند اشعار کا ترجمہ ملاحظہ کریں:

"بدر کی چکی (جنگ) نے اہل بدر کو خوب پیس دیا ہے۔ بدر جیسے حادثات ہی پر چیخا چلایا جاتا ہے اور آنسو بہائے جاتے ہیں۔

لوگوں کے سردار اپنے ہی حوضوں پر قتل کر دیے گئے۔ اسے انوکھا نہ جانو، بلا شبہ حکمران ایسے ہی گرا کرتے ہیں۔

اس میدان میں روشن چہروں والے کتنے ہی بزرگ قتل کر دیے گئے جن کے ہاں زمانے کے مارے پناہ لیتے تھے۔

جن لوگوں کی ناراضی میرے لیے خواری و رسوائی کا باعث ہے وہ کہہ رہے ہیں کہ اشرف کا بیٹا کعب بے صبری کا مظاہرہ کر رہا ہے۔

---

[1] السيرة النبوية لابن هشام:58/3. [2] نضرة النعيم:298/1.

انھوں نے سچ کہا ہے، کاش! جب وہ قتل ہوئے تھے زمین اپنے پر موجود لوگوں کو اپنے اندر دھنسا لیتی اور انھیں نگل جاتی۔

مجھے خبر دی گئی ہے کہ تمام بنو کنانہ نے ابو ولید کی بات کو تسلیم کر لیا اور انھوں نے اپنے اعضا کٹوا لیے۔''[1]

کعب بن اشرف قریش کو مسلسل رسول اللہ ﷺ کے خلاف ابھارتا، مسلمانوں سے جنگ پر اکساتا اور آپ ﷺ کی ہجو کر کے اذیت دیتا رہا۔ ابوسفیان (رضی اللہ عنہ) نے اس سے پوچھا: ''میں تمھیں اللہ کی قسم دیتا ہوں کہ تم بتاؤ کیا ہمارا دین اللہ کو زیادہ پسند ہے یا محمد (ﷺ) اور اس کے ساتھیوں کا؟'' وہ کہنے لگا: ''تم ان کی نسبت زیادہ صحیح راہ پر ہو۔'' بعدازاں وہ اس حال میں مکہ سے نکلا کہ اس نے آپ ﷺ کی دشمنی کا اظہار اور آپ (ﷺ) کی توہین کرتے ہوئے مشرکین کو مسلمانوں کے ساتھ جنگ پر آمادہ کر لیا تھا۔[2]

جب کعب مدینہ آ گیا تو کھلم کھلا رسول اللہ ﷺ سے دشمنی کا اظہار کرنے لگا اور آپ کی ہجو شروع کر دی۔ اس کی کمینگی اور تکبر کا یہ عالم تھا کہ مسلمان عورتوں کے متعلق بھی زبان درازی کرنے لگا۔ حتی کہ آپ کے چچا جان عباس رضی اللہ عنہ کی بیوی ام فضل بنت حارث رضی اللہ عنہا کے محاسن کہہ ڈالے، ان کے متعلق اس نے یہ اشعار کہے:

''کیا تم جا رہے ہو تمھیں کوئی مقام و مرتبہ میسر نہ ہو (تم نے کوئی شرف پایا ہی نہیں) جبکہ تم ام فضل کو حرم میں چھوڑے جا رہے ہو۔

وہ زعفرانی رنگ و خوشبو والی زرد (عورت) اگر تو اسے شیشی میں نچوڑنا چاہے تو نچڑ جائے وہ مہندی اور کتم کے رنگ والی۔

وہ بنو عامر کی یکتا عورت جس کی بنا پر دل بے قرار ہے اور اگر وہ چاہے تو کعب کو اس (عشق کی) بیماری سے شفایاب کر دے۔

---

[1] تاریخ الإسلام للذهبي: 158/2، والسيرة النبوية لابن هشام: 57/3. [2] تاريخ الإسلام للذهبي: 158/2.

میں نے اس سے قبل رات کے وقت سورج طلوع ہوا نہیں دیکھا یہاں تک کہ یہ رات کی تاریکی میں ہم پر ظاہر ہوئی۔''[1]

حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کعب بن اشرف کی گھات میں: رسول اللہ ﷺ حسان رضی اللہ عنہ کو کعب کا سامنا کرنے پر ابھارتے تھے۔ آپ ﷺ حسان رضی اللہ عنہ کو برابر مکہ میں کعب کے میزبانوں کی اطلاع پہنچا رہے تھے۔ جب کعب مکہ میں مطلب بن ابی وداعہ بن ضبیرہ سہمی اور اس کی بیوی عاتکہ بنت اسید بن ابوالعیص کے گھر آیا تو آپ ﷺ نے حسان رضی اللہ عنہ کو اس سے باخبر کیا۔ حضرت حسان رضی اللہ عنہ نے ابن اشرف کو اپنے گھر جگہ دینے پر ان میزبانوں کی خوب مذمت کی۔ جب عاتکہ کو اس مذمت کی خبر پہنچی تو وہ کعب بن اشرف یہودی کا ساز و سامان باہر پھینکتے ہوئے اپنے خاوند سے کہنے لگی: ''ہمارا اس یہودی سے کیا تعلق؟ تم دیکھتے نہیں حسان ہمارے ساتھ کیا کر رہا ہے؟'' اب کعب انھیں چھوڑ کر دوسرے لوگوں کا رخ کرنے لگا۔ وہ جب بھی کسی قوم کے پاس جاتا نبی ﷺ حسان رضی اللہ عنہ کو بلاتے اور اس کی اقامت گاہ سے باخبر فرماتے، حسان رضی اللہ عنہ ان کی مذمت کر دیتے تو اس کے میزبان بھی اسے دھتکار دیتے، یہ اسی طرح نقل مکانی کرتا رہا حتی کہ ہر گھر نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کے سامنے کشادہ راہیں تنگ ہونے لگیں اور وہ ذلیل و خوار ہو کر مدینہ لوٹ آیا۔ اور اپنے حتمی انجام اور سزا، جس کا وہ مستحق تھا، اس کا انتظار کرنے لگا۔[2]

کعب کے خلاف حضرت حسان رضی اللہ عنہ کی تشہیری جنگ اپنے مقاصد پورے کر رہی تھی۔

حضرت حسان رضی اللہ عنہ کے اس کے رد میں کہے گئے چند اشعار کا ترجمہ یوں ہے:

''کیا کوئی کعب پر رویا ہے، پھر اس پر آنسو بہائے گئے ہیں، جبکہ کعب نے ایسی ذلت آمیز زندگی گزاری کہ اس کی سنی ہی نہیں جاتی تھی۔

میں نے بدر کی وادی میں ان کے ایسے مقتولین دیکھے ہیں جن کے لیے آنکھیں

[1] تاريخ الإسلام للذهبي: 160/2. [2] الصراع مع اليهود لأبي فارس: 111/1.

لگا تار بہہ رہی ہیں اور آنسو بہا رہی ہیں۔
تو نے کمینے غلاموں کو خوب رلایا ہے اب تو خود رو جس طرح چھوٹا کتا چھوٹی کتیا کے پیچھے آواز نکالتا ہے۔
بلاشبہ رحمٰن نے ہمارے سردار اور قائد ﷺ کو مطمئن کر دیا ہے اور جن لوگوں نے ان سے جنگ کی انھیں ذلیل وخوار کر دیا اور وہ قتل کر کے زمین پر گرائے گئے۔
اور ان میں سے وہ شخص نجات پا گیا اور بچ نکلا جسے ان کے ساتھ قلبی لگاؤ ہے اور اس کے ڈر کے مارے اس کا دل پھٹا جا رہا ہے۔''[1]

کعب بن اشرف کا انجام: اس یہودی نے رسول اللہ ﷺ، عام مسلمانوں اور عزت مآب، اطاعت شعار اور عبادت گزار مسلم خواتین کے متعلق کئی ایک جرائم، خیانتوں اور قباحتوں کا ارتکاب کیا۔ جن میں سے ایک ایک جرم اپنی اپنی جگہ عہد کی خلاف ورزی میں شمار ہوتا اور قتل کی سزا کا مستوجب تھا، جبکہ اس فتنہ انگیز یہودی میں تو یہ تمام جرائم یکجا ہو چکے تھے۔[2]

کعب بن اشرف آپ ﷺ کی ہجو، دشمنانِ اسلام سے نرمی کا اظہار اور ان کے مقتولین کی مرثیہ خوانی کر کے انھیں مسلمانوں کے خلاف ابھار کر معاہدے کی خلاف ورزی کا مرتکب ہو چکا تھا۔ ان جرائم کی بنا پر یہ حربی کافر بن چکا تھا اور اس لائق ہو چکا تھا کہ اس کا خون رائیگاں قرار دیا جائے، چنانچہ آپ ﷺ نے اس کے قتل کا حکم جاری فرما دیا۔[3]

امام بخاری رحمہ اللہ نے اس کے قتل کا واقعہ تفصیلی طور پر بیان کیا ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے بیان کیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:
«مَنْ لِّكَعْبِ بْنِ الْأَشْرَفِ فَإِنَّهُ قَدْ آذَى اللّٰهَ وَرَسُولَهُ» ''کعب بن اشرف کی خبر کون لے گا؟ اس نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کو اذیت دی ہے۔''

---

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 59/3. [2] الصراع مع اليهود لأبي فارس: 111/1. [3] السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري: 304/1.

محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کھڑے ہو کر عرض کرنے لگے: ''یا رسول اللہ! آپ پسند فرمائیں گے کہ میں اسے قتل کر دوں۔''

فرمایا: «نَعَمْ!» ''ہاں!''

محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ''مجھے اجازت دیجیے میں جو مناسب سمجھوں کہہ لوں؟''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «قُلْ» ''کہہ لینا (اجازت ہے)۔''

محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کعب بن اشرف کے پاس آئے اور کہا: ''اس شخص (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) نے ہم سے زکاۃ و صدقہ مانگا ہے اور ہمیں مشکل میں ڈال دیا ہے۔ میں تمھارے پاس کچھ قرض کے لیے حاضر ہوا ہوں۔''

کعب نے کہا: ''اللہ کی قسم! مستقبل میں تم اس سے اور بھی اکتا جاؤ گے۔''

محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ: ''ہم نے اس کی پیروی کی ہے اور انجام دیکھنے سے قبل اسے چھوڑنا بھی نہیں چاہتے۔ اور اب ہم چاہتے ہیں کہ تم ہمیں ایک یا دو وسق (غلّہ) بطور قرض دے دو۔''

کعب: ''ٹھیک ہے۔ کچھ نہ کچھ میرے پاس گروی رکھو۔''

محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ: ''تم کیا چیز گروی چاہتے ہو؟''

کعب: ''اپنی عورتیں میرے پاس گروی رکھ دو۔''

محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ: ''تم سارے عرب سے خوبصورت ہو، ہم تمھارے پاس عورتیں کیسے گروی رکھ دیں۔''

کعب: ''تو پھر اپنے بیٹے میرے پاس گروی رکھ دو۔''

محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ: ''اپنے بیٹے کیسے تمھارے پاس گروی رکھیں۔ لوگ انھیں ساری زندگی طعنہ دیں گے کہ یہ ایک یا دو وسق کے عوض گروی رکھے گئے تھے۔ یہ تو ہمارے لیے بڑی شرم کی بات ہے۔ اس کے بجائے ہم تمھارے پاس اپنے ہتھیار گروی رکھتے ہیں۔''

اب محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے اس سے وعدہ کر لیا کہ میں پھر آؤں گا۔ ایک رات محمد بن

مسلمہ رضی اللہ عنہ آئے۔ ان کے ساتھ ابو نائلہ رضی اللہ عنہ بھی تھے جو کعب کے رضاعی (دودھ شریک) بھائی تھے۔ کعب نے انھیں قلعے کے پاس بلالیا اور خود قلعے سے نیچے اترنے لگا تو اس وقت اس کی بیوی بولی: ''اس وقت باہر کہاں جا رہے ہیں؟''

کعب: ''یہ محمد بن مسلمہ اور میرا بھائی ابو نائلہ ہے۔''

وہ کہنے لگی: ''مجھے ایسی آواز سنائی دے رہی ہے جس سے خون ٹپک رہا ہے۔''

کعب: ''میرے بھائی محمد بن مسلمہ اور دودھ شریک ابو نائلہ کے سوا کوئی نہیں۔ باعزت انسان کو اگر رات کے وقت نیزہ مارنے کے لیے بلایا جائے تو وہ ضرور جائے گا۔''

ادھر محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ دو آدمی ساتھ لے کر آئے۔[1] اور ان سے کہنے لگے: ''جب کعب آئے گا میں اس کے بال تھام کر سونگھوں گا۔ تم جب دیکھو کہ میں نے اچھی طرح اس کے سر کو پکڑ لیا ہے تم اپنا کام کر دکھانا اور اسے قتل کر دینا۔'' کعب چادر اوڑھے اترا، اس سے خوشبو مہک رہی تھی۔

محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے کہا: ''میں نے آج کی طرح عمدہ خوشبو کبھی نہیں محسوس کی۔ مجھے اپنا سر سونگھنے کی اجازت دیتے ہو۔''

کعب: ''ہاں۔''

محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے اسے سونگھا اور پھر اپنے ساتھیوں کو بھی سونگھایا، پھر کعب سے کہا: ''مجھے دوبارہ اجازت ہے؟'' کہنے لگا: ''ہاں!'' اب جب محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے اسے اچھی طرح زور سے تھام لیا تو اپنے ساتھیوں سے کہا: ''پکڑ لو۔'' تو انھوں نے اسے قتل کر دیا۔

---

[1] سیرت کی کتابوں میں کعب کو قتل کرنے والے پانچ اشخاص کا تذکرہ ہے: محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ۔ سِلکان بن سلامہ بن وقش ابو نائلہ رضی اللہ عنہ جن کا تعلق بنو عبد الاشہل سے تھا۔ یہ کعب کے دودھ شریک بھائی تھے۔ عباد بن بشر بن وقش رضی اللہ عنہ ان کا تعلق بھی بنو عبد الاشہل سے تھا اور اسی طرح حارث بن اوس بن معاذ رضی اللہ عنہ یہ بھی بنو عبد الاشہل سے تھے، بنو حارثہ میں سے ابو عبس بن جبر رضی اللہ عنہ تھے۔ انھوں نے ابو نائلہ کو کعب سے گفتگو کرنے کے لیے آگے کیا۔

بعدازاں وہ نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ کو اس کی خبر دی۔[1]

سیرت ابن ہشام میں ہے کہ جب محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کعب کو قتل کرنے کی تیاری کر چکے تو اس کے بعد تین دن تک انتہائی معمولی خوراک لے رہے تھے جس سے زندگی بحال رہ سکے۔ آپ ﷺ کو اس کی اطلاع ملی تو اسے بلا کر دریافت فرمایا:

«لِمَ تَرَكْتَ الطَّعَامَ وَالشَّرَابَ؟» ''تم نے کھانا پینا کیوں چھوڑ دیا ہے؟''

عرض کیا: ''یارسول اللہ! میں نے آپ سے کعب کو قتل کرنے کے سلسلے میں جو بات کی ہے مجھے معلوم نہیں اسے پورا بھی کرسکوں گا یا نہیں؟''

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: «إِنَّمَا عَلَيْكَ الْجَهْدُ» ''تم پر تو صرف کوشش کرنا لازم ہے۔''

عرض کیا: ''ہمیں ضرور کچھ نازیبا الفاظ کہنے پڑیں گے؟''

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «قُولُوا مَا بَدَا لَكُمْ» ''تمھارے احوال جو تقاضا کریں کہہ لینا۔''[2]

سیرت ابن اسحاق میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے حسن سند سے منقول ہے کہ آپ ﷺ ان کے ساتھ بقیع الغرقد تک تشریف لے گئے، پھر انھیں اس مہم پر روانہ کرتے ہوئے فرمایا: «اِنْطَلِقُوا عَلَى اسْمِ اللّٰهِ، اللّٰهُمَّ أَعِنْهُمْ» ''اللہ تعالیٰ کے نام سے اپنے اس سفر کا آغاز کرو۔ اے اللہ! ان کی نصرت واعانت فرما۔''[3]

اسباق اور عبرتیں: کعب کے قصۂ قتل میں متعدد عبرتیں، اسباق اور حکمتیں ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اسلام اور حکومت اسلامیہ کے دشمنوں سے کیسا سلوک کیا۔ اس سے یہ بات تو روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ عہد شکن انسان کی سزا قتل ہی ہے۔ اور آپ ﷺ نے یہی فیصلہ فرمایا۔ اور یہ بھی ثابت ہوا کہ جو شخص معاہد ہو کر پیغمبر علیہ السلام کو گالی گلوچ کرے

---

[1] صحيح البخاري، حديث: 4037، و صحيح مسلم، حديث: 1801. [2] السيرة النبوية لابن هشام: 58/3. [3] السيرة النبوية لابن هشام: 59/3.

اور پیغمبر ﷺ کی ہجو کر کے آپ ﷺ کی دل آزاری کرے اس کی سزا قتل ہی ہے۔ اور کعب کے ساتھ یہی سلوک ہوا۔ اس سے یہ نتیجہ بھی بآسانی نکالا جاسکتا ہے کہ شاتم رسول، خواہ معاہد ہو یا کوئی اور اس کی گردن بطور سزا کاٹ دی جائے گی۔ ان احکام کی عمدہ تفصیل شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''الصارم المسلول علی شاتم الرسول ﷺ'' میں کی ہے۔

❁ کعب بن اشرف کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کے حکم کو اس انداز سے عملی جامہ پہنانے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ بعض امور کو مصلحتِ عامہ کے تحت مخفی طور پر بھی بروئے کار لایا جاسکتا ہے۔ خاص طور پر جب کسی حکم کو ظاہری طور پر ادا کرنے میں مسلمانوں کو کسی فتنے کا ڈر یا کوئی خطرہ لاحق ہو جو مسلمانوں کے لیے کسی بڑی مشقت کا پیش خیمہ بن جائے۔[1]

❁ اس واقعے نے یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ دشمنانِ اسلام اور حکومت مخالف عناصر سے میدانِ جنگ کے علاوہ بھی نپٹا جاسکتا ہے اور گناہ سے بچتے ہوئے ہر طریقے سے دشمن کو زچ بھی کیا جاسکتا ہے۔ مسلمانوں کے خلاف جنگ کے شعلے بھڑکانے اور انھیں جگر سوز مظالم اور زبردست نقصانات سے دوچار کرنے والا شخص خود ہی اپنے خلاف فیصلے کا حق دے دیتا ہے۔

یہ سب ایسی صورت ہی میں روا ہے جب فتنے کا خوف نہ ہو، یعنی مسلمانوں کو غلبہ، قوت اور حکومت میسر ہو تاکہ اس کے نتیجے میں مسلمانوں کی پکڑ دھکڑ، داعیانِ دین کا غیر ممالک سے انخلا اور ان کے معاشرے میں فتنہ و فساد کا اندیشہ نہ رہے۔[2]

❁ اس طرح کے واقعات کو لے کر بعض مسلمانوں نے جلد بازی سے مسلم ممالک میں مسلح تصادم کا رستہ اپنا لیا ہے، حالانکہ ان کا اس سے استدلال غلط ہے کیونکہ یہ مدینہ کا واقعہ ہے اور وہاں اس وقت مسلمانوں کی شان و شوکت اور حکومت تھی، جبکہ ان کے پاس حکومت

[1] الصراع مع اليهود لأبي فارس: 115/1. [2] التاريخ الإسلامي للحميدي: 54/5.

ہے نہ تسلط۔ پھر یہ بھی واضح رہے کہ اس واقعے میں دین کی بالادستی، اس کا استحکام اور کفار کو مرعوب کرنا مقصود تھا اور یہ سب مصالح ہی تھے۔ ان کے ہوتے ہوئے کسی خرابی کا خطرہ نہ تھا۔ لیکن موجودہ کمزور صورتِ حال میں اس جیسے جو واقعات رونما ہوتے ہیں ان کا نتیجہ ہر ذی شعور اور صاحب بصیرت دیکھ رہا ہے کہ اموال پر قبضہ کر لیا جاتا ہے، ان کے بدلے میں مسلمانوں کا ناحق خون ہوتا ہے، عزت پامال کر دی جاتی ہے اور شر و فساد کا لامتناہی سلسلہ چل پڑتا ہے۔[1]

❁ رسول اللہ ﷺ نے مکہ مکرمہ میں قیام کے دوران مشرکین میں سے کسی کو ملیامیٹ کرنے کی کوشش نہیں کی باوجود اس کے کہ آپ ﷺ شرک کے پرستاروں، مثلاً: ابوجہل، امیہ بن خلف اور عتبہ وغیرہ کو قتل کرنے کی طاقت رکھتے تھے۔ اگر آپ ﷺ سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ یا سیدنا عمر رضی اللہ عنہ یا اپنے اصحاب میں سے کسی کو اشارہ فرماتے تو ان میں ہر کوئی یہ فریضہ سرانجام دے سکتا تھا لیکن سیرت طیبہ اس بارے میں ہماری رہنمائی کرتی ہے کہ کفر کے ستون گرانے کے لیے طاقت و غلبہ کی ضرورت ہے۔ اس سے ضمناً یہ بھی سمجھ آتا ہے کہ اہل حل و عقد اور علم میں راسخ علماء، جو اس بارے میں مصالح اور مفاسد پر دقیق نگاہ رکھتے ہوں، وہی اس مسئلے کی چھان بین کر کے فتویٰ جاری کریں تو ایسا اقدام کرنا چاہیے۔

اس وقت تو یہ معاملہ اور زیادہ پیچیدگی اختیار کر گیا ہے کیونکہ اس زمانے میں مصالح اور مفاسد آپس میں خلط ملط ہو چکے ہیں۔ اور ملکی سطح پر رائے عامہ کا لحاظ رکھتے ہوئے قانون تشکیل دیا جاتا ہے اور اس طرح نقصانات پہنچانے کے ذرائع اور امکانات بہت وسیع ہو چکے ہیں۔[2]

❁ اس واقعے میں ہم دیکھ سکتے ہیں کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے ہاں اپنی بات کی کتنی قدر و قیمت ہوتی تھی! ہم محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کا شاندار طرز عمل دیکھتے ہیں کہ انھوں نے جب نبی ﷺ

[1] وقفات تربوية مع السيرة النبوية لأحمد فريد، ص:205. [2] الأساس في السنة لسعيد حوّى: 537/2.

سے یہودی کے قتل کرنے کا عہد کرلیا اور اسے پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے مشکلیں سر کرتے ہوئے تاخیر ہوئی تو کھانا پینا چھوڑ دیا اور ان پر غم سوار رہنے لگا۔ کیونکہ زبان سے ایک بات کہہ دی تھی جس کے متعلق انھیں خطرہ لاحق تھا کہ کہیں نامکمل ہی نہ رہ جائے۔ ہم موجودہ زمانے میں اپنے معاشرے کو دیکھتے ہیں کہ اکثر لوگ پکے وعدے تو کر لیتے ہیں مگر وعدے کی قدر و قیمت سے ناآشنا ہیں۔ ہم عہد شکنی کرتے اور وعدے کرکے بآسانی ان سے پس و پیش کرجاتے ہیں۔ وعدہ تو بس کاغذ پر سیاہی کی حد تک ہی باقی رہ جاتا ہے۔ ایسے لوگ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور اصول کے احترام کے بجائے نظریۂ ضرورت کے پجاری ہوتے ہیں۔ جن کی طرف سے ہر وقت اسی نظریے کو معبود قرار دیے جانے کا خدشہ رہتا ہے۔ جبکہ پختہ عزم کے حامل لوگ گردن کے کٹ جانے، جسم کے کمزور ہوجانے اور روح کے بدن کا ساتھ چھوڑ جانے کو اپنی بات سے پھر جانے اور اپنے عہد و میثاق کو توڑ دینے پر ترجیح دیتے ہیں۔ وہ اسلام اور اس کے عقائد و نظریات کی خاطر ہر قسم کی سزا حتی کہ موت کو گلے لگا کر بھی لطف اندوز ہوتے ہیں۔[1]

❁ فرمانِ رسول ﷺ: «إِنَّمَا عَلَيْكَ الْجَهْدُ» ”تیرا کام تو فقط خوب محنت کرنا ہے۔“ میں آپ ﷺ کی طرف سے اس بات کی رہنمائی ہے کہ نصرت الٰہی صرف جدو جہد اور مشکل کے وقت صبر کی مرہون منت ہوتی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ ۚ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَآ اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا ۛ فَاصْبِرْ ۛ اِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝﴾

”(اے نبی!) یہ کچھ غیب کی خبریں ہیں، ہم انھیں آپ کی طرف وحی کرتے ہیں، اس سے پہلے نہ آپ انھیں جانتے تھے اور نہ آپ کی قوم، اس لیے آپ صبر کریں، بے شک (بہترین) انجام متقین ہی کے لیے ہے۔“[2]

[1] الصراع مع اليهود لأبي فارس: 119/1. [2] هود 49:11.

مسلمان کے ذمے ہے کہ اپنی حتی المقدور توانائی، فکری صلاحیتیں اور جسمانی طاقتیں ایفائے عہد پر صرف کردے، بعد ازاں ان کے نتائج اللہ تعالیٰ کے سپرد کرے۔[1]

❁ یہ فرمانِ رسول ﷺ: «قُولُوا مَا بَدَا لَكُمْ» ''جو ضرورت ہو کہہ لینا۔''[2] آپ ﷺ کی عمدہ اور گہری سوجھ بوجھ کی غمازی کرتا ہے کیونکہ محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے ایسی گفتگو کرنی تھی جو عام حالات میں دائرۂ کفر میں شمار ہوتی ہے۔

یہاں یہ نکتہ بھی سامنے آتا ہے کہ اہم جنگی ضروریات کے پیش نظر گفتگو میں شرعی پابندیوں کو ملحوظ نہ رکھنے کا جواز ہے۔ لیکن یہاں ایک اور مسئلہ سامنے آتا ہے کہ اگر جنگی مشاغل کچھ غیر شرعی اعمال وافعال کا تقاضا کریں یا فرائض چھوڑنے کی نوبت آجائے تو کیا صورت اختیار کی جائے؟ صحیح بات تو یہ ہے کہ کفر و شرک سے بڑا کوئی گناہ نہیں تو جب کفر کا اظہار درست ہے تو دیگر امور بطریقِ اولیٰ جائز ٹھہرے لیکن یہ اس صورت میں ہے جب مقصود تک رسائی یقینی نظر آرہی ہو یا کم از کم کامیابی کا غالب امکان ہو۔ اور پھر کسی فرض کے ترک یا اسے مؤخر کرنے کی نوبت پیش آئے تو ضروری ہے کہ ایسی اجازت کو اسی حد تک روا رکھا جائے جس کے بغیر کوئی چارہ ہی نہ ہو۔ ایسی صورتِ حال میں حدود سے بڑھنے اور ممنوع افعال کے ارتکاب میں سے جس کی بھی نوبت آئے اس کو اہل فتویٰ کی رہنمائی کے بغیر ہرگز نہ کیا جائے۔ جبکہ کچھ شرعی محرمات وممنوعات ایسی بھی ہیں، مثلاً: زناکاری اور ہم جنس پرستی وغیرہ جو کسی بھی صورت جائز نہیں ہیں۔[3]

اور کچھ معاملات ایسے بھی ہیں جن کے لیے باصلاحیت اور ماہر اہل فتویٰ کے فتوے کی ضرورت ہوتی ہے۔ خاص طور پر جب کوئی ایسی استثنائی یا اضطراری، سیاسی یا عسکری صورت سامنے آجائے جس کی ہر کوئی استطاعت نہیں رکھتا۔ بنیادی احکام تو نامعلوم نہیں ہوتے لیکن استثنائی صورت حال میں استثنائی فتوے کی ضرورت ہوتی ہے جس کے لیے راسخ فقہاء

---

[1] الصراع مع اليهود لأبي فارس: 120/1. [2] السيرة النبوية لابن هشام: 61/3. [3] الأساس في السنة لسعيد حوّى: 538,537/2.

اور ربانی علماء کی ضرورت پیش آتی ہے جنھیں شریعت کے مقاصد سمجھنے کی قدرت اور لوگوں کے رہن سہن اور اس معاشرے کا جس میں وہ زندگی بسر کر رہے ہیں مکمل ادراک ہو۔ [1]

❁ اور فرمانِ رسول ﷺ: «قُولُوا مَا بَدَا لَكُمْ» ''جس کا تقاضا ہو کہہ لینا۔'' میں بڑی حکمت و دانائی ہے جس کی وضاحت یہ فرمانِ رسول ﷺ کرتا ہے: «اَلْحَرْبُ خُدْعَةٌ» ''جنگ چالبازی کا نام ہے۔'' [2]

❁ فرمانِ رسول ﷺ ہے: «اِنْطَلِقُوا عَلَى اسْمِ اللّٰهِ، اَللّٰهُمَّ أَعِنْهُمْ» ''اللہ تعالیٰ کے نام سے سفر کا آغاز کرو۔ اے اللہ! ان کی مدد فرما۔'' جہاد میں اس فرمان سے اخلاص کی یاد دہانی ہوئی۔ اور ان کے لیے مدد اور توفیق کی دعا بھی ہے۔

یہ فرامین ثابت قدمی اور بلند حوصلے کا باعث بنے۔ یہی وجہ تھی کہ انھوں نے کعب بن اشرف کی طاقت وقوت اور اس کے اردگرد موجود لوگوں کی کوئی پروا نہ کی کیونکہ انھیں اللہ تعالیٰ کی معیت کا بھرپور یقین تھا اور یہ ادراک بھی تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کے لیے رب تعالیٰ کی نصرت اور مقصد پورا ہونے کی دعا کی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی سیرتِ مبارکہ میں ہمیں یہ چیز نظر آتی ہے کہ نبی مکرم ﷺ نے دعا کے ساتھ ساتھ تمام مادی اسباب اور درست منصوبہ بندی کو بھی اختیار کیا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اپنے مقصد میں کامیابی کا باعث بننے والے اسباب سے ہرگز بے خبر نہیں رہے اور مسلمان کو اللہ پر توکل اور تمام جائز اسباب اختیار کرنے کا حکم ملا ہے۔ [3]

اس لیے حضرت محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے اپنے دیگر ساتھیوں کے ساتھ بڑا شاندار منصوبہ تشکیل دیا۔ دراصل انھوں نے اسباب اختیار کرنے کے پہلو کو خوب سمجھ لیا تھا۔

کعب بن اشرف کے قتل کے منصوبے کی تکمیل میں جو اسباب بروئے کار لائے گئے وہ درج ذیل ہیں:

---

1 الأساس في السنة لسعيد حوّى: 538,537/2. 2 صحيح مسلم، حديث: 1740. 3 التاريخ الإسلامي للحميدي: 56/5.

❁ ابونائلہ رضی اللہ عنہ کعب کا دودھ شریک بھائی تھا جس سے وہ مطمئن تھا اور اسے ان کی طرف سے کوئی خطرہ لاحق نہیں تھا۔

❁ بعض روایات میں ہے کہ ابونائلہ رضی اللہ عنہ نے اس سے کلام کرنے سے قبل اس کے ساتھ اشعار کا تبادلہ کیا اور اس طرح اس کو اطمینان دلایا اور اس کے ہاں اپنا مقام بنالیا۔

❁ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کعب سے اس وقت تک گفتگو نہ کی جب تک کعب کو قلعے سے باہر نہ نکلوا لیا اور کچھ دیر تک اس سے گفتگو کرتے رہے حتی کہ وہ ان سے مانوس اور مطمئن ہو گیا۔ یہ سب کچھ کامیابی کے ذرائع بروئے کار لانے کے لیے تھا، وگرنہ اگر وہ وہاں ہی رہتے تو راز کھل بھی سکتا تھا، لہٰذا ان کا اسے تنہا کر کے اس سے گفتگو کرنا انتہائی اہمیت کا حامل تھا۔

❁ محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے جنگی چال کے تحت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اکتاہٹ کا اظہار، آپ کی طرف ظلم وزیادتی کی نسبت اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عیب جوئی نے کعب کو مطمئن کر دیا۔

❁ اسلحہ گروی رکھنے کی رائے انتہائی مناسب تھی تاکہ اسلحہ ساتھ لانے سے وہ شک وشبہ میں مبتلا نہ ہو جائے۔ اس طرح وہ کعب کے پاس اسلحہ بطور گروی لا سکتے تھے اور جب بھی اس سے ملاقات ہوتی یہ اسلحہ استعمال کر سکتے تھے۔

❁ کعب سے وقت طے کر لینا بھی اس منصوبے کو استحکام بخشنے کا باعث تھا کیونکہ اس طرح اب وہ بغیر شک میں ڈالے رات کے کسی بھی حصے میں اس کے پاس آ کر دستک دے سکتے تھے۔

❁ کعب ابونائلہ اور محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہما سے اتنا مطمئن ہو چکا تھا کہ اچانک اور غفلت میں اپنے اوپر حملہ ہونے کو بھلا کر ایسے وقت میں گھر سے نکل آیا جس وقت میں آدمی عام طور پر باہر نہیں نکلتا۔[1]

❁ کعب کو گھر سے اتنی دور لے جانا کہ جس جگہ وہ بغیر کسی مددگار اور نگران کے ہو بڑا کارگر منصوبہ تھا۔

[1] الصراع مع اليهود لأبي فارس: 122/1.

❁ محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ [1] کا کعب کو الو بنانا، اس کے سر کی خوشبو سونگھنا، پھر بالوں کو سونگھنے کے بہانے مضبوطی سے پکڑنا بڑا کامیاب حیلہ اور اس شرانگیز سر پر مکمل گرفت کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ اس ملعون یہودی پر اللہ کے حکم کی تنفیذ کا یہ نادر موقع ہاتھ سے جانے نہ پائے۔

❁ اس سے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی اپنے راز کو محفوظ رکھنے کی اعلیٰ صلاحیت کا بھی پتا چلتا ہے۔ وہ اس طرح کہ مدینہ میں یہود اور منافقین خاصی تعداد میں موجود تھے، علاوہ ازیں اس منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچاتے کئی دن لگے تھے۔ یہ بات بھی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ معاملہ صحابۂ کرام کے سامنے پیش کیا۔ اس کے متعلق مشورہ بھی ہوا مگر راز راز ہی رہا۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی قوت ایمانی اور اپنے دین کے ساتھ اخلاص کی یہ نمایاں دلیل ہے۔ [2]

میدانِ جنگ کے ان شہسواروں نے طے شدہ منصوبے کے ہر پہلو کو عمدہ طور پر پورا کیا اور اپنا عظیم مقصد پالیا، جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی مکمل احساسات اور جذبات کے ساتھ ان کے پہلو بہ پہلو تھے۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم منصوبے کو عملی شکل اپنے فہم کے مطابق جسمانی توانائیوں کے ذریعے سے دیتے تھے۔ جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے لیے نصرت اور اعانت کی دعا فرماتے

---

[1] مؤلف نے یہاں محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کے بجائے ابونائلہ رضی اللہ عنہ کا تذکرہ کیا ہے، جبکہ اس واقعے کو امام بخاری رحمہ اللہ کے حوالے سے بیان کرتے ہوئے مؤلف ہی نے اس جگہ محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کا نام لکھا تھا۔ دراصل صحیحین میں اس مقام پر محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ ہی کا تذکرہ ہے۔ (دیکھیے: صحيح البخاري، حديث: 4037، و صحيح مسلم، حديث: 1801) مگر بعض اصحاب مغازی اور اہل سیر نے اس جگہ پر ابونائلہ رضی اللہ عنہ کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ یوں رقمطراز ہیں: ''اس صحیح روایت میں آیا ہے کہ جنھوں نے اس موقع پر کعب بن اشرف سے گفتگو کی تھی وہ محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ ہی تھے، جبکہ ابن اسحاق اور ان کے علاوہ اصحاب مغازی نے ابونائلہ رضی اللہ عنہ کا نام لکھا ہے۔ اور دمیاطی رحمہ اللہ نے اسے ہی ترجیح دی ہے۔ بہرکیف یہ احتمال موجود ہے کہ ان دونوں ہی نے اس بارے میں کعب سے کوئی بات کی ہو، اس لیے کہ ابونائلہ رضی اللہ عنہ اس کے دودھ شریک بھائی تھے اور محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کعب کے بھانجے تھے۔'' (فتح الباري: 423,422/7) [2] التاريخ الإسلامي للحميدي: 56/5.

اور اللہ تعالیٰ سے تعلق برقرار رکھ کر قائدانہ فریضہ انجام دیتے تھے۔ [1]

یہود کے سرغنے کعب بن اشرف کے قتل کا یہودیوں پر اثر: کعب بن اشرف کے قتل کی خبر مدینہ میں چہار سو پھیل گئی۔ علمائے یہود انتہائی سرعت سے رسول اللہ ﷺ کے پاس شکایت لے کر آ گئے اور صحابہ کے اس فعل پر ناگواری کا اظہار کرتے ہوئے اعتراض کرنے لگے۔ آپ ﷺ نے ان کی کوئی پروانہ کی بلکہ اسے اس کے معاندانہ کردار کا لازمی نتیجہ قرار دیا۔

اس واقعے نے تمام یہود کے دلوں میں رعب بھر دیا۔ اب تو ان کے بڑوں میں سے کوئی بھی قلعے سے باہر آنے کی جرأت ہی نہ کرتا۔ اسی طرح مدینے کا ہر یہودی مسلمانوں سے خوف زدہ رہنے لگا اور یہود اپنے عہد کی تجدید کرنے پر مجبور ہو گئے۔ کعب کے قتل کا ان پر انتہائی گہرا اثر پڑا اور وہ اسلام کے خلاف گھناؤنی سازشیں کرنے کے درپے ہو گئے، جیسا کہ آنے والے واقعات اس کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کعب کے جرم کی پاداش میں بنونضیر کا مواخذہ نہیں کیا بلکہ اس کی بدعہدی کے پیش نظر اسی کے قتل پر اکتفا کیا۔ اور یہود کے ساتھ معاہدے کی تجدید کی۔ [2]

رسول اللہ ﷺ کا یہود کے ساتھ یہ معاملہ آپ کی اعلیٰ بصیرت کی غمازی کرتا ہے کیونکہ یہودی طبعی طور پر شر پسند تھے۔ شرارتوں سے باز رہنا یا ان سے کنارہ کشی ان کے بس کی بات نہیں تھی، لہٰذا آپ ﷺ نے ان کے سرغنے کو قتل اور کچھ کو جلاوطن کر کے ان کو رعب تلے رکھنے کا مناسب حل تجویز فرمایا۔ [3]

کچھ اجتماعی مناسبات (تعلق داریاں و روابط)

رسول اللہ ﷺ کا حفصہ رضی اللہ عنہا سے نکاح: حضرت عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب میری

[1] التاريخ الإسلامي للحميدي: 57/5. [2] السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري: 304/1.
[3] الصراع مع اليهود لأبي فارس: 126/1.

بیٹی حفصہ کے خاوند خُنَیس بن حذافہ سہمی رضی اللہ عنہ، جو کہ شرکائے بدر میں سے تھے، مدینہ منورہ میں فوت ہوگئے تو میں نے عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو اس سے نکاح کی پیش کش کی تو وہ کہنے لگے: ''میں اپنے بارے میں ذرا سوچ بچار کرلوں۔'' کچھ دن گزرنے کے بعد وہ مجھ سے ملے اور کہنے لگے: ''میرا خیال ہے کہ میں ان دنوں شادی نہ کروں۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ بعدازاں میں ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ملا اور ان سے کہا: ''اگر آپ چاہیں تو میں اپنی بیٹی کا عقد آپ کے ساتھ کردوں۔'' ابوبکر رضی اللہ عنہ نے خاموشی اختیار کرلی اور کوئی جواب نہ دیا۔ یہ صورت حال دیکھ کر مجھے ابوبکر رضی اللہ عنہ پر عثمان رضی اللہ عنہ سے بھی زیادہ دکھ ہوا۔ چند ہی دن گزرے ہوں گے کہ حفصہ رضی اللہ عنہا کو رسول اللہ ﷺ نے نکاح کا پیغام بھیج دیا۔ میں نے اس کا نکاح آپ ﷺ سے کردیا تو اب مجھے ابوبکر رضی اللہ عنہ ملے اور کہنے لگے: ''آپ نے جب مجھے حفصہ رضی اللہ عنہا کے متعلق کہا اور میں نے کوئی جواب نہ دیا تو شاید آپ کو غصہ آیا ہو؟'' حضرت عمر نے کہا: ''جی ہاں۔'' ابوبکر رضی اللہ عنہ کہنے لگے: ''میں آپ کی اس پیش کش کا جواب ضرور دیتا مگر مجھے معلوم ہوچکا تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے حفصہ کا تذکرہ کیا ہے۔ اور یہ آپ ﷺ کا ایک راز تھا جسے میں افشا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ہاں! اگر آپ ﷺ ارادہ ترک فرماتے تو میں ضرور اسے قبول کرتا۔''[1]

سیدہ فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے عقد میں: حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے متعلق رسول اللہ ﷺ کو نکاح کا پیغام موصول ہوا تو ایک لونڈی نے مجھ سے دریافت کیا کہ کیا تمھیں معلوم ہے کہ آپ ﷺ کو فاطمہ رضی اللہ عنہا کے متعلق نکاح کا پیغام پہنچا ہے؟ میں نے کہا: ''نہیں۔'' لونڈی بولی: ''انھیں پیغام موصول ہوا ہے۔ مگر تمھارے سامنے کیا رکاوٹ ہے کہ تم رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤ اور وہ تمھارے ساتھ اس کا عقد کردیں؟'' میں نے کہا: ''میرے پاس کچھ ہے کہ شادی

[1] صحيح البخاري، حديث: 5122.

کروں!'' وہ کہنے لگی: ''تم اگر نبی ﷺ کے پاس جاؤ تو آپ ﷺ ضرور تمھارے ساتھ اس کا عقد کردیں گے۔''

حضرت علی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ''وہ مسلسل مجھے امید دلاتی رہی حتی کہ میں آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوگیا۔ جب میں آپ ﷺ کے سامنے بیٹھا تو اللہ کی قسم! آپ کے رعب و دبدبہ اور ہیبت کے مارے کوئی بات نہ کرسکا۔''

آپ ﷺ نے خود فرمایا: «مَا جَاءَ بِكَ؟ أَلَكَ الْحَاجَةُ؟» ''کیسے آنا ہوا؟ کوئی کام ہے؟''

میں خاموش رہا تو آپ ﷺ نے فرمایا: «لَعَلَّكَ جِئْتَ تَخْطُبُ فَاطِمَةَ» ''شاید تم فاطمہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کے متعلق بات کرنے آئے ہو؟''

میں نے عرض کیا: ''ایسا ہی ہے۔''

آپ ﷺ نے فرمایا: «وَ هَلْ عِنْدَكَ مِنْ شَيْءٍ تَسْتَحِلُّهَا بِهِ» ''کیا تمھارے پاس حق مہر میں دینے کے لیے کچھ ہے؟''

میں نے عرض کیا: ''نہیں، اللہ کی قسم! اے اللہ کے رسول!۔''

پھر آپ ﷺ نے فرمایا: «مَا فَعَلَتْ دِرْعٌ سَلَّحْتُكَهَا؟» ''میں نے تمھیں جو زرہ اسلحے کے طور پر دی تھی اس کا کیا بنا؟''

سیدنا علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں علی کی جان ہے! وہ واقعی مضبوط اور بھاری زرہ تھی لیکن اس کی قیمت چار درہم بھی نہ تھی۔''

میں نے عرض کیا: ''وہ میرے پاس ہے۔''

فرمایا: «قَدْ زَوَّجْتُكَهَا، فَابْعَثْ إِلَيْهَا بِهَا، فَاسْتَحِلَّهَا بِهَا» ''میں نے اس پر فاطمہ سے تیرا عقد کردیا۔ یہ زرہ فاطمہ کو دے دو اور گھر بساؤ۔''

یہی رحمت عالم ﷺ کی صاحبزادی سیدہ فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کا حق مہر تھا۔[1]

[1] دلائل النبوة للبيهقي: 160/3.

اس کے ساتھ ساتھ آپ ﷺ نے فاطمہ رضی اللہ عنہا کو ایک دھاری دار چادر، مشکیزہ اور ایک چمڑے کا تکیہ، جس میں گھاس بھری ہوئی تھی، عنایت کیا۔[1]

یہی ان کا انداز زندگی تھا جس میں انتہائی سادگی اور بے تکلفی تھی اور وہ تکلفات اور پیچیدگیوں سے کوسوں دور تھے۔ وہ اسباب زندگی کی بہتات کی نسبت انتہائی محدود وسائل اختیار کرتے تھے۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی طرف سے قیدیوں میں سے ایک خادم کی درخواست کے جواب میں رسول اللہ ﷺ کا موقف، جو درج ذیل واقعے میں آ رہا ہے، سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی دشوار گزار زندگی کی عکاسی کرتا ہے۔

مسند احمد میں روایت ہے کہ ایک دن حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے کہا: ''اللہ کی قسم! کنویں کا پانی کھینچ کھینچ کر میرے سینے میں تکلیف ہوگئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تمھارے والد گرامی کو قیدیوں سے نوازا ہے۔ تم ان کے پاس جاؤ اور کسی خادم کا مطالبہ کرو۔'' حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کہنے لگیں: ''اللہ کی قسم! آٹا پیس پیس کر میرے ہاتھوں پر بھی آبلے پڑ گئے ہیں۔'' لہٰذا میں آپ ﷺ کے پاس آئی۔ آپ ﷺ نے دریافت فرمایا:

«مَاجَاءَ بِكِ أَيْ بُنَيَّةُ؟!» ''میری بیٹی! کیسے آنا ہوا؟''

میں نے عرض کیا: ''آپ کو سلام کرنے حاضر ہوئی ہوں۔'' اور مارے شرم کے کچھ کہہ ہی نہ سکی اور سوال کیے بغیر ہی واپس چلی آئی۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: ''کیا کر کے آئی ہو؟'' جواباً کہا: ''مجھے شرم آرہی تھی میں سوال ہی نہ کر سکی۔'' اس کے بعد ہم دونوں حاضر ہوئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! اللہ کی قسم! کنویں سے پانی نکال نکال کر سینہ دکھنے لگا ہے۔'' اور فاطمہ رضی اللہ عنہا نے عرض گزاری: ''میرے ہاتھوں پر آبلے پڑ گئے ہیں۔ اللہ کے فضل سے آپ کو قیدی ملے ہیں۔ اب فراخی ہوگئی ہے، لہٰذا ہمیں کوئی خادم عنایت کیجیے۔'' آپ ﷺ نے فرمایا:

1 صحيح السيرة النبوية للدكتور العمري، ص: 267.

«وَاللّٰهِ! لَا أُعْطِيكُمَا، وَأَدَعُ أَهْلَ الصُّفَّةِ تَطْوٰى بُطُونُهُمْ، لَا أَجِدُ مَا أُنْفِقُ عَلَيْهِمْ وَلٰكِنِّي أَبِيعُهُمْ وَأُنْفِقُ عَلَيْهِمْ أَثْمَانَهُمْ»

''اللہ کی قسم! میں تمھیں نہیں دوں گا۔ کیا میں اہل صفہ کو چھوڑ دوں جو بھوک کے مارے لاغر ہو رہے ہیں۔ میرے پاس ان کے اخراجات کے لیے کچھ نہیں۔ ان قیدیوں کو بیچ کر ان کی قیمت ان پر خرچ کروں گا۔''

چنانچہ حضرت علی اور فاطمہ رضی اللہ عنہما دونوں واپس آگئے۔ اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان دونوں کے پاس تشریف لائے۔ دونوں چادریں اوڑھے لیٹے ہوئے تھے۔ چادریں بھی اتنی چھوٹی تھیں کہ سر ڈھانپتے تو پاؤں ننگے ہو جاتے اور پاؤں ڈھانپتے تو سر ننگے ہو جاتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر دونوں اٹھ بیٹھے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «مَكَانَكُمَا» ''اپنی جگہ پر رہو۔''

پھر فرمایا: «أَلَا أُخْبِرُكُمَا بِخَيْرٍ مِّمَّا سَأَلْتُمَانِي؟» ''تم دونوں جو طلب کرنے آئے تھے تمھیں اس سے بہتر بات نہ بتاؤں؟''

دونوں نے عرض کیا: ''کیوں نہیں!''

فرمایا: «كَلِمَاتٌ عَلَّمَنِيهِنَّ جِبْرِيلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ، فَقَالَ: تُسَبِّحَانِ فِي دُبُرِ كُلِّ صَلَاةٍ عَشْرًا، وَّتَحْمَدَانِ عَشْرًا، وَّتُكَبِّرَانِ عَشْرًا، وَّإِذَا أَوَيْتُمَا إِلٰى فِرَاشِكُمَا فَسَبِّحَا ثَلَاثًا وَّثَلَاثِينَ وَاحْمَدَا ثَلَاثًا وَّثَلَاثِينَ وَكَبِّرَا أَرْبَعًا وَّثَلَاثِينَ» ''مجھے جبریل علیہ السلام نے یہ کلمات سکھائے ہیں'' پھر فرمایا: ''ہر نماز کے بعد تم دونوں دس دفعہ سبحان اللہ، دس مرتبہ الحمد للہ اور دس بار اللہ اکبر کہا کرو۔ اور جب بستر پر آؤ تو تینتیس بار سبحان اللہ، تینتیس دفعہ الحمد للہ اور چونتیس بار اللہ اکبر کہا کرو۔''[1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اہل بیت اور عزیز و اقارب کی تربیت کا یہ انداز تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ

[1] مسند أحمد: 107,106/1، اس حدیث کی اصل صحيح البخاري، حدیث: 3113 میں بھی ہے۔

اور فاطمہ رضی اللہ عنہا کی طرف سے غلام حاصل کرنے کی کوشش بے سود گئی کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم قیدیوں کو فروخت کر کے بھوک سے لاچار اہل صفہ پر خرچ کرنا چاہتے تھے۔ اور پھر حضرت علی اور فاطمہ رضی اللہ عنہما کی طرح اہل صفہ سے بھی آپ کا خصوصی تعلق تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور فاطمہ رضی اللہ عنہا کو خدمت کی ضرورت تھی، جبکہ اصحاب صفہ کو کھانے کی ضرورت تھی اور ظاہر ہے خدمت پر کھانے کو اولیت حاصل ہے۔[1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس نبوی تربیت کا گہرا اثر قبول کیا۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا عہد شباب رفتہ رفتہ گزرتا چلا گیا۔ ایک وقت آیا کہ وہ مسلمانوں کے خلیفہ مقرر ہوئے۔ ان پر ابھی تک نبوی تربیت کے آثار موجود تھے۔ زمین کے خزانے اور بھلائیاں ہاتھ میں آ گئیں مگر دنیا کی زیب و زینت سے کوسوں دور رہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُس وصیت کا اثر ابھی تک چلا آ رہا ہے اور دل و جان ذکر الٰہی سے معمور ہیں۔ خود بیان کرتے ہیں کہ اللہ کی قسم! جب سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ وظیفہ سکھایا ہے اسے میں نے کبھی نہیں چھوڑا۔ ایک شخص (ابن الکوّاء) نے دریافت کیا: ''جنگ صفین کی رات بھی نہ چھوڑا؟'' فرمانے لگے: ''ہاں! صفین کی رات بھی ترک نہیں کیا تھا۔''[2]

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی مجلس میں ضرار بن ضمرہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی سیرت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا: ''وہ دنیا اور اس کی نمود و نمائش سے انتہائی متنفر، رات اور اس کی تاریکی سے مانوس تھے۔ اللہ کی قسم! وہ بہت روتے رہتے، خاصی دیر تک سوچ بچار کرتے اور اپنی ہتھیلیاں الٹ پلٹ کرتے، اپنے نفس کو جھنجھوڑتے، مختصر لباس پسند کرتے اور موٹا جھوٹا کھانا (غریبوں کی طرح سادہ سا کھانا) مرغوب رکھتے تھے۔''[3]

1. التربية القيادية للدكتور الغضبان: 100/3. 2 مسند أحمد: 107,106/1، و الإصابة: 159/8.
3 صفة الصفوة لابن الجوزي: 84/1.

باب 2

میدانِ احد سے پہلے کے حالات

غزوۂ احد کے اسباب

جنگ احد کے کئی ایک اسباب تھے جن میں سے کچھ دینی، چند ایک معاشرتی، بعض اقتصادی اور کچھ سیاسی تھے، ان کی وضاحت درج ذیل ہے:

دینی سبب: اللہ تعالیٰ نے باخبر فرمایا ہے کہ مشرکین اپنے مال اللہ کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے، اسلامی دعوت کے آگے مشکلات کھڑی کرنے، لوگوں کو اسلام سے روکنے، اسلام اور مسلمانوں کو نیست و نابود کرنے اور دنیا کے نقشے پر ابھرنے والی نئی اسلامی ریاست کے وجود کو ختم کرنے کے لیے خرچ کرتے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ لِيَصُدُّوا عَن سَبِيلِ اللَّهِ ۚ فَسَيُنفِقُونَهَا ثُمَّ تَكُونُ عَلَيْهِمْ حَسْرَةً ثُمَّ يُغْلَبُونَ ۗ وَالَّذِينَ كَفَرُوا إِلَىٰ جَهَنَّمَ يُحْشَرُونَ ۝﴾

”بے شک جن لوگوں نے کفر کیا وہ اپنے مال خرچ کرتے ہیں تاکہ وہ (لوگوں کو) اللہ کے راستے سے روکیں تو وہ ابھی (اور) مال خرچ کریں گے، پھر وہ ان کے لیے باعث حسرت ہوگا، پھر وہ مغلوب ہو جائیں گے اور جن لوگوں نے کفر کیا وہ جہنم کی طرف اکٹھے کیے جائیں گے۔“[1]

[1] الأنفال 36:8.

امام ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں باخبر فرمایا ہے کہ کفار اپنے مال راہ حق کی اتباع میں رکاوٹ ڈالنے کے لیے خرچ کرتے ہیں۔''[1]

امام طبری رحمہ اللہ کا کہنا ہے: ''وہ اپنے مال کالین دین اور خرچ اس لیے کرتے ہیں کہ لوگوں کو اسلام میں داخل ہونے سے روکیں۔''[2]

امام شوکانی رحمہ اللہ کہتے ہیں: ''اس آیت کے معنی یہ ہیں کہ اموال خرچ کرنے سے ان کفار کی غرض راہ حق سے روکنا ہے اور یہ آپ ﷺ سے جنگ اور لشکر اکٹھے کرنے کی صورت میں ہے۔''[3]

یہاں یہی بات سامنے آتی ہے کہ جنگ احد کے اسباب میں سے اہم ترین سبب دینی تھا۔ قریش کا اصل مقصد اللہ کے دین سے اور راہِ حق کی اتباع سے روکنا، قبولِ اسلام کے راستے میں حائل ہونا، آپ ﷺ سے جنگ کرنا اور اسلامی تحریک و دعوت کو سبوتاژ کرنا تھا۔[4]

معاشرتی سبب: بدر میں قریش مکہ کی شکستِ فاش اور ان کی قیادت اور سرداروں کا قتل ان کے لیے بڑی ذلت و ندامت کا سبب بنا۔ انھیں ہر دم اس ذلت اور شکست کا احساس رہتا تھا، لہٰذا انھوں نے بدر سے واپسی کے فوراً بعد رسول اللہ ﷺ سے جنگ کرنے کے لیے اموال اکٹھے کرنے شروع کر دیے اور اپنی حتی الوسع کوشش میں لگ گئے تاکہ کسی نہ کسی طرح اس ذلت و اہانت کو، جو ان کے مقدر میں لکھی جا چکی تھی، دھو سکیں۔

ابن اسحاق کہتے ہیں: ''بدر کے دن سردارانِ قریش قتل ہو گئے اور ان کے باقی ماندہ افراد مکہ واپس ہوئے۔ ابوسفیان بھی اپنا تجارتی قافلہ لے کر مکہ پہنچ چکا تھا۔ اپنے دستور کے مطابق انھوں نے مکمل قافلہ ''دارالندوہ'' میں ٹھہرائے رکھا۔ نہ تو اسے تقسیم کیا اور نہ ہی قافلے کی کوئی چیز وہاں سے ہلنے دی۔ سردارانِ قریش نے اس قافلے کی ساری مالیت رسول اللہ ﷺ سے جنگ کی تیاری میں اپنے دل کی خوشی سے لٹا دی۔''

---

[1] تفسیر ابن کثیر آیت مذکورہ کے ذیل میں۔ [2] غزوة أحد لمحمد عيظة بن سعيد، ص:71. [3] فتح القدیر مذکورہ آیت کی تفسیر کے تحت۔ [4] غزوة أحد لمحمد عيظة بن سعيد، ص:71.

عبد اللہ بن ابی ربیعہ، عکرمہ بن ابی جہل، حارث بن ہشام، حویطب بن عبد العزیٰ، صفوان بن امیہ اور قریش کے دیگر وہ لوگ جن کے باپ، بیٹے اور بھائی بدر کے دن مارے گئے تھے یہ سب جمع ہوکر ابوسفیان اور قافلے کے دیگر مالکوں کے پاس آئے اور ان سے کہنے لگے: ''اے خاندانِ قریش! محمد (ﷺ) نے تمھیں تباہ کردیا اور تمھارے سردار قتل کردیے ہیں، تم اس مال سے اس کے خلاف ہماری مدد کرو۔ ہوسکتا ہے ہم اپنے مقتولین کا بدلہ لے لیں۔'' ابوسفیان کہتے ہیں کہ سب سے پہلے میں نے یہ بات تسلیم کی۔ [1]

جبیر بن مطعم نے اپنے حبشی غلام ''وحشی'' کو بلایا۔ اسے حبشہ میں رائج انداز سے نیزہ پھینکنے کا ایسا طریقہ آتا تھا جس میں وہ بہت کم ہی غلطی کرتا تھا، چنانچہ جبیر نے اس سے کہا: ''تم لوگوں کے ساتھ جاؤ۔ اگر تم نے میرے چچا طعیمہ بن عدی کے بدلے میں محمد (ﷺ) کے چچا حمزہ کو قتل کردیا تو تم آزاد ہو۔'' [2]

اقتصادی سبب: اسلامی حکومت کے متحرک جنگی دستوں نے قریش کی اقتصادی حالت پر گہرا اثر چھوڑا۔ ان پر ایک انتہائی تنگ اقتصادی دائرہ کھینچ دیا۔ مکی معیشت کی بنیاد ان دنوں گرمی اور سردی کے دو تجارتی سفروں پر قائم تھی۔ موسم سرما میں یمن کا سفر کرتے، اس میں شام کی اشیاء اور پیداوار اپنے ساتھ لے جاتے اور گرمیوں میں شام کی طرف سفر کرتے تھے جس میں یمنی پیداوار اور اشیاء ادھر لے جاتے تھے۔ ان دونوں سفروں میں سے ایک کا ختم ہونا دوسرے کے لیے بھی نقصان دہ تھا کیونکہ شام کی تجارت کا دارومدار یمن کے سامان پر اور یمن کی تجارت کی بنیاد شام سے آئے ہوئے سامان پر تھی۔ [3]

ارشاد ربانی ہے:

﴿لِاِيْلٰفِ قُرَيْشٍ ○ اٖلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيْفِ ○ فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ ○ الَّذِيْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ ○﴾

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 68/3. [2] السيرة النبوية لابن هشام: 79/3. [3] غزوة أحد لمحمد عيظة بن سعيد، ص: 74.

''قریش کے مانوس ہونے کی وجہ سے، (یعنی) ان کے سردی اور گرمی کے سفر سے مانوس ہونے کی وجہ سے، لہٰذا انھیں چاہیے کہ وہ اس گھر (کعبہ) کے مالک کی عبادت کریں، جس نے انھیں بھوک میں کھانا کھلایا اور انھیں خوف سے امن دیا۔''[1]

صفوان بن امیہ کی حسبِ ذیل صراحت سے ان کی مذکورہ صورتِ حال واضح ہے:

''محمد (ﷺ) اور اس کے ساتھیوں نے ہماری تجارتی منڈیوں کے راستے روک دیے ہیں۔ ہماری سمجھ میں نہیں آرہا کہ ان کا کیا علاج کریں؟ جو ساحل سمندر پر بھی مقیم ہیں ان سے محمد (ﷺ) نے مصالحت کر رکھی ہے۔ ان کی اکثریت اس کے دین میں داخل ہو چکی ہے۔ ہماری سمجھ سے باہر ہے کہ ہم کہاں چلے جائیں۔ اگر یہیں بیٹھے ہم اپنے اصل زر کھاتے رہے تو ہماری گزران اور بقا مشکل ہو جائے گی۔ ہمارا تو یہاں رہنا گرمی میں شام کی طرف تجارت اور سردی میں حبشہ کی طرف تجارت پر منحصر ہے۔''[2]

سیاسی سبب: جنگ بدر کے بعد رفتہ رفتہ قریش کی قیادت دم توڑ رہی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ قبائل میں اس کی مرکزی حیثیت کو خطرناک دھچکا لگ چکا تھا، لہٰذا اس عہدے کو تحفظ فراہم کرنے کے لیے انھیں زیادہ محنت کرنے اور جان و مال داؤ پر لگانے کی اشد ضرورت تھی۔

یہ وہ اہم وجوہات تھیں جنھوں نے قریش کو مدینہ کی اسلامی حکومت کے خلاف بہت جلد جنگی معرکے پر مجبور کر دیا۔[3]

قریش کا مکہ سے مدینہ کی طرف کوچ

ہجرت کے تیسرے سال، 7 شوال بروز ہفتہ قریش نے اپنی طرف سے جنگ کی تیاری مکمل کر لی۔[4]

اس موقع پر قریش نے تین ہزار جنگجوؤں کا لشکر تیار کیا۔ ان کی عورتیں اور خدم و حشم

[1] القریش 106:1-4. [2] المغازي للواقدي:1/195,196. [3] غزوة أحد لمحمد عيظة بن سعيد، ص:75. [4] البداية والنهاية: 4/11، والمغازي للواقدي:1/199.

ہمراہ تھے۔ پڑوس عرب قبائل سے جو بھی ساتھ ملتا گیا اسے بھی بھرتی کرتے گئے۔ قریش اپنے کیل کانٹے سمیت نکلے۔ ان کے ساتھ ان غیر عرب قبائل کے افراد بھی تھے جو قبائل عرب سے آملے تھے، علاوہ ازیں کنانہ اور اہل تہامہ میں سے کئی لوگ ان کے ساتھ تھے۔ انھوں نے اپنے ساتھ عورتوں کو بھی لیا، جو ہودج میں سوار تھیں۔ یہ اس لیے تھا کہ اپنے دستور کے مطابق عورتوں کی حفاظت کو یقینی بنانے کے لیے کوئی بھی شخص جنگ سے راہ فرار اختیار نہ کرے۔

ابوسفیان جو ان کا سپہ سالار تھا اس نے ہند بنت عتبہ بن ربیعہ کو ساتھ لیا،[1] اسی طرح صفوان بن امیہ بن خلف نے برزہ بنت مسعود ثقفیہ کو، عکرمہ بن ابی جہل نے ام حکیم بنت حارث بن ہشام بن مغیرہ کو، حارث بن ہشام بن مغیرہ نے فاطمہ بنت ولید بن مغیرہ کو ساتھ لیا۔[2]

یہ لشکر وادیِ قناۃ کے کنارے بنجر زمین پر مدینہ کی جانب خیمہ زن ہوا۔[3]

قریشی لشکر کے اخراجات اور سامان کی تیاری کے لیے بڑے وسیع پیمانے پر تشہیری مہم چلائی گئی تھی جس کے سرکردہ لوگوں میں ابوعزہ عمرو بن عبد اللہ جُمَحی، عمرو بن العاص، ہبیرہ مخزومی اور ابن زبعریٰ وغیرہ شامل تھے۔ اور ان کے لیے اس کے بڑے حوصلہ افزا نتائج بھی برآمد ہوئے۔[4]

قریشی لشکر کا جنگی بجٹ پچاس ہزار طلائی دینار تک پہنچ چکا تھا۔[5]

دشمن کی نقل و حرکت پر رسول اللہ ﷺ کی کڑی نظر

حضرت عباس بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ قریش کی جنگی تیاری اور نقل و حرکت کی نگرانی کررہے تھے۔ جب یہ لشکر مکہ سے روانہ ہوا تو عباس رضی اللہ عنہ نے لشکر کی تمام تر تفصیلات پر مشتمل خط بڑی تیزی سے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ارسال کر دیا جسے ایلچی نے انتہائی کم مدت میں پہنچایا۔ اس نے مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کا باہمی فاصلہ جو کم و بیش

[1] الإصابة: 346/8، رقم: 11860. [2] السيرة النبوية لابن هشام: 70/3. [3] غزوة أحد دراسة دعوية، ص: 78. [4] غزوة أحد لأبي فارس، ص: 17. [5] غزوة أحد لأبي فارس، ص: 16.

500 کلومیٹر پر مبنی ہے، صرف تین دن میں طے کیا۔ جب ایلچی نے وہ خط آپ ﷺ کے سپرد کیا۔ آپ ﷺ اس وقت مسجد قبا میں تشریف فرما تھے۔[1]

رسول اللہ ﷺ اپنے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے ذریعے قریش کی ایک ایک خبر پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ ابن عبد البر کا بیان ہے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ مشرکوں کی خبریں لکھ کر آپ ﷺ کی طرف ارسال کر رہے تھے۔ مکی مسلمان عباس رضی اللہ عنہ کو اپنا سہارا خیال کرتے تھے، جبکہ عباس رضی اللہ عنہ چاہتے تھے میں مدینہ میں آپ ﷺ کے پاس چلا جاؤں۔ آپ ﷺ نے انھیں لکھا کہ آپ کا مکہ میں رہنا زیادہ بہتر ہے۔[2]

حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی ارسال کردہ خبریں بڑی تفصیلی ہوتی تھیں۔ ایک خط میں وہ لکھتے ہیں: ''قریش کا لشکر آپ کی طرف روانہ ہو چکا ہے۔ ان کے پہنچنے تک ان سے مقابلے کی حتی المقدور تیاری کر لیجیے۔ یہ کل تین ہزار کا لشکر ہے جس کے آگے دو سو گھڑ سوار ہیں، ان میں سات سو زرہ پوش ہیں اور تین ہزار اونٹ ہیں اور وہ اپنا تمام تر اسلحہ ساتھ لا رہے ہیں۔''[3]

اس خط میں اہم معلومات درج تھیں جن میں سے کچھ یہ ہیں:

① مشرکین کی مدینہ منورہ کی جانب پیش قدمی کی یقینی خبر۔

② لشکر کی مکمل معلومات اور اس کی جنگی استعداد۔ اس کی تفصیل اس ٹڈی دل لشکر کے مقابلے کی مکمل تیاری میں معاون بنی۔

مگر رسول اللہ ﷺ نے مکی خبر رسانوں ہی پر اکتفا نہ کیا بلکہ آپ ﷺ چاہتے تھے کہ دشمن کے متعلق تازہ ترین معلومات ہر روز حاصل ہوتی رہیں۔ آپ ﷺ کے اس نظام میں مسلمان قائدین کے لیے رہنمائی ہے کہ تازہ معلومات حاصل کرنا کتنا اہم ہے! تاکہ اس کے مطابق آئندہ مناسب لائحۂ عمل اور سیاسی حکمت عملی اختیار کی جائے۔

رسول اللہ ﷺ نے قریش کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لیے حضرت حباب

---

[1] الرحيق المختوم، ص: 250. [2] الاستيعاب: 812/2. [3] المغازي للواقدي: 204/1.

بن منذر بن جموح رضی اللہ عنہ کو روانہ کیا۔ وہ مکی لشکر کے اندر گھس کر اس کی نفری، اسلحہ اور تیاری کا اندازہ لگا کر واپس آگئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا: «مَا رَأَيْتَ؟» ''تم نے کیا دیکھا؟'' عرض کی: ''اے اللہ کے رسول! میرے اندازے کے مطابق کم و بیش تین ہزار (3000) آدمی، دو سو گھوڑے اور سات سو (700) دوہری زرہیں تھیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: «هَلْ رَأَيْتَ ظُعُنًا؟» ''کیا تم نے ان کے ساتھ عورتیں بھی دیکھیں؟'' عرض کیا: ''جی ہاں، عورتیں بھی ہیں جن کے پاس دف اور طبلے ہیں۔'' فرمایا: «أَرَدْنَ أَنْ يُحَرِّضْنَ الْقَوْمَ وَيُذَكِّرْنَهُمْ قَتْلٰى بَدْرٍ، هٰكَذَا جَاءَنِي خَبَرُهُمْ. لَا تَذْكُرْ مِنْ شَأْنِهِمْ حَرْفًا، حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ، اَللّٰهُمَّ! بِكَ أَجُولُ وَبِكَ أَصُولُ» ''مجھے اطلاعات پہنچی ہیں کہ مقتولین بدر کی یاد تازہ کرانے اور جنگ پر ابھارنے کے لیے ان کے ساتھ عورتیں بھی آئی ہیں۔ بہر حال تم کسی کے سامنے ان کے متعلق کچھ نہ کہنا۔ ہمیں اللہ تعالیٰ ہی کافی ہے، وہ بہترین کارساز ہے، اے اللہ! میں تیری توفیق ہی سے پھرتا اور دشمن پر حملہ آور ہو کر غالب آتا ہوں۔''[1]

اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فضالہ کے دونوں بیٹوں انس اور مونس کو چپکے سے قریش کی خبریں سننے کے لیے بھیجا۔ انھوں نے قریش کو مدینہ کے بالکل قریب پایا۔ انھوں نے اپنے گھوڑے اور اونٹ مدینہ کے اردگرد کی چراگاہوں میں چرنے کے لیے چھوڑ رکھے تھے۔ دونوں نے واپس آکر قریش کے احوال ذکر کیے۔[2]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام معلومات اکٹھی کر کے چاہا کہ یہ معلومات اور خبریں صرف اعلیٰ قیادت تک ہی رہیں تاکہ تیاری سے پہلے ہی مسلمانوں پر یہ خبریں ذہنی دباؤ کا باعث نہ بنیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا ارسال کردہ خط حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو قباء میں پڑھ کر سنایا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں معاملہ پوشیدہ رکھنے کا حکم دیا

[1] المغازي للواقدي: 1/207، 208. [2] السيرة النبوية لأبي شهبة: 2/187.

اور خود تیزی سے مدینہ منورہ تشریف لے آئے۔ اور اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے مہاجرین و انصار کے ذمہ داران سے تبادلہ خیالات فرمایا۔

رسول اللہ ﷺ نے انصاریوں کے سردار حضرت سعد بن ربیع رضی اللہ عنہ کو حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی تحریر کردہ معلومات سے آگاہ کیا اور فرمایا: «وَاللّٰهِ! إِنِّي لَأَرْجُو أَنْ يَكُونَ خَيْراً فَاسْتَكْتِمْهُ إِيَّاهُ» ”اللہ کی قسم! مجھے توقع ہے کہ اچھا ہی ہوگا مگر ابھی اس بات کو پوشیدہ ہی رکھو۔“ آپ ﷺ جب سعد رضی اللہ عنہ کے پاس سے تشریف لے گئے تو حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی بیوی نے کہا: ”نبی ﷺ نے آپ سے کیا گفتگو کی ہے؟“ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے کہا: ”تمھارا ستیاناس! تمھیں ان باتوں سے کیا غرض؟“ وہ بولیں: ”نبی ﷺ نے آپ کے ساتھ جو بات کی ہے میں نے وہ ساری سن لی ہے۔“ پھر انھوں نے نبی ﷺ کی ساری رازدارانہ گفتگو کہہ سنائی۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے «إنا للّٰه و إنا إليه راجعون» پڑھا (پھر نبی ﷺ کے پاس گئے) اور عرض پرداز ہوئے: ”اے اللہ کے رسول! مجھے خدشہ ہے کہ بات پھیل جائے گی۔ آپ سمجھیں گے کہ یہ بات تو میں نے تمھارے ساتھ ہی کی تھی، لہٰذا تمھی نے پھیلائی ہے۔“ آپ ﷺ نے فرمایا: «خَلِّ عَنْهَا» ”اس عورت کی بات چھوڑو۔“ [1]

اس پیش آمدہ واقعے میں جنگی حکام کے لیے اہم پیغام ہے اور ان کے لیے واضح تنبیہ ہے کہ جنگی رازوں، منصوبوں اور معاملات سے بیویوں کو بالکل بے خبر رکھنا چاہیے۔ اور اس جیسے راز عام کرنے سے باز رہنا چاہیے کیونکہ ایسے رازوں کا افشا کسی قوم کے لیے ہولناک واقعے کا پیش خیمہ بن سکتا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ بڑی بڑی ناکامیاں، مشکلیں اور پریشانیاں خائن بیویوں یا پھر دوستوں کے لبادے میں دشمن یا ظاہراً قریبی اور حقیقت میں مخالف قسم کے لوگوں کی طرف سے راز فاش ہونے کی بنا پر واقع ہوئیں۔ [2]

1 السيرة الحلبية: 489/2. 2 غزوة أحد لأبي فارس، ص: 22.

رسول اللہ ﷺ کی صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے عمومی مشاورت

کفارِ قریش کے متعلق تمام معلومات جمع کرنے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ طلب کیا کہ مدینہ میں رہتے ہوئے قلعہ بند ہو رہیں یا مشرکوں سے باہر نکل کر پنجہ آزمائی کریں۔ آپ ﷺ کا خیال یہی تھا کہ مدینہ میں رہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

«إِنَّا فِي جُنَّةٍ حَصِينَةٍ، فَإِنْ رَأَيْتُمْ أَنْ تُقِيمُوا، وَتَدَعُوهُمْ حَيْثُ نَزَلُوا، فَإِنْ أَقَامُوا، أَقَامُوا بِشَرِّ مُقَامٍ، وَإِنْ دَخَلُوا عَلَيْنَا قَاتَلْنَاهُمْ فِيهَا»

''مدینہ ہمارے لیے ایک محفوظ ڈھال ہے۔ اگر تم چاہو تو یہیں رہو اور انھوں نے جہاں پڑاؤ ڈالا ہے انھیں وہاں ہی رہنے دو۔ اگر وہ وہاں رہیں گے تو انتہائی نامناسب جگہ رہیں گے اور اگر وہ یہاں تک پہنچ گئے تو ہم مدینہ میں رہتے ہوئے ان سے جنگ کریں گے۔''[1]

عبداللہ بن ابی کی رائے بھی آپ ﷺ کے ساتھ تھی۔[2]

لیکن وہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم جو جنگِ بدر میں شریک نہ ہو سکے تھے، عرض کرنے لگے:

''اے اللہ کے رسول ﷺ! ہمیں ہمارے دشمن کی طرف لے چلیے۔''

ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: ''بہت سے لوگ مدینہ سے باہر نکل کر دشمن سے نبرد آزما ہونے پر مصر تھے اور رسول اللہ ﷺ کی رائے اور فرمان پر اکتفا نہیں کر رہے تھے، اگر آپ کے حکم پر راضی ہو جاتے تو اچھا ہوتا لیکن تقدیر غالب آ کر رہی۔ مدینہ منورہ سے باہر جا کر دشمن سے ٹکرانے کا مشورہ دینے والوں کی اکثریت ان لوگوں پر مشتمل تھی جو بدر میں شریک نہیں ہو سکے تھے کیونکہ وہ اہل بدر کی فضیلت سے بخوبی آگاہ تھے۔''[3]

---

[1] تاريخ الطبري: 60/2. [2] غزوة أحد لمحمد عيطة بن سعيد، ص: 82. [3] البداية والنهاية: 14/4.

ابن اسحاق رحمہ اللہ کا بیان ہے کہ جو لوگ دشمن سے دو دو ہاتھ کرنا چاہتے تھے وہ رسول اللہ ﷺ کو برابر کہتے رہے حتی کہ آپ ﷺ خانۂ نبوت میں تشریف لے گئے اور اپنا جنگی لباس پہن لیا۔ اب لوگ ایک دوسرے کو کہنے لگے: ''نبی ﷺ نے ایک رائے دی مگر تم نے اس کے خلاف رائے کا اظہار کر دیا، چنانچہ حمزہ رضی اللہ عنہ! آپ جائیں اور نبی ﷺ سے عرض کریں کہ آپ کا فیصلہ ہی ہمارا فیصلہ ہے۔'' حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے آ کر عرض کیا: ''اے اللہ کے نبی! لوگ نادم ہیں اور کہتے ہیں کہ آپ کا فیصلہ ہی ہمارا فیصلہ ہے۔''
آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«إِنَّهُ لَيْسَ لِنَبِيٍّ إِذَا لَبِسَ لَأْمَتَهُ أَنْ يَّضَعَهَا حَتّٰى يُقَاتِلَ»

''کسی نبی کے لیے مناسب نہیں کہ جب ہتھیار پہن لے، پھر بغیر جنگ کیے انھیں اتار دے۔''[1]

جو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم مدینہ سے باہر نکل کر دشمن سے نبرد آزما ہونا چاہتے تھے ان کی یہ رائے درج ذیل امور کی بنیاد پر تھی:

① انصار نے ''بیعتِ عقبۂ ثانیہ'' کے وقت ہر موڑ پر رسول اللہ ﷺ کی مدد کا عہد کیا تھا۔ اب اکثر کا خیال تھا کہ (جنگ مسلط ہونے کے باوجود) مدینہ میں رہنا اس عہد سے پیچھے ہٹنے کے مترادف ہوگا۔

② کچھ مہاجرین کا خیال تھا کہ انصار کی نسبت ان کا زیادہ حق بنتا ہے کہ مدینہ منورہ کا دفاع کریں، قریش سے ان کی رزم آرائی بھی ہو اور وہ مدینہ منورہ کے آس پاس انصار کے کھیت کھلیان وغیرہ کو بھی تحفظ فراہم کریں۔

③ غزوۂ بدر سے پیچھے رہ جانے والے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم دشمن سے مڈھ بھیڑ کے لیے بے تاب تھے اور ان کی آرزو یہ تھی کہ شاید اس طرح انھیں اللہ کی راہ میں شہادت نصیب

1. السيرة النبوية لابن هشام: 71/3.

ہوجائے گی۔

④ مدینہ سے باہر جنگ لڑنے والوں کی اکثریت کا خیال تھا کہ مدینہ منورہ کا محاصرہ قریش کی فتح متصور ہوگی، لہٰذا یہ ایسا خواب ہے جسے کسی صورت شرمندۂ تعبیر نہیں ہونا چاہیے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ خدشہ بھی تھا کہ محاصرہ طویل ہوسکتا ہے جس کی بنا پر مسلمانوں کو ہر قسم کی امداد سے محروم ہونے کا خطرہ لاحق رہے گا۔[1]

مدینہ منورہ میں رہ کر دشمن کا مقابلہ کرنے والوں کی رائے درج ذیل حکمت عملی پر استوار تھی:

① مکی لشکر مختلف گروہوں پر مشتمل ہے، لہٰذا اس کے لیے زیادہ دیر پڑاؤ ڈالنا یا محاصرہ کرنا ممکن نہیں۔ ان میں اس بارے میں کبھی نہ کبھی اختلاف لازماً پھوٹ پڑے گا۔

② جو شہر اس انداز سے تعمیر ہوں کہ وہاں کے حوض، قلعے اور مقامات دفاعی لحاظ سے مستحکم ہوں ایسے شہروں کا گھیراؤ امیدوں کو کبھی پورا نہیں ہونے دیتا۔ خاص طور پر جبکہ دونوں لشکروں کا اسلحہ بھی تقریباً ایک جیسا ہو، جبکہ اُحد میں ایسا ہی تھا۔

③ دفاع کرنے والے جب اپنے گھر والوں میں موجود ہوں گے تو اپنے بیٹوں، بیٹیوں، بیویوں اور عزتوں کی حفاظت جوانمردی سے کریں گے۔

④ عورتوں اور بچوں کے جنگ میں شریک ہونے کی وجہ سے لڑنے والوں کی تعداد دوگنی ہوجائے گی۔

⑤ دفاع کرنے والے دشمن پر پتھر اور اس جیسا دیگر اسلحہ استعمال کرسکیں گے۔ اور اسی طرح گھیرا ڈالنے والے ان کی دسترس میں ہوں گے۔[2]

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ساتھیوں کو مشورے کے وقت بلاخوف و خطر اپنی اپنی رائے دینے کا عادی بنا رکھا تھا، خواہ ان کی رائے آپ ﷺ کی رائے کے خلاف ہی ہو۔ جو معاملات عمومی نوعیت کے ہوتے اور ان میں کوئی واضح نص بھی نہ ہوتی

[1] غزوۃ أحد لأحمد عزالدین، ص:52,51. [2] القیادۃ العسکریۃ للدکتور محمد الرشید، ص:374.

آپ ﷺ صحابہ رضی اللہ عنہم کو ان میں غور وخوض کرنے اور امت کو لاحق مشکلات کا حل ڈھونڈ نے کا عادی بنانا چاہتے تھے۔ مشورے کا فائدہ ہی کیا جب اظہارِ رائے کی آزادی نہ ہو۔ یہ بات کہیں نہیں مل سکتی کہ آپ ﷺ نے غلط رائے یا غلط سوچ پر کسی کو ملامت کی ہو۔ اسی طرح حاکم کے لیے ضروری ہے کہ وہ شوریٰ کے نظام کو اپنائے۔

اور حسب ذیل قرآنی رہنمائی کی عملی تنفیذ کا آپ ﷺ سے بڑھ کر اور کون اہل ہوسکتا ہے:

﴿فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۖ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۚ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ ○﴾

”پس (اے نبی!) آپ اللہ کی رحمت کے باعث ان کے لیے نرم ہوگئے۔ اگر آپ تند خو اور سخت دل ہوتے تو وہ سب آپ کے پاس سے چھٹ جاتے، چنانچہ آپ ان سے درگزر کریں اور ان کے لیے بخشش مانگیں اور ان سے (اہم) معاملات میں مشورہ کریں، پھر جب آپ پختہ ارادہ کرلیں تو اللہ پر بھروسا کریں، بے شک اللہ بھروسا کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔“[1]

یہ سب کچھ اس لیے تھا کہ آپ ﷺ کی امت شورائی نظام کی عادی بن جائے۔

یہاں یہ بات بھی واضح معلوم ہورہی ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ایسے سیاسی شعور کے حامل تھے کہ وہ اپنی رائے کا اظہار تو کرسکتے ہیں مگر انھیں اپنی رائے کو قائد پر ٹھونسنے کا حق حاصل نہیں ہے۔ وہ رائے کا اظہار کردیں قائد آزادی سے جو بھی رائے چاہے اختیار کرے۔ آپ ﷺ نے ان کے اصرار پر باہر نکل کر دشمن سے مقابلہ کرنے کا ارادہ فرمایا تو وہ فوراً معذرت کے لیے حاضر ہوگئے۔ لیکن آپ ﷺ پھر انھیں ایک اور نکتہ سمجھانا چاہتے تھے کہ مثالی قیادت کا یہی وصف ہوتا ہے کہ جب وہ کوئی ارادہ کرکے اس کے مطابق

1 آل عمرٰن 159:3.

عملدرآمد کا آغاز کر دے تو اس کے بعد وہ کسی قسم کے تردد کا شکار نہیں ہوتی کیونکہ اس سے اعتماد کو سخت ٹھیس پہنچتی ہے اور ماتحت لوگ انتشار اور افراتفری کا شکار ہو جاتے ہیں۔ [1]

رسول اللہ ﷺ نے باہر نکل کر مقابلہ کرنے کا پختہ ارادہ کر لیا اور ہنگامی صورت حال کا اعلان فرما دیا۔ سب مسلمان جنگ کے لیے تیار ہو گئے۔ اور رات بھی بڑے محتاط انداز پر گزاری۔ ہر کوئی ہتھیار بند رہنے لگا حتی کہ سوتے وقت بھی ہتھیار ساتھ رکھے۔ آپ ﷺ نے مدینہ منورہ کی نگرانی کا حکم دیا اور اس کام کے لیے محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کی قیادت میں پچاس مضبوط ترین مجاہد علیحدہ کر دیے۔ چند ایک صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپ کی نگرانی پر متعین ہو گئے۔ حضرت سعد بن معاذ، اسید بن حضیر، سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہم اور کچھ دیگر صحابہ نے جمعے کی رات مسلح ہو کر مسجد کے دروازے پر آپ ﷺ کی حفاظت میں گزاری۔ [2]

اسلامی لشکر کی احد کی جانب پیش قدمی اور بعض واقعات

دشمن کی طرف پیش قدمی کے وقت آپ ﷺ نے چند اہم اسباب اختیار فرمائے:

لشکر کے خروج کے لیے مناسب وقت اور راستہ: رسول اللہ ﷺ نے روانگی کے لیے مناسب وقت اور مناسب راستے کا انتخاب فرمایا، چنانچہ آپ آدھی رات کے بعد روانہ ہوئے۔ جب فضا پرسکون تھی، نقل و حرکت نہ ہونے کے برابر تھی اور سفر سے تھکا ماندہ دشمن خواب خرگوش میں تھا۔

تھکاوٹ کے بعد سونے والا عموماً گہری نیند سوتا ہے اور اٹھنے والی بلند آوازوں اور ہر قسم کی نقل و حرکت سے بھی بے خبر ہو جاتا ہے۔

سیرت نگار واقدی کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ رات گئے تک سوئے رہے اور جب سحری کا وقت ہوا تو فرمایا: «أَيْنَ الْأَدِلَّاءُ؟» ”رہبر کہاں ہیں؟“ [3]

---

1 السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري:2/380. 2 غزوة أحد لأبي فارس، ص:35,34.
3 المغازي للواقدي:1/217.

علاوہ ازیں آپ ﷺ نے میدان جنگ کا مناسب راستہ اپنایا۔ یہ ایسا مخفی اور پوشیدہ راستہ تھا کہ مسلمانوں کا رواں دواں لشکر دشمن کی نگاہ سے اوجھل تھا۔ آپ ﷺ نے ساتھیوں سے فرمایا:

«مَنْ رَّجُلٌ يَّخْرُجُ بِنَا عَلَى الْقَوْمِ مِنْ كَثَبٍ مِّنْ طَرِيقٍ لَّا يَمُرُّ بِنَا عَلَيْهِمْ؟»

''کون ہے جو مختصر اور محفوظ راستے سے ہمیں دشمن تک لے جائے اور وہ راستہ ایسا ہو کہ ہم دشمن کے قریب سے نہ گزریں؟'' یہ سن کر ابوخیثمہ رضی اللہ عنہ نے اپنی استعداد کا اظہار کرتے ہوئے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! میں حاضر ہوں۔'' بعدازاں وہ رسول اللہ ﷺ کو حرۂ بنی حارثہ اور ان کے کھیتوں سے گزارتے ہوئے لے چلے۔ اس راستے سے جاتے ہوئے لشکر کا گزر ربعی بن قیظی (ابن ہشام کے مطابق مربع بن قیظی) کے کھیت سے ہوا۔ یہ شخص منافق اور نابینا تھا۔ اس نے رسول اللہ ﷺ اور آپ کے ساتھ مسلمانوں کی آمد محسوس کی تو ان کے چہروں پر دُھول پھینکنے لگا اور کہنے لگا: ''اگر آپ اللہ کے رسول ہیں تو آپ کو میری زمین میں آنے کی اجازت نہیں۔'' یہ بھی منقول ہے کہ اس نے مٹی کی لپ اپنے ہاتھ میں لی اور بولا: ''اللہ کی قسم! اگر مجھے معلوم ہوجائے کہ اے محمد (ﷺ)! یہ کسی اور کے بجائے تجھ ہی پہ گرے گی تو میں یہ لپ ضرور تیرے چہرے پر مارتا۔'' (معاذ اللہ) لوگ اسے قتل کرنے کے لیے لپکے مگر آپ ﷺ نے فرمایا:

«لَا تَقْتُلُوهُ، فَهٰذَا الْأَعْمٰى أَعْمَى الْقَلْبِ، أَعْمَى الْبَصَرِ»

''اسے قتل نہ کرو، یہ دل اور آنکھ دونوں کا اندھا ہے۔''

لیکن آپ ﷺ کے منع کرنے سے پہلے ہی بنو عبدالاشہل کے سعد بن زید رضی اللہ عنہ اس کے سر پر کمان مار کر اسے زخمی کر چکے تھے۔[1]

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 69/3، وتاريخ الطبري: 218/1.

بلاشبہ رسول اللہ ﷺ کا درختوں اور باغوں کے درمیان سے گزرنا بتاتا ہے کہ آپ اثنائے رستہ احتیاط پر مبنی تدابیر اختیار کرنا چاہتے تھے کیونکہ عام رستے سے دشمن مسلمانوں کی قوت کا بآسانی اندازہ لگا سکتا تھا۔ اور یہ انتہائی خطرناک ہوتا۔ اس طرح آپ ﷺ نے امت کو وقت اور جگہ کی راز داری اختیار کرنے کا سبق دیا تاکہ دشمن قوت کا اندازہ لگا کر مقابلے کے لیے حسبِ ضرورت منصوبہ بندی نہ کرلے، وگرنہ راز فاش ہونے پر تو سپہ سالار کا نظم و ضبط اور لشکر کی جنگی تیاری دھری کی دھری رہ جائے گی۔

ربعی بن قیظی کے اس واقعے سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر دو مصلحتیں بالمقابل ہوں تو مصلحت عامہ کو خاص افراد کی مصلحت پر فوقیت دی جائے گی۔ آپ ﷺ ربعی بن قیظی منافق کی کھیتی سے تباہ ہونے کی پروا نہ کرتے ہوئے گزر گئے کیونکہ لشکر کے لیے مختصر رستہ اپنانے کی ایک حکمت تھی۔ گویا آپ بتا رہے ہیں کہ دینی مصلحت دیگر مصلحتوں سے بہر صورت مقدم ہے۔ یہاں مصلحت عامہ اور انفرادی مصلحت مدمقابل تھیں، نیز دینی مصلحت ہی مصلحت عامہ تھی جسے بعض افراد کی محض مالی مصلحت پر مقدم رکھا گیا۔[1]

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے منفعتوں کے حصول کی خاطر شرعی مصلحتوں کو ایک خاص ترتیب سے رکھا ہے، مثلاً: دین، جان، عقل، نسل اور مال ہر ایک کا اسی ترتیب سے ایک مقام ہے جسے واضح کیا گیا ہے۔[2]

جب ہم دین کی پانچ بنیادی مصلحتوں اور ان کی اہمیت کا مشاہدہ کرتے ہیں تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ یہ پانچوں مصلحتیں اور قواعد آپس میں اہمیت کے لحاظ سے خاص ترتیب رکھتے ہیں اور وہ ترتیب یہ ہے: دین، جان، عقل، نسل اور مال۔ دین کو تحفظ فراہم کرنے والی مصلحت اور جان کو تحفظ فراہم کرنے والی مصلحت ایک دوسرے کے مدمقابل آجائیں تو دینی مصلحت مقدم ہوگی۔ اسی طرح جان کو تحفظ فراہم کرنے والی مصلحت اور عقل کو تحفظ

[1] غزوة أحد لمحمد عيظة بن سعيد، ص: 168. [2] ضوابط المصلحة للبوطي، ص: 23.

فراہم کرنے والی مصلحت میں تعارض ہوجائے تو جان سے متعلقہ مصلحت کو اولیت حاصل ہوگی۔ اسی طرح نسل کو تحفظ فراہم کرنے والی مصلحت تعارض کی صورت میں مالی مصلحت سے فوقیت رکھے گی۔ ان قواعد و مقاصد کی اس ترتیب پر تمام اہل علم کا اتفاق ہے۔ [1]

امام شاطبی رحمہ اللہ اور عزبن عبد السلام جیسے ارباب تحقیق جن کی سیرت نبوی پر گہری نظر ہے انھوں نے مصلحت عامہ کو مصلحتِ خاصہ پر مقدم رکھنے کے سلسلے میں کئی ایک اہم قواعد کا استنباط کیا ہے، چنانچہ امام شاطبی رقمطراز ہیں: ''مصلحت و مفسدت میں اصل قانون باہمی موازنہ ہی ہے، لہٰذا جو بھی ان میں سے راجح ہوگی اسے مقدم (خیال) کیا جائے گا۔'' [2]

عزبن عبد السلام کا بیان ہے کہ راجح مصلحتوں کو مرجوح مصلحتوں پر مقدم کرنا بہتر اور قابل تعریف ہے اور اسی طرح زیادہ خرابیوں کو کم خرابیوں سے دور کرنا بہتر اور قابل تعریف ہے۔ اس پر اصول کے ماہر علماء کا اتفاق ہے۔ شرعی احکام کا حکم بھی اسی طرح ہے اگر مراتب برابر ہیں تو اختیار ہے۔ ہاں! اگر درجہ بندی معلوم ہوجائے تو راجح و مرجوح کا قاعدہ استعمال کریں گے۔ [3]

دوسری جگہ فرماتے ہیں: ''اصل قانون یہ ہے کہ اگر مصلحت بلا مفاسد واضح ہورہی ہے تو اسے کوشش کرکے حاصل کیا جائے گا۔ اور اگر خرابی بلا مصلحت صاف نظر آرہی ہے تو اسے حتی المقدور کوشش کرکے دور کیا جائے۔'' [4]

عبد اللہ بن ابی کی تہائی لشکر سمیت واپسی: مسلمانوں کا لشکر جب ''شوط'' [5] مقام پر پہنچا تو رئیس المنافقین عبد اللہ بن ابی ابن سلول تین سو منافقین کو ساتھ لے کر یہ کہتا ہوا چل دیا کہ مشرکین کے ساتھ جنگ نہیں ہوگی اور یہ اعتراض بھی کیا کہ مدینہ کے باہر جنگ

---

1 المقاصد العامة للشريعة ليوسف حامد العالم، ص: 166. 2 الموافقات للشاطبي: 651/2.

3 قواعد الأحكام لأبي محمد عزالدين: 7,6/1. 4 قواعد الأحكام لأبي محمد عزالدين: 47/1.

5 شوط: مدینہ منورہ اور جبل احد کے درمیان واقع ایک باغ کا نام ہے۔

کا فیصلہ کیوں کیا گیا۔ اس کا کہنا تھا: ''نبی ﷺ نے بے سمجھ لوگوں اور بچوں کی رائے تسلیم کی ہے اور میری رائے کی خلاف ورزی کی ہے، لہٰذا ہم خواہ مخواہ کیوں اپنی جان دیں۔''[1]

اس سرکشی سے عبد اللہ بن ابی کا اصل مقصد اسلامی لشکر میں اضطراب و انتشار کی کیفیت پیدا کرنا تھا تاکہ ان کے حوصلے پست ہوجائیں اور دشمنانِ اسلام کے حوصلے بڑھیں اور وہ بلند ہمت ہوجائیں۔ اس کی کوشش اور تدبیر بڑی خطرناک خیانت اور اسلام اور اس کے چاہنے والوں کے ساتھ سراسر بغض و عناد پر مبنی تھی۔ اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضا تھا کہ مخلص مسلمانوں پر مشتمل لشکر ہی آگے بڑھے تاکہ مخلص لوگ منافقوں سے الگ ہوسکیں۔ اور اخلاص کی دولت سے مالا مال مسلمان مفاد پرستوں کے ٹولے سے نکھر جائیں۔[2]

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ ۭ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِىْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ ۠ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۚ وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَلَكُمْ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝ ﴾

''اللہ مومنوں کو اس حالت میں ہرگز نہ رہنے دے گا جس میں تم اس وقت ہو، یہاں تک کہ وہ پاک کو ناپاک سے علیحدہ کردے اور اللہ کا یہ طریقہ نہیں کہ وہ تم پر غیب ظاہر کرے، لیکن اللہ اپنے رسولوں میں سے جسے چاہتا ہے (غیب کی باتیں بتانے کے لیے) چن لیتا ہے، پس تم ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسولوں پر اور اگر تم ایمان لاؤ گے اور پرہیزگاری اختیار کرو گے تو تمھارے لیے بہت بڑا اجر ہے۔''[3]

منافقوں کے اس طرزِ عمل سے بزدلی اور کفر کی جانب ان کی واپسی سامنے آ گئی۔ اور قبل اس کے کہ قرآن ان کی رسوائی کا چرچا کرتا انھیں اپنے ضمیر اور لوگوں کے سامنے

1 البداية والنهاية: 4/14. 2 غزوة أحد لمحمد عيظة بن سعيد، ص: 84. 3 آل عمرٰن 3:179.

رسوائی کا سامنا کرنا پڑ گیا۔[1]

منافقوں کی واپسی پر عبداللہ بن عمرو بن حرام رضی اللہ عنہ کا موقف: حضرت عبداللہ بن حرام رضی اللہ عنہ نے منافقین کو اس نازک صورتِ حال میں ساتھ چھوڑنے سے روکنے کی بھرپور کوشش کی مگر انھوں نے انکار کردیا تو وہ فرمانے لگے: ''لوگو! میں تمھیں اللہ (کا عہد) یاد دلاتا ہوں۔ دشمن سر پر ہے، لہٰذا اپنی قوم اور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تعاون سے ہاتھ نہ کھینچو۔'' وہ بولے: ''اگر ہم جانتے کہ تم لوگ جنگ کرو گے تو قطعاً تمھیں دشمن کے حوالے نہ کرتے لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ لڑائی کی نوبت نہیں آئے گی۔'' جب انھوں نے بات نہ مانی اور ہر صورت واپس جانے ہی کو پسند کیا تو عبداللہ بن حرام رضی اللہ عنہ فرمانے لگے: ''اللہ کے دشمنو! تم پر اللہ کی مار پڑے عنقریب اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو تم سے مستغنی کردے گا۔''[2]

انھی رسوا ترین لوگوں کے متعلق یہ ارشاد باری تعالیٰ نازل ہوا:

﴿وَمَآ اَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعَانِ فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَلِيَعْلَمَ الْمُؤْمِنِيْنَ ○ وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ نَافَقُوْا ۚ وَقِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوِ ادْفَعُوْا ۭ قَالُوْا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَّاتَّبَعْنٰكُمْ ۭ هُمْ لِلْكُفْرِ يَوْمَىِٕذٍ اَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْاِيْمَانِ ۚ يَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۭ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يَكْتُمُوْنَ ○﴾

''اور جس (احد کے) دن دونوں لشکر باہم ٹکرائے تو تمھیں جو (نقصان) پہنچا وہ اللہ کے حکم سے تھا اور اس لیے تھا کہ اللہ جان لے کہ مومن کون ہیں اور یہ بھی جان لے کہ منافق کون ہیں اور ان منافقوں سے کہا گیا تھا: آؤ! اللہ کے راستے میں لڑو یا (شہر کا) دفاع کرو۔ انھوں نے کہا: اگر ہمیں جنگ ہونے کا یقینی علم ہوتا تو ہم ضرور تمھارے ساتھ چلتے۔ وہ اس روز ایمان کی نسبت کفر کے زیادہ قریب تھے۔ وہ اپنے مونہوں سے وہ بات کہہ رہے تھے جو ان کے دلوں میں نہیں تھی اور

[1] مرويات غزوة أحد لحسين أحمد الباكري، ص: 71. [2] صحيح السيرة النبوية، ص: 277.

اللہ وہ بات خوب جانتا ہے جسے وہ چھپاتے ہیں۔'' [1]

بنوسلمہ اور بنوحارثہ کا تردد اور اس کے بعد دلجمعی: جب عبداللہ بن ابی اپنے ساتھیوں کے ہمراہ واپس ہوا تو بنوسلمہ اور بنوحارثہ نے بھی پسپائی کا ارادہ کرلیا۔لیکن اللہ تعالیٰ نے انھیں محفوظ فرمایا اور ثابت قدم رکھا۔ان کے متعلق اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان نازل ہوا:

﴿ اِذْ هَمَّتْ طَّآئِفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا ۙ وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ ﴾

''جب تمھارے دوگروہوں نے کم ہمتی دکھانے کا ارادہ کیا اور اللہ ان دونوں کا دوست تھا اور مومنوں کو اللہ ہی پر بھروسا کرنا چاہیے۔'' [2]

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں یہ آیت ہمارے قبیلے بنوسلمہ اور بنوحارثہ کے متعلق نازل ہوئی، اس کا ہمارے بارے میں اترنا مجھے ناپسند نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے بارے میں فرمایا: ﴿ وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا ﴾ ''اللہ ان دونوں کا دوست ہے۔'' [3]

مسلمانوں کی ان دونوں جماعتوں پر منافقین کے اس گھٹیا طرزِ عمل کا گہرا اثر ہوا۔ انھوں نے بھی شروع میں واپسی کا قصد کیا لیکن جلد ہی اپنی کمزوری پر قابو پالیا۔اللہ تعالیٰ کی مدد سے انھوں نے اپنے نفوس پر غلبہ پایا اور کمزوری وسستی دور کی اور مومنوں کے ساتھ جانے پر ڈٹ گئے۔

ابن سلول کے اس رویے پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں دو آرا پیدا ہوگئیں:

① لشکر میں تفریق پیدا کرکے واپس جانے والے منافقین جنھوں نے مسلمانوں کا ساتھ چھوڑا انھیں قتل کردیا جائے۔

② کچھ صحابہ کا خیال تھا کہ انھیں قتل نہ کیا جائے۔

قرآن پاک نے فریقین کے موقف کا اس آیت میں تذکرہ فرمایا: [4]

---

[1] آل عمرٰن 3:166،167. [2] آل عمرٰن 3:122. [3] صحيح البخاري، حديث:4051. [4] السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري:3/382.

﴿فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنٰفِقِيْنَ فِئَتَيْنِ وَاللّٰهُ اَرْكَسَهُمْ بِمَا كَسَبُوْا ۭ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَهْدُوْا مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ ۭ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ۝﴾

''پھر تمھیں کیا ہوا ہے کہ منافقوں کے بارے میں دو گروہوں میں بٹ گئے ہو؟ حالانکہ اللہ نے ان کے اعمال کی وجہ سے انھیں الٹا کر دیا ہے۔ کیا تم چاہتے ہو کہ ان لوگوں کو ہدایت دو جنھیں اللہ نے گمراہ کیا ہو؟ اور جسے اللہ گمراہ کرے، پھر اس کے لیے آپ ہرگز کوئی راستہ نہیں پائیں گے۔''[1]

غیر مسلموں سے مدد: جب رسول اللہ ﷺ شیخان[2] مقام پر پہنچے تو آپ ﷺ نے ایک قافلے کا شور وغل سنا۔ ان آوازوں میں سے ہتھیاروں کی آواز بھی سنائی دی۔ آپ ﷺ نے دریافت فرمایا: «مَاهٰذِهٖ؟» ''یہ کیسی آواز ہے؟'' بتلایا گیا کہ یہ عبداللہ بن اُبی کے حلیف یہود ہیں۔ ارشاد فرمایا: «لَا نَسْتَنْصِرُ بِأَهْلِ الشِّرْكِ عَلٰى أَهْلِ الشِّرْكِ» ''ہم اہل شرک کے خلاف مشرکوں ہی سے تعاون نہیں لیتے۔''[3]

یہ ایک بنیادی قاعدہ ہے جس کی آپ ﷺ نے وضاحت فرما دی کہ مدد کے لیے اسلام دشمن عناصر کی طرف مائل ہونا اچھا نہیں۔[4]

رسول اللہ ﷺ کا بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کو کم سنی کی بنا پر واپس کرنا: رسول اللہ ﷺ نے ''شیخان'' مقام ہی سے کچھ نوجوانوں کو کم عمر ہونے کی بنا پر واپس کر دیا۔ وہ تمام نوعمر چودہ برس یا اس سے کم عمر کے حامل تھے۔ ان میں سے چند ایک کے نام یہ ہیں:

عبداللہ بن عمر بن خطاب، زید بن ثابت، اُسامہ بن زید، زید بن ارقم، براء بن عازب اور ابوسعید خدری رضی اللہ عنہم یہ کل چودہ نوعمر لڑکے تھے۔ معتبر روایت کے مطابق ابن عمر رضی اللہ عنہما انھی میں سے تھے۔[5]

---

[1] النسآء 4:88. [2] **شیخان:** مدینہ اور احد کے درمیان ایک جگہ کا نام ہے۔ [3] صحیح السیرۃ النبویۃ لإبراهیم العلي، ص: 278. [4] محمد رسول اللّٰه ﷺ لصادق عرجون: 561/3. [5] السیرۃ النبویۃ الصحیحۃ للدکتور العمري: 383/2.

جب رسول اللہ ﷺ کو بتایا گیا کہ رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ ماہر تیر انداز ہیں تو آپ ﷺ نے انھیں اجازت دے دی۔ یہ بات سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ کو پہنچی تو وہ اپنے سوتیلے باپ مرّی بن سنان بن ثعلبہ رضی اللہ عنہ کے پاس گئے۔ یہ ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کے چچا تھے اور سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ نے انھی کے ہاں پرورش پائی تھی، چنانچہ سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ روتے ہوئے اپنے سوتیلے باپ سے کہنے لگے: ''میرے ابوجان! نبی ﷺ نے رافع کو اجازت دے دی ہے اور مجھے واپس کردیا ہے، حالانکہ میں رافع کو پچھاڑ سکتا ہوں۔'' حضرت مرّی بن سنان رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر اس بات کا تذکرہ کیا۔ آپ ﷺ رافع اور سمرہ کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: ''دونوں کشتی کرو۔'' تب سمرہ رضی اللہ عنہ نے رافع رضی اللہ عنہ کو پچھاڑ دیا۔ آپ ﷺ نے سمرہ رضی اللہ عنہ کو بھی اجازت دے دی اور انھیں اپنے لشکر میں شامل فرمایا۔ ان دونوں جوانوں میں سے ہر ایک کا اپنا امتیاز اور مقام و مرتبہ تھا۔[1]

ہم دیکھ رہے ہیں کہ آپ ﷺ نے رافع رضی اللہ عنہ اور سمرہ رضی اللہ عنہ کو ان کے دوسرے ہم عمر لڑکوں کی نسبت خصوصی طور پر اجازت دی تھی کیونکہ وہ دونوں جنگی صلاحیت میں دوسروں سے ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔

رسول اللہ ﷺ نے دیگر کم عمر نوجوانوں کو اس لیے واپس کردیا کہ جب تلواریں ٹکرائیں گی، تیر چلیں گے، نیزے مارے جائیں گے اور عین گھمسان کی جنگ جاری ہوگی کہیں یہ موقع پر راہ فرار اختیار کرکے مسلمانوں کی صفوں میں اضطراب و انتشار کا باعث نہ بن جائیں۔[2]

ان واقعات سے اسلامی معاشرے میں آگے بڑھنے کی تمنا اور شوق شہادت سے لبریز ہونے کی بھرپور عکاسی ہو رہی ہے۔ بوڑھے ہوں یا جوان حتی کہ چھوٹے بچے بہادری کے ساتھ شہادت گاہ کی طرف رواں دواں ہیں۔ حیرانی کا مقام ہے کہ وہ جذبہ شہادت سے

---

[1] محمد رسول اللہ ﷺ لصادق عرجون:572,571/3. [2] محمد رسول اللہ ﷺ لصادق عرجون: 572,571/3.

کیسے سرشار تھے، جبکہ فوجی بھرتی کا کوئی جبری قانون تھا نہ میدانِ جنگ میں جھونک دینے والی کوئی قیادت۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ سب نبوی طریقۂ تربیت کا اثر تھا جو امت کے کم عمر یا پختہ عمر افراد میں کارفرما رہا اور یہ دنیا کے معاملات سے بالاتر آخرت کی محبت و چاہت پر مبنی تھا۔

کفارِ مکہ سے مقابلے کے لیے نبی ﷺ کی منصوبہ بندی

دستوں کی تقسیم: رسول اللہ ﷺ نے قریشی مشرکوں کا مقابلہ کرنے کے لیے بڑی شاندار منصوبہ بندی کی۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنے لیے مناسب مقام کا چناؤ کیا۔ جنگجو افراد کا انتخاب فرمایا۔ جن میں قابلیت نہ تھی انھیں واپس بھیج دیا۔ پچاس ماہر تیر انداز منتخب کیے اور انھیں بڑی سختی سے اپنی ذمہ داری نبھانے کا حکم دیا۔ آپ ﷺ نے لشکر کو تین گروہوں میں تقسیم فرمایا اور ہر گروہ کے ایک ایک فرد کو پرچم عطا کیا۔ وہ تین گروہ اس طرح تھے:

① مہاجرین کا دستہ: اس کا پرچم حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو دیا۔

② انصار سے قبیلۂ اوس کا دستہ: ان کا پرچم اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ کو دیا۔

③ انصار سے قبیلۂ خزرج کا دستہ: ان کا علم حضرت حباب بن منذر رضی اللہ عنہ کو عطا کیا۔[1]

پرجوش خطبہ: رسول اللہ ﷺ کی عادت مبارکہ تھی کہ دشمن سے مقابلے کے لیے اپنے ساتھیوں کو جوش دلاتے اور میدان جنگ میں دشمن کے مقابلے میں ڈٹ جانے کی تلقین فرماتے تاکہ ان کے حوصلے بلند ہوں اور دشمن سے ٹکراؤ کے وقت ثابت قدمی کا مظاہرہ کریں، جنگ احد کے دن بھی آپ ﷺ نے ایسا ہی کیا۔

واقدی کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ کھڑے ہوئے اور لوگوں سے ان الفاظ میں مخاطب ہوئے: «يَا أَيُّهَا النَّاسُ! أُوصِيكُمْ بِمَا أَوْصَانِي اللّٰهُ فِي كِتَابِهٖ، مِنَ الْعَمَلِ بِطَاعَتِهٖ، وَالتَّنَاهِي عَنْ مَّحَارِمِهٖ، ثُمَّ إِنَّكُمُ الْيَوْمَ بِمَنْزِلِ أَجْرٍ، وَّذُخْرٍ،

1 غزوة أحد لمحمد عيطة بن سعيد، ص: 89.

لِمَنْ ذَكَرَ الَّذِي عَلَيْهِ، ثُمَّ وَطَّنَ نَفْسَهُ لَهُ عَلَى الصَّبْرِ، وَالْيَقِينِ، وَالْجِدِّ، وَالنَّشَاطِ، فَإِنَّ جِهَادَ الْعَدُوِّ شَدِيدٌ كَرْبُهُ، قَلِيلٌ مَّنْ يَّصْبِرُ عَلَيْهِ إِلَّا مَنْ عَزَمَ اللّٰهُ رُشْدَهُ، فَإِنَّ اللّٰهَ مَعَ مَنْ أَطَاعَهُ، وَإِنَّ الشَّيْطَانَ مَعَ مَنْ عَصَاهُ، فَافْتَتِحُوا أَعْمَالَكُمْ بِالصَّبْرِ عَلَى الْجِهَادِ، وَالْتَمِسُوا بِذٰلِكَ مَا وَعَدَكُمُ اللّٰهُ، وَعَلَيْكُمْ بِالَّذِي أَمَرْتُكُمْ، فَإِنِّي حَرِيصٌ عَلَى رُشْدِكُمْ، فَإِنَّ الْإِخْتِلَافَ، وَالتَّنَازُعَ، وَالتَّثْبِيطَ مِنْ أَمْرِ الْعِجْزِ، وَالضَّعْفِ، مِمَّا لَا يُحِبُّ اللّٰهُ، وَلَا يُعْطِي عَلَيْهِ النَّصْرَ، وَلَا الظَّفَرَ» ''اے لوگو! میں تمھیں اس بات کی وصیت کرتا ہوں جس کی اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنی کتاب میں وصیت فرمائی ہے، وہ یہ ہے کہ اس کے حکم کے مطابق عمل ہو۔ ممنوعہ اور حرام کردہ امور سے مکمل اجتناب کیا جائے، پھر آج جس نے اپنا فریضہ واجب سمجھ کر، اپنے آپ کو اس پر صبر و یقین اور محنت و سنجیدگی سے ثابت رکھا تو وہ آج اجر و ثواب کے مقام پر کھڑا ہے۔ دشمن سے لڑائی ایک مشکل اور کڑا معاملہ ہے اس پر صرف وہی استقامت دکھا سکتا ہے جسے اللہ تعالیٰ بھلائی عنایت فرما دیں۔ اطاعت شعاروں کے ساتھ اللہ تعالیٰ اور نافرمانوں کا ساتھی شیطان ہے۔ میدانِ جہاد میں صبر و استقامت کا دامن تھامے رکھو اور معبود برحق نے جو سچا وعدہ کیا ہے اسے پانے کی جستجو کرو۔ لوگو! میں تمھاری رشد و ہدایت کا انتہائی متمنی ہوں، لہٰذا میرے حکم پر لبیک کہو اور باہمی اختلاف، جھگڑا اور ہٹ دھرمی، شکست اور کمزوری کا پیش خیمہ ثابت ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نہ انھیں پسند فرماتے ہیں اور نہ ہی اللہ تعالیٰ ان خامیوں کے ہوتے ہوئے نصرت و فتح عنایت فرماتے ہیں۔''[1]

اس خطبے سے کئی مقاصد سامنے آتے ہیں، مثلاً:

① میدان جہاد میں بھرپور کوشش کرنے اور مستعد رہنے پر ابھارنا۔

② معرکے میں دشمن کے مقابلے میں ڈٹ جانے کی تلقین۔

[1] المغازي للواقدي:222,221/1.

③ جھگڑے اور اختلافات کے نقصانات۔[1]

رسول اللہ ﷺ کی بابرکت رہنمائی ہمیں کئی ایک طے شدہ حقائق کی تعلیم دیتی ہے، مثلاً: جب شرکائے لشکر میں ایسے مضبوط ارادوں اور قوی دل کے حامل افراد نہ ہوں جنھیں زندگی ہی کی طرح موت بھی عزیز لگے تو تمام تر اسلحہ اور ساری منصوبہ بندی دھری کی دھری رہ جاتی ہے۔ اور یہ چیز لشکر کو وعظ و نصیحت، ان کی ذہن سازی اور ان میں جہاد کی محبت اور شہادت کی تڑپ پیدا کرنے ہی سے حاصل ہوسکتی ہے۔

جبل احد کی جنگی اہمیت: رسول اللہ ﷺ نے لشکر کی حفاظت کے لیے احد پہاڑ کی اہمیت کو بھانپ لیا تھا، لہٰذا مسلمان لشکر جونہی احد کے پاس پہنچا تو آپ ﷺ نے انھیں احد کی طرف پشت کرنے اور مدینہ منورہ کی طرف رخ کرنے کی تلقین فرمائی۔ اور حضرت عبداللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ کی قیادت میں پچاس تیر انداز عَینَین پہاڑی پر، جو احد کے بالمقابل ہے، مقرر فرما دیے تاکہ کفار مسلمانوں کا محاصرہ نہ کرسکیں۔ آپ ﷺ نے ان 50 تیراندازوں کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا:

«إِنْ رَأَيْتُمُونَا تَخْطَفُنَا الطَّيْرُ، فَلَا تَبْرَحُوا مَكَانَكُمْ هٰذَا حَتّٰى أُرْسِلَ إِلَيْكُمْ، وَإِنْ رَأَيْتُمُونَا هَزَمْنَا الْقَوْمَ وَأَوْطَأْنَاهُمْ فَلَا تَبْرَحُوا حَتّٰى أُرْسِلَ إِلَيْكُمْ»

”اگر تم دیکھو کہ پرندے ہمیں اچک رہے ہیں تو بھی اپنی جگہ نہ چھوڑنا یہاں تک کہ میں تمھیں بلا بھیجوں اور اگر تم دیکھو کہ ہم نے دشمن کو شکست دے دی ہے اور انھیں کچل دیا ہے تو بھی میرا پیغام آنے تک وہیں رہنا۔“[2]

اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے ان تیراندازوں کو چھوڑ کر باقی لشکر سے فرمایا:

«لَا تَبْرَحُوا حَتّٰى أُوذِنَكُمْ» ”جب تک میں تمھیں اجازت نہ دوں اپنی جگہ پر رہنا۔“

---

[1] القيادة العسكرية في عهد الرسولﷺ، ص:469. [2] صحيح البخاري، حديث:3039.

اور فرمایا: «لَا يُقَاتِلَنَّ أَحَدٌ حَتّٰى اٰمُرَهٗ بِالْقِتَالِ» ”جب تک میں حکم نہ دوں کوئی بھی جنگ کا آغاز نہ کرے۔“

آپ ﷺ نے تیراندازوں کے کمانڈر سے یہ بھی فرمایا: «اِنْضَحِ الْخَيْلَ عَنَّا بِالنَّبْلِ، لَا يَأْتُونَا مِنْ خَلْفِنَا، وَاثْبُتْ مَكَانَكَ إِنْ كَانَتْ لَنَا أَوْعَلَيْنَا» ”شہسواروں کو تیر مار کر ہم سے دور رکھنا تاکہ وہ ہمارے پیچھے سے نہ آنے پائیں۔ ہم جیتیں یا ہاریں تم اپنی جگہ پر رہنا۔“ [1]

تیراندازوں سے آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا: «اِلْزَمُوا مَكَانَكُمْ، لَاتَبْرَحُوا مِنْهُ، فَإِذَا رَأَيْتُمُونَا نَهْزِمُهُمْ حَتّٰى نَدْخُلَ عَسْكَرَهُمْ، فَلَا تُفَارِقُوا مَكَانَكُمْ، وَإِنْ رَّأَيْتُمُونَا نُقْتَلُ، فَلَاتَغِيثُونَا وَلَا تَدْفَعُوا عَنَّا، وَارْشُقُوهُمْ بِالنَّبْلِ، فَإِنَّ الْخَيْلَ لَا تُقْدِمُ عَلَى النَّبْلِ، إِنَّا لَنْ نَّزَالَ غَالِبِينَ مَا مَكَثْتُمْ مَّكَانَكُمْ، اَللّٰهُمَّ! إِنِّي أُشْهِدُكَ عَلَيْهِمْ» ”تم نے اپنی جگہ نہیں چھوڑنی۔ جب تم دیکھو کہ ہم انھیں شکست دیتے ہوئے ان کے لشکر میں گھس گئے ہیں تو بھی اپنی جگہ سے نہ ہٹنا۔ اور اگر تم دیکھو کہ ہم قتل ہو رہے ہیں تو بھی ہماری مدد کے لیے نہ آنا اور نہ ہمارا دفاع کرنا۔ انھیں تیر مار مار کر ہم سے پرے رکھنا کیونکہ گھوڑا تیروں کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ تم اپنی جگہ قائم رہے تو ہم غالب ہی غالب ہیں۔ اے اللہ! میں تجھے ان پر گواہ بناتا ہوں۔“ [2]

مسلمانوں نے بلند اور اہم جنگی مقامات قبضے میں لے لیے اور مکی لشکر کو وادی میں رکھا ان کا منہ احد کی جانب اور پشت مدینہ کی جانب تھی۔ اب تیراندازوں کے ذمے یہ کام تھے کہ موقع پر نگاہ رکھیں، مسلمانوں کی پشت محفوظ رکھیں اور دشمن کے شہسواروں کو مسلمانوں کے پاس نہ آنے دیں۔ [3]

[1] السيرة الحلبية: 496/2، وتاريخ الطبري: 507/2، ودلائل النبوة للبيهقي: 227/3، والسيرة النبوية لابن هشام: 70/3. [2] السيرة الحلبية: 496/2، و السيرة النبوية لابن هشام: 70,69/3، وتاريخ الطبري: 507/2. [3] غزوة أحد لمحمد عيظة بن سعيد، ص: 90.

غزوۂ احد (15 شوال 3ھ)
﴿وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ حَتّٰٓى اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ﴾ "اور تحقیق سچا کر دکھایا تم سے اللہ نے اپنا وعدہ جب کاٹتے تھے تم انکو ساتھ اسکے حکم کے یہاں تک کہ جب تم پست ہمت ہوگئے اور باہم جھگڑا کیا تم نے حکم (رسول) میں اور نافرمانی کی تم نے بعد اسکے کہ دکھلایا اس نے تم کو وہ جسے تم پسند کرتے تھے۔"
(آل عمران 152:3)
جبل احد
جنگ کے بعد مسلمانوں کا اجتماع
مسلمانوں کا پڑاؤ
عبداللہ بن جبیر کے تیرانداز
جبل عینین
(جبل رُماۃ)
خالد بن ولید کا حملہ
مسلمان: 700 مجاہد
علی
میمنہ
حمزہ
قلب
مقداد
میسرہ
عکرمہ بن ابی جہل
ایک سو گھڑ سواروں کے ہمراہ
پیدل فوج
صفوان بن امیہ یا
عمرو بن عاص کی قیادت میں
خالد بن ولید
ایک سو گھڑ سواروں کے ہمراہ
مشرکین: 3000 جنگجو
قریشی عورتوں کے خیمے
جنگل (غابہ)
سیلابی ندیوں کا سنگم
بئر رومہ
جرف
بنو حارثہ
وادی قناۃ
بنو عبدالاشہل
اور زعوراء
عُبیت
مزاد
ثنیۃ الوداع
(وداع کی گھاٹی)
راتج
بنو ظفر
بنو حارث بن خزرج
مدینہ منورہ
(یثرب)
الشیخ
بنو سلمہ
بدائع
مسجد نبوی
بنو نجار
البقیع
وادی العقیق

صف بندی اور لشکر کی تنظیم: رسول اللہ ﷺ نے آگے بڑھ کر نماز کی صفوں کی طرح صفیں ترتیب دیں۔ آپ ﷺ خود پیادہ چل کر صفیں درست فرما رہے تھے اور جنگ کے لیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی مورچہ بندی کر رہے تھے۔ آپ ﷺ صفیں سیدھی کرتے ہوئے فرماتے: «تَقَدَّمْ يَا فُلَانُ وَتَأَخَّرْ يَا فُلَانُ» ''فلاں! تم آگے ہو جاؤ! فلاں، تم پیچھے ہو جاؤ۔'' اس طرح صفیں سیدھی کر لیں۔[1] آپ ﷺ نے صفوں کے آگے زیادہ قوی اور جری افراد منتخب فرمائے تاکہ وہ پیچھے والوں کے لیے رستہ بنائیں۔ آپ ﷺ نے یہ اسلوب اس لیے اپنایا کہ دشمن سے جنگ میں یہ مؤثر ترین طریقہ ہے۔[2]

سپہ سالار کی اجازت کے بغیر جنگ کا آغاز کرنے کی ممانعت: امام طبری کا کہنا ہے کہ آپ ﷺ نے لشکر کی پشت احد کی جانب کی اور فرمایا:

«لَا يُقَاتِلَنَّ أَحَدٌ حَتّٰى نَأْمُرَهُ بِالْقِتَالِ»

''ہمارے حکم کے بغیر کوئی جنگ (کا آغاز) نہ کرے۔''[3]

اور اس میں اہم نکتہ یہ تھا کہ اس طرح ذمہ داری اور قیادت صرف ایک شخص کے ہاتھ میں رہے گی اور آپ ﷺ مصلحت کے تقاضے خوب جانتے تھے۔

1 المغازي للواقدي: 219/1. 2 العبقرية العسكرية لمحمد فرج، ص: 356,355. 3 تاريخ الطبري: 507/2.

باب 3

میدانِ احد کی تفصیلات

جنگ کا آغاز اور مسلمانوں کا غلبہ

مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے کی کوشش: جنگ کی ابتدا میں ابوسفیان نے مسلمانوں کی مضبوط صفوں میں شگاف ڈالنے کی بھرپور کوشش کی، اس سلسلے میں اس نے انصار کو پیغام بھیجا: ''آپ لوگ ہمارے اور ہمارے چچیرے بھائی کے درمیان حائل نہ ہوں۔ اس کے نتیجے میں ہم بھی آپ سے کنارہ کش ہو جائیں گے کیونکہ آپ کے ساتھ ہمیں لڑنے کی کوئی ضرورت نہیں۔'' مگر انصار نے اس کی پیشکش کے عین خلاف جواب دیا۔[1]

اس کوشش کے ناکام ہونے پر قریش نے دوسرا پتہ پھینکا، چنانچہ ابوعامر راہب جو اہل مدینہ کا خائن تھا وہ اہل مکہ کا آلۂ کار بن کر سامنے آیا۔ اس نے کچھ انصار کو پسپائی اختیار کرنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی اور کہنے لگا: ''اے خاندانِ اوس! میں ابوعامر ہوں۔'' آگے سے جواب آیا: ''ارے فاسق! اللہ کرے تیری اور تجھے بھیجنے والوں کی سازشیں خاک میں ملیں۔'' یہ جواب سن کر وہ بولا: ''میری قوم میرے بعد شر سے دوچار ہوگئی ہے۔'' پھر اس نے مسلمانوں سے پرزور لڑائی کی اور ان پر پتھر برسائے۔[2]

انفرادی لڑائی یا مبارزت: جنگ کا آغاز حضرت علی رضی اللہ عنہ اور مشرکین کے علمبردار طلحہ

1 إمتاع الأسماع للمقريزي: 120/1. 2 السيرة النبوية لابن هشام: 71/3، و السيرة النبوية لأبي شهبة: 192/2.

بن عثمان کے درمیان مبارزت سے ہوا۔ سیرتِ حلبیہ کے مولف کا بیان ہے کہ طلحہ بن عثمان مشرکین کا علم اٹھائے سامنے آیا اور بار بار مبارزت کا تقاضا کیا مگر کوئی بھی سامنے نہ آیا۔ وہ کہنے لگا:

''محمد (ﷺ) کے ساتھیو! تمھارا خیال ہے کہ اللہ تمھاری تلواروں سے ہمیں بہت جلد آگ اور ہماری تلواروں سے تمھیں بہت جلد جنت میں پہنچا دیتا ہے۔ تو کیا تم میں سے کوئی ایسا شخص ہے جو جلدی سے اپنی تلوار لے اور مجھے آگ میں پہنچا دے یا میں اسے اپنی تلوار سے جلد از جلد جنت میں پہنچا دوں؟''

یہ سن کر حضرت علی رضی اللہ عنہ سامنے آئے اور فرمایا:

''اللہ کی قسم! جب تک میری تلوار کے ذریعے اللہ تجھے بہت جلد آگ میں نہ پہنچا دے یا تیری تلوار کے ذریعے اللہ مجھے جلد جنت میں نہ پہنچا دے میں پیچھے نہیں ہٹوں گا۔''

یہ کہنے کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس پر تلوار سے وار کیا اور اس کا ایک پاؤں کاٹ دیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ زمین پر گرا اور ننگا ہو گیا اور التجا کرنے لگا: ''اے میرے چچیرے بھائی! تمھیں اللہ کی قسم اور رشتہ داری کا واسطہ دیتا ہوں۔'' حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جب یہ سنا تو اسے زندہ چھوڑ کر واپس لشکر میں آ گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے (یہ منظر دیکھتے ہوئے) نعرۂ تکبیر بلند فرمایا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے کسی ساتھی نے ان سے دریافت کیا کہ آپ نے اس کا کام تمام کیوں نہ کر دیا؟ فرمایا: ''میرے چچیرے بھائی نے رشتہ داری کا واسطہ اس وقت دیا جب وہ ننگا ہو چکا تھا تو مجھے بھی شرم محسوس ہونے لگی۔''[1]

[1] السيرة الحلبية: 2/498,497، و تفسير الطبري: 7/218. غزوۂ احد میں مبارزت کے متعلق صحیح بخاری میں بھی حدیث موجود ہے۔ وحشی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: لوگوں نے جب لڑائی کے لیے صف بندی کر لی تو سباع نے مبارزت کی دعوت دی تو حمزہ رضی اللہ عنہ مقابلے کے لیے نکلے اور کہا: ''او سباع! او شرمگاہ کی چمڑی کاٹنے (عورتوں کا ختنہ کرنے) والی عورت کے بیٹے! اللہ اور اس کے رسول سے مخالفت مول لیتے ہو؟'' یہ کہتے ہوئے اس پر ٹوٹ پڑے۔ وہ ایسے ہو گیا جیسے گزرا ہوا کل ہو۔ (صحيح البخاري، حديث: 4072) مولف رحمہ اللہ بھی اپنی کتاب میں یہ روایت لائے ہیں، تفصیل کے لیے دیکھیے اس کتاب کے صفحہ 598 پر۔

گھمسان کا رن پڑنا اور نبی ﷺ کی حوصلہ افزائی: دونوں لشکروں میں گھمسان کی جنگ شروع ہوگئی۔ لڑائی کے شعلے ہر طرف بھڑک اٹھے۔ رسول اللہ ﷺ ساتھیوں کو ہمت، ولولے اور جنگی جذبے پر ابھارنے لگے اور ان کے جذبوں کو تازگی دینے کے لیے آپ ﷺ نے ایک تلوار پکڑی اور فرمایا:

«مَنْ يَأْخُذُ مِنِّي هٰذَا؟» ''یہ تلوار مجھ سے کون لے گا؟''

کئی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ہاتھ پھیلاتے ہوئے عرض کیا: ''میں لوں گا، میں تھاموں گا۔''

آپ ﷺ نے فرمایا: «مَنْ يَأْخُذُهُ بِحَقِّهِ؟» ''کون ہے جو یہ تلوار مجھ سے لے کر اس کا حق ادا کرے گا؟''

اب لوگ کچھ رک گئے تو حضرت ابودجانہ سماک بن خَرَشہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا:

''اے اللہ کے رسول! اس کا حق کیا ہے؟''

فرمایا: «أَنْ تَضْرِبَ بِهِ الْعَدُوَّ حَتّٰى يَنْحَنِيَ» ''اس تلوار کو دشمن پر اتنا چلاؤ کہ یہ ٹیڑھی ہو جائے۔''

انھوں نے کہا: ''میں اس تلوار کو لے کر اس کا حق ادا کروں گا۔''

آپ ﷺ نے تلوار انھیں دے دی۔ حضرت ابودجانہ رضی اللہ عنہ بڑے بہادر انسان تھے۔ لڑائی کے وقت سینہ تان کر چلتے تھے۔ جب رسول اللہ ﷺ نے انھیں مسلمانوں اور مشرکوں کی صفوں کے درمیان سینہ تان کر چلتے دیکھا تو فرمایا: «إِنَّهَا لَمِشْيَةٌ يُّبْغِضُهَا اللّٰهُ إِلَّا فِي مِثْلِ هٰذَا الْمَوْطِنِ» ''اس جیسے موقعوں کے سوا یہ چال اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہے۔''

حضرت ابودجانہ رضی اللہ عنہ نے وہ تلوار تھام لی اور اس کے ساتھ مشرکوں کی کھوپڑیاں اڑانے لگے۔[1]

---

1. صحیح مسلم، حدیث: 2470، و السیرة النبویة لابن هشام: 71/3، و دلائل النبوة للبیهقي: 232/3.

حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ جنگ احد میں ابودجانہ رضی اللہ عنہ کے عمدہ کردار پر ان الفاظ سے لب کشاں ہیں: ''جب میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تلوار مانگی اور آپ نے مجھے نہ دی اور ابودجانہ رضی اللہ عنہ کو دے دی تو میرے دل پر اس کا اثر ہوا اور میں نے دل میں سوچا کہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی صفیہ کا بیٹا ہوں، قریشی ہوں اور میں نے ابودجانہ رضی اللہ عنہ سے پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے تلوار مانگی لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابودجانہ رضی اللہ عنہ کو دے دی اور مجھے نہ دی۔ اللہ کی قسم! میں دیکھوں گا وہ اس سے کیا کام لیتے ہیں، چنانچہ میں ابودجانہ کے پیچھے لگا رہا۔ انھوں نے اپنی سرخ پٹی نکالی اور سر پر باندھی تو اس پر انصار نے کہا: ''ابودجانہ رضی اللہ عنہ نے سر پر کفن باندھ لیا ہے۔'' ابودجانہ جب یہ پٹی باندھتے لوگ اس طرح کہا کرتے تھے، پھر وہ یہ کہتے ہوئے میدان جنگ میں کود پڑے:

أَنَا الَّذِي عَاهَدَنِي خَلِيلِي وَ نَحْنُ بِالسَّفْحِ لَدَى النَّخِيلِ
أَلَّا أَقُومَ الدَّهْرَ فِي الْكَيُّولِ أَضْرِبْ بِسَيْفِ اللّٰهِ وَالرَّسُولِ

''میں وہی ہوں جس سے دامنِ کوہ کے نخلستان میں میرے خلیل صلی اللہ علیہ وسلم نے عہد و پیمان لیا تھا کہ کبھی صفوں کے پیچھے نہ رہوں گا۔
اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی (عطا کردہ) تلوار کیا ہی خوب چلتی ہے بلکہ میں کھڑے ہو کر آخری صف تک برابر مقابلہ کرتا رہوں گا۔''

اس کے بعد انھیں جو بھی دشمن نظر آتا اسے قتل کر دیتے۔ ادھر مشرکین میں ایک شخص تھا جو ہمارے زخمیوں کو قتل کرنے جا رہا تھا۔ اب ابودجانہ رضی اللہ عنہ اور وہ قاتل مشرک دونوں آہستہ آہستہ ایک دوسرے کے قریب ہو رہے تھے۔ میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ دونوں کا آمنا سامنا ہو جائے اور ایسا ہی ہوا۔ دونوں نے ایک دوسرے پر وار کیا۔ مشرک نے ابودجانہ رضی اللہ عنہ پر تلوار چلائی جس سے ابودجانہ رضی اللہ عنہ نے ڈھال سے بچاؤ کیا۔ مشرک کی تلوار اس ڈھال میں الجھ کر رہ گئی۔ اب ابودجانہ رضی اللہ عنہ نے اس پر تلوار چلائی اور اس کا کام تمام

کر دیا، پھر میں نے دیکھا کہ انھوں نے تلوار ہند بنت عتبہ کے سر کے وسط پر اٹھائی اور پھر اسے ہٹا لیا۔ میں نے سوچا کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ ہی بہتر جانتے ہیں۔''

ابن اسحاق کا بیان ہے کہ ابو دجانہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے ایک انسان کو دیکھا، وہ لوگوں کو بڑے زور شور سے جوش و ولولہ دلا رہا تھا۔ میں اس کی طرف بڑھا، میں نے جب اس پر تلوار اٹھائی تو اس نے چیخ مار کر واویلا کیا۔ اب پتا چلا کہ یہ تو عورت ہے۔ میں نے رسول اللہ ﷺ کی تلوار کو محترم جانا کہ اس سے کسی عورت کو ماروں۔ [1]

تیر اندازوں کی حکم عدولی اور جنگ کا پانسہ پلٹنا

مشرکین کے ساتھ جنگ میں مسلمانوں نے بہادری کے جوہر دکھائے۔ ان کا جنگی شعار اس دن «أَمِتْ، أَمِتْ» ''مارو، مارو'' تھا۔ جری مجاہدین جنگی شہسواروں اور سپوتوں کو موت کی آغوش میں دھکیل رہے تھے۔ اسلام کے شیروں نے بہادری اور جوانمردی کی تاریخ از سرنو مرتب کر دی۔ حضرت حمزہ، مصعب بن عمیر، ابو دجانہ، ابوطلحہ انصاری، سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہم اور دیگر جوانمردوں نے شجاعت و بہادری کی داستانیں رقم کیں۔ اور پہلے ہی حملے میں جنگ کا توازن مسلمانوں کے حق میں ہو گیا۔ [2]

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اس طرف اشارہ فرمایا ہے:

﴿وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ حَتّٰٓى اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ۭ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۚ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْھُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ ۚ وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ ۭ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَلَي الْمُؤْمِنِيْنَ ○﴾

''یقیناً اللہ نے تم سے اپنا وعدہ سچ کر دکھایا جب تم (احد میں) اس کے حکم سے

1 البداية والنهاية: 17/4، والسيرة النبوية لابن هشام: 73/3، ودلائل النبوة للبيهقي: 233/3.

2 نضرة النعيم: 303/1.

کافروں کو قتل کر رہے تھے، یہاں تک کہ جب تم نے کم ہمتی اختیار کی اور اپنی ذمہ داری کے بارے میں جھگڑنے لگے اور جونہی اللہ نے تمھیں وہ چیز (مالِ غنیمت کی جھلک) دکھائی جس سے تم محبت کرتے تھے تو تم نے نافرمانی کی، (اس لیے کہ) تم میں سے کچھ لوگ دنیا چاہتے تھے اور کچھ آخرت کی خواہش رکھتے تھے، پھر اللہ نے تمھیں کافروں کے مقابلے میں پسپا کر دیا تاکہ تمھاری آزمائش کرے۔ بلا شبہ (پھر بھی) اس نے تمھیں معاف کر دیا۔ اور اللہ مومنوں پر فضل کرنے والا ہے۔''[1]

عینین پہاڑ پر مامور تیر اندازوں نے جب قریشی لشکر کو شکست خوردہ پایا اور میدان جنگ میں مالِ غنیمت پڑا دیکھا تو اس کی چاہت میں وہ مورچہ چھوڑ بیٹھے۔ ان کا یہ خیال تھا کہ جنگ تو ختم ہو چکی ہے، چنانچہ وہ اپنے امیر عبد اللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ سے کہنے لگے: ''غنیمت! لوگو غنیمت! تمھارے ساتھی جیت چکے ہیں اب کیا انتظار کر رہے ہو؟'' حضرت عبد اللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''کیا تم بھول گئے ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تم سے کیا کہا تھا؟'' وہ کہنے لگے: ''اللہ کی قسم! ہم بھی لوگوں کے پاس جائیں گے اور کچھ غنیمت حاصل کریں گے۔''[2] یہ کہتے ہوئے وہ اپنے امیر کی اجازت کے بغیر مالِ غنیمت سمیٹنے لگے۔

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما تیر اندازوں کی اس صورت حال کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں: ''جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو فتح حاصل ہو گئی اور مشرکین کا لشکر شکست سے دوچار ہو چکا تو اس دوران تیر انداز اکٹھے ہی میدان جنگ میں آ دھمکے اور غنیمت جمع کرنے لگے۔ تمام اسلامی لشکر کی صفیں اکٹھی ہو چکیں۔ ایسے جمع ہو گئے جس طرح ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسری میں گھس جاتی ہیں۔ تو جب تیر اندازوں نے اپنا مورچہ خالی کر دیا وہیں سے دشمن کے شہسوار مسلمانوں پر پل پڑے۔ اس کے نتیجے میں خود مسلمان عدمِ شناخت کی وجہ سے ایک دوسرے کو قتل کرنے لگے۔ اس طرح مسلمانوں میں سے خاصی تعداد شہید ہو گئی۔''[3]

---

[1] آل عمرٰن 3:152. [2] صحيح البخاري، حديث:3039. [3] مسند أحمد:1/487.

خالد بن ولید، مشرکوں کے گھڑ سواروں کے کمانڈر تھے، انھیں مسلم سپاہ نرغے میں لینے کا سنہری موقع ہاتھ آ گیا۔ مشرکین نے جب یہ صورتِ حال دیکھی تو اب دوبارہ جنگ کی طرف لپکے اور دونوں اطراف سے مسلمانوں کو گھیرے میں لے لیا۔ مسلمانوں کی جنگی منصوبہ بندی درہم برہم ہوگئی اور وہ بغیر کسی قیادت، وحدت اور قاعدے کے بے ہنگم لڑ رہے تھے۔ حتی کہ اپنوں کو بھی پہچان نہیں رہے تھے۔ اسی دوران حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کے والد گرامی حضرت یمان رضی اللہ عنہ کو غلطی سے شہید کر دیا گیا۔[1]

مسلمان شہداء میدان جنگ میں گرنے لگے اور ان کا رسول اللہ ﷺ سے رابطہ ٹوٹ گیا اور مشہور ہو گیا کہ آپ ﷺ شہید ہو چکے ہیں۔[2]

سارا نظام ہی درہم برہم ہو گیا۔ جنگ کی بھٹی گرم ہوگئی جو بھی مسلمان مشرکوں کے ہاتھ لگتا اسے مار دیتے۔ ایک موقع پر وہ رسول اللہ ﷺ کے انتہائی قریب پہنچ گئے۔ مشرکین نے آپ ﷺ پر پتھر پھینکا جس سے چہرۂ مبارک پر زخم آ گیا۔ سامنے والے دو دانتوں کے ساتھ والا نچلا دایاں دانت مبارک ٹوٹ گیا اور ناک مبارک پر چوٹ آ گئی۔ طبیعت بوجھل ہونے لگی اور خاصا خون بہہ نکلا۔[3]

حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ احد کے دن آپ ﷺ کا رباعی دانت ٹوٹ گیا، آپ ﷺ کا سر مبارک زخمی ہو گیا۔ اس دوران آپ ﷺ اپنے چہرے سے خون پونچھتے جا رہے تھے اور یہ کہتے جا رہے تھے:

«كَيْفَ يُفْلِحُ قَوْمٌ شَجُّوا نَبِيَّهُمْ وَكَسَرُوا رَبَاعِيَتَهُ وَهُوَ يَدْعُوهُمْ إِلَى اللّٰهِ»

”وہ قوم کیسے نجات پا سکتی ہے جس نے اپنے نبی کے چہرے کو زخمی کر دیا اور دانت

[1] صحيح البخاري، حديث: 4065. [2] غزوة أحد لمحمد عيظة بن سعيد، ص: 98. [3] فقه السيرة للغزالي، ص: 294.

توڑ دیا، جبکہ وہ انھیں اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دیتا ہے۔''[1]

اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

﴿لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ أَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَإِنَّهُمْ ظَالِمُونَ﴾

''(اے نبی!) آپ کا اس معاملے میں کچھ اختیار نہیں، اللہ چاہے تو ان کی توبہ قبول کرے، چاہے تو انھیں عذاب دے کیونکہ وہ ظالم ہیں۔''[2]

رسول اللہ ﷺ کی شہادت کی افواہ

حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ سے بہت مشابہت رکھتے تھے، چنانچہ ابن قمئہ نے ان پر حملہ کر کے انھیں شہید کر دیا۔ اور قریش سے کہا: ''میں نے محمد (ﷺ) کو قتل کر دیا ہے۔''[3]

یہ افواہ پھیل گئی کہ رسول اللہ ﷺ شہید کر دیے گئے ہیں۔ یہ سنتے ہی مسلمان بکھرنے لگے اور کچھ تو مدینہ منورہ چلے گئے۔ ایک جماعت پہاڑ کا رخ اختیار کر گئی۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حیران و ششدر تھے، انھیں کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا کہ اس جان لیوا خبر کے بعد کیا کریں۔[4]

مسلمانوں کا ایک گروہ میدان جنگ سے بھاگ نکلا۔ کچھ میدان کے کنارے (ہتھیار پھینک کر) بیٹھ گئے۔ کچھ مسلمانوں نے اسی خیال کے بعد کہ آپ ﷺ تو شہید ہو چکے اب زندگی کا کیا لطف، شہادت کو ترجیح دی۔ انھی میں سے حضرت انس بن نضر رضی اللہ عنہ بھی تھے جو بدر میں عدم شمولیت کی بنا پر افسوس کیا کرتے تھے اور کہتے تھے: ''اللہ کی قسم! مجھے رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ جنگ کی فرصت ملی تو اللہ تعالیٰ دیکھیں گے کہ میں کیا کرتا ہوں۔'' چنانچہ اس موقع پر انھوں نے اپنا وعدہ سچا کر دیا۔

---

[1] صحیح مسلم، حدیث: 1791. [2] آل عمرٰن 3:128. [3] السيرة النبوية لابن هشام: 3/81. [4] غزوة أحد لمحمد عيظة بن سعيد، ص: 100.

انس بن نضر رضی اللہ عنہ کی جرأت و بہادری

حضرت انس بن نضر رضی اللہ عنہ نے احد کے دن کچھ پریشان حال صحابہ سے جو ہتھیار پھینک کر بیٹھے تھے، دریافت کیا: ''کس لیے بیٹھے ہو؟'' کہنے لگے: ''آپ صلی اللہ علیہ وسلم شہید ہو چکے ہیں۔'' انس بن نضر رضی اللہ عنہ نے جواب دیتے ہوئے کہا: ''لوگو! اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شہید ہوگئے ہیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رب تو شہید نہیں ہوگیا۔ تم بھی اس پر جان دے دو جس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جان قربان کردی ہے۔'' پھر کہنے لگے: ''اے اللہ! میں اپنے ساتھیوں کے اس موقف سے بری ہوں اور مشرکین کے کردار سے لاتعلقی کا اظہار کرتا ہوں۔'' بعد ازاں حضرت انس بن نضر رضی اللہ عنہ سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ سے ملتے ہیں اور کہتے ہیں: ''اے سعد! میں احد کے پاس جنت کی خوشبو پا رہا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ میدانِ کارزار میں کود پڑے اور شہادت سے ہمکنار ہونے تک برسرِ پیکار رہے۔ معرکے کے بعد انس بن نضر رضی اللہ عنہ کے جسم پر تلوار، نیزے اور تیر کے اسی (80) سے زیادہ زخم موجود تھے، حتی کہ شناخت ناممکن ہو رہی تھی، چنانچہ ان کی بہن نے انگلی کے پوروں سے انھیں پہچانا تھا۔[1]

یقیناً ان جیسے بہادر ہی حسبِ ذیل فرمان باری تعالیٰ کے مصداق ہو سکتے ہیں:

﴿مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ۝﴾

''مومنوں میں سے کچھ وہ لوگ بھی ہیں جنھوں نے اللہ سے جو عہد کیا تھا وہ سچ کر دکھایا، چنانچہ ان میں سے بعض نے اپنا عہد پورا کیا (شہادت پا گئے) اور ان میں سے بعض منتظر ہیں اور انھوں نے (عہد میں) کوئی تبدیلی نہیں کی۔''[2]

---

1 صحيح البخاري، حديث:4048، و السيرة النبوية لابن هشام: 88/3، وغزوة أحد لمحمد عيطة بن سعيد، ص:101. 2 الأحزاب 23:33.

میدانِ جنگ سے بھاگنے والے اور ان کی معافی

مگر جو لوگ ثابت قدم رہنے کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کی تلقین کے باوجود میدان چھوڑ گئے ان کے متعلق درج ذیل ارشاد نازل ہوا:

﴿إِذْ تُصْعِدُونَ وَلَا تَلْوُونَ عَلَىٰٓ أَحَدٍ وَالرَّسُولُ يَدْعُوكُمْ فِىٓ أُخْرَىٰكُمْ فَأَثَـٰبَكُمْ غَمًّۢا بِغَمٍّ لِّكَيْلَا تَحْزَنُوا۟ عَلَىٰ مَا فَاتَكُمْ وَلَا مَآ أَصَـٰبَكُمْ ۗ وَٱللَّهُ خَبِيرٌۢ بِمَا تَعْمَلُونَ ۝﴾

"جب تم بھاگے چلے جا رہے تھے اور کسی کی طرف پلٹ کر نہ دیکھتے تھے اور رسول (ﷺ) تمھارے پیچھے سے تمھیں آوازیں دے رہے تھے، پھر اللہ نے تمھیں غم پر غم دیے تاکہ تمھیں یہ سبق ملے کہ جو کچھ تمھارے ہاتھ سے جائے یا جو مصیبت تم پر نازل ہو اس پر تمھیں غمگین نہیں ہونا چاہیے اور تم جو عمل کرتے ہو اللہ اس کی خبر رکھتا ہے۔"[1]

قرآن پاک نے ان صحابہ کا تذکرہ کیا ہے جنھوں نے رسول اللہ ﷺ کی شہادت کی افواہ سن کر بھاگنے میں عافیت جانی۔ سب سے قبل جس شخص نے رسول اللہ ﷺ کو پہچان کر لوگوں کو خوشخبری دی کہ آپ ﷺ زندہ ہیں وہ حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ تھے۔ انھوں نے خوشی میں بآواز بلند اعلان کیا تو آپ ﷺ نے انھیں خاموش کرا دیا کہ مبادا مشرکین تک یہ بات نہ پہنچ جائے۔[2]

میدانِ جنگ چھوڑ کر جانے والے گروہ کو اللہ تعالیٰ نے معافی عطا فرما دی، چنانچہ ارشاد فرمایا:

﴿إِنَّ ٱلَّذِينَ تَوَلَّوْا۟ مِنكُمْ يَوْمَ ٱلْتَقَى ٱلْجَمْعَانِ إِنَّمَا ٱسْتَزَلَّهُمُ ٱلشَّيْطَـٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوا۟ ۖ وَلَقَدْ عَفَا ٱللَّهُ عَنْهُمْ ۗ إِنَّ ٱللَّهَ غَفُورٌ حَلِيمٌ ۝﴾

[1] آل عمرٰن 3:153. [2] مجمع الزوائد: 112/6، والسيرة النبوية لابن هشام: 88/3.

”بے شک جب دو لشکر (احد میں) آپس میں ٹکرائے تھے تو تم میں سے جن لوگوں نے پسپائی اختیار کی یقیناً وہ اپنی بعض کوتاہیوں کے سبب شیطان کے بہکاوے میں آگئے تھے اور بلا شبہ اللہ نے انھیں معاف کر دیا، بے شک اللہ نہایت بخشنے والا، بہت حوصلے والا ہے۔“ [1]

رسول اللہ ﷺ کے ارد گرد بہادری کے مناظر

ابتدائی فتح کے بعد جب مشرکین مسلمانوں پر پل پڑے جس میں ان کا اصل ہدف رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ گرامی تھی۔ آپ ﷺ اپنے مقام سے پیچھے نہیں ہٹے۔ جاں نثار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ایک ایک کر کے آپ پر جان نچھاور کر رہے تھے۔ جس وقت آپ ﷺ کا گھیراؤ ہوا آپ ﷺ کے ساتھ صرف نو ساتھی تھے جن میں سے سات انصاری تھے۔ [2]

رسول اللہ ﷺ مشرکین کا حصار توڑ کر پہاڑ پر موجود اپنے لشکر میں جانا چاہتے تھے۔ ادھر انصار دیوانہ وار آپ ﷺ کے دفاع میں یکے بعد دیگرے جانیں قربان کر رہے تھے۔ [3]

بعد ازاں حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ نے اس قدر لڑائی کی کہ جسم لہولہان تھا اور تیر لگنے سے دایاں ہاتھ شل ہو گیا۔ [4]

رسول اللہ ﷺ نے ایک چٹان پر چڑھنا چاہا مگر نہ چڑھ سکے، پھر حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نیچے بیٹھے تو آپ ﷺ ان پر اپنے قدم مبارک رکھ کر چٹان پر چڑھ گئے۔ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ فرما رہے تھے: «أَوْجَبَ طَلْحَةُ» ”طلحہ نے جنت واجب کر لی۔“ [5]

اس دن حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے بھی رسول اللہ ﷺ کے سامنے جرأت و بہادری کے جوہر دکھائے، آپ ﷺ انھیں تیر پکڑاتے اور فرماتے: «اِرْمِ يَا سَعْدُ! فِدَاكَ أَبِي وَ أُمِّي» ”اے سعد! تیر پھینکو تم پر میرے ماں باپ قربان!“ [6]

---

1 آل عمران 155:3. 2 صحيح مسلم، حديث: 1789. 3 نضرة النعيم: 304/1. 4 صحيح البخاري، حديث:4060-4064. 5 مسند أحمد: 137/1، و جامع الترمذي، حديث: 1692.
6 صحيح البخاري، حديث:4055.

اسی طرح اس دن رسول اللہ ﷺ کے دفاع میں ماہر تیرانداز حضرت ابوطلحہ انصاری رضی اللہ عنہ نے بھی خوب جوہر دکھائے۔ آپ ﷺ ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کے متعلق فرمارہے تھے: «لَصَوْتُ أَبِي طَلْحَةَ فِي الْجَيْشِ أَشَدُّ عَلَى الْمُشْرِكِينَ مِنْ فِئَةٍ» ”لشکر میں (اکیلے) ابوطلحہ کی آواز مشرکین پر ایک بڑی جماعت سے بھی زیادہ گراں ہے۔“[1]

حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ اپنی ڈھال لے کر رسول اللہ ﷺ کے سامنے سپر بن گئے۔ آپ بڑے مایہ ناز تیرانداز تھے۔ بہت کھینچ کر تیر چلاتے تھے، چنانچہ اس دن آپ نے دو یا تین کمانیں توڑ ڈالیں۔ آپ ﷺ کے پاس سے کوئی بھی آدمی ترکش لیے گزرتا تو آپ ﷺ اس سے فرماتے: «اُنْثُرْهَا لِأَبِي طَلْحَةَ» ”اپنے تیر ابوطلحہ کے لیے بکھیر دو۔“ پھر آپ ﷺ لوگوں کی طرف سر اٹھا کر دیکھتے تو ابوطلحہ رضی اللہ عنہ عرض کرتے: ”اے اللہ کے نبی! میرے ماں باپ آپ پر قربان! آپ سر اٹھا کر نہ جھانکیں، کہیں دشمن کا کوئی تیر آپ کو نہ لگ جائے۔ میرا سینہ آپ کے سینۂ مبارک کا دفاع کر رہا ہے۔“[2]

حضرت نُسیبہ بنت کعب مازنیہ رضی اللہ عنہا بھی آپ ﷺ کے دفاع میں تلوار اور تیر چلاتی ہیں حتی کہ ان کے جسم پر کئی ایک نمایاں زخم بھی آگئے۔

حضرت ابودجانہ رضی اللہ عنہ نے تو اپنے جسم کو آپ ﷺ کے سامنے ڈھال بنا لیا۔ اس کے باعث ان کی کمر تیروں سے چھلنی ہوگئی۔[3]

پھر ان نازک ترین لمحات میں رسول اللہ ﷺ کے گرد جاں نثار پہنچنے لگے، چنانچہ ابوبکر اور ابوعبیدہ رضی اللہ عنہما آگئے۔ ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کے چہرۂ انور سے اپنے دانتوں کے ساتھ خود کی دو کڑیاں نکالیں۔ پھر آہستہ آہستہ تیس جاں نثار آپ ﷺ کے دفاع کے لیے جمع ہوگئے۔ جن میں حضرت قتادہ، ثابت بن دحداح، سہل بن حنیف، عمر بن خطاب،

[1] مسند أحمد:203/3، و مسند عبد بن حميد، حديث:1384. [2] صحيح البخاري، حديث: 4064. [3] البداية والنهاية:36,35/4، والسيرة النبوية لابن هشام:87/3.

عبدالرحمٰن بن عوف اور زبیر بن عوام رضی اللہ عنہم اور دیگر صحابۂ کرام شامل تھے۔

اب خالد بن ولید کی قیادت میں مشرکین کا ایک دستہ پہاڑ پر چڑھ آیا جسے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے نیچے دھکیلا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ دیگر صحابہ نے اس تازہ حملے کو پسپا کرنے کے لیے جان کی بازی لگادی اور حالات ایک دفعہ پھر قابو میں آگئے۔[1]

مشرکین حتمی فتح سے مایوس ہوکر اعصاب شکن طویل جنگ اور مسلمانوں کی جان فروش بہادری کی بنا پر پیچھے ہٹنے لگے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ساتھیوں کے ہمراہ احد کی ایک گھاٹی کی طرف چلے گئے۔ تمام مسلمان مشرکین کو واپس لوٹانے کے باوجود اپنے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے احوال کی بنا پر انتہائی دکھ، غم اور پریشانی کے عالم میں تھے۔[2]

اونگھ کا طاری ہونا

چنانچہ اسی حالت میں اللہ تعالیٰ نے تھوڑی دیر کے لیے مجاہدین پر اونگھ طاری کر دی جس کے بعد وہ اطمینان بخش حالت میں بیدار ہوئے۔ ارشاد باری ہے:

﴿ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَةً نُّعَاسًا يَّغْشٰى طَآئِفَةً مِّنْكُمْ ۙ وَطَآئِفَةٌ قَدْ اَهَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ يَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ ۭ يَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ ۭ قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ ۭ يُخْفُوْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ مَّا لَا يُبْدُوْنَ لَكَ ۭ يَقُوْلُوْنَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا ۭ قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِيْ بُيُوْتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ ۚ وَلِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ وَلِيُمَحِّصَ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ﴾

”پھر اس نے غم کے بعد تم پر سکون نازل کیا جو ایک اونگھ تھی۔ وہ تمھارے ایک گروہ پر چھا رہی تھی۔ اور دوسرا گروہ جس کے نزدیک ساری اہمیت اپنی ذات ہی

[1] السيرة النبوية للدكتور الغضبان، ص: 468-470. [2] نضرة النعيم:1/305.

کی تھی، وہ اللہ کے بارے میں ناحق جاہلانہ طور پر گمان کرنے لگا۔ وہ کہتے تھے: کیا اس معاملے میں ہمارا بھی کوئی اختیار ہے؟ کہہ دیجیے: سب اختیار اللہ ہی کا ہے۔ وہ اپنے دلوں میں وہ بات چھپاتے ہیں جو آپ (ﷺ) کے سامنے ظاہر نہیں کرسکتے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر اس معاملے میں ہمارا بھی کچھ اختیار ہوتا تو ہم یہاں نہ مارے جاتے۔ کہہ دیجیے: اگر تم اپنے گھروں میں ہوتے تو بھی جن کی قسمت میں قتل ہونا لکھا تھا وہ اپنی قتل گاہوں کی طرف ضرور نکل آتے اور یہ اس لیے ہوا کہ جو کچھ تمھارے سینوں میں ہے اللہ اسے آزمائے اور تاکہ تمھارے دلوں میں سے وسوسے صاف کردے اور اللہ سینوں کے بھید خوب جانتا ہے۔"[1]

تمام مفسرین کے بقول ﴿ وَطَآئِفَةٌ قَدْ اَهَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ ﴾ سے مراد منافقین ہیں۔[2]

ادھر قریش اب حتمی فتح سے مایوس اور طویل جنگ سے اکتا چکے تھے۔ اور وہ اس وقت تو بالکل ہی ناامید ہو چکے تھے جب مسلمان اونگھ سے اطمینان پانے کے بعد آپ ﷺ کے اردگرد اکٹھے ہو رہے تھے، لہٰذا اب انھوں نے مسلمانوں کا پیچھا کرنے اور مجتمع قوت میں رخنہ ڈالنے کے بجائے واپسی کی راہ لی۔

شہدائے احد

سید الشہداء حضرت حمزہ بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ: اللہ کے شیر سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ نے دشمن کو خاک و خون میں تڑپایا اور خون کی ندیاں بہادیں اور مشرکین کے علم بردار قبیلے عبد الدار کے یکے بعد دیگرے کئی آدمی قتل کیے۔ سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ اسی طرح جرأت و بہادری کی تاریخ رقم کررہے تھے، جبکہ وحشی آپ کی گھات لگائے بیٹھا تھا۔ جونہی حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ اس کے نشانے پر آگئے تو اس نے نیزہ پھینکا جس سے آپ شہید ہوگئے۔

[1] آل عمرٰن 3:154۔ [2] نضرة النعيم 1/305۔

ہم وحشی کی زبانی سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ کی شہادت کا واقعہ نقل کرتے ہیں۔ اس کا بیان ہے کہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے طعیمہ بن عدی بن خیار کو بدر میں قتل کیا تھا تو مجھ سے میرے مالک جبیر بن مطعم نے کہا: ''اگر تم میرے چچا کے بدلے میں حمزہ (رضی اللہ عنہ) کو قتل کردو تو تم آزاد ہو۔'' چنانچہ جب لوگ جنگ احد کے لیے نکلے میں بھی لوگوں کے ساتھ نکلا۔ لوگوں نے جب لڑائی کے لیے صف بندی کر لی تو سباع نے مبارزت کی دعوت دی۔ تو حمزہ رضی اللہ عنہ اس کے مقابلے کے لیے نکلے اور اسے پکار کر اس کی ماں کے پیشے کی عار دلائی اور کہا: ''اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے مخالفت مول لیتے ہو؟'' پھر اس پر ٹوٹ پڑے۔ وہ ایسے ہو گیا جیسے گزرا ہوا کل ہو۔ اور میں ایک چٹان کے نیچے حمزہ رضی اللہ عنہ کے قتل کے ارادے سے چھپ گیا۔ جب وہ میرے نزدیک آ گئے تو میں نے اپنا نیزہ ان پر پھینکا وہ ان کی ناف کے نیچے لگا اور دونوں سرینوں کے درمیان سے پار ہو گیا اور اسی حالت میں وہ شہادت سے سرفراز ہو گئے۔ بعد ازاں لوگ واپس ہوئے تو میں بھی ان کے ساتھ واپس مکہ آ گیا۔ میں مکہ ہی میں رہا، پھر جب مکہ میں اسلام پھیل گیا تو میں طائف کی طرف نکل گیا۔

اہل مکہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کئی پیغام رساں بھیجے۔ مجھے بھی مشورہ ملا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایلچیوں کی گرفت نہیں کرتے۔ تو میں بھی لوگوں کے ساتھ چلا آیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے دیکھ کر فرمایا: «أَنْتَ وَحْشِيٌّ ؟!!» ''کیا تو وحشی ہے؟'' میں نے عرض کیا: ''میں ہی ہوں۔'' فرمایا: «أَنْتَ قَتَلْتَ حَمْزَةَ؟» ''حمزہ کو تو نے شہید کیا تھا؟'' میں نے عرض کیا: ''آپ کو جو بات پہنچی ہے ایسے ہی ہوا۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «فَهَلْ تَسْتَطِيعُ أَنْ تُغَيِّبَ وَجْهَكَ عَنِّي» ''کیا تو میرے سامنے سے جا سکتا ہے؟'' تو میں وہاں سے چلا گیا۔ جس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فوت ہو گئے تو مسیلمہ کذاب نے شورش بپا کی۔ میں نے سوچا کہ میں ضرور اس کی طرف جاؤں گا، ممکن ہے اس طرح میں حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو شہید کرنے کا بدلہ چکا سکوں، لہٰذا میں بھی لوگوں کے ساتھ چلا، پھر یہ ہوا کہ میں نے خاکستری

رنگ کے اونٹ کی طرح قد آور اور پراگندہ بالوں والے ایک شخص کو دیوار کی ٹوٹی ہوئی جگہ میں کھڑا دیکھا، تو میں نے اسے اپنا نیزہ مارا۔ وہ اس کے سینے پر لگا اور کندھوں کے درمیان سے آر پار ہوگیا۔ ساتھ ہی ایک انصاری صحابی اس پر جھپٹے اور اس کے سر پر تلوار ماردی۔ عبداللہ بن فضل کہتے ہیں: ''مجھے سلیمان بن یسار نے بتایا کہ انھوں نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو کہتے سنا کہ اسی وقت کسی گھر کی چھت سے ایک بچی پکار رہی تھی: ''ہائے امیرالمؤمنین (مسیلمہ کذاب)! ایک کالے غلام نے انھیں مار ڈالا۔''[1]

❁ **رسول اللہ ﷺ کی حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی جائے شہادت پر تشریف آوری:** جب جنگ احد ختم ہوگئی تو آپ ﷺ نے ساتھیوں سے پوچھا: «مَنْ رَّأَى مَقْتَلَ حَمْزَةَ؟» ''حمزہ کی جائے شہادت کس نے دیکھی ہے؟'' ایک آدمی نے عرض کیا: ''میں نے وہ مقام دیکھا ہے۔'' فرمایا: «فَانْطَلِقْ أَرِنَاهُ» ''تو چلو ہمیں دکھاؤ۔'' آپ ﷺ چل دیے اور کچھ دیر بعد سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ کی لاش کے پاس جا پہنچے۔ دیکھا کہ ان کا پیٹ پھاڑ دیا گیا ہے اور مثلہ بھی کیا گیا ہے۔ اس آدمی نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! ان کا مثلہ کیا گیا ہے۔''[2]

ایک روایت میں ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کو سیدالشہداء حمزہ رضی اللہ عنہ کی شہادت کی اطلاع ملی تو آپ کے آنسو رواں ہوگئے اور جب انھیں دیکھا تو ہچکی بندھ گئی۔ آپ ﷺ شہداء کے درمیان کھڑے ہوئے اور فرمایا:

«أَنَا شَهِيدٌ عَلٰى هٰؤُلَاءِ، كَفِّنُوهُمْ فِي دِمَائِهِمْ فَإِنَّهُ لَيْسَ جُرْحٌ يُجْرَحُ فِي اللّٰهِ إِلَّا جَاءَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يَدْمٰى، لَوْنُهُ لَوْنُ الدَّمِ، وَرِيحُهُ رِيحُ الْمِسْكِ، قَدِّمُوا أَكْثَرَهُمْ قُرْآنًا، فَاجْعَلُوهُ فِي اللَّحْدِ»

---

1 صحيح البخاري، حديث: 4072، و دلائل النبوة للبيهقي: 3/241-243، و تاريخ الطبري: 2/516,517. 2 المعجم الكبير للطبراني: 19/82، و مجمع الزوائد: 6/119.

''میں ان پر گواہ ہوں۔ انھیں ان کے خون ہی میں کفن دے دو کیونکہ جو بھی زخم اللہ کے راستے میں آتا ہے قیامت کے دن وہ ایسی حالت میں ہوگا کہ خون بہہ رہا ہوگا۔ اس کا رنگ تو خون کا سا ہوگا مگر خوشبو کستوری کی طرح ہوگی۔ جسے قرآن زیادہ یاد تھا اسے لحد میں آگے کرو۔''[1]

حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی شہادت سے وہ خواب شرمندۂ تعبیر ہوا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے احد کی جانب آنے سے قبل اپنے ساتھیوں کو یوں سنایا تھا: «رَأَيْتُ فِي سَيْفِي ذِي الْفَقَارِ فَلًّا، فَأَوَّلْتُهُ فَلًّا يَكُونُ فِيكُم (أَيْ: اِنْهِزَامًا)، وَرَأَيْتُ أَنِّي مُرْدِفٌ كَبْشًا، فَأَوَّلْتُهُ كَبْشَ الْكَتِيبَةِ، وَرَأَيْتُ أَنِّي فِي دِرْعٍ حَصِينَةٍ، فَأَوَّلْتُهَا الْمَدِينَةَ، وَرَأَيْتُ بَقَرًا تُذْبَحُ، فَبَقَرٌ وَّاللّٰهُ خَيْرٌ! فَبَقَرٌ وَّاللّٰهُ خَيْرٌ!» ''میں نے خواب میں اپنی تلوار ذوالفقار پر کچھ شکستگی دیکھی تھی جس کی تعبیر میں نے نکالی تھی کہ تم میں کچھ شکست واقع ہوگی۔ اور میں نے دیکھا کہ میں نے اپنے پیچھے مینڈھا سوار کر رکھا ہے۔ جس کی تعبیر میں نے لشکر کے سردار سے کی ہے۔ میں نے خواب میں دیکھا کہ میں محفوظ زرہ میں ہوں۔ اس کی تعبیر میں نے مدینہ سے کی ہے۔ اور میں نے دیکھا بہت سی گائیں ذبح کی جارہی ہیں۔ پس گائیں، اور اللہ خیر (اللہ کا کرنا بہتر ہے۔) پس گائیں، اور اللہ خیر (اللہ کا کرنا بہتر ہے)۔'' تو جیسے جیسے آپ نے کہا تھا ویسے ہی ہوگیا۔[2]

❁ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کا اپنے بھائی سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ کی المناک شہادت پر صبر:

حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ احد کے دن ایک عورت بھاگتی ہوئی آئی قریب تھا کہ وہ شہداء و مقتولین تک پہنچ جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہیں چاہتے تھے کہ وہ شہداء کی حالت دیکھے، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آواز دی: «اَلْمَرْأَةَ ...... اَلْمَرْأَةَ» ''عورت کو روکو!

[1] صحيح البخاري، حديث: 4079، وسنن أبي داود، حديث: 3138، وجامع الترمذي، حديث: 1036. [2] جامع الترمذي، حديث: 1561، ومسند أحمد: 271/1، والسيرة النبوية لابن هشام: 67,66/3. اور دیکھیے: صحيح البخاري، حديث: 7035.

عورت کو روکو!'' حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ''میں نے پہچان لیا کہ وہ صفیہ رضی اللہ عنہا ہیں، چنانچہ میں بھاگتا ہوا ان کی جانب گیا اور ان کے مقتولین تک پہنچنے سے قبل انھیں جالیا۔ انھوں نے میرے سینے کو زور دار دھکا دیا۔ وہ مضبوط عورت تھیں اور ساتھ ہی کہنے لگیں: ''پرے ہٹ جاؤ۔ تمھارے لیے کوئی جگہ نہ رہے۔'' میں نے کہا: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو آگے جانے سے قطعاً منع کیا ہے۔'' یہ سن کر وہ اسی جگہ ٹھہر گئیں۔ اور اپنے پاس موجود دو کپڑے نکال کر کہنے لگیں: ''مجھے میرے بھائی کی شہادت کی خبر ملی تھی، چنانچہ میں یہ دونوں کپڑے ان کے کفن کے لیے لائی ہوں۔ انھیں ان میں کفن دے دینا۔'' ہم نے وہ دونوں کپڑے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو کفن دینے کے لیے لے لیے۔ ہم نے دیکھا تو حمزہ رضی اللہ عنہ کے پہلو میں ایک انصاری شہید موجود تھے اور ان کے ساتھ بھی حمزہ رضی اللہ عنہ جیسا سلوک کیا گیا تھا۔ ہمیں اچھا نہ لگا کہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو تو دو کپڑوں میں کفن دیا جائے اور انصاری کے لیے کفن ہی نہ ہو۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ ایک کپڑا حمزہ رضی اللہ عنہ اور دوسرا انصاری کے لیے ہوگا۔ کپڑا دیکھا تو ایک چھوٹا اور ایک بڑا تھا، چنانچہ اس میں قرعہ ڈالا گیا اور جس کا قرعہ نکلا اسے اس میں کفن دے دیا گیا۔[*]

❁ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے غم میں حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کے اشعار: حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں:

''میری بہنو! کیا تم اصحابِ احد کے بارے میں ڈرتی ڈرتی پوچھ رہی ہو، خواہ ان میں سے کوئی حالات سے واقف ہو یا ناواقف؟

پس واقف شخص نے تو بتا دیا ہے کہ حمزہ رضی اللہ عنہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وزیر اور بہترین وزیر تھے، شہید ہوگئے ہیں۔

---

* مسند أحمد: 165/1، ومسند البزار، حديث: 1797، ومسند أبي يعلى، حديث: 686، والسنن الكبرى للبيهقي: 290/3، ومجمع الزوائد: 118/6، وصحيح السيرة النبوية لإبراهيم العلي، ص: 285، و السيرة النبوية لابن هشام: 103/3.

انھیں عرش عظیم والے معبود حقیقی نے جنت کی طرف بلالیا ہے، وہاں وہ زندہ ہیں
اور سرور کی زندگی بسر کررہے ہیں۔
یہ تو وہ چیز ہے جس کی ہم سب آرزو کرتے اور دوسروں کو بھی اسی کی خواہش
کرنے کا کہتے ہیں۔ حشر کے دن حمزہ رضی اللہ عنہ کے لیے بہترین واپسی کی جگہ ہوگی۔
پس اللہ کی قسم! جب تلک بادِ صبا چلتی رہے گی میں آپ کو نہ بھولوں گی بلکہ سفرو
حضر میں غمزدہ رہ کر ہمیشہ روتی رہوں گی۔
اللہ تعالیٰ کے اس شیر پر جو قوم کا حامی تھا اور ہر کافر سے اسلام کی مدافعت کرنے
والا تھا۔
اے کاش! اس وقت میرے جسم کے ٹکڑے اور ہڈیاں بھی ان بجوؤں اور کرگسوں
کی خوراک بن جاتے جو انسانی گوشت کھانے کے عادی ہیں۔
جس وقت موت کی خبر دینے والے نے میرے خاندان میں یہ خبر پہنچائی تو میں
پکار اٹھی: ''میرے مددگار بھائی! تجھے اللہ تعالیٰ بہتر جزا دے۔''

❁ حمزہ رضی اللہ عنہ پر کوئی آنسو بہانے والی نہیں! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم احد سے واپس تشریف لائے اور انصار کی عورتوں کو روتے ہوئے دیکھا تو فرمانے لگے: «لٰكِنْ حَمْزَةُ لَا بَوَاكِيَ لَهُ» ''لیکن حمزہ پر تو کوئی آنسو بہانے والی نہیں؟'' یہ بات انصار کی عورتوں کو پہنچی تو وہ حمزہ رضی اللہ عنہ پر رونے لگیں۔ آپ سو کر اٹھے تو بھی وہ رو رہی تھیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «يَا وَيْحَهُنَّ! أَنْتُنَّ هٰهُنَا تَبْكِينَ حَتَّى الْآنَ، مُرُوهُنَّ فَلْيَرْجِعْنَ وَلَا يَبْكِينَ عَلٰى هَالِكٍ بَعْدَ الْيَوْمِ» ''افسوس! تم اس وقت سے اب تک رو رہی ہو؟ (اپنے گھر والوں سے) انھیں کہو کہ یہ واپس چلی جائیں اور آج کے بعد کسی مرنے والے پر نہ روئیں۔''[1]

[1] مسند أحمد: 40/2، و سنن ابن ماجه، حديث: 1591، و المعجم الكبير للطبراني: 238/3، حديث: 2875، و مسند أبي يعلىٰ، حديث: 3576، ومجمع الزوائد: 120/6. علامہ البانی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو حسن کہا ہے دیکھیے: صحیح سنن ابن ماجه، حديث: 1303، 42/2.

اس کے ساتھ ہی میت پر نوحہ حرام کر دیا گیا۔ اور کچھ مدت بعد اس کی حرمت وحی کے ذریعے سے اور زیادہ پختہ کردی گئی۔ اور اسے کبائر میں شامل کر دیا گیا۔ اس طرح جاہلیت کے رسوم ورواج ایک ایک کر کے جڑ سے اکھیڑ دیے اور ان کی جگہ اسلامی تعلیمات بو دی گئیں۔[1]

نوحہ کی ممانعت پر نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: «اَلنِّيَاحَةُ عَلَى الْمَيِّتِ مِنْ أَمْرِ الْجَاهِلِيَّةِ، وَإِنَّ النَّائِحَةَ إِذَا لَمْ تَتُبْ قَبْلَ أَنْ تَمُوتَ، فَإِنَّهَا تُبْعَثُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَلَيْهَا سَرَابِيلُ مِنْ قَطِرَانٍ، ثُمَّ يُعْلَى عَلَيْهَا بِدُرُوعٍ مِّنْ لَّهَبِ النَّارِ» ''نوحہ امورِ جاہلیت سے ہے۔ نوحہ کرنے والی عورت اگر توبہ کیے بغیر فوت ہوگئی تو قیامت کے روز ایسی حالت میں اٹھائی جائے گی کہ اس پر تارکول کا ازار بند ہوگا پھر اس پر آگ کے شعلے قمیص کی صورت میں بھڑکیں گے۔''[2]

دوسری حدیث میں ارشاد ہے: «اِثْنَتَانِ فِي النَّاسِ هُمَا بِهِمْ كُفْرٌ: اَلطَّعْنُ فِي النَّسَبِ، وَالنِّيَاحَةُ عَلَى الْمَيِّتِ» ''مسلمانوں میں دو کفریہ خصلتیں ہوں گی: نسب میں عیب جوئی اور میت پر نوحہ کرنا۔''[3]

الغرض نوحہ کرنے والیوں کو روک دیا گیا مگر آنسوؤں کی اجازت ہے۔

❁ **انصار کے نومولود کا نام حمزہ رکھنا:** حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ہم انصاریوں میں سے ایک شخص کے ہاں بیٹا پیدا ہوا تو انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے مشورہ طلب کیا کہ ہم اس کا نام کیا رکھیں؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «سَمُّوهُ بِأَحَبِّ الْأَسْمَاءِ إِلَيَّ حَمْزَةَ بْنِ عَبْدِالْمُطَّلِبِ» ''مجھے سب سے پیارا نام حمزہ لگتا ہے یہی رکھ دو۔''[4]

گویا کہ حمزہ رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے دل و دماغ میں جاگزیں تھے۔

بعدازاں اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی اپنے نبی ﷺ سے اپنے ہاں پسندیدہ نام بیان

---

1 السيرة النبوية لمحمد الصوياني: 90/3. 2 سنن ابن ماجه، حديث: 1582، وصحيح الجامع الصغير للألباني: 1151/2. 3 صحيح مسلم، حديث: 67. 4 المستدرك للحاكم: 196/3.

کر دیے، چنانچہ آپ ﷺ نے صحابہ سے فرمایا: «إِنَّ أَحَبَّ الْأَسْمَاءِ إِلَى اللّٰهِ عَبْدُاللّٰهِ وَعَبْدُ الرَّحْمٰنِ» ”تمھارے ناموں میں سے اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ پسندیدہ نام عبداللہ اور عبدالرحمٰن ہیں۔“ [1]

❁ کیا ایسا ممکن ہے کہ تم میرے سامنے نہ آؤ؟ رسول اللہ ﷺ نے وحشی رضی اللہ عنہ سے جو یہ فرمایا تھا: «فَهَلْ تَسْتَطِيعُ أَنْ تُغَيِّبَ وَجْهَكَ عَنِّي؟» ”کیا ہوسکتا ہے کہ تم میرے سامنے نہ آؤ؟“ [2]

اس مشفقانہ اسلوبِ کلام میں وحشی کا نہ مؤاخذہ ہے نہ اسے گناہگار ٹھہرانا مقصود ہے بلکہ صرف یہ بات ہے کہ وحشی رضی اللہ عنہ کے سامنے آنے کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ کے زخم تازہ ہو جائیں گے جس سے رسول اللہ ﷺ کے دل میں اپنے چچا سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ کے واقعۂ شہادت کا منظر اور نامناسب انداز سے انھیں مثلہ کرنے کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ [3]
لہٰذا آپ ﷺ نے وحشی رضی اللہ عنہ کو چلے جانے کا مشورہ دیا تاکہ اس المناک واقعے کی یاد ہی محو ہو جائے۔ [4]

ایک روایت میں ہے: وحشی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر ہوا۔ آپ ﷺ نے دریافت فرمایا: ”تم وحشی ہو؟“ میں نے عرض کیا: ”جی ہاں۔“ فرمایا: ”تم نے حمزہ رضی اللہ عنہ کو شہید کیا تھا۔“ عرض کیا: ”جی ہاں! اللہ کا شکر ہے کہ اس نے میرے ہاتھ سے انھیں عزت بخشی اور مجھے ان کے ہاتھوں ذلیل ہونے (حالتِ کفر میں مرنے) سے بچایا۔“ قریش کے لوگوں نے کہا: ”اس نے حمزہ رضی اللہ عنہ کو شہید کیا تھا اس کے باوجود بھی آپ اس سے محبت رکھتے ہیں؟“ میں نے عرض کیا: ”اے اللہ کے رسول! میرے لیے بخشش کی دعا فرما دیجیے۔“

---

1 صحيح مسلم، حديث: 2132، و سنن أبي داود، حديث: 4949، و جامع الترمذي، حديث: 2833، و سنن ابن ماجه، حديث: 3728. 2 صحيح البخاري، حديث: 4072. 3 محمد رسول اللّٰه ﷺ لصادق عرجون: 603/3. 4 التاريخ الإسلامي للحميدي: 141/5.

آپ ﷺ نے تین بار زمین پر تھوکا اور تین بار میرے سینے کو دھکیلا اور فرمایا: «يَا وَحْشِيُّ، أُخْرُجْ فَقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ، كَمَا قَاتَلْتَ لِتَصُدَّ عَنْ سَبِيلِ اللّٰهِ» ''وحشی! جاؤ اللہ کی راہ میں ایسے ہی لڑو جس طرح اللہ کے راستے سے روکنے کے لیے لڑے تھے۔''[1]

آپ ﷺ نے اس طرح گزشتہ گناہ کی تلافی کا رستہ دکھایا ہے کہ جب حالتِ کفر میں اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت مول لے کر کفر کیا ہے تو جہاد فی سبیل اللہ ہی گزشتہ گناہوں کا بہترین مداوا ہے۔ آپ ﷺ نے اسے جہاد کا پرچم بلند کرنے پر ابھارا۔ شاید وحشی رضی اللہ عنہ کا یمامہ جا کر مسیلمہ کذاب کو قتل کرنا آپ ﷺ کے اس مشورے کا نتیجہ تھا جس میں آپ ﷺ نے اسے گناہ دھوڈالنے والے، غلطیوں کو کھرچ دینے والے اور آلائشوں سے پاک صاف کرنے والے کام کی طرف اشارہ فرمایا تھا۔

بذاتِ خود وحشی رضی اللہ عنہ کو بھی اس کا مکمل ادراک تھا، چنانچہ مسیلمہ کذاب کو قتل کرنے کے بعد انھوں نے یہ تاریخی الفاظ کہے: ''میں نے اسلام لانے سے پہلے بہترین انسان، یعنی سید الشہداء حمزہ بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ کو شہید کیا تھا اور اب (اسلام لانے کے بعد) بدترین انسان مسیلمہ کذاب کو بھی واصل جہنم کیا ہے۔''[2]

مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کی شہادت: حضرت خباب رضی اللہ عنہ کا بیان ہے: ''ہم نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ رضائے الٰہی کے لیے ہجرت کی، یقیناً اللہ تعالیٰ ہمیں اجر سے نوازے گا۔ اب ہم میں سے کچھ لوگ تو دنیا سے رخصت ہوگئے۔ انھوں نے (دنیا میں) اپنی محنت کا کچھ بھی صلہ نہیں پایا۔ انھی میں سے مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ تھے۔ وہ جنگ احد میں شہید ہوئے اور

---

1 المعجم الكبير للطبراني: 139/22، ومجمع الزوائد: 127/6، علامہ البانی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو منکر کہا ہے۔ دیکھیے: سلسلة الأحاديث الضعيفة: 870/12، حديث: 5938. 2 محمد رسول اللّٰه ﷺ لصادق عرجون: 602/3. اور دیکھیے: صحيح البخاري، حديث: 4072. یہاں وحشی رضی اللہ عنہ کے یہ الفاظ بھی ہیں: «لَأَخْرُجَنَّ إِلَى مُسَيْلِمَةَ لَعَلِّي أَقْتُلُهُ فَأُكَافِئَ بِهِ حَمْزَةَ» ''میں مسیلمہ کذاب کی طرف ضرور جاؤں گا۔ شاید میں اسے قتل کردوں اور اس طرح سید الشہداء حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی شہادت کا بدلہ اتار سکوں۔''

صرف ایک دھاری دار چادر چھوڑ گئے۔ جب ہم (کفن کے لیے) ان کا سر ڈھانپتے تو پاؤں نظر آنے لگتے، پاؤں ڈھانپتے تو سر دکھائی دینے لگتا۔ تب آپ ﷺ نے فرمایا:

«غَطُّوا رَأْسَهُ، وَاجْعَلُوا عَلٰى رِجْلَيْهِ الْإِذْخِرَ»

''ان کا سر ڈھانپ دو اور پاؤں پر اذخر گھاس رکھ دو۔''

اور ہم میں سے کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جن (کی محنت) کا پھل پک چکا ہے اور وہ اسے چُن چُن کر کھا رہے ہیں۔'' [1]

حضرت عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کی حدیث میں حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کی شہادت کا تذکرہ اس طرح آیا ہے کہ عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ روزے سے تھے۔ (افطار کے لیے) ان کا کھانا لایا گیا تو کہنے لگے: ''مصعب بن عمیر مجھ سے بہت بہتر تھے وہ شہید ہوگئے۔ ان کے لیے سوائے ایک دھاری دار چادر کے کفن بھی نہ مل سکا۔ اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ یا کسی اور شخص کا نام لیا کہ وہ شہید ہوئے اور وہ بھی مجھ سے بدرجہا بہتر تھے، ان کے لیے بھی ایک چادر کے سوا کفن میسر نہ آیا۔ مجھے تو ڈر ہے کہ کہیں ہماری بھلائیاں ہمیں دنیا ہی میں جلد نہ دے دی گئی ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ رونے لگے حتی کہ کھانا بھی چھوڑ دیا۔ [2]

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کا تذکرہ یوں مروی ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ احد سے پلٹے تو مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ راستے میں شہید پڑے تھے۔ آپ ﷺ ان کے پاس کھڑے ہوگئے اور ان کے لیے دعا کی، پھر یہ آیت تلاوت فرمائی:

﴿مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ۝﴾

''مومنوں میں سے کچھ وہ لوگ بھی ہیں جنھوں نے اللہ سے جو عہد کیا تھا وہ سچ کر دکھایا، چنانچہ ان میں سے بعض نے اپنا عہد پورا کیا (شہادت پا گئے) اور ان میں

---

1 صحيح البخاري، حديث:3897. 2 صحيح البخاري، حديث:1275,1274.

سے بعض منتظر ہیں اور انھوں نے (عہد میں) کوئی تبدیلی نہیں کی۔"[1]

پھر آپ ﷺ نے فرمایا:

«أَشْهَدُ أَنَّ هٰؤُلَاءِ شُهَدَاءُ عِنْدَاللّٰهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَائْتُوهُمْ وَزُورُوهُمْ، وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ! لَا يُسَلِّمُ عَلَيْهِمْ أَحَدٌ إِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ إِلَّا رَدُّوا عَلَيْهِ»

"میں گواہی دیتا ہوں کہ یہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کے ہاں شہداء ہوں گے۔ ان کے پاس آیا کرو اور ان کی زیارت کیا کرو۔ مجھے اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! قیامت تک جو بھی ان کو سلام کرے گا اس کے سلام کا جواب لوٹائیں گے۔"[2]

حضرت سعد بن ربیع رضی اللہ عنہ کی شہادت اور رسول اللہ ﷺ سے والہانہ عقیدت:

حضرت سعد بن ربیع رضی اللہ عنہ وہ شخص ہیں جنھیں رسول اللہ ﷺ نے قریش کے مکہ سے روانہ ہونے کی خبر کو پوشیدہ رکھنے کا کہا تھا۔ آپ ﷺ کو ان سے بڑی محبت تھی۔ جب جنگِ احد ہو چکی تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«مَنْ رَّجُلٌ يَنْظُرُ مَا فَعَلَ سَعْدُ بْنُ الرَّبِيعِ، أَفِي الْأَحْيَاءِ هُوَ أَمْ فِي الْأَمْوَاتِ؟»

"کون ہے جو سعد بن ربیع کو دیکھے، آیا وہ زندوں میں سے ہیں یا شہداء میں سے؟" آپ ﷺ نے ان پر نیزے پڑتے دیکھے تھے۔ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: "میں ان کی خبر لاتا ہوں۔" آپ ﷺ نے فرمایا: «إِنْ رَّأَيْتَ سَعْدَ بْنَ الرَّبِيعِ، فَاقْرَئْهُ مِنِّي السَّلَامَ وَقُلْ لَّهُ: يَقُولُ لَكَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: كَيْفَ تَجِدُكَ؟» "اگر

[1] الأحزاب 23:33. [2] المستدرك للحاكم: 200/3، ودلائل النبوة للبيهقي: 284/3. علامہ البانی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو ضعیف کہا ہے، دیکھیے: السلسلة الضعيفة: 365/11، حديث: 5221.

تم سعد بن ربیع کو پاؤ تو میری طرف سے انھیں سلام کہنا۔ اور یہ بھی کہنا: ''رسول اللہ ﷺ دریافت فرما رہے ہیں کہ تم اپنے آپ کو کیسا پا رہے ہو؟'' ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے انھیں دیکھا تو ایسی حالت میں پایا کہ زخمی ہیں اور آخری سانسیں لے رہے ہیں۔ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ ان سے کہنے لگے: ''مجھ سے نبی ﷺ نے فرمایا ہے کہ میں دیکھوں کہ آپ زندوں میں سے ہیں یا شہادت سے سرفراز ہونے والوں میں سے۔'' حضرت سعد رضی اللہ عنہ بولے: ''مجھے نیزوں کے بارہ زخم آئے ہیں جو جان لیوا ہیں۔''

ایک صحیح روایت میں ہے کہ انھوں نے جواب دیا: ''رسول اللہ ﷺ پر اور آپ پر سلام ہو۔ میری طرف سے رسول اللہ ﷺ سے عرض کرنا: ''اے اللہ کے رسول! میں جنت کی خوشبو پا رہا ہوں۔'' اور میری قوم انصار سے کہنا: ''اگر تم میں سے کسی ایک میں زندگی کی کوئی رمق باقی رہی اور دشمن رسول اللہ ﷺ تک پہنچ گئے تو تمھارے لیے اللہ تعالیٰ کے ہاں کوئی عذر باقی نہ رہے گا۔''[1]

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ اس کے ساتھ ہی ان کی روح پرواز کر گئی۔[2]

جان کنی کے وقت اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے لیے خیر خواہی کے یہ جذبات قوت ایمانی کا بین ثبوت اور بیعت کی وفاداری پر مر مٹنے کی علامت ہیں۔ اور اس بات کی دلیل ہیں کہ یہ جذبہ زخموں کی تکالیف اور موت سے بھی ماند نہیں پڑا۔

سیدنا عبد اللہ بن جحش رضی اللہ عنہ: حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ جنگ احد کے دن مجھ سے عبد اللہ بن جحش رضی اللہ عنہ نے کہا: ''تم اللہ تعالیٰ سے دعا نہیں کرتے!'' تو وہ ایک طرف ہو گئے اور حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے دعا شروع کر دی: ''اے میرے پروردگار! جب میں دشمن سے ملوں تو میری ملاقات کسی جنگجو اور سورما سے ہو۔ میں اس سے نبرد آزما ہوں اور

1 السيرة النبوية لابن هشام: 100/3. 2 المستدرك للحاكم: 201/3، ودلائل النبوة للبيهقي: 285/3، والسيرة الحلبية: 532/2، وصحيح السيرة النبوية لإبراهيم العلي، ص: 294.

وہ مجھ سے لڑے، پھر مجھے اس پر ایسا غلبہ عنایت فرما کہ میں اسے قتل کر دوں اور اس کا سب مال و متاع میرے قبضے میں آئے۔'' تو عبد اللہ بن جحش رضی اللہ عنہ نے اس دعا پر آمین کہی، پھر عبد اللہ بن جحش رضی اللہ عنہ نے ان الفاظ سے دعا مانگی: ''اے اللہ! میں کسی جنگجو اور دلیر انسان سے ٹکراؤں۔ میں تیری راہ میں اس سے لڑوں وہ مجھ سے لڑے، پھر وہ مجھے قابو کر لے اور میری ناک اور کان کاٹ ڈالے، پھر جب کل قیامت کے دن میں تجھ سے ملوں تو تُو دریافت فرمائے: ''تیرا ناک کان کس نے کاٹا ہے؟'' میں عرض کروں: ''تیرے اور تیرے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی راہ میں کٹا ہے۔'' تب تو فرمائے: ''تو سچ کہتا ہے۔'' یہ قصہ بیان کرتے ہوئے حضرت سعد رضی اللہ عنہ اپنے بیٹے سے کہنے لگے: ''میرے بیٹے! عبد اللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کی دعا میری دعا سے بہتر تھی۔ میں نے اس دن کے آخر میں انھیں دیکھا تو ان کا ناک اور کان (دشمن کی طرف سے) ایک لڑی میں پرو دیے گئے تھے۔ [1]

اس سے معلوم ہوا کہ آدمی اللہ کی راہ میں شہادت کی دعا اور تمنا کر سکتا ہے اور یہ دعا موت کی منع کردہ تمنا کے زمرے میں ہرگز نہیں آتی۔ [2]

غسیل الملائکہ حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ: مشرکین جب مسلمانوں کے آمنے سامنے ہوئے تو حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ نے ابوسفیان کے گھوڑے کو تلوار ماری۔ ابوسفیان زمین پر گرتے ہوئے چیخا چلایا۔ حنظلہ رضی اللہ عنہ اسے ذبح کرنے ہی والے تھے کہ اسی وقت شداد بن اسود پہنچ گیا۔ اسے ابن شعوب بھی کہتے تھے۔ اس نے آتے ہی حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ پر نیزہ مارا اور اسے آر پار کر دیا۔ حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ نیزہ تانے اس پر لپکے۔ تب اس نے دوسرا وار کر دیا جس سے وہ شہید ہو گئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع دی گئی تو فرمایا: «إِنِّي رَأَيْتُ الْمَلَائِكَةَ تُغَسِّلُهُ

---

1 سبل الهدیٰ والرشاد للصالحي: 241/10، وصحيح السيرة النبوية لإبراهيم العلي، ص: 293. 2 زاد المعاد: 212/3.

بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ بِمَاءِ الْمُزْنِ فِي صِحَافِ الْفِضَّةِ» ''میں نے دیکھا کہ فرشتے حنظلہ رضی اللہ عنہ کو چاندی کے برتنوں میں بادلوں کے پانی سے آسمان و زمین کے درمیان غسل دے رہے ہیں۔'' پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «فَاسْئَلُوا أَهْلَهُ مَاشَأْنُهُ؟» ''ان کی بیوی سے پوچھو کہ کیا معاملہ ہے؟'' ان کی بیوی سے دریافت کیا گیا تو انھوں نے بتایا کہ انھوں نے جب جنگ کی پکار سنی تو حالتِ جنابت ہی میں نکل کھڑے ہوئے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «فَلِذٰلِكَ غَسَّلَتْهُ الْمَلَائِكَةُ» ''اس لیے انھیں فرشتوں نے غسل دیا ہے۔''[1]

واقدی کا بیان ہے کہ حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ نے جمیلہ بنت عبد اللہ بن ابی ابن سلول رضی اللہ عنہا سے شادی کی اور اگلے ہی روز جنگ احد تھی۔ انھوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے رات گھر گزارنے کی اجازت طلب کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دے دی۔ صبح کی نماز کے بعد وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب جانے لگے تو بیوی نے پیچھا نہیں چھوڑا اور وہ کچھ دیر کے لیے بیوی کے ساتھ رک گئے اور حقوقِ زوجیت ادا کیے۔ اس حال میں جب جانے لگے تو جمیلہ رضی اللہ عنہا نے اپنے قبیلے کے چار آدمی بلا کر انھیں گواہ بنایا کہ میرے خاوند نے مجھ سے ہم بستری کی ہے۔ بعدازاں ان سے پوچھا گیا: ''یہ گواہ قائم کرنے کا کیا مقصد تھا؟'' جمیلہ نے کہا: ''میں نے (خواب) دیکھا تھا گویا آسمان پھٹا اور حنظلہ اس میں داخل ہوئے تو وہ پھر مل گیا۔ میں سمجھ گئی کہ یہ شہادت ہی ہے، اس لیے میں نے گواہ طلب کیے کہ وہ میرے خاوند بن چکے تھے۔'' یہی ملاپ عبد اللہ بن حنظلہ کا سبب بنا تھا۔ اس کے بعد ان سے حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ نے شادی کر لی جس سے محمد بن ثابت پیدا ہوئے۔[2]

❁ **حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ کی شہادت سے ماخوذ نصیحتیں وعبرتیں:** ① حضرت جمیلہ رضی اللہ عنہا نے خواب دیکھ کر خود ہی تعبیر نکالی کہ حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ شہید ہوں گے۔ ایسی صورتِ حال میں

---

1 المستدرك للحاكم 205,204/3، والسنن الكبرىٰ للبيهقي: 15/4، والمعجم الكبير للطبراني: 12094، ومجمع الزوائد: 23/3. 2 المغازي للواقدي: 273/1.

عورت چاہتی ہے کہ مرد سے دور رہے تا کہ (تعبیر صحیح نکلنے پر یہ بیوہ ہو بھی جائے تو) کسی اور منگیتر کے لیے اس میں کشش باقی رہے لیکن اس کے برعکس یہ اس خواہش سے خاوند کے پاس گئیں کہ ممکن ہے اللہ تعالیٰ انھیں شہید ہونے والے سعادت مند شخص کے بیٹے کی ماں بنادے۔ وہ بیٹا بعدازاں اس شہید باپ کی طرف منسوب ہو جو نیکی میں بلند مراتب تک رسائی پا چکا تھا اور اب اس کے بارے میں شہادت سے سرفراز ہونے کی امید ہے۔ تو ایسا ہی ہوا اور ان کی یہ خواہش پوری ہوئی۔ جمیلہ رضی اللہ عنہا سیدنا حنظلہ رضی اللہ عنہ سے حاملہ ہوئیں اور ان کا بیٹا پیدا ہوا جس کا نام عبد اللہ رکھا گیا۔ اس بچے نے بھی بڑا نام کمایا۔ وہ اپنے لیے فخر یہ طور پر کہا کرتا تھا: «أَنَا ابْنُ غَسِيلِ الْمَلَائِكَةِ» ”میں فرشتوں کے ذریعے غسل دیے جانے والے شہید باپ کا بیٹا ہوں۔“

② حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ اللہ کے دشمنوں سے مقابلہ آرائی کے کتنے متمنی و حریص تھے۔ انھوں نے اتنی جلدی کی کہ غسل جنابت کا موقع بھی نہ مل سکا۔

③ ان کی کمال بہادری کی علامت ہے کہ انھوں نے فرداً مشرکین کے سپہ سالار ابوسفیان بن حرب کو جالیا، حالانکہ سپہ سالار عموماً محافظوں کی حصار میں ہوتا ہے ویسے بھی حنظلہ رضی اللہ عنہ پیدل تھے اور ابوسفیان گھوڑے پر سوار تھا۔

④ اللہ تعالیٰ نے انھیں کمال شرف سے نوازا کہ فرشتے صاف ستھرے پانی کے ساتھ چاندی کے برتنوں میں غسل دے رہے ہیں۔

⑤ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو فرشتوں کے غسل دینے کی خبر دی۔ آپ نے فرشتوں کو غسل دیتے دیکھا، جبکہ صحابہ انھیں نہیں دیکھ رہے تھے۔[1]

⑥ فرشتوں نے حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ کو غسل دیا ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ شہید اگر جنبی ہو تو اسے غسل دینا چاہیے۔[2]

[1] التاريخ الإسلامي للحميدي:130,129/5. [2] زاد المعاد:214/3.

حضرت عبد اللہ بن عمرو بن حرام رضی اللہ عنہ کی شہادت اور ان کا ایک منفرد اعزاز:

حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ نے غزوۂ احد کے لیے جانے پر اصرار کرتے ہوئے اپنے بیٹے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے کہا: ''اے جابر! ہمارے اس معرکے کے نتیجے تک تم مدینہ ہی میں رہنا۔ اللہ کی قسم! اگر یہ بات نہ ہوتی کہ میں پیچھے متعدد بیٹیاں چھوڑے جا رہا ہوں تو میں پسند کرتا کہ تم میرے سامنے (مجھ سے پہلے) شہید کر دیے جاؤ۔''[1]

حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے سے مزید کہا: ''میں دیکھ رہا ہوں کہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں میں سے پہلے پہلے شہید ہونے والوں میں سے ہوں گا۔ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا سب لوگوں سے زیادہ تمھیں اپنا پیارا سمجھتا ہوں۔ مجھ پر کچھ قرض ہے اسے ادا کر دینا اور میں تمھیں تمھاری بہنوں کے متعلق بھلائی کی وصیت کرتا ہوں، اس وصیت کا خیال رکھنا۔''[2]

سیدنا عبد اللہ بن عمرو بن حرام رضی اللہ عنہ مسلمانوں کے ہمراہ چلے اور اللہ کے راستے میں شہادت کے رُتبے پر فائز ہوئے۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ اس طرح قصہ بیان کرتے ہیں: ''جب میرے والد گرامی عبد اللہ رضی اللہ عنہ احد والے دن شہید ہوئے تو میں بار بار ان کے منہ سے کپڑا ہٹاتا اور مسلسل رو رہا تھا۔ اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم مجھے رونے سے منع کر رہے تھے لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع نہیں فرمایا۔ میری پھوپھی بھی ان پر رونے لگیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «تَبْكِينَ أَوْلَا تَبْكِينَ، مَا زَالَتِ الْمَلَائِكَةُ تُظِلُّهُ بِأَجْنِحَتِهَا حَتّٰى رَفَعْتُمُوهُ» ''آپ روئیں یا خاموش رہیں جب تک تم لوگ انھیں اٹھاتے نہیں فرشتے اپنے پروں سے ان پر سایہ فگن رہیں گے۔''[3]

سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھ سے ملے اور فرمانے لگے:

---

[1] مسند أحمد:3/398,397، و مجمع الزوائد: 4/135. [2] صحيح البخاري، حديث:1351.

[3] صحيح البخاري، حديث:1244.

«يَا جَابِرُ! مَالِي أَرَاكَ مُنْكَسِرًا؟» ''جابر! کیا بات ہے، تم مجھے غمگین نظر آ رہے ہو؟'' عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! میرے والد شہید ہوگئے اور انھوں نے پیچھے میری بہنیں اور قرضہ چھوڑا ہے۔''

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «أَلَا أُبَشِّرُكَ بِمَا لَقِيَ اللّٰهُ بِهِ أَبَاكَ؟» ''کیا میں تمھیں خوشخبری نہ دوں کہ اللہ تعالیٰ نے تمھارے باپ سے کیا سلوک کیا ہے؟''

میں نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! ضرور بتائیں!'' آپ ﷺ نے فرمایا:

«مَا كَلَّمَ اللّٰهُ أَحَدًا قَطُّ إِلَّا مِنْ وَّرَاءِ حِجَابٍ وَّكَلَّمَ أَبَاكَ كِفَاحًا، يَّاجَابِرُ! أَمَا عَلِمْتَ أَنَّ اللّٰهَ أَحْيَا أَبَاكَ، فَقَالَ: يَاعَبْدِي! تَمَنَّ عَلَيَّ أُعْطِيكَ، قَالَ: يَارَبِّ! تُحْيِينِي فَأُقْتَلُ فِيكَ ثَانِيَةً، فَقَالَ الرَّبُّ سُبْحَانَهُ: إِنَّهُ سَبَقَ مِنِّي أَنَّهُمْ إِلَيْهَا لَا يُرْجَعُونَ، قَالَ: يَارَبِّ فَأَبْلِغْ مَنْ وَّرَائِي»

''اللہ تعالیٰ نے جس سے بھی کلام فرمایا پردے کے پیچھے سے فرمایا لیکن تمھارے باپ سے آمنے سامنے بات چیت کی ہے۔ جابر! تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے تمھارے والد کو زندہ کیا اور فرمایا: ''اے میرے بندے! مجھ سے مانگ میں تجھے دوں۔'' تمھارے والد نے عرض کیا: ''اللہ عزوجل! مجھے دوبارہ دنیا میں بھیج دے تاکہ میں تیری راہ میں ایک بار پھر شہید کیا جاؤں۔'' تب اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے فرمایا: ''یہ بات تو میں پہلے ہی مقرر کر چکا ہوں کہ کوئی بھی لوٹ کر دوبارہ دنیا میں نہیں جائے گا۔'' تمھارے والد عرض پرداز ہوئے: ''اے میرے رب! میرے بعد والوں کو (شہادت سے لطف اندوز ہونے اور شہید کے درجات کے متعلق) خبر پہنچا دے۔'' چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرما دی:

﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ۚ بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ○﴾

''اور ان لوگوں کو مردہ خیال نہ کرو جو اللہ کے راستے میں مارے گئے ہیں بلکہ وہ زندہ ہیں، انھیں ان کے رب کے ہاں رزق دیا جاتا ہے۔''[1]

جنگ احد سے پہلے حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ نے خواب دیکھا جسے وہ خود بیان کرتے ہیں کہ احد سے پہلے مجھے خواب میں حضرت مبشر بن عبدالمنذر رضی اللہ عنہ ملے جو مجھ سے کہہ رہے تھے: ''تم چند دن کے اندر اندر ہمارے پاس آنے والے ہو۔'' میں نے کہا: ''تم کہاں ہو؟'' وہ بولے: ''ہم جنت میں ہیں۔ اپنی مرضی سے کھاتے پیتے اور آتے جاتے ہیں۔'' میں نے پوچھا: ''تم بدر میں شہید نہیں ہو چکے تھے؟'' وہ کہنے لگے: ''کیوں نہیں، مگر مجھے دوبارہ زندہ کر دیا گیا ہے۔'' حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے یہ خواب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمانے لگے: «هٰذِهِ الشَّهَادَةُ يَا أَبَا جَابِرٍ!» ''ابوجابر! یہ تو شہادت ہے۔''[2]

اور یہ خواب اللہ تعالیٰ کے فضل و احسان سے شرمندۂ تعبیر ہوا۔

ابوسعد حضرت خیثمہ رضی اللہ عنہ کا شوقِ شہادت: ابوسعد خیثمہ رضی اللہ عنہ کا بیٹا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں معرکۂ بدر میں شریک ہو کر شہید ہو چکا تھا، وہ کہتے ہیں کہ میں جنگ بدر میں شریک نہ ہو سکا، حالانکہ مجھے اس کی بڑی خواہش تھی۔ حتی کہ میں نے شرکت کے لیے اپنے بیٹے سے قرعہ اندازی کی تو اس کا قرعہ نکل آیا اور اسے شہادت نصیب ہوئی۔ گزشتہ شب میں نے اپنے بیٹے کو خواب میں بڑی اچھی صورت میں دیکھا۔ وہ جنت کے باغوں اور نہروں سے لطف اندوز ہو رہا تھا اور مجھ سے کہہ رہا تھا: ''ہم سے آملیے! ہمارے جنت کے ساتھی بن جائیے۔ میں نے اللہ تعالیٰ کے کیے ہوئے وعدے کو سچا پایا ہے۔'' یہ کہہ کر حضرت خیثمہ رضی اللہ عنہ عرض کرنے لگے: ''اے اللہ کے رسول! میں جنت میں اس کا ساتھی بننے کے لیے بیتاب ہوں۔ میں عمر رسیدہ ہوں، ہڈیاں کمزور ہو چکی ہیں۔ مجھے اپنے رب سے

---

1 آل عمرٰن 3:169. جامع الترمذي، حديث: 3010، و سنن ابن ماجه، حديث: 190 و 2800.

2 المستدرك للحاكم: 3/204، و دلائل النبوة للبيهقي: 3/249، وزاد المعاد: 3/208.

ملاقات کا شوق پیدا ہو گیا ہے۔ اے اللہ کے رسول! آپ اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائیے کہ وہ مجھے شہادت اور سعد کا ساتھ نصیب فرمائے۔" رسول اللہ ﷺ نے ان کے لیے ان کی چاہت کے مطابق دعا مانگی، آپ ﷺ کی دعا قبول ہوئی اور وہ احد میں شہید ہو گئے۔[1]

سیدنا وہب مزنی رضی اللہ عنہ اور ان کے بھتیجے حارث بن عقبہ رضی اللہ عنہ کی مایہ ناز شہادت:

وہب بن قابوس مزنی اور ان کے بھتیجے حارث بن عقبہ بن قابوس رضی اللہ عنہما مزینہ کے پہاڑوں سے اپنی بکریاں لے کر مدینہ پہنچے تو دیکھا کہ مدینہ منورہ سُونا سُونا ہے۔ دونوں نے دریافت کیا: "یہاں کے باشندے کہاں ہیں؟" جواب ملا کہ رسول اللہ ﷺ مشرکین مکہ سے جنگ کے لیے جبلِ احد کے پاس گئے ہیں۔ دونوں نے طے کیا کہ اب مزید تحقیق کی ضرورت نہیں۔ دونوں آپ ﷺ کی خدمت میں اس وقت پہنچے جب لڑائی جاری تھی اور مسلمانوں کا پلہ بھاری تھا۔ دونوں جنگ اور غنیمت جمع کرنے میں لگ گئے۔ اتنے میں خالد بن ولید اور عکرمہ بن ابی جہل گھڑسواروں کے ہمراہ پیچھے سے آ گئے۔ ان سے مڈبھیڑ ہوئی تو ان دونوں نے خوب جوہر دکھائے۔ مشرکین کا ایک گروہ (لڑنے کے لیے) سامنے ہوا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: «مَنْ لِّهٰذِهِ الْفِرْقَةِ؟» "مشرکین کے اس گروہ کو کون سنبھالے گا؟" وہب بن قابوس رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: "اے اللہ کے رسول! میں۔" پھر انھوں نے تیراندازی کرتے ہوئے مشرکوں کو بھگا دیا اور خود واپس آ گئے۔ اب مشرکین کا دوسرا گروہ لڑنے کے لیے آیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: «مَنْ لِّهٰذِهِ الْكَتِيبَةِ؟» "اس گروہ سے کون نمٹے گا؟" سیدنا مزنی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: "اے اللہ کے رسول! میں۔" پھر انھوں نے شمشیرزنی کرتے ہوئے مشرکین کو پسپائی پر مجبور کر دیا اور خود واپس آ گئے۔ اب تیسرا گروہ سامنے آیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: «مَنْ يَّقُومُ لِهٰؤُلَاءِ؟» "انھیں کون بھگائے گا؟" سیدنا وہب مزنی نے پھر عرض کیا: "میں اے اللہ کے رسول!" آپ ﷺ نے فرمایا: «قُمْ وَأَبْشِرْ

---

[1] دلائل النبوة للبيهقي:249/3، وزاد المعاد:208/3.

بِالْجَنَّةِ» ''جاؤ اور جنت کی بشارت سے خوش ہو جاؤ۔'' مزنی رضی اللہ عنہ پھر خوشی خوشی یہ کہتے ہوئے کھڑے ہوئے کہ اللہ کی قسم! میں چین سے بیٹھوں گا نہ اپنے عہد سے سبکدوش ہوں گا۔ اور یہ کہہ کر مشرکین کی صفوں میں گھس گئے اور تلوار چلانے لگے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کو دیکھ رہے تھے۔ مزنی لڑتے لڑتے مشرکین کے لشکر کے آخر تک چلے گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا مانگ رہے تھے: «اَللّٰهُمَّ ارْحَمْهُ» ''اے اللہ! اس پر رحم فرما۔'' سیدنا وہب مزنی رضی اللہ عنہ دوبارہ مشرکین کے لشکر کی طرف پلٹے۔ مشرکین ان کی تاک میں تھے۔ یہ جیسے ہی سامنے آئے تو اچانک مل کر تلواروں اور نیزوں سے ان پر ٹوٹ پڑے۔ اور انھیں شہید کر دیا۔ انھیں بیس جان لیوا زخم آئے اور ان کا بدترین مثلہ کیا گیا۔ ان کے بعد ان کے بھتیجے حارث بن عقبہ رضی اللہ عنہ اٹھے تو وہ بھی انھی کی طرح دیوانہ وار لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کہا کرتے تھے: ''مجھے سب شہادتوں سے پسندیدہ شہادت، جس کی مجھے آرزو ہے، وہ ہے جس حالت اور مشن پر مزنی رضی اللہ عنہ نے جامِ شہادت پیا۔''[1]

بلال بن حارث مزنی بیان کرتے ہیں کہ ہم سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے ساتھ جنگ قادسیہ میں شریک تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں فتح عطا کی، غنائم تقسیم ہو چکیں تو اس تقسیم میں مزینہ قبیلے کے خاندان قابوس کا ایک نوجوان غنیمت سے محروم رہ گیا۔ جب حضرت سعد رضی اللہ عنہ بیدار ہوئے تو میں ان کے پاس آیا۔ انھوں نے پوچھا: ''بلال ہے؟'' میں نے کہا: ''جی ہاں۔ بلال ہوں۔'' حضرت سعد رضی اللہ عنہ کہنے لگے: ''خوش آمدید۔ یہ ساتھ کون ہے؟'' میں نے کہا: ''میری قوم آل قابوس کے ایک فرد ہیں۔'' حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا: ''نوجوان! جنگ احد میں شہید ہونے والے مزنی صحابی سے تمھارا کیا رشتہ ہے؟'' اس نے کہا: ''میں ان کا بھتیجا ہوں۔'' حضرت سعد نے کہا: ''خوش آمدید! اللہ تمھاری آنکھ ٹھنڈی فرمائے۔ میں نے اس مزنی کا جو کارنامہ احد کے دن دیکھا آج تک کبھی کسی شخص کا نہیں

[1] المغازي للواقدي:1/277.

دیکھا۔ ہم اس دن مشرکین کی رینج میں تھے اور انھوں نے ہمیں گھیرا ہوا تھا۔ اور رسول اللہ ﷺ ہمارے وسط میں تھے۔ دشمن کے گروہ ہر طرف سے ہم پر چڑھائی کر رہے تھے۔ آپ ﷺ نے لوگوں کو دیکھا اور دریافت فرمایا: ''اس گروہِ مشرکین سے کون نمٹے گا؟'' اس طرح کے نئے نئے لشکر نبرد آزما ہونے کے لیے بار بار آتے رہے اور آپ ﷺ نے جب پوچھا کہ ان سے کون نمٹے گا؟ تو وہی صحابی فوراً کہتے: ''اے اللہ کے رسول! میں۔'' جب وہ مزنی صحابی آخری مرتبہ کمر بستہ ہوئے وہ منظر میں کبھی نہ بھول سکوں گا، تب آپ ﷺ نے انھیں بشارت دیتے ہوئے فرمایا: ''(مزنی!) اٹھو تمھارے لیے جنت کی خوشخبری ہے۔''

حضرت سعد رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ''میں ان کے بعد اٹھا۔ اللہ تعالیٰ جانتے ہیں کہ میں بھی اسی طرح شہادت کا طالب تھا۔ ہم مشرکین کے گروہ میں گھس گئے اور آخر تک جانے کے بعد دوبارہ اس میں گھسے۔ بالآخر دشمن نے انھیں شہید کر دیا۔ اللہ تعالیٰ ان پر رحم فرمائے۔ اللہ کی قسم! میری بڑی خواہش تھی کہ کاش! میں بھی ان کے ساتھ شہادت کے درجے پر فائز ہوتا لیکن میری شہادت وہاں لکھی نہیں تھی۔'' اس کے بعد حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے اس وقت ان کا حصہ منگوا کر انھیں دیا بلکہ کچھ زائد بھی دیا۔ اور کہا: ''تم چاہو تو یہاں ہمارے پاس رہو چاہو تو اپنے گھر جا سکتے ہو۔'' بلال نے کہا: ''یہ واپس ہی جانا چاہتے ہیں۔'' چنانچہ ہم واپس آ گئے۔

حضرت سعد رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ''میں نے رسول اللہ ﷺ کو مزنی کے شہید ہونے کے بعد ان کے پاس کھڑے دیکھا، آپ ﷺ فرما رہے تھے: «رَضِيَ اللّٰهُ عَنْكَ فَإِنِّي عَنْكَ رَاضٍ» ''اللہ تعالیٰ تجھ سے راضی ہو۔ میں تو تجھ پر راضی ہو چکا ہوں۔'' میں نے رسول اللہ ﷺ کو زخموں سے چور ہونے کے باوجود مزنی کی قبر کے پاس کھڑے دیکھا۔ آپ ﷺ لحد میں اتارنے تک وہیں کھڑے رہے۔ حضرت وہب مزنی رضی اللہ عنہ کی میت پر سبز دھاری دار چادر تھی۔ آپ ﷺ نے چادر کے ساتھ ان کا سر ڈھانپ دیا، پھر انھیں طولاً

لحد میں اتارا گیا۔ وہ چادر آدھی پنڈلی تک پہنچ رہی تھی۔ آپ ﷺ نے اس کے پاؤں پر حرمَل بوٹی رکھنے کا حکم دیا، چنانچہ ہم نے لحد ہی میں ان کے پاؤں پر گھاس رکھ دیا۔ بعدازاں آپ ﷺ وہاں سے تشریف لے گئے۔ میری بڑی چاہت ہے کہ میں بھی اس مزنی کی طرح شہید ہوکر اللہ تعالیٰ سے ملوں۔'' [1]

ایمان اہل ایمان کو اسی طرح بیتاب کرتا ہے۔ سیدنا وہب مزنی رضی اللہ عنہ اور ان کے بھتیجے مدینہ میں بکریاں چھوڑتے ہیں اور مسلمانوں کے لشکر میں شامل ہوجاتے ہیں۔ انھیں شہادت کی انتہائی چاہت ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے انھیں مشرف فرمادیا۔ وہب مزنی رضی اللہ عنہ کا گھمسان کی جنگ کا وہ معرکہ صحابہ کے دل میں محفوظ ہے۔ سعد رضی اللہ عنہ اس واقعے کو تقریباً 13 برس بعد دہرا رہے ہیں۔ مُزینہ کے ایک آدمی کا نام کان میں پڑا تو سارا واقعہ آنکھوں کے سامنے آ گیا۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ وہب مزنی رضی اللہ عنہ کی طرز پر شہادت سے سرفراز ہوکر اللہ تعالیٰ سے شرف ملاقات کی تمنا کررہے ہیں۔

حضرت عمرو بن جموح رضی اللہ عنہ: حضرت عمرو بن جموح رضی اللہ عنہ کا لنگڑا پن بڑا واضح تھا اور ان کے شیروں جیسے چار بیٹے بھی تھے۔ حضرت خلاد، معوّذ، معاذ، ابو ایمن رضی اللہ عنہم۔ اور یہ تمام جنگوں میں رسول اللہ ﷺ کے شانہ بشانہ رہتے۔ جنگ احد کے موقع پر اپنے باپ کو مدینہ میں رکھنا چاہتے تھے، چنانچہ وہ اپنے والد سے عرض کرنے لگے: ''اللہ تعالیٰ نے آپ کا عذر قبول کر رکھا ہے، لہٰذا آپ جنگ میں نہ جائیں۔'' عمرو رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: ''میرے بیٹے مجھے آپ کے ساتھ میدانِ کارزار میں جانے سے روک رہے ہیں۔ اللہ کی قسم! میں چاہتا ہوں جنت میں اسی طرح لنگڑاتا ہوا چلا جاؤں۔'' آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: «أَمَّا أَنْتَ فَقَدْ عَذَرَكَ اللّٰهُ تَعَالٰى فَلَا جِهَادَ عَلَيْكَ» ''آپ کا عذر اللہ تعالیٰ کے ہاں قبول ہے آپ پر جہاد نہیں۔'' اور ان کے بیٹوں سے فرمایا:

1 المغازي للواقدي:277/1.

«مَا عَلَيْكُمْ أَلَّا تَمْنَعُوهُ، لَعَلَّ اللّٰهَ أَنْ يَرْزُقَهُ الشَّهَادَةَ» ''انھیں نہ روکو! عین ممکن ہے اللہ تعالیٰ انھیں شہادت عنایت فرما دے۔'' چنانچہ عمرو رضی اللہ عنہ نے وہاں سے نکلتے ہوئے قبلے کی طرف رخ کر کے دعا کی: «اَللّٰهُمَّ! لَا تَرُدَّنِي إِلٰى أَهْلِي خَائِبًا» ''اے میرے اللہ! مجھے میرے گھر نامراد واپس نہ لانا۔'' بالآخر اپنی خواہش کے مطابق وہ شہادت سے سرفراز ہوئے۔'' ایک روایت میں ہے کہ عمرو بن جموح رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے اور عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! اگر میں شہادت تک اللہ تعالیٰ کے راستے میں جنگ کرتا رہوں تو کیا جنت میں میرا یہ لنگڑا پن ختم ہوجائے گا؟ فرمایا: «نَعَمْ!» ''ہاں'' چنانچہ خود عمرو بن جموح رضی اللہ عنہ، ان کا بھتیجا اور دونوں کا ایک آزاد کردہ غلام شہادت سے ہمکنار ہوئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس تشریف لائے۔ ان تینوں کو ایک ہی قبر میں اتارا گیا۔[1]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جنھیں اللہ تعالیٰ نے مریض یا معذور ہونے کی بنا پر جہاد سے رخصت دے رکھی ہے اگر وہ چاہیں تو شریکِ جہاد ہو سکتے ہیں مگر ان پر شرکت واجب نہیں ہے جیسا کہ عمرو بن جموح رضی اللہ عنہ ٹانگ سے معذور ہونے کے باوجود جنگ میں شریک ہوئے۔[2]

ابو حذیفہ حضرت یمان اور ثابت بن وقش رضی اللہ عنہما: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب احد کے لیے چلے تو حذیفہ رضی اللہ عنہ کے والد حُسیل بن جابر المعروف یمان اور ثابت بن وقش رضی اللہ عنہم کو بچوں اور عورتوں کے ساتھ قلعوں میں بٹھا دیا۔ یہ دونوں بہت بوڑھے تھے، لہٰذا ایک نے دوسرے سے کہا: ''تمھارا برا ہو! انتظار کس چیز کا کر رہے ہو؟ اللہ کی قسم! ہم دونوں قبر میں ٹانگیں لٹکائے بیٹھے ہیں۔ ہماری موت آنے ہی والی ہے۔ کیوں نہ ہم تلواریں لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہو لیں۔ ممکن ہے اللہ تعالیٰ ہمیں شہادت کا درجہ عطا فرما دے۔'' دونوں نے تلواریں لیں اور جا کر مسلمانوں کے لشکر میں شریک ہوگئے۔ اور کسی مسلمان کو ان کے

---

[1] مسند أحمد: 299/5، و دلائل النبوة للبيهقي: 246/3، والسيرة النبوية لابن هشام: 96/3، ومجمع الزوائد: 315/9. [2] زاد المعاد: 218/3.

متعلق کوئی اطلاع نہ تھی۔ ثابت بن وقش رضی اللہ عنہ کو تو مشرکین نے شہید کر دیا۔ رہے یمان رضی اللہ عنہ تو ان پر مسلمانوں ہی کی تلواریں ٹوٹ پڑیں اور اس طرح انھوں نے بے خبری میں انھیں شہید کر دیا۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے آواز دی: ''یہ میرے والد ہیں۔'' مسلمانوں نے کہا: ''اللہ کی قسم! ہم انھیں پہچان نہیں سکے۔'' اور یہ حقیقت تھی کہ وہ پہچان نہیں سکے تھے۔

اس پر حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے کہا: ''اللہ تعالیٰ آپ سب کو معاف فرمائے۔ وہ بڑا رحم کرنے والا ہے۔'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چاہا کہ انھیں خون بہا دیا جائے مگر انھوں نے خون بہا مسلمانوں پر صدقہ کر دیا (معاف کر دیا) تو اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں ان کا درجہ اور بھی زیادہ بلند ہو گیا۔[1]

اس واقعے سے عمر رسیدہ لوگوں کے دلوں میں قوت ایمانی کا اثر نمایاں طور پر نظر آتا ہے جنھیں اللہ تعالیٰ نے جہاد کی رخصت دے رکھی ہے۔ انھوں نے کیسے قلعوں کو چھوڑا اور شہادت کی چاہت اور اللہ تعالیٰ سے ملاقات کے شوق میں میدان کارزار جا پہنچے۔ اس طرح اس واقعے سے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کا عظیم کردار سامنے آتا ہے کہ اپنے والد گرامی کا خون بہا مسلمانوں پر صدقہ کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی اس غلطی پر ان کے لیے مغفرت کی دعا بھی کر رہے ہیں۔ اس سے یہ مسئلہ بھی سامنے آیا کہ مسلمانوں کے ہاتھوں میدان جنگ میں اگر کوئی مسلمان کافر سمجھ کر قتل ہو جائے تو اس کی دیت حاکم کو بیت المال سے ادا کرنی چاہیے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو حضرت یمان رضی اللہ عنہ کا خون بہا دینے کا ارادہ فرمایا تھا مگر حذیفہ رضی اللہ عنہ نے اسے لینے سے انکار کیا اور اسے مسلمانوں کو بخش دیا۔[2]

جس عقیدے اور عمل پر موت آئے اعتبار اسی کا ہوتا ہے: دنیا سے رخصت ہونے سے قبل جس نظریے یا عمل کو اختیار کیا جائے وہی معتبر ہوگا۔ دو واقعے پیش آئے جو اسلام کے

---

1 صحيح البخاري، حديث: 3824 و 4065، (اس حدیث کی مزید شرح فتح الباری میں دیکھیے) والسيرة النبوية لابن هشام: 92/3. 2 زاد المعاد: 218/3.

اس اہم قاعدے کو ثابت کرتے ہیں۔ ان واقعات میں نصیحت قبول کرنے والے اور عبرت حاصل کرنے والے ہر مسلمان کے لیے بڑے اسباق ہیں۔ وہ دونوں واقعات یہ ہیں: [1]

❁ **حضرت اصیرم رضی اللہ عنہ کا واقعۂ شہادت:** ان کا اصل نام عمرو بن ثابت بن وقش ہے۔ ان پر اسلام پیش کیا گیا مگر اسلام نہ لائے۔ ان کا واقعہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ اصیرم اپنی قوم کے سامنے اسلام کا انکار کرتے تھے۔ ایک دن آیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کے ساتھ اُحد کے پاس تھے۔ یہ پوچھنے لگے: ''سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کہاں ہیں؟'' جواب ملا: ''میدانِ احد میں۔'' کہنے لگے: ''ان کے بھتیجے؟'' جواب ملا: ''وہ بھی وہاں ہیں'' پھر پوچھا: ''میری قوم کے لوگ کہاں ہیں؟'' جواب ملا: ''وہ بھی احد کے پاس گئے ہوئے ہیں۔'' اب ان کے دل میں قبول اسلام کے شوق نے انگڑائی لی اور وہ مسلمان ہوگئے۔ اس کے ساتھ ہی اپنی تلوار، نیزہ اور زرہ لی، گھوڑے پر سوار ہوئے اور چل دیے حتی کہ لوگوں کے ایک بڑے جتھے میں جا داخل ہوئے۔ جب مسلمانوں نے انھیں دیکھا تو کہنے لگے: ''اے عمرو! ہم سے الگ رہو۔'' وہ بولے: ''میں ایمان لا چکا ہوں۔'' پھر جنگ میں شریک ہوئے اور زخموں سے لہولہان ہوگئے۔ بنو عبد الأشہل جنگ میں کام آنے والے اپنے مقتولین تلاش کرتے کرتے اچانک ان تک جا پہنچے۔ انھیں دیکھا تو کہنے لگے: ''اللہ کی قسم! یہ تو اصیرم ہے۔ یہ یہاں کیا لینے آیا تھا؟ ہم تو اسے اس حال میں چھوڑ آئے تھے کہ یہ اس دین کا انکاری تھا۔'' انھوں نے ان سے دریافت کیا: ''تم یہاں کیسے؟ اپنی قوم کی محبت میں آئے ہو یا اسلام کی رغبت تمھیں یہاں کھینچ لائی ہے؟'' کہنے لگے: ''اسلام کی رغبت لیے ہوئے آیا ہوں۔ میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لا چکا ہوں۔ اسلام *لانے کے بعد میں نے تلوار تھامی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ صبح ہی آ گیا تھا، پھر میں نے* جنگ کی اب جو میری حالت ہے تمھارے سامنے ہے۔ اگر میں مر جاؤں تو میرا مال آپ صلی اللہ علیہ وسلم

[1] غزوۃ أحد لأبي فارس، ص: 117.

کا ہے آپ جیسے چاہیں کام میں لائیں۔'' انھوں نے آکر یہ قصہ رسول اللہ ﷺ کے گوش گزار کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: «إِنَّهُ مِنْ أَهْلِ الْجَنَّةِ» ''وہ اہل جنت میں سے ہے۔''

یہاں ایک سوال پیدا ہوا کہ اصیرم رضی اللہ عنہ نے ایک بھی نماز نہیں پڑھی، پھر وہ جنت میں کیسے داخل ہوگئے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: «عَمِلَ يَسِيرًا وَّ أُجِرَ كَثِيرًا» ''عمل تھوڑا کیا مگر اجر بہت پایا۔''[1]

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہا کرتے تھے: ''بتاؤ وہ کون ہے جس نے کبھی نماز نہ پڑھی مگر جنت میں داخل ہوگیا۔'' لوگ لاعلمی کا اظہار کرتے اور ان سے پوچھتے کہ وہ کون ہیں؟ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے: ''وہ اصیرم بن عبدالأشہل ہے۔''[2]

❁ **مخیریق کا واقعہ:** جب جنگ احد ہوئی اور رسول اللہ ﷺ مشرکوں سے جنگ کے لیے نکلے تو مخیریق نے اپنی قوم یہود کو اکٹھا کر کے کہا: ''اے گروہ یہود! اللہ کی قسم! تمھیں معلوم ہے کہ محمد (ﷺ) کی مدد کرنا تم پر واجب ہے۔'' انھوں نے کہا: ''آج تو یوم السبت (ہفتے کا دن) ہے۔'' مخیریق نے کہا: ''تمھیں ''سبت'' (راحت وسکون) نصیب نہ ہو۔''

اس کے بعد مخیریق نے اپنی تلوار اور ساز وسامان لیا اور کہا: ''اگر میں مارا گیا تو میرا مال محمد (ﷺ) کا ہے۔ آپ ﷺ اسے جس طرح چاہیں کام میں لائیں۔'' اگلی صبح وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پہنچا اور آپ ﷺ کے ساتھ جنگ میں حصہ لیا تا آنکہ قتل ہوگیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: «مُخَيْرِيقُ خَيْرُ يَهُودَ» ''مخیریق سب سے بہتر یہودی ہے۔''[3]

اس کے اسلام لانے کے متعلق اختلاف ہے۔ امام ذہبی نے التجرید اور حافظ ابن حجر نے الاصابہ میں واقدی کے حوالے سے ذکر کیا ہے کہ مخیریق حالتِ اسلام میں فوت ہوا تھا۔[4]

[1] صحيح البخاري، حديث: 2808. [2] السيرة النبوية لابن هشام: 101,100/3، و فتح الباري، شرح الحديث: 2808. [3] المغازي للواقدي: 263/1، وتاريخ الطبري: 531/2، والطبقات الكبرى لابن سعد: 501/1. [4] تجريد أسماء الصحابة للذهبي: 70/2، والإصابة لابن حجر: 393/3.

اسی طرح سُہیلی نے ''الروض الأنف'' میں ذکر کیا ہے کہ وہ مسلمان تھا۔ سُہیلی نے ابن اسحاق کی اس روایت پر کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «مخيريق خير يهود» پر تبصرہ اور بحث کرتے ہوئے کہا کہ مخیریق مسلمان تھا۔ جبکہ کسی مسلمان کے بارے میں کہنا کہ هو خير النصارىٰ يا خير اليهود (جو کہ اضافت بیانیہ ہے اور بتقدیر من ہوتی ہے جو جزئیت اور بعضیت کا افادہ کرتی ہے) ''نصاریٰ میں سے سب سے بہتر یا یہود میں سے سب سے بہتر ہے۔'' درست نہیں ہے۔ اگر کہا جائے کہ یہ کہنا (جو رسول اللہ ﷺ نے کہا ہے) کیسے درست ہے؟ ہم کہیں گے کیونکہ آپ ﷺ نے فرمایا: «خَيْرُ يَهُودَ» ''قبیلہَ یہود میں سے بہتر انسان ہے۔'' یہ نہیں فرمایا: «خير اليهود» ''یہودیوں میں سے اچھا یہودی ہے۔'' (لفظ) یہود ثمود کی طرح اسم علم ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہود یہوذ ابن یعقوب کی طرف منسوب ہیں، پھر ''ذال'' کو ''دال'' سے بدل دیا گیا۔ [1]

ڈاکٹر عبداللہ الشقاری نے اپنی کتاب «اليهود في السنة المطهرة» میں اس مسئلے کی اچھی تحقیق پیش کی ہے۔ ان کا بھی یہی خیال ہے کہ مخیریق اسلام لا چکا تھا اور اسی بنا پر وہ مسلمانوں کے ہمراہ مشرکین سے جنگ کرنے پر آمادہ ہوا تھا اور اسی بنا پر اس نے سارا سامان وقف کر دیا تھا، حالانکہ وہ بہت مالدار تھا، جبکہ یہود مال کی محبت اور اس کی انتہائی درجے کی حرص رکھنے میں معروف ہیں۔ [2]

❁ **اعمال کا دارو مدار نیتوں پر ہے:** مسلمانوں کے ہمراہ جنگ کرنے والوں میں سے ایک شخص قُزمان بھی تھا۔ اس کی بہادری کی بڑی دھوم تھی۔ رسول اللہ ﷺ کے سامنے جب کبھی اس کا ذکر ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا: «إِنَّهُ مِنْ أَهْلِ النَّارِ» ''یہ شخص دوزخیوں میں سے ہے۔'' جنگ احد سے پیچھے رہا تو بنوظفر کی عورتوں نے اسے شرم دلائی، چنانچہ آپ ﷺ

[1] الروض الأنف للسهيلي: 408/4. [2] اليهود في السنة المطهرة للدكتور عبدالله الشقاري: 306/1.

ابھی صفیں درست فرما رہے تھے کہ یہ پہلی صف میں آ کھڑا ہوا۔ سب سے پہلا تیر بھی (احد کے دن) مسلمانوں کی جانب سے اسی نے پھینکا، بعد ازاں ایسی تیر اندازی کی گویا وہ تیر (تیرتے ہوئے) نیزے ہوں۔ وہ ساتھ ساتھ اونٹ کی طرح آواز نکالتا رہا اور اس نے تلوار سے کارہائے نمایاں انجام دیے۔ یوں اس نے 7 یا 9 آدمی قتل کیے۔ اور خود بھی زخمی ہوگیا اور گر پڑا۔ حضرت قتادہ بن نعمان رضی اللہ عنہ نے باآواز بلند اسے کہا: ''اے ابوغیداق! تجھے شہادت مبارک ہو!'' عام مسلمانوں نے یہ کہنا شروع کردیا: ''قزمان! آج تو تم نے بہادری کے خوب جوہر دکھائے ہیں تمھیں جنت کی خوشخبری ہو۔'' وہ بولا: ''کس چیز کی بشارت! میں نے تو اللہ کی قسم! اپنی قوم کے شرف کے لیے جنگ کی ہے۔ یہ بات نہ ہوتی تو میں ہرگز اس میں حصہ نہ لیتا۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بات بتائی گئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «إِنَّهُ مِنْ أَهْلِ النَّارِ» ''یہ شخص جہنمیوں میں سے ہے۔''[1]

یہاں یہ فرمان نبوی بھی مدنظر رہے: «إِنَّ اللّٰهَ يُؤَيِّدُ الدِّينَ بِالرَّجُلِ الْفَاجِرِ» ''یقیناً اللہ تعالیٰ اپنے دین کو کبھی فاجر شخص کے ہاتھوں بھی تقویت دیتا ہے۔''[2]

اس واقعے سے واضح ہوجاتا ہے کہ جہاد میں نیت کی کتنی اہمیت ہے اور یہ کہ جو شخص اپنی قوم کی حمیت یا بہادر کہلانے کی خاطر لڑے اور اس کے اعمال رضائے الٰہی کے لیے نہ ہوں، اس سے اللہ تعالیٰ جہاد جیسی نیکی بھی قبول نہیں فرماتے۔

غزوۂ احد سے متعلقہ چند دلائلِ نبوت کا تذکرہ

قتادہ بن نعمان رضی اللہ عنہ کی آنکھ: حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ کی آنکھ پر ضرب لگی تو وہ نکل کر رخسار پر لٹکنے لگی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ مبارک سے ان کی آنکھ کو اس کی جگہ لوٹا دیا۔ وہ آنکھ قتادہ کی دوسری آنکھ سے بہتر اور تیز ہوگئی۔[3]

---

1 السيرة النبوية لابن هشام: 3/99، و غزوة أحد لمحمد عيظة بن سعيد، ص: 113. 2 صحيح البخاري، حديث: 4204، و صحيح مسلم، حديث: 112,111. 3 المستدرك للحاكم: 3/295، والمعجم الكبير للطبراني: 19/8، ودلائل النبوة للبيهقي: 3/252,251.

جب کبھی آشوبِ چشم ہوتا تو یہ آنکھ نہ دکھتی۔[1]

حضرت قتادہ بن نعمان رضی اللہ عنہ کا صاحبزادہ خلیفہ مسلمین سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے ہاں آیا۔ انھوں نے دریافت کیا: ''تم کون ہو؟'' تو اس نے فی البدیہہ اشعار میں اپنا تعارف کرایا:

''میں اس شخص کا بیٹا ہوں جس کی آنکھ رخسار پر آپڑی تھی۔ اور مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں بہتر طور پر اپنی جگہ لوٹا دی گئی۔

اور وہ پہلے جیسی ہوگئی۔ کیا ہے خوبصورتی آنکھ کی اور کتنے ہی خوبصورت انداز سے اسے اپنی جگہ فٹ کردیا گیا۔''

اس پر حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے بھی یہ شعر کہا:

''یہ ہیں قابل قدر مکارم نہ کہ دودھ اور ایسے دودھ بھرے پیالے جن میں پانی ملا ہو اور بعدازاں دونوں پیشاب بن جاتے ہیں۔'' (یعنی عزت وتکریم یہی ہے جو قتادہ بن نعمان رضی اللہ عنہ کو حاصل تھی، کھانے پینے کی چیزیں بڑھا لینے سے تو کوئی تکریم حاصل نہیں ہوتی)۔

بعد ازاں عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے ان کے ساتھ صلہ رحمی کی اور بہت اچھی تکریم و عطیات سے نوازا۔[2]

ابی بن خلف کے قتل کی پیش گوئی: مکہ مکرمہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ابی بن خلف ملتا اور کہتا: ''اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)! میرے پاس ایک جائے پناہ ہے یہ جائے پناہ وہ گھوڑا ہے جسے میں روزانہ ایک ''فرق'' (تقریباً پونے پانچ کلو) دانہ کھلاتا ہوں۔ میں اس پر سوار ہو کر تجھے قتل کروں گا۔'' (نعوذ باللہ)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے: «بَلْ أَنَا أَقْتُلُكَ إِنْ شَاءَ اللّٰهُ» ''بلکہ ان شاء اللہ تجھے میں قتل کروں گا۔''

---

[1] السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري: 388/2. [2] البداية والنهاية: 35/4.

جب جنگ احد کا دن آیا اور رسول اللہ ﷺ گھاٹی پر چڑھ گئے۔ وہاں ابی بن خلف بھی آپہنچا اور کہنے لگا: ''اے محمد! اگر تم بچ گئے تو میں نہ رہوں گا۔'' مسلمانوں نے دریافت کیا: ''یارسول اللہ! کیا ہم میں سے کوئی شخص اس کا منہ توڑ جواب دے؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: «دَعُوهُ» ''اسے چھوڑ دو'' پھر جب ابی بن خلف قریب آیا تو رسول اللہ ﷺ نے حارث بن صمہ رضی اللہ عنہ سے نیزہ لیا۔ اور اس سے نیزہ لے کر اسے ایسی حرکت دی کہ ہم سب آن واحد میں ادھر اُدھر بکھرنے پر مجبور ہو گئے۔ پھر رسول اللہ ﷺ ابی بن خلف کی طرف بڑھے اور اس کی گردن پر ایک ایسا نیزہ مارا کہ وہ گھوڑے سے لڑھکتا ہوا واپس پلٹا۔ ابی بن خلف گردن میں ہلکی سی خراش آنے کے بعد واپس قریش کے پاس پہنچا تو خون بہنے کے بجائے رکا ہوا تھا۔ کہنے لگا: ''خدا کی قسم مجھے محمد (ﷺ) نے قتل کر دیا۔'' قریش نے اس سے کہا: ''تو دل چھوڑ بیٹھا ہے اتنی کونسی بات ہے۔ اللہ کی قسم! تجھے کوئی خاص چوٹ نہیں۔'' ابی بن خلف نے بتایا: ''محمد (ﷺ) نے مکہ میں مجھ سے کہا تھا کہ میں تجھے قتل کروں گا۔ پس خدا کی قسم! اگر وہ مجھ پر تھوک بھی دیتا تو بھی میں مرجاتا۔'' جب قریش مکہ کی جانب اس کے ساتھ واپس ہو رہے تھے تو اللہ کا یہ دشمن مقام ''سَرِف''[1] تک پہنچ کر مر گیا۔[2]

اس واقعے سے رسول اللہ ﷺ کی مایہ ناز بہادری کا پتا چلتا ہے۔ ابی بن خلف اس وقت اسلحے سے لیس اور حفاظتی زرہ اوڑھے ہوئے تھا۔ اس کے باوجود آپ ﷺ اس کی زرہ اور خود کے درمیان گردن کے انتہائی مشکل ہدف پر نیزہ لگانے میں کامیاب ہو گئے۔ معلوم ہوا کہ آپ ﷺ اعلیٰ جنگی قابلیت اور نشانے کی نزاکت پر کس قدر عبور رکھتے تھے۔ اس واقعے میں آپ ﷺ کے معجزے کا پتا بھی چلتا ہے کہ آپ ﷺ نے ابی بن خلف کو پہلے ہی خبردار کر دیا تھا کہ میں تجھے قتل کروں گا اور ایسے ہی ہوا۔ اس واقعے سے یہ بات

[1] سرف: مکہ سے 6 میل کے فاصلے پر ایک مقام ہے۔ [2] السيرة النبوية لابن هشام: 94,93/3، وتاريخ الطبري: 519,518/2، و دلائل النبوة للبيهقي: 211/3.

بھی عیاں ہوتی ہے کہ مشرکین آپ ﷺ کی صداقت کا یقین رکھتے تھے۔ اور انھیں اس کا مکمل علم تھا کہ آپ ﷺ جو کہتے ہیں وہ یقیناً ہوجاتا ہے۔ ابی بن خلف کو اس بات کا یقین تھا کہ وہ اس نیزے کے لگنے ہی سے مرجائے گا لیکن اپنی اسلام دشمنی وضد اور خواہش پرستی کی بنا پر اسلام میں داخل نہ ہوسکا۔[1]

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَإِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُونَكَ وَلَٰكِنَّ الظَّالِمِينَ بِآيَاتِ اللَّهِ يَجْحَدُونَ﴾

''پس بے شک وہ آپ کو نہیں جھٹلاتے بلکہ دراصل یہ ظالم تو اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں۔''[2]

حضرت حسان رضی اللہ عنہ نے اس واقعے کو اپنے شعروں میں یوں دوام بخشا ہے:

''ابی بن خلف کو گمراہی اپنے باپ سے وراثت میں ملی تھی۔ جس دن رسول اللہ ﷺ اس سے برسرِ پیکار ہوئے۔

اے ابی! تو اپنی بوسیدہ ہڈیاں اٹھائے رسول اللہ ﷺ کی طرف آرہا تھا۔ اور آپ ﷺ کی حقیقت سے واقف ہوتے ہوئے بھی انھیں دھمکیاں دے رہا تھا؟''[3]

---

[1] التاريخ الإسلامي للحميدي: 169/5. [2] الأنعام 33:6. [3] السيرة النبوية لابن هشام: 94/3.

باب 4

غزوۂ احد کے بعد کے حالات و واقعات

رسول اللہ ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم سے ابوسفیان کا زوردار مکالمہ

حضرت براء رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ”ابوسفیان (غزوۂ احد کے اختتام پذیر ہونے کے بعد) نمودار ہوا اور پوچھنے لگا: ”کیا تم میں محمد (ﷺ) ہیں؟“

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «لَا تُجِيبُوهُ» ”اسے جواب نہ دو۔“

اس نے پھر سوال کیا: ”کیا تم میں ابن ابی قحافہ (حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ) ہیں؟“

آپ ﷺ نے فرمایا: «لَا تُجِيبُوهُ» ”اسے جواب نہ دو۔“

اس نے پھر پوچھا: ”تم میں خطاب کے بیٹے ہیں؟“ پھر خود کہنے لگا: ”یہ لوگ تو قتل ہو چکے کیونکہ اگر زندہ ہوتے تو ضرور جواب دیتے۔“

یہ سن کر عمر رضی اللہ عنہ بے قابو ہو گئے اور بولے: ”او اللہ کے دشمن! تو جھوٹ بولتا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے تیری رسوائی کے لیے انھیں باقی رکھا ہے۔“

اس کے بعد ابوسفیان نے نعرہ لگایا: أُعْلُ هُبَلُ! ”ہبل بلند ہو۔“

آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: «أَجِيبُوهُ» ”اسے جواب دو۔“

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: ”ہم کیا کہیں؟“

فرمایا: «قُولُوا: اَللّٰهُ أَعْلٰى وَأَجَلُّ» ”تم یہ جواب دو: ”اللہ تعالیٰ ہی بلند و بالا اور عظمت و جلال کا مالک ہے۔“

یہ سن کر ابوسفیان بولا: ''ہمارا عُزّٰی ہے مگر تمھارا کوئی عُزّٰی نہیں۔''

نبی ﷺ نے فرمایا: «أَجِيبُوهُ» ''اسے جواب دو۔''

صحابہ عرض کرنے لگے: ''کیا کہیں؟''

فرمایا: «قُولُوا: اَللّٰهُ مَوْلَانَا وَلَا مَوْلٰی لَكُمْ» ''کہو: اللہ ہمارا آقا ہے اور تمھارا کوئی آقا ہی نہیں۔''

اس کے بعد ابوسفیان نے کہا: ''آج کا دن جنگ بدر کے دن کا بدلہ ہے۔ اور لڑائی میں ہار جیت ہوتی رہتی ہے۔ تمھارے مقتولین کا مثلہ ہوا ہے۔ میں نے اس کا حکم نہیں دیا تھا اور نہ ہی مجھے برا لگا۔''[1]

ایک روایت میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: ''کاہے کی برابری! ہمارے شہداء جنت میں ہیں اور تمھارے مقتولین جہنم میں ہیں۔''[2]

ابوسفیان (رضی اللہ عنہ) نے رسول اللہ ﷺ، ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں دریافت کیا تھا۔ اس میں واضح دلالت ہے کہ مشرکین کے ہاں بھی ان شخصیات کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ وہ جانتے تھے یہ اسلام کے پرچارک ہیں۔ اسلام کی عالی شان عمارت انھی پر استوار ہے اور یہ اسلامی ریاست کے رکن رکین ہیں۔ مشرکین کو یقین تھا کہ ان کی شہادت کے بعد اسلام قائم نہیں رہ سکتا۔ آپ ﷺ نے ابتدا میں ابوسفیان کے جواب میں خاموشی کا حکم دیا تا کہ اسے مزید ذلیل کیا جائے۔ یہاں تک کہ جب وہ غرور کے نشے میں مست ہو جائے تب اسے حقیقت حال سے باخبر کریں اور بہادری سے اس کا جواب دیں۔

ابن قیم رحمہ اللہ اس مکالمے پر اپنی رائے ان الفاظ میں دیتے ہیں: ''رسول اللہ ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو اس وقت جواب دینے کا حکم دیا جب اس نے اپنے معبودوں کا اور انھیں

---

[1] صحيح البخاري، حديث:4043، ودلائل النبوة للبيهقي:268/3. [2] مسند أحمد:463/1، ومجمع الزوائد:110/6، و السيرة النبوية لابن هشام:99/3.

شریک ٹھہرانے کا فخریہ طور پر اظہار کیا۔ اس سے آپ ﷺ کا مقصد یہ تھا کہ توحید کی عظمت کا ڈنکا بجایا جائے اور بتایا جائے کہ مسلمان جس کی عبادت کرتے ہیں وہ درحقیقت عزت کا مالک اور انتہائی طاقتور ہے اور اسے مغلوب نہیں کیا جا سکتا اور ہم مسلمان اسی کا گروہ اور اسی کی فوج ہیں۔

اور جب اس نے کہا: ''کیا تم میں محمد ﷺ ہیں؟ ابو قحافہ کے بیٹے (ابوبکر) ہیں؟ عمر ہیں؟'' تو آپ ﷺ نے جواب نہ دینے کا حکم دیا۔ بلکہ روایات میں آتا ہے کہ آپ ﷺ نے جواب سے منع کر دیا اور فرمایا: «لَا تُجِيبُوهُ» ''اسے جواب نہ دو۔'' کیونکہ مسلمان قوم کو زخم خوردہ کرنے کے باوجود وہ مسلمانوں کی تلاش میں ابھی ٹھنڈے نہیں ہوئے تھے، ان کے غیظ وغضب کی آگ تاحال بھڑک رہی تھی۔ لیکن جب اس نے اپنے ساتھیوں کو بتایا کہ تمھارے ہاتھوں ان کا کام تمام کیا جا چکا ہے۔ تو عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ جوش میں آگئے۔ ان کے غصے میں شدت آگئی اور انھوں نے جواب دیا: ''او اللہ کے دشمن! تم جھوٹ بکتے ہو۔'' دراصل اس اطلاع میں کافروں کی رسوائی کا سامان اور اپنی بہادری جتلانا مقصود تھا اور اس وقت دشمن کو باخبر کرنا تھا کہ ہم لوگ اب بھی تم سے ٹکرانے کی تب وتاب رکھتے ہیں اور ہم کمزوری اور کاہلی کا شکار نہیں ہوئے۔ میں اور میرے ساتھی تم سے ہرگز خوف زدہ نہیں ہوئے۔ ہمیں زندہ رکھ کر اللہ تعالیٰ نے تمھاری رسوائی کا سامان باقی رکھا ہے۔ اور ان تینوں شخصیات کے متعلق بتانا کہ وہ بقید حیات ہیں دشمن کو گھبراہٹ اور خوف میں مبتلا کرنے کے مترادف تھا۔ کیونکہ انھیں یقین ہو چکا تھا کہ یہ تینوں وفات پا چکے ہیں۔ اس موقع پر ایک ایک کے بجائے تینوں کی بقا کا اکٹھا جواب دے کر ابوسفیان اور اس کی قوم کو ذلیل اور کمزور کرنا مقصود تھا اور ایسا الگ الگ جواب دینے سے ممکن نہ تھا۔

ابوسفیان (رضی اللہ عنہ) کا ان کے متعلق پوچھنا اور اپنی قوم کو ان کی وفات کی اطلاع دینا دشمن کی چالبازیوں کے ترکش کا آخری تیر تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کی اس چال کے ممکن

ہونے تک صبر کیا جب انھوں نے اپنی سازش کو عملی جامہ پہنا لیا تو عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا اور ان کے فریب کے تیر انھی کی طرف لوٹا دیے۔ پہلے جواب نہ دینا بہتر اور اب کی بار جواب دینا مفید تھا۔ اسی طرح آغاز گفتگو میں جب اس نے ان کے متعلق دریافت کیا تو اسے سرے سے جواب ہی نہ دینا اس کی ذلت و حقارت کا باعث تھا۔ تو جب وہ اپنے ہی من میں خوش ہونے لگا کہ وہ قتل ہو چکے ہیں اور اس کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی اور وہ اس سے انتہائی غرور و تکبر کی سراب میں کھو گیا۔ تو اب اسے جواب دینا انتہائی مناسب تھا کیونکہ اس میں اس کے لیے حقارت و ذلت پوشیدہ تھی۔ اب جواب دینا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان: «لَا تُجِيبُوهُ» کے خلاف بھی نہ تھا کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عدم جواب کا حکم صرف اس وقت دیا تھا جب اس نے پوچھا: ''کیا تم میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے؟ کیا تم میں فلاں فلاں ہیں؟'' لیکن جب اسی نے کہا: ''یہ تینوں تو قتل ہو چکے۔'' اس موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے جواب دینے سے منع نہیں فرمایا۔ بہر حال ابوسفیان کو پہلے جواب نہ دینا اور اب جواب دینا ہی بہتر تھا۔''[1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا شہداء کی خبر گیری کرنا

ابوسفیان کے میدان جنگ چھوڑنے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ساتھیوں کی خبر گیری کے لیے تشریف لے گئے اور چند ایک شہداء کے پاس کھڑے ہوئے۔ ان میں سے حضرت حمزہ بن عبدالمطلب، مصعب بن عمیر، حنظلہ بن ابی عامر، سعد بن ربیع، اصیرم رضی اللہ عنہم اور دیگر صحابہ شامل ہیں۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شہدائے احد کو دیکھا تو فرمایا:

«أَنَا شَهِيدٌ عَلٰى هٰؤُلَاءِ، إِنَّهٗ مَا مِنْ جَرِيحٍ يُّجْرَحُ فِي اللّٰهِ إِلَّا وَاللّٰهُ يَبْعَثُهٗ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يَدْمٰى جُرْحُهٗ، اَللَّوْنُ لَوْنُ دَمٍ، وَّالرِّيحُ رِيحُ

[1] زاد المعاد: 203,202/3.

الْمِسْكِ، أُنْظُرُوا أَكْثَرَ هٰؤُلَاءِ جَمْعًا لِّلْقُرْآنِ فَاجْعَلُوهُ أَمَامَ أَصْحَابِهِ فِي الْقَبْرِ»

''میں ان سب پر گواہ ہوں۔ جو بھی شخص اللہ تعالیٰ کے راستے میں زخمی کیا جائے گا اللہ تعالیٰ اسے قیامت کے روز اس طرح اٹھائے گا کہ اس کے زخم سے خون بہہ رہا ہوگا جس کا رنگ تو خون ہی والا ہوگا مگر خوشبو مشک جیسی ہوگی۔ دیکھو! جسے قرآن زیادہ یاد تھا اسے دوسروں سے پہلے لحد میں رکھو۔''[1]

امام بخاری رحمہ اللہ نے سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کی روایت بیان کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم دو دو شہیدوں کو ایک ہی کپڑے میں لپیٹتے اور پوچھتے: «أَيُّهُمْ أَكْثَرُ أَخْذًا لِّلْقُرْآنِ؟» ''ان دونوں میں سے قرآن کس کو زیادہ یاد تھا؟'' جب اشارہ کیا جاتا کہ فلاں کو تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسے لحد میں آگے کرتے اور فرماتے: «أَنَا شَهِيدٌ عَلٰى هٰؤُلَاءِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ» ''قیامت کے دن ان لوگوں پر میں گواہ ہوں گا۔'' اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ ان لوگوں کو خون سمیت دفن کردو اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر نماز جنازہ پڑھی نہ ہی انھیں غسل دیا گیا۔''[2]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ انھیں ان کی شہادت گاہوں میں دفن کیا جائے، لہٰذا جن شہدا کو دفن کرنے کے لیے مدینہ منتقل کیا جا چکا تھا انھیں دوبارہ ان کی شہادت گاہوں کی طرف منتقل کردیا گیا۔[3]

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حمزہ بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ کا مثلہ کیا ہوا دیکھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم انتہائی غمگین ہوگئے اور روتے ہوئے سسکیاں بھرنے لگے، قریب تھا روتے روتے بے ہوش ہوجاتے۔[4]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

---

1 السيرة النبوية لابن هشام: 109/3. 2 صحيح البخاري، حديث: 4079. 3 سنن النسائي، حديث: 2006. 4 مختصر سيرة الرسول ﷺ لمحمد بن عبد الوهاب، ص: 331.

«لَوْلَا أَنْ تَحْزَنَ صَفِيَّةُ، وَيَكُونَ سُنَّةً مِّنْ بَعْدِي لَتَرَكْتُهُ حَتّٰى يَكُونَ فِي بُطُونِ السِّبَاعِ، وَحَوَاصِلِ الطَّيْرِ، وَلَئِنْ أَظْهَرَنِي اللّٰهُ عَلٰى قُرَيْشٍ فِي مَوْطِنٍ مِّنَ الْمَوَاطِنِ لَأُمَثِّلَنَّ بِثَلَاثِينَ رَجُلًا مِّنْهُمْ»

''اگر مجھے اس بات کا خیال نہ ہوتا کہ صفیہ کو صدمہ پہنچے گا اور یہ کہ میرے بعد یہ ایک سنت بن جائے گی تو میں انھیں ایسے ہی رہنے دیتا تاکہ وہ درندوں کے پیٹوں اور پرندوں کے پوٹوں میں پہنچ جائے۔ اور اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے کسی موقع پر قریش پر غلبہ عطا فرمایا تو میں ان کے تیس آدمیوں کا مثلہ کروں گا۔''

مسلمانوں نے آپ ﷺ کے چچا جان کے ساتھ اس قسم کا سلوک کرنے والوں پر رسول اللہ ﷺ کا غم و غصہ دیکھا تو کہنے لگے: ''اگر اللہ تعالیٰ نے ہمیں ان پر کسی زمانے میں بھی فتح نصیب کی تو ہم ان کا ایسا مثلہ کریں گے کہ عرب میں کسی بھی شخص کا ایسا مثلہ نہ کیا گیا ہوگا۔''[1]

اس وقت اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان نازل ہوا:

﴿وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوا بِمِثْلِ مَا عُوقِبْتُم بِهِۦ ۖ وَلَئِن صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصَّٰبِرِينَ ۝﴾

''اور اگر تم بدلہ لو تو اتنا ہی بدلہ لو جتنی تمھیں تکلیف دی گئی ہو اور اگر تم صبر کرو تو وہ صابرین کے لیے بہت بہتر ہے۔''[2]

مشرکوں نے مسلمان شہداء کا مثلہ کر کے مقتولین کے پیٹ پھاڑ کر ناک، کان اور بعض

[1] سنن أبي داود، حديث: 3136، وجامع الترمذي، حديث: 1016، ومسند أحمد: 128/3، والسيرة النبوية لابن هشام: 106/3، والمستدرك للحاكم: 196/3، والمصنف لابن أبي شيبة: 391/14، 392. علامہ البانی ﷫ نے اس حدیث کو ضعیف کہا ہے، دیکھیے: السلسلة الضعيفة: 27/2، حديث: 549. [2] النحل 126:16. سنن دار قطني: 204/5، ودلائل النبوة للبيهقي: 286/3. علامہ البانی ﷫ نے اس حدیث کو ضعیف کہا ہے، دیکھیے: السلسلة الضعيفة: 26/2، حديث: 548.

کی شرمگاہیں کاٹ کر انتہائی وحشت کا مظاہرہ کیا۔ [1]

اس کے باوجود رسول اللہ ﷺ اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے صبر سے کام لیا۔ آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی نصیحت کو قبول کرتے ہوئے درگزر اور صبر سے کام لیا۔ اپنی قسم کا کفارہ ادا کیا اور مثلہ کرنے سے منع کر دیا۔

ابن اسحاق نے سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے اپنی سند کے ساتھ بیان کیا ہے کہ ایسا کبھی نہ ہوا کہ رسول اللہ ﷺ ایک جگہ کھڑے ہوں اور اسے چھوڑنے سے پہلے پہلے ہمیں صدقہ و خیرات کا حکم نہ دیا یا مثلہ سے منع نہ فرمایا ہو۔ [2]

احد کے دن رسول اللہ ﷺ کی دعا

رسول اللہ ﷺ نے بہت زیادہ خون بہہ جانے کی بنا پر احد کے دن ظہر کی نماز بیٹھ کر پڑھائی۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی آپ ﷺ کے پیچھے بیٹھے ہوئے تھے۔ نماز کے بعد آپ ﷺ نے اللہ کی حمد و ثنا کی اور درپیش آزمائش اور مشقت کے متعلق اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائی، چنانچہ آپ ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمایا: «اِسْتَوُوا حَتّٰى أُثْنِي عَلٰى رَبِّي عَزَّوَجَلَّ» ''برابر ہو جاؤ۔ ذرا میں اپنے پروردگار کی حمد و ثنا کر لوں۔'' اس حکم پر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ ﷺ کے پیچھے صفیں باندھ لیں تو آپ ﷺ نے ایمان سے معمور ان کلمات سے یوں دعا کی:

«اَللّٰهُمَّ! لَكَ الْحَمْدُ كُلُّهُ، اَللّٰهُمَّ! لَا قَابِضَ لِمَا بَسَطْتَّ، وَلَا بَاسِطَ لِمَا قَبَضْتَ، وَلَا هَادِيَ لِمَا أَضْلَلْتَ، وَلَا مُضِلَّ لِمَنْ هَدَيْتَ، وَلَا مُعْطِيَ لِمَا مَنَعْتَ، وَلَا مَانِعَ لِمَا أَعْطَيْتَ، وَلَا مُقَرِّبَ لِمَا بَاعَدْتَّ، وَلَا مُبْعِدَ لِمَا قَرَّبْتَ، اَللّٰهُمَّ! ابْسُطْ عَلَيْنَا مِنْ بَرَكَاتِكَ، وَرَحْمَتِكَ، وَفَضْلِكَ، وَرِزْقِكَ، اَللّٰهُمَّ! إِنِّي أَسْأَلُكَ النَّعِيمَ الْمُقِيمَ الَّذِي لَا يَحُولُ،

[1] غزوة أحد لأبي فارس، ص: 104. [2] السيرة النبوية لابن هشام: 102/3.

وَلَا يَزُولُ، اَللّٰهُمَّ! إِنِّي أَسْأَلُكَ النَّعِيمَ يَوْمَ الْغَلَبَةِ، وَالْأَمْنَ يَوْمَ الْخَوْفِ، اَللّٰهُمَّ! عَائِذٌ بِكَ مِنْ شَرِّمَا أَعْطَيْتَنَا، وَشَرِّمَا مَنَعْتَنَا، اَللّٰهُمَّ! حَبِّبْ إِلَيْنَا الْإِيمَانَ، وَزَيِّنْهُ فِي قُلُوبِنَا، وَكَرِّهْ إِلَيْنَا الْكُفْرَ وَالْفُسُوقَ، وَالْعِصْيَانَ، وَاجْعَلْنَا مِنَ الرَّاشِدِينَ، اَللّٰهُمَّ! تَوَفَّنَا مُسْلِمِينَ، وَأَحْيِنَا مُسْلِمِينَ، وَأَلْحِقْنَا بِالصَّالِحِينَ غَيْرَ خَزَايَا، وَلَا نَادِمِينَ، وَلَا مَفْتُونِينَ. اَللّٰهُمَّ! قَاتِلِ الْكَفَرَةَ الَّذِينَ يُكَذِّبُونَ رُسُلَكَ، وَيَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِكَ، وَاجْعَلْ عَلَيْهِمْ رِجْزَكَ، وَعَذَابَكَ، اَللّٰهُمَّ! قَاتِلِ الْكَفَرَةَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ، إِلٰهَ الْحَقِّ »

’’اے اللہ! تیرے ہی لیے سب تعریفیں ہیں۔ اے اللہ! تو جس کے لیے کشادگی فرما دے اسے کوئی تنگ نہیں کرسکتا۔ اور جسے تو تنگی میں مبتلا کردے اسے کوئی کشادگی سے نہیں نواز سکتا۔ اور جس شخص کو تو گمراہ کردے اسے کوئی ہدایت نہیں دے سکتا۔ اور جس شخص کو تو ہدایت دے دے اسے کوئی گمراہ نہیں کرسکتا۔ جس سے تو روک لے اسے کوئی دے نہیں سکتا۔ اور جسے تو دے اس سے کوئی رکاوٹ نہیں بن سکتا۔ اور جسے تو دور کردے اسے کوئی قریب نہیں کرسکتا۔ اور جسے تو قریب کردے اسے کوئی دور نہیں کرسکتا۔ اے اللہ! ہم پر اپنی برکتوں، رحمتوں اور فضل ورزق کے دہانے کھول دے۔ اے اللہ! میں تجھ سے برقرار رہنے والی نعمت کا سوال کرتا ہوں۔ جو نہ ٹلے اور نہ ختم ہو۔ اے اللہ! میں تجھ سے فقر کے دن مدد کا اور خوف کے دن امن کا سوال کرتا ہوں۔ اے اللہ! جو کچھ تو نے ہمیں دیا ہے اس کے شر سے اور جو کچھ نہیں دیا ہے اس کے بھی شر سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔ اے اللہ! ہمارے نزدیک ایمان کو محبوب بنا دے اور اسے ہمارے دلوں میں خوشنما

بنا دے اور کفر و فسق اور نافرمانی کو ناگوار بنا دے اور ہمیں ہدایت یافتہ لوگوں میں کر دے۔ اے اللہ! اسلام کی حالت میں ہمیں موت دینا اور اسلام ہی پر زندہ رکھنا اور رسوائی اور فتنے سے دوچار کیے بغیر ہمیں صالحین میں شامل فرما۔ اے اللہ! تو ان کافروں کو ہلاک کر، ان پر سختی کر اور ان پر عذاب نازل فرما جو تیرے پیغمبروں کو جھٹلاتے اور تیری راہ سے روکتے ہیں۔ اے اللہ! اہل کتاب کو نیست و نابود کر دے۔ اے سچے الٰہ (ہماری دعا قبول فرما!)۔''[1]

پھر آپ ﷺ اپنے گھوڑے پر سوار ہوئے اور مدینہ منورہ کا رُخ کیا۔[2]

رسول اللہ ﷺ نے یہ اعلیٰ نمونہ اپنی امت کے سامنے رکھا تاکہ وہ نصرت اور توفیق جہانوں کے پروردگار ہی سے طلب کریں۔ نبی ﷺ نے اپنی امت کے لیے یہ بات واضح فرما دی کہ فتح و نصرت ہو یا شکست ہر صورت میں دعا مطلوب ہے کیونکہ دعا عبادت کا مغز ہے۔ اسی طرح دعا ناگوار حالات کو ٹالنے اور اعلیٰ مقاصد کے حصول کا قوی ترین ذریعہ ہے۔

دعا دلوں کو اپنے خالق سے جوڑ دیتی ہے جس کے نتیجے میں سکون و اطمینان اور ثابت قدمی حاصل ہوتی ہے۔ یہ دلوں کو بہت بڑی روحانی قوت سے بہرہ ور کرتی ہے اور اس طرح احساسات و خیالات بلندیوں کو چھوتے اور انعاماتِ الٰہیہ کی طرف شوق سے بڑھتے رہتے ہیں۔

اختتامِ معرکہ پر آپ ﷺ نے تیاری کی اور مسلمانوں کی صف بندی کی تاکہ رب تعالیٰ کی ثنا بیان کریں۔ یہ راسخ ایمان کی روشن دلیل ہے جو رب العالمین کی بلاشراکت غلامی کے عظیم موقف کو واضح کرتی ہے۔ اور اسی سے یہ اظہار ہوتا ہے کہ وہ جو چاہے کرے، وہی ہے جو تنگی و ترشی میں مبتلا کرنے والا ہے اور کشادگی پیدا کرنے والا ہے، وہی ہے عطا کرنے والا اور روک لینے والا۔ اس کے حکم کو نہ کوئی رد کر سکتا ہے اور نہ کوئی ٹال سکتا ہے۔

یہ عبادت گزاروں کو عبودیت کی اعلیٰ منازل طے کروانے کے لیے بہترین طرز عمل ہے جو

---

1 مسند أحمد:424/3، و المعجم الكبير للطبراني:47/5، حديث:4549، ومسند البزار، حديث:1800. 2 السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري:394/2.

معبود کی بے پایاں عظمت اور کبریائی دلوں میں بٹھاتا ہے۔ اسی طرح عظمت و جلالت کا واضح ترین اظہار حمد و ثنا کے ذریعے سے ہوتا ہے۔[1]

دشمن کے مکروہ عزائم سے باخبر رہنا

مشرکوں کا لشکر میدانِ جنگ سے سمٹ گیا تو رسول اللہ ﷺ نے جنگ کے فوراً بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھیجا تاکہ معلوم کیا جائے کہ دشمن کا اب کہاں کا ارادہ ہے۔ آپ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا: «أُخْرُجْ فِي آثَارِ الْقَوْمِ، وَانْظُرْ مَاذَا يَصْنَعُونَ، وَمَا يُرِيدُونَ؟ فَإِنْ كَانُوا جَنَّبُوا الْخَيْلَ وَامْتَطَوُا الْإِبِلَ فَإِنَّهُمْ يُرِيدُونَ مَكَّةَ، وَإِنْ رَكِبُوا الْخَيْلَ وَسَاقُوا الْإِبِلَ فَهُمْ يُرِيدُونَ الْمَدِينَةَ، وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ! إِنْ أَرَادُوهَا لَأَسِيرَنَّ إِلَيْهِمْ فِيهَا ثُمَّ لَأُنَاجِزَنَّهُمْ» ''ان کے پیچھے پیچھے جاؤ اور معلوم کرو کہ ان کے عزائم کیا ہیں۔ اگر کفار گھوڑوں کو اپنے ساتھ لے کر چل رہے ہیں اور خود اونٹوں پر سوار ہیں تو وہ واپس مکہ جانا چاہتے ہیں اور اگر وہ اپنے گھوڑوں پر سوار ہو کر اونٹوں کو ہانک رہے ہیں تو پھر سمجھ لو کہ ان کا ارادہ مدینے کا ہے۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! اگر ان کا مدینے پر حملے کا ارادہ ہوا تو میں خود ان کی طرف بڑھ کر ان سے ضرور جنگ کروں گا۔'' حضرت علی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں ان کے پیچھے گیا تاکہ دیکھوں کہ ان کے عزائم کیا ہیں۔ جب میں نے دیکھا تو انھوں نے گھوڑوں کو اپنے پہلو میں رکھا ہوا تھا اور اونٹوں پر سوار تھے۔ اور ان کا رخ مکہ کی جانب تھا۔[2]

نصیحتیں اور عبرتیں: اس خبر میں متعدد اسباق اور نصائح ہیں: آپ ﷺ دشمن کی نقل و حرکت پر کڑی نظر رکھے ہوئے تھے اور ان کی سرگرمیوں سے باخبر تھے۔ آپ ﷺ کی

---

[1] صور و عبر من الجهاد النبوي في المدينة للدكتور فوزي فيض الله، ص: 133,132. [2] البداية والنهاية: 41/4، والسيرة النبوية لابن هشام: 100/3.

سنگینی حالات کا اندازہ لگانے کی صلاحیت اور معاملات کو بھانپنے کی دسترس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر دشمن مدینہ کی طرف پلٹتا تو آپ ﷺ مشرکوں سے پنجہ آزمائی کے لیے بالکل تیار تھے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آپ ﷺ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ پر بھرپور اعتماد تھا اور آپ بڑے مردم شناس تھے۔ اسی طرح یہ واقعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شجاعت کی بھی دلیل ہے کیونکہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ اس نازک مرحلے میں تھے کہ لشکر کی نگاہ آپ پر پڑ جاتی تو مشرکین مکہ آپ کو شہید کرنے کی کوشش سے ہرگز اجتناب نہ کرتے۔[1]

یہ بات ہمارے سامنے ہے کہ رسول اللہ ﷺ جنگ کے بعد زخمی اور شہداء کے احوال دریافت کرنے کے لیے کچھ دیر میدان جنگ میں قیام پذیر رہے، شہداء کے دفن کا حکم دیا، اپنے پروردگار کی ثنا کی اور دعا فرمائی۔ اسی دوران حضرت علی رضی اللہ عنہ کو دشمن کے احوال دریافت کرنے کو بھیجا۔ ان تمام تر سرگرمیوں سے مقصود یہ تھا کہ اس جنگ میں مسلمانوں نے جو کامیابی حاصل کی ہے اس کی حفاظت کی جا سکے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق میں فتح و شکست کے اسباب مقرر فرما رکھے ہیں، چنانچہ جو بھی فتح و نصرت کے اسباب اختیار کرتا اور اللہ تعالیٰ پر سچا بھروسا رکھتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے نصرت کا حقدار ٹھہرتا ہے جیسا کہ ارشاد باری ہے:

﴿سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ ۖ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۝﴾

”یہ اللہ کا طریقہ ہے جو پہلے سے چلا آ رہا ہے اور آپ اللہ کے طریقے میں ہرگز کوئی تبدیلی نہیں پائیں گے۔“[2]

غزوۂ حمراء الاسد، جس کا تذکرہ ذیل میں آ رہا ہے، سے یہ بات بالکل عیاں ہو جاتی ہے کہ آپ ﷺ کس انداز سے اسباب اختیار فرماتے تھے۔

1 غزوة أحد لأبي فارس، ص:96,95. 2 الفتح48:23.

غزوۂ حمراء الأسد

بعض روایات سے آگاہی ہوتی ہے کہ نبی ﷺ اپنے بہی خواہوں کے ذریعے سے مشرکوں کے بارے میں مسلسل مطلع رہنے کے لیے کوشاں رہے حتی کہ یہ تسلسل ان کے مکہ پہنچنے کے بعد بھی جاری رہا۔ آپ ﷺ کو ابوسفیان کی یہ بات بھی پہنچی کہ وہ اپنے لشکر کو ملامت کر رہا تھا کہ محمد ﷺ اور ان کے ساتھیوں کی طرف سے ابھی ان کے غصے کی آگ ٹھنڈی نہیں ہوئی۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ابوسفیان اور مشرکین جب احد سے واپسی پر روحاء[1] پہنچے تو ابوسفیان نے کہا: ''تم لوگوں نے کچھ نہیں کیا نہ تو محمد (ﷺ) کو قتل کیا اور نہ ہی جوان عورتوں کو ساتھ قیدی بنا کر لائے۔'' یہ بات رسول اللہ ﷺ تک پہنچ گئی۔[2]

اس روایت سے عیاں ہے کہ جنگ ختم ہونے کے باوجود رسول اللہ ﷺ دشمن کی سرگرمیوں پر کس قدر نظر رکھے ہوئے تھے۔ اس سے مقصود یہ تھا کہ دشمن کے اچانک حملہ آور ہونے کا خطرہ ٹل جائے۔ اور جب آپ ﷺ نے سنا کہ قریش واپس مدینے کا ارادہ کر رہے ہیں تو آپ ﷺ عام مسلمانوں کو چھوڑ کر صرف غزوۂ احد میں شریک ساتھیوں کی معیت میں حمراء الأسد تک گئے۔

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ جنگ احد 15 شوال ہفتہ کے روز ہوئی تھی، پھر جب اگلا دن اتوار 16 شوال آیا تو رسول اللہ ﷺ کی طرف سے اعلان کرنے والے نے دشمن کا تعاقب کرنے کا اعلان کیا۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ جو لوگ کل ہمارے ساتھ جنگ میں شریک نہیں ہوئے وہ ہمارے ساتھ نہ نکلیں۔ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر ساتھ نکلنے کی اجازت طلب کی تو آپ ﷺ نے انھیں اجازت مرحمت

---

[1] روحاء: یہ مقام مدینہ سے مکہ مکرمہ کی طرف 73 کلومیٹر پر واقع ہے۔ [2] مجمع الزوائد: 121/6.

فرما دی۔ آپ ﷺ کی اس پیش قدمی کا مقصد دشمن کو خوفزدہ کرنا اور اس پر واضح کرنا تھا کہ جنگ احد میں جو صورت حال پیش آئی ہے اس کی بنا پر انھیں دشمن سے مقابلہ کرنے اور اس کی گرفت کرنے میں کسی قسم کی کمزوری کا سامنا نہیں ہے۔ [1]

رسول اللہ ﷺ کے جاں نثار ساتھیوں نے جہاد کی پکار پر دوبارہ لبیک کہا۔ حتی کہ زخموں سے چور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی اس مہم سے پیچھے نہ رہے۔ بنوعبد الأشہل سے تعلق رکھنے والے ایک صحابی بیان کرتے ہیں کہ میں اور میرا بھائی دونوں جنگ احد میں شریک ہوئے۔ جب جنگ سے لوٹے تو زخموں سے نڈھال تھے، دریں اثنا اعلان کرنے والے نے دشمن کا تعاقب کرنے کی صدا دی۔ ہم دونوں میں سے ایک نے دوسرے سے کہا: ''کیا رسول اللہ ﷺ کی معیت میں ہم غزوے میں شریک ہونے کی سعادت سے محروم رہ جائیں گے؟ اللہ کی قسم! ہمارے پاس تو کوئی سواری بھی نہیں ہے، جبکہ ہم دونوں میں سے ہر ایک کو خاصا گہرا زخم بھی آیا ہے، پھر بھی ہم دونوں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نکل ہی پڑے۔ میں بھائی کی نسبت ذرا کم زخمی تھا۔ میرا بھائی جب زیادہ شکستہ حالت ہو جاتا تو میں اسے کچھ وقت کے لیے اٹھا لیتا اور کچھ دیر وہ پیدل چلتا۔ آخر ہم دونوں مسلمانوں کے ساتھ منزلِ مقصود تک پہنچ گئے۔'' [2]

رسول اللہ ﷺ حمراء الأسد تک گئے اور مشرکوں کے لشکر کے قریب پہنچ گئے۔ تین دن تک مشرکوں کو چیلنج کے طور پر وہاں قیام پذیر رہے مگر دشمن کو سامنا کرنے اور مقابلے میں آنے کی جرأت نہ ہوئی۔ آپ ﷺ نے صحابہ کو خوب آگ جلانے کا حکم دیا جس کے نتیجے میں وہ بیک وقت پانچ سو (500) الاؤ روشن کر دیتے تھے۔ [3]

1 البداية والنهاية: 50/4، والسيرة النبوية لابن هشام: 107/3، ودلائل النبوة للبيهقي: 314/3.
2 البداية والنهاية: 50/4. 3 غزوة أحد لأبي فارس، ص: 144، بحوالہ الطبقات الكبرٰى لابن سعد: 43/2.

معبد بن ابو معبد خزاعی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر مسلمان ہوئے تو آپ ﷺ نے ان سے فرمایا کہ وہ ابوسفیان کے پاس جائیں اور اس کی حوصلہ شکنی کریں۔ حضرت معبد رضی اللہ عنہ اسے روحاء میں جا ملے۔ اسے معبد رضی اللہ عنہ کے مسلمان ہونے کا علم نہ تھا۔ ابوسفیان نے معبد سے پوچھا: ''انھیں پیچھے کس حال میں چھوڑ کر آئے ہو؟'' انھوں نے کہا: ''محمد (ﷺ) اور اس کے ساتھی تم لوگوں پر سخت تاؤ میں ہیں اور وہ اپنے ساتھیوں کی ایک کثیر تعداد کے ساتھ، جس کی مثال اب تک دیکھنے میں نہیں آئی، نکلے ہیں۔ احد میں پیچھے رہ جانے والے بھی اب آگئے ہیں اور جنگ سے پیچھے رہ جانے پر بڑے سخت نادم ہیں۔'' ابوسفیان بولا: ''تو پھر آپ کی کیا رائے ہے؟'' معبد نے جواب دیا: ''مجھے امید نہیں کہ ان کے سواروں کی پیشانیاں اس ٹیلے کے پیچھے سے نمودار ہونے سے بیشتر تم یہاں سے کوچ کرسکو گے۔''[1]

ابوسفیان کہنے لگا: ''اللہ کی قسم! اب تو ہم نے ان پر دوبارہ حملہ کرنے کا عزم کرلیا ہے تاکہ ان کی جڑ کاٹ کر رکھ دیں۔'' معبد نے جواباً کہا: ''میں تمھیں اس سے باز رہنے کا مشورہ دیتا ہوں۔ اللہ کی قسم! جو کچھ میں نے دیکھا میں نے اس (سے مرعوب ہوکر اس) کے بارے میں چند شعر بھی کہے ہیں۔'' ابوسفیان نے پوچھا: ''آپ نے کیا شعر کہے ہیں؟'' معبد نے یہ شعر سنائے:

''قریب تھا کہ آوازوں کے شوروغل سے میری سواری خوف زدہ ہوکر گرجائے
جب زمین پر گروہ در گروہ گھوڑوں کا سیلاب اُمڈ آیا۔
یہ گھوڑے جنگ کے موقع پر اپنے ان سواروں کو نہایت تیزی سے لے جانے والے
تھے جو لمبے قد والے ہیبت ناک شیروں کی طرح ہیں جو بزدل ہیں نہ غیر مسلح۔
جب یہ گھوڑے شکست نہ کھانے والے سردار کی معیت میں آگے بڑھ رہے تھے۔

[1] زاد المعاد:245/3.

میں تیزی سے دوڑا، جبکہ زمین مجھے ہلتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔
جب بطحاء کی سرزمین ان گروہوں سے جوش کھا رہی تھی تو میں نے کہا: ''ابن حرب کا برا ہو کہ وہ تم سے جنگ کرے۔''
میں ہر صاحبِ عقل و خرد کو احمد (ﷺ) کے اس لشکر سے ڈراتا ہوں جو لشکر حقیر و قصیر لوگوں پر مشتمل نہیں۔ اور میں جس چیز سے ڈرا رہا ہوں اسے محض زبانی جمع خرچ نہ سمجھا جائے۔''[1]

یہ سن کر ابوسفیان اپنے ساتھیوں سمیت اپنے ارادے سے پلٹ گیا۔

ابوسفیان نے واپس پلٹ جانے کی خفت مٹانے اور مسلمانوں کو مرعوب کرنے کے لیے ان پر ایک اعصابی جنگ مسلط کرنے کی کوشش کی، چنانچہ اس وقت مکی لشکر کے پاس سے تجارت کی غرض سے مدینہ آنے والا عبدالقیس کا ایک قافلہ گزر رہا تھا۔ ابوسفیان نے ان کے ذریعے رسول اللہ ﷺ کی طرف پیغام بھیجا کہ انھیں خبردار کردو کہ ہم نے محمد (ﷺ) اور آپ کے ساتھیوں پر دوبارہ حملہ آور ہونے کا عزم کرلیا ہے تاکہ ان کا نام ونشان مٹا دیں۔ اس پیغام پہنچانے پر ابوسفیان نے اس وفد سے وعدہ کیا کہ جب وہ اس کے پاس عکاظ آئیں گے تو وہ انھیں اس کے بدلے میں کِشمِش دے گا۔

یہ قافلہ آپ ﷺ کو حمراء الاسد میں ملا اور قافلے والوں نے ابوسفیان کا پیغام پہنچا دیا۔ آپ ﷺ نے اور مسلمانوں نے سن کر کہا:

«حَسْبُنَا اللّٰهُ وَ نِعْمَ الْوَكِيلُ»

''اللہ ہمارے لیے کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے۔''[2]

مسلمان حمراء الاسد میں مقیم رہے، جبکہ قریش نے جنگ سے بچاؤ اور واپسی کو ترجیح دی اور واپس مکہ چلے گئے، بعدازاں مسلمان بھی فخر سے سربلند کیے، ہلکے پھلکے مدینہ واپس

[1] البداية والنهاية: 4/51. [2] تاريخ الإسلام للذهبي: 2/226.

آ گئے (گویا اس اقدام سے انھوں نے) شکست کی عار کو کسی حد تک کم کر لیا، چنانچہ باعزت سر اٹھائے ہوئے، مشرکوں کی فتح کو خاک میں ملائے ہوئے اور اعصابی جنگ میں انھیں شکست سے دوچار کیے ہوئے مدینہ منورہ میں داخل ہوئے۔ اور اس طرح منافقینِ مدینہ اور یہود کی ساری خوشی خاک میں ملا دی۔

قرآن پاک نے درج ذیل آیات مبارکہ میں اسی سرد جنگ کے اثرات کا تذکرہ فرمایا ہے، ارشاد ہے:

﴿ اَلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ مِنْۢ بَعْدِ مَآ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ ۛؕ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا مِنْهُمْ وَاتَّقَوْا اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝ اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا ۖۗ وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ ۝ فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ ۙ وَّاتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَظِيْمٍ ۝ اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّيْطٰنُ يُخَوِّفُ اَوْلِيَآءَهٗ ۪ فَلَا تَخَافُوْهُمْ وَخَافُوْنِ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ ﴾

”یہی لوگ ہیں جنھوں نے جنگ میں زخم لگنے کے بعد اللہ اور اس کے رسول کا حکم مانا، ان میں سے جو لوگ نیکو کار اور پرہیز گار ہیں، ان کے لیے بہت بڑا اجر ہے۔ انھی سے لوگوں نے کہا تھا کہ تمھارے خلاف ایک بڑی فوج جمع ہوئی ہے، پس تم ان سے ڈرو، تب اس بات نے ان کے ایمان میں اضافہ کر دیا اور انھوں نے کہا: ”ہمیں اللہ کافی ہے اور وہ بہت اچھا کارساز ہے۔ پھر وہ اللہ کی نعمت اور فضل کے ساتھ لوٹے، انھیں کوئی نقصان نہ پہنچا اور انھوں نے پیروی کی اللہ کی رضا کی اور اللہ بہت بڑے فضل والا ہے۔ یہ تو شیطان ہی ہے جو اپنے دوستوں سے ڈراتا ہے، پس تم ان سے نہ ڈرو اور صرف مجھ سے ڈرو اگر تم مومن ہو۔“ [1]

[1] آل عمرٰن 3:172-175۔

مدینہ واپسی سے پہلے شاعر ابوعزہ جُمَحی رسول اللہ ﷺ کی گرفت میں آ گیا۔ اسے باندھ کر قتل کر دیا گیا۔ یہ وہ شخص تھا جسے آپ ﷺ نے جنگ بدر میں بلا معاوضہ احسان کرتے ہوئے اس شرط پر چھوڑ دیا تھا کہ وہ آپ ﷺ کے خلاف کسی سے تعاون نہیں کرے گا مگر وہ وعدہ خلافی کرتے ہوئے پھر جنگ احد میں شریک ہو گیا۔ اس نے اب پھر بچ نکلنے کی کوشش کی، وہ کہنے لگا: ''اے اللہ کے رسول! میری لغزش سے درگزر کریں۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: «لَا وَاللّٰهِ! لَا تَمْسَحُ عَارِضَيْكَ بِمَكَّةَ وَتَقُولُ: خَدَعْتُ مُحَمَّدًا مَرَّتَيْنِ، اِضْرِبْ عُنُقَهُ يَا زُبَيْرُ!» ''اب ہرگز ایسا نہیں ہو سکتا مبادا تم مکہ جا کر اپنے رخسار پر ہاتھ پھیرو اور کہو میں نے محمد (ﷺ) کو دو مرتبہ دھوکا دیا۔ اے زبیر! اس کی گردن اُڑا دو۔'' تو انھوں نے اس کی گردن مار دی۔[1]

اس موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا: «لَا يُلْدَغُ الْمُؤْمِنُ مِنْ جُحْرٍ وَّاحِدٍ مَّرَّتَيْنِ» ''مومن ایک سوراخ سے دو مرتبہ نہیں ڈسا جاتا۔''[2]

یہ جملہ قبل ازیں متعارف نہ تھا لیکن بعد میں یہ ضرب المثل بن گیا۔ رسول اللہ ﷺ کا فیصلہ شرعی سیاست کا حصہ تھا کیونکہ یہ شاعر فسادی اور فتنہ پرور تھا۔ اس پر دوبارہ احسان کرنا گویا مسلمانوں کے خلاف اسے جنگ اور فتنے کا ایک اور موقع فراہم کرنا تھا۔ ابوعزہ جمحی کے سوا مشرکوں میں سے کوئی بھی قید نہ ہوا تھا۔[3]

جنگ احد میں ستر شہداء کو شہادت نصیب ہوئی، یہ فرمان اس کی تائید کرتا ہے:

﴿اَوَلَمَّآ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَيْهَا قُلْتُمْ اَنّٰى هٰذَا ۭ قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾

1 الطبقات الكبرىٰ لابن سعد: 43/2، والسنن الكبرىٰ للبيهقي: 65/9، والسيرة النبوية لابن هشام: 116/3. 2 صحيح البخاري، حديث: 6133، وصحيح مسلم، حديث: 2998. ملحوظہ: صحیحین میں اس حدیث مبارکہ کے اس موقع پر وارد ہونے کا ذکر نہیں ہے، البتہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ابن اسحاق کی مغازی اور سیرۃ ابن ہشام کے حوالے سے سعید بن مسیّب کی مرسل روایت ذکر کی ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجیے: فتح الباري، شرح الحديث: 6133. 3 البداية والنهاية: 53/4.

”کیا جب تمھیں (احد میں) مصیبت پہنچی تو تم کہنے لگے کہ یہ کہاں سے آئی ہے؟ حالانکہ (بدر میں) تم نے اس سے دگنی مصیبت کافروں کو پہنچائی تھی۔ کہہ دیجیے کہ یہ مصیبت تمھاری اپنی لائی ہوئی ہے، بے شک اللہ ہر چیز پر خوب قادر ہے۔“[1]

یہ آیت شہدائے احد کے بارے میں مسلمانوں کو تسلی دینے کے لیے نازل ہوئی۔ ابنِ عطیہ کہتے ہیں: ”مشرکوں نے احد کے معرکے میں ستر مسلمان شہید کیے۔ مسلمانوں نے بھی بدر کے موقع پر ستر مشرک قتل اور ستر ہی قید کیے تھے۔“[2]

معرکۂ احد میں مشرکین کے مقتولین کی تعداد بائیس تھی۔[3]

غزوۂ حمراء الاسد کے اہم مقاصد: غزوۂ حمراء الاسد میں مشرکوں کا پیچھا کرنے میں درج ذیل کئی ایک اہم مقاصد پنہاں تھے:

① غزوۂ احد کے شرکاء کے دلوں پر شکست کا جو احساس ہوا تھا وہ احساس ان کے دلوں میں نہ بیٹھ جائے۔

② مسلمانوں کو یہ باور کرانا تھا کہ جب بھی وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے کمزوری اور بزدلی کا لباس اتار پھینکیں گے تو وہی دشمن پر غالب ہوں گے۔

③ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اپنے دشمن کے خلاف جنگ پر جرأت دلانا۔

④ انھیں بتانا مقصود تھا کہ معرکے میں جو کچھ ہوا وہ اللہ کی حکمت اور ارادے کا تقاضا تھا جو صرف آزمائش اور امتحان کے لیے تھا، جبکہ درحقیقت وہی طاقتور ہیں اور ان کے مخالفین محض ظاہری غلبہ پا سکے ہیں، حالانکہ وہی دراصل کمزور ہیں۔[4]

اسی طرح رسول اللہ ﷺ کے حمراء الاسد تک پیش قدمی سے اعصابی جنگ بپا کرنے کی اہمیت واضح ہوتی ہے کہ اس کا مخالف پر کتنا نفسیاتی اثر پڑتا ہے۔ آپ ﷺ بمع لشکر

---

[1] آل عمرٰن 165:3. [2] المحرر الوجيز لابن عطية: 411/3. [3] مرويات غزوة أحد لحسين أحمد الباكري، ص:367-369. [4] تفسير في ظلال القرآن لسيد قطب: 519/1.

حمراء الاسد تک گئے۔ وہاں تین دن ٹھہرے۔ آگ کے الاؤ روشن کرنے کا حکم دیا، وہ آگ دور سے نظر آتی تھی اور پورا علاقہ روشن ہو جاتا۔ حتی کہ قریش سمجھنے لگے کہ مسلمانوں کا لشکر بہت بڑی تعداد میں ہے جس کا مقابلہ اس کے بس کی بات نہیں، چنانچہ وہ ایسی کیفیت میں پلٹے کہ وہ انتہائی مرعوب تھے۔ [1]

ابن سعد کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ صحابہ سمیت حمراء الاسد جا خیمہ زن ہوئے۔ مسلمان وہاں آنے والی راتوں میں پانچ سو الاؤ روشن کرتے تاکہ دور سے نظر آئیں۔ اس طرح ان کے لشکر کی آوازیں اور آگ کی روشنی ہر جانب پھیل گئی تو اللہ تعالیٰ نے اس سے مسلمانوں کے دشمن کو رسوا اور نامراد فرما دیا۔ [2]

جنگِ احد میں مسلمان عورتوں کی شرکت

غزوۂ احد وہ پہلا معرکہ تھا جس میں مسلمان عورتیں بھی شریک ہوئیں، چنانچہ متعدد بہادر عورتیں اور ان کی ایمانی صداقت اس جنگ میں سامنے آئی۔ وہ پیاسوں کو پانی پلانے اور زخمیوں کی دیکھ بھال کے لیے گھروں سے نکلیں۔ کئی ایک نے تو رسول اللہ ﷺ پر مشرکوں کے حملے کو آگے بڑھ کر روکا۔ جنگ احد میں شریک مسلمان عورتوں میں ام المؤمنین عائشہ صدیقہ بنت صدیق، ام عمارہ، حمنہ بنت جحش اسدیہ، ام سلیط، ام سُلَیم رضی اللہ عنہن اور کچھ انصار کی عورتیں شامل تھیں۔ [3]

ثعلبہ بن ابو مالک بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے کچھ چادریں مدینہ کی عورتوں کو تقسیم کیں۔ ایک عمدہ چادر بچ گئی۔ ان کے پاس بیٹھے چند لوگوں نے کہا: ”اے امیر المؤمنین! یہ چادر نبی کریم ﷺ کی نواسی کو دے دیجیے۔ وہ آپ کی بیوی بھی ہیں۔“ اس سے ان کی مراد ام کلثوم بنت علی رضی اللہ عنہا تھیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ”نہیں ام سلیط رضی اللہ عنہا

1 غزوة أحد لأبي فارس، ص:51. 2 الطبقات الكبرىٰ لابن سعد:49/2. 3 صحيح مسلم، حديث:1809-1811، یہاں چند مذکورہ صحابیات رضی اللہ عنہن کا تذکرہ نہیں ہے۔

اس کی زیادہ حق دار ہے۔'' ام سلیط ایک انصاری خاتون تھیں جنھوں نے رسول اللہ ﷺ کی بیعت کی ہوئی تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''یہ ام سلیط رضی اللہ عنہا احد کے دن پانی کی مشکیں بھر بھر کر ہمارے لیے اٹھا کر لاتی تھیں۔''[1]

خواتین کا مجاہدین کو پانی پلانا: حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب احد کی جنگ ہوئی تو مسلمان شکست کھا کر نبی اکرم ﷺ سے جدا ہو گئے مگر میں نے حضرت عائشہ صدیقہ اور ام سلیم رضی اللہ عنہما کو دیکھا تو وہ دونوں کپڑوں کو سمیٹے ہوئے بڑی تندہی سے جلدی جلدی پانی کی مشکیں اپنی پیٹھ پر لا رہی تھیں۔ وہ مسلمانوں کو پانی پلا کر پھر لوٹ جاتیں اور مشکیں بھر کر لاتیں اور مسلمانوں کو پلا دیتیں۔ مجھے ان کے پاؤں کی پازیب بھی نظر آئی تھی۔[2]

حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں نے حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا اور عائشہ رضی اللہ عنہا کو دیکھا کہ انھوں نے احد کے دن اپنی پیٹھوں پر مشکیزے اٹھا رکھے تھے۔ اور حمنہ بنت جحش رضی اللہ عنہا پیاسوں کو پانی بھی پلا رہی تھیں اور زخمیوں کی مرہم پٹی بھی کر رہی تھیں، جبکہ ام ایمن رضی اللہ عنہا زخمیوں کو پانی پلانے میں مصروف تھیں۔[3]

خواتین اسلام کی طرف سے زخمیوں کی مرہم پٹی اور غمخواری: حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب بھی کسی جنگ میں تشریف لے جاتے آپ ام سلیم رضی اللہ عنہا اور انصار کی کچھ دیگر عورتوں کو ساتھ لے جاتے جو مجاہدین کو پانی پلاتیں اور زخمیوں کی مرہم پٹی کرتیں۔[4]

امام عبدالرزاق امام زہری سے بیان کرتے ہیں کہ عورتیں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جنگ میں شریک ہوتیں اور جنگجوؤں کو پانی پلاتیں اور زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی تھیں۔[5]

حضرت ربیع بنت معوذ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ ہم (غزوات میں) رسول اللہ ﷺ کے ساتھ

---

1 صحيح البخاري، حديث:2881 و4071. 2 صحيح البخاري، حديث:2880. 3 المغازي للواقدي:249/1. 4 صحيح مسلم، حديث: 1810. 5 فتح الباري، شرح الحديث:2880.

ہوتیں اور لوگوں کو پانی پلاتیں، زخمیوں کی مرہم پٹی کرتیں اور جو خوش نصیب شہید ہو جاتے انھیں مدینہ منتقل کرتیں۔[1]

ایک روایت میں ہے: ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جہاد میں شریک ہوتیں، پھر ہم لوگوں کو پانی پلاتیں، ان کی خدمت کرتیں اور زخمیوں اور شہید ہونے والوں کو مدینہ منورہ لے آتیں۔[2]

حضرت ابو حازم فرماتے ہیں کہ میں نے سہل بن سعد رضی اللہ عنہ کو اس وقت کہتے ہوئے سنا جب ان سے رسول اللہ ﷺ کے زخمی ہونے کا حال پوچھا گیا۔ انھوں نے کہا: ''دیکھو، اللہ کی قسم! میں خوب جانتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ کا زخم کون دھو رہا تھا اور کون پانی ڈال رہا تھا۔ اور کون سی دوا لگائی گئی؟'' پھر وہ کہنے لگے: ''آپ ﷺ کی صاحبزادی سیدہ فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا زخم دھو رہی تھیں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ ڈھال سے پانی ڈال رہے تھے۔ جب حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے دیکھا کہ جوں جوں پانی ڈالتے ہیں خون زیادہ ہو رہا ہے تو انھوں نے بوریے کا ایک ٹکڑا لیا اور اس کو جلا کر زخم پر چپکا دیا۔ تو خون اسی وقت رک گیا۔''[3]

اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کا تلوار کے ذریعے دفاع: غزوۂ احد کے موقع پر خواتین میں سے صرف ام عمارہ نُسیبہ بنت کعب مازنیہ رضی اللہ عنہا ہی لڑائی میں شریک ہوئیں۔ حضرت ضمرہ بن سعید اپنی دادی جان کی اس شرکت کا حال خود بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں: ''ام عمارہ رضی اللہ عنہا غزوۂ احد میں شریک ہوئیں اور پانی پلا رہی تھیں۔'' وہ کہتی ہیں: ''میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ آج نُسیبہ بنت کعب کی کارکردگی کئی ایک مردوں سے بہتر رہی ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ان کا مشاہدہ کیا تھا کہ وہ اپنی کمر پر پٹکا باندھے سخت جنگ لڑ رہی تھیں۔ یہاں تک کہ انھیں تیرہ (13) زخم آئے۔ وہ جب فوت ہوئیں انھیں غسل دینے والوں میں سے میں بھی تھا۔ میں نے ایک ایک زخم گنا تو (مکمل)

1 صحيح البخاري، حديث:2882. 2 صحيح البخاري، حديث:2883. 3 صحيح البخاري، حديث:4075.

تیرہ زخم تھے۔ وہ کہا کرتی تھیں کہ ابن قمۂ کے میرے کندھے پر تلوار مارنے کی صورت اب بھی میری نظروں کے سامنے ہے۔ یہ باقی زخموں کی نسبت گہرا زخم تھا جس کا علاج وہ ایک سال تک کرتی رہیں۔

جب آپ ﷺ نے حمراء الاسد جانے کا اعلان فرمایا تو انھوں نے اپنے کپڑے باندھے لیکن زیادہ خون بہہ جانے کی بنا پر ساتھ نہ جا سکیں۔ ہم رات بھر زخموں کی ٹکور کرتے رہے۔ آپ ﷺ جب غزوۂ حمراء الاسد سے واپس تشریف لائے تو گھر پہنچنے سے پہلے ہی ان کے بھائی حضرت عبداللہ بن کعب مازنی رضی اللہ عنہ کو ان کے متعلق دریافت کرنے کے لیے آپ ﷺ نے بھیجا۔ انھوں نے واپسی پر اپنی بہن سیدہ نسیبہ رضی اللہ عنہا کی صحت و سلامتی کی خبر پہنچائی تو آپ ﷺ اس سے خوش ہو گئے۔''[1]

استاذ حسین باکری حضرت نُسَیبہ بنت کعب رضی اللہ عنہا کے جنگ میں شریک ہونے پر ان الفاظ میں تبصرہ کرتے ہیں کہ مردوں کے ساتھ جنگ میں شریک ہونے کے لیے حضرت نُسَیبہ کے واقعے کے علاوہ کوئی مثال نہیں ملتی۔ ان کا لڑنا بھی اضطراری اور مجبوری کی حالت میں تھا۔ وہ اس طرح کہ جب انھوں نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ لوگوں کے ادھر ادھر ہونے کی بنا پر خطرے میں گھر گئے ہیں تو ایسی صورتِ حال میں مرد ہو یا عورت ہر ایک کے لیے اسلحہ اٹھانا ضروری ہو گیا تھا۔[2]

غزوۂ احد کے موقع پر عورتوں کی جنگ میں شرکت کے حوالے سے مروی روایات پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر اکرم ضیاء عمری رقمطراز ہیں: ''یہ روایات اس امر کی دلیل ہیں کہ ضرورت و مجبوری کے وقت عورتوں سے مدد لی جا سکتی ہے، مثلاً: زخمیوں کی دیکھ بھال اور ان کی خدمت خاطر کرنا لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ پردے کا مکمل اہتمام ہو اور

---

1 سير أعلام النبلاء: 278/2، والمغازي للواقدي: 270,269/2. 2 مرويات غزوة أحد لحسين أحمد الباكري، ص: 254.

انھیں تحفظ فراہم کیا جائے اور ان کے حوالے سے کسی قسم کے فتنے کا ڈر بھی نہ ہو۔ اسی طرح اگر دشمن ان کے مقابلے میں آجائے تو انھیں دفاع کا مکمل حق ہے۔ یہ بات مسلم ہے کہ جہاد صرف مردوں پر فرض ہے، سوائے اس حالت کے کہ دشمن مسلم علاقوں پر دھاوا بول دے تو ایسی حالت میں مرد وزن ہر ایک پر قتال واجب ہو جاتا ہے۔''[1]

استاذ محمد احمد باشمیل کا خیال ہے کہ غزوۂ احد پہلی جنگ تھی جس میں کسی مسلمان عورت نے مشرکوں سے جنگ کی ہو۔ اور یہ بات بھی ثابت شدہ ہے کہ صرف ایک خاتون ہی اس معرکے میں شامل ہوئی تھیں اور وہ بھی رسول اللہ ﷺ کے دفاع کے لیے اور یہ بات بھی واضح ہے کہ جو عورت جنگ میں شریک ہوئی وہ جنگ کی غرض سے نہیں نکلی تھی اور نہ ہی وہ مردوں کی طرح اسلحے سے لیس تھی۔ بلکہ وہ تو صرف یہ مشاہدہ کرنے کے لیے گئی تھیں کہ دیکھیں لوگ کس حالت میں ہیں تاکہ وہ ممکنہ حد تک مسلمانوں کا تعاون کرسکیں، مثلاً: زخمیوں کو پانی پلانا وغیرہ۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی یاد رہے کہ جنگ احد میں شریک ہونے والی یہ خاتون ادھیڑ عمر تھیں اور جنگ میں اپنے خاوند اور دو بیٹوں کے ہمراہ روانہ ہوئی تھیں جو اس لشکر کا حصہ تھے جنھوں نے قتال میں حصہ لیا تھا۔

علاوہ ازیں اس صحابیہ کی اخلاقی اور دینی اعتبار سے اعلیٰ تربیت بھی پیشِ نظر رہنی ضروری ہے۔ ان سب اوصاف کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس جلیل القدر صحابیہ پر اس زمانے کی فوجی عورتوں کو قطعاً قیاس نہیں کیا جاسکتا جو جنگی لباس زیب تن کرتی ہیں اور فتنے اور برائی پر برانگیختہ کرنے کا باعث بنتی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ انھیں ہر دم مردوں کے سامنے اپنے اظہار کی چاہت رہتی ہے۔ کہاں یہ انتہائی پستی اور کہاں وہ انتہائی بلندی۔

چہ نسبت خاک را بہ عالمِ پاک؟

اسی طرح اُس زمانے کے مردوں کی ذکاوت، استقامت، پاکدامنی اور مردانگی پر اس

[1] السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري: 391/2.

زمانے کے مردوں کو بھی قیاس نہیں کیا جاسکتا۔

جنگ احد میں شریک جملہ جنگجو جن کے ساتھ یہ خاتون شریک جنگ تھیں وہ اس امت کے ایسے منتخب کردہ اشخاص تھے جو امت کی عظمت کی دلیل، خودداری اور وقار کی علامت اور استقامت کے انمٹ نقوش تھے، لہٰذا اس ایک صحابیہ کو مثال بنا کر مطلقاً اس زمانے میں عورت کا فوج میں شراکت کے جواز کا شرعاً قانون نہیں بنایا جاسکتا کہ وہ مرد کے شانہ بشانہ لشکر کا حصہ بن کر جنگ لڑے۔ اس صورت میں یہ قیاس مع الفارق ہے اور قطعی طور پر باطل ہے۔ [1]

صحابیات رضی اللہ عنہن کے صبر کی نادر مثالیں

حضرت صفیہ بنت عبد المطلب رضی اللہ عنہا: جب ان کے بھائی حمزہ بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ جنگِ احد میں شہید ہوگئے تو یہ انھیں دیکھنے کے لیے آگے بڑھیں۔ مشرکوں نے سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ کا مثلہ کردیا تھا۔ ان کی ناک کاٹ دی، بطن پھاڑ دیا، کان الگ کردیے اور شرمگاہ بھی کاٹ دی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صفیہ رضی اللہ عنہا کے فرزند حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ سے کہا:

«اِلْقَهَا، فَارْجِعْهَا لَا تَرٰى مَا بِأَخِيهَا»

''حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا سے آگے بڑھ کر ملو اور انھیں واپس کردو۔ جو کچھ ان کے بھائی کے ساتھ ہوا ہے اسے وہ نہ دیکھیں۔''

حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے اپنی والدہ صاحبہ سے عرض کیا: ''اماں جان! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ کو حکم دیتے ہیں کہ آپ واپس چلی جائیں۔'' انھوں نے دریافت کیا: ''ایسا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کس بنا پر فرمایا ہے؟ مجھے یہ معلوم ہو چکا ہے کہ میرے بھائی کا مثلہ کیا گیا ہے اور یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے راستے میں ہوا ہے جو کچھ بھی ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس پر رضا کی توفیق بخشی ہے۔ اللہ نے چاہا تو میں ضبط اور تحمل سے کام لوں گی اور صبر کا دامن نہیں چھوڑوں

[1] غزوة أحد لأحمد باشميل، ص:171-173.

گی۔'' حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر ساری بات آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے گوش گزار کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «خَلِّ سَبِيلَهَا» ''ان کا راستہ چھوڑ دو۔'' حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی لاش کے پاس آئیں۔ ان کی طرف دیکھتی رہیں، ان کے لیے اللہ سے دعا مانگی اور إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ پڑھا اور اللہ سے ان کے لیے بخشش مانگتی رہیں۔[1]

حضرت حمنہ بنت جحش اسدیہ رضی اللہ عنہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شہداء کی تدفین سے فارغ ہو کر اپنے گھوڑے پر سوار ہوئے اور اپنے جاں نثار ساتھیوں کے ہمراہ مدینہ منورہ کا رُخ فرمایا۔ راستے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت حمنہ بنت جحش رضی اللہ عنہا ملیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا:

«يَا حَمْنَةُ! احْتَسِبِي!» ''اے حمنہ! اللہ تعالیٰ سے اجر و ثواب کی امید رکھو۔''

انھوں نے عرض کی: ''کس کے متعلق؟''

فرمایا: «أَخَاكِ عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ جَحْشٍ» ''اپنے بھائی عبداللہ بن جحش کے بارے میں۔''

حمنہ رضی اللہ عنہا نے إِنَّا لِلّٰهِ وَ إِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ پڑھا اور دعائے مغفرت کی۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھی سے پھر فرمایا: «يَا حَمْنَةُ! احْتَسِبِي!» ''حمنہ! اجر و ثواب کی امید رکھو۔''

وہ عرض کرنے لگیں: اے اللہ کے رسول! ''کس کے متعلق؟''

فرمایا: «خَالُكِ حَمْزَةُ بْنُ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ» ''اپنے ماموں حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کے متعلق۔''

کہنے لگیں: إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ۔ اللہ تعالیٰ انھیں معاف فرمائے۔ انھیں شہادت مبارک ہو۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم تیسری بار گویا ہوئے: «يَا حَمْنَةُ! احْتَسِبِي» ''اے حمنہ! اجر و ثواب کی

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 108/3.

امید رکھو۔" عرض کی: "کس کے بارے میں اے اللہ کے رسول؟"

فرمایا: «زَوْجُكِ مُصْعَبُ بْنُ عُمَيْرٍ» "اپنے خاوند مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کے بارے میں۔"

اب انھوں نے انتہائی غم کا اظہار کیا، چیخنے لگیں اور آہ و بکا کرنے لگیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «إِنَّ زَوْجَ الْمَرْأَةِ مِنْهَا لَبِمَكَانٍ» "عورت کے نزدیک اس کا شوہر ایک خصوصی درجہ رکھتا ہے۔"

کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ حمنہ بنت جحش رضی اللہ عنہا اپنے بھائی اور ماموں کی شہادت کی اطلاع پر تو صبر وثبات کا پیکر بنی رہیں مگر اپنے خاوند کی شہادت کی اطلاع پر بلند آواز سے رونے لگیں۔ بعد ازاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حمنہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟

عرض کی: "اے اللہ کے رسول! مجھے ان کے بیٹوں کی یتیمی یاد آئی تو مجھے بہت غم لگا۔"

یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لیے اور ان کی اولاد کے لیے بہتر بدل کی دعا فرمائی۔[1]

بعد ازاں حضرت حمنہ بنت جحش رضی اللہ عنہا نے طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ سے شادی کر لی۔ ان سے محمد اور عمران پیدا ہوئے۔ یہی طلحہ بن عبید اللہ ان کی سابقہ اولاد سے انتہائی صلہ رحمی سے پیش آتے تھے۔[2]

بنو دینار سے تعلق رکھنے والی صحابیہ کا واقعہ: حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بنو دینار کی ایک عورت کے پاس سے گزرے۔ ان کے شوہر، بھائی اور والد جنگ احد میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت میں شہید ہو چکے تھے۔ انھیں ان تینوں کی شہادت کی خبر سنائی گئی تو انھوں نے پوچھا: "یہ تو بتاؤ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا حال ہے؟"

---

[1] سنن ابن ماجه، حديث: 1590، علامہ البانی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو ضعیف کہا ہے۔ وتاریخ الطبري: 532/2، و البداية والنهاية: 47/4، والسيرة النبوية لابن هشام: 104/3، ودلائل النبوة للبيهقي: 301/3، وغزوة أحد لمحمد عيظة بن سعيد، ص: 236. [2] الإصابة: 88/8، وغزوة أحد لأبي فارس، ص: 109.

جواب دیا گیا: ''اے ام فلاں! آپ ﷺ اللہ کے فضل سے خیریت سے ہیں۔ جیسا کہ آپ کی آرزو ہے۔'' خاتون کہنے لگیں: ''رسول اللہ ﷺ کہاں ہیں؟ ذرا میں اپنی آنکھوں سے آپ ﷺ کا دیدار کرلوں۔'' چنانچہ رسول اللہ ﷺ کی طرف اشارہ کر کے انھیں بتا دیا گیا۔ انھوں نے چہرۂ انور دیکھا تو پکار اٹھیں:

«كُلُّ مُصِيبَةٍ بَعْدَكَ جَلَلٌ» ''آپ کے ہوتے ہوئے ہر مصیبت ہیچ ہے۔''[1]

اہل اسلام کے دلوں میں ایمان ایسے ہی اثرات چھوڑتا ہے۔

ام سعد بن معاذ سیدہ کبشہ بنت عبید خزرجیہ رضی اللہ عنہا: حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کی والدہ رسول اللہ ﷺ کی طرف دوڑتی ہوئی آئیں۔ اس وقت آپ ﷺ گھوڑے پر سوار تھے جس کی لگام حضرت سعد رضی اللہ عنہ تھامے ہوئے تھے۔ حضرت سعد عرض کرنے لگے: ''اے اللہ کے رسول! میری والدہ ہیں۔''

آپ ﷺ نے فرمایا: «مَرْحَبًا بِهَا» ''انھیں مرحبا ہو۔''

وہ قریب آئیں، آپ ﷺ کو غور سے دیکھا اور کہنے لگیں:

«أَمَّا إِذْ رَأَيْتُكَ سَالِمًا فَقَدْ أَشْوَتِ الْمُصِيبَةُ»

''جب آپ کو سلامت دیکھ لیا تو میرے لیے ہر مصیبت کمتر ہے۔''

آپ ﷺ نے ان کے بیٹے عمرو بن معاذ رضی اللہ عنہ کی شہادت پر تعزیت کے کلمات ادا فرماتے ہوئے صبر کی تلقین کی۔ بعدازاں آپ ﷺ نے فرمایا:

«يَا أُمَّ سَعْدٍ! أَبْشِرِي وَبَشِّرِي أَهْلِيهِمْ، أَنَّ قَتْلَاهُمْ قَدْ تَرَافَقُوا فِي الْجَنَّةِ جَمِيعًا۔ وَهُمْ اِثْنَا عَشَرَ رَجُلًا۔ وَقَدْ شُفِّعُوا فِي أَهْلِيهِمْ»

''اے ام سعد! تم خوش ہو جاؤ اور شہداء کے گھر والوں کو خوشخبری سنا دو کہ ان کے

[1] دلائل النبوة للبيهقي: 2/302، والبداية والنهاية: 4/48، والسيرة النبوية لابن هشام: 3/105، والمغازي للواقدي: 1/292، وتاريخ الطبري: 2/533.

شہداء سب کے سب جنت میں ہیں۔ وہ بارہ آدمی تھے۔ اور اپنے گھر والوں کے بارے میں ان کی شفاعت قبول کر لی گئی ہے۔''

ام سعد کہنے لگیں: ''اے اللہ کے رسول! ہم راضی ہیں۔ اس عظیم خوشخبری کے بعد ان پر کون روئے گا؟''

پھر عرض کی: ''اے اللہ کے رسول! پسماندگان کے لیے بھی دعا فرمایئے۔''

آپ ﷺ نے فرمایا: «اَللّٰهُمَّ اذْهَبْ حُزْنَ قُلُوبِهِمْ وَاجْبُرْ مُصِيبَتَهُمْ وَ أَحْسِنِ الْخَلَفَ عَلٰى مَنْ خُلِّفُوا» ''اے اللہ! ان کے دلوں کا غم دور فرما، ان کی مصیبت کی تلافی فرما اور پسماندگان کو بہترین بدل سے نواز دے۔''[1]

[1] المغازي للواقدي:1/316,315.

باب 5

غزوۂ احد سے متعلق بعض حکمتیں، عبرتیں اور فوائد

قرآن پاک نے اس معرکے کے ایک ایک پہلو پر روشنی ڈالی ہے۔ غزوۂ احد کے متعلق روایات کی نسبت قرآنی تعبیر ووضاحت بہت دقیق انداز سے کی گئی ہے۔ قرآن پاک کی ان اطمینان بخش، خوش کن، ملامت آمیز، باعث تسکین اور وعظ ونصیحت سے بھرپور آیات کا اسلوب انتہائی عمدہ اور قوی ہے۔ قرآن مجید نے لشکر نبوی کے دلی خیالات کی ترجمانی کی ہے۔ غزوۂ احد کے بیان میں قرآن مجید کا یہ وہ یگانہ اسلوب ہے جس سے کتب سیرت خالی ہیں۔ قرآن کریم نے دلوں میں پوشیدہ ایسے رازوں پر روشنی ڈالی ہے جو بسا اوقات انسان کے تحت الشعور میں چلے جانے کی بنا پر ذہن سے اتر جاتے ہیں۔ قرآن مجید میں غور وفکر کرنے والا اس میں بیان کردہ غزوۂ احد پر تبصرہ پڑھ کر لطافت، گہرائی اور ہمہ جہتی محسوس کرتا ہے۔

سید قطب رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''غزوۂ احد کے بیان میں ہر ایک کے طرز عمل کا اظہار، ہر ایک نقل وحرکت کی اطلاع اور ہر ایک اندیشے اور کھٹکے کی خبر ہے اور اس میں ایسی گہرائی ہے جو دل میں جاگزیں ہوجاتی ہے اور اس میں دل میں چھپے خیالات، پنپنے والے احساسات اور دل پر وارد ہونے والے تصورات کا احاطہ ہے۔ ہم اس منظر کشی میں زندگی کو جلا بخشنے والی قوت، اثر انگیزی اور موزونیت محسوس کرتے ہیں جیسا کہ احساسات کے ساتھ ساتھ ان کی تعبیر اور عکاسی انتہائی حساسیت اور گہرائی سے برابر چل رہی ہے۔ آپ لمبے لمبے

کی اس عکاسی، تعبیر اور تبصرے کو دیکھ کر قطعاً بے حرکت و ساکت نہیں رہ سکتے کیونکہ یہ ایک زندہ تعبیر ہے۔ عین جنگ کے لمحہ بہ لمحہ حالات و واقعات پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اب وقوع پذیر ہو رہی ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اس کے آس پاس اثر آفریں سرگرمیاں، بڑی تیز روشنی اور پر اثر الہامات بھی پھیلتے رہتے ہیں۔''[1]

امت کی تربیت کے لیے رسول اللہ ﷺ کی سرگرمیاں، اسلامی حکومت کا قیام، اللہ تعالیٰ کے دین کو سربلند کرنے کے اقدامات یہ سب کچھ دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ دنیاوی زندگی کے قیام و انصرام کے لیے قرآن پاک کے مفاہیم کا وہ عکس ہے جو آپ ﷺ کے احساسات، افکار اور شعور پر مکمل طور پر حاوی ہو چکا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جنگ احد میں ہونے والی شکست کا اثر زائل کرنے کے لیے قرآن کریم کے منہج کی پیروی کر رہے ہیں۔ اس قرآنی منہج کے متعلق بعض امور و نکات پر ہم روشنی ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں:

غزوۂ احد کے متعلق نازل شدہ آیات کا اسلوب بیان

ان آیات میں سابقہ انبیائے کرام کے پیروکاروں کے حالات کی یاددہانی اور مومنوں کو ایمان کی طرف دعوت دی گئی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عٰقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ○ هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ ○ وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○﴾

''تم سے پہلے بھی ایسے واقعات گزر چکے ہیں، چنانچہ تم زمین میں چل پھر کر دیکھو کہ (نبیوں کو) جھٹلانے والوں کا انجام کیا ہوا؟ یہ (قرآن) لوگوں کے لیے وضاحت اور پرہیزگاروں کے لیے ہدایت اور نصیحت ہے۔ اور تم سستی نہ کرو اور

[1] تفسیر في ظلال القرآن لسید قطب:1/532.

نہ غم کھاؤ، تم ہی غالب رہو گے اگر تم مومن ہو۔“ [1]

ان آیات مبارکہ پر غور کرنے والا یہ بات ضرور پائے گا کہ غزوۂ احد کے امتحان میں شریک ہونے والوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے شیطانی وسوسوں کی کوئی جگہ نہیں چھوڑی بلکہ ان آیات میں انھیں اس انداز سے مخاطب فرمایا، جس سے ان کے دلوں میں امید کی کرن پھوٹی اور انھیں ثابت قدم اور پختہ عزم رہنے کی رہنمائی میسر آئی۔ اور اس رہنمائی سے ان کی اشک شوئی کی اور ان کے غم ہلکے کر دیے۔ [2]

امام قرطبی کا بیان ہے کہ ان آیاتِ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے مومنوں کو تسلی دی گئی ہے۔ [3]

سابقہ آیات میں گزشتہ اقوام کے انجام کے متعلق غور وفکر کی دعوت ہے۔ وہ اقوام جنھوں نے اللہ تعالیٰ کی دعوت کو جھٹلایا اور اس کی نافرمانی کی تو ان کے ظلم اور کفر کی پاداش میں اللہ تعالیٰ کا قانونِ فطرت ان میں کیسے جاری ہوا اور انھیں تہس نہس کر کے رکھ دیا۔

قرآن مجید میں یہاں ﴿ كَيْفَ ﴾ کا لفظ آیا ہے جو استفہام کے لیے مستعمل ہے۔ اس سے جھٹلانے والی قوموں کی حالت کی تصویر کشی کرنا مقصود ہے۔ ان کی یہ حالت حیرت اور تعجب کا باعث بھی ہے اور مومنوں کے لیے عبرت و موعظت کا سامان بھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان جھٹلانے والوں کو اللہ تعالیٰ نے زمین پر جگہ و قدرت عنایت فرمائی، بہت سی نعمتوں سے نوازا مگر انھوں نے ان کی قدر نہ کی تو اللہ تعالیٰ نے انھیں اس سرکشی اور طغیانی کی بنا پر ہلاک کر دیا۔ [4]

اسی طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ○ ﴾

1 آل عمرٰن 3:137-139. 2 حديث القرآن الكريم عن غزوات الرسول ﷺ لأبي بدر محمد بكر آل عابد: 190/1. 3 تفسير القرطبي: 216/4. 4 حديث القرآن عن غزوات الرسول ﷺ لأبي بدر محمد بكر آل عابد: 191/1.

''اور تم سستی نہ کرو اور نہ غم کھاؤ، تم ہی غالب رہو گے اگر تم مومن ہو۔''[1]

اس فرمان میں مسلمانوں کو سستی دور کرنے، بزدلی سے نفرت کرنے، کمزوری سے کنارہ کشی اختیار کرنے اور غم نہ کرنے کی تلقین فرمائی ہے کیونکہ اپنے ایمان کے سبب وہی غالب ہونے والے ہیں۔

مومنوں کو تسلی اور جنگ میں پیدا ہونے والے ناگہانی حالات کی حکمت: ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنْ یَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ ؕ وَتِلْكَ الْاَیَّامُ نُدَاوِلُهَا بَیْنَ النَّاسِ ۚ وَلِیَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَیَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ ؕ وَاللّٰهُ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیْنَ ○ وَلِیُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَیَمْحَقَ الْكٰفِرِیْنَ ○ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا یَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِیْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَیَعْلَمَ الصّٰبِرِیْنَ ○ وَلَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَلْقَوْهُ فَقَدْ رَاَیْتُمُوْهُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ○﴾

''اگر تمھیں (احد میں) زخم لگے ہیں تو ایسے ہی زخم (بدر میں) کافروں کو بھی لگ چکے ہیں۔ ہم ان دنوں کو لوگوں کے درمیان ادل بدل کرتے رہتے ہیں۔ اور (تمھیں یہ زخم اس لیے لگے کہ) اللہ جاننا چاہتا تھا کہ کون ایمان والے ہیں؟ اور وہ تم میں سے بعض کو شہادت کا مرتبہ دینا چاہتا تھا اور اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔ اور (ایک وجہ یہ تھی کہ) اللہ ایمان والوں کو پاک صاف کر دینا اور کافروں کو مٹا دینا چاہتا تھا۔ کیا تم یہ سمجھ بیٹھے ہو کہ تم (سیدھے) جنت میں داخل ہو جاؤ گے، حالانکہ ابھی اللہ نے یہ تو دیکھا ہی نہیں کہ تم میں سے کون لوگ اس کی راہ میں جانیں لڑانے والے اور صبر کرنے والے ہیں۔ تحقیق تم جنگ سے پہلے ہی (شہادت کی) موت کی خواہش کرتے تھے، چنانچہ پس اب تم نے اسے اپنی آنکھوں سے

[1] آل عمرٰن 3:139۔

اپنے سامنے دیکھ لیا ہے۔''[1]

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے واضح فرمادیا ہے کہ شہادتوں اور آنے والے زخموں کو دشمن کے خلاف جہاد کی کوششوں میں اثر انداز نہیں ہونا چاہیے۔ وہ اس لیے کہ جس طرح انھیں زخم پہنچے ہیں دشمن کو بھی تو اسی طرح پہلے سے زخم پہنچ چکے ہیں، لہٰذا اگر وہ اپنی گمراہی اور برے انجام کے باوجود جنگ سے کنارہ کش نہیں ہوئے تو تم حق پر قائم ہونے اور بہتر انجام کی امید رکھتے ہوئے جنگ سے پیچھے نہ ہٹنے یا جنگ میں سستی کا مظاہرہ نہ کرنے کے زیادہ حقدار ہو۔[2]

صاحبِ ''کشاف'' امام زمخشری رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ آیت مبارکہ کا مفہوم یہ ہے کہ اگر انھوں نے احد کے دن تمھیں نقصان پہنچایا ہے تو تم نے بھی اس سے پہلے بدر کے دن انھیں نقصان پہنچایا تھا۔ بدر کے دن پہنچنے والے نقصان نے ان کے دلوں کو نہ کمزور کیا اور نہ ہی تمھارے ساتھ جنگ میں دو دو ہاتھ کرنے سے روکا ہے، لہٰذا تم تو کمزوری نہ دکھانے کے زیادہ حقدار ہو۔[3]

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ''احد کا دن بدر کے دن کا بدلہ تھا۔ احد کے دن کئی مومن شہید ہوئے جنھیں اللہ تعالیٰ نے شہادت کے لیے چن لیا اور بدر کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مشرکوں پر غالب آئے تھے۔ اور مشرکوں کو زیر کرلیا تھا۔''[4]

اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿إِنْ يَمْسَسْكُمْ قَرْحٌ ......﴾ کا جوابِ شرط محذوف ہے، عبارت اس طرح ہے: «إِنْ يَمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَاصْبِرُوا عَلَيْهِ وَاعْقِدُوا عَزْمَكُمْ عَلٰى قِتَالِ أَعْدَائِكُمْ، فَقَدْ مَسَّهُمْ قَرْحٌ مِّثْلُهُ قَبْلَ ذَالِكَ» ''اگر تمھیں زخم آیا ہے تو اس پر صبر کرو۔ اور دشمن کے خلاف جنگ کے لیے پختہ عزم رہو۔ انھیں بھی تو اس سے پہلے ایسا ہی زخم پہنچ چکا ہے۔''

1 آل عمرٰن 3:140-143. 2 تفسیر الرازي: 14/9. 3 تفسیر الکشاف: 465/1. 4 تفسیر الرازی: 105/4.

جنگ احد میں مسلمانوں کو پہنچنے والا دکھ زمانۂ حال کے قریب ہی تھا، اس کی بنا پر فعل مضارع ﴿يَمْسَسْكُمْ﴾ سے تعبیر کیا گیا ہے اور مشرکوں کو چونکہ بدر میں شکست ہوئی تھی اور اسے سال سے اوپر عرصہ گزر چکا تھا، لہٰذا اسے فعل ماضی ﴿مَسَّ﴾ سے تعبیر فرمایا گیا۔

اور ارشاد باری تعالیٰ: ﴿وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ﴾ دنیا میں اللہ تعالیٰ کے جاری و ساری قانون کی وضاحت ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ احد میں مومنوں کو پہنچنے والے دکھ پر تسلی بھی دی گئی ہے۔[1]

اور ارشاد باری تعالیٰ: ﴿وَلِيَعْلَمَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا﴾ کے مفہوم کو امام قرطبی یوں بیان کرتے ہیں: ''یہ حالات کا الٹ پھیر مومن کو منافق سے ممتاز کر کے واضح کرنے کے لیے تھا۔''[2]

اور ارشاد ربانی: ﴿وَيَتَّخِذَ مِنكُمْ شُهَدَاءَ﴾ کے متعلق امام ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں قتل کیے جاتے ہیں اور اس کی خوشنودی کے لیے اپنی جانوں کے نذرانے پیش کرتے ہیں۔[3]

پھر اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے آیت مبارکہ کو ان الفاظ پر ختم فرمایا: ﴿وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ﴾ ''اور اللہ تعالیٰ ظالموں سے محبت نہیں کرتا۔''

بعد ازاں اللہ تعالیٰ نے جنگ احد میں وقوع پذیر ہونے والی مومنوں سے متعلقہ دو حکمتوں کا تذکرہ فرمایا ہے، چنانچہ ارشاد ہے: ﴿وَلِيُمَحِّصَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَيَمْحَقَ الْكَافِرِينَ﴾ اس آیت میں لفظ: ﴿لِيُمَحِّصَ﴾ کو المحص سے لیا گیا ہے جس کے معنی ہیں: ''پاک صاف کرنا، چن لینا۔'' یا پھر یہ لفظ تمحیص بمعنی آزمانا اور امتحان لینا سے ہے۔

﴿يَمْحَقَ﴾ المحق سے ہے۔ اس کے معنی ہیں کسی چیز کو مٹانا اور ختم کر دینا۔

---

1 حديث القرآن الكريم عن غزوات الرسول ﷺ لأبي بدر محمد بكر آل عابد: 195/1. 2 تفسير القرطبي: 218/4. 3 تفسير ابن كثير: 408/1.

امام طبری رحمہ اللہ نے اس کے معنی یہ ذکر کیے ہیں: ''تا کہ جو لوگ اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے مخلصانہ تعلق رکھتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کا امتحان لے، چنانچہ مشرکین کو ان پر غالب کر کے اللہ تعالیٰ نے ان کی آزمائش کی تا کہ مخلص اور صحیح معنوں میں ایمان لانے والے مومن منافقوں سے واضح ہو جائیں۔''[1]

امام ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: ''ارشاد ربانی: ﴿وَلِيُمَحِّصَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا﴾ سے مراد یہ ہے کہ اگر مومنوں کے گناہ ہیں تو انھیں مٹا دے بصورت دیگر انھیں جتنا دکھ پہنچا اس قدر ان کے درجات بلند کر دے۔ اور ارشاد ربانی: ﴿وَيَمْحَقَ الْكَافِرِينَ﴾ سے مراد یہ ہے کہ جب کفار فتح یاب ہوتے ہیں تو سرکشی اور تکبر پر اتر آتے ہیں اور ان کا یہی کردار ان کے نیست و نابود ہونے، ہلاکت سے دوچار ہونے اور تباہ و برباد ہونے کا سبب بن جاتا ہے۔''[2]

اس کا مفہوم یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے غزوۂ احد میں جو کیا وہ مومنوں کو گناہوں سے پاک صاف کرنے کے لیے کیا۔ اور اس میں یہ بھی حکمت تھی کہ وہ منافق جو مومنوں میں گھس چکے ہیں اللہ تعالیٰ انھیں نکال باہر کرے۔ اسی طرح اس میں یہ حکمت بھی شامل تھی کہ کافروں کو ان کے تکبر و غرور اور بغاوت کی بنا پر ہلاک کر دے۔

غزوۂ احد میں اہل ایمان جن حالات سے دوچار ہوئے اللہ تعالیٰ نے اس کی چار حکمتیں ذکر فرمائی ہیں، جو درج ذیل ہیں:

① اس معاملے کا مشاہداتی طور پر اللہ کے علم میں آجانا اور مومنوں کے سامنے اس کا اظہار۔

② بعض سعادت مندوں کو شہادت سے سرفراز کرنا۔ شہادت شہید ہونے والے کو بلند ترین مقام تک پہنچا دیتی ہے۔

③ مومنوں کی تطہیر اور گناہوں سے صفائی اور منافقوں کو ان سے الگ کرنا۔

④ کفار کو مٹانا اور آہستہ آہستہ ان کی بیخ کنی کرنا۔[3]

---

1 تفسير الطبري: 107/4. 2 تفسير ابن كثير: 408/1. 3 حديث القرآن الكريم عن غزوات الرسول ﷺ لأبي بدر محمد بكر آل عابد: 199/1.

بعد ازاں فرمایا:

﴿ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ ○ ﴾

''کیا تم یہ سمجھ بیٹھے ہو کہ تم (سیدھے) جنت میں داخل ہو جاؤ گے، حالانکہ ابھی اللہ نے یہ تو دیکھا ہی نہیں کہ تم میں سے کون لوگ اس کی راہ میں جانیں لڑانے والے اور صبر کرنے والے ہیں۔''[1]

اس کے معنی یہ ہیں کہ جنگ احد میں پسپا ہونے والو! کیا تمھارا خیال ہے کہ تم بھی اس جنگ میں زخم کی تکلیف برداشت کر کے شہید ہونے والوں کی طرح جنت میں داخل ہو جاؤ گے، حالانکہ تم نے نہ ان کا راستہ اپنایا نہ ان جیسا عظیم صبر کیا؟ ایسا ہرگز نہ ہوگا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ شہادت پر فائز ہونے والوں کو ظاہر کر دے تاکہ اس پر جزا مل سکے اور وہ صبر کرنے والوں کو واضح فرما دے۔[2]

ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ تمھیں اس وقت تک جنت نہیں مل سکتی جب تک تمھاری آزمائش نہ ہو جائے اور جب تک اللہ تعالیٰ تم میں سے اپنی راہ میں جہاد کرنے والوں کو ظاہر نہ کر دے اور انھیں بھی واضح نہ کر دے جو صبر وثبات کا پیکر بن کر دشمن کے مقابلے میں ڈٹ جاتے ہیں۔[3]

پھر ارشاد فرمایا:

﴿ وَلَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَلْقَوْهُ فَقَدْ رَاَيْتُمُوْهُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ○ ﴾

''تحقیق تم جنگ سے پہلے ہی (شہادت کی) موت کی خواہش کرتے تھے، چنانچہ پس اب تم نے اسے اپنی آنکھوں سے اپنے سامنے دیکھ لیا ہے۔''[4]

---

[1] آل عمرٰن3:142. [2] تفسیر القرطبي:220/4. [3] تفسیر ابن کثیر:409/1. [4] آل عمرٰن3:143.

امام ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''اس کا مفہوم یہ ہے کہ اے مسلمانو! تم آج سے پہلے دشمن سے ملاقات کی آرزو رکھتے تھے اور اس کے لیے بیتاب تھے اور چاہتے تھے کہ کفار کے سامنے اپنی بہادری کا مظاہرہ کرو اور ان کے مقابلے میں ڈٹ جاؤ۔ لو اب تمھاری چاہت کے مطابق تمھاری آرزو بر آئی ہے، لہٰذا تم اب جنگ کرو اور ثابت قدمی کا مظاہرہ کرو۔''[1]

کمزوریوں کا مداوا: جنگ احد کے موقع پر مسلمان جن حالات سے دوچار ہوئے قرآن کریم نے اس پر غزوۂ بدر کے برعکس بڑا نرم لہجہ اختیار فرمایا ہے۔ بدر کے قیدیوں کے متعلق آراء میں کمی بیشی پر محاسبہ غزوۂ احد میں شکست خوردہ ہونے پر محاسبے کی نسبت سخت تھا، چنانچہ غزوۂ بدر میں قیدیوں سے فدیہ لینے کے فیصلے کے متعلق فرمایا:

﴿مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗٓ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ ۭ تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا ڰ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ○ لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَآ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ○﴾

''کسی نبی کے لائق نہیں کہ اس کے پاس قیدی ہوں یہاں تک کہ وہ زمین میں خوب خون ریزی (انھیں قتل) کرے۔ (مسلمانو!) تم سامان دنیا چاہتے ہو اور اللہ (تمھاری) آخرت چاہتا ہے اور اللہ زبردست، خوب حکمت والا ہے۔ اگر اللہ کی طرف سے پہلے ہی (ایک بات) لکھی ہوئی نہ ہوتی تو تم نے (بدر کے قیدیوں سے) جو (فدیہ) لیا اس کے بدلے تمھیں بڑا عذاب آ پکڑتا۔''[2]

اور جنگ احد اور اس میں شکست کے متعلق فرمایا:

﴿وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ اِذْ تَحُسُّوْنَھُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ حَتّٰٓي اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ۭ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۚ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْھُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ ۚ وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ ۭ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَلَي الْمُؤْمِنِيْنَ ○﴾

[1] تفسیر ابن کثیر: 409/1. [2] الأنفال 8: 68,67.

”یقیناً اللہ نے تم سے اپنا وعدہ سچ کر دکھایا جب تم (احد میں) اس کے حکم سے کافروں کو قتل کر رہے تھے، یہاں تک کہ جب تم نے کم ہمتی اختیار کی اور اپنی ذمہ داری کے بارے میں جھگڑنے لگے اور جونہی اللہ نے تمھیں وہ چیز (مال غنیمت کی جھلک) دکھائی جس سے تم محبت کرتے تھے تو تم نے نافرمانی کی، (اس لیے کہ) تم میں سے کچھ لوگ دنیا کو چاہتے تھے اور کچھ آخرت کی خواہش رکھتے تھے، پھر اللہ نے تمھیں کافروں کے مقابلے میں پسپا کر دیا تا کہ تمھاری آزمائش کرے۔ بلا شبہ (پھر بھی) اس نے تمھیں معاف کر دیا۔ اور اللہ مومنوں پر فضل کرنے والا ہے۔“ [1]

سابقہ قوموں کے مجاہدین کا بطور مثال تذکرہ: ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا ۗ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ ○ وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِيْٓ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ○ فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ ۗ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ○﴾

”اور کتنے ہی نبی گزرے جن کے ساتھ مل کر بہت سے اللہ والوں نے جہاد کیا، انھیں اللہ کی راہ میں جو تکلیفیں پہنچیں انھوں نے ہمت نہ ہاری اور نہ کمزوری دکھائی اور نہ وہ (کافروں سے) دبے اور اللہ صبر کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ اور ان کا کہنا یہی تھا کہ اے ہمارے رب! ہمارے گناہ بخش دے اور ہمارے کاموں میں ہم سے جو زیادتیاں ہوئیں وہ معاف کر دے۔ اور ہمیں ثابت قدم رکھ اور کافر قوم کے مقابلے میں ہماری مدد فرما، چنانچہ اللہ نے انھیں دنیا میں ثواب دیا اور آخرت میں بہت اچھا ثواب دیا۔ اور اللہ نیکو کاروں کو پسند کرتا ہے۔“ [2]

[1] آل عمرٰن 3:152۔ [2] آل عمرٰن 3:146-148۔

امام ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ نے ان آیات اور سابقہ آیات میں جنگ احد میں پسپائی اختیار کرنے والوں کو ڈانٹ پلائی ہے جنھوں نے چلّانے والے (شیطان) کی اس چیخ پر کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) قتل ہو چکے ہیں جنگ چھوڑی تھی۔ ان کے راہِ فرار اختیار کرنے اور جنگ چھوڑنے پر اللہ تعالیٰ نے انھیں (سخت) ملامت فرمائی۔''[1]

اللہ تعالیٰ نے ان کے سامنے گزشتہ امتوں میں سے ان کے مجاہد بھائیوں کی مثال بیان فرمائی ہے کہ وہ جہاد فی سبیل اللہ میں اپنے انبیاء کے نقشِ قدم پر چلتے رہے اور اس راہ میں انھیں جو بھی مشکلات آئیں وہ ان پر کبھی کمزور دکھائی نہ دیے، نہ زخم آنے پر انھوں نے جہاد سے منہ موڑا اور نہ ہی دشمن کے سامنے جھکے بلکہ جہادی راہوں میں ثابت قدم رہے۔

مذکورہ آیات میں پسِ پردہ ان مومنوں کی جانب اشارہ ہے جنھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کی جھوٹی افواہ سن کر بزدلی اور کمزوری لاحق ہوگئی تھی۔ نتیجتاً انھوں نے مشرکوں سے جہاد میں کمزوری، سستی اور کوتاہی کا اظہار کیا، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے سابقہ ادوار میں ہو گزرنے والے اہل اللہ کی اس موقع پر گفتگو نقل فرمائی ہے تاکہ مسلمان ان سے اور ان کے حسب ذیل قول سے ثابت قدمی کا درس لیں، ارشاد ہوا:

﴿ وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ إِلَّآ أَنْ قَالُوا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَإِسْرَافَنَا فِيٓ أَمْرِنَا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِينَ ۝ ﴾

''اور ان کا کہنا یہی تھا کہ اے ہمارے رب! ہمارے گناہ بخش دے اور ہمارے کاموں میں ہم سے جو زیادتیاں ہوئیں وہ معاف کر دے۔ اور ہمیں ثابت قدم رکھ اور کافر قوم کے مقابلے میں ہماری مدد فرما۔''[2]

سابقہ قوموں کے مجاہدین نے گناہوں اور زیادتیوں کی نسبت اپنی طرف کی ہے باوجود اس کے کہ وہ حزب اللہ تھے، یہ اپنے نفس کو کچل دینے کے مترادف ہے اور اپنی کمی کوتاہی کا

[1] تفسیر ابن کثیر: 410/1. [2] آل عمرٰن 3:147.

اعتراف بھی ہے۔ اور اسی طرح ان کی طرف سے دشمن کے مقابلے میں ثابت قدمی کی درخواست سے قبل گناہوں کی بخشش کی دعا اس لیے ہے تاکہ اپنے رب سے نصرت کی طلب خشوع وخضوع کے ساتھ اور گناہوں سے پاک صاف ہوکر کی جائے۔ اس میں مسلمانوں کو یہ سمجھانا بھی مقصود ہے کہ عجز وانکسار، استغفار اور توبہ کا ہونا ازحد ضروری ہے۔ اس کی اہمیت دشمن کے خلاف مدد فراہم کرنے سے اور بھی واضح ہو جاتی ہے، جیسا کہ ارشاد باری ہے:

﴿فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ ۗ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝﴾

''چنانچہ اللہ نے انھیں دنیا میں ثواب دیا اور آخرت میں بہت اچھا ثواب دیا۔ اور اللہ نیکوکاروں کو پسند کرتا ہے۔''[1]

یعنی اس کی بنا پر انھوں نے دونوں جہانوں کا ثواب پالیا۔ دنیا میں غنیمت اور مدد و نصرت اور آخرت میں بہتر ثواب۔ یہ انعامات اللہ سے دعا میں خلوص اور بھرپور توجہ کے ساتھ ساتھ راہ جہاد میں مخلصانہ کاوشوں کے نتیجے کے طور پر حاصل ہوئے، مزید برآں وہ مثال بھی بن گئے جسے اللہ تعالیٰ بطور نمونہ مسلمان مجاہدین کے لیے بیان بھی فرما رہا ہے۔ آخرت کے بدلے کے ساتھ خاص طور پر اللہ تعالیٰ نے لفظ ﴿حُسْنَ﴾ کا اضافہ فرمایا ہے جو دنیا کے بدلے سے عمدہ، بہتر اور مقدم ہونے کی دلیل ہے۔ اور اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اصل بدلہ وہی ہے۔[2]

امیر کی مخالفت لشکر کی شکست کا سبب بنتی ہے: تیر اندازوں کی طرف سے نبی ﷺ کی حکم عدولی اور اس فحش غلطی کے ارتکاب نے جنگ کا پانسہ ہی بدل دیا اور یہ چیز مسلمانوں کے لیے بہت بڑے خسارے کا باعث بن گئی۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ امیر کی مخالفت لشکر کی شکست کا باعث بن جایا کرتی ہے۔

[1] آل عمرٰن 3:148. [2] المستفاد من قصص القرآن لعبد الکریم زیدان:2/204.

ہم حاکم کی اطاعت کی مزید اہمیت کا مشاہدہ اس سے بھی کر سکتے ہیں کہ عبداللہ بن ابی اور دیگر منافقین کا عین جنگ کے موقع پر ساتھ چھوڑ جانا مسلمانوں پر اثر انداز نہیں ہوا لیکن جب ان تیر اندازوں نے نبی ﷺ کی حکم عدولی کی جنھیں آپ ﷺ نے بڑی مناسب جگہ دے کر اہم ذمہ داری سونپی تھی تو اس کا نقصان تمام مسلمانوں کو اٹھانا پڑا۔ وہ اس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دشمن کو ان پر مسلط کر دیا۔ سارا معاملہ ہی الٹ پلٹ ہو گیا۔ لشکر ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گیا اور قریب تھا کہ اسلام کی دعوت اپنے آغاز ہی میں دم توڑ جاتی۔

غزوۂ احد کے حالات سے بخوبی اندازہ ہو رہا ہے کہ جب تک تیر انداز رسول اللہ ﷺ کے فرامین اور اپنے امیر حضرت عبداللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ کے حکم پر کاربند رہے تو وہ فتح یاب تھے مگر جس وقت رسول اللہ ﷺ کے حکم کی پروا نہ کرتے ہوئے تیر انداز دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ مل کر مال غنیمت سمیٹنے کے لیے گھاٹی سے نیچے اتر آئے تو شکست سے دوچار ہو گئے۔[1]

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِذْ تُصْعِدُونَ وَلَا تَلْوُونَ عَلَىٰ أَحَدٍ وَالرَّسُولُ يَدْعُوكُمْ فِي أُخْرَاكُمْ فَأَثَابَكُمْ غَمًّا بِغَمٍّ لِّكَيْلَا تَحْزَنُوا عَلَىٰ مَا فَاتَكُمْ وَلَا مَا أَصَابَكُمْ ۗ وَاللَّهُ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ۝﴾

”جب تم بھاگے چلے جا رہے تھے اور کسی کی طرف پلٹ کر نہ دیکھتے تھے اور رسول (ﷺ) تمھارے پیچھے سے تمھیں آوازیں دے رہے تھے، پھر اللہ نے تمھیں غم پر غم دیے تاکہ تمھیں یہ سبق ملے کہ جو کچھ تمھارے ہاتھ سے جائے یا جو مصیبت تم پر نازل ہو اس پر تمھیں غمگین نہیں ہونا چاہیے اور تم جو عمل کرتے ہو اللہ اس کی خبر رکھتا ہے۔“[2]

---

1 غزوة أحد لمحمد عيظة بن سعيد، ص:207-209. 2 آل عمرٰن3:153.

حکم عدولی کے نتائج بھی برے ہی برآمد ہوتے ہیں جیسا کہ جنگ احد کے موقع پر چند ایک صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طرف سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کا نتیجہ نکلا، جبکہ وہ اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے جہاد میں مشغول تھے۔ اسی سبب کی طرف اللہ تعالیٰ اشارہ فرما رہے ہیں جیسا کہ ارشاد ہے:

﴿وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ .....﴾

''اور جونہی اللہ نے تمھیں وہ چیز (مال غنیمت کی جھلک) دکھائی جس سے تم محبت کرتے تھے تو تم نے نافرمانی کی ......۔''[1]

یہ ایک غلطی تھی جس کی وجہ سے وہ فتح جس کے مبادیات و آثار سامنے آچکے تھے، شکست میں بدل گئی۔ یہ تو صرف ایک کوتاہی تھی، جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بنفسِ نفیس وہاں موجود تھے، اسی سے اندازہ لگائیے کہ ایک نہیں بلکہ لاتعداد گناہوں کا ارتکاب ہورہا ہو تو نتائج کیا ہوں گے؟ اس لیے تو ہم کہتے ہیں کہ یہ گناہوں کا نتیجہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بعض ظالموں کو بعض دیگر پر ان کے اعمال کی وجہ سے مسلط کردیتے ہیں۔ اور ان پر جس قدر ظلم و زیادتی ہوتی ہے، اس قدر نصرت و غلبہ اور عزت و وقار دور ہوتے چلے جاتے ہیں۔[2]

حکمرانوں کی اطاعت: حکمرانوں کی اطاعت ایک اہم فریضہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کے بعد اس کا شمار ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا۝﴾

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تم اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحب امر ہوں، پھر اگر تم باہم کسی چیز میں اختلاف

[1] آل عمرٰن 3:152۔ [2] غزوۃ أحد لمحمد عیظۃ بن سعید، ص:211۔

کرو تو اسے اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹا دو، اگر تم واقعی اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہو۔ یہ بہتر ہے اور انجام کے لحاظ سے بہت اچھا ہے۔''[1]

علماء کا کہنا ہے کہ یہ آیت مبارکہ رعایا کے بارے میں نازل ہوئی ہے، خواہ ان کا تعلق فوج سے ہو یا وہ سویلین ہوں۔ ان پر لازم ہے کہ وہ تقسیم کے معاملات میں، فیصلوں میں اور جنگی معاملات کے ساتھ ساتھ تمام معاملات میں اپنے حکام کی فرماں برداری کریں۔ وہ حکام جو یہ فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔[2]

یقیناً حکام کی اطاعت ہمارے دینی فرائض میں سے ایک اہم فریضہ ہے حتی کہ ائمہ کرام نے اسے عقائد میں شمار کیا ہے۔[3]

حکومت کے قیام اور امت کی تربیت کے لیے حکام کی اطاعت کی اپنی اہمیت ہے۔ حکام کی اطاعت کی اسی اہمیت کو ہم اختصار سے چند نکات میں یوں بیان کر سکتے ہیں:

① امراء اور حکام کی اطاعت احکامِ الٰہی کی بجا آوری میں ممد و معاون ثابت ہوتی ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ۝﴾

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تم اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحب امر ہوں، پھر اگر تم باہم کسی چیز میں اختلاف کرو تو اسے اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹا دو، اگر تم واقعی اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہو۔ یہ بہتر ہے اور انجام کے لحاظ سے بہت اچھا ہے۔''[4]

---

[1] النسآء 59:4. [2] الفتاوی لابن تيمية: 246/28. [3] بدائع السالك في طبائع الممالك لأبي عبدالله بن الأزرق: 77/1. [4] النسآء 59:4.

② حکام کی اطاعت زمین میں اللہ تعالیٰ کی شریعت کے نافذ کرنے کا، حق کو حق ثابت کرنے کا اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے قیام کا وسیلہ و ذریعہ ہے۔ یہ بذات خود مقصود و مطلوب نہیں ہے۔ یہ تو صرف اس امت کے بہترین امت ہونے کے احقاق، کلمۂ توحید اور محض اللہ تعالیٰ کی ذات کو عبادت کے لیے خاص کرنے کا ذریعہ ہے۔

③ اطاعتِ حکام سے مسلمانوں کے اندر یکجہتی کی لہر دوڑتی ہے کیونکہ باہمی اختلاف و انتشار کی صورت میں ان کے دنیوی اور اخروی احوال کی تباہی اور بربادی لازم آتی ہے۔[1]

④ اس سے مسلمان اپنے دین کو غالب کرتے اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت گزاری پر مدد حاصل کرتے ہیں۔

⑤ حکام کی اطاعت ہی میں دنیا کی سعادت مندی ہے۔

لہٰذا اہل سنت والجماعت کے بنیادی اصولوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ہم حکمرانوں کی عوام پر ظلم و زیادتی کے باوجود ان کے خلاف خروج کا نظریہ نہیں رکھتے اور نہ ہی ان کی اطاعت سے ہاتھ کھینچتے ہیں۔ اور جب تک وہ اللہ کی نافرمانی کا نہ کہیں ہم ان کی اطاعت کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت خیال کرتے ہیں اور یہ ایک فرض کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور ہم ان کے لیے بارِالٰہ سے درستگی اور درگزر کرنے کا سوال کرتے ہیں۔[2]

آخرت پر دنیا کو ترجیح دینے کا انجام: متعدد آیات و احادیث میں اللہ تعالیٰ کے ہاں دنیا کی وقعت کا ذکر ہے۔ ان نصوص میں دنیا کی حرص سے متنبہ کیا گیا ہے اور واضح کیا گیا ہے کہ اس کی زیب و زینت اور ملمع سازی کا انسان پر کتنا برا اثر پڑتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَ الْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَ الْفِضَّةِ وَ الْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ؕ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ۝ ﴾

[1] غزوة أحد لمحمد عيظة بن سعيد، ص: 220. [2] شرح العقيدة الطحاوية لابن أبي العز الحنفي:2/540.

''لوگوں کے لیے خواہشات نفس کی محبت مزین (پرکشش) کر دی گئی ہے، یعنی عورتوں سے، بیٹوں سے، سونے اور چاندی کے جمع کیے ہوئے ڈھیروں سے، نشان لگے (عمدہ) گھوڑوں سے، مویشیوں سے اور کھیتی سے، یہ سب دنیاوی زندگی کا سامان ہے اور اچھا ٹھکانا اللہ ہی کے پاس ہے۔''[1]

سورۂ لقمان میں ارشاد ربانی ہے:

﴿فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ○﴾

''لہٰذا دنیاوی زندگی تمھیں دھوکے میں نہ ڈال دے اور کوئی دھوکے باز تمھیں اللہ کے متعلق دھوکے میں نہ ڈالے۔''[2]

معلم انسانیت ﷺ نے بارہا اپنی امت کو دنیا کی شدید حرص اور اس سے فریب خوردہ ہونے پر تنبیہ فرمائی ہے کیونکہ حرص وطمع کا پوری امت پر عموماً اور دعوت کے علمبرداروں پر خصوصاً برا اثر مرتب ہوتا ہے۔ اس موضوع پر چند احادیث ملاحظہ فرمائیے:

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نبی اکرم ﷺ کا فرمان نقل کرتے ہیں:

«إِنَّ الدُّنْيَا حُلْوَةٌ خَضِرَةٌ، وَّإِنَّ اللّٰهَ مُسْتَخْلِفُكُمْ فِيهَا، فَيَنْظُرُ كَيْفَ تَعْمَلُونَ، فَاتَّقُوا الدُّنْيَا وَاتَّقُوا النِّسَاءَ، فَإِنَّ أَوَّلَ فِتْنَةِ بَنِي إِسْرَائِيلَ كَانَتْ فِي النِّسَاءِ»

''دنیا بہت ہی میٹھی اور سرسبز ہے اور اللہ تعالیٰ تمھیں اس میں خلیفہ بنا کر تمھیں دیکھنے والا ہے کہ تم کیسے اعمال بجالاتے ہو، لہٰذا تم دنیا سے بھی بچو اور عورتوں سے بھی بچو کیونکہ بنی اسرائیل میں پہلا فتنہ عورتوں کی بنا پر وقوع پذیر ہوا تھا۔''[3]

اور غزوۂ احد میں دنیا کی حرص کا جو نتیجہ برآمد ہوا تھا وہ کسی بھی مطالعہ کرنے والے سے

---

1 آل عمرٰن 14:3. 2 لقمٰن 33:31. 3 صحیح مسلم، حدیث: 2742، ومسند أحمد: 22/3، وصحیح ابن حبان، حدیث: 3221.

مخفی نہیں ہے۔

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما ذکر کرتے ہیں کہ احد کے دن جب مشرکوں کو اللہ تعالیٰ نے شکست سے دوچار کر دیا تو تیر اندازوں نے آپس میں کہا: ''اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور جنگ میں شریک لوگوں سے جاملو۔ وہ تم سے پہلے غنیمتوں کی طرف نہ بڑھنے پائیں کہ تمھیں ان سے کم غنیمتیں حاصل ہوں۔'' دوسرے شرکا نے یہ رائے دی کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت تک ہم یہیں جمے رہیں گے۔ تب یہ آیتِ مبارکہ نازل ہوئی:

﴿مِنكُم مَّن يُرِيدُ الدُّنْيَا وَمِنكُم مَّن يُرِيدُ الْآخِرَةَ﴾

''تم میں سے کچھ لوگ دنیا کو چاہتے تھے اور کچھ آخرت کی خواہش رکھتے تھے۔''[1]

امام طبری رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے مراد غنیمت ہے۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں خیال نہیں کرتا تھا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے بھی کوئی دنیا کا ارادہ رکھتا ہوگا، یہاں تک کہ احد کے دن ہمارے متعلق یہی آیت نازل ہوئی۔[2]

جنگ احد میں جو کچھ ہوا اس میں دعوت کے علمبرداروں کے لیے بڑی عبرت و نصیحت ہے۔ انھیں متنبہ کیا گیا ہے کہ دنیا کی محبت آہستہ آہستہ غیر محسوس انداز سے اہل ایمان کے دلوں میں سرایت کرتی رہتی ہے۔ آخر کار نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ دنیا اور اس کے فوائد کو آخرت اور اس کی نعمتوں سے ہمکنار ہونے پر ترجیح دینے لگتے ہیں۔ اور شریعت کے واضح اور صریح احکام کی نافرمانی شروع کر دیتے ہیں۔ جیسا کہ تیر اندازوں نے دنیا کی محبت اور نفس کی چاہت (ترجیح) کی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا صریح حکم پسِ پشت ڈال دیا تھا، چنانچہ انھوں نے حکم نبوی کی مخالفت کی اور احکام و اوامر بھلا بیٹھے۔

ایک مومن سے اس طرح کے امور سرزد ہو جاتے ہیں اور اسے ان کے مخفی اسباب کا پتا ہی نہیں چلتا۔ ان مخفی اسباب میں سرِفہرست دنیا کی محبت اور اسے آخرت اور ایمان کے

---

[1] آل عمرٰن 3:152، تفسیر الطبري: 3/474. [2] تفسیر الطبري: 3/474.

تقاضوں پر ترجیح دینا ہے۔ یہی امور دعوت کا علم بلند کرنے والوں سے تقاضا کرتے ہیں کہ وہ اپنے دلوں میں پنپنے والے پوشیدہ اسباب اور دنیا کی محبت کو جڑ سے اکھیڑتے رہیں تاکہ یہ ان کے اور احکام شریعت کے درمیان حائل نہ ہونے پائیں۔ اور نفسانی خواہشات میں ڈوبی ہوئی تاویلات اور دنیا اور اس کے سازو سامان کی طرف التفات انھیں شرع کی مخالفت پر ہرگز ہرگز نہ ابھارے۔[1]

دین کے ساتھ مضبوط رابطہ اور گہرا تعلق: امام ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: ''غزوۂ احد کے دن جب کچھ مسلمان شہید اور کچھ شکست خوردہ ہو گئے تو شیطان بآواز بلند چلایا: ''محمد (ﷺ) قتل ہو چکے ہیں!'' ادھر ابن قمۂ مشرکوں کے پاس آکر کہنے لگا: ''میں نے محمد (ﷺ) کو قتل کر دیا ہے۔'' اس نے رسول اللہ ﷺ کے سر مبارک پر پتھر مار کر زخمی کر دیا تھا، چنانچہ بہت سے لوگوں کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی اور وہ یقین کر گئے کہ رسول اللہ ﷺ شہید ہو چکے ہیں۔ قرآن پاک نے انبیاء علیہم السلام کے اس دنیا سے چلے جانے کے متعلق جو فرمایا ہے اس کے پیش نظر وہ آپ ﷺ کے شہید ہونے کو بعید خیال نہ کر رہے تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان کمزوری اور بزدلی میں مبتلا ہو گئے اور جنگ سے پیچھے ہٹنے لگے۔ اسی کے متعلق ارشاد ربانی نازل ہوا:

﴿وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۚ اَفَاۡىِٕنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ۚ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـًٔا ۗ وَسَيَجْزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ۝﴾

''اور محمد (ﷺ) ایک رسول ہی تو ہیں۔ ان سے پہلے بہت سے رسول گزر چکے ہیں۔ اگر ان کا انتقال ہو جائے یا یہ شہید ہو جائیں تو کیا تم اسلام سے اپنی ایڑیوں کے بل پھر جاؤ گے؟ اور جو کوئی اپنی ایڑیوں کے بل پھر جائے تو وہ اللہ کا کچھ بھی بگاڑ نہ سکے گا۔ اور اللہ شکر ادا کرنے والوں کو اچھی جزا دے گا۔''[2]

1 المستفاد من قصص القرآن لعبد الكريم زيدان: 197/2. 2 آل عمرٰن 3:144.

یعنی نبوت و رسالت اور جوازِ شہادت میں سابقہ انبیائے کرام علیہم السلام رسول اللہ ﷺ کے لیے نمونہ ہیں۔[1]

مندرجہ بالا آیت کی تفسیر میں یہ بھی منقول ہے کہ انبیاء و رسل علیہم السلام اپنی قوموں میں ہمیشہ نہیں رہتے۔ ہر ایک نے موت کا مزا چکھا ہے۔ اور رسول اللہ ﷺ کی ذمہ داری یہ تھی کہ آپ کی طرف جو پیغام بھیجا گیا ہے اسے دوسروں تک پہنچادیں اور وہ آپ ﷺ کر چکے ہیں۔ رسالت کے لوازم میں سے یہ قطعاً نہیں کہ رسول اللہ ﷺ ہمیشہ اپنی قوم کے ساتھ ہی رہیں کیونکہ اس جہاں میں ہمیشہ رہنا کسی کے لیے بھی نہیں ہے۔

بعدازاں اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی شہادت یا وفات (کی افواہ کی خبر) سے کمزوری کا شکار ہونے والوں پر ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿ اَفَاۡئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ﴾

''اگر ان کا انتقال ہو جائے یا یہ شہید ہو جائیں تو کیا تم اسلام سے اپنی ایڑیوں کے بل پھر جاؤ گے؟''[2]

یعنی تم الٹے پاؤں پھر جاؤ گے اور جہاد سے ہاتھ کھینچ لو گے؟ ایڑیوں کے بل پھرنے سے مراد جہاد اور فرامینِ نبویہ کی روشنی میں اس کے تقاضوں سے روگردانی ہے۔ اور فرمایا:

﴿وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـًٔا ۗ وَسَيَجْزِي اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ○﴾

''اور جو کوئی اپنی ایڑیوں کے بل پھر جائے تو وہ اللہ کا کچھ بھی بگاڑ نہ سکے گا۔ اور اللہ شکر ادا کرنے والوں کو اچھی جزا دے گا۔''[3]

شکر کرنے والوں سے یہاں وہ لوگ مراد ہیں جنھوں نے روگردانی نہیں کی یا وہ مراد ہیں جو اپنے دین پر ثابت قدم رہنے والے اور رسول اللہ ﷺ کی حیات مبارکہ میں بھی

[1] تفسیر ابن کثیر: 441/1. [2] آل عمرٰن 3:144. [3] آل عمرٰن 3:144.

اور آپ ﷺ کے بعد بھی آپ ﷺ ہی کی اتباع کرنے والے ہیں۔[1]

غزوۂ احد کے موقع پر مسلمانوں کو لاحق ہونے والی مصیبت و آزمائش کے اسباب میں سے ایک سبب یہ بھی تھا کہ انھوں نے اپنے ایمان، عقیدے اور اعلائے کلمۃ اللہ کی دعوت کو رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ عالیہ سے مربوط کر رکھا تھا، چنانچہ اللہ کے رب اور معبود یکتا ہونے کے عقیدے کے درمیان اور جذباتِ محبت سے مغلوب ہوکر رسول اللہ ﷺ کے ہمیشہ زندہ رہنے کے درمیان وہ واضح فرق نہ کر پائے۔

دراصل رسول اللہ ﷺ کی ہمیشہ کے لیے رسالت اور آپ ﷺ کی ذاتِ گرامی، جنھیں موت کے عوارضات لاحق ہونے تھے، اسے وہ باہم مربوط خیال کر بیٹھے کہ جیسے آپ ﷺ کی رسالت ہمیشہ کے لیے ہے ویسے ہی آپ ﷺ کی ذات بھی ہمیشہ کے لیے ہے۔ یہ ان اسباب میں سے ایک سبب تھا جن کی بنا پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بے چینی، پریشانی اور ان حالات سے دوچار ہونا پڑا جن کی انھیں توقع نہ تھی۔

رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ گرامی کو اسوہ بنانے کا جو وجوب ہے وہ آپ ﷺ کی مکمل اتباع کیے بغیر ممکن نہیں۔ آپ ﷺ کی اتباع مشکلات پر صبر کا مظاہرہ کرنے سے، دین کا پیغام پھیلانے کے لیے سرتوڑ اور مسلسل کوششوں سے، دعوت کو دوسروں تک پہنچانے سے اور دین حق کی نصرت و حمایت ہی سے ممکن ہے۔ اور یہ پیروی پیغامِ اسلام کے منہج کا روشن پہلو ہے۔ اسی طرح بقائے دین اور دوامِ جہاد کو نبی ﷺ کی ذات مبارکہ کے بقا کے ساتھ باہم مربوط نہ سمجھنا اور فکری اور عملی طور پر آپ ﷺ کی پیروی کا وجوب یہ دونوں باتیں دعوت کے علمبرداروں کے لیے بالخصوص اسلامی معاشرے کے اتحاد کے سلسلے کی بنیادی کڑیاں ہیں۔[2]

---

[1] المستفاد من قصص القرآن لعبد الكريم زيدان: 200/2. [2] محمد رسول اللّٰه ﷺ لصادق عرجون: 616/3.

امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''غزوۂ احد رسول اللہ ﷺ کی وفات سے قبل ایک تمہید اور اشارہ تھا جس کی بنیاد پر اللہ تعالیٰ نے انھیں ثابت قدمی اختیار کرنے کی تلقین فرمائی۔ اور رسول اللہ ﷺ کی وفات یا شہادت کی صورت میں ایڑیوں کے بل پھر جانے پر ڈانٹ پلائی۔ اللہ تعالیٰ نے مومنین کو سمجھایا کہ ان پر اللہ کی طرف سے فرض عائد ہوتا ہے کہ اسی کے دین اور توحید پر جمے رہیں اور اسی راہ پر انھیں موت یا شہادت نصیب ہونی چاہیے کیونکہ وہ نبی کریم ﷺ کی نہیں بلکہ اُن کے رب کی عبادت کرر ہے ہیں اور ان کے رب پر موت ممکن نہیں۔ اور اگر محمد ﷺ فوت یا شہید ہو جائیں تو یہ مسلمانوں کے شایاں نہیں کہ آپ ﷺ کی وفات انھیں آپ ﷺ کے دین و پیغام سے برگشتہ کردے۔ اللہ کے سوا ہر کسی کو موت کا جام نوش کرنا ہے۔ نہ کوئی اور انسان اور نہ ہی حضرت محمد ﷺ ہمیشہ رہنے کے لیے بھیجے گئے ہیں۔ مسلمانوں کے لیے ضروری ہے کہ انھیں موت اسلام اور توحید پر آئے۔ رسول اللہ ﷺ فوت ہو گئے ہوں یا ابھی مزید زندہ رہیں موت تو ایک حتمی فیصلہ ہے۔ اسی لیے شیطان نے جب بآوازِ بلند چیخ کر کہا کہ حضرت محمد (ﷺ) شہید ہو چکے ہیں تو جن مسلمانوں نے میدانِ جنگ چھوڑا اللہ تعالیٰ نے انھیں زجروتوبیخ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿ اَفَاۡئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ۭ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰي عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَـيْـــًٔا ۭ وَسَيَجْزِي اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ۝﴾

''اگر ان کا انتقال ہو جائے یا یہ شہید ہو جائیں تو کیا تم اسلام سے اپنی ایڑیوں کے بل پھر جاؤ گے؟ اور جو کوئی اپنی ایڑیوں کے بل پھر جائے تو وہ اللہ کا کچھ بھی بگاڑ نہ سکے گا۔ اور اللہ شکر ادا کرنے والوں کو اچھی جزا دے گا۔''[1]

شکر گزار وہ لوگ ہیں جنھوں نے اسلام کی قدر ومنزلت پہچانی اور موت یا شہادت تک

[1] آل عمرٰن 3:144.

اسی پر ثابت قدم رہے۔

اللہ تعالیٰ کے اس موقع پر عتاب اور اس خطاب کی معنویت کا حقیقی اثر اس وقت سامنے آیا جب رسول اللہ ﷺ 11 ہجری کو اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ اس وقت کئی لوگ ارتداد کا شکار ہو گئے، جبکہ شکر گزار اپنے دین پر ثابت قدم رہے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی مدد فرمائی، انھیں عزت سے نوازا، دشمن کے مقابلے میں انھیں کامیاب کیا اور بہتر انجام ان کے حق میں کر دیا۔''[1]

امام قرطبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: ''یہ آیتِ کریمہ غزوۂ احد میں شکست سے دوچار ہونے والوں کو سرزنش کے سلسلے کی آخری کڑی ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ انھیں لائق نہ تھا کہ اگرچہ محمد ﷺ شہید ہی کر دیے جائیں کہ وہ شکستہ دل ہو بیٹھیں۔ نبوت موت کے راستے میں رکاوٹ نہیں ہے۔ اور نہ ہی انبیاء علیہم السلام کی وفات سے دین زائل ہوا کرتے ہیں۔''[2]

امام قرطبی رحمہ اللہ کا کلام بڑا عمدہ ہے۔ جن لوگوں نے اس سے پہلے یہ خیال کر لیا تھا کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات سے اسلام ختم ہو چکا ہے اور اسی طرح وہ لوگ جن کا خیال یہ تھا کہ غلبۂ اسلام اور اس کی دعوت آپ ﷺ کی ذات گرامی پر موقوف ہے، ان دونوں گروہوں کا نقطۂ نظر درست نہیں تھا۔ انھوں نے نہ تو اس دین کا مقام و مرتبہ پہچانا اور نہ ہی اس کا حق پورا کیا۔ کیونکہ اس دین کا غلبہ اور تمام ادیان پر اس کی برتری اللہ تعالیٰ کے ہاں طے شدہ ہے اور تم اللہ تعالیٰ کے اس طریقے کو ہرگز بدلا ہوا نہ پاؤ گے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿هُوَ الَّذِيٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ○﴾

''وہی (اللہ) ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تاکہ اسے سب دینوں پر غالب کرے، خواہ مشرکین کو برا ہی لگے۔''[3]

[1] زاد المعاد: 224/3. [2] تفسير القرطبي: 222/4. [3] التوبة 33:9. مرض النبي ﷺ ووفاته لخالد أبي صالح، ص: 20 بحواله غزوة أحد لمحمد عيطة بن سعيد، ص: 191.

جنگ احد میں جو کچھ وقوع پذیر ہوا اس کے متعلق اللہ تعالیٰ کی طرف سے زجر و توبیخ پر مشتمل احکام نازل ہوئے۔ ان کی عملی شکل رسول اللہ ﷺ کی وفات کے وقت سامنے آئی جیسا کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ فوت ہوئے تو ابوبکر رضی اللہ عنہ مقام سنح میں واقع اپنے گھر سے ایک گھوڑے پر سوار ہو کر آئے اور گھوڑے سے اتر کر مسجد میں داخل ہو گئے اور کسی سے کوئی بات نہ کی، پھر میرے حجرے میں آئے اور رسول اللہ ﷺ کی طرف بڑھے۔ آپ ﷺ کو یمن کی قیمتی چادر سے ڈھانپ دیا گیا تھا۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے وہ چادر آپ ﷺ کے چہرۂ مبارک سے ہٹائی، پھر جھک کر بوسہ دیا اور رو پڑے، پھر کہنے لگے: ''آپ پر میرے ماں باپ قربان! اللہ تعالیٰ آپ پر دو موتیں جمع نہیں کرے گا۔ بس ایک موت جو آپ پر لکھی گئی تھی وہ آپ پر طاری ہو چکی۔''[1]

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ باہر تشریف لائے۔ اس وقت عمر رضی اللہ عنہ لوگوں سے باتیں کر رہے تھے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا: ''عمر! بیٹھ جائیے۔'' مگر عمر رضی اللہ عنہ نہ بیٹھے۔ آخر سب لوگ عمر رضی اللہ عنہ کی طرف سے توجہ ہٹا کر سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اس وقت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے خطبہ ارشاد فرمایا: ''اما بعد! تم میں سے جو کوئی حضرت محمد ﷺ کی عبادت کرتا تھا تو حضرت محمد ﷺ تو فوت ہو چکے۔ اور تم میں سے جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا تھا تو اللہ تعالیٰ ہمیشہ زندہ ہے اسے کبھی موت لاحق نہیں ہو گی۔'' اللہ تعالیٰ قرآن میں ارشاد فرماتا ہے:

﴿وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۚ اَفَاۡىِٕنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ۚ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـًٔا ۗ وَسَيَجْزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ○﴾

''اور محمد (ﷺ) ایک رسول ہی تو ہیں۔ ان سے پہلے بہت سے رسول گزر چکے

[1] صحيح البخاري، حديث:4453.

ہیں۔ اگر ان کا انتقال ہو جائے یا یہ شہید ہو جائیں تو کیا تم اسلام سے اپنی ایڑیوں کے بل پھر جاؤ گے؟ اور جو کوئی اپنی ایڑیوں کے بل پھر جائے تو وہ اللہ کا کچھ بھی بگاڑ نہ سکے گا۔ اور اللہ شکر ادا کرنے والوں کو اچھی جزا دے گا۔''[1]

ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ ایسا معلوم ہوا جیسے سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے اس آیت کی تلاوت کرنے سے قبل لوگ یہ جانتے ہی نہ تھے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری ہوئی ہے، پھر تو سب نے یہ آیت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے سیکھ لی۔ میں نے جس کو بھی دیکھا وہ یہی آیت پڑھ رہا تھا۔

امام زہری کہتے ہیں کہ مجھے سعید بن مسیّب رحمہ اللہ نے بتایا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہتے تھے: ''مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میں نے یہ آیت سنی ہی نہ تھی۔ جب ابوبکر رضی اللہ عنہ نے یہ آیت پڑھی تو میں نے سنی۔ میں اس وقت سہم گیا اور میرے پیروں نے جواب دے دیا۔ میں زمین پر جا پڑا۔ جونہی میں نے یہ آیت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے سنی تو مجھے یقین ہو گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو چکی ہے۔''[2]

تیر اندازوں اور منافقوں کا معاملہ

تیر انداز: جن تیر اندازوں نے غزوۂ احد میں اجتہادی غلطی کی تھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں اپنی صفوں میں شامل رکھا۔ اور انھیں یہ نہ کہا کہ تم جنگ کے لیے موزوں نہیں ہو۔ کیونکہ تجربے کے دوران تم سے کمزوری اور کوتاہی سامنے آئی ہے۔ بلکہ رحمت، شفقت اور فیاضی سے ان کی کمزوری سمیت انھیں قبول کیا۔ بعد ازاں اللہ تعالیٰ نے (بھی) اپنی کمال مہربانی اور معافی تمام شرکائے جنگ پر عام کر دی، باوجودیکہ ان میں سے بعض افراد سے فاش غلطیاں سرزد ہوئی تھیں جن کی بنا پر تمام مسلمانوں کو اجتماعی طور پر زبردست نقصانات اٹھانے پڑے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں معاف کرتے ہوئے ان کی کوتاہیوں کو دھو ڈالا اور غلطیوں کے نشانات تک مٹا دیے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

1 آل عمرٰن 3:144. 2 صحيح البخاري، حديث:4454.

﴿ وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ ۗ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ○ ﴾
”بلا شبہ (پھر بھی) اس نے تمھیں معاف کر دیا۔ اور اللہ مومنوں پر فضل کرنے والا ہے۔“ [1]

اللہ تعالیٰ کے عفو ودرگزر کے ساتھ ساتھ یہاں ایک اہم پہلو اور بھی تھا جو صحابہ کرام کے دلوں میں ایسا اثر چھوڑ سکتا تھا جو عفو ودرگزر کی راہ میں رکاوٹ بن جاتا۔ اور وہ تھا صحابہ رضی اللہ عنہم سے سرزد ہونے والے کردار کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا موقف۔ صحابہ کو یہ معلوم تھا کہ ان کی حکم عدولی اور کوتاہیوں کا نتیجہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے بھگتا، لہٰذا ان کی دلی مسرت اسی میں تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے بھی معافی مل جائے، چنانچہ اس طرح اللہ تعالیٰ کی نعمت کاملہ انھیں میسر آ گئی۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو بھی صحابہ کو معاف کرنے کا حکم دیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ابھارا کہ ان کے لیے بخشش طلب کریں۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی حکم دیا کہ ان کی یہ کوتاہی ان کے تجربات اور مشوروں کی راہ میں حائل نہ ہو بلکہ ان کی رائے کا احترام کرنے اور توجہ سے ان کے مشورے سننے کا حکم صادر فرمایا ہے۔ [2] ارشاد ربانی ہے:

﴿ فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۖ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۚ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ ○ ﴾

”پس (اے نبی!) آپ اللہ کی رحمت کے باعث ان کے لیے نرم ہو گئے۔ اگر آپ تندخو اور سخت دل ہوتے تو وہ سب آپ کے پاس سے چھٹ جاتے، چنانچہ آپ ان سے درگزر کریں اور ان کے لیے بخشش مانگیں اور ان سے (اہم) معاملات میں مشورہ کریں، پھر جب آپ پختہ ارادہ کر لیں تو اللہ پر بھروسا کریں، بے شک اللہ بھروسا کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔“ [3]

1 آل عمرٰن 152:3۔ 2 غزوة أحد لمحمد عيظة بن سعيد، ص: 218۔ 3 آل عمرٰن 159:3۔

ابن سلول منافق کا عین وقت پر ساتھ چھوڑ جانا: عبداللہ بن ابی تین سو منافقوں کو کو علیحدہ کر کے اسلامی لشکر میں اضطراب کی کیفیت پیدا کرنا اور کھلبلی مچانا چاہتا تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ اسلامی لشکر کے حوصلے پست ہوں اور دشمن دلیر ہو جائے اور ان کے حوصلے بلند ہوں۔ اس کا یہ گھناؤنا کردار اسلام کے مستقبل کو کمزور کرنے اور انتہائی کٹھن حالات میں مسلمانوں کو دھوکا دینے کے زمرے میں آتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن حرام رضی اللہ عنہ نے انھیں پسپائی سے باز رکھنے کی کوشش کی مگر منافقوں نے ان کی بات پر کان نہ دھرے۔[1]

انھی کے متعلق ارشاد ہے:

﴿وَمَآ اَصٰبَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَلِيَعْلَمَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ نَافَقُوْا ۚ وَقِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوِ ادْفَعُوْا ۭ قَالُوْا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَّاتَّبَعْنٰكُمْ ۭ هُمْ لِلْكُفْرِ يَوْمَىِٕذٍ اَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْاِيْمَانِ ۚ يَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۭ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يَكْتُمُوْنَ ۝﴾

”اور جو مصیبت تمھیں اس (احد کے) دن پہنچی جب دونوں لشکر باہم ٹکرائے تو تمھیں جو (نقصان) پہنچا وہ اللہ کے حکم سے تھا اور اس لیے تھا کہ اللہ جان لے کہ مومن کون ہیں۔ اور یہ بھی جان لے کہ منافق کون ہیں اور ان منافقوں سے کہا گیا تھا: آؤ! اللہ کے راستے میں لڑو یا (شہر کا) دفاع کرو۔ انھوں نے کہا: اگر ہمیں جنگ ہونے کا یقینی علم ہوتا تو ہم ضرور تمھارے ساتھ چلتے۔ وہ اس روز ایمان کی نسبت کفر کے زیادہ قریب تھے۔ وہ اپنے مونہوں سے وہ بات کہہ رہے تھے جو ان کے دلوں میں نہیں تھی اور اللہ وہ بات خوب جانتا ہے جسے وہ چھپاتے ہیں۔“[2]

1 غزوة أحد لمحمد عيطة بن سعيد، ص: 219. 2 آل عمرٰن 3:166,167.

قریش کے مقابلے میں مسلمانوں کی تعداد خاصی کم تھی، اس لیے مسلمانوں کو افرادی قوت بھی درکار تھی۔ اس کے باوجود منافقین کے رویے کو بالائے طاق رکھتے ہوئے رسول اللہ ﷺ نے انھیں ان کی حالت پر چھوڑ دیا اور ان کی مطلق پروا نہ کی۔ اور لوگوں کے روبرو ان کی رسوائی ہی کو کافی خیال کیا۔[1]

رسول اللہ ﷺ کے اس انداز نے ابن سلول کی اہانت و سرزنش کا گہرا اثر چھوڑا۔ اس کا اندازہ امام زہری کی حسبِ ذیل وضاحت سے ہوتا ہے۔ عبداللہ بن ابی کی عادت تھی کہ وہ ہر جمعہ کے روز خطبے کے دوران میں، جبکہ رسول اللہ ﷺ بیٹھ جاتے، کھڑا ہوتا اور قوم سے کہتا: ''یہ رسول اللہ ﷺ ہیں جو تمھارے درمیان موجود ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے ذریعے سے تمھیں عزت دی اور تمھارا اکرام کیا، اس لیے ان کی مدد کرو، انھیں تقویت دو، ان کی بات سنو اور اطاعت کرو۔'' یہ کہہ کر وہ بیٹھ جاتا تھا۔ ایک تو وہ بذاتِ خود بہت پراعتماد تھا، دوسرا قوم میں بھی اس کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ اور واقعی وہ تھا بھی قوم کا معتبر کہ اسے کوئی نہیں ٹوکتا تھا۔

غزوۂ احد کے موقع پر عبداللہ بن ابی اور اس قماش کے لوگوں کا جو گھناؤنا کردار سامنے آیا اس سے ان کے مکروہ چہرے واضح ہوگئے۔ حسب سابق غزوۂ احد کے بعد جب ابن سلول وعظ کے لیے کھڑا ہوا تو مسلمانوں نے ہر طرف سے اس کے کپڑے پکڑ کر اسے کھینچا اور کہنے لگے: ''ارے! اللہ کے دشمن! بیٹھ جا۔ اپنے برے کردار کی بنا پر تو اس کام کا اہل نہیں رہا۔'' یہ دیکھ کر ابن سلول لوگوں کی گردنیں پھلانگتا ہوا نکل گیا اور کہتا جا رہا تھا: ''اللہ کی قسم! گویا میں نے تو کوئی غلط اور بری بات کہی ہے، میں تو انھی کا معاملہ مضبوط کرنے کھڑا ہوا تھا۔'' مسجد کے دروازے پر اسے انصار کے کچھ لوگ ملے۔ انھوں نے اس سے پوچھا: ''تیرا برا ہو، تجھے کیا ہوا؟'' کہنے لگا: ''میں نبی ﷺ کا معاملہ مضبوط کرنے

[1] غزوة أحد لمحمد عيطة بن سعيد، ص: 220.

کھڑا ہوا تھا مگر آپ ﷺ کے کچھ ساتھی میرے درپے ہوگئے اور میرے کپڑے کھینچنے لگے اور برا بھلا کہنے لگے۔ ایسا لگا کہ میں نے کوئی بری بات کہی ہے۔ میں تو صرف آپ ﷺ کو تقویت دینے کے لیے کھڑا ہوا تھا۔'' انھوں نے جواب دیا: ''تیرا برا ہو، واپس آجا، ہم رسول اللہ ﷺ سے تیرے لیے معافی طلب کرتے ہیں۔'' وہ کہنے لگا: ''اللہ کی قسم! مجھے معافی طلب کرنے کی حاجت نہیں۔''[1]

احد پہاڑ کی مسلمانوں سے محبت

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو خیبر سے واپسی پر احد پہاڑ دکھائی دیا تو آپ ﷺ فرمانے لگے: «هٰذَا جَبَلٌ يُحِبُّنَا وَنُحِبُّهُ» ''یہ وہ پہاڑ ہے جو ہم سے محبت کرتا ہے اور ہم اس سے محبت کرتے ہیں۔''[2]

یہ بات رسول اللہ ﷺ کے شعور کی لطافت پر دلالت کرتی ہے۔ آپ ﷺ نے مسلمانوں کے احد پہاڑ کو اپنا دفاعی ذریعہ بنانے اور اللہ تعالیٰ کی اس پہاڑ کو ودیعت کردہ خوبی اور صلاحیت کے درمیان باہم گہرا ربط قائم کردیا۔ اور اسے دوستی و تعلق کے بلند ترین احساسات، یعنی لفظِ محبت سے تعبیر کیا۔ برملا کہا جاسکتا ہے کہ جو ہستی ایک بے جان ٹھوس پتھر کی فضیلت کی معترف ہے اور اس کے متعلق ایسے بلند تر اخلاق کا اظہار کررہی ہے تو لازماً بنی نوعِ انسان کے کمتر احسان کی بھی معترف ضرور ہوگی۔ جب جمادات سے آپ ﷺ کی وفا اور پاسداری اتنی بلند تر ہے کہ بڑے لطیف اور بلند تر کلمات ادا کررہے ہیں تو بنی نوعِ انسان میں سے وفاداروں کے ساتھ اور خصوصاً جن کے ساتھ آپ کا اللہ کے لیے بھائی چارہ تھا، ان کے ساتھ آپ کے اخلاقِ عالیہ کا کیا کہنا ہوگا!![3]

اس حدیث شریف میں کئی ایک مفاہیم پنہاں ہیں۔ کچھ کا تذکرہ حمیدی نے کیا ہے اور

[1] البداية والنهاية: 53/4، والسيرة النبوية لابن هشام: 111/3. [2] صحيح البخاري، حديث: 2889، وصحيح مسلم، حديث: 1365. [3] التاريخ الإسلامي للحميدي: 198/5.

کچھ وہ ہیں جو استاد صالح الشامی یوں بیان کرتے ہیں: ''انسان کی عادت ہے کہ وہ کسی پہنچنے والی مصیبت اور اس کی جگہ اور وقت میں تعلق جوڑ لیتا ہے۔ یہ فرمانِ عالی مقام حق کی وضاحت کے طور پر تھا کہ اسلام آنے کے بعد بھی یہ عادت ساتھ ساتھ جاری وساری نہ رہے۔

اس میں یہ خدشہ لاحق تھا کہ معرکے کے بعد بھی مسلمان احد پہاڑ پر کھڑے اس گزشتہ معرکے کو یاد کریں گے، لہٰذا آپ ﷺ نے واضح کر دیا کہ جگہ اور وقت اللہ تعالیٰ کی مخلوقات ہیں تا کہ ان کے ذہنوں میں کوئی ایسا وہم پیدا نہ ہو اور انھیں یہ یقین ہو جائے کہ زمان و مکان اور ان میں ہونے والے امور و افعال کا کوئی باہمی تعلق نہیں ہوتا۔ تمام تر معاملات تو اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی راہ میں شہادت صاحب شہادت کے لیے عزت کا مقام ہے نہ کہ مصیبت کا۔ ایمان کے تقاضے کے مطابق مفاہیم و مطالب اس طرح دلوں میں جاگزیں ہوتے ہیں۔ اسی مفہوم کے تحت ''اُحد'' قابل تکریم اور محبت کا مرکز خیال کیا جانے لگا۔ اور وہ کیوں نہ قابل ستائش ہوا سے اللہ تعالیٰ نے سید الشہداء حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کی جائے قرار کے طور پر پسند فرمایا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جنھیں اللہ تعالیٰ نے اس دن کے لیے منتخب فرمایا تو انھوں نے اس کی رضا و چاہت کی تمنا میں اپنی جانوں تک کا نذرانہ پیش کر دیا۔''[1]

غزوۂ احد میں فرشتوں کی آمد

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے احد کے دن رسول اللہ ﷺ کی دائیں اور بائیں طرف دو آدمیوں کو دیکھا جو سفید کپڑے پہنے ہوئے آپ ﷺ کی طرف سے خوب لڑ رہے تھے۔ میں نے ان دونوں کو اس سے پہلے دیکھا تھا نہ بعد میں، یعنی انھوں نے حضرت جبریل علیہ السلام اور حضرت میکائیل علیہ السلام کو دیکھا۔[2]

---

1 من معين السيرة لصالح الشامي، ص:427. 2 صحيح البخاري، حديث:4054، و صحيح مسلم، حديث:2306.

جنگ احد میں فرشتوں نے صرف آپ ﷺ کے دفاع کے لیے شرکت کی تھی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی حفاظت کی ضمانت لے رکھی تھی۔ نبی ﷺ کے دفاع میں فرشتوں کی اس جنگ کے علاوہ غزوۂ احد میں کسی صحیح حدیث سے فرشتوں کا قتال ثابت نہیں۔ ہاں! اللہ تعالیٰ نے مدد کا وعدہ ضرور کیا تھا مگر وہ وعدہ تین امور سے مشروط تھا: ① صبر ② تقوی ③ دشمن اگر اچانک آجائے۔ نہ یہ شرائط پوری ہوئیں اور نہ ہی امداد حاصل ہوئی۔[1]

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِذْ تَقُولُ لِلْمُؤْمِنِينَ أَلَنْ يَكْفِيَكُمْ أَنْ يُمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلَاثَةِ آلَافٍ مِّنَ الْمَلَائِكَةِ مُنْزَلِينَ ○ بَلَىٰ ۚ إِنْ تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا وَيَأْتُوكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هَٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ آلَافٍ مِّنَ الْمَلَائِكَةِ مُسَوِّمِينَ ○﴾

"(اے نبی!) جب آپ مومنوں سے کہہ رہے تھے: کیا تمھارے لیے کافی نہ ہوگا کہ اللہ آسمان سے تین ہزار فرشتے اتار کر تمھاری مدد کرے؟ کیوں نہیں! اگر تم صبر کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو اور دشمن تم پر فوراً چڑھ آئے تو اسی لمحے تمھارا رب پانچ ہزار فرشتوں سے تمھاری مدد کرے گا جن کے (خاص) نشان لگے ہوں گے۔"[2]

سورۂ انفال اور آل عمران کی روشنی میں فتح و شکست کے قوانین

سورۂ انفال میں غزوۂ بدر کے متعلق قدرے تفصیل ذکر کی گئی ہے۔ اور سورۂ آل عمران میں غزوۂ احد کے متعلق وضاحت ہے۔ ان کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ امتِ مسلمہ وہ مطالب و مفاہیم بخوبی جان سکے جن کا تعلق قضاء و قدر، موت و حیات، فتح و شکست، نفع و نقصان اور ایمان و نفاق سے ہے۔ علاوہ ازیں انھیں ابتلاء و آزمائش میں کامیاب اور دشمن کے عزائم خاک میں ملانے کے طریقے سے آگاہی بھی ہوجائے، چنانچہ واقعاتِ بدر و احد اور سورۂ انفال و آل عمران سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ان آیات کی روشنی میں فتح و شکست کے مفاہیم

[1] السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري: 391/2. [2] آل عمرٰن 3:124، 125.

اچھی طرح سمجھ لیے۔ ان مفاہیم کو خلاصتاً درج ذیل نکات میں بیان کیا جا سکتا ہے:

❁ اول و آخر مدد صرف اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے اور اس پر کسی بھی مخلوق کا کنٹرول نہیں ہے۔ وہ جسے چاہے عنایت فرمائے، جس سے چاہے اپنی نصرت و اعانت پھیر لے۔ یہ بھی رزق، موت اور دیگر اعمال ہی کی طرح ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

﴿وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰی وَلِتَطْمَئِنَّ بِهٖ قُلُوْبُكُمْ ۚ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝﴾

"اور اس (مدد) کو اللہ نے خوشخبری بنا دیا تاکہ اس سے تمھارے دلوں کو تسلی ہو جائے اور مدد تو اللہ ہی کے پاس ہے۔ بے شک اللہ غالب ہے، خوب حکمت والا۔"[1]

❁ جب اللہ تعالیٰ (فتح) مدد کا فیصلہ فرمالے تو زمین کی جملہ قوتیں اس میں رکاوٹ نہیں بن سکتیں۔ اس طرح جب وہ شکست مقدر کر دے تو زمین کی تمام قوتیں ملکر بھی امت کو شکست سے دوچار ہونے سے نہیں بچا سکتیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۚ وَاِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِهٖ ۗ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝﴾

"اگر اللہ تمھاری مدد کرے تو کوئی تم پر غالب نہیں آسکتا اور اگر وہ تمھیں بے یار و مددگار چھوڑ دے تو پھر کون ہے جو اس کے بعد تمھاری مدد کر سکے؟ اور مومنوں کو اللہ ہی پر بھروسا کرنا چاہیے۔"[2]

❁ اللہ تعالیٰ کے ہاں فتح و نصرت کے طے شدہ مقدس قوانین ہیں جنھیں سمجھنے کی ضرورت ہے، لہٰذا خدائی لشکر کہلانے والوں کی کشور کشائی خالصتاً اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہو۔ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ ۝﴾

[1] الأنفال 10:8۔ [2] آل عمران 160:3۔

''اے ایمان والو! اگر تم اللہ (کے دین) کی مدد کرو گے تو وہ تمھاری مدد کرے گا اور تمھارے قدم ثابت رکھے گا۔''[1]

اللہ تعالیٰ کی مدد اس کے احکام پر لبیک کہنے، اس کے بیان کردہ منہج پر قائم دائم رہنے اور اس کی راہ میں جہاد کرنے کی صورت ہی میں مل سکتی ہے۔

❊ باہمی یک جہتی اور یگانگت مدد کی بنیاد ہے، جبکہ اختلاف رائے اور انتشار ہلاکت و شکست کا باعث ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ وَاصْبِرُوْا ۚ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝﴾

''اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور آپس میں جھگڑا نہ کرو ورنہ تم ہمت ہار بیٹھو گے اور تمھاری ہوا اکھڑ جائے گی۔ اور صبر کرو، بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔''[2]

❊ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کا دم بھرنا اور اس سے روگردانی نہ کرنا فتح و نصرت کی بنیاد ہے، جبکہ نافرمانی شکست کی جانب لے جاتی ہے۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ وَاصْبِرُوْا ۚ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝﴾

''اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور آپس میں جھگڑا نہ کرو ورنہ تم ہمت ہار بیٹھو گے اور تمھاری ہوا اکھڑ جائے گی۔ اور صبر کرو، بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔''[3]

❊ دنیا کی محبت اور دیوانگی امت کو اللہ تعالیٰ کی نصرت سے محروم کر دیتی ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

---

[1] محمد 7:47. [2] الأنفال 46:8. [3] الأنفال 46:8.

﴿حَتّٰٓی اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِی الْاَمْرِ وَعَصَیْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ؕ مِنْكُمْ مَّنْ یُّرِیْدُ الدُّنْیَا وَمِنْكُمْ مَّنْ یُّرِیْدُ الْاٰخِرَةَ﴾

”یہاں تک کہ جب تم نے کم ہمتی اختیار کی اور اپنی ذمہ داری کے بارے میں جھگڑنے لگے اور جونہی اللہ نے تمھیں وہ چیز (مال غنیمت کی جھلک) دکھائی جس سے تم محبت کرتے تھے تو تم نے نافرمانی کی، (اس لیے کہ) تم میں سے کچھ لوگ دنیا کو چاہتے تھے اور کچھ آخرت کی خواہش رکھتے تھے۔“[1]

❁ تعداد کی کمی اور سامانِ جنگ کی قلت شکست کا سبب نہیں۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝﴾

”اور اللہ نے بدر میں عین اس وقت تمھاری مدد کی جب تم کمزور تھے۔ پس تم اللہ سے ڈرو تاکہ تمھیں شکر ادا کرنے کی توفیق ہو۔“[2]

❁ ہاں، دشمن سے نبرد آزما ہونے کے لیے وسائل کی تیاری اور شعور کی بیداری ضروری چیز ہے، ارشاد الٰہی ہے:

﴿وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَیْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِیْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ ۚ اَللّٰهُ یَعْلَمُهُمْ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَیْءٍ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ یُوَفَّ اِلَیْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ۝﴾

”اور ان (کافروں کے مقابلے) کے لیے تم مقدور بھر قوت اور بندھے ہوئے گھوڑے تیار رکھو جن سے تم اللہ کے دشمنوں اور اپنے دشمنوں کو اور ان کے علاوہ دوسروں کو ڈرائے رکھو جنھیں تم نہیں جانتے (مگر) اللہ انھیں جانتا ہے اور تم اللہ کی راہ میں جو کچھ خرچ کرو گے تمھیں (اس کا) پورا پورا ثواب دیا جائے گا۔ اور تم پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔“[3]

[1] آل عمرٰن 152:3. [2] آل عمرٰن 123:3. [3] الأنفال 60:8.

❁ دشمن سے رزم آرائی کے وقت صبر کا مظاہرہ کرتے ہوئے ثابت قدم رہنا بھی نصرت کے حصول کے بنیادی اسباب میں سے ہے۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَقِيتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوا وَاذْكُرُوا اللَّهَ كَثِيرًا لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۝ ﴾

''اے ایمان والو! جب کسی گروہ سے تمھارا آمنا سامنا ہو تو ثابت قدم رہو اور اللہ کو بہت یاد کرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔''[1]

اور فرمایا:

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوهُمُ الْأَدْبَارَ ۝ ﴾

''اے ایمان والو! جب تمھارا ان لوگوں کے لشکر سے مقابلہ ہو جنھوں نے کفر کیا تو تم ان سے پیٹھیں نہ پھیرو۔''[2]

❁ دشمن سے مڈبھیڑ کے وقت ثابت قدمی اور صبر کے حصول کے لیے کثرت سے ذکر و اذکار معاون ثابت ہوتے ہیں۔ اور اللہ کی یاد کے لیے ضروری ہے کہ دل اسی کی طرف متوجہ ہو کیونکہ وہی مدد اتارنے والا ہے، اسی سے مدد طلب کی جائے، اسی پر بھروسا کیا جائے اور اپنی طاقت وقوت سے تہی دامن ہونے کا اظہار کیا جائے اور محض اپنی تعداد، استعداد اور اپنی ذات پر اعتماد نہ کیا جائے۔ یہ سب کچھ نصرت کے عوامل میں سے ہے۔[3]

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَقِيتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوا وَاذْكُرُوا اللَّهَ كَثِيرًا لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۝ ﴾

''اے ایمان والو! جب کسی گروہ سے تمھارا آمنا سامنا ہو تو ثابت قدم رہو اور اللہ

---

[1] الأنفال 8:45. [2] الأنفال 8:15. [3] فقه السيرة النبوية للدكتور الغضبان، ص: 463.

کو بہت یاد کرو تا کہ تم فلاح پاؤ۔“ [1]

شہداء کا مقام و مرتبہ اور فضیلت

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

«لَمَّا أُصِيبَ إِخْوَانُكُمْ بِأُحُدٍ، جَعَلَ اللّٰهُ أَرْوَاحَهُمْ فِي أَجْوَافِ طَيْرٍ خُضْرٍ، تَرِدُ أَنْهَارَ الْجَنَّةِ، وَتَأْكُلُ مِنْ ثِمَارِهَا، وَ تَأْوِي إِلٰى قَنَادِيلَ مِنْ ذَهَبٍ فِي ظِلِّ الْعَرْشِ، فَلَمَّا وَجَدُوا طِيبَ مَشْرَبِهِمْ، وَ مَأْكَلِهِمْ، وَ حُسْنَ مَقِيلِهِمْ، قَالُوا: يَا لَيْتَ إِخْوَانَنَا يَعْلَمُونَ مَا صَنَعَ اللّٰهُ بِنَا لِئَلَّا يَزْهَدُوا فِي الْجِهَادِ، وَلَا يَنْكُلُوا عَنِ الْحَرْبِ! فَقَالَ عَزَّوَجَلَّ: أَنَا أُبَلِّغُهُمْ عَنْكُمْ، فَأَنْزَلَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ عَلٰى رَسُولِهِ ﷺ هٰذِهِ الْآيَاتِ»

”جنگِ احد میں جب تمھارے بھائی شہید ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی روحوں کو سبز پرندوں کے قالبوں میں رکھا۔ وہ جنت کی نہروں پر آتی اور جنت کے باغوں کے پھل کھاتی ہیں۔ اور عرش کے سایے میں سونے کی قندیلوں میں بسیرا کرتی ہیں، پھر جب ان روحوں نے اپنے کھانے پینے کی اشیا کے مزے اور اپنی آرام گاہ کی خوبیوں کا نظارہ کیا تو وہ کہنے لگیں: ”کاش! ہمارے بھائیوں کو یہ بات معلوم ہوجاتی کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں کس قدر اعزاز سے نوازا ہے تا کہ وہ جہاد سے بے رغبتی کریں نہ میدانِ جنگ سے گریزاں ہوں۔“ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”تمھاری جانب سے یہ پیغام میں پہنچادیتا ہوں۔“ لہٰذا اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ پر یہ آیات نازل فرمائیں:

[1] الأنفال 45:8.

﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ۝ فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَيَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ يَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ وَّاَنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝﴾

''ان لوگوں کو مردہ خیال نہ کرو جو اللہ کے راستے میں مارے گئے ہیں بلکہ وہ زندہ ہیں، انھیں ان کے رب کے ہاں رزق دیا جاتا ہے۔ جو کچھ اللہ نے اپنے فضل سے انھیں دیا اس پر وہ خوش ہیں اور ان (مومنوں) کے بارے میں بھی خوشی محسوس کرتے ہیں جو ابھی تک ان سے نہیں ملے اور ان کے پیچھے (دنیا میں) رہ گئے ہیں کہ انھیں نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ وہ اللہ کی نعمت اور اس کے فضل (کے عطا ہونے) پر خوشی محسوس کرتے ہیں۔ اور بے شک اللہ مومنوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔''[1]

امام واحدی نے حضرت سعید بن جبیر سے سابقہ آیات کی تفسیر میں ذکر کیا ہے کہ جب حضرت حمزہ بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ اور حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ احد کے دن شہادت سے نوازے گئے۔ اس کے نتیجے میں انھوں نے جو مقام و مرتبہ پایا تو اسے دیکھ کر وہ یہ خواہش کرنے لگے: ''کاش! ہمارے بھائی ہمارے مقام و مرتبہ کو جان لیں تاکہ ان میں جہاد کی چاہت اور رغبت اور زیادہ ہو جائے۔'' تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''انھیں تمھاری طرف سے یہ بات میں پہنچاتا ہوں۔'' تب اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیات اتاریں۔[2]

امام مسلم رحمہ اللہ نے مسروق کے واسطے سے بیان کیا ہے کہ ہم نے عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے ان مذکورہ آیات کے متعلق دریافت کیا تو ابن مسعود رضی اللہ عنہ کہنے لگے: ''ہم نے ان کے

[1] آل عمران 3:169-171. مسند أحمد: 1/266، وسنن أبي داود، حديث: 2520، ومسند أبي يعلى: 4/219، حديث: 2331، وتفسير الطبري: 4/170. [2] أسباب النزول للواحدي، ص: 125، و تفسير الطبري: 4/269.

متعلق رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا تھا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«أَرْوَاحُهُمْ فِي جَوْفِ طَيْرٍ خُضْرٍ، لَّهَا قَنَادِيلُ مُعَلَّقَةٌ بِالْعَرْشِ تَسْرَحُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ شَائَتْ، ثُمَّ تَأْوِي إِلٰى تِلْكَ الْقَنَادِيلِ، فَاطَّلَعَ إِلَيْهِمْ رَبُّهُمُ اطِّلَاعَةً، فَقَالَ: هَلْ تَشْتَهُونَ شَيْئًا؟ قَالُوا: أَيَّ شَيْءٍ نَّشْتَهِي؟ وَنَحْنُ نَسْرَحُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ شِئْنَا، فَفَعَلَ ذٰلِكَ بِهِمْ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ، فَلَمَّا رَأَوْا أَنَّهُمْ لَنْ يُّتْرَكُوا مِنْ أَنْ يُّسْأَلُوا، قَالُوا: يَارَبِّ! نُرِيدُ أَنْ تَرُدَّ أَرْوَاحَنَا فِي أَجْسَادِنَا حَتّٰى نُقْتَلَ فِي سَبِيلِكَ مَرَّةً أُخْرٰى، فَلَمَّا رَأٰى أَنْ لَّيْسَ لَهُمْ حَاجَةٌ تُرِكُوا»

''شہیدوں کی روحیں سبز پرندوں کے قالب میں ہوتی ہیں۔ ان کے لیے عرش کے ساتھ قندیلیں لٹک رہی ہیں۔ وہ جنت میں جہاں چاہتی ہیں چرتی پھرتی ہیں، پھر اپنی قندیلوں میں راحت و آرام کرتی ہیں۔ ایک بار ان کے پروردگار نے انھیں دیکھا اور فرمایا: ''تم کچھ چاہتی ہو؟'' انھوں نے کہا: ''اب ہم کیا چاہیں گی ہم تو جنت میں جہاں چاہتی ہیں چگتی پھرتی ہیں۔'' اللہ تعالیٰ نے ان سے اسی طرح تین بار پوچھا۔ جب انھوں نے دیکھا کہ ان سے یہ سوال ہونا ہی ہونا ہے تو وہ کہنے لگیں: ''اے ہمارے پروردگار! ہم یہ چاہتی ہیں کہ ہمیں ہمارے جسموں میں پھیر دے تاکہ ہم دوبارہ تیری راہ میں شہید کی جائیں۔'' جب اللہ تعالیٰ نے دیکھ لیا کہ ان کی کوئی خواہش نہیں تو ان سے مزید سوال نہیں کیا گیا۔''[1]

مشرکین کے خلاف میڈیا وار

عہد نبوی میں میڈیا کی جنگ شعر گوئی پر مبنی تھی۔ بدر میں مشرکوں کے شعراء کا انداز

[1] صحیح مسلم، حدیث: 1887.

دفاعی اور مرثیہ خوانی پر مبنی تھا۔ احد کے موقع پر قریش کے شعراء نے اپنی ظاہری جیت کو بہت بڑی فتح کی صورت میں پھیلانے کی ٹھان لی، چنانچہ انھوں نے اسے رائی کا پہاڑ بنا دیا۔ ان کے اس غرور اور گھمنڈ کا مقابلہ کرنے کے لیے حضرت حسان بن ثابت، حضرت کعب بن مالک اور حضرت عبد اللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہم سامنے آئے تاکہ وہ مشرکوں کی اس میڈیا وار کا منہ توڑ جواب دیں۔ مشرکین کی طرف سے میڈیا وار ان کے شعراء ہبیرہ بن ابووہب، عبد اللہ بن زبعری، ضرار بن خطاب اور عمرو بن عاص کر رہے تھے۔[1]

حضرت حسان رضی اللہ عنہ کے اشعار مشرکین پر میزائل بن کر گرتے رہے۔ جنگ میں مسلمانوں نے مشرکوں کے تمام علم برداروں کا صفایا کر دیا تھا، لہٰذا علم تھامنے والا ان کا کوئی سردار باقی نہ بچا حتی کہ ایک عورت نے ان کا علم تھاما۔ حضرت حسان رضی اللہ عنہ نے اس معاملے میں مسلمانوں کی شجاعت کے قصیدے پڑھے اور مشرکین کو بزدلی کا طعنہ دیتے رہے۔ مشرکوں نے جنگ کے آغاز میں جس بزدلی اور ذلت کا سامنا کیا تھا انھیں وہ یاد کرا کے ان کی برابر مذمت کی تاکہ جنگ کے اختتام پر مسلمانوں کو جس صورت حال کا سامنا کرنا پڑا اس پر مشرکین غرور نہ کریں۔ حضرت حسان رضی اللہ عنہ نے تو اس وقت گویا مشرکوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جب انھیں شرم دلائی کہ وہ جنگ میں علَم تھامنے کے قابل نہ رہے بالآخر ایک عورت نے آگے بڑھ کر اسے تھاما۔ دراصل اس طرح در پردہ انھیں سخت بزدلی کا طعنہ دینا مقصود تھا۔[2]

عمرہ بنت علقمہ حارثیہ اور اس کے علَم تھامنے پر تبصرہ کرتے ہوئے حضرت حسان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

''جب عضل جال میں جکڑے ہوئے ایسے ہرنوں کی طرح ہماری طرف لائے گئے جن کے ابروؤں پر نشان لگے ہوں۔

[1] من معين السيرة لصالح الشامي، ص:253,252. [2] التاريخ الإسلامي للحميدي: 21/5.

اس وقت ہم نے ان پر نہایت ہلاکت خیز اور عبرتناک نیزہ بازی کی اور ہر طرف سے تلواریں مار مار کر لاشوں کے انبار لگا دیے۔

اگر عمرہ حارثیہ جھنڈا نہ اٹھاتی تو وہ بازاروں میں سامانِ تجارت کی طرح فروخت کیے جاتے۔"[1]

اور جب عمرہ حارثیہ سے جھنڈا بنو طلحہ کے ایک حبشی غلام صؤاب نے تھام لیا اور وہ انتہائی پامردی و بہادری سے لڑا تو حضرت حسان رضی اللہ عنہ نے اس مناسبت سے بھی اشعار کہے:

"تم نے اپنے جھنڈے پر فخر کیا ہے، حالانکہ تمھارا یہ فخر گھٹیا ترین فخر ہے کیونکہ بالآخر یہ جھنڈا صؤاب (غلام) کے ہاتھ میں پہنچ گیا تھا۔

جھنڈے کے بارے میں تم نے یہ فخر ایک غلام کے بل پر حاصل کیا ہے۔ اور اس شخص کے ہاتھوں تم نے یہ فخر حاصل کیا ہے جو روئے زمین پر بسنے والوں میں سے گھٹیا ترین ہے۔

تم نے گمان سے کام لیا ہے اور احمقوں کا گزارہ گمانوں ہی پر ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ گمان درستگی سے دور ہی ہوتا ہے۔"

حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ نے قریش کے کسی شاعر کا رد کرتے ہوئے کہا:

"قریش کو میرا یہ پیغام پہنچا دو اور سب سے بہتر قول وہ ہوتا ہے جو سب سے سچا ہو اور اہل دانش کے نزدیک سچائی ہی مقبول ہے۔

ہم نے اپنے شہداء کے عوض تمھارے علمبرداروں کو موت کے گھاٹ اتارا ہے، لہٰذا بتاؤ لوگوں میں کس معاملے کا زیادہ تذکرہ ہوتا ہے؟

جنگ بدر میں ہماری تمھاری رزم آرائی ہوئی۔ ہمیں کمک حاصل تھی جس میں ساتھ ساتھ میکائیل اور جبرائیل بھی تھے۔

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 87/3.

تم اگر ہمیں قتل بھی کردو گے تو کیا، دینِ حق ہماری فطرت ہے اور حق کے معاملے میں شہید ہو جانا اللہ تعالیٰ کے نزدیک بڑی فضیلت کا باعث ہے۔

اور اگر تم اپنی رائے کے مطابق یہ سمجھتے ہو کہ ہمارا معاملہ بے وقوفی پر مبنی ہے تو سمجھ لو کہ اسلام مخالف شخص کی رائے سراسر گمراہی اور بے راہ روی پر مشتمل ہے۔''[1]

مشرکوں اور مسلمانوں کے درمیان میڈیا کی اس جنگ میں ضرار بن خطاب کے اشعار بھی بڑے تعجب خیز ہیں۔ یہ اشعار انھوں نے اسلام لانے سے قبل رسول اللہ ﷺ اور مہاجرین کی بدر میں فتح پر فخریہ انداز سے کہے تھے:

فَإِنْ تَظْفَرُوا فِي يَوْمِ بَدْرٍ فَإِنَّمَا ... بِأَحْمَدَ أَمْسٰى جَدُّكُمْ وَهُوَ ظَاهِرُ

وَبِالنَّفَرِ الْأَخْيَارِ هُمْ أَوْلِيَاؤُهُ ... يُحَامُونَ فِي اللَّأْوَاءِ وَالْمَوْتُ حَاضِرُ

يُعَدُّ أَبُو بَكْرٍ وَحَمْزَةُ فِيهِمْ ... وَيُدْعٰى عَلِيٌّ وَسْطَ مَنْ أَنْتَ ذَاكِرُ

وَيُدْعٰى أَبُو حَفْصٍ وَعُثْمَانُ مِنْهُمْ ... وَسَعْدٌ إِذَا مَا كَانَ فِي الْحَرْبِ حَاضِرُ

أُولٰئِكَ لَا مَنْ نَتَّجَتْ مِنْ دِيَارِهَا ... بَنُو الْأَوْسِ وَالنَّجَّارِ حِينَ تُفَاخِرُ

''تم بدر کے دن فتح یاب ہوئے تو ظاہر ہے کہ یہ صرف احمد (ﷺ) کی بنا پر ہوا۔

اور وہ فتح اس کے بہترین ساتھیوں کی بنا پر تھی جو سختی و رنج کے وقت جب موت سامنے نظر آرہی تھی، اس کا دفاع کر رہے تھے۔

ابوبکر اور حمزہ (رضی اللہ عنہما) انھی بہترین رفقاء میں شمار ہوتے ہیں۔ تو اس باب میں جن کا بھی تذکرہ کرے ان میں علی (رضی اللہ عنہ) کا نام بھی واضح طور پر لے۔

ان کے ساتھ ساتھ ابوحفص عمر، عثمان اور سعد (رضی اللہ عنہم) بھی جنگ میں شریک تھے۔

یہ مذکورہ لوگ وہ ہیں جن کی وجہ سے فتح حاصل ہوئی۔ اس علاقے کے لوگوں کی

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 164/3.

وجہ سے فتح حاصل نہیں ہوئی جہاں بنو اوس اور بنو نجار پیدا ہوئے۔ جب تو فخر کرے (تو اس حقیقت کا خیال رکھ)‘‘ [1]

ان اشعار میں شاعر نے آہستہ آہستہ خاندانی عصبیت والا جاہلی انداز اختیار کرلیا جس کا حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے اس طرح جواب دیا:

وَفِينَا رَسُولُ اللّٰهِ وَالْأَوْسُ حَوْلَهٗ لَهٗ مَعْقِلٌ مِّنْهُمْ عَزِيزٌ وَنَاصِرُ
وَجَمْعُ بَنِي النَّجَّارِ تَحْتَ لِوَائِهٖ يُمَشَّوْنَ فِي الْمَاذِي وَالنَّقْعُ ثَائِرُ

’’ہم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم موجود ہیں جن کے اردگرد اوس ہیں۔ ان کی صورت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو محفوظ اور مضبوط پناہ گاہ میسر ہے۔ اور بنو نجار کا سارا لشکر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جھنڈے تلے ایسی تکلیف دہ حالت میں شام کررہے ہیں کہ جنگ کا غبار اڑ رہا ہے۔‘‘

کعب رضی اللہ عنہ مزید کہتے ہیں:

وَكَانَ رَسُولُ اللّٰهِ قَدْ قَالَ أَقْبِلُوا فَوَلُّوا وَقَالُوا: إِنَّمَا أَنْتَ سَاحِرُ
لِأَمْرٍ أَرَادَ اللّٰهُ أَنْ يَّهْلِكُوا بِهٖ وَلَيْسَ لِأَمْرٍ حَمَّهُ النَّارُ زَاجِرُ

’’رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے کہا تھا: آجاؤ! (اسلام قبول کرلو!) تو وہ یہ کہتے ہوئے پیٹھ پھیر گئے کہ آپ تو جادوگر ہیں۔

یہ اس لیے ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ وہ اپنے اسی انکار کی وجہ سے ہلاک ہوں، جس معاملے کو دھمکانے والی آگ نے گرمایا ہوا سے کوئی ٹھنڈا کرنے والا نہیں ہوتا۔‘‘

اسی طرح ایک اور شعر میں اسے جواب دیا جس کا ترجمہ یہ ہے:

’’اور بدر کے دن سے، جب ہم ان کے چہرے بدل رہے تھے، اس وقت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور جبریل بھی ہمارے جھنڈے تلے تھے۔‘‘

صاحبِ عقد الفرید کے بقول یہ شعر عرب کے تمام اشعار سے زیادہ فخر والا ہے۔ [2]

---

1 من معين السيرة لصالح الشامي، ص:252. 2 من معين السيرة لصالح الشامي، ص:252.

حصہ 12

غزوۂ احد اور خندق کے درمیان کے اہم واقعات

هُوَ الَّذِيْٓ اَخْرَجَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ دِيَارِهِمْ لِاَوَّلِ الْحَشْرِ ۭمَا ظَنَنْتُمْ اَنْ يَّخْرُجُوْا وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مَّانِعَتُهُمْ حُصُوْنُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَاَتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ حَيْثُ لَمْ يَحْتَسِبُوْا ....

”وہی ہے جس نے اہلِ کتاب کے کافروں کو پہلی جلاوطنی کے وقت ان کے گھروں سے نکال دیا، تم نے کبھی یہ خیال نہیں کیا تھا کہ وہ (وہاں سے) نکلیں گے، اور انھوں نے سمجھا تھا کہ بے شک ان کے قلعے انھیں اللہ (کے عذاب) سے بچالیں گے، پھر ان کے پاس اللہ (کا عذاب) آیا جہاں سے انھوں نے گمان بھی نہیں کیا تھا، اور اس نے ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا، وہ اپنے گھر اپنے ہاتھوں اجاڑتے تھے اور مومنوں کے ہاتھوں بھی، تو اے آنکھوں والو! عبرت پکڑو۔“

(الحشر 2:59)

اِنَّ الَّذِيْنَ جَاۗءُوْ بِالْاِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنْكُمْ ۭ لَا تَحْسَبُوْهُ شَرًّا لَّكُمْ ۭ بَلْ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۭ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ مَّا اكْتَسَبَ مِنَ الْاِثْمِ ۚ

”بے شک جو لوگ (ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر) بہتان گھڑ لائے وہ تمھی میں سے ایک گروہ ہیں، تم اسے اپنے لیے برا نہ سمجھو، بلکہ وہ تمھارے لیے بہتر ہے، ان میں سے ہر شخص کے لیے اتنا ہی گناہ ہے جو اس نے کمایا۔“

(النور 11:24)

باب 1

حکومتِ اسلامیہ کو کمزور کرنے کی کوششیں اور چند متفرق واقعات

غزوۂ احد کے نتائج کے پیشِ نظر اسلامی حکومت کے دشمنوں کو اس کے خلاف سازشیں کرنے اور لوگوں کو اس کے خلاف ابھارنے کا موقع ہاتھ آ گیا۔ بدوی مشرکین میں یہ احساس ابھرا کہ مسلمانوں پر غلبہ پانا اور انھیں زیر کرنا بھی ممکن ہے۔ دوسرے مشرکین مسلمانوں کو نیست و نابود کرنے اور ان کی شان و شوکت کو ختم کرنے کے لیے مدینہ منورہ پر چڑھائی کا سوچنے لگے، اسی طرح بنو اسد کی نگاہیں اسلامی حکومت کی طرف اٹھنے لگیں۔

ادھر خالد بن سفیان ہذلی نے بکھری ہوئی اسلام دشمن طاقتوں کو جمع کر کے مدینہ پر حملہ کرنے کا پروگرام تشکیل دیا۔ قبیلہ عضل اور قارہ نے مسلمانوں کو دھوکا دے کر بدعہدی کرنے کی جرأت کی۔ عامر بن طفیل اٹھا اور اس نے اسلام کے پُر امن داعی قرائے کرام کو شہید کر دیا۔ بنو نضیر کے یہود نے تو رسول اللہ ﷺ پر اچانک بے خبری میں حملہ کر کے شہید کر دینے کی ناپاک جسارت بھی کی۔ ان تمام سازشوں اور اوچھے ہتھکنڈوں کا مقابلہ حبیب کبریا ﷺ نے بڑی بہادری، دانشمندانہ سیاسی پالیسی اور پُر امن منصوبہ بندی سے کیا۔

مملکتِ اسلامیہ کے خلاف بنو اسد کی ریشہ دوانیاں اور اس کا نتیجہ

بنو اسد طلیحہ اسدی کی سرکردگی میں مدینہ منورہ پر چڑھائی کا ارادہ رکھتے تھے۔ اس حملے کے مذموم مقاصد یہ تھے کہ مدینہ منورہ کی نعمتیں اور بھلائیاں ان کے ہاتھ لگ جائیں اور کفر و شرک کی حمایت کے ساتھ ساتھ وہ مسلمانوں کے خلاف قریش کی طرفداری کر سکیں۔

بنو اسد کے اس قسم کی تیاریوں میں مگن ہونے کی اطلاع رسول اللہ ﷺ کو جزیرۂ عرب میں پھیلائے ہوئے جاسوسوں کی بدولت مل چکی تھی، چنانچہ آپ ﷺ نے انتہائی مستعدی سے ابوسلمہ بن عبدالاسد مخزومی کی قیادت میں ایک سو پچاس مہاجرین و انصار پر مبنی لشکر ترتیب دیا۔ اور انھیں علَم تھماتے ہوئے فرمایا کہ تم بنو اسد کے علاقے میں جاؤ اور اس سے پہلے کہ وہ تمھارے خلاف اکٹھے ہو جائیں، ان پر اچانک حملہ کر دو۔[1]

حضرت ابوسلمہ رضی اللہ عنہ ان کی جانب ماہِ محرم میں گئے۔[2]

وہاں پہنچ کر ابوسلمہ رضی اللہ عنہ نے ان کے چوپاؤں پر اچانک حملہ کیا تو وہ جدھر منہ آیا بھاگ کھڑے ہوئے۔ مسلمانوں نے ان کے جانوروں کو قابو کر لیا، اس طرح انھیں دشمنانِ اسلام کو بکھیرنے میں کوئی مشقت نہ اٹھانی پڑی اور وہ کامیاب مدینہ منورہ پلٹ آئے۔ حضرت ابوسلمہ رضی اللہ عنہ کا شمار سابقین اولین میں سے ہوتا ہے۔ ابوسلمہ رضی اللہ عنہ اس غزوے سے تھکے ماندے واپس ہوئے تو احد میں لگا زخم اچانک ہرا ہو گیا اور وہ تھوڑے ہی عرصے میں فوت ہو گئے۔[3]

سریہ ابوسلمہ رضی اللہ عنہ سے حاصل ہونے والے اہم اسباق: رسولِ گرامی ﷺ کی جنگی منصوبہ بندی کی عمدگی اور لطافت کا اظہار کہ دشمن کے اکٹھے ہونے سے پہلے ہی انھیں منتشر کر دیا۔ ابوسلمہ رضی اللہ عنہ کے چھوٹے سے لشکر کے آنے سے وہ گھبراہٹ میں پڑ گئے، جبکہ ان کا خیال یہ تھا کہ جنگ احد نے مسلمانوں کو اس قدر کمزور کر دیا ہے کہ وہ اپنا آپ بھی بھول چکے ہیں مگر اس کارروائی سے مشرکوں پر مسلمانوں کا رعب طاری ہو گیا اور ان کے عزائم خاک میں مل گئے اور مدینے پر حملہ کرنے کے بجائے انھیں اپنی ہی فکر دامن گیر ہو گئی۔ اس کارروائی سے مسلمانوں کی جنگی امور کی نگرانی اور اس میں کامل مہارت عیاں ہوتی ہے۔ جیسا کہ اس مہم جوئی کے لیے مسلمانوں نے مناسب وقت اور صحیح راستے کا انتخاب کیا۔ وہ اس طرح کہ طویل سفر ہونے کے باوجود یہ لشکر دشمن تک جا پہنچا اور انھیں کانوں کان خبر نہ ہوئی۔

---

[1] قراءة سياسية للسيرة النبوية للدكتور قلعجي، ص: 163,162. [2] زاد المعاد: 243/3. [3] فقه السيرة للغزالي، ص: 274.

اس کارروائی میں مسلمانوں کی کامیابی کا یہ ایک اہم سبب تھا۔ اس جنگ نے دشمنوں کے خیالات پر گہرا اثر چھوڑا۔ انھیں یہ بات ذہن نشین ہوگئی کہ مسلمان پوشیدہ طور پر حملہ کرنے اور ہنگامی کارروائیوں کی مکمل قدرت رکھتے ہیں۔ اس سے دشمن مرعوب ہوگیا اور اسے ہر وقت مسلمانوں کی جانب سے حملے کا اندیشہ رہنے لگا۔ اس فکر نے انھیں مسلمانوں کی قوت کو تسلیم کرنے اور ان کے ساتھ صلح صفائی کرنے پر مجبور کردیا۔[1]

حضرت عبداللہ بن اُنیس رضی اللہ عنہ کی کارروائی

خالد بن سفیان ہذلی عرفات میں ہذیل اور آس پاس کے دیگر جنگجو اکٹھے کرنے لگا۔ اس کا ارادہ مدینہ منورہ پر حملہ کرنے کا تھا۔ اس حملے سے اس کے مقاصد یہ تھے کہ قریش کا قرب حاصل ہو، ان کی طرفداری کا اظہار ہو، اپنے غلط عقائد ونظریات کا دفاع بھی ہو اور پھر مدینہ منورہ سے دولت بھی ہاتھ آئے۔ اس کے خطرناک عزائم کے پیشِ نظر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے قتل کرنے کا عندیہ دے کر حضرت عبداللہ بن اُنیس جہنی رضی اللہ عنہ کو اس کی جانب روانہ فرمایا۔[2] تو لیجیے حضرت عبداللہ بن انیس رضی اللہ عنہ اپنا واقعہ خود بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بلایا اور فرمایا:

«إِنَّهُ قَدْ بَلَغَنِي: أَنَّ خَالِدَ بْنَ سُفْيَانَ بْنِ نُبَيْحٍ يَّجْمَعُ لِي النَّاسَ لِيَغْزُوَنِي وَهُوَ بِعُرَنَةَ، فَأْتِهِ فَاقْتُلْهُ»

''مجھے اطلاعات ملی ہیں کہ خالد بن سفیان بن نبیح لوگوں کو میرے خلاف جنگ کے لیے جمع کررہا ہے۔ اور وہ اس وقت عرنہ میں ہے۔ تم اس تک پیش قدمی کرو اور اسے موت کے گھاٹ اتاردو۔''

حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! اس کی شکل و

[1] التاريخ الإسلامي للحميدي: 23/6. [2] نضرة النعيم: 313/1.

صورت بتا دیجیے تا کہ میں اسے پہچان سکوں۔''

آپ ﷺ نے فرمایا: «إِذَا رَأَيْتَهُ وَجَدْتَّ لَهُ قُشَعْرِيرَةً» ''تم جب اسے دیکھو گے تو تم پر کپکپی طاری ہوگی۔''

چنانچہ میں تلوار گلے میں لٹکائے نکل کھڑا ہوا اور میں نے اسے عرنہ میں بوقتِ عصر اس حال میں دیکھا کہ وہ اپنے ساتھ موجود عورتوں کے لیے جگہ ڈھونڈ رہا تھا۔ جب میں نے اسے دیکھا تو آپ ﷺ کے بیان کے مطابق کپکپی محسوس کی۔ میں سیدھا اس کی جانب متوجہ ہوا۔ اس دوران میں نے سوچا کہ میرے اور اس کے درمیان معرکہ آرائی میں نماز رہ نہ جائے، لہٰذا میں نے اس کی طرف پیش قدمی کرتے ہوئے اشارے ہی سے نماز ادا کرلی۔ اس کے پاس پہنچا تو اس نے پوچھا: ''تم کون ہو؟'' میں نے کہا: ''عرب ہی کا ایک باشندہ ہوں۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ اس شخص (رسول اللہ ﷺ) سے لڑنے کے لیے لشکر جمع کررہے ہیں۔ اسی سلسلے میں میں حاضر ہوا ہوں۔'' اس نے کہا: ''بالکل میں یہی کام کررہا ہوں۔'' میں تھوڑی دیر اس کے ساتھ ساتھ چلتا رہا جب مجھے موقع مل گیا تو میں نے تلوار کے وار سے اسے ڈھیر کردیا۔ اور وہاں سے چل دیا۔ عورتیں اس پر نوحہ کرنے لگیں۔ میں واپس مدینہ پہنچا تو آپ ﷺ نے دیکھتے ہی فرمایا:

«أَفْلَحَ الْوَجْهُ» ''چہرا کامیاب ہوا۔''

میں نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول میں نے اسے قتل کردیا ہے۔''

آپ ﷺ فرمانے لگے: «صَدَقْتَ» ''سچ کہہ رہے ہو؟''

پھر آپ ﷺ مجھے لے کر کھڑے ہوئے اور مجھے اپنے گھر لے گئے اور اپنا عصا مبارک دیا اور فرمایا:

«أَمْسِكْ هٰذِهِ عِنْدَكَ يَا عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ أُنَيْسٍ» ''عبداللہ! یہ اپنے پاس محفوظ رکھنا۔''

میں وہ عصا لیے لوگوں کے پاس گیا تو وہ پوچھنے لگے: ''یہ لاٹھی کیسی ہے؟''

میں نے کہا: ''یہ مجھے رسول اللہ ﷺ نے عنایت فرمائی ہے اور ساتھ یہ بھی فرمایا ہے کہ اسے اپنے پاس محفوظ رکھنا۔''

انھوں نے کہا: ''واپس جا کر پوچھو تو سہی کہ اس کا مقصد کیا ہے؟''

میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں دوبارہ حاضر ہوا اور عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! آپ نے یہ لاٹھی مجھے کس مقصد کے لیے عنایت فرمائی ہے؟''

آپ ﷺ نے فرمایا:

«آيَةٌ بَيْنِي وَبَيْنَكَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، إِنَّ أَقَلَّ النَّاسِ الْمُتَخَصِّرُونَ يَوْمَئِذٍ»

''یقیناً قیامت کے دن بہت کم لوگ ہی اپنے اپنے نیک اعمال کے سہارے حاضر ہوں گے اس دن یہ لاٹھی میرے اور تیرے درمیان نشانی ہوگی۔''[1]

چنانچہ عبد اللہ بن انیس رضی اللہ عنہ نے وہ لاٹھی اپنی تلوار کے ساتھ ملا لی اور وہ ان کے پاس ہی رہی اور ان کی وصیت کے مطابق کفن کے ساتھ ہی قبر میں رکھ دی گئی۔''[2]

دروس وعبرتیں: اس واقعے میں کئی ایک حکمتیں، عبرتیں اور اسباق ہیں:

❁ **جنگی منصوبہ بندی میں اعلیٰ مہارت:** رسول اللہ ﷺ امن وسلامتی کے معاملے پر بڑی توجہ دیتے تھے۔ اور ایسے بحرانوں کا بروقت اور مناسب حل تلاش کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ خالد بن سفیان کو لشکر جمع کرنے کا موقع ہی نہیں دیا کہ وہ طاقت بن کے ابھرے بلکہ بڑی دانشمندی کے ساتھ اس فتنے کو سر اٹھانے سے قبل کچل دیا۔ اس سے امت کو متعدد فوائد حاصل ہوئے۔ اور مدینہ منورہ پر خالد بن سفیان کی لشکر کشی کے نتیجے میں ہونے والے

---

1 اس عبارت کا ایک مفہوم یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ ''بہت کم لوگ ہوں گے جنھیں کوئی سہارا میسر ہوگا۔''

2 مسند أحمد: 496/3، و مسند أبي يعلى، حديث: 905، وسنن أبي داود، حديث: 1249 مختصراً.

ممکنہ نقصانات کا پیشگی بندوبست ہوگیا۔ یہ سب کچھ اس صورت میں ممکن ہوسکتا ہے جب جنگی خبر رسانی کا نظام بھی عمدہ ترین ہو اور طے شدہ تجویز پر انتہائی مستعدی سے عمل درآمد بھی ہوسکے۔

نبی مکرم ﷺ کی مردم شناسی میں مہارت تامہ: رسول اللہ ﷺ انتہائی مردم شناس تھے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی خداداد صلاحیتوں سے خوب واقف تھے۔ کسی مہم کے لیے ایسے شخص کا انتخاب فرماتے جو اس مہم کے لیے سب سے زیادہ موزوں ہوتا۔ قیادت کے لیے ایسا شخص چنتے جو بہادر، زیرک اور ملنسار ہو۔ تبلیغ و تعلیم کے لیے اسے مقرر فرماتے جو وسیع علم کے ساتھ ساتھ اخلاقِ عالیہ کا مالک اور نرم طبیعت رکھتا ہو اور لوگوں کو اپنی جانب مائل کرنے کی خوبی بھی اس میں موجود ہو۔ سفارت کے لیے اس کا چناؤ کرتے جو جسمانی طور پر عمدہ ڈیل ڈول والا، فصیح زبان اور فی البدیہہ کلام پر قادر ہو۔ فدا کاری کے لیے اس کا انتخاب فرماتے جو بہادری میں نمایاں، مضبوط اور اپنے جذبات کو قابو میں رکھنے کی طاقت رکھتا ہو۔ [1]

حضرت عبداللہ بن اُنیس رضی اللہ عنہ مضبوط دل، یقین کامل اور گہرے ایمان سے متصف تو تھے ہی مگر انھیں اس مہم جوئی کا اہل قرار دینے کی ایک اور وجہ بھی تھی اور وہ وجہ یہ تھی کہ ان کا تعلق جہینہ قبیلے سے تھا۔ اس وجہ سے وہ وہاں کے آس پاس کے قبائل اور علاقوں سے خوب واقف تھے۔ [2]

اس مہم کا اخروی پہلو: اس انتہائی جرأت مندانہ اقدام کا صلہ اور مقصد دنیاوی زر کی صورت میں نہ تھا جیسا کہ قدیم تاریخ اور جدید دور میں بھی بڑے انوکھے کارنامے انجام دینے والا ایسی آرزوئیں رکھتا ہے بلکہ اس مہم سے ان کا مقصد بہت عظیم اور بلند تر تھا۔ اور وہ آخرت میں ملنے والا اعلیٰ مقام اور مرتبہ تھا جس کے آرزومند تھوڑے ہی لوگ ہوتے ہیں۔ [3]

---

1 التاريخ الإسلامي للحميدي: 27/6. 2 محمد رسول اللہ ﷺ لصادق عرجون: 51,50/4، وغزوة أحد لأحمد باشميل، ص: 31. 3 السرايا والبعوث النبوية للدكتور بريك محمد بريك، ص: 160,159.

متقی اور پرہیزگار لوگ دنیا میں بدلے کے منتظر نہیں ہوتے۔ اس حوالے سے انھیں اگر کچھ سامانِ دنیا میسر آ بھی جائے تو وہ ان کا مطمحِ نظر نہیں ہوتا۔ وہ تو صرف آخرت کے بدلے کے منتظر ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عبداللہ بن اُنیس رضی اللہ عنہ کا بدلہ وہ عصا ہی تھا جو ان کے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان روزِ قیامت ایک نشانی (علامت) ہوگا۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ آخرت میں ان کا کتنا بلند درجہ ہوگا۔[1]

❁ **بعض فقہی احکام:** اس واقعے سے کچھ فقہی احکام بھی حاصل ہوتے ہیں، مثلاً: دشمن کی تلاش میں مشغول ہونے والے مجاہد کی نماز۔ امام خطابی کہتے ہیں: ''دشمن کا تعاقب اور تلاش کرنے والے شخص کی نماز کے متعلق اختلاف ہے۔ عام اہلِ علم کہتے ہیں: ''اگر دشمن اس کی کھوج میں ہو اور مسلمان مطلوب ہو تو اسے اشارتاً نماز پڑھ لینی چاہیے لیکن اگر خود دشمن کی تلاش اور تتبع میں ہو تو رکوع و سجود کے ساتھ نماز پڑھے۔ اور اگر سوار ہے تو سواری سے اتر کر نماز پڑھے۔'' ابن منذر کا بھی یہی خیال ہے۔[2]

امام شافعی رحمہ اللہ نے دوسرے علماء سے الگ ایک شرط لگائی ہے، وہ کہتے ہیں: ''جب مسلمان دشمن کی تلاش میں ہوں اور ان کی تعداد بھی دشمن سے کم ہو، نیز دشمن کے تعاقب میں یہ لشکر سے بچھڑ چکے ہوں۔ انھیں اگر یہ اندیشہ ہو کہ دشمن پلٹ کر ان پر حملہ کر سکتا ہے تو ایسی صورت میں وہ اشارے سے نماز پڑھ سکتے ہیں۔'' امام خطابی کہتے ہیں: ''اس مسئلے کے کچھ متعلقات اس قصے میں بھی موجود ہیں۔''[3]

علامہ عینی نے عمدۃ القاری میں اس مسئلے کے متعلق فقہاء کے مذاہب بیان کیے ہیں۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا خیال ہے کہ اگر آدمی دشمن کو مطلوب ہے تو چلتے پھرتے نماز درست ہے لیکن اگر خود دشمن کے تعاقب میں ہے تو ایسا درست نہیں ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ اور ان

---

1 التاريخ الإسلامي للحميدي: 29/6. 2 السرايا والبعوث النبوية للدكتور بريك محمد بريك، ص: 160. 3 معالم السنن للخطابي: 42/2.

کے کچھ اصحاب کا خیال ہے کہ مسلمان دشمن کے تعاقب میں ہو یا دشمن اس کا تعاقب کر رہا ہو دونوں صورتوں میں حکم ایک سا ہے، یعنی ہر ایک اپنی سواری پر نماز پڑھ سکتا ہے۔ امام اوزاعی رحمہ اللہ، امام شافعی رحمہ اللہ اور دیگر علماء بھی یہی نظریہ رکھتے ہیں۔ اور یہی قول حضرت عطاء، حسن، ثوری، احمد اور ابوثور رحمہم اللہ کا بھی ہے۔

امام شافعی رحمہ اللہ کہتے ہیں: ''دشمن کا پیچھا کرنے والے کو ڈر ہو کہ دشمن کہیں دور نہ نکل جائے تو وہ اشارتاً نماز پڑھ لے، وگرنہ نہیں۔''[1]

❁ **نبی مکرم ﷺ کے زمانے میں اجتہاد کا جواز:** نبی مکرم ﷺ کے زمانے میں بھی اجتہاد کرنا درست تھا۔ حضرت عبداللہ بن اُنیس رضی اللہ عنہ نے اجتہاد کرتے ہوئے نماز ادا کی اور آپ ﷺ نے انکار نہ کیا۔ اور یہ انتہائی خوف کے وقت اشارتاً نماز ادا کرنے کے جواز کی دلیل ہے۔[2]

یہ استدلال بالکل صحیح ہے کیونکہ عبداللہ بن اُنیس رضی اللہ عنہ نے یہ کام آپ ﷺ کی مبارک زندگی میں کیا۔ جو وحی کا زمانہ تھا اور یہ ممکن نہیں کہ آپ ﷺ اس سے باخبر نہ ہوں۔[3]

❁ **نبوت کے دلائل:** رسول اللہ ﷺ نے خالد بن سفیان کو دیکھے بغیر اس کی شناخت سے عبداللہ بن اُنیس رضی اللہ عنہ کو مطلع کر دیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اس کی نشانی یہ ہے کہ جب تم اسے دیکھو گے تو ڈر جاؤ گے اور تمھیں شیطان دکھائی دے گا۔'' حضرت عبداللہ بن اُنیس رضی اللہ عنہ نے تعجب کرتے ہوئے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! میں تو کبھی کسی چیز سے ڈرا ہی نہیں؟'' تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«بَلٰی، آيَةٌ مَّا بَيْنِي وَبَيْنَهُ أَنْ تَجِدَ لَهُ قُشَعْرِيرَةً إِذَا رَأَيْتَهُ»

''کیوں نہیں، اس کی نشانی ہی یہ ہے کہ جب تم اسے دیکھو گے تو تم پر لرزہ طاری

1 عمدة القاري شرح صحيح البخاري: 263/6. 2 السرايا والبعوث النبوية للدكتور بريك بن محمد بريك، ص: 161. 3 عون المعبود: 129/4.

ہو جائے گا۔‘‘ [1]

حضرت عبداللہ بن اُنیس رضی اللہ عنہ نے خالد کو رسول اللہ ﷺ کی بیان کردہ شناخت ہی پر پایا۔ عبداللہ بن اُنیس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ جب میں نے اسے دیکھا تو میں ڈر گیا اور مجھ پر رعب طاری ہو گیا۔ یہ دیکھ کر میں نے دل میں کہا کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے فرامین کس قدر سچے ہوتے ہیں۔ [2]

❁ حضرت عبداللہ بن اُنیس رضی اللہ عنہ کے خالد ہذلی کے قتل پر کہے گئے اشعار:

’’میں نے ابن ثور کو اونٹنی کے شیر خوار بچے کی طرح کر کے اس حال میں چھوڑا کہ اس کے اردگرد نوحہ کرنے والی عورتیں گریبان تار تار کر رہی تھیں۔

میرے پیچھے اور اس کے پیچھے بھی سوار عورتیں تھیں۔ میں نے اسے ہندوستانی لوہے کی بنی عمدہ تلوار سے جا لیا۔

جب تلوار اس کے سر کو کاٹ رہی تھی تو میں نے اس سے کہا: ’’میں شرافت اور شہرت رکھنے والا شہسوار ابن اُنیس ہوں۔‘‘

میں نے اس سے یہ بھی کہا: ’’ایک ایسے قابل قدر شخص کی چوٹ کو برداشت کر جو صرف اور صرف محمد ﷺ کے دین پر کاربند ہے۔‘‘

جب نبی مکرم ﷺ کسی کافر کی گرفت کا ارادہ فرماتے ہیں تو میں سب سے آگے بڑھ کر ہاتھ اور زبان سے اس کافر کی طرف پیش قدمی کرتا ہوں۔‘‘

قبیلہ عضل اور قارہ کی غداری اور رجیع کا الم ناک واقعہ

واقعۂ رجیع اور اس کے اسباب کے متعلق کئی قسم کی روایات منقول ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ جماعت کس مقصد کے لیے اور کب روانہ فرمائی؟ امام بخاری رحمہ اللہ نے روایت بیان

[1] المغازي للواقدي: 532/2. [2] دلائل النبوة للبيهقي: 41/4.

کی ہے کہ آپ ﷺ نے انھیں دشمن سے متعلقہ معلومات اکٹھی کرنے اور جاسوسی کے لیے بھیجا تھا۔[1]

جبکہ دیگر صحیح روایات میں اس واقعے کا ذکر یوں ہے کہ قبیلہ عضل اور قبیلہ قارہ کا ایک گروہ مدینہ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: ''ہم میں اسلام تو موجود ہے (مگر ہم دین سے پوری طرح آگاہ نہیں، لہٰذا) اپنے کچھ آدمیوں کو ہمارے ساتھ بھیجیے تاکہ وہ ہمیں ہمارا دین سمجھائیں، ہمیں قرآن پڑھائیں اور شریعت اسلامیہ کی تعلیم دیں۔''[2]

معلوم ہوتا ہے کہ قبیلہ ہذیل نے مسلمانوں سے خالد بن سفیان ہذلی کا بدلہ لینے کی کوشش میں دھوکا دہی اور بدعہدی کا سہارا لیا تھا۔ واقدی نے تو بالیقین یہ سبب ذکر کیا ہے کہ قبیلہ ہذیل کے ذیلی قبیلے بنولحیان سے کچھ افراد بنوعضل اور قارہ کے پاس گئے اور انھیں اس ضمن میں معاوضے کی پیش کش کی کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس جائیں، اور دعوتِ اسلام اور دین میں سمجھ بوجھ حاصل کرنے کے لیے ان سے کچھ لوگ طلب کریں، جبکہ ہم ان کی گھات میں رہیں گے اور انھیں قید کرکے اہل مکہ کو فروخت کرکے ان سے مال وصول کریں گے۔[3]

رسول اللہ ﷺ نے 10 افراد پر مشتمل ایک دستہ تشکیل دیا اور ان پر عاصم بن ثابت بن ابواقلح کو امیر بنا کر روانہ فرمایا۔[4]

---

[1] صحیح البخاري، حدیث: 4086. [2] المغازي للواقدي: 355,354/1، مؤلف نے یہاں صحیح روایات کا لکھ کر بعد میں واقدی کا حوالہ دیا ہے، جبکہ واقدی خود بھی اصول حدیث کی رو سے نااہل ہیں۔ علاوہ ازیں واقدی نے اس بحث کے آغاز میں سب سے پہلے وہی سبب ذکر کیا ہے جسے امام بخاری رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے۔ دیکھیے: (المغازي للواقدي: 301/1) بہر حال صحیح بخاری کی روایت کو ہر لحاظ سے ترجیح حاصل ہے۔ [3] نضرۃ النعیم: 314/1، والمغازي للواقدي: 355,354/1. [4] صحیح البخاري، حدیث: 3989، (البتہ یہاں یہ صراحت ہے کہ یہ جاسوسی دستہ تھا جیسا کہ مؤلف نے قبل ازیں خود بھی وضاحت کی ہے۔)

یہ جب عسفان اور مکہ کے درمیان پہنچے تو بنو لحیان کے تقریباً دو سو جنگجوؤں نے ان پر حملہ کر دیا۔ اور ہر طرف سے گھیرے میں لے کر ایک ٹیلے پر انھیں محصور کر دیا، پھر انھیں قتل نہ کرنے کی امان دی لیکن مسلمانوں کے امیر عاصم بن ثابت رضی اللہ عنہ نے کفار کی امان کو ٹھکرا کر ٹیلے سے اترنے سے انکار کر دیا۔[1]

حضرت عاصم بن ثابت رضی اللہ عنہ نے واضح الفاظ میں کہا کہ میں نے تو نذر مان رکھی ہے کہ کبھی مشرک کی امان قبول نہیں کروں گا، چنانچہ حضرت عاصم رضی اللہ عنہ ان سے لڑتے ہوئے یہ اشعار کہنے لگے:

”مجھ میں کیا کمی ہے! میں تو ایک ماہر تیرانداز ہوں۔ تیر موجود ہیں اور قوس میں سخت تانت لگی ہوئی ہے۔

اس سے تیز دھار اور طویل و عریض تیر تیزی سے نکل سکتے ہیں۔ موت تو برحق ہے مگر زندگی ایک ناپائیدار چیز ہے۔

اللہ تعالیٰ نے جو بھی مقدر کر رکھا ہے وہ آدمی پر نازل ہو کر رہے گا اور انسان کو بہر صورت اللہ تعالیٰ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

اگر میں تم سے مقابلہ نہ کروں تو میری ماں بچے کو گم پانے کا صدمہ اٹھائے۔“[2]

یہ اشعار کہتے ہوئے انھوں نے دشمن پر تیر برسائے حتی کہ تمام تیر ختم ہو گئے، پھر نیزے سے لڑے حتی کہ نیزہ ٹوٹ گیا۔ اور صرف تلوار بچی تو دعا کرنے لگے: ”اے میرے اللہ! میں دن کے آغاز سے تیرے دین کی حفاظت میں مصروف ہوں۔ میری دعا ہے کہ اب دن کے آخر میں تو میرے جسم کو محفوظ فرما۔“ یہ دعا انھوں نے اس لیے کی کہ دشمن ہر مقتول کو ننگا کر دیتے تھے۔ اس دعا کے بعد انھوں نے اپنی تلوار کا نیام توڑ دیا اور شہادت تک لڑتے رہے۔ شہادت سے پہلے انھوں نے دو مشرکوں کو زخمی اور ایک کو قتل کیا۔ آپ

1 نضرة النعيم:314/1. 2 المغازي للواقدي:355/1.

لڑتے جاتے اور ساتھ ساتھ یہ کہتے جاتے تھے:

''میں ابوسلیمان ہوں اور مجھ جیسا تیرانداز کون ہے؟ اور میری قوم شریف لوگوں کی قوم ہے۔''

بالآخر سب مشرکوں نے ان میں اپنے نیزے گاڑ دیے اور انھیں شہید کر دیا۔

جنگ احد میں سلافہ بنت سعد بن شُہید کا خاوند اور چار بیٹے قتل ہوئے تھے۔ ان میں سے حارث اور مسافع کو حضرت عاصم رضی اللہ عنہ نے قتل کیا تھا۔ اس پر اس عورت نے نذر مانی تھی کہ اگر میں عاصم بن ثابت کا سر حاصل کر سکی تو اس کا کاسہ بنا کر اس میں شراب پیوں گی۔ اور سر لانے والے کو ایک سو اونٹنیاں انعام دوں گی۔ یہ بات عام عرب اور بنولحیان کو بھی معلوم تھی، چنانچہ انھوں نے چاہا کہ ان کا سر کاٹ کر لے جائیں اور سلافہ بنت سعد سے انعام وصول کریں۔ ادھر اللہ تعالیٰ نے شہد کی مکھیوں کا غول بھیج دیا جس نے انھیں میت کے قریب نہ آنے دیا۔ وہ اتنی تعداد میں تھیں کہ کوئی میت کے قریب ہی نہ آ سکا۔ کوئی کوشش بھی کرتا تو وہ اس کے چہرے پر ڈنک مارتیں۔ یہ صورت حال دیکھ کر انھوں نے کہا کہ شام ہونے دو، اس وقت تک مکھیاں چلی جائیں گی۔ رات ہونے لگی تو اللہ تعالیٰ نے پانی کا ریلا بھیجا، حالانکہ اس وقت کسی جانب بھی بادل نہ تھے۔ وہ سیلاب عاصم رضی اللہ عنہ کی میت بہا لے گیا۔ اور وہ نامراد رہ گئے۔[1]

بنولحیان کی تیراندازی سے عاصم بن ثابت رضی اللہ عنہ سمیت سات آدمی شہید ہوئے۔ بعدازاں ان بدوؤں نے تین باقی رہ جانے والے اصحاب کو ازسرِ نو پناہ دی۔ جسے ان تینوں نے قبول کر لیا مگر انھیں قابو میں کر لینے کے بعد ان سے بدعہدی کی تو عبداللہ بن طارق رضی اللہ عنہ نے ان سے مقابلہ کیا اور ان کے ہاتھوں وہ بھی شہید ہو گئے۔ دیگر دو حضرات

[1] المغازي للواقدي: 356/1، والسيرة النبوية لابن هشام: 180/3، ودلائل النبوة للبيهقي: 328/3.

خبیب اور زید بن دثنہ رضی اللہ عنہما کو مکہ لے جا کر انھوں نے قریش کے ہاتھوں فروخت کر دیا۔[1]

یہ واقعہ صفر 4 ھ کو پیش آیا۔[2]

حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کو حارث بن عامر بن نوفل کے بیٹوں نے خریدا تا کہ انھیں اپنے باپ حارث کے بدلے میں قتل کریں جسے حضرت خبیب رضی اللہ عنہ نے بدر کے دن قتل کیا تھا۔ حضرت خبیب رضی اللہ عنہ ایک مدت تک ان کی قید میں رہے۔ جب وہ خبیب رضی اللہ عنہ کے قتل کا فیصلہ کر چکے تو خبیب رضی اللہ عنہ نے حارث کی ایک بیٹی زینب سے صفائی کے لیے استرا مانگا۔ اس نے دے دیا۔ اس دوران زینب کی توجہ اپنے بیٹے سے ہٹ گئی تو وہ بچہ خبیب رضی اللہ عنہ کے پاس جا کر ان کی ران پر بیٹھ گیا۔ زینب گھبرائی کہ کہیں یہ انتقامی طور پر بچے کو قتل نہ کر دے! حضرت خبیب رضی اللہ عنہ نے کہا: ''کیا تجھے خدشہ ہے کہ میں اس بچے کو مار ڈالوں گا؟ اللہ تعالیٰ نے چاہا تو ایسا کام مجھ سے کبھی نہ ہوگا۔'' زینب کہا کرتی تھی: ''میں نے خبیب سے زیادہ نیک کوئی نہیں دیکھا۔ میں اپنی آنکھوں سے دیکھتی کہ خبیب رضی اللہ عنہ انگور کا خوشہ کھا رہے ہوتے تھے، حالانکہ ان دنوں مکہ میں میوے کا نام تک نہ تھا۔ ویسے بھی وہ زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے (خود پھل لانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔) وہ تو اللہ تعالیٰ کا رزق تھا جو اس نے انھیں عطا کیا۔'' وہ لوگ حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے کے لیے حرم سے باہر لے گئے تو خبیب رضی اللہ عنہ نے کہا: ''مجھے دو رکعت نماز پڑھنے کی مہلت دے دو۔'' پھر نماز پڑھ کر ان سے کہنے لگے: ''اگر تم یہ خیال نہ کرو کہ میں موت سے گھبرا رہا ہوں تو میں اور نماز پڑھتا۔'' حضرت خبیب رضی اللہ عنہ ہی وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے تختۂ دار پر لٹکتے وقت دو رکعت نماز کا طریقہ جاری کیا۔[3]

پھر حضرت خبیب رضی اللہ عنہ نے یوں دعا کی:

---

1 تفصیل کے لیے دیکھیے: صحیح البخاري، حدیث: 4086. 2 جوامع السیرة لابن حزم، ص: 176. 3 صحیح البخاري، حدیث: 4068، و السیرة النبویة الصحیحة للدکتور العمري: 399/1.

«اَللّٰهُمَّ! أَحْصِهِمْ عَدَدًا وَّاقْتُلْهُمْ بَدَدًا وَّلَا تُبْقِ مِنْهُمْ أَحَدًا»

''اے میرے اللہ! ان سب کو گن گن کر علیحدہ علیحدہ کر کے مار اور ان میں سے کسی کو باقی نہ چھوڑ۔''

بعدازاں انھوں نے یہ اشعار کہے:

''لشکروں کے لشکر میرے اردگرد جمع ہوگئے ہیں اور انھوں نے اپنے قبائل کو بھی جمع کر کے بھرپور اکٹھا کرلیا ہے۔

سب کے سب مجھ پر اپنی دشمنی ظاہر کر رہے ہیں اور میرے ساتھ زور آزمائی کر رہے ہیں کیونکہ میں زنجیروں میں بندھا ہوا بے بس ہوں۔

اور انھوں نے اپنے بیٹوں اور عورتوں کو اکٹھا کرلیا ہے۔ اور میں ایک لمبے تنے کے قریب کر دیا گیا ہوں۔

اپنی غریب الوطنی، درپیش مشکل اور جن لشکروں کو انھوں نے مجھے پھانسی دینے کے وقت جمع کرلیا ہے، میں ان سب کا شکوہ اللہ تعالیٰ ہی کے سامنے رکھتا ہوں۔

اے عرش والے! ان کے ناپاک عزائم پر مجھے صبر کی توفیق عطا فرما۔ انھوں نے میرے گوشت کے ٹکڑے کر ڈالنے کا ارادہ کیا ہے اور میری ہر امید مایوسی میں بدل گئی ہے۔

انھوں نے مجھے کفر اختیار کرنے کا موقع دیا ہے اور دوسری صورت میں موت کی دھمکی دی ہے۔ میری آنکھوں نے آنسو بہائے ہیں مگر وہ گھبراہٹ کے نہیں۔

اور مجھے موت کا کوئی خوف نہیں۔ میں تو مرنے ہی والا ہوں اور بلاشبہ میرا لوٹنا اور واپسی تو میرے پروردگار ہی کی طرف ہے۔

جب میں حالتِ اسلام میں جامِ شہادت پی رہا ہوں تو راہِ الٰہ میں شہید ہوکر جس پہلو پر بھی گروں مجھے اس کی کوئی پروا نہیں۔

یہ سب اللہ تعالیٰ کی راہ میں پیش آرہا ہے وہ اگر چاہے تو کٹے ہوئے، بکھرے

پڑے اور الگ الگ اعضاء میں بھی برکت ڈال دے۔
میں دشمن کے سامنے کسی قسم کی عاجزی اور گھبراہٹ ظاہر کرنے والا نہیں ہوں۔
میں تو اللہ تعالیٰ ہی کی طرف لوٹ کر جا رہا ہوں۔''[1]

اس وقت ابوسفیان (رضی اللہ عنہ) نے حضرت خبیب رضی اللہ عنہ سے کہا: ''کیا تمھیں یہ بات پسند آئے گی کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہمارے پاس ہوں تو ان کی گردن ماردی جائے اور تم اپنے اہل و عیال میں خوش وخرم رہو؟'' انھوں نے جواب دیا: ''اللہ کی قسم! مجھے تو یہ بھی گوارا نہیں کہ میں اپنے اہل و عیال میں رہوں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم جہاں ہیں وہاں رہتے ہوئے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی کانٹا چبھ جائے اور اس سے آپ تکلیف محسوس کریں۔''[2]

اس کے بعد سیدنا خبیب رضی اللہ عنہ کو سولی پر لٹکا دیا گیا اور ان کی لاش کی نگرانی کے لیے آدمی مقرر کر دیے گئے۔ رات کے وقت حضرت عمرو بن امیہ ضمری رضی اللہ عنہ آئے، لاش اٹھا کر لے گئے اور دفن کر دی۔[3]

جن تین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو مشرک بدوؤں نے پناہ دی تھی ان میں تیسرے حضرت زید بن دثنہ رضی اللہ عنہ تھے۔ انھیں صفوان بن امیہ نے خرید کر اپنے باپ کے بدلے میں قتل کر دیا کیونکہ اس کا باپ امیہ بدر میں مارا گیا تھا۔

ابوسفیان نے قتل کرنے سے پہلے ان سے پوچھا: ''زید! تمھیں اللہ کی قسم! سچ سچ کہنا کیا تمھیں یہ بات پسند آئے گی کہ تمھاری جگہ اس وقت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہمارے پاس ہوتے اور ان کی گردن ماردی جاتی اور تم اپنے اہل وعیال میں مزے سے رہ رہے ہوتے؟'' انھوں نے کہا: ''اللہ کی قسم! مجھے تو یہ بھی گوارا نہیں کہ میں اپنے اہل وعیال میں رہوں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو جہاں آپ ہیں وہیں رہتے ہوئے کوئی کانٹا بھی چبھے جس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف ہو۔'' ابوسفیان بولا: ''میں نے لوگوں میں کسی کو کسی سے اتنی محبت کرتے نہیں دیکھا

[1] زاد المعاد: 245/3، وفتح الباري، شرح الحديث: 4086، والسيرة النبوية لابن هشام: 185/3.
[2] زاد المعاد: 246,245/3. [3] زاد المعاد: 246,245/3.

جتنی محبت محمد (ﷺ) کے ساتھی محمد (ﷺ) سے کرتے ہیں۔“[1]

بعدازاں انھیں نسطاس نے شہید کردیا۔[2]

یہ دردناک داستان چشمہ ”رجیع“ کے پاس رقم ہوئی اس بنا پر اس کا یہی نام معروف ہوا۔

سانحۂ رجیع سے ماخوذ دروس و عبرتیں: چند اہم دروس درج ذیل ہیں:

❁ **حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کے ذکر کردہ نکات:** حدیث سے یہ بات ثابت ہوئی کہ مسلمان قیدی اگر چاہے تو خود داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہ کہیں اس پر کافر کا بس نہ چلے، کافر کی امان قبول نہ کرے، اسی طرح اگر چاہے تو محاصرے کی صورت میں بھی گرفتاری نہ دے، خواہ اسے قتل کردیا جائے لیکن یہ اس صورت میں ہے جب وہ رخصت پر عمل نہ کرنا چاہے۔ بصورتِ دیگر رخصت پر عمل کرتے ہوئے اس کی امان میں آ بھی سکتا ہے۔ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ اس میں حرج نہیں ہے، جبکہ حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ اسے ناپسند کرتے تھے۔

اس واقعے سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مشرکین کے ساتھ بھی عہد کی پاسداری کا خیال رکھنا چاہیے۔ ان کی اولاد کو مارنے یا قتل کرنے سے احتراز ضروری ہے۔ اور جسے قتل کرنا ہے اس کے ساتھ بھی نرمی کے برتاؤ کا حکم ہے۔ اسی طرح اس واقعے سے حسبِ ذیل احکام بھی معلوم ہوتے ہیں:

❁ اولیاء کی کرامات برحق ہیں۔

❁ مشرکین پر بلاتعیین بددعا درست ہے۔

❁ تختۂ دار پر لٹکتے وقت نماز پڑھنا۔

❁ موت سے قبل شعر گوئی درست ہے۔

---

1 السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري: 400/2، والسيرة النبوية لابن هشام: 181/3.

2 السيرة النبوية لابن هشام: 181/3.

* حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کے یقین محکم اور دین کے ساتھ ان کی گہری وابستگی کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔

* اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اجروثواب سے نوازنے کے لیے اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو آزمائش سے گزارتا ہے۔ وہ آزمائش اس کے قدیم علم میں پہلے ہی سے طے ہو چکی ہوتی ہے کیونکہ اگر پروردگار نہ چاہتا تو وہ ایسا نہ کر سکتے۔

* اس قصے سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ مسلمان کی دعا قبول ہوتی ہے، نیز زندگی میں اور موت کے بعد بھی مسلمان کی عزت و تکریم کرنی چاہیے۔ اس طرح اس پر غور کرنے سے دیگر فوائد و مسائل بھی معلوم ہو سکتے ہیں۔

* اللہ تعالیٰ نے شہادت کے شرف سے نوازنے کے لیے انھیں قتل ہونے سے تو نہیں بچایا، البتہ ان کے جسم کو مشرکین سے محفوظ رکھنے کی دعا قبول فرما لی اور اسی طرح ان کی لاش مبارک گوشت کاٹے جانے کی بے حرمتی سے بچ گئی۔[1]

* **سپرداری یا موت تک لڑنے کا عزم:** سابقہ واقعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ دشمن کے نرغے میں آجانے والے قیدی کو ان کی امان سے انکار کا حق حاصل ہے، اپنے بارے میں کافر کا حکم جاری ہونے سے بچنے کے لیے اس پر اپنی برتری کا اظہار کرتے ہوئے کافروں کی دسترس میں نہ آئے، خواہ قتل ہی کر دیا جائے جیسا کہ حضرت عاصم رضی اللہ عنہ نے کیا تھا۔ لیکن اگر رخصت سے فائدہ اٹھانا چاہے تو اسے ان کی امان قبول کرنے کا بھی حق حاصل ہے جیسا کہ حضرت خبیب اور حضرت زید رضی اللہ عنہما نے کیا تھا۔ لیکن مسلمان قیدی کو بھاگ نکلنے کا موقع مل جائے تو صحیح بات یہی ہے کہ اسے ان سے اپنی جان چھڑانی ضروری ہے، خواہ ان میں رہتے ہوئے اسے دین کے اظہار کا موقع بھی حاصل ہو کیونکہ قیدی بہرکیف کفار کے قبضے میں بے بس، لاچار اور ان کے زیرتسلط ہوتا ہے، لہٰذا اسے قید

[1] فتح الباري، شرح الحديث:4086.

اورغلامی کی اس حالت سے اپنے آپ کو چھٹکارا دلانا ضروری ہے۔[1]

نئے پیش آمدہ حالات وواقعات سے نپٹنے کے لیے یہ حدیث مسلمانوں کے لیے کئی ایک راہیں کھول رہی ہے کہ جب وہ مظلومانہ طور پر قید کر لیے جائیں تو انھیں قید میں رہنے کا اختیار ہے اور اگر قید کرنے والے سے انصاف کی توقع نہ ہو اور تسلط و حکمرانی بھی غیراسلامی ہوتو مرتے دم تک کفار سے جنگ بھی ان کے اختیار میں ہے۔[2]

❁ **سنت نبوی کی عظمت اور مقام:** اس واقعے سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سنت نبوی کی کس قدر تعظیم کرتے تھے۔ حضرت خبیب رضی اللہ عنہ مشرکوں کی قید میں ہونے اور کسی صبح یا شام شہید کر دیے جانے کا علم رکھنے کے باوجود غیرضروری بالوں کی صفائی کے متعلق طریقہ نبوی اپنانے کے کس قدر حریص تھے۔ جو لوگ امت کو درپیش حالات کا بہانہ بنا کر بہت سی سنتوں کو معمولی سمجھ کر نظرانداز کر دیتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ایسے حالات میں سنتوں کو اپنانا مناسب نہیں ایسے لوگوں کے لیے سیدنا خبیب رضی اللہ عنہ کے طرزِ عمل میں نصیحت کا سامان موجود ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ شریعت میں مکمل طور پر داخل ہونا، جس کے متعلق اکثر و بیشتر کہا جاتا ہے اور سنت پر عمل کرنے کا اہتمام یہ دونوں ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔[3]

❁ **منتہائے حیات تک اسلامی قوانین پر عملداری:** حضرت خبیب رضی اللہ عنہ نے حارث کی بیٹی سے صفائی کے لیے استرا مانگا تو اس نے انھیں وہ دے دیا۔ اس کا بیان ہے کہ میں بچے سے بے خبر ہوگئی اور وہ آہستہ آہستہ خبیب رضی اللہ عنہ کے پاس جا پہنچا۔ انھوں نے اسے اپنی ران پر بٹھالیا۔ جب میں نے بچے کو اس حالت میں دیکھا تو میرے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی کیونکہ خبیب رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں استرا (بھی) تھا۔ میری یہ حالت دیکھ کر خبیب رضی اللہ عنہ کہنے

[1] فقه السيرة للبوطي، ص: 189,188. [2] الأساس في السنة لسعيد حوّى: 622/2. [3] وقفات تربوية مع السيرة النبوية لأحمد فريد، ص: 234.

لگے: ”تمھیں ڈر ہے کہ میں اسے قتل کردوں گا؟ اللہ تعالیٰ نے چاہا تو ایسا ہرگز نہ ہوگا۔“[1]

یہ عمدہ کردار روح کی بالیدگی، دل کی صفائی اور اسلامی منہج کے ساتھ گہرے تعلق کی علامت ہے، اسی لیے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی﴾

”اور کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔“[2]

صحیح اور سیدھی راہ پر قائم رہنا مسلمان کے کردار کا وہ فطرتی تقاضا ہے جس پر وہ دکھ اور سکھ، دونوں حالتوں میں قائم رہتا ہے۔[3]

حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کی یہ بات: «مَا كُنْتُ لِأَفْعَلَ ذٰلِكَ إِنْ شَاءَ اللّٰهُ» ”میں ایسا کام ان شاء اللہ ہرگز نہ کروں گا۔“ عربی ادب میں یہ اسلوب اس بات کی عکاسی کرتا ہے کہ یہ فعل ان سے سرزد ہونا تھا نہ ہی ان کے حاشیۂ خیال میں یہ بات تھی اور نہ ہی ان کی طرف سے اس کا کوئی امکان تھا، حالانکہ وہ بڑے کٹھن حالات سے گزر رہے تھے۔ اگرچہ ایسے پریشان کن حالات میں بسا اوقات ”ان شاء اللہ“ جان محفوظ کرنے یا ضرورت پوری کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ لیکن اصل بنیاد دین سے وفاداری کرنا اور اپنے آپ کو مجرموں کی صف میں شامل ہونے سے بچانا ہے۔ ان خوبیوں کے سامنے اس قسم کے مفروضے اور خیالات کچھ حیثیت نہیں رکھتے۔[4]

یہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی عظمت کی بلند ترین دلیل ہے کہ وہ جان کے دشمنوں اور ظلم و ستم ڈھانے والوں سے برتاؤ کرتے وقت بھی اخلاقِ عالیہ کا مظاہرہ کرتے تھے۔ یہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے کمالِ ایمان اور فہمِ اسلام کی واضح دلیل ہے۔[5]

---

[1] صحیح البخاري، حدیث: 4086، وصحیح السیرة النبویة لإبراهیم العلي، ص: 320.

[2] بنيّ إسرآء یل 15:17. [3] من معین السیرة لصالح الشامي، ص:259. [4] صور و عبر من الجهاد النبوي للدكتور فوزي فیض اللّٰه، ص: 153. [5] التاریخ الإسلامي للحمیدي: 38/6.

❁ **صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے والہانہ عقیدت:** صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کمال درجے کی محبت و عقیدت تھی۔ محبت دراصل کسی کی پوری معرفت کا ثمرہ ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قدر و منزلت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم خوب واقف تھے اور انھیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری معرفت حاصل تھی۔ اسی وجہ سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت بھی بڑی لاجواب اور باکمال تھی۔[1]

واقعۂ رجیع میں ابوسفیان اور زید بن دثنہ رضی اللہ عنہ میں ہونے والی سنجیدہ گفتگو سے صحابہ کی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ جب ابوسفیان نے ان سے پوچھا: ''کیا تم پسند کرتے ہو کہ اس وقت تمھاری جگہ ہمارے پاس محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہوں اور تمھاری بجائے ان کی گردن ماری جائے اور تم اپنے گھر والوں کے ساتھ بخوشی رہو؟'' یہ سن کر حضرت زید بن دثنہ رضی اللہ عنہ گویا ہوئے:

«وَاللّٰهِ! مَا أُحِبُّ أَنَّ مُحَمَّدًا الْآنَ فِي مَكَانِهِ الَّذِي هُوَ فِيهِ تُصِيبُهُ شَوْكَةٌ وَّ إِنِّي جَالِسٌ فِي أَهْلِي»

''اللہ کی قسم! مجھے تو یہ بھی گوارا نہیں کہ میں اپنے اہل و عیال میں رہوں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم جہاں بھی ہوں وہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی کانٹا بھی چبھ جائے۔''[2]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت ایمان کا حصہ ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

«ثَلَاثٌ مَّنْ كُنَّ فِيهِ وَجَدَ حَلَاوَةَ الْإِيمَانِ: مَنْ كَانَ اللّٰهُ وَرَسُولُهُ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِمَّا سِوَاهُمَا، وَمَنْ أَحَبَّ عَبْدًا لَّا يُحِبُّهُ إِلَّا لِلّٰهِ وَمَنْ يَّكْرَهُ أَنْ يَّعُودَ فِي الْكُفْرِ بَعْدَ إِذْ أَنْقَذَهُ اللّٰهُ كَمَا يَكْرَهُ أَنْ يُّلْقٰى فِي النَّارِ»

''جس میں تین خوبیاں ہوں گی وہ ان کے باعث ایمان کی مٹھاس اور حلاوت

---

1 حقوق النبي ﷺ على أمته للدكتور محمد بن خليفة التميمي: 314/1. 2 صور و عبر من الجهاد النبوي للدكتور فوزي فيض الله، ص: 154.

پالے گا: ① جسے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ سے سب سے بڑھ کر محبت ہو۔
② جو اللہ تعالیٰ ہی کے لیے کسی شخص سے محبت رکھے۔ ③ جسے اللہ تعالیٰ نے کفر سے بچالیا ہے وہ کفر کی طرف لوٹنے کو ایسے ہی ناپسند سمجھے جیسے وہ آگ میں گر جانے کو ناپسند کرتا ہے۔''[1]

❁ بنولحیان کی مذمت میں حضرت حسان رضی اللہ عنہ کے اشعار: رجیع میں شہید ہونے والوں کا مسلمانوں کو زبردست صدمہ پہنچا۔ حضرت حسان رضی اللہ عنہ اپنے اشعار کے ذریعے سے مسلمانوں کے احساسات واحوال کی تعبیر کرتے تھے۔ انھوں نے قابلِ مذمت لوگوں کی مذمت اور تعریف کے قابل لوگوں کی تعریف کی۔ بنولحیان کی مذمت میں حضرت حسان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

''اگر تمھیں بغیر کسی لگی لپٹی کے دھوکا دہی اور غداری کے اصل مفہوم سے آشنائی کا شوق ہو تو رجیع کے مقام پر جاؤ اور لحیان کی حویلی کے متعلق دریافت کرو۔
وہ ایسی قوم ہے جس نے اپنے قرب و جوار میں رہنے والوں کو ملیامیٹ کرنے کی ٹھان لی ہے، لگتا ہے ان کے نزدیک کتا، بندر اور انسان سب برابر ہیں۔
اگر کبھی کسی سانڈھ کو قوت گویائی حاصل ہو جائے تو کھڑا ہو کر وہ انھیں اسی قسم کی پٹیاں ہی پڑھائے گا اور وہ ان میں زیادہ شرف اور شان والا ثابت ہوگا۔''[2]

عامر بن طفیل کی ریشہ دوانیاں اور بئر معونہ کا دردناک واقعہ (4 ھ)

عامر بن طفیل بنو عامر کے سرداروں میں سے ایک نہایت متکبر اور خود پسند سردار تھا۔ یہ بادشاہی کی امید لگائے بیٹھا تھا۔ یہ دیکھ رہا تھا کہ عنقریب نبی اکرم ﷺ کو جزیرۂ عرب پر غلبہ اور اقتدار حاصل ہو جائے گا۔ یہی سوچ لے کر وہ آپ ﷺ کے پاس آیا اور کہنے لگا: ''میں آپ کو تین امور کا اختیار دیتا ہوں: ① دیہی علاقوں پر آپ کی اور شہروں میں میری حکومت ہو۔ ② آپ کے بعد میں آپ کا خلیفہ اور جانشین بنوں۔ ③ یا پھر میں غطفان

1 صحيح البخاري، حديث:21. 2 البداية والنهاية:4/70.

کے ایک ہزار سرخ و زرد گھوڑوں اور ایک ہزار اونٹنیوں کے ساتھ آپ سے لڑوں گا۔''[1]

رسول اللہ ﷺ نے زمانۂ جاہلیت کے ان تمام مطالبات کو ٹھکرا دیا۔ انھی دنوں مدینہ منورہ میں بنو عامر کا سردار اور عامر بن طفیل کا چچا ابو براء عامر بن مالک، جو «ملاعبُ الأسنّة» (برچھیوں سے کھیلنے والا) کے نام سے معروف تھا، نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں ایک ہدیہ پیش کرنے کے لیے حاضر ہوا۔ آپ ﷺ نے اس پر اسلام کی دعوت پیش کی۔ اس نے قبول تو نہ کی مگر اس سے نفرت اور دوری کا اظہار بھی نہ کیا اور عرض کرنے لگا: ''اے محمد (ﷺ)! اگر آپ اپنے ساتھیوں کو اہلِ نجد کے پاس بھیج دیں تو مجھے امید ہے کہ وہ آپ کا پیغام ضرور قبول کرلیں گے۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: «إِنِّي أَخْشٰی عَلَیْهِمْ أَهْلَ نَجْدٍ» ''مجھے اپنے ان آدمیوں کے متعلق اہل نجد سے خدشہ ہے۔'' ابو براء بولا: ''میں ان کا حمایتی ہوں۔ آپ (فکر نہ کریں) جسے چاہتے ہیں اہل نجد کی طرف بھیج دیں۔''

آپ ﷺ نے ان کی طرف منذر بن عمرو رضی اللہ عنہ کے ساتھ دیگر صحابہ کرام بھیج دیے۔ منذر رضی اللہ عنہ کو «الْمُعْنِقُ لِیَمُوتَ» یا «أَعْنَقَ الْمَوْتَ» (جذبۂ شہادت سے سرشار) کہا جاتا تھا۔ اسی اثنا میں عامر بن طفیل نے بنو عامر کو ان پر حملہ کرنے کے لیے پکارا مگر انھوں نے ابو براء کی طرف سے دی گئی پناہ کے پیشِ نظر اسے ماننے سے انکار کردیا۔ اس ناکامی کے بعد اس نے بنو سلیم کو حملہ کے لیے پکارنا شروع کردیا۔ انھوں نے اسے قبول کرلیا۔ اور ان کے تقریباً ایک سو تیر انداز ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے پیچھے لگ گئے۔ انھوں نے بئر معونہ پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو جالیا۔ وہاں انھیں تہ تیغ کرنا شروع کردیا۔ صرف حضرت عمرو بن امیہ ضمری رضی اللہ عنہ ہی بچ سکے۔[2]

---

[1] صحیح البخاري، حدیث:4091، و مسند أحمد:210/3. [2] صحیح السیرة النبویة لإبراهیم العلي، ص:322، و صحیح مسلم، حدیث: 677، والسیرة النبویة لابن هشام:194,193/3، وصحیح البخاري، حدیث:4088-4096. اور فتح الباری میں اس کی شرح دیکھنا نہ بھولیے۔ وہاں بڑی تفصیلات اور کام کی باتیں ہیں۔

سیدنا انس رضی اللہ عنہ اس واقعے کو ان الفاظ سے بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کچھ لوگ آئے اور کہنے لگے: ”ہمارے ساتھ چند آدمی بھیج دیں جو ہمیں قرآن وسنت کی تعلیم دیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ساتھ انصار کے ستر (70) آدمیوں کو روانہ فرمایا۔ انھیں قراء کہا جاتا تھا۔ ان میں میرے ماموں حرام بن ملحان رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ وہ لوگ قرآن مجید پڑھا کرتے تھے اور رات کے وقت ایک دوسرے سے اس کا مذاکرہ کرتے اور سیکھتے تھے۔ دن کو پانی لا کر مسجد میں رکھتے۔ لکڑیاں اکٹھی کر کے فروخت کرتے اور اس سے اہل صفہ اور فقراء کے لیے کھانا خریدتے۔ انھیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (ان لوگوں کی درخواست پر) ان کی طرف تبلیغ کے لیے بھیج دیا۔ مگر مطلوبہ مقام تک پہنچنے سے پہلے ہی انھوں نے ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو شہید کر دیا، تو ان صحابہ نے دعا کی: ”اے اللہ! ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہماری طرف سے یہ پیغام پہنچا دے کہ ہم تجھ سے ملے اور تجھ سے راضی ہو گئے اور تو بھی ہم سے راضی ہے۔“

حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک شخص حرام رضی اللہ عنہ کے پاس پیچھے سے آیا اور انھیں نیزہ مارا جو ان کے آر پار ہو گیا، تب حضرت حرام رضی اللہ عنہ نے کہا: ”ربّ کعبہ کی قسم! میں کامیاب ہو گیا!“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے کہا:

«إِنَّ إِخْوَانَكُمْ قَدْ قُتِلُوا وَ إِنَّهُمْ قَالُوا: اَللّٰهُمَّ بَلِّغْ عَنَّا نَبِيَّنَا أَنَّا قَدْ لَقِينَاكَ فَرَضِينَا عَنْكَ وَ رَضِيتَ عَنَّا»

”تمھارے بھائی (جنھیں بھیجا گیا تھا وہ) شہید کر دیے گئے ہیں۔ انھوں نے یہ دعا کی تھی: ”اے اللہ تعالیٰ! ہمارے نبی کو ہماری جانب سے یہ بات پہنچا دے کہ ہم تجھ (اللہ تعالیٰ) سے ملے ہیں اور تجھ سے راضی ہو گئے اور تو ہم سے راضی ہو گیا ہے۔“[1]

حادثۂ بئر معونہ سے ماخوذ دروس و عبرتیں: اس الم ناک اور دکھ انگیز واقعے میں کئی نصیحتیں، عبرتیں اور حکمتیں ہیں:

---

[1] صحيح مسلم، حديث: 677، و مسند أحمد: 416/1، و دلائل النبوة للبيهقي: 344/3.

❁ **تبلیغ کے لیے قربانیاں ضروری ہیں:** ہم نے دیکھا کہ بئرمعونہ کے حادثے میں شہید ہونے والے قراء سے ہذیل کے حلیفوں نے کس طرح دھوکا کیا۔ ان قراء کو آپ ﷺ نے تعلیم دینے اور دین سمجھانے کے لیے بھیجا تھا۔ اس موقع پر عامر بن طفیل نے ستر قراء کے ساتھ دھوکا کیا، جبکہ انھیں صرف اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت اور اس کا دین سمجھانے کے لیے بلایا گیا تھا۔ بئرمعونہ کے دن بڑے ہولناک انداز سے انھیں ذبح کر دیا گیا۔ ان مصائب نے آپ ﷺ کے دل پر گہرا اثر چھوڑا یہاں تک کہ آپ ﷺ فجر کی نماز میں ایک ماہ تک سُلَیم کے قبائل پر، جنھوں نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی کی تھی، قنوت نازلہ پڑھتے رہے۔[1]

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک مہینے تک مسلسل ظہر، عصر، مغرب، عشاء اور صبح کی نماز میں قنوت پڑھی۔ آپ ﷺ ہر نماز کی آخری رکعت میں جب ''سمع اللہ لمن حمدہ'' کہتے تو بنوسلیم کے قبائل رِعل، ذکوان اور عُصَیَّہ کے خلاف بددعا کرتے اور مقتدی اس پر آمین کہتے۔[2]

حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اس سے پہلے ہم قنوت نہیں کرتے تھے۔ اس واقعے پر قنوت شروع ہوئی۔[3]

یہ واقعہ انتہائی المناک اور دلخراش تھا۔ اس کے باوجود اس سے مسلمانوں کی قوت میں کوئی کمی واقع ہوئی نہ دعوت الی اللہ کے بارے میں ان کے جوش اور ولولے میں کوئی فرق آیا۔ اور نہ ہی ایسے واقعات دین کی خدمت اور دعوت وعزیمت کی راہ میں رکاوٹ بنا کرتے ہیں کیونکہ دعوت کے اثرات اور فوائد کے سامنے خونوں اور جانوں کی حیثیت کچھ بھی نہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دعوت کو نصرت اسی صورت میں ملتی ہے کہ اس راہ میں

---

1 صور و عبر من الجهاد النبوي للدكتور فوزي فيض اللّٰه، ص:151. 2 سنن أبي داود، حديث: 1443، و مسند أحمد:302,301/1، و صحيح ابن خزيمة، حديث: 618. 3 صحيح البخاري، حديث:4088.

جانیں کھپادی جائیں۔ ایسی مشکلات کے سامنے عزم و ہمت کی دیوار بن کر ڈٹ جانا اور دعوت کے لیے قربانیاں پیش کرنا ہی دعوت کے پھلنے پھولنے اور اسے غالب کرنے کے لیے ناگزیر ہے۔

دعوت کے اس میدان میں قوت کا اظہار اور قربانیوں کے پیش کیے بغیر فقط نعرے اور کھوکھلے دعوے زبانی جمع خرچ اور بکھرے خیالات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ خیالات اور فلسفے کتابوں میں بند ہوتے ہیں، کہانیوں کی زینت بنتے ہیں اور بالآخر قصۂ پارینہ بن جاتے ہیں۔

رجیع اور بئر معونہ کے حادثات ہمیں اللہ کے دین اور اس کی طرف دعوت کے متعلق بھاری ذمہ داری کا سبق یاد دلاتے ہیں۔ علاوہ ازیں ان واقعات سے ان عظیم قربانیوں کی منظر کشی بھی ہمارے سامنے آجاتی ہے جنھیں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اپنے عقیدے، دین اور رضائے الٰہی کی خاطر پیش کرتے تھے۔

راحت، سعادت، بزرگی اور غلبے کی کچھ نہ کچھ قیمت ادا کرنا ہوتی ہے، جبکہ اس دعوت کی قیمت وہ پاکیزہ خون ہے جو اللہ کی راہ میں بہایا جاتا ہے تاکہ اللہ تعالیٰ کا نظام و شریعت نافذ ہو اور ہر طرف دین کا سکہ بٹھادیا جائے۔[1]

❁ ربِّ کعبہ کی قسم میں کامیاب ہوگیا! یہ جملہ حضرت حرام بن ملحان رضی اللہ عنہ سے اس وقت صادر ہوا جب نیزہ ان کی پشت کو چیرتا ہوا سینے سے نکل گیا اور وہ اپنے خون آلود ہاتھوں سے اپنا چہرہ اور سر رنگ رہے تھے۔ اور کہہ رہے تھے: «فُزْتُ وَ رَبِّ الْكَعْبَةِ!» ''رب کعبہ کی قسم! میں کامیاب ہوگیا۔''[2]

یہ منظر بڑے بڑے بہادر، حوصلہ منداور جگر والے افراد پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ وہ بھی

1 صور و عبر من الجهاد النبوي للدكتور فوزي فيض الله، ص: 152. 2 صحيح البخاري، حديث:4092,4091.

اپنے آپ کو ان عظیم اور قدآور شخصیات کے سامنے چھوٹا محسوس کرتے ہیں جن کے چہروں پر موت کی گھبراہٹ کے اثرات دور دور تک بھی نظر نہیں آتے۔ بلکہ ایسی حالت میں ان پر خوشی اور سرور کے جذبات اور سکون و اطمینان کے آثار واضح طور پر جھلک رہے ہوتے ہیں۔ [1]

اس کے متعلق سیدنا حرام بن ملحان رضی اللہ عنہ پر نیزے سے حملہ کرنے والا شخص جبار بن سلمی اپنا چشم دید واقعہ خود بیان کرتا ہے: ”مجھے جس چیز نے اسلام کی طرف راغب کیا وہ یہ تھی کہ بئر معونہ کے موقع پر میں نے ایک مسلمان کے کندھوں کے درمیان نیزہ مارا اور جب نیزے کی نوک اس کے سینے سے باہر نکلی تو میں نے اسے یہ کہتے ہوئے سنا: «فُزْتُ وَ رَبِّ الْكَعْبَةِ!» ”رب کعبہ کی قسم! میں مراد پا گیا۔“ یہ سن کر میں نے دل میں سوچا کہ اسے کون سی مراد مل گئی؟ کیا میں نے اسے قتل نہیں کر دیا؟ پھر میں نے اسی قول کے بارے میں دریافت کیا تو مجھے بتایا گیا کہ یہ کامیابی شہادت کے درجے پر فائز ہونے کی وجہ سے سمجھی جاتی ہے تو میں نے کہا: ”پھر تو واقعی اللہ کی قسم! وہ مراد پا گیا۔“ یہی بات جبار بن سلمی کے اسلام قبول کرنے کا سبب بن گئی۔ [2]

سیدنا حرام بن ملحان رضی اللہ عنہ کا یہ منفرد اور یگانۂ روزگار کردار ہمارے لیے ایک سوال چھوڑتا ہے اور وہ یہ ہے کہ کیا شہید موت کی تکلیف محسوس کرتا ہے؟ اس سوال کا شافی جواب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے ان الفاظ میں ملتا ہے:

«مَا يَجِدُ الشَّهِيدُ مِنْ مَسِّ الْقَتْلِ إِلَّا كَمَا يَجِدُ أَحَدُكُمْ مِّنْ مَسِّ الْقَرْصَةِ»

”شہید ہونے والا شخص قتل ہونے کی صرف اتنی ہی تکلیف محسوس کرتا ہے جس قدر تم میں سے کوئی شخص چیونٹی کے کاٹنے سے درد محسوس کرتا ہے۔“ [3]

---

1 التاريخ الإسلامي للحميدي: 50/6. 2 السيرة النبوية لابن هشام: 196/3، و دلائل النبوة للبيهقي: 353/3. اور ملاحظہ کیجیے: فتح الباري، شرح الحديث: 4092,4091. 3 جامع الترمذي، حديث: 1668، و السنن الكبرىٰ للنسائي: 36/6، و سنن ابن ماجه، حديث: 2802.

اللہ تعالیٰ کے ہاں شہید کے لیے خاص مقام و مرتبہ ہے۔ جیسے اللہ کی راہ میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کر کے شہید گراں قیمت ادا کرتا ہے ایسے ہی اللہ تعالیٰ، جو انتہائی عدل پسند ہے، اس نے بھی بدلہ دینے میں ہرگز کوئی کمی نہیں فرمائی بلکہ اسے چھ انعامات سے نوازا ہے جن میں سے ایک انعام دنیا و مافیہا کے برابر ہے، چنانچہ حضرت مقدام بن معدیکرب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لِلشَّهِيدِ عِنْدَ اللّٰهِ سِتُّ خِصَالٍ: يُغْفَرُ لَهُ فِي أَوَّلِ دُفْعَةٍ مِّنْ دَمِهِ، وَيُرٰى مَقْعَدَهُ مِنَ الْجَنَّةِ وَيُجَارُ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ، وَيَأْمَنُ مِنَ الْفَزَعِ الْأَكْبَرِ، وَيُحَلّٰى حُلَّةَ الْإِيمَانِ وَيُزَوَّجُ مِنَ الْحُورِالْعِينِ وَيُشَفَّعُ فِي سَبْعِينَ إِنْسَانًا مِّنْ أَقَارِبِهِ»

"اللہ تعالیٰ کے ہاں شہید کے لیے چھ انعام ہیں: ① خون جاری ہوتے ہی اس کے گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں۔ ② اسے جنت میں اس کا ٹھکانا دکھا دیا جاتا ہے۔③ اسے عذاب قبر سے محفوظ کر دیا جاتا ہے اور وہ بڑی گھبراہٹ سے بھی محفوظ رہے گا۔ ④ اسے ایمان کا جوڑا پہنایا جاتا ہے۔⑤ اس کا عقد موٹی موٹی خوبصورت آنکھوں والی حور سے کر دیا جاتا ہے۔ ⑥ اسے اپنے خاندان کے ستر اشخاص کی شفاعت کا حق عطا ہوتا ہے۔"[1]

یہ اعزازات اس واضح اور امتیازی نشان کے علاوہ ہیں جس کے ساتھ شہید روز قیامت آئے گا۔ اس وقت اس کا زخم اس دن کی طرح تازہ ہوگا جس دن وہ اسے لگا تھا۔ اس کا رنگ تو بظاہر خون کی طرح ہوگا مگر خوشبو کستوری جیسی ہوگی۔[2]

اسی طرح شہداء کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ ان کی زندگی ان کی شہادت کے ساتھ ہی

---

1 جامع الترمذي، حديث: 1663، و سنن ابن ماجه، حديث: 2799. 2 جامع الترمذي، حديث: 1656.

ختم نہیں ہو جاتی بلکہ وہ زندہ ہوتے ہیں اور رب کے پاس انھیں رزق پہنچایا جاتا ہے اور وہ نعمتوں سے مستفید ہوتے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ عِنْدَ رَبِّھِمْ يُرْزَقُوْنَ ۝﴾

”اور ان لوگوں کو مردہ خیال نہ کرو جو اللہ کے راستے میں مارے گئے ہیں بلکہ وہ زندہ ہیں، انھیں ان کے رب کے ہاں رزق دیا جاتا ہے۔“[1]

❁ **نبی مکرم ﷺ عالم الغیب نہیں تھے:** بئر معونہ، رجیع اور اس قسم کے دیگر واقعات سے پتا چلتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ غیب نہیں جانتے تھے۔ جیسا کہ دیگر دلائل بھی اس حقیقت کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَاۗءَ اللّٰهُ ۭوَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ ۚ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْۗءُ ۚ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝﴾

”کہہ دیجیے: میں اپنی جان کے لیے نفع اور نقصان کا اختیار نہیں رکھتا مگر جو اللہ چاہے اور اگر میں غیب جانتا ہوتا تو بہت سی بھلائیاں حاصل کر لیتا اور مجھے کوئی تکلیف نہ پہنچتی، میں تو ڈرانے والا اور خوشخبری سنانے والا ہوں ان لوگوں کو جو ایمان لاتے ہیں۔“[2]

غیب صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے، جبکہ انبیاء اور رسل علیہم السلام صرف اسی قدر ہی جانتے ہیں جس قدر انھیں اللہ تعالیٰ بتلا دیں۔[3] ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿عٰلِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰي غَيْبِهٖٓ اَحَدًا ۝ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ يَسْلُكُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا ۝﴾

1 آل عمرٰن 3:169. 2 الأعراف 7:188. 3 وقفات تربوية مع السيرة النبوية لأحمد فريد، ص: 237.

''(وہی) عالم الغیب ہے، وہ اپنا غیب کسی پر ظاہر نہیں کرتا۔ سوائے کسی رسول کے جسے وہ پسند کرے، پھر بے شک وہ اس (رسول) کے آگے اور پیچھے نگہبان لگا دیتا ہے۔''[1]

❁ عہد کی پاسداری: حضرت عمرو بن امیہ ضمری رضی اللہ عنہ بئر معونہ کے موقع پر قید ہوگئے۔ جب عامر بن طفیل کو معلوم ہوا کہ وہ مُضَر قبیلے سے ہیں تو اس نے انھیں قید سے رہا کیا اور ان کی پیشانی کے بال کاٹ دیے۔ اور اس کی اپنی والدہ کے ذمے غلام آزاد کرنے کی جو نذر تھی اسے پورا کرنے کے لیے انھیں آزاد کر دیا۔ حضرت عمرو بن امیہ ضمری رضی اللہ عنہ جب مدینہ کا ارادہ کیے ہوئے راستے میں سایے تلے ٹھہرے تو وہاں بنو عامر کے دو آدمی بھی آ گئے۔ ان دونوں کے ہمراہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے امان نامہ موجود تھا۔ مگر عمرو بن امیہ رضی اللہ عنہ کو اس کا علم نہ تھا۔ وہ دونوں جب وہاں پڑاؤ کے لیے آگئے تو وہ ان سے پوچھنے لگے: ''تم کس قبیلے سے تعلق رکھتے ہو؟'' دونوں نے جواب دیا: ''بنو عامر سے۔'' حضرت عمرو بن امیہ رضی اللہ عنہ نے انھیں کچھ نہ کہا مگر جب وہ سو گئے تو ان پر حملہ کر کے دونوں کو قتل کر دیا۔ ان کے دل میں خیال یہ تھا کہ میں نے ان دونوں کو قتل کر کے بنو عامر سے صحابہ رضی اللہ عنہم کے قتل کا بدلہ لے لیا ہے۔ جب عمرو بن امیہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آکر اس کی اطلاع دی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لَقَدْ قَتَلْتَ قَتِيلَيْنِ لَأَدِيَنَّهُمَا»

''یقیناً تم نے دو آدمیوں کو (ناجائز) قتل کیا ہے، لہٰذا میں ان کی دیت ضرور ادا کروں گا۔''[2]

یہ کتنا بلند کردار ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو عامر کے ان دونوں آدمیوں کی دیت ادا کی جنھیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے امان نامہ مل چکا تھا مگر یہ بات عمرو بن امیہ رضی اللہ عنہ کے علم

---

1 الجن72:26، 27. 2 صحيح البخاري، حديث:4093، والسيرة النبوية لابن هشام:3/206.

میں نہ تھی تو انھوں نے دونوں کو قتل کر دیا تھا۔ مسلمانوں کے ساتھ دھوکا بنو عامر کے دیگر لوگوں نے کیا تھا، اس وجہ سے آپ ﷺ نے انھیں مجرم نہیں ٹھہرایا اور دوسروں کا بدلہ ان سے نہ لیا۔ یہ ایفائے عہد کی بلند ترین مثال اور بڑا اعلیٰ نمونہ ہے۔

یہ عین ممکن تھا کہ رسول اللہ ﷺ حضرت عمرو بن امیہ رضی اللہ عنہ کے اس اقدامِ قتل کو اپنے شہداء کے انتقام کا ایک حصہ قرار دے دیتے کیونکہ مجرموں اور ظلم وستم کرنے والوں سے ایسا سلوک روا ہے لیکن آپ ﷺ نے کسی قوم کے کچھ لوگوں کے ظلم وستم کو دیگر بے گناہ افراد کے کھاتے میں ڈال کر انھیں مجرم نہیں ٹھہرایا۔ اسلام کی روشن اور اعلیٰ تعلیمات ہی نے آپ ﷺ اور مسلمانوں کی ان اخلاق عالیہ کی طرف رہنمائی کی ہے جن کی مثال بنی نوعِ انسان سے ملنا مشکل ہے۔[1]

❁ **عظمت کا نشان عامر بن فہیرہ رضی اللہ عنہ:** جب بئر معونہ کے موقع پر متعدد صحابہ رضی اللہ عنہم شہید ہوگئے اور عمرو بن امیہ ضمری قید ہوئے تو عامر بن طفیل نے ان سے ایک شہید کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دریافت کیا: ''یہ کون ہے؟'' عمرو رضی اللہ عنہ کہنے لگے: ''یہ عامر بن فہیرہ رضی اللہ عنہ ہیں۔'' عامر بولا: ''میں نے قتل ہوجانے کے بعد دیکھا کہ انھیں آسمان کی طرف اٹھالیا گیا ہے حتی کہ وہ بالکل آسمان کے قریب ہوگئے۔ اور پھر انھیں نیچے رکھ دیا گیا۔''[2]

❁ **حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کا عامر بن طفیل کو قتل کرنے پر ابھارنا:** شاعر رسول حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ عامر بن طفیل کے قتل پر ابھارتے ہیں، حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کا تعلق خبر رساں ادارے سے تھا۔

حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ دشمن پر اعصابی جنگ برپا رکھتے تھے۔ حضرت کعب بن مالک اور عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہما جیسے دیگر شعراء بھی ان کے ساتھ تھے۔ انھوں نے کافروں کے ہر قصیدے کا منہ توڑ جواب دیا۔ ان شعراء نے رسول اللہ ﷺ کی حیات مبارکہ کے

---

[1] التاريخ الإسلامي للحميدي: 50/6. [2] صحيح البخاري، حديث: 4093.

ہر واقعے پر شعر کہے۔ حضرت حسان رضی اللہ عنہ کے یہودی سردار کعب بن اشرف کی تردید میں کہے گئے اشعار مشہور و معروف ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسلامی ریاست کے شعراء کا دھیان رکھتے اور جہاد کے شعبے میں ان کی حوصلہ افزائی فرماتے تھے۔ عصر حاضر کے مسلمان علماء، فقہاء، قائدین، سیاسی ذمے داروں اور عوامی حلقوں کا فرض بنتا ہے کہ اپنے ہاں کے شعراء کی کفالت کریں اور جہاد کے اس عظیم شعبے میں حصہ لینے پر ان کی حوصلہ افزائی کریں۔[1]

حضرت حسان رضی اللہ عنہ کو بئر معونہ والوں کی خبر ہوئی تو انھوں نے ایسے اشعار کہے جنھیں بڑی شہرت ملی۔ ان شعروں میں انھوں نے ربیعہ بن عامر بن مالک کو عامر بن طفیل کے خلاف برانگیختہ کیا کہ اس نے تمھارے والد ابو براء عامر بن مالک کے عہد کو پامال کیا ہے۔ حضرت حسان رضی اللہ عنہ نے کہا:

''ہاں! کون میرا یہ پیغام ربیعہ کو پہنچائے گا جو تم نے میرے بعد زمانے میں نئی (بدعہدی) پیدا کی ہے۔

تمھارا والد ابو براء جو کردار کا غازی اور بڑے شرف والا ہے۔ تمھارا ماموں حکم بن سعد ہے۔

ام بنین کے بیٹو! کیا تمھیں کچھ خیال نہ آیا، حالانکہ تم اہل نجد کے سرداروں میں شمار ہوتے ہو۔

ابو براء کا عہد وفا توڑنے کے لیے عامر بن طفیل کی یہ زبردستی! اور غلطی سے جو کچھ ہو جائے وہ ارادتاً کرنے کی طرح نہیں ہوتا۔''[2]

عرب کے ہاں شعر تیروں، نیزوں اور تلواروں سے بھی زیادہ موثر سمجھے جاتے تھے۔ یہ اشعار ربیعہ بن ابی براء کو پہنچے تو وہ اسی وقت اپنے باپ کا بدلہ لینے اٹھ کھڑا ہوا۔ جاتے ہی عامر بن طفیل پر اس نے ایسا حملہ کیا کہ وہ مرا تو نہیں مگر لہولہان ضرور ہو گیا۔ قوم اس پر ٹوٹ پڑی اور انھوں نے عامر سے کہا: ''اس سے بدلہ لیجیے۔'' عامر نے کہا: ''میں درگزر کرتا ہوں۔ اور اگر زندہ رہا تو اس کے متعلق خود فیصلہ کروں گا۔''[3]

---

1 الأساس في السنة لسعيد حوّى: 656/2. 2 محمد رسول الله لصادق عرجون: 64/4.

3 صحيح البخاري، حديث:4091، وفتح الباري، شرح الحديث:4096.

حضرت حسان رضی اللہ عنہ نے بئر معونہ کے شہداء بالخصوص منذر بن عمرو رضی اللہ عنہ پر اظہار تاسف کرتے ہوئے جو اشعار کہے تھے ان میں سے چند ایک یہ ہیں:

''اپنی آنکھوں سے بے شمار آنسو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان شہ سواروں پر بہاؤ جو بئر معونہ میں شہید کر دیے گئے۔

جس روز وہ موت کا استقبال کر رہے تھے اور موت تقدیر کے فیصلے پر ان کا استقبال کر رہی تھی۔

بئر معونہ والوں کو موت ایسے لوگوں کی بدعہدی کی بنا پر آئی جن کے عہد و وفا کی رسی غداری سے بندھی ہوئی ہے۔

سخت افسوس ہے کہ منذر ہم سے منہ موڑ گیا۔ وہ بڑی تیزی اور نہایت صبر و استقلال سے موت کی جانب بڑھ گیا۔''[1]

❁ **عامر بن طفیل کی موت:** رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عامر بن طفیل کے لیے بددعا کی جسے اللہ تعالیٰ نے قبول فرمایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: «اَللّٰهُمَّ اكْفِنِي عَامِراً» ''اے میرے اللہ! مجھے عامر سے بے فکر کر دے۔''[2]

تب اس سرکش کو لاعلاج مرض لاحق ہوا جسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے «غُدَّةٌ كَغُدَّةِ الْبَعِيرِ» ''اونٹ کی گلٹی جیسی گلٹی'' سے تعبیر کیا اور طاعون کا نام دیا۔[3]

یہ گلٹی کے طاعون کی خاص صورت تھی جس میں دوسری اقسام کی بنسبت درجہ حرارت بڑھ جاتا ہے۔ متاثرہ عضو کے آس پاس یا بغل کے نیچے گلٹیاں سی بن جاتی ہیں اور تلی بھی بڑی ہو جاتی ہے۔[4]

عامر بن طفیل کو یہ مرض اس کی قوم کی ایک عورت کے گھر لاحق ہوا اور وہ وہیں کا ہو کر رہ گیا۔

---

1 السيرة النبوية لابن هشام: 209/3. 2 المعجم الكبير للطبراني، رقم الحديث: 5724، ومجمع الزوائد: 126,125/6. 3 فتح الباري، شرح الحديث: 4091. 4 تعليق الدكتور قلعجي على دلائل النبوة للبيهقي: 346/2.

یوں عامر بن طفیل کا جزیرۂ عرب پر حکمرانی کا خواب بکھر گیا۔ وہ لشکر جن کی اس نے نبی اکرم ﷺ کو دھمکی دی تھی، اس کے گلے میں موت کا ہار بن گئے۔ وہ اسے ایک عورت کے گھر میں بند کر کے اس خدشے سے ادھر ادھر ہوگئے کہ یہ متعدی مرض ہے کہیں انھیں بھی لاحق نہ ہوجائے۔ عامر بن طفیل کی عقل میں خلل آگیا۔ وہ اپنے پاس موجود لوگوں کو چیخ چلا کر کہنے لگا: «غُدَّةٌ كَغُدَّةِ الْبَكْرِ فِي بَيْتِ امْرَأَةٍ مِنْ آلِ بَنِي فُلَانٍ إِئْتُونِي بِفَرَسِي» ''فلاں خاندان کی ایک عورت کے گھر میں اونٹ کی گلٹی جیسی گلٹی، میرا گھوڑا لاؤ۔'' چنانچہ گھوڑے کی پیٹھ پر اس کا دم نکل گیا۔[1]

یہ سرکش ضدی انسان پاگل ہوکر مرگیا۔ لوگ متعدی مرض کے خوف سے اسے چھوڑ کر جاچکے تھے۔[2]

نبی مکرم ﷺ کا زینب رضی اللہ عنہا اور ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے عقد اور دیگر واقعات

زینب بنت خزیمہ ام المساکین رضی اللہ عنہا سے عقد

یہ ہیں زینب بنت خزیمہ بن حارث ہلالیہ جو بنو عبد مناف بن ہلال بن عامر بن صعصعہ سے تعلق رکھتی تھیں۔ زمانۂ جاہلیت میں مساکین کو بکثرت کھانا کھلانے کی بنا پر ام المساکین کہلائیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ہجرت سے اکتیس ماہ بعد (3 ھ) رمضان المبارک میں ان سے عقد فرمایا۔ حضرت زینب رضی اللہ عنہا قریباً آٹھ ماہ آپ ﷺ کی رفاقت میں رہیں اور آپ ﷺ کی زندگی ہی میں، انتالیسویں ماہ، ربیع الثانی کے آخر میں وفات پاگئیں۔ مدینۃ الرسول ﷺ میں مدفون ہیں۔[3]

حضرت زینب رضی اللہ عنہا قبل ازیں حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کے عقد میں تھیں۔ وہ جنگ

---

1 صحيح البخاري، حديث: 4091. 2 السيرة النبوية للصوياني، ص: 131. 3 تفسير القرطبي: 14/166.

احد میں شہید ہوگئے تو رسول اللہ ﷺ نے زینب رضی اللہ عنہا سے عقد فرمالیا۔ گویا آپ ﷺ نے ان کی عظمت کے اعتراف میں ان سے شادی کرلی۔ [1]

ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے نکاح

یہ ہیں ہند بنت ابی امیہ حذافہ بن مغیرہ قریشیہ مخزومیہ۔ پہلے اپنے چچازاد ابوعبداللہ بن عبدالاسد کے نکاح میں تھیں۔ ابوسلمہ بن عبدالاسد رسول اللہ ﷺ کی پھوپھی برّہ بنت عبدالمطلب کے بیٹے اور آپ ﷺ کے رضاعی بھائی تھے۔ حضرت ابوسلمہ اور ام سلمہ رضی اللہ عنہما نے دین و ایمان کی حفاظت کے لیے پہلے ہجرتِ حبشہ کی، پھر واپس مکہ مکرمہ آگئے اور جب نبی ﷺ نے اور دیگر مسلمانوں نے مدینہ ہجرت کی تو انھوں نے بھی مدینہ کا رخ کیا۔ [2]

ابوسلمہ رضی اللہ عنہ کا ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے ایک یادگار مکالمہ: حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا ایک روز جناب ابوسلمہ رضی اللہ عنہ سے کہنے لگیں: ”مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ کسی عورت کا خاوند فوت ہوجائے اور وہ عورت اس کے بعد عقد نہ کرے تو اللہ تعالیٰ انھیں جنت میں ضرور جمع فرما دے گا، آیئے ہم آپس میں عہد کریں کہ ایک دوسرے کے بعد عقد نہیں کریں گے۔“

حضرت ابوسلمہ رضی اللہ عنہ نے پوچھا: ”کیا تم میری بات تسلیم کروگی؟“ بولیں: ”بالکل“ حضرت ابوسلمہ رضی اللہ عنہ نے کہا: ”جب میں فوت ہو جاؤں تو تم عقد کر لینا۔“ انھوں نے پھر دعا مانگی:

«اَللّٰھُمَّ ارْزُقْ أُمَّ سَلَمَةَ بَعْدِي رَجُلًا خَيْرًا مِّنِّي لَا يَحْزُنُهَا وَلَا يُؤْذِيهَا»

”اے اللہ! میرے بعد ام سلمہ کو مجھ سے بہتر شوہر عطا کرنا جو اسے دکھ اور تکلیف نہ دے۔“

ام سلمہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ جب ابوسلمہ رضی اللہ عنہ وفات پا گئے تو میں نے سوچا: ”ابوسلمہ سے بہتر کون ہوگا؟“ پھر زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ رسول اللہ ﷺ تشریف لائے، دروازے

1 المفصل في أحكام المرأة للدكتور عبدالكريم زيدان: 469/11. 2 سير أعلام النبلاء: 202/2.

پر کھڑے ہوئے اور ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے چچا زاد یا بیٹے سے ان کا ہاتھ مانگا۔ ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے کہا: ''(کیا کروں) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات تسلیم نہ کروں یا اولاد سمیت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس چلی جاؤں۔'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگلے روز دوبارہ شادی کا پیغام لے کر آ گئے۔[1]

خاوند کی وفات پر ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی دعا: حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کو اپنے خاوند سے بے حد محبت تھی۔ جب مشرکین سے جنگ[2] میں آنے والے زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے ابوسلمہ رضی اللہ عنہ شہید ہو گئے تو ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! ابوسلمہ وفات پا گئے ہیں۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«قُولِي: اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِي وَلَهُ، وَأَعْقِبْنِي مِنْهُ عُقْبٰى حَسَنَةً»

''تم یوں دعا کیا کرو: ''اے اللہ مجھے اور اسے بخش دے اور مجھے اس سے اچھا بدلہ عطا فرما۔''

کہتی ہیں کہ میں نے یہ دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے مجھے ان سے اچھا بدلہ عطا کیا، یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم (کے نکاح میں آ گئی)۔[3]

ارادۂ نکاح کے وقت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات چیت: عمر بن ابوسلمہ رضی اللہ عنہما کا بیان ہے کہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی عدت پوری ہو گئی تو ابوبکر رضی اللہ عنہ نے پیغام نکاح بھیجا۔ ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے قبول نہ کیا، پھر عمر رضی اللہ عنہ نے پیغام بھیجا۔ ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے اسے بھی قبول نہ کیا، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام پہنچا تو مرحبا کہا اور پیغام لانے والے سے کہا کہ

---

1 سير أعلام النبلاء: 203/2. محقق کے بقول ابن سعد کی یہ روایت ہے اور اس کے رجال بھی ثقہ ہیں۔ 2 حضرت ابوسلمہ رضی اللہ عنہ غزوۂ بدر اور احد میں شریک ہوئے تھے۔ غزوۂ احد میں انھیں گہرے زخم آئے تھے۔ بعد میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں بنو اسد کے خلاف ایک معرکہ میں بھیجا جہاں ان کے پرانے زخم تازہ ہو گئے اور زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے شہید ہو گئے۔ (الإصابة في تمييز الصحابة: 154/4)

3 صحيح مسلم، حديث: 919، ومسند أحمد: 291/6.

رسول اللہ ﷺ کو یہ بتا دیں: ''میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ غیرت مند بھی ہوں اور اس وقت یہاں میرا کوئی ولی بھی موجود نہیں۔'' آپ ﷺ نے جواباً فرمایا: «أَمَّا قَوْلُكِ: إِنِّي مُصْبِيَةٌ فَإِنَّ اللّٰهَ سَيَكْفِيكِ صِبْيَانَكِ وَأَمَّا قَوْلُكِ: إِنِّي غَيْرٰى، فَسَأَدْعُو اللّٰهَ أَنْ يُّذْهِبَ غَيْرَتَكِ، وَأَمَّا الْأَوْلِيَاءُ فَلَيْسَ أَحَدٌ مِّنْهُمْ إِلَّا سَيَرْضٰى بِي» ''تمھارا یہ کہنا کہ میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں تو ان کے لیے اللہ تعالیٰ کافی ہے۔ تمھارا یہ خیال کہ میں بڑی باغیرت ہوں تو میں اس کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کروں گا۔ رہے ولی تو میرے متعلق تمھارے سب ولی رضامندی کا اظہار ہی کریں گے۔''[1]

ایک روایت میں ہے کہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے عرض کی: ''میں ادھیڑ عمر ہوں۔'' آپ ﷺ نے جواب دیا: «وَأَمَّا السِّنُّ فَأَنَا أَكْبَرُ مِنْكِ» ''میں عمر میں تم سے بڑا ہوں۔''[2] یہ جواب آپ ﷺ نے بڑا اچھا دیا اور آپ ﷺ تو تھے ہی بڑے اچھے بلکہ سب سے اچھے۔[3]

اس پر ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے اپنے بیٹے عمر سے کہا: ''چلیے! رسول اللہ ﷺ سے عقد کا انتظام کیجیے۔''[4]

ابن کثیر رحمہ اللہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی اس بات: ''چلیے، عقد کا انتظام کیجیے۔'' پر کہتے ہیں: ''اس کا مقصود یہ تھا کہ میں اس کے لیے راضی ہوں اور اجازت دیتی ہوں۔ اس سے کچھ علماء نے سمجھ لیا کہ شاید وہ اتنے چھوٹے بچے کو نکاح طے کرنے کی ذمہ داری سونپ رہی ہیں۔ وہ بچہ تو بہت چھوٹا تھا اور اس کا اہل نہیں تھا۔'' امام ابن کثیر رحمہ اللہ مزید کہتے ہیں: ''میں نے اس کی تحقیق پر ایک کتابچہ لکھا ہے۔ میں نے اس میں وضاحت کی ہے کہ معاملات نکاح کی ذمہ داری ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے بڑے بیٹے سلمہ نے نبھائی تھی۔''[5]

---

1 مسند أحمد: 314,313/6، والسنن الکبریٰ للنسائي: 82,81/6، وسیر أعلام النبلاء: 204,203/2. 2 الطبقات لابن سعد: 90/8 رجال ثقہ ہیں۔ 3 المفصل في أحکام المرأة للدکتور عبدالکریم زیدان: 470/11. 4 سیر أعلام النبلاء: 204,203/2. 5 البدایة والنهایة: 92/4.

نکاح کے لیے گھریلو سامان کی تیاری اور ان سے معاملہ: نکاح کا معاملہ طے پا گیا تو آپ ﷺ نے ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے کہا:

«أَمَا إِنِّي لَا أَنْقُصُكِ شَيْئًا مِّمَّا أَعْطَيْتُ أُخْتَكِ فُلَانَةَ، رَّحَيَيْنِ وَجَرَّتَيْنِ وَ وِسَادَةً مِّنْ أَدَمٍ حَشْوُهَا لِيفٌ»

''میں نے تمھاری فلاں بہن کو جو کچھ دیا تھا تمھیں اس سے کم نہیں دوں گا، یعنی دو چکیاں، دو مٹکے اور کھجور کے پتوں سے بھرا ایک تکیہ۔''[1]

ابوسلمہ رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے ہاں بیٹی پیدا ہوئی تھی۔ اب رسول اللہ ﷺ سے نکاح ہو چکا تھا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ جب آپ ﷺ تشریف لاتے تو ام سلمہ رضی اللہ عنہا اپنی بیٹی زینب کو دودھ پلانا شروع کر دیتیں۔ آپ ﷺ نہایت مہربان اور بڑے شرمیلے تھے۔ آپ واپس تشریف لے جاتے۔ ایسا ہوتا رہا۔ ام سلمہ کے ماں جائے بھائی عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما ان معاملات کو بھانپ گئے۔ انھوں نے اپنے ہاں یا کسی اور عورت کے ہاں بھانجی کی رضاعت کا انتظام کر دیا۔ نبی ﷺ تشریف لائے تو پوچھا: «أَيْنَ زُنَابُ» ''چھوٹی بچی کہاں ہے؟'' ام سلمہ کے پاس قریبہ بنت ابو امیہ کھڑی تھیں، وہ کہنے لگیں: ''اسے عمار بن یاسر نے لے لیا ہے۔'' آپ ﷺ نے فرمایا:

«إِنِّي آتِيكُمُ اللَّيْلَةَ» ''تو میں آج رات آؤں گا۔''

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ میں نے پسا ہوا آٹا جمع کرنے کی چادر چکی تلے بچھائی۔ مٹکے سے کچھ جو نکالے اور انھیں چربی میں ملایا۔ آپ ﷺ نے شب بسری کے بعد فرمایا: «إِنَّ بِكِ عَلٰى أَهْلِكِ كَرَامَةً فَإِنْ شِئْتِ سَبَّعْتُ لَكِ وَإِنْ أُسَبِّعْ لَكِ سَبَّعْتُ لِنِسَائِي وَإِنْ شِئْتِ ثَلَّثْتُ ثُمَّ دُرْتُ!» ''تم میرے نزدیک قابل احترام ہو، تم چاہو تو میں تمھارے پاس سات دن قیام کروں لیکن پھر دیگر ازواج کے پاس بھی سات دن ہی

[1] سیر أعلام النبلاء:2/204.

رہوں گا۔ اور اگر تم چاہو تو میں تمھارے پاس تین دن قیام کروں اور پھر معمول کے مطابق آؤں گا۔'' ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے کہا: ''تین دن تک رہیے۔''[1]

پھر آپ ﷺ نے فرمایا:

«لِلْبِكْرِ سَبْعٌ وَّلِلثَّيِّبِ ثَلَاثٌ»

''غیر شادی شدہ (کنواری) کے لیے سات اور بیوہ کے لیے تین دن ہیں (اتنے ایام ان کے پاس رہا جائے)۔''[2]

شادی کرنے والے کی اگر پہلے سے بیوی موجود ہے تو وہ اپنی اس بیوی کے پاس اسی حساب سے قیام کرے گا۔ آپ ﷺ تین خوشگوار دن ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس رہے اور اس کے بعد معمول کے مطابق آنے لگے۔

برّہ بنت ابوسلمہ کے نام کی تبدیلی: اس یتیم بچی برّہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ شادی کے بعد ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس آئے تو وہ مجھے برّہ کے نام سے پکارتی تھیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

«لَا تُزَكُّوا أَنْفُسَكُمْ، فَإِنَّ اللّٰهَ هُوَ أَعْلَمُ بِالْبَرَّةِ مِنْكُنَّ وَالْفَاجِرَةِ سَمِّيهَا زَيْنَبَ»

''اپنے آپ کی پاکیزگی نہ بیان کیا کرو، اللہ تعالیٰ نیک و بد کو خوب جانتا ہے۔ اس کا نام زینب رکھو۔'' ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے کہا: ''یہ آج سے زینب ہے۔''[3]

یہ رسول اللہ ﷺ کی عادت مبارکہ تھی کہ آپ اچھے نام پسند فرماتے تھے۔ نہ صرف بچوں کے ناگوار نام تبدیل کر دیتے بلکہ مرد و خواتین اور بوڑھی عورتوں تک کے نام بھی تبدیل کر دیتے تھے۔ آپ ﷺ کی خدمت میں ایک آدمی کو شہاب (دہکتا ہوا انگارا) کے نام سے

---

[1] صحیح مسلم، حدیث: 1460، وسنن أبي داود، حدیث: 2122. [2] صحیح مسلم، حدیث: 1460. [3] صحیح مسلم، حدیث: (19)2142، والأدب المفرد، رقم: 821.

پکارا جارہا تھا آپ نے فرمایا: «بَلْ أَنْتَ هِشَامٌ» ''نہیں بلکہ تم ہشام (سخاوت) ہو۔''[1]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس تشریف فرما تھے کہ ایک بڑھیا آئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا: «مَنْ أَنْتِ؟» ''تم کون ہو؟'' اس نے بتایا: ''جثامہ مزنیہ ہوں۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «بَلْ أَنْتِ حَسَّانَةُ الْمُزَنِيَّةُ! كَيْفَ أَنْتُمْ؟ كَيْفَ حَالُكُمْ؟ كَيْفَ كُنْتُمْ بَعْدَنَا؟» ''بلکہ تم حسانہ مزنیہ ہو، تم لوگ کیسے ہو؟ تمھارا کیا حال ہے؟ ہمارے بعد (ہجرت مدینہ کے بعد) کیسے رہے؟'' اس نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! آپ پر میرے ماں باپ قربان! ہم بہت اچھے رہے ہیں۔ اس دوران (پکا ہوا) گوشت آپ کی خدمت میں لایا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم (اپنے مبارک ہاتھوں سے) اس کی مہمان نوازی کرنے لگے۔ اس نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! آپ کے مبارک ہاتھ چکناہٹ والے نہ ہو جائیں!'' سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ جب وہ چلی گئیں تو میں نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! ایک بڑھیا پر اتنی نوازش؟'' فرمایا: «إِنَّهَا كَانَتْ تَأْتِينَا زَمَنَ خَدِيجَةَ، وَإِنَّ حُسْنَ الْعَهْدِ مِنَ الْإِيمَانِ» ''جب خدیجہ زندہ تھیں تو یہ ہمارے پاس آیا کرتی تھیں۔ گزرے ہوئے اچھے وقت کی یاد تازہ کرنا بھی تو ایمان ہے۔''[2]

ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے شادی کی حکمت: تفسیر المنار کے مولف نے لکھا ہے کہ اس شادی کی حکمت صرف یہی نہیں تھی کہ جائز خواہش کو پورا کر لیا جائے بلکہ اس کی حکمت تب واضح ہوگی جب آدمی ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی اس صائب رائے پر غور کرے جو انھوں نے ''حدیبیہ'' کے روز دی تھی۔ علاوہ ازیں انھوں نے خاوند کی وفات پر صبر جمیل کیا تھا جو اللہ تعالیٰ کو بہت پسند آیا۔[3]

یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا قریش کی معزز شاخ بنو مخزوم سے تعلق رکھتی تھیں۔ قریش میں حرب و ضرب کے معاملات بنو مخزوم کے سپرد تھے۔ یوں وہ آپ سے جنگ

---

[1] مسند أحمد: 75/6، والأدب المفرد، رقم: 825، ومجمع الزوائد: 51/8. [2] شعب الإيمان للبيهقي، رقم: 9122، والمستدرك للحاكم: 16/1، والسلسلة الصحيحة: 424/1، حديث: 216.

[3] تفسير المنار: 372/4.

کرنے اور دشمنی کے اظہار میں پیش پیش رہتے تھے۔ اس شادی سے بنومخزوم کا کینہ فرو ہوا اور ان کے دل قریب ہوگئے۔ یہ شادی ان کی محبت کی بنیاد بنی تا کہ آپ ﷺ کے سسرال بننے کا شرف حاصل کرنے کے بعد وہ اسلام میں بھی داخل ہو جائیں۔[1]

اس شادی سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ مجموعی طور پر امت کی اندرونی حالت بہت اچھی تھی۔ رسول اللہ ﷺ شہداء کی ازواج کا بہت خیال رکھتے تھے۔ ازواج شہداء کا حق تھا کہ نور نبوت سے فیض یابی کے بعد انھیں پیغام رسالت کے پہنچانے کا موقع دیا جاتا۔[2]

امہات المومنین رضی اللہ عنہن میں ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے سب سے آخر میں (61 ہجری میں) وفات پائی۔ ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے 388 مرفوع احادیث مروی ہیں، جبکہ صحیح بخاری میں 3 اور صحیح مسلم میں 13 احادیث ہیں۔[3]

ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے علم وحکمت کی ترویج و اشاعت میں نمایاں کردار ادا کیا اور اسلامی تعلیمات کی روشنی پھیلانے میں دوسرے راویوں کے ہمراہ بھرپور حصہ لیا۔ نور ہدایت اور علم وحکمت کا یہ آخری چراغ ان کی وفات کے ساتھ ہی بجھ گیا۔[4]

حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما کی پیدائش

امام قرطبی کا بیان ہے کہ حسن رضی اللہ عنہ 4 ھ شعبان میں پیدا ہوئے۔ یوں حضرت حسین رضی اللہ عنہ، حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے بعد ایک سال کے اندر اندر تولد ہوئے۔ اسے واقدی کے اس بیان سے بھی تائید ملتی ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا جناب حسن رضی اللہ عنہ کی پیدائش کے پچاس دن بعد دوبارہ حاملہ ہوئیں۔ امام نووی نے التہذیب میں صراحت کی ہے کہ حضرت حسن 5 شعبان 4 ھ کو پیدا ہوئے۔[5]

---

1 التربية القيادية للدكتور الغضبان: 356/3. 2 التربية القيادية للدكتور الغضبان: 357/3.
3 سير أعلام النبلاء: 210/2. 4 السيرة النبوية لأبي شهبة: 249,248/2. 5 شذرات الذهب لابن العماد الحنبلي: 10/1.

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ جب حسن پیدا ہوا تو میں نے اس کا نام حرب رکھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور فرمایا: «أَرُونِي ابْنِي! مَا سَمَّيْتُمُوهُ؟» ''مجھے میرا بیٹا تو دکھاؤ، نام کیا رکھا ہے اس کا؟'' میں نے عرض کیا: ''حرب (جنگ) نام رکھا ہے۔'' فرمایا: «بَلْ هُوَ حَسَنٌ» ''نہیں، اس کا نام ''حسن'' ہے۔''[1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سخت اور شدید نام کے بجائے خوش کن اور فرحت انگیز نام رکھ دیا۔ یوں بچے کو خوبصورت نام ملا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حسن کو اٹھایا اور بوسہ دیا۔ ابو رافع بیان کرتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حسن کے دونوں کانوں میں نماز والی اذان کہی۔[2]

عقیقہ کے متعلق ان کا بیان ہے کہ جب حسن رضی اللہ عنہ پیدا ہوئے تو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: ''میں اپنے بیٹے کا عقیقہ نہ کروں؟'' آپ نے فرمایا: «لَا وَلٰكِنِ احْلِقِي رَأْسَهُ وَتَصَدَّقِي بِوَزْنِ شَعْرِهِ مِنْ فِضَّةٍ عَلَى الْمَسَاكِينِ وَالْأَوْفَاضِ» ''نہیں، اس کا سر مونڈ دو اور بالوں کے ہم وزن چاندی مساکین اور ''اوفاض'' پر صدقہ کر دو۔'' ''اوفاض'' چند ضرورت مند صحابہ کرام تھے جو مسجد یا صفہ میں رہتے تھے، چنانچہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں: میں نے ایسا ہی کیا۔[3]

آپ صلی اللہ علیہ وسلم سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کا عقیقہ خود کرنا چاہتے تھے، چنانچہ آپ نے دو مینڈھے ذبح کیے۔[4]

عقیقہ سے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

[1] مسند أحمد: 98/1و118، والأدب المفرد، رقم: 823، والمعجم الكبير للطبراني، رقم: 2773، والمستدرك للحاكم: 180/3، وصحيح ابن حبان، رقم: 6958. [2] مسند أحمد: 9/6و392، وسنن أبي داود، حديث: 5105، وجامع الترمذي، حديث: 1514، علامہ البانی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو حسن کہا ہے، دیکھیے: (صحيح سنن أبي داود: 5105، وصحيح سنن الترمذي: 1514) [3] مسند أحمد: 391,390/6. [4] السنن الكبرىٰ للنسائي: 166/7، والسيرة النبوية للصوياني: 106/3.

«كُلُّ غُلَامٍ مُّرْتَهَنٌ بِعَقِيقَتِهِ، يُذْبَحُ عَنْهُ يَوْمَ سَابِعِهِ وَيُحْلَقُ رَأْسُهُ وَيُسَمّٰى»

''ہر بچہ اپنے عقیقہ کے عوض گروی رکھا ہوا ہے۔ ساتویں دن اس کی طرف سے جانور ذبح کیا جائے، سر مونڈا جائے اور نام رکھا جائے۔''[1]

یہود کی زبان سیکھنا

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ 4 ہجری میں یہود کی زبان سیکھتے ہیں۔ زید بن حارثہ رضی اللہ عنہما حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے حوالے سے بیان کرتے ہیں: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں یہود کی زبان سیکھنے کا حکم دیا تا کہ جب یہود آپ کو خط لکھیں تو زید بن ثابت رضی اللہ عنہ خط پڑھ کر سنائیں۔''[2]

زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے یہ زبان پندرہ دن میں سیکھ لی۔ ایک روایت میں ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو زید کو آپ کی خدمت میں لایا گیا۔ لوگوں نے کہا: ''اے اللہ کے رسول! یہ بنونجار کا نوجوان ہے۔ اسے آپ پر اترنے والی تقریباً انیس سورتیں یاد ہیں۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس پر بڑی خوشی ہوئی۔ ان کی لیاقت دیکھ کر فرمایا: ''زید تم میرے لیے یہود کی زبان سیکھو۔ اللہ کی قسم! مجھے ان پر اعتبار نہیں۔'' حضرت زید رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ پھر پندرہ دن نہیں گزرے تھے کہ میں نے یہود کی زبان سیکھ لی اور اس میں ماہر ہو گیا، چنانچہ جب وہ آپ کو خط لکھتے تو میں ہی خط پڑھ کر سناتا اور آپ ان کا جواب دینا چاہتے تو میں آپ کے کہنے پر جواب لکھ دیتا۔[3]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حکومت میں ترجمان کی بڑی اہمیت ہے کیونکہ اسے معاملات

1 مسند أحمد: 7/5 و8 و12 و17 و22، وسنن أبي داود، حديث: 2838,2837، وجامع الترمذي، حديث: 1522، وسنن ابن ماجه، حديث: 3165. 2 صحيح البخاري، حديث: 7195. 3 سنن أبي داود، حديث: 3645، ومسند أحمد: 186/5، والمستدرك للحاكم: 75/1.

حکومت کے اسرار سے باخبر ہونا ہے۔ یوں وہ حکومت کی طرف سے خطوط کا جواب دیتا ہے۔ یہ درست نہیں کہ حکومتی مراسلات کی اطلاع ہر کسی کو ہو مبادا اسرار حکومت کے فاش ہو جانے سے حکومتی امور میں گڑبڑ پیدا ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے زید رضی اللہ عنہ کو یہود کی بولی سیکھنے کا حکم دیا تھا۔ صرف پندرہ دن میں یہود کی بولی سیکھ جانا ان کے قوی حافظے اور ذہین وفطین ہونے کی واضح دلیل ہے۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ عہد نبوی ہی میں مکمل قرآن پاک حفظ کر چکے تھے اور وحی کے مشہور کاتبین میں شمار ہوتے تھے۔ عہد صدیقی میں بھی کتابت قرآن پاک کی ذمہ داری انھی کے سپرد ہوئی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں مصحف سے مزید نسخے تیار کرنے والوں میں ایک یہ بھی تھے۔

رسول اللہ ﷺ کی طرف سے حضرت زید رضی اللہ عنہ کو یہود کی زبان سیکھنے کا حکم دینا اس امر کی دلیل ہے کہ اسلام مسلمانوں کو اغیار کے علوم وفنون اور زبانیں سیکھنے کی ترغیب دیتا ہے بالخصوص جبکہ اس کی ضرورت بھی ہو۔[1]

1 السيرة النبوية لأبي شهبة:249/2.

باب 2

یہود بنو نضیر کی جلاوطنی

یہود مدینہ نے کعب بن اشرف کے قتل اور معرکۂ احد کی درمیانی مدت بڑی مرعوبیت میں گزاری تھی، تاہم احد میں مسلمانوں کی شکست سے ان کی امیدیں پھر سے بر آئیں۔ یہود کے دلوں میں انجام بد کا خوف نہیں رہا تھا۔ بئر معونہ کا واقعہ بھی ان کی مرعوبیت اور گھبراہٹ کم کرنے کا سبب بنا تھا۔ یہود کی مرعوبیت زیادہ دیر نہ رہی اور وہ مکروفریب کے نئے انداز پھر سے اپنانے لگے۔ انھوں نے اپنے قلعے اسلحے سے بھر لینے اور مسلمانوں پر کاری ضرب لگانے کا ارادہ کر لیا۔[1]

غزوۂ بنو نضیر کی تاریخ اور اس کے اسباب

غزوۂ بنو نضیر کی تاریخ: اہل تحقیق کا خیال ہے کہ غزوۂ بنو نضیر غزوۂ احد کے بعد ربیع الاول 4 ہجری میں پیش آیا۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ غزوۂ بدر کے 6 ماہ بعد پیش آیا۔[2]

امام ابن قیم رحمہ اللہ اس کی تردید میں لکھتے ہیں: ”محمد بن شہاب زہری رحمہ اللہ کا خیال ہے کہ غزوۂ بنو نضیر بدر کے 6 ماہ بعد پیش آیا، تاہم ان کا یہ خیال درست نہیں۔ درست یہ ہے کہ غزوۂ بنو نضیر غزوۂ احد کے بعد پیش آیا۔ غزوۂ بدر کے 6 ماہ بعد غزوۂ بنو قینقاع پیش آیا تھا۔ غزوۂ بنو قریظہ، غزوۂ خندق کے بعد اور غزوۂ خیبر حدیبیہ کے بعد پیش آیا۔“[3] امام

[1] التاريخ السياسي والعسكري للدكتور علي المعطي: 189,188. [2] صحيح البخاري، قبل الحديث: 4028. [3] زادالمعاد: 3/249.

ابن العربی کے بقول درست یہ ہے کہ غزوۂ بنونضیر غزوۂ احد کے بعد پیش آیا تھا۔ امام ابن کثیر کی رائے بھی یہی ہے۔[1]

غزوۂ بنونضیر کے اسباب: نبی مکرم ﷺ کئی ایک اسباب کی بنا پر اس جنگ کے لیے آمادہ ہوئے۔ ان میں سے چند اہم اسباب حسب ذیل ہیں:

❁ **بنونضیر کی عہد شکنی:** معاہدے کی رو سے بنونضیر پر لازم تھا کہ مسلمانوں کے دشمن کو جگہ نہ دیں، یہود نے نہ صرف معاہدے کی خلاف ورزی کی بلکہ دشمن کو مسلمانوں کے کمزور پہلوؤں سے بھی آگاہ کیا۔ ان کی بدعہدی غزوۂ سویق میں بھی سامنے آئی تھی۔ بدر کے بعد ابوسفیان نے نذر مانی تھی کہ مدینہ پر حملہ کرنے سے پہلے وہ غسل جنابت نہیں کرے گا۔ جب وہ دوسو سواروں کے ہمراہ مدینہ روانہ ہوا تو بنونضیر کے سردار سلام بن مشکم نے اس کی حمایت اور مہمان نوازی کی اور پوشیدہ امور سے مطلع کیا۔ مدینہ کے اسرار پر مامور عہدہ داران سے ہرگز بے خبر نہیں تھے۔[2]

صاحب مغازی موسیٰ بن عقبہ کہتے ہیں کہ بنونضیر نے قریش کو مسلمانوں کے راز فراہم کیے، آپ کے خلاف جنگ پر ابھارا اور کمزور پہلوؤں کی نشاندہی کی۔[3]

❁ **رسول اللہ ﷺ پر اچانک حملے کا منصوبہ:** رسول اللہ ﷺ چند صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ہمراہ قباء کے راستے بنونضیر کی طرف روانہ ہوئے تاکہ ان دونوں عامریوں کی دیت میں ان سے تعاون حاصل کریں جو عمرو بن امیہ ضمری رضی اللہ عنہ کی بھول سے مارے گئے تھے۔ عمرو بن امیہ ضمری رضی اللہ عنہ کو یہ علم نہ تھا کہ انھیں تو رسول اللہ ﷺ پناہ دے چکے ہیں۔ آپ ﷺ اس معاہدے کی بنا پر بنونضیر کی طرف گئے جو دیت کی ادائیگی کے لیے آپ کے اور ان کے درمیان طے شدہ تھا۔

---

1 أحكام القرآن لابن العربي: 1765/4، وحديث القرآن عن غزوات الرسول ﷺ للدكتور محمد بكر آل عابد: 254/1. 2 تاريخ الطبري: 284/2. 3 فتح الباري: 332/7.

بنونضیر نے رسول اللہ ﷺ کا بڑا پرتپاک اور مکارانہ استقبال کیا اور آپ ﷺ کو دھوکے سے قتل کرنے کی ناپاک سازش کی۔ ان کا ارادہ یہ تھا کہ آپ جس دیوار کے سایے میں تشریف فرما تھے اسی چھت سے آپ پر بڑا پتھر گرا دیا جائے۔ آپ چونکہ اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں تھے، اس لیے ان کے ارادۂ بد کی اطلاع آپ کو آسمان سے مل گئی۔ آپ فوراً اٹھے اور مدینہ منورہ تشریف لے آئے، بعدازاں صحابہ کرام بھی پہنچ گئے۔[1]

صرف ذات رسول ﷺ بنونضیر کی سعی نامشکور کا ہدف نہ تھی بلکہ انھوں نے حکومت مدینہ اور اسلامی دعوت کو بھی نشانہ بنانے کی کوشش کی تھی، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے بنونضیر سے نمٹنے کا پختہ ارادہ کرلیا۔ آپ ﷺ نے جنگ کی تیاری کا حکم دیا اور کوچ کا اعلان کردیا۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر اس امر کا احسان جتایا کہ اس نے انھیں شر سے محفوظ رکھا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ هَمَّ قَوْمٌ اَنْ يَّبْسُطُوْٓا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ فَكَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۚ وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ ﴾

”اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اپنے اوپر اللہ کی نعمت یاد کرو، جب ایک قوم نے ارادہ کیا تھا کہ تمھاری طرف اپنے ہاتھ بڑھائیں تو اللہ نے انھیں تم پر ہاتھ ڈالنے سے روک دیا اور اللہ سے ڈرو اور ایمان والوں کو چاہیے کہ اللہ ہی پر بھروسا کریں۔“[2]

مفسرین نے اس آیت مبارکہ کی شان نزول کے سلسلے میں کئی روایات بیان کی ہیں، چند ایک حسب ذیل ہیں:

❁ مفسر طبری نے ابو زیاد کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ ابوبکر، عمر اور علی رضی اللہ عنہم کے ہمراہ اپنے ساتھیوں کی دیت میں تعاون کی غرض سے بنونضیر کے ہاں تشریف

1 المغازي للواقدي: 365/1، والتاريخ السياسي والعسكري للدكتور علي المعطي، ص: 190.
2 المآئدة 11:5.

لے گئے۔ آپ نے انھیں فرمایا کہ اس ناگہانی دیت پر مجھ سے تعاون کریں تو انھوں نے کہا: ''ہاں ابوالقاسم! آپ کا حق ہے کہ آپ ضرورت پڑنے پر ہمارے پاس آئیں۔ آپ تشریف رکھیے، پہلے کھانا کھائیے۔'' آپ صحابہ کے ساتھ انتظار میں بیٹھ گئے۔ ان کا لیڈر بھی آیا، (پھر وہ اپنے لوگوں کے پاس چلا گیا اور) اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا: آج یہ تمھارے قابو میں ہے۔ اس پر پتھر پھینکو اور قتل کر دو (نعوذ باللہ)۔ اس کے بعد تمھارا کوئی اندیشہ باقی نہیں رہے گا۔

وہ ایک بڑی چکی کا پاٹ اٹھا لائے کہ آپ پر گرا دیں، اللہ تعالیٰ نے ان کے ہاتھوں کو اس فعل بد سے روک رکھا۔ اتنے میں جبریل امین پہنچ گئے اور آپ کو وہاں سے اٹھا دیا۔ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔[1]

❁ ابن اسحاق، مجاہد اور عکرمہ کے علاوہ کئی ایک کا خیال ہے کہ یہ آیت مبارکہ بنونضیر کے متعلق نازل ہوئی۔[2]

نبی ﷺ عامریوں کی دیت کے حوالے سے تعاون کی غرض سے بنونضیر کے ہاں گئے۔ انھوں نے عمرو بن جحاش کے سپرد یہ کام کیا تھا کہ اگر رسول اللہ ﷺ دیوار کے پاس بیٹھیں اور ہم ان کے پاس جمع ہوں تو تم اوپر سے چکی پھینک دینا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو ان کے برے ارادے سے مطلع فرما دیا۔ آپ فوراً مدینہ منورہ تشریف لے آئے۔ بعد میں صحابہ کرام بھی آ گئے۔ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔[3]

❁ ابن جریر طبری نے آیت مبارکہ کی شان نزول میں اسی واقعے کو ترجیح قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ آیت مبارکہ کے مفہوم کی وضاحت میں سب سے صحیح قول یہ ہے کہ اس آیت میں نعمت سے مراد وہ نعمت ہے جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو اور صحابہ کو بنی نضیر کے ارادۂ بد سے

---

1 تفسیر الطبري: 6/145,144. 2 ان روایات میں قدرے ضعف ہے مگر مجموعی طور پر قابل حجت ہیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: المجتمع المدني في عهد النبوة للدكتور العمري، ص: 145. 3 تفسیر ابن کثیر: 2/31.

محفوظ رکھنے کے سلسلے میں مطلع فرمایا۔ اس روز رسول اللہ ﷺ عمرو بن امیہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں قتل ہونے والے دو آدمیوں کی دیت کے لیے بنونضیر کے ہاں گئے تھے۔ ان مقتولوں کی دیت آپ نے اپنے ذمے لی تھی۔ آیت مبارکہ کی شان نزول میں اسی واقعے کو ہم نے اس لیے زیادہ صحیح کہا ہے کہ آیت کے متصل بعد اللہ تعالیٰ نے یہود کے برے کردار، قبیح افعال، اللہ تعالیٰ اور دیگر انبیاء علیہم السلام کے ساتھ ان کی خیانت کا تذکرہ فرمایا ہے۔[1]

ڈاکٹر محمد آل عابد نے بھی مفسر طبری کی تائید کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ''بعید نہیں کہ یہ آیت مبارکہ پیش آمدہ تمام واقعات پر نازل ہوئی ہو کیونکہ جیسا کہ علماء کا خیال ہے، حوادث مختلف ہیں مگر مقصود ایک ہی ہے۔''

آیت کا مفہوم یہ ہوگا: ''تم پر اللہ تعالیٰ کا جو احسان ہے اسے یاد کرو، اس کا بڑا مظہر یہ ہے کہ اس نے یہود کے ہاتھوں کو تم تک پہنچنے سے روک رکھا۔ وہ اپنے ہاتھوں کو برے ارادے سے تمھاری طرف دراز کرنا چاہتے تھے اور قریب تھا کہ وہ اپنے برے ارادے کو عملی جامہ پہنا لیتے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی تدبیر کو ناکام کر دیا۔ اور تمھارے پیغمبر کو ان کے شر سے محفوظ رکھا۔''[2]

بعدازاں اللہ تعالیٰ نے تقویٰ اور اپنے اوپر کامل بھروسا و اعتماد کا حکم دیتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو اور مومنوں کو اللہ تعالیٰ پر بھروسا کرنا چاہیے۔

یعنی اے مومنو! اللہ تعالیٰ کے حقوق کی ادائیگی کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کرو۔ اور شکر گزاری میں کمی نہ آنے دو، اس نے تمھیں اپنی قدرت کا نظارہ کرا دیا ہے۔ اس اکیلے پر بھروسا رکھو۔ اس نے تمھیں اپنی کمال حفاظت دکھائی ہے اور مومنوں کو اس اکیلے پر بھروسا رکھنا چاہیے۔[3]

---

1 تفسير الطبري:145,144/6. 2 حديث القرآن عن غزوات الرسول ﷺ للدكتور محمد بكر آل عابد:251/1. 3 حديث القرآن عن غزوات الرسول ﷺ للدكتور محمد بكر آل عابد:252/1.

بنونضیر کا محاصرہ اور ان کی جلاوطنی

بنونضیر کو انتباہ: سیرت نبوی کی تمام معتبر کتب نے اس امر کا تذکرہ کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بنونضیر کو دس دن کے اندر اندر جلاوطن ہونے کا حکم دے دیا تھا۔ آپ ﷺ نے محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کو ان کی طرف یہ حکم دے کر بھیجا کہ بنونضیر سے کہو: ''مجھے رسول اللہ ﷺ نے تمھاری طرف یہ پیغام دے کر بھیجا ہے کہ میرے علاقے سے نکل جاؤ، تم نے دھوکا دہی کی بنا پر اس عہد کو ختم کر دیا ہے جو میں نے تم سے کیا تھا۔ میں تمھیں دس دن کی مہلت دیتا ہوں۔ دس دن کے بعد تم میں سے جو بھی نظر آیا اس کی گردن اڑا دی جائے گی۔'' [1]

رسول اللہ ﷺ کی بات کا ان کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ انھوں نے محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ سے صرف یہ کہا کہ ہمیں توقع نہیں تھی کہ قبیلہ اوس کا کوئی شخص اب یہ پیغام لے کر آئے گا۔ محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: ''دل بدل چکے ہیں۔ اسلام نے (جاہلیت میں ہونے والے) تمام معاہدے ختم کر دیے ہیں۔'' انھوں نے کہا کہ ہم یہ برداشت کریں گے۔ (چلے جائیں گے)۔ اس کے بعد وہ چند دن تک کوچ کی تیاری کرتے رہے۔ [2]

اس دوران میں عبداللہ بن ابی نے بنونضیر کو پیغام بھیجا کہ اپنی جگہ ٹھہرے رہو اور مت جاؤ، ہم تمھیں ان کے رحم و کرم پر ہرگز نہیں چھوڑیں گے۔ اور اگر تم پر جنگ مسلط کی گئی تو ہم تمھارے ساتھ مل کر لڑیں گے۔ تمھیں نکالا گیا تو ہم بھی تمھارے ساتھ نکل جائیں گے۔ [3] تم مت جاؤ۔ میرے ساتھ عرب اور میری قوم کے دو ہزار افراد موجود ہیں۔ تم اپنی جگہ قائم رہو۔ وہ بھی تمھارے ساتھ تمھارے قلعوں میں رہیں گے۔ تم تک پہنچنے کے لیے انھیں ان دو ہزار افراد کی لاشوں سے گزرنا ہوگا۔ [4]

اس پر یہود کو حوصلہ ملا۔ ان کے سردار حُیی بن اخطب نے ڈینگ مارتے ہوئے جُدَی

---

1 الطبقات لابن سعد: 57/2، والمغازي للواقدي: 363/1-370. 2 تاريخ الطبري: 552/2.
3 السيرة النبوية لابن هشام: 212/3. 4 تاريخ الطبري: 553/2.

بن اخطب کے ہاتھ نبی ﷺ کو پیغام بھیجا کہ ہم اپنے گھروں کو بالکل نہیں چھوڑیں گے۔ تم سے جو ہوسکتا ہے کرلو۔ یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے بآواز بلند اللہ اکبر کہا اور صحابہ کرام نے بھی آپ کا ساتھ دیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: «حَارَبَتْ يَهُودُ» ''یہود جنگ کریں گے۔''[1]

محاصرہ اور جلاوطنی: دس دن گزر گئے لیکن بنونضیر اپنے گھروں سے نہ نکلے۔ اسلامی لشکر نے پیش قدمی کی اور پندرہ دن تک ان کا محاصرہ کیے رکھا۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کے کھجوروں کے درخت جلانے کا حکم دیا اور ان کی جنگ کے وسائل و اموال پر کاری ضرب لگائی۔ یوں ان کی جنگی قوت کمزور پڑنے لگی۔ وہ گھبرا اٹھے اور چیخنے لگے: ''اے محمد (ﷺ)! آپ تو فساد سے منع کرتے اور فساد کرنے والے کو معیوب سمجھتے تھے۔ تو کیا کھجوروں کا کاٹنا فساد نہیں؟'' اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا۔ بنونضیر سمجھ گئے کہ جلا وطنی کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ ناامیدی ان کے دلوں میں بیٹھ گئی۔ خاص طور پر جب عبداللہ بن ابی نے وعدہ تعاون کی خلاف ورزی کی اور دیگر یہود بھی ان کے کسی کام نہ آئے، چنانچہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے درخواست کی کہ انھیں پرامن جلاوطنی کا موقع دیا جائے۔ آپ نے ان کا یہ مطالبہ تسلیم کرتے ہوئے فرمایا: «أُخْرُجُوا مِنْهَا، وَلَكُمْ دِمَائُكُمْ وَمَا حَمَلَتِ الْإِبِلُ إِلَّا الْحَلَقَةَ» ''مدینہ سے نکل جاؤ۔ تمھاری جانیں محفوظ رہیں گی۔ تمھارے اونٹ جتنا مال اٹھا سکیں وہ بھی لے جاؤ سوائے اسلحہ کے۔'' یہود کو سر تسلیم خم کرنا پڑا۔[2]

یہودیوں نے گھروں کی چھتیں، ستون اور دیواریں سب توڑ دیں تاکہ مسلمان ان سے فائدہ نہ اٹھا سکیں۔ اپنے ساتھ وافر مقدار میں سونا چاندی لے گئے۔ سلام بن ابی الحقیق ایک بیل کے چمڑے میں سونا چاندی بھر کے لے گیا۔ وہ کہا کرتا تھا: ''ہم نے یہ سونا زندگی کے نشیب و فراز کے لیے رکھ چھوڑا تھا۔ کھجوریں خیبر میں بھی بہت ہیں۔''[3] یہودیوں

---

1 السيرة النبوية لابن كثير:3/146. 2 حديث القرآن عن غزوات الرسول للدكتور محمد بكر آل عابد:1/257. 3 السيرة الحلبية:2/566.

خیبر
حرہ خیبر
حرہ
مدینہ منورہ
آبار علی
50
100
حرۂ واقم
(مشرقی سنگلاخ زمین)
بنوعبدالاشہل اور زعوراء
نبیت
بنوظفر
السُنح
بنوحارث بن خزرج
مسجد نبوی
جبل سلع
البقیع
مدینہ منورہ
بنوزُریق
بنوواقف
وادی بطحان
بنوحارث
وادی مہزور
بنوقینقاع کے مکانات
بنوقریظہ کے مکانات
وادی العقیق
وادی مذینب
بنونضیر کے مکانات
بنوعوف بن خزرج
بنوعوف بن
مالک بن اوس
مسجد قباء
بنونضیر (ربیع الاول 4ھ)
﴿مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّيْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا قَآئِمَةً عَلٰٓى اُصُوْلِهَا فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَلِيُخْزِيَ الْفٰسِقِيْنَ﴾ ”جو کاٹ ڈالا تم نے کوئی کھجور کا درخت یا چھوڑ دیا تم نے اسے قائم اس کی جڑوں پر تو (یہ سب) اللہ کے حکم سے ہے اور تاکہ وہ رسوا کرے فاسقوں کو“ (الحشر: 5/59)
نقشہ: 13

نے چھ سو اونٹوں پر سامان لادا اور اس حالت میں نکلے کہ پیچھے باجا، سارنگی اور گانے والیاں گا رہی تھیں تاکہ مسلمان ان کے نکلنے پر خوشی کا اظہار نہ کریں۔ کچھ یہودی تو خیبر کی جانب چلے گئے اور کچھ نے شام کے علاقے اذرعات کا قصد کیا۔[1] رسول اللہ ﷺ کے حکم سے جلاوطنی کے تمام معاملات کی نگرانی محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کر رہے تھے۔[2]

یہودیوں کے سردار سلام بن ابی الحقیق، حیی بن اخطب اور کنانہ بن ربیع بن ابی الحقیق خیبر جانے والوں میں شامل تھے۔ یہ خیبر گئے تو وہاں کے لوگ ان کے ماتحت ہو گئے۔[3]

غزوۂ بنونضیر کی حکمتیں اور عبرتیں سورۂ حشر کے تناظر میں

سورۂ حشر تمام کی تمام واقعۂ بنونضیر پر مشتمل ہے۔ حبر الامہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما تو اس سورت کو ''سورۂ بنونضیر'' کہا کرتے تھے۔ امام بخاری رحمہ اللہ حضرت سعید بن جبیر سے نقل کرتے ہیں کہ میں نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کے روبرو کہا: ''سورۃ الحشر'' انھوں نے کہا: ''بلکہ کہو: سورۂ بنونضیر۔''[4]

سورۂ حشر نے غزوۂ بنونضیر کے تمام متعلقہ امور واضح کر دیے ہیں اور بڑی تفصیل سے یہ واقعہ بیان کیا ہے اور مال فے کے احکام کا ذکر بھی کیا ہے۔ یہود سے منافقوں کا تعلق واضح کیا ہے۔ یہود کے نفسیاتی حقائق طشت ازبام کیے ہیں۔ یہود سے منافقوں کے گہرے تعلق کو مثالوں سے بیان کیا ہے۔ جنگ سے متعلق گفتگو کرتے کرتے اللہ تعالیٰ نے خطاب کا رخ مسلمانوں کی طرف پھیرتے ہوئے انھیں تقویٰ اختیار کرنے اور نافرمانی

1 السيرة الحلبية: 565/2، وحديث القرآن عن غزوات الرسول للدكتور محمد بكر آل عابد: 257/1. 2 المغازي للواقدي: 374/1، واليهود في السنة المطهرة للدكتور الشقاري: 321/1.
3 السيرة النبوية لابن هشام: 212/3. 4 صحيح البخاري، حديث: 4029.

سے اجتناب کرنے کا حکم دیا ہے۔ بعدازاں اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی بلند شان اور اپنے لائق بعض بلند و بالا صفات کا تذکرہ فرمایا ہے۔

مسلم معاشرہ واقعات وحوادث کے دوران اس طرح توحید، اللہ تعالیٰ کی تعظیم اور روزِ قیامت کی تیاری کے منہج پر تربیت پا رہا تھا۔ سورۂ حشر پر غور وفکر کرنے سے کئی ایک حکمتیں اور عبرتیں سامنے آتی ہیں۔ اہم ترین درج ذیل ہیں:

اللہ تعالیٰ کی بزرگی کا تذکرہ: سورت کی ابتدا اللہ تعالیٰ کی تعریف سے ہوئی ہے اور یہ کہ تمام مخلوقات انسان، حیوان، نباتات، جمادات اللہ تعالیٰ کی پاکیزگی بیان کرتے ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، قدرت اور بزرگی کے شاہد ہیں اور اس کی عظمت کے گن گاتے ہیں۔ ارشاد ہے: ﴿سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ○﴾

”اللہ کے لیے تسبیح کرتی ہے جو چیز آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے اور وہی غالب ہے، خوب حکمت والا۔“ [1]

ابتدا ہی میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ بڑی حکمت والا ہے وہ کوئی چیز بے فائدہ پیدا نہیں کرتا اور بغیر مصلحت کے کوئی حکم جاری نہیں کرتا۔ بنونضیر کے خلاف اپنے پیغمبر کی مدد کرنا بھی حکمت ہی کا تقاضا تھا۔ جب انھوں نے بدعہدی کی تو انھیں ان کے محبوب گھروں سے نکال باہر کیا گیا۔“ [2]

رعب و دبدبہ بھی اللہ تعالیٰ کا ایک لشکر ہے: اگلی آیات مبارکہ پر غور وفکر کرنے سے پتا چلتا ہے کہ یہود بنونضیر کو ان کے گھروں سے مقام حشر کی جانب نکالنے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے، جبکہ تمام مادی اسباب ان کے ساتھ تھے اور انھیں اپنے مضبوط قلعوں کی بنا پر یقین کامل تھا کہ کوئی انھیں یہاں سے نکال نہیں سکتا۔

لیکن اللہ تعالیٰ اسباب اور مسببات کا خالق ہے۔ اس نے انھیں ایسے پکڑا کہ ان کے

[1] الحشر 59:1. [2] تفسير السعدي، ص:849,848.

وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا، وہ اپنے ہاتھوں اپنے گھر گرانے لگے۔ حوادث و واقعات پر اس انداز سے امت کی تربیت منفرد قرآنی اسلوب ہے جو عام سیرت نگاروں سے بالکل جدا ہے۔ یہ اسلوب اس لحاظ سے بھی ممتاز ہے کہ یہ حقائق کو کھولتا اور مخفی امور کو واضح کرتا ہے اور حوادث کا تعلق ان واقعات کے حقیقی فاعل اللہ رب العالمین سے جوڑتا ہے۔ اسی لیے یہاں واضح کر دیا کہ بنونضیر کو نکالنے والا درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

آیات مبارکہ نے تسلسل سے یہود بنونضیر کے تمام خیالات کو ظاہر کیا ہے اور یہ بھی بیان کیا ہے کہ وہ تمام زمینی اسباب سے مالا مال تھے۔ لیکن انھیں شکست ایسی جگہ سے ملی جس سے وہ بالکل بے خوف تھے، یعنی اپنے ہی دلوں سے۔ رعب و دبدبہ ان کو اندر سے کھا گیا۔ اور وہ اچانک پستی میں گر گئے۔ لہٰذا ہر عقل مند انسان کو اس غزوے سے عبرت حاصل کرنی چاہیے اور اچھی طرح جان لینا چاہیے کہ معاملات کا حقیقی تصرف محض اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے۔ اس کی عظیم قدرت کے سامنے اسباب ٹھہر سکتے ہیں نہ مسببات۔ وہ تو ہر چیز پر قادر ہے۔ لوگوں پر لازم ٹھہرتا ہے کہ وہ اس عظیم ہستی کو دل سے تسلیم کریں۔ انھیں چاہیے کہ اپنے معاملات کی اصلاح کریں۔ یوں جب وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کو بجا لائیں گے تو اللہ تعالیٰ ان کے لیے تمام معاملات درست کر دے گا اور ان کے دشمنوں کو ایسی جگہ سے نکال باہر کر دے گا کہ انھیں وہم و گمان بھی نہ ہوگا۔

غزوۂ بنونضیر ہر دور میں امت کے لیے ایک سبق لیے ہوئے ہے کہ مدد کا رستہ انتہائی قریب ہے اور وہ ہے اللہ تعالیٰ سے رجوع اور اسی پر اعتماد۔ اس کے احکام کو تسلیم کرنا اور اس کے حق کو تسلیم کرنا۔ مومن جب یہ بات جان لیں گے تو اللہ تعالیٰ ان کی ضرور مدد فرمائے گا، خواہ ان کا دشمن کتنا ہی قوی اور تعداد میں زیادہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کو تو کوئی چیز ہرا نہیں سکتی۔ اس امر کا ثبوت بنونضیر کا بے دخل ہونا ہے۔ یہ عبرت کی جا ہے۔ عقل مند وہی ہے جو غیر سے عبرت حاصل کرے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے واضح کر دیا کہ اگر وہ انھیں جلا وطنی کی سزا نہ دیتا تو قتل کی سزا سے دوچار کرتا۔ رہا معاملہ آخرت کا تو وہاں ان کے لیے آگ کا عذاب ہے۔[1]

دشمن کی مملوکہ اشیاء کو تباہ کرنا: رسول اللہ ﷺ لشکر کے ہمراہ بنو نضیر کی جانب روانہ ہوئے تو وہاں پہنچ کر ان کا محاصرہ کر لیا۔ بنو نضیر قلعہ بند ہو گئے تب آپ نے کھجوریں کاٹنے اور انھیں نذر آتش کرنے کا حکم دیا۔ انھوں نے آوازیں دیں: ''اے محمد (ﷺ)! آپ تو فساد سے منع کرتے اور فساد کرنے والے کو معیوب سمجھتے تھے تو یہ کھجوروں کا کاٹنا اور جلانا کیسا ہے؟'' تب اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک اتارا:

﴿ مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّيْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا قَآئِمَةً عَلٰٓى اُصُوْلِهَا فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَلِيُخْزِيَ الْفٰسِقِيْنَ ۝ ﴾

''تم نے جو بھی کھجور کا درخت کاٹا یا اسے اس کی جڑوں پر کھڑا چھوڑ دیا تو (یہ) اللہ کے حکم سے ہے تاکہ وہ نافرمانوں کو رسوا کرے۔''[2]

الشیخ ابوزہرہ نے اسی آیت کے متعلق سیر حاصل بحث کی ہے۔ فقہاء کی آراء کا ذکر کرنے کے بعد انھوں نے لکھا: ''اصل تو یہ ہے کہ دوران جنگ درختوں کو نہ کاٹا جائے اور نہ عمارتوں کو خراب کیا جائے۔ جنگ کا اصل مقصد یہ نہیں ہوتا کہ عوام کو تکلیف میں مبتلا کیا جائے بلکہ صرف عوام کو ظالم حکمرانوں سے نجات دلانا مقصود ہوتا ہے۔ متعدد آیات و احادیث سے یہی چیز واضح ہوتی ہے۔

جب درخت کاٹنا اور عمارت گرانا جنگی ضرورت بن جائے جس کے بغیر کوئی چارہ نہ ہو، مثلاً: دشمن اس کے پیچھے چھپا ہو اور اسلامی لشکر کو ایذا رسانی کے لیے اسے وسیلہ بنا رہا ہو تو ایسی صورت حال میں درختوں کے کاٹنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا، اس لیے کہ اب وہ جنگی ضرورت کا حصہ بن چکا ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے بنو نضیر اور ثقیف کے محاصرے

[1] حديث القرآن عن غزوات الرسول للدكتور محمد بكر آل عابد: 1/270-271. [2] الحشر 59:5.

میں یہی طرز عمل اختیار کیا تھا۔

جن فقہاء نے عمارتیں گرانے یا درخت اکھاڑنے کی اجازت دی ان کے قول کو اس پر محمول کیا جائے گا۔ اس کی بنیاد محض دشمن کو تکلیف دینا یا فساد نہیں ہے۔ دشمن عوام نہیں بلکہ صرف وہ لوگ ہیں جو جنگ کے لیے ہتھیار اٹھائے ہوئے ہیں۔

اسلامی حکومت کے لیے مال کا بندوبست: بنونضیر کی جلاوطنی کے بعد مسلمانوں نے جو اموال قبضے میں لیے تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کا حکم واضح کرتے ہوئے فرمایا:

﴿وَمَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْهُمْ فَمَآ اَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَّلَا رِكَابٍ وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهٗ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ○﴾

''اور اللہ نے ان سے اپنے رسول کی طرف جو مال لوٹایا تو اس کے لیے تم نے گھوڑے اور اونٹ نہیں دوڑائے لیکن اللہ اپنے رسولوں کو جس پر چاہتا ہے غلبہ دیتا ہے۔ اور اللہ ہر چیز پر خوب قادر ہے۔''[1]

اللہ تعالیٰ نے واضح کیا ہے کہ سخت جنگ لڑے بغیر بنونضیر سے حاصل شدہ اموال محض اللہ تعالیٰ کا فضل ہے۔ مسلمان دشمن کی طرف صرف بڑھے تو تھے مگر نہ گھوڑے پر سوار ہوئے نہ اونٹ پر۔ مسلمانوں نے انھیں بغیر جنگ کے مغلوب کرلیا اور جلا وطن کر کے اموال غنیمت قبضے میں لے لیے۔ اور جہاں اللہ تعالیٰ نے چاہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اموال صرف کیے۔

سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

«كَانَتْ أَمْوَالُ بَنِي النَّضِيرِ مِمَّا أَفَاءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُولِهِ ﷺ، مِمَّا لَمْ يُوجِفْ عَلَيْهِ الْمُسْلِمُونَ بِخَيْلٍ وَّلَا رِكَابٍ، فَكَانَتْ لِلنَّبِيِّ خَاصَّةً، فَكَانَ يُنْفِقُ عَلٰى أَهْلِهِ نَفَقَةَ سَنَةٍ وَّمَا بَقِيَ جَعَلَهُ فِي الْكُرَاعِ وَالسِّلَاحِ عُدَّةً فِي سَبِيلِ اللّٰهِ»

[1] الحشر 6:59.

”اللہ تعالیٰ نے بنونضیر کے مال اپنے رسول کو دیے، جبکہ مسلمانوں نے گھوڑوں اور اونٹوں سے ان کے خلاف چڑھائی نہیں کی تھی۔ ایسے اموال صرف رسول اللہ ﷺ کے تھے۔ آپ ان سے گھر کا سالانہ خرچ چلاتے اور جو بچ رہتا وہ ہتھیار اور گھوڑوں کی مد میں صرف کر دیتے۔“[1]

پھر اللہ تعالیٰ نے کافروں کی عام بستیوں سے حاصل شدہ مال فے کے احکام واضح فرما دیے۔ ارشاد ہوا:

﴿مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ﴾

”اللہ اپنے رسول کی طرف بستیوں والوں (کے مال) سے جو کچھ لوٹا دے، تو وہ اللہ کے لیے اور اس کے رسول کے لیے اور (اس کے) قرابت داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے۔“[2]

بنونضیر کے اموال فے صرف رسول اللہ ﷺ کے لیے تھے۔ آپ ان میں مرضی سے تصرف فرماتے، چنانچہ آپ ﷺ نے یہ اموال مسلمانوں پر احسان کرتے ہوئے اور اللہ تعالیٰ کے بیان کردہ مصارف کی مد میں خرچ کر دیے۔ بنونضیر کے اموال ہاتھ آئے تو رسول اللہ ﷺ نے ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کو بلایا اور فرمایا: «اُدْعُ لِي قَوْمَكَ» ”اپنی قوم کو میرے پاس بلاؤ۔“ ثابت رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ”خزرج؟“ فرمایا: «اَلْأَنْصَارُ كُلُّهَا» ”تمام انصار کو۔“ انھوں نے اوس و خزرج سب کو بلا لیا۔ آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی شایان شان تعریف کی، انصار اور مہاجرین کے ساتھ ان کے حسن سلوک، گھروں اور مالوں میں حصہ دار بنانے اور انھیں اپنے اوپر ترجیح دینے کا تذکرہ فرمایا، پھر فرمایا: «إِنْ أَحْبَبْتُمْ قَسَمْتُ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَ الْمُهَاجِرِينَ مَا أَفَاءَ اللّٰهُ عَلَيَّ مِنْ بَنِي النَّضِيرِ وَكَانَ الْمُهَاجِرُونَ

1 صحيح مسلم، حديث: 1757. 2 الحشر 59:7.

عَلٰى مَا هُمْ عَلَيْهِ من السُّكْنٰى فِي مَنَازِلِكُمْ وَأَمْوَالِكُمْ، وَإِنْ أَحْبَبْتُمْ أَعْطَيْتُهُمْ وَخَرَجُوا مِنْ دُورِكُمْ» ''اگر تم چاہو تو میں بنونضیر سے حاصل شدہ مال فے تم میں اور مہاجرین میں تقسیم کردوں اور مہاجرین تمھارے جن گھروں اور اموال میں اس وقت حصے دار ہیں وہ ویسے ہی رہیں۔ اور اگر تم چاہو تو یہ اموال انھیں اس شرط پر دے دوں کہ وہ تمھارے گھروں سے الگ ہو جائیں۔''

تب حضرت سعد بن عبادہ اور حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہما نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! بلکہ یہ اموال ہم مہاجرین میں تقسیم کرتے ہیں اس پر کہ وہ ہمارے گھروں ہی میں رہیں جیسا کہ پہلے رہتے تھے۔'' تمام انصار نے تائیداً کہا: ''اے اللہ کے رسول! ہم اس پر راضی ہیں اور تسلیم کرتے ہیں۔''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مال فے مہاجرین میں تقسیم کیا اور دو انصاریوں ابو دجانہ اور سہل بن حنیف کے سوا کسی انصاری کو حصہ نہ دیا۔ انھیں بھی صرف ان کی ضرورت کی بنا پر دیا۔[1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو علم تھا کہ مال فے میں تصرف کا حق صرف آپ ہی کو حاصل ہے، پھر بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کو جمع کیا اور ان کی رائے لی تاکہ اموال کی تقسیم کے متعلق ان کے دل مطمئن رہیں۔ سیاسی امور کے سلسلے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی عمدہ طرزِ عمل ہے۔

اس تقسیم کا مطلب صرف یہ تھا کہ انصار کے بوجھ کو کم کیا جائے۔ یوں مہاجرین بنونضیر کے گھروں میں جا بسے اور انصار کے گھر مالکوں کو واپس کر دیے گئے۔ بعض مہاجرین نے اپنے آپ کو غنی سمجھتے ہوئے اس تقسیم سے حصہ نہ لیا۔ مطلب یہ کہ مہاجرین کے معاشی حالات میں بتدریج بہتری آرہی تھی۔[2]

بنونضیر کے اموال کی تقسیم نے اسلامی حکومت کی مالی پالیسی میں اچھے اور مستحسن اقدام کا اضافہ کیا۔ اس سے پہلے جنگی غنیمتیں قرآن کے متعین کردہ خمس کے علاوہ صرف مجاہدین

[1] السيرة النبوية لابن هشام:202,201/3. [2] فتح الباري، شرح الحديث:4030.

میں تقسیم ہوتی تھیں لیکن بنو نضیر کے اس غزوے کے بعد غنائم کے متعلق نئی مالی پالیسی کا اضافہ ہوا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جنگی غنیمتیں نئی سیاسی پالیسی کے تحت دو اقسام کی ہو گئیں:

- وہ غنائم جو مجاہدین نے تلوار کے زور پر حاصل کی تھیں۔ یہ مال خمس کے سوا سارے کا سارا مجاہدین میں تقسیم ہونا قرار پایا۔
- وہ غنائم جو اللہ تعالیٰ نے بغیر جنگ کے مجاہدین کے ہاتھ میں دی تھیں، اس قسم کے مال کا مکمل اختیار اسلامی حکومت کے سربراہ کو حاصل ہے کہ وہ بتقاضائے مصلحت جہاں چاہے خرچ کرے، چاہے تو ملک کی اقتصادی حالت درست کرنے کے لیے خرچ کرے، فقرا کو فقیری کی دلدل سے نکالنے، اسلحہ خریدنے، نئے شہر آباد کرنے یا راستے درست کرنے پر خرچ کرے۔ مقصد یہ ہے کہ حاکم وقت کے پاس خاص بجٹ موجود ہے جو وہ خاص مصلحت کے تحت فی الفور خرچ کر سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے بنو نضیر کے اموال کی تقسیم کی حکمت واضح کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ اس تقسیم میں کسی کو دیا گیا اور کسی کو محروم رکھا گیا تھا تاکہ مال صرف اغنیا ہی کے درمیان نہ گھومتا رہے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ اموال کے متعلق اسلامی شریعت کی سیاست اسی قانون کے تابع ہے اور اسی مقصد کے حصول کے لیے ہے۔ اقتصاد سے متعلق اسلامی شریعت کی جملہ کتب اور ابحاث ایسا ہی معاشرہ قائم کرنے کی جستجو میں ہیں جو لوگوں کے مختلف طبقات کو قریب کرے اور جماعتوں میں اتحاد قائم کر سکے۔ اور ان اسباب کو ختم کرنے کی کوشش کرے جو رخنہ اندازی کا باعث بنتے اور انصاف کے عملی نفاذ پر اثر انداز ہوتے ہیں۔[1]

حقیقت یہ ہے کہ اگر مال سے متعلق اسلامی شریعت کے احکام عملاً نافذ کر دیے جائیں، مثلاً: زکاۃ کا نظام، سود کی ممانعت، ذخیرہ اندوزی کے مختلف طریقوں کا انسداد تو بلاشبہ لوگ بڑی عمدہ گزر بسر کر سکیں۔ اس میں رزق کی اونچ نیچ تو ہو سکتی ہے مگر سب آسانی سے گزارہ کر

[1] قراءة سياسية للسيرة النبوية للدكتور قلعجي، ص: 169۔

سکتے ہیں اور کوئی کسی پر بوجھ نہ بنے۔ اگرچہ سب آپس میں تعاون ضرور کریں گے۔[1]

اموال کی تقسیم میں اصل سبب وعلت کا تذکرہ فرمانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے احکام بجالائیں اور جس سے آپ ﷺ منع کریں، رک جائیں۔ یہ ایمان کا لازمہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں تقویٰ کا بھی حکم دیا کیونکہ نافرمانوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی سزا بڑی سخت اور دردناک ہوتی ہے۔ ارشاد ہے:

﴿وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَ مَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝﴾

”اور اللہ کا رسول تمھیں جو کچھ دے تو وہ لے لو اور جس سے منع کرے تو اسے چھوڑ دو اور اللہ سے ڈرتے رہو، بے شک اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔“[2]

یعنی رسول اللہ ﷺ نے تمھیں جو بھی حکم دیا ہے اس کو مانو اور جس سے منع کیا اس سے بچو کیونکہ وہ تمھیں اچھائی و بھلائی کا کہتے ہیں اور شر و فساد ہی سے روکتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ سے خوف کا اظہار اس کے احکام بجالانے کے ساتھ اور منہیات سے اجتناب کر کے کرو۔

اس ارشاد باری تعالیٰ سے یہ بھی واضح ہے کہ اس کی سزا بڑی سخت ہوتی ہے۔ نافرمان اور مخالف کے لیے اس کا عذاب بڑا سخت ہوتا ہے۔ مفسرین کا کہنا ہے کہ یہ آیت اگرچہ اموال فے سے متعلق ہے لیکن یہ آپ ﷺ کے تمام اوامر اور منہیات سے متعلق ہے، خواہ اس کا تعلق واجب سے ہو، مندوب سے ہو، مستحب یا حرام سے ہو، اس میں فے کے علاوہ دیگر تمام احکامات بھی شامل ہیں۔[3]

بہت ساری آیات امت کی تربیت اس انداز سے کرتی ہیں کہ تمام معاملات میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام تسلیم کرنے ضروری ہیں:

1 فقه السيرة للبوطي، ص: 194. 2 الحشر 7:59. 3 تفسير الرازي: 28/29، و صفوة التفاسير: 351/3.

ارشاد ہے:

﴿ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ○ ﴾

''چنانچہ (اے نبی!) آپ کے رب کی قسم! وہ مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنے باہمی اختلافات میں آپ کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں، پھر آپ کے کیے ہوئے فیصلے پر ان کے دلوں میں کوئی تنگی نہ آنے پائے اور وہ اسے دل و جان سے مان لیں۔''[1]

آپ ﷺ کا فرمان ہے:

«مَا نَهَيْتُكُمْ عَنْهُ فَاجْتَنِبُوهُ، وَمَا أَمَرْتُكُمْ بِهِ فَافْعَلُوا مِنْهُ مَا اسْتَطَعْتُمْ، فَإِنَّمَا أَهْلَكَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ كَثْرَةُ مَسَائِلِهِمْ وَاخْتِلَافُهُمْ عَلٰى أَنْبِيَائِهِمْ»

''میں جس کام سے تم کو منع کردوں اس سے باز رہو اور جس کام کا حکم دوں اس کو بجالاؤ جہاں تک تم سے ہوسکے کیونکہ تم سے پہلے لوگ اپنے انبیاء سے بہت زیادہ پوچھنے اور ان سے اختلاف کرنے کی وجہ سے ہلاک ہوئے۔''[2]

مہاجرین و انصار رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ کی فضیلت: سورۂ حشر میں دیگر صحابہ پر مہاجرین کی فضیلت کا تذکرہ ہے۔ اس میں بیان کیا گیا ہے کہ درجۂ اول مہاجرین کو حاصل ہے۔ متعدد آیات ان کے عمدہ عمدہ اوصاف پر مشتمل ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے صدق کی گواہی دی ہے۔ فرمایا:

﴿ لِلْفُقَرَاءِ الْمُهَاجِرِينَ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ وَأَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَّيَنْصُرُونَ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ ۚ أُولٰئِكَ هُمُ الصّٰدِقُونَ ○ ﴾

''(مالِ فے) ان مہاجر فقراء کے لیے ہے جو اپنے گھروں اور اپنی جائیدادوں سے

[1] النسآء 4:65. [2] صحيح مسلم، حديث: 1337، ومسند أحمد: 2/247.

نکالے گئے، وہ اللہ کا فضل اور اس کی رضا ڈھونڈتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی مدد کرتے ہیں، یہی لوگ سچے ہیں۔‘‘ [1]

اس سورت میں انصار کی فضیلت بھی بیان کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے متعلق فرمایا:

﴿ وَالَّذِيْنَ تَبَوَّءُو الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۚ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ ﴾

’’اور (مالِ فَے ان کے لیے ہے) جنھوں نے (مدینہ کو) گھر بنا لیا تھا اور ان (مہاجرین) سے جو پہلے ایمان لا چکے تھے، وہ (انصار) ان سے محبت کرتے ہیں جو ان کی طرف ہجرت کرے اور وہ اپنے دلوں میں اس (مال) کی کوئی حاجت نہیں پاتے جو ان (مہاجرین) کو دیا جائے اور اپنی ذات پر (ان کو) ترجیح دیتے ہیں اگرچہ خود انھیں سخت ضرورت ہو اور جو کوئی اپنے نفس کے لالچ سے بچا لیا گیا تو وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔‘‘ [2]

انصار و مہاجرین کے نقشِ قدم پر چلنے والوں کی فضیلت بھی اس سورت میں بیان کی گئی ہے۔ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو انصار و مہاجرین کے اچھے اوصاف اپنانے اور ان کے نقشِ پا پر چلنے والے ہیں۔ ایسے لوگ اپنے سابقہ مومن بھائیوں کے لیے تنہائی میں بھی دعا کرتے ہیں اور علانیہ بھی۔ ارشاد ہے:

﴿ وَالَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝ ﴾

’’اور (فَے ان کے لیے ہے) جو ان (مہاجرین و انصار) کے بعد آئے، وہ کہتے

[1] الحشر 59:8. [2] الحشر 59:9.

ہیں: ''اے ہمارے رب! ہمیں اور ہمارے ان بھائیوں کو بخش دے جنھوں نے ایمان میں ہم سے پہل کی اور ہمارے دلوں میں اہل ایمان کے لیے کوئی کینہ نہ رکھ۔ اے ہمارے رب! بے شک تو بہت نرمی والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔''[1]

الغرض سورۂ حشر نے مہاجرین و انصار اور ان کے تابعین (شاگردانِ صحابہ) کی بڑی خوبصورت تصویر کشی کی ہے۔

مدینہ منورہ میں منافقین کا موقف: قرآن مجید نے منافقین کی حالت بیان کرتے ہوئے اور ان کے یہودیوں سے گٹھ جوڑ کو خوب واضح کیا ہے، نیز مسلمانوں کے متعلق ان کا جو موقف ہے اسے بھی نمایاں کیا ہے۔ قرآن مجید نے یہود کے موقف اور ان کی نفسیات کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ سورۂ حشر میں بھی ان منافقین کی یہود دوستی کی تصویر کشی کی گئی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس سورت میں منافقین کے متعلق بتایا ہے کہ عبداللہ بن ابی اور اس کے ساتھیوں نے بنونضیر کو پیغامات بھیجے اور انھیں مدد دینے کا وعدہ کیا۔

سورۂ حشر میں ﴿لِإِخْوَانِهِمُ﴾ سے مراد وہ لوگ ہیں کہ منافقوں اور ان کے درمیان کفر کا بھائی چارہ ہے۔ مراد بنونضیر کے یہود ہیں چونکہ انھیں منافقین سے کفر نے آپس میں اکٹھا کر رکھا تھا، اس لیے بھائی قرار دیا۔ تاہم دونوں کے کفر کی نوعیت جدا جدا تھی۔

اور اسی آیت میں ﴿لَئِنْ أُخْرِجْتُمْ﴾ سے مراد یہ ہے کہ اللہ کی قسم! اگر تم اپنے گھروں سے نکالے گئے ﴿لَنَخْرُجَنَّ مَعَكُمْ﴾ ہم بھی اپنے گھروں سے تمھارے ساتھ نکل کھڑے ہوں گے ﴿وَلَا نُطِيعُ فِيكُمْ﴾ اور تمھارے متعلق کسی کی بات نہیں سنیں گے۔ ﴿أَحَدًا﴾، یعنی کوئی بھی ہو جو ہمیں تمھارے ساتھ نکلنے سے روکے۔ پھر کہنے لگے: ﴿وَإِنْ قُوتِلْتُمْ﴾ اگر مسلمان تم سے جنگ کریں گے ﴿لَنَنْصُرَنَّكُمْ﴾ تو ہم (ان کے خلاف جو تم سے جنگ کریں گے) تمھاری مدد کریں گے۔

[1] الحشر 10:59.

اللہ تعالیٰ نے منافقین کو جھوٹا قرار دیا اور ارشاد فرمایا: ﴿وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ﴾
''اور اللہ گواہ ہے کہ وہ بلاشبہ جھوٹے ہی ہیں۔''

بنو نضیر کے ساتھ وعدے میں منافقین کے جھوٹ کو پہلے اللہ تعالیٰ نے اجمالاً بیان کیا، پھر ان کے سفید جھوٹ کو تفصیل سے بیان کیا۔ اور ان کی تردید میں تاکیداً فرمایا: ﴿لَئِنْ اُخْرِجُوْا لَا يَخْرُجُوْنَ مَعَهُمْ﴾ یعنی اگر مسلمانوں نے یہود کو نکال دیا تو منافقین ہرگز ان کے ساتھ نہیں نکلیں گے۔

مزید فرمایا: ﴿وَلَئِنْ قُوْتِلُوْا لَا يَنْصُرُوْنَهُمْ﴾ اگر مسلمانوں نے یہود سے جنگ کی تو منافق ہرگز ان کی مدد نہیں کریں گے۔

ارشاد ربانی ہے: ﴿وَلَئِنْ نَّصَرُوْهُمْ لَيُوَلُّنَّ الْاَدْبَارَ ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ ۝﴾ یعنی اگر بفرض محال منافقین نے یہود کی مدد کی بھی تو اُن کی مدد مسلمانوں کو ہرگز نقصان نہیں دے گی۔ یہود اور منافقین دونوں مسلمانوں کے بالمقابل بھاگ کھڑے ہوں گے اور پھر اللہ تعالیٰ بنو نضیر کی مدد بھی نہیں فرمائے گا۔

بعدازاں اللہ تعالیٰ نے یہود اور منافقین کے دلوں کی حقیقی کیفیت آشکارا کی اور ارشاد فرمایا:

﴿لَاَنْتُمْ اَشَدُّ رَهْبَةً فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنَ اللّٰهِ ۚ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ۝﴾

''(اے مسلمانو!) یقیناً ان کے سینوں میں اللہ کی نسبت تمھارا ڈر زیادہ ہے، یہ اس لیے کہ بے شک وہ ایسے لوگ ہیں جو سمجھتے نہیں۔''[1]

اللہ تعالیٰ نے ان کی حقیقت کو دیگر صفات بیان کر کے مزید واضح کر دیا ہے۔ ارشاد ہے:

﴿لَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ جَمِيْعًا اِلَّا فِيْ قُرًى مُّحَصَّنَةٍ اَوْ مِنْ وَّرَآءِ جُدُرٍ﴾

''وہ سب مل کر بھی تم سے نہیں لڑ سکیں گے، مگر ایسی بستیوں میں جو قلعہ بند ہیں یا

1 الحشر 13:59. المستفاد من قصص القرآن لعبد الكريم زيدان: 283/2.

دیواروں کی اوٹ سے۔''[1]

اس کے بعد قرآن مجید نے ان کے بزدلی کے اسباب بیان کیے ہیں، فرمایا:

﴿ بَأْسُهُمْ بَيْنَهُمْ شَدِيدٌ ۚ تَحْسَبُهُمْ جَمِيعًا وَّقُلُوبُهُمْ شَتّٰى ﴾

''ان کی لڑائی تو آپس میں بہت سخت ہے گو آپ انھیں متحد سمجھتے ہیں لیکن ان کے دل دراصل ایک دوسرے سے جدا ہیں۔''[2]

یہ بے عقل لوگ بظاہر مسلمانوں کے خلاف معلوم ہوتے ہیں لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ آپس میں ان کی سخت عداوت ہے۔ یعنی اس لیے کہ وہ لوگ نہ حق سمجھتے ہیں نہ اس کا ساتھ دیتے ہیں بلکہ وہ تو باطل کے ہم رکاب رہتے ہیں۔''[3]

آیت مبارکہ میں مسلمانوں کو یہود کے خلاف حوصلہ دلایا جا رہا ہے۔ انھیں رب العالمین کی طرف سے بتا دیا گیا ہے کہ یہود بزدل ہیں۔

بعدازاں اللہ تعالیٰ نے واضح کیا کہ بنونضیر پر یہ آفت ان کی مکارانہ سرشت کی بنا پر آئی ہے۔ ان کے بھائیوں بنوقینقاع پر بھی ایسی ہی آفت آچکی ہے۔ انھوں نے بھی غرور اور خیانت کا مزا چکھا تھا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ كَمَثَلِ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ قَرِيبًا ذَاقُوا وَبَالَ أَمْرِهِمْ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝ ﴾

''ان کی مثال ان لوگوں کی سی ہے جو ان سے پہلے قریب ہی اپنی بداعمالی کا وبال چکھ چکے ہیں اور اُن کے لیے دردناک عذاب ہے۔''[4]

پھر اللہ تعالیٰ نے منافقوں کی ایک اور مثال بیان کی۔ منافقین نے پہلے تو بنونضیر کو مقابلے پر ابھارا اور پھر مشکل کے وقت مدد سے ہاتھ کھینچ لیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

---

1 الحشر 14:59۔ 2 الحشر 14:59۔ 3 حدیث القرآن عن غزوات الرسول ﷺ للدکتور محمد بکر آل عابد: 294,293/1۔ 4 الحشر 15:59۔

﴿كَمَثَلِ الشَّيْطٰنِ اِذْ قَالَ لِلْاِنْسٰنِ اكْفُرْ فَلَمَّا كَفَرَ قَالَ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّنْكَ اِنِّيْٓ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ○﴾

''ان کی مثال شیطان کی سی ہے جب وہ انسان سے کہتا ہے کہ کفر کر، پھر جب وہ کفر کرتا ہے تو شیطان کہتا ہے بے شک میں تجھ سے بریٔ الذمہ ہوں۔ میں تو اللہ رب العالمین سے ڈرتا ہوں۔''[1]

یعنی یہود جو منافقین کے وعدے سے دھوکا کھا گئے لیکن جب حقائق سامنے آئے اور ان پر محاصرے کے بادل چھا گئے تو منافقین ان سے الگ ہوگئے اور انھیں ہلاکت کے سپرد کردیا، ان کی مثال شیطان کی سی ہے۔ شیطان جب ان کو کفر پر آمادہ کر کے ارتکاب کفر کرا لیتا ہے تو خود بریٔ الذمہ اور لاتعلق ہو جاتا اور کہتا ہے کہ میں تو اللہ رب العالمین سے ڈرتا ہوں۔

اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ان کی اخروی سزا پر دلالت کرتا ہے:

﴿فَكَانَ عَاقِبَتَهُمَآ اَنَّهُمَا فِي النَّارِ خَالِدَيْنِ فِيْهَا ۭ وَذٰلِكَ جَزٰۗؤُا الظّٰلِمِيْنَ ○﴾

''لہٰذا ان دونوں کا انجام یہی ہوگا کہ بے شک وہ ہمیشہ (دوزخ کی) آگ میں رہیں گے اور ظالموں کی سزا یہی ہے۔''[2]

⑦ اہل ایمان کو آخرت کی یاد دہانی اور یہ کہ اہل جنت اور اہل جہنم میں بڑا فرق ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ○ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰىهُمْ اَنْفُسَهُمْ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ○ لَا يَسْتَوِيْٓ اَصْحٰبُ النَّارِ وَاَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۭ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمُ الْفَاۗىِٕزُوْنَ ○﴾

[1] الحشر 16:59. [2] الحشر 17:59. المستفاد من قصص القرآن لعبد الكريم زيدان:284/2.

''اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور (ہر) شخص کو دیکھنا چاہیے کہ اس نے کل کے لیے آگے کیا بھیجا ہے اور تم اللہ سے ڈرتے رہو، بے شک اللہ کو خوب خبر ہے جو تم عمل کرتے ہو۔ اور ان کی طرح نہ ہو جاؤ جنھوں نے اللہ کو بھلا دیا، تو اللہ نے انھیں اپنا آپ بھلوا دیا، یہی لوگ نافرمان ہیں۔ آگ والے (دوزخی) اور باغ والے (جنتی) کبھی برابر نہیں ہو سکتے، جنتی ہی کامیاب ہیں۔''[1]

یہ آیات محاسبۂ نفس کے سلسلے میں اصول کی حیثیت رکھتی ہیں انسان کو چاہیے کہ اپنا محاسبہ کرتا رہے۔

مسلمانوں کو بنونضیر کے خلاف شاندار فتح حاصل ہوئی۔ صحابہ کرام معاشی طور پر آسودہ حال ہوئے۔ فے کی زمین اسلامی اراضی میں شامل ہوئی تو حکومتی آمدنی میں خاطر خواہ اضافہ ہوا، تاہم قرآن مجید نے اسی واقعے کے ذریعے سے عقائد کی تعلیم دی۔ آخرت کی یاد دہانی کرائی اور حیات بعد الموت کے لیے تیاری کا حکم دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اسلامی معاشرے کے افراد کو حکم دیا ہے کہ وہ ایمان کے تقاضے پورے کریں۔ ظاہراً و باطناً تقویٰ اختیار کریں اور حدود کا پاس کریں۔ نیز اپنے حقوق و فرائض کا خیال رکھیں۔ اور اصلاح اعمال کی روش پر قائم رہیں۔

اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ اہل ایمان آخرت کی زندگی کو پیش نظر رکھیں۔ اسے زندگی کا نصب العین بنائیں۔ آخرت کی فکر کریں اور حصول رضائے الٰہی کے لیے کوشاں رہیں۔ حصول رضائے الٰہی کی تمام رکاوٹیں دور کریں اور رضائے الٰہی ہی کو مطمح نظر بنائیں۔[2]

قرآن مجید نے قیامت کے لیے «غَدٌ» ''کل'' کا لفظ استعمال کر کے بتایا ہے کہ قیامت بہت قریب ہے۔ بالکل ایسے جیسے کل آج سے قریب ہے، اس لیے کہ کل تو آ کر ہی رہے گا اور ہر آنے والا قریب ہی ہوتا ہے۔[3]

[1] الحشر 59:18-20. [2] تفسير السعدي: 340/7. [3] المحرر الوجيز: 390/14.

اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو باخبر کیا ہے کہ وہ ان کے اعمال سے بخوبی واقف ہے۔ ان کے اعمال اللہ سے مخفی نہیں، نیز اس کے ہاں اعمال ضائع نہیں ہوتے۔ مطلب یہ کہ وہ سنجیدگی سے محنت کریں۔[1]

اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو انتباہ کیا ہے کہ ان لوگوں کی طرح نہ ہونا جو اللہ تعالیٰ کے ذکر سے غافل ہوگئے۔ نتیجے کے طور پر اللہ نے انھیں اپنا آپ بھلوا دیا۔ انھیں اپنے نفع و نقصان کی خبر نہ رہی۔ یوں وہ نافرمان قرار پائے اور دین کی حدود سے کنارہ کش ہوگئے۔

اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے اہل جنت اور اہل جہنم کے برابر ہونے کی نفی کی اور واضح فرمایا ہے کہ اہل جنت اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچنے والے اور ہمیشہ کے لیے اس کی نعمتوں سے ہمکنار ہونے والے ٹھہرے ہیں، جبکہ جہنمی اصل خسارہ پانے والے لوگ ہیں۔[2]

یہ تفصیل، یاد دہانی اور وعظ آخرت کو ذہنوں اور دلوں کے قریب کر دینے اور اہل ایمان کے لیے نیکیوں میں سبقت لے جانے کا باعث ہیں۔

قرآن کریم کی عظمت اور اللہ تعالیٰ کی بعض صفات عالیہ: ارشاد ربانی ہے:

﴿ لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خٰشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ؕ وَ تِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ۝ ﴾

"(اے نبی!) اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر نازل کرتے تو آپ دیکھتے کہ وہ اللہ کے خوف سے دب جاتا (اور) پھٹ جاتا اور یہ مثالیں ہم لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں شاید کہ وہ غور وفکر کریں۔"[3]

آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اے لوگو! اگر ہم پہاڑ میں تم جیسی عقل رکھ دیتے اور پھر اس پر قرآن پاک نازل کرتے تو پہاڑ لازماً ڈر جاتا، جھک جاتا اور اللہ تعالیٰ کے ڈر سے ریزہ ریزہ

[1] تفسير السعدي:4/342. [2] تفسير السعدي:3/342. [3] الحشر 21:59.

ہو جاتا۔ یہ ہے قرآن پاک کے بلند و بالا مقام کی مثال۔ اور اس کے وعظ میں جو تاثیری قوت پائی جاتی ہے۔ اس کا تذکرہ ہے۔ انسان کے سخت دل ہونے پر اسے ایک طرح کی ڈانٹ بھی پلائی گئی ہے۔ اور یہ کہ انسان کتنا بے خوف و نڈر ہے۔ قرآن پاک کے زور دار انداز سے توجے ہوئے پہاڑ بھی پست ہو جائیں۔ [1]

اس کے بعد اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے واضح فرمایا کہ وہ لوگوں کے لیے مثالیں بیان کرتا ہے۔ حلال و حرام کی وضاحت کرتا ہے تا کہ وہ اس کی آیات پر غور و فکر کریں اور سوچ بچار سے کام لیں۔ قرآن پر غور و فکر سے انسان کے لیے علم کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ یہ نیکی بدی کے راستے واضح کرتا ہے۔ انسان کو اچھے اخلاق پر ابھارتا ہے اور عمدہ عادات اپنانے کی ترغیب دیتا ہے اور برے اخلاق سے منع کرتا ہے، لہٰذا قرآن پاک پر غور و فکر اور تدبر کرنے سے زیادہ نفع مند بات انسان کے لیے کوئی نہیں۔ [2]

❁ سورۃ الحشر کے اختتام پر اللہ تعالیٰ کی چند صفات عالیہ کا تذکرہ ہے، ارشاد ہے:

﴿هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عٰلِمُ الْغَیْبِ وَ الشَّهَادَةِ ۚ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ ○ هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَیْمِنُ الْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ؕ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا یُشْرِكُوْنَ ○ هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ؕ یُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۚ وَ هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ○﴾

''وہ اللہ ہی ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ غیب اور حاضر کا جاننے والا ہے، وہ رحمٰن ہے، رحیم ہے۔ اللہ وہ ہستی ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ بادشاہ ہے، نہایت پاک، سلامتی والا، امن دینے والا، نگہبان، زبردست، زور آور، بڑائی والا، پاک ہے اللہ اس سے جو وہ شرک کرتے ہیں۔ وہ اللہ ہے، خالق ہے، موجد،

[1] تفسير المراغي: 28/57. [2] تفسير السعدي: 7/344.

صورت گر، اسی کے لیے ہیں اسمائے حُسنٰی، اسی کی تسبیح پڑھتی ہے جو چیز آسمانوں اور زمین میں ہے اور وہ غالب ہے، خوب حکمت والا۔''[1]

یوں یہ سورت اللہ تعالیٰ کی چند صفاتِ عالیہ کے بیان پر اختتام کو پہنچتی ہے تاکہ اسلامی معاشرہ اللہ تعالیٰ ہی کی عبودیت اپنائے اور اسی روش پر پروان چڑھے۔ اس کے اسمائے حسنٰی اور صفاتِ عالیہ کے ذکر سے اس کی پہچان حاصل کرے۔

ایسا اللہ تعالیٰ کے عظیم کمال، عام احسان اور زبردست تدبیر کی بنا پر ہوا ہے۔ اللہ کے علاوہ ہر الٰہ باطل ہے اور ذرہ برابر عبادت کا مستحق نہیں کیونکہ وہ تو خود محتاج، عاجز اور ناقص ہے، نہ اپنے لیے کسی چیز کا مالک ہے اور نہ غیر کے لیے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات بابرکات کے بارے میں واضح کیا ہے کہ اس کا علم ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ خواہ وہ مخلوق سے پوشیدہ ہو یا مخلوق کے سامنے۔ اور اپنی بے کراں رحمت کا ذکر کیا جو ہر چیز پر چھائی ہے اور ہر آدمی تک پہنچی ہوئی ہے۔ اس کے بعد دوبارہ اپنی عام الوہیت اور یکتائی کا تذکرہ فرمایا اور بتایا کہ وہ اکیلا تمام کائنات کا مالک ہے۔ جہانِ بالا ہو یا جہانِ اسفل تمام جہانوں کے رہنے والے اس کے غلام اور محتاج ہیں۔

﴿الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ﴾ یعنی پاکیزہ۔ ہر عیب سے اور ہر نقص سے پاک۔ عظمت اور بزرگی والا۔ لفظ قدوس ہر نقص سے پاک ہونے پر دلالت کرتا ہے اور اللہ کے صفات عالیہ سے متصف ہونے کا پتا دیتا ہے۔

﴿الْمُؤْمِنُ﴾ یعنی اپنے انبیاء اور رسولوں کے شرائع و احکام، دلائل واضحہ اور براہین قاطعہ کی تصدیق کرنے والا۔

﴿الْعَزِيْزُ﴾ وہ جس پر غلبہ نہ پایا جاسکے، نہ اس کی پکڑ سے محفوظ رہا جاسکے۔ وہ خود ہر چیز پر غالب ہے اور ہر چیز اس کے تابع ہے۔

[1] الحشر 59:22-24۔

﴿الْجَبَّارُ﴾ جس کا غلبہ تمام انسانوں پر ہے۔ ساری مخلوقات نے اس غلبے کا اقرار کر رکھا ہے۔ وہ جو ٹوٹے پھوٹے کو درست اور فقیر کو غنی کر دے۔

﴿الْمُتَكَبِّرُ﴾ جس کے لیے عظمت اور کبریائی ہے اور جو تمام عیوب سے مبرا ہے۔

﴿سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ﴾ یہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی عام پاکیزگی کا بیان ہے۔ وہ ان عیوب سے پاک ہے جو مشرکین ومخالفین بیان کرتے ہیں۔

﴿هُوَ اللّٰهُ الْخٰلِقُ﴾ تمام مخلوقات کا اکیلا خالق ہے۔

﴿الْبَارِئُ﴾ ہر پیدا ہونے والی چیز کا موجد۔

﴿الْمُصَوِّرُ﴾ صورتیں بنانے والا۔

یہ تمام اسماء اللہ کی تخلیق، تدبیر اور تقدیر سے متعلق ہیں اور اس امر کا اظہار کرتے ہیں کہ ان تمام امور میں وہ یکتا ہے، ان میں اس کا کوئی حصے دار نہیں۔

﴿لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى﴾ یعنی اللہ تعالیٰ کے بہت سارے نام ہیں جنھیں نہ کوئی شمار کر سکتا ہے نہ کوئی ان تمام ناموں کا علم رکھتا ہے۔ اسی کثرت کے باوجود وہ تمام نام سب سے اچھے ہیں، یعنی صفات کمال ہیں۔ بلکہ وہ کامل اور عظیم ترین صفات پر دلالت کرتے ہیں۔ ان میں کسی قسم کا کوئی نقص نہیں۔

اسمائے حسنیٰ کی خوبی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انھیں پسند کرتا ہے اور جو انھیں محبوب رکھتا ہے اللہ تعالیٰ اس سے محبت کرتا ہے۔ اور اپنے بندوں سے چاہتا ہے کہ وہ اسے ان اسماء کے ساتھ پکاریں اور اس سے ان کے ساتھ سوال کریں۔ اللہ تعالیٰ کے کمال کا یہ عالم ہے کہ اس کے سب سے اچھے نام بلند تر صفات کے حامل ہیں اور آسمان و زمین کی تمام مخلوق ہمیشہ اس کی محتاج ہے۔ اس کی حمد کے ساتھ تسبیح بیان کرتی ہے۔ اس سے اپنی ضروریات مانگتی ہے اور وہ اپنے فضل و کرم سے اپنی حکمت و رحمت کے تقاضے کے مطابق عطا کرتا ہے۔

﴿وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ﴾ وہ ذات جو کچھ بھی چاہے ہو جائے اور جو بھی ہوتا ہے اس کی حکمت و مصلحت کے تابع ہے۔[1]

اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ اور صفات عالیہ کا علم تینوں قسم کی توحید پر مشتمل ہے۔ توحید ربوبیت، توحید الوہیت اور توحید اسماء و صفات۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اللہ تعالیٰ کی معرفت اور اس کے مطابق عمل پر پروان چڑھے۔ توحید کی جملہ اقسام ایمان کی روح اس کا اصل اور نتیجہ و مقصود ہیں۔ انسان اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات کی جس قدر معرفت حاصل کرتا ہے اس کا ایمان اسی قدر زیادہ ہوتا اور یقین اتنا ہی پختہ ہو جاتا ہے۔ یہی علم تھا جو صحابہ کے دلوں میں جاگزیں تھا۔ اس کا نتیجہ اللہ تعالیٰ کے ڈر اور اس کی کما حقہ معرفت کے طور پر سامنے آیا، لہٰذا انھوں نے اس کے مطابق عمل کیا۔[2]

شراب کی حرمت

ربیع الاول 4 ھ میں بنونضیر کے محاصرے کے دوران میں شراب حرام کر دی گئی۔[3] شراب کی حرمت بھی قاعدۂ تدریج کے مطابق عمل میں آئی۔ مطلب یہ کہ شراب یکبارگی نہیں بلکہ بتدریج حرام کی گئی بالآخر سورۂ مائدہ کی آیات حرمت میں اسے قطعی حرام قرار دیا گیا۔[4]

ارشاد ربانی ہے:

﴿يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ۖ قُلْ فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَإِثْمُهُمَا أَكْبَرُ مِن نَّفْعِهِمَا ۗ وَيَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ قُلِ الْعَفْوَ ۗ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمُ الْآيَاتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُونَ ۝﴾

”(اے نبی!) لوگ آپ سے شراب اور جوئے کے بارے میں سوال کرتے ہیں؟

1 تفسير السعدي: 347,346/7. 2 الوسطية في القرآن الكريم للصلابي، ص: 228. 3 حديث القرآن عن غزوات الرسول ﷺ للدكتور محمد بكر آل عابد: 253/1، وتفسير القرطبي: 10/18.
4 الخصائص العامة للإسلام للقرضاوي: 181.

کہہ دیجیے: ان دونوں میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے لیے (کچھ) فائدہ بھی ہے اور ان دونوں کا گناہ ان کے فائدے سے بہت بڑا ہے اور وہ آپ سے پوچھتے ہیں: کیا خرچ کریں؟ کہہ دیجیے: جو ضرورت سے زائد ہو۔ اللہ تمھارے لیے اپنے احکام اسی طرح بیان کرتا ہے تاکہ تم غور وفکر کرو۔"[1]

سید قطب رحمہ اللہ نے اس آیت کے متعلق لکھا: حرمت شراب کے متعلق یہ پہلا اقدام تھا، کئی امور خالص شر نہیں ہوتے بلکہ کبھی خیر شر سے مل چکی ہوتی ہے اور کبھی شر خیر کے ساتھ مل جاتا ہے۔ لیکن حرمت و حلت کا دارومدار خیر یا شر کے غالب ہونے پر ہوتا ہے، چنانچہ جب شراب اور جوئے میں گناہ نفع سے زیادہ تھا تو یہی ان دونوں کی حرمت کا سبب بنا۔

یہاں اسلامی تربیت اور ربانی حکمت کا ایک نادر پہلو سامنے آتا ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ یہ منہج اکثر شرائع، فرائض اور توجیہات میں بھی ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ یہاں شراب اور جوئے کی مناسبت سے بات کرتے ہوئے ہم منہج اسلامی کے اسی قاعدے کے بارے میں اشارہ کرنا چاہتے ہیں۔ اور وہ یہ کہ جب امر و نہی کا تعلق اعتقادی مسئلے سے ہو تو اسلام وہاں نہی کی ابتدا ہی میں قطعی فیصلہ صادر کر دیتا ہے۔ لیکن جب امر و نہی کا تعلق عبادت، رسم و رواج، عادت یا طے شدہ اجتماعی قانون سے ہو تو اسلام وہاں مہلت دیتا اور آسانی کو پیش نظر رکھتا ہے۔ اور ایسے حالات پیدا کرتا ہے جن میں سہولت کو اس کے نفاذ میں مدنظر رکھا جاسکے۔

چنانچہ جب توحید و شرک کا مسئلہ تھا تو اسلام نے اپنا قطعی حکم ابتدا ہی میں صادر فرما دیا۔ جس میں نہ تردد کی گنجائش تھی نہ مڑ کر دیکھنے سوچنے کی، اس میں نہ درمیانہ رستہ اختیار کرنے کا موقع دیا نہ خوش اسلوبی کو مانع بننے دیا۔ کچھ لو کچھ دو والا معاملہ ہی نہ ہوا۔ یہ مسئلہ اسلام کے بنیادی تصور کا مسئلہ تھا۔ جس کے بغیر نہ ایمان باقی رہتا ہے نہ اسلام قائم۔

لیکن شراب اور جوئے کا معاملہ عادت، پسند اور چاہت کا معاملہ تھا۔ اور عادت کی

[1] البقرۃ 2:219.

تبدیلی علاج معالجہ کی محتاج ہوتی ہے، لہٰذا اسلام مسلمانوں کے دلوں میں ایک دینی اور فطری تصور اجاگر کرنے لگا کہ شراب و جوئے میں گناہ نفع کی نسبت زیادہ ہے، جس میں یہ اشارہ تھا کہ انھیں چھوڑنا ہی بہتر ہے۔

اس کے بعد دوسرا اقدام سورۂ نساء کی اس آیت کی شکل میں کیا۔ ارشاد ہوا:

﴿ يَآأَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوا مَا تَقُولُونَ ﴾

''اے ایمان والو! جب تم نشے میں مست ہو نماز کے قریب بھی نہ جاؤ جب تک کہ اپنی بات کو سمجھنے نہ لگو۔''[1]

نماز روزانہ پانچ بار ادا کی جاتی ہے جس کا درمیانی وقفہ اکثر نمازوں میں برابر ہے۔ اس وقفے میں نشہ اور پھر اس سے افاقہ ممکن نہیں۔ اس سے اصل مقصود شراب نوشی کو انتہائی دشوار بنانا اور اکثر و بیشتر جن اوقات میں اسے استعمال کیا جاتا تھا ان پر ہمیشگی کی عادت کو ختم کرنا تھا۔ کیونکہ نشے کا عادی انسان اپنی عادت پوری کرنے کی ضرورت اس وقت محسوس کرتا ہے جس وقت اس کی روٹین بنی ہو، خواہ عادت شراب کی ہو یا ہلکے نشے کی۔ تب وہ نشہ آور چیز بے قراری سے طلب کرتا ہے، پھر جب وہ وقت گزر جائے اور اس طرح وہ وقت بار بار گزارا جائے تو عادت بڑی حد تک کمزور پڑ جاتی ہے اور اس پر غلبہ پانا ممکن ہو جاتا ہے۔ جب یہ دونوں اقدام مکمل ہو گئے تو شراب اور جوئے کی حتمی حرمت کا حکم نازل ہو گیا اور قطعی ممانعت کر دی گئی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ○ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاحْذَرُوْا ۚ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ○ ﴾

[1] النسآء 4:43.

''بے شک شیطان چاہتا ہے کہ تمھارے درمیان شراب اور جوئے کے ذریعے سے دشمنی اور بغض ڈال دے اور تمھیں اللہ کے ذکر اور نماز سے روکے، پھر کیا تم ان (شیطانی کاموں) سے باز آتے ہو؟ اور تم اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور احتیاط کرو، پس اگر تم حق سے پھر جاؤ تو جان لو کہ ہمارے رسول پر تو صرف کھول کر پہنچا دینا لازم ہے۔''[1]

انجامِ یہود سے عبرت

بری تدبیر کرنے والے خود اس کا نشانہ بن جاتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے متعلق یہود کی سازشیں اور مدینہ پر تسلط حاصل کرنے کی مساعی انتہائی نامشکور تھیں۔ وہ مکر وفریب کے ذریعے سے عزت، بلندی اور غلبہ حاصل کرنا چاہتے تھے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ اور مسلمانوں کو یہودیوں کے مکر وفریب سے نجات دی۔ انھیں ذلیل و رسوا کیا اور ان کی برتری ختم ہوئی۔ غلبہ ختم ہو گیا۔ گھر برباد ہوئے۔ انھیں گھروں سے چلتا کیا۔ ان تمام امور میں مسلمانوں کو مسلح تصادم کی تکلیف بھی نہ دی اور نہ کشت وخون کی نوبت آنے دی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا۔ وہ انتہائی پست ہو گئے۔ انھیں جان کے لالے پڑ گئے۔ بیش بہا دولت چھوڑ گئے جسے مسلمانوں نے مفت میں وصول کیا۔ اللہ تعالیٰ انھی کے متعلق فرماتے ہیں:

﴿هُوَ الَّذِيٓ اَخْرَجَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ دِيٰرِهِمْ لِاَوَّلِ الْحَشْرِ ۣ مَا ظَنَنْتُمْ اَنْ يَّخْرُجُوْا وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مَّانِعَتُهُمْ حُصُوْنُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَاَتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ حَيْثُ لَمْ يَحْتَسِبُوْا ۤ وَقَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ يُخْرِبُوْنَ بُيُوْتَهُمْ بِاَيْدِيْهِمْ وَاَيْدِي الْمُؤْمِنِيْنَ ۤ فَاعْتَبِرُوْا يٰٓاُولِي الْاَبْصَارِ ۝﴾

''وہی ہے جس نے اہلِ کتاب کے کافروں کو پہلی جلا وطنی کے وقت ان کے

[1] المآئدة5:92,91. تفسير في ظلال القرآن لسيد قطب:229/1.

گھروں سے نکال دیا، تم نے کبھی یہ خیال نہیں کیا تھا کہ وہ (وہاں سے) نکلیں گے اور انھوں نے سمجھا تھا کہ بے شک ان کے قلعے انھیں اللہ (کے عذاب) سے بچا لیں گے، پھر ان کے پاس اللہ (کا عذاب) آیا جہاں سے انھوں نے گمان بھی نہیں کیا تھا اور اس نے ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا، وہ اپنے گھر اپنے ہاتھوں اجاڑتے تھے اور مومنوں کے ہاتھوں بھی، تو اے آنکھوں والو! عبرت پکڑو۔''[1]

بری سوچ اور دھوکا دہی کا یہی نتیجہ ہے۔ دیکھیے اس کے بعد قرآن پاک نے اس واقعے میں عبرت کے مقامات کی طرف کیسے اشارہ فرمایا ہے اور کس احسن انداز سے علانیہ اس زجر و توبیخ کا ذکر کیا ہے جو ہر اس انسان کو آسکتی ہے جو بھی تکلیف دہ مکر و فریب اور مہلک بغض و کینہ کا رستہ اختیار کرے گا۔ ارشاد ربانی ہے کہ اے آنکھوں والو! عبرت حاصل کرو۔

اس آیت میں میرے سامنے عبرت کا بہت سا سامان ہے:

① ہر وہ شخص جو حق کے رستے میں رکاوٹ بنتا ہے، لوگوں کو اس سے روکتا ہے، داعیانِ حق کو دور ہٹاتا ہے بالآخر وہ شکست کھاتا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ وَتُحْشَرُوْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ ۭ وَبِئْسَ الْمِهَادُ﴾

''کافروں سے کہہ دیجیے! تم عنقریب مغلوب کیے جاؤ گے۔ اور جہنم کی طرف جمع کیے جاؤ گے اور وہ برا ٹھکانا ہے۔''[2]

② حق و باطل کی کشمکش کبھی تھمنے والی نہیں یہ سلسلہ تا قیامت جاری رہے گا۔ مستقبل میں کبھی حق اور کبھی باطل کو عروج ہوگا لیکن بالآخر نتائج حق کے حق میں ہوں گے۔

③ یہود کی خیانت اور دھوکا دہی سے عبرت حاصل کی جا سکتی ہے۔ اس طرز عمل سے اجتناب کیا جائے تاکہ بصورت دیگر جو ذلت، رسوائی اور شکست ان کا مقدر بنی اس سے بچا جا سکے۔

[1] الحشر 2:59. [2] آل عمرٰن 12:3.

دین میں جبر نہیں ہے

بنو نضیر میں انصار کے کچھ بیٹے تھے جو یہود کے زیر تربیت رہ کر یہودیت اختیار کر چکے تھے۔ ان کے مسلمان اہل خانہ نے انھیں جلاوطنی سے روکنا چاہا تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۖ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا ۗ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝﴾

''دین میں کوئی زبردستی نہیں، ہدایت، گمراہی سے واضح ہو چکی ہے، پھر جو شخص طاغوت کا انکار کرے اور اللہ پر ایمان لے آئے تو یقیناً اس نے ایک مضبوط کڑا تھام لیا جو ٹوٹنے والا نہیں اور اللہ خوب سننے والا، خوب جاننے والا ہے۔''[1]

امام ابوداود اپنی سنن میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت لائے ہیں کہ ''بسا اوقات ایسا ہوتا کہ کسی عورت کی اولاد زندہ نہ رہتی تو وہ نذر مان لیتی کہ اگر اس کا بچہ زندہ رہا تو وہ اسے یہودی بنا دے گی۔ جب بنو نضیر کو جلا وطن کیا گیا۔ تو ان میں انصار کے کئی بیٹے تھے۔ انصار نے کہا: ''ہم اپنے بیٹوں کو نہیں چھوڑیں گے۔'' تب اللہ تعالیٰ نے قرآنی آیات اتاریں کہ دین میں قطعی جبر نہیں۔''[2]

1 البقرة2:256. 2 سنن أبي داود، حديث:2682، والسنن الكبرىٰ للنسائي، رقم:10983,10982.
علامہ البانی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے، دیکھیے: (صحيح سنن أبي داود:2682)

باب 3

غزوۂ ذات الرقاع، طے شدہ غزوۂ بدر اور دومۃ الجندل

غزوۂ ذات الرقاع کی تاریخ، اسباب اور وجہ تسمیہ

سیرت نگار اور اہل مغازی اس غزوے کی تاریخ کے متعلق اختلاف کرتے ہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ کا خیال ہے کہ یہ غزوہ، غزوۂ خیبر کے بعد پیش آیا تھا۔[1] ابن اسحاق کے مطابق یہ غزوہ، غزوۂ بنو نضیر کے بعد پیش آیا تھا۔[2]

ایک یہ بھی خیال ہے کہ غزوۂ ذات الرقاع، غزوۂ خندق کے بعد 4 ھ میں پیش آیا۔ واقدی اور ابن سعد کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ غزوۂ ذات الرقاع محرم 5 ھ میں پیش آیا۔[3] حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے امام بخاری رحمہ اللہ کے نقطۂ نظر کو ترجیح دی ہے۔

وجہِ ترجیح دراصل یہ ہے کہ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ غزوۂ ذات الرقاع میں شامل تھے۔ وہ فتح خیبر کے فوراً بعد حبشہ سے آگئے تھے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بھی اس غزوے میں شریک تھے۔ وہ فتح خیبر کے موقع پر اسلام لائے تھے۔ اس غزوۂ ذات الرقاع میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صلاۃ الخوف ادا کی تھی۔ صلاۃ الخوف غزوۂ خندق کے موقع پر شریعت کا حصہ نہیں بنی تھی بلکہ غزوۂ حدیبیہ کے موقع پر عسفان میں مقرر ہوئی تھی۔ غزوۂ حدیبیہ 6 ھ میں پیش آیا۔

ڈاکٹر سعید رمضان بوطی نے لکھا ہے کہ غزوۂ ذات الرقاع یقیناً غزوۂ خندق سے پہلے

---

[1] صحيح البخاري، قبل الحديث:4125. [2] السيرة النبوية لابن هشام:225/3. [3] المغازي للواقدي:395/1، والطبقات لابن سعد:61/2.

پیش آیا۔[1] انھوں نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی وہ صحیح روایت بطور دلیل پیش کی ہے جس میں ذکر ہے کہ جابر رضی اللہ عنہ نے غزوۂ خندق میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے گھر آنے کی اجازت طلب کی۔ اور واپس آکر اپنی اہلیہ سے تذکرہ کیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو سخت بھوک لگی ہے۔ روایت میں کھانے کا ذکر بھی ہے جس کی دعوت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام لشکر کو دی تھی۔ کھانا جابر رضی اللہ عنہ نے تیار کرایا تھا۔ جابر رضی اللہ عنہ کے کھانے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت کا معجزہ ظاہر ہوا تھا۔ اسی روایت میں یہ بھی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی اہلیہ سے فرمایا تھا: ''یہ کھانا کھاؤ اور اسے تحفے کے طور پر ہمسایوں میں بھی دو، اس لیے کہ لوگ بھوکے ہیں۔''[2]

صحیحین کی ایک روایت میں ہے کہ غزوۂ ذات الرقاع میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے دریافت فرمایا تھا کہ تم نے شادی کرلی ہے؟ جابر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا تھا: جی ہاں![3] اس کا مطلب یہ ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی شادی کا علم نہیں تھا۔

ڈاکٹر سعید رمضان بوطی، ابن حجر رحمہ اللہ کے غزوۂ ذات الرقاع کے غزوۂ خیبر کے بعد وقوع پذیر ہونے والے نقطۂ نظر کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''ابن حجر کا استدلال کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ احزاب میں صلاۃ الخوف نہیں پڑھی تھی بلکہ قضا کی تھی، اس کا جواب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت مسلمانوں اور مشرکین کے درمیان مقابلہ جاری رہنے کی وجہ سے نماز نہ پڑھ سکے اور یہ امکان ہے کہ دشمن قبلے کی جانب تھا۔ یہ بھی امکان ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے رہ جانے والی نمازوں کی قضا کے جواز کے بیان کے لیے ایسا کیا ہو۔

سیدنا ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی روایت سے استدلال کا جواب بھی دیا جاسکتا ہے جو اکثر سیرت نگاروں اور اہل مغازی نے دیا ہے کہ ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کی مراد کوئی اور غزوہ ہے جس کا نام بھی ذات الرقاع تھا۔ دراصل وہ اس کے متعلق کہتے ہیں کہ ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے

---

[1] فقه السيرة للبوطي، ص: 210. [2] صحيح البخاري، حديث: 4101. [3] صحيح البخاري، حديث: 2097، وصحيح مسلم، حديث: [3636](54)-715، ومسند أحمد: 376,375/3.

ہمراہ جنگ کے لیے روانہ ہوئے۔ چھ چھ آدمیوں کے پاس باری باری سواری کے لیے ایک ایک اونٹ تھا۔[1]

جس غزوۂ ذات الرقاع کی بات ہم کر رہے ہیں اس میں تعداد اس سے بھی زیادہ تھی۔[2]

ڈاکٹر حکمی اور ڈاکٹر اکرم ضیاء عمری کا میلان امام بخاری اور ابن حجر کی طرف ہے۔[3]

ڈاکٹر مہدی رزق اللہ احمد نے ڈاکٹر سعید رمضان بوطی کی تائید کی ہے۔ وہ مزید کہتے ہیں کہ ڈاکٹر بوطی کی یہ دلیل کہ جابر رضی اللہ عنہ کی شادی غزوۂ خندق سے پہلے ہو چکی تھی، صحیحین کی روایت ہے جسے مسترد نہیں کیا جا سکتا۔ جبکہ امام بخاری رحمہ اللہ اپنی رائے کی تائید میں معلق روایت لائے ہیں۔ ان کی دلیل صرف یہ ہے کہ ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی آمد فتح خیبر کے بعد ہوئی تھی۔ ڈاکٹر بوطی کے بقول اس دلیل کا جواب یہ ہے کہ (ذات الرقاع) کے نام سے ایک سے زائد غزوے پیش آئے تھے۔[4] بوطی نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ غزوہ 4ھ میں پیش آیا، جبکہ بنو نضیر کو جلاوطن ہوئے تقریباً ڈیڑھ ماہ گزر چکا تھا۔ اکثر سیرت نگاروں کی یہی رائے ہے۔[5] میری رائے بھی یہی ہے۔

عرب (نجد) کے قبائل کی طرف سے مسلمانوں کے ساتھ اتنا بڑا دھوکا کبھی نہیں کیا گیا تھا جو ان ستر (70) مبلغین کی شہادت کی صورت میں سامنے آیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بنو ثعلبہ اور محارب کے انھی قبائل کے ارادے سے روانہ ہوئے۔ ڈاکٹر محمد ابو فارس نے بیان کیا ہے کہ ایک مخبر مدینہ منورہ آیا اور مسلمانوں کو اطلاع دی کہ بنو محارب اور بنو ثعلبہ جن کا تعلق غطفان سے ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جنگ کے لیے بڑی فوجیں اکٹھی کر چکے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم 400 اور بعض کے مطابق 700 مجاہدین کے ہمراہ ان کے ہاں جا پہنچے۔ وہ

---

[1] صحيح البخاري، حديث: 4128. [2] السيرة النبوية للدكتور مهدي رزق الله، ص: 425.
[3] مرويات غزوة الحديبية للدكتور حافظ حكمي، ص: 73-86، والمجتمع المدني للدكتور العمري، ص: 130. [4] السيرة النبوية للدكتور مهدي رزق الله، ص: 425. [5] فقه السيرة النبوية للدكتور البوطي، ص: 194.

لوگ اس قدر خائف ہوئے کہ اپنی عورتوں اور بچوں کو چھوڑ کر پہاڑوں میں جا چھپے۔ نماز کا وقت آیا، مسلمان ڈرتے تھے کہ اچانک حملہ نہ ہو جائے، چنانچہ آپ ﷺ نے صلاۃ الخوف ادا کی اور مدینہ منورہ واپس تشریف لے آئے۔[1]

اس جنگی مہم نے اپنا مقصود پالیا۔ مسلمان غطفان کے ان قبائل کو بکھیرنے میں کامیاب رہے جو مدینہ پر حملہ آور ہونے کے لیے پر تول رہے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان قبائل کو مرعوب کر کے یہ پیغام دیا کہ مسلمان نہ صرف مدینہ پر حملہ آور ہونے کا منصوبہ بنانے والوں کو دور ہٹانے پر قادر ہیں بلکہ وہ دشمن کے گھر جا کر لڑنے اور اسے اس کے علاقے میں سبق سکھانے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔[2]

غزوے کا نام ذات الرقاع یوں پڑا کہ صحابہ کرام نے گرمی سے بچنے کے لیے پیروں پر چیتھڑے باندھ رکھے تھے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انھوں نے جھنڈوں میں پیوند لگا رکھے تھے۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہاں ذات الرقاع نامی ایک درخت تھا۔[3]

یہ قول بھی ہے کہ مسلمانوں نے جس جگہ ڈیرے ڈالے تھے وہاں سیاہ وسفید پہاڑ تھے۔[4]

درست ترین یہ ہے کہ صحابہ کرام نے قدم زخمی ہونے کے سبب پیروں پر چیتھڑے باندھ رکھے تھے۔ صحیحین میں حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جنگ کے لیے روانہ ہوئے۔ چھ چھ آدمیوں کو ایک ایک اونٹ میسر تھا جس پر وہ باری باری سوار ہوتے۔ یوں ہمارے قدم زخمی ہو گئے۔ میرے دونوں پاؤں زخمی ہو گئے۔ ناخن بھی گر گئے۔ ہم نے پاؤں پر چیتھڑے باندھ لیے۔ یوں غزوے کا نام غزوۂ ذات الرقاع پڑ گیا۔[5] (عربی میں چیتھڑوں کو رقاع کہتے ہیں۔)

1 غزوة الأحزاب لأبي فارس، ص: 14. 2 غزوة الأحزاب لمحمد أحمد باشميل، ص: 78,77.
3 حديث القرآن عن غزوات الرسول ﷺ للدكتور محمد بكر آل عابد: 309/1. 4 صور وعبر من الجهاد النبوي للدكتور فوزي فيض الله، ص: 170. 5 صحيح البخاري، حديث: 4128، وصحيح مسلم، حديث: 1816.

صلاۃ الخوف

اللہ تعالیٰ نے غزوۂ ذات الرقاع میں صلاۃ الخوف کا حکم نازل فرمایا اور دشمن کے روبرو ادائے نماز کا طریقہ واضح ہوا۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿وَإِذَا كُنتَ فِيهِمْ فَأَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلَوٰةَ فَلْتَقُمْ طَآئِفَةٌ مِّنْهُم مَّعَكَ وَلْيَأْخُذُوٓا أَسْلِحَتَهُمْ ۖ فَإِذَا سَجَدُوا فَلْيَكُونُوا مِن وَرَآئِكُمْ وَلْتَأْتِ طَآئِفَةٌ أُخْرَىٰ لَمْ يُصَلُّوا فَلْيُصَلُّوا مَعَكَ وَلْيَأْخُذُوا حِذْرَهُمْ وَأَسْلِحَتَهُمْ ۗ وَدَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ تَغْفُلُونَ عَنْ أَسْلِحَتِكُمْ وَأَمْتِعَتِكُمْ فَيَمِيلُونَ عَلَيْكُم مَّيْلَةً وَٰحِدَةً ۚ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِن كَانَ بِكُمْ أَذًى مِّن مَّطَرٍ أَوْ كُنتُم مَّرْضَىٰٓ أَن تَضَعُوٓا أَسْلِحَتَكُمْ ۖ وَخُذُوا حِذْرَكُمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ أَعَدَّ لِلْكَٰفِرِينَ عَذَابًا مُّهِينًا ۝﴾

''اور (اے نبی!) جب آپ مومنوں کے درمیان ہوں، پھر انھیں نماز پڑھانے کے لیے کھڑے ہوں تو ان میں سے ایک گروہ اپنے ہتھیار لگائے ہوئے آپ کے ساتھ جماعت میں کھڑا ہو، پھر جب وہ سجدہ کر لے تو پیچھے چلا جائے اور دوسرا گروہ جس نے ابھی نماز نہیں پڑھی وہ آپ کے ساتھ نماز ادا کرے اور اپنا بچاؤ ساتھ لے اور اپنے ہتھیار (لگائے رکھے۔) کافر چاہتے ہیں کہ تم اپنے ہتھیاروں اور اپنے سامان کی طرف سے ذرا غافل ہو جاؤ تو وہ تم پر یکبارگی دھاوا بول دیں۔ اور اگر تمھیں بارش سے تکلیف ہو یا تم بیمار ہو تو تم پر کوئی گناہ نہیں کہ اپنے ہتھیار (ایک طرف) رکھ دو اور اپنا بچاؤ ساتھ لو۔ بے شک اللہ نے کافروں کے لیے رسوا کر دینے والا عذاب تیار کر رکھا ہے۔''[1]

چنانچہ مسلمانوں نے دورانِ جنگ صلاۃ الخوف ادا کی۔ طریقہ یہ تھا کہ لشکر کے ایک حصے نے آپ ﷺ کے ساتھ صف بنالی اور دوسرا حصہ دشمن کے سامنے رہا۔ آپ ﷺ نے

[1] النسآء 102:4.

پہلے گروہ کو ایک رکعت پڑھائی اور کھڑے رہے۔ پہلے گروہ نے اپنی نماز خود مکمل کی، پھر یہ جماعت دشمن کے سامنے چلی گئی وہاں موجود دوسری جماعت اقتدائے نبوی میں آ گئی۔ آپ ﷺ نے بقیہ رکعت انھیں پڑھائی، پھر آپ بیٹھے رہے۔ انھوں نے اپنی نماز خود مکمل کر لی تو آپ ﷺ نے ان کے ساتھ سلام پھیر دیا۔[1]

ایک اور روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک گروہ کو دو رکعتیں پڑھائیں۔ وہ پیچھے ہٹ گئے تو دوسرے گروہ کو آپ نے پھر دو رکعتیں پڑھا دیں۔ آپ ﷺ کی چار اور لوگوں کی دو دو رکعتیں ہوئیں۔[2]

ڈاکٹر بوطی دونوں روایات میں مطابقت پیدا کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کو کئی مرتبہ صلاۃ الخوف پڑھائی ہے۔ کبھی پہلے طریقے کے مطابق اور کبھی دوسرے طریقے کے مطابق۔ آپ نے یہ نماز مدینہ منورہ سے دو دن کی مسافت پر واقع ''نخل''[3] نامی جگہ میں پڑھائی۔[4]

صلاۃ الخوف کی مشروعیت نماز کی اہمیت پر دلالت کرتی ہے کہ عین جنگ میں بھی نماز کے متعلق سستی و کوتاہی ناروا ہے۔ حالات جیسے بھی ہوں، نماز کے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ کتاب اللہ سے ماخوذ منہج نبوی میں امت کی تربیت اسی نہج پر کی گئی کہ جہاد اور عبادت ایک دوسرے سے الگ تھلگ نہ ہوں۔[5]

سرحدوں کی حفاظت

صحابہ کرام نے ذات الرقاع سے واپسی پر کسی مشرک کی ایک بیوی کو قیدی بنا لیا۔ اس

1 صحيح البخاري، حديث: 4129، وصحيح مسلم، حديث: 842. 2 صحيح مسلم، حديث: 843. 3 وادی نخل مدینہ منورہ کے مشرق میں تقریباً سو (100) کلو میٹر دور ہے۔ غزوۂ ذات الرقاع وادی نخل میں موجودہ قصبہ الحناکیہ کے قریب پیش آیا تھا۔ (معجم المعالم الجغرافيه في السيرة النبوية، ص: 317) 4 فقه السيرة النبوية للبوطي، ص: 207. 5 التربية القيادية للدكتور الغضبان: 304,303/3.

کے خاوند نے نذر مانی کہ میں محمد (ﷺ) کے ساتھیوں کا خون بہائے بغیر گھر نہ لوٹوں گا۔ آپ ﷺ نے حضرت عباد بن بشر اور عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما کو پہرے پر مقرر فرما رکھا تھا۔ وہ مشرک رات کے وقت آیا تو عباد بن بشر رضی اللہ عنہ کو، جو پہرے پر کھڑے نماز ادا کر رہے تھے، تیر مارا۔ انھوں نے تیر کھینچ کر نکال دیا۔ اس نے پے در پے تین تیر مارے مگر حضرت عباد رضی اللہ عنہ نے نماز پوری کر کے اپنے ساتھی کو بیدار کیا، اس نے کہا: ''سبحان اللہ! آپ نے مجھے پہلے ہی کیوں نہ بیدار کر دیا۔'' وہ کہنے لگے: ''میں ایک سورت پڑھ رہا تھا جسے ختم کیے بغیر میں چھوڑنا نہ چاہتا تھا مگر جس وقت دشمن نے مسلسل تیر برسائے تو میں نے نماز مختصر کر کے سلام پھیر کر آپ کو مطلع کیا۔ اللہ کی قسم! اگر سرحد کی حفاظت کا مسئلہ نہ ہوتا جس پر آپ ﷺ نے میرا تعین فرمایا تھا تو جان چلی جاتی مگر میں سورت مکمل کر کے رہتا۔''[1]

اس واقعے سے ہمیں کئی باتیں معلوم ہوتی ہیں، مثلاً:

- نبی ﷺ لشکر کی حفاظت کے سلسلے میں انتہائی اہتمام فرمایا کرتے تھے۔
- پہرے داری کی تقسیم: جن دو صحابہ کی ڈیوٹی پہرے پر لگائی گئی تھی انھوں نے ازخود رات دو حصوں میں تقسیم کر لی تھی۔ آدھی رات آرام کے لیے اور آدھی رات پہرے داری کے لیے۔
- قرآن پاک سے صحابہ کرام کا گہرا تعلق اور تلاوت قرآنی سے محبت: تلاوت کی محبت نے صحابی کو ان تیروں کی تکلیف بھلا دی جو اس کے جسم میں پیوست ہو رہے تھے اور خون کا فوارہ پھوٹ رہا تھا۔
- پہرے کے سلسلے میں احساس ذمہ داری: حضرت عباد رضی اللہ عنہ نے تکلیف کے احساس پر نماز مختصر نہیں کی بلکہ اس جوابدہی کے شعور پر نماز مختصر کر دی جس کی انھیں ذمہ داری سونپی گئی تھی۔

[1] المستدرك للحاكم: 156/1، وسنن أبي داود، حديث: 198.

❁ پہرے داری کی جگہ زمینی حقائق کے عین مطابق تھی: رسول اللہ ﷺ نے پہرہ داری کے لیے گھاٹی کی تنگ جگہ (دہانے) کا انتخاب فرمایا تھا۔ یہ جگہ پہرے کی متقاضی تھی۔ سکیورٹی کے حوالے سے خدشہ تھا کہ دشمن وہیں سے حملہ آور ہوگا۔

❁ محافظ کے آرام کی جگہ اس کے بالکل قریب ہونی چاہیے تاکہ ہنگامی صورت میں وہ اپنے ساتھی کو بیدار کر سکے۔ مذکورہ واقعہ میں محافظ اپنے سوئے ہوئے ساتھی کو بروقت بیدار کرسکا۔ لیکن اگر وہ جگہ دور ہوتی تو سوئے ہوئے ساتھی کو بروقت بیدار نہ کرسکتا اور انجام بد سے دوچار ہوتا۔[1]

تجھے مجھ سے کون بچائے گا

غزوۂ ذات الرقاع سے واپسی پر نبی ﷺ نے کانٹوں سے پُر ایک وادی میں قیلولہ کیا۔ تمام لوگ درختوں کا سایہ ڈھونڈنے ادھر ادھر پھیل گئے۔ آپ ﷺ نے بھی ایک درخت تلے پڑاؤ ڈالا اور تلوار درخت سے لٹکا دی۔ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما کا بیان ہے:

''ہم کچھ دیر کے لیے سو گئے۔ اچانک آپ ﷺ ہمیں بلا رہے تھے۔ ہم آپ ﷺ کے پاس پہنچے تو وہاں ایک بدو بیٹھا تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: «إِنَّ هٰذَا اخْتَرَطَ سَيْفِي وَأَنَا نَائِمٌ، فَاسْتَيْقَظْتُ وَهُوَ فِي يَدِهِ صَلْتًا، فَقَالَ لِي: مَنْ يَّمْنَعُكَ مِنِّي؟ فَقُلْتُ لَهٗ: اَللّٰهُ! فَهَاهُوَ ذَا جَالِسٌ» ''میں سورہا تھا کہ اس نے میری تلوار مجھ پر سونت لی۔ میں بیدار ہوا تو تلوار اس کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے مجھ سے کہا: ''تجھے مجھ سے کون بچائے گا؟'' میں نے کہا: ''اللہ!'' اب یہ بیٹھا ہوا ہے۔'' آپ ﷺ نے اسے سزا نہ دی۔ اس بدو کا نام غورث بن حارث تھا۔''[2]

1 غزوة الأحزاب لأبي فارس، ص: 32. 2 صحيح البخاري، حديث: 4136,4135، وصحيح مسلم، حديث: 843.

غورث نے آپ ﷺ سے وعدہ کیا کہ وہ مسلمانوں سے کبھی نہیں لڑے گا نہ ایسے لوگوں کا ساتھ دے گا جو مسلمانوں سے لڑیں۔ آپ ﷺ نے اسے چھوڑ دیا۔ وہ اپنے ساتھیوں کے پاس پہنچا تو کہنے لگا:

«جِئْتُكُمْ مِنْ عِنْدِ خَيْرِ النَّاسِ»

''میں بہترین آدمی کے پاس سے تمھارے ہاں آیا ہوں۔''[1]

یہ واقعہ نبی اکرم ﷺ کی نبوت، آپ کی غیر معمولی شجاعت، یقین کامل، صبر وثبات اور نادانوں سے درگزر کرنے کی واضح دلیل ہے۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ خوف وخطرہ نہ ہو تو اہل لشکر نیند اور پڑاؤ کرنے کے لیے علیحدہ علیحدہ ہو سکتے ہیں۔ اس واقعے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کی حفاظت کرتا تھا، پھر یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ نبی ﷺ کے ہاتھوں خرق عادت واقعات رونما ہوتے تھے۔ یہ امر رسول اللہ ﷺ کی رسالت پر کامل یقین اور نبوت کی روشن دلیل ہے۔ رسول اللہ ﷺ گہری نیند سو چکے تھے۔ صحابہ سے الگ تھلگ تھے۔ تلوار مشرک کے ہاتھ میں تھی۔ گویا آپ ﷺ کو شہید کرنے کے تمام ظاہری اسباب اسے میسر تھے، تبھی تو خود اس نے کہا: «مَنْ يَّمْنَعُكَ مِنِّي» ''تجھے مجھ سے کون بچائے گا؟'' پھر وہ کون تھا جس نے اسے قتل کرنے سے روک دیا؟[2]

یہ صرف خدائی مہربانی اور خالقِ کائنات کا وہ اعجاز ہے جو قوانینِ عالم اور تصرفات کائنات سے برتر ہے۔ یہ دعوت اسلامی کی مدافعت ہے۔[3]

اللہ تعالیٰ کی مہربانی اس مشرک کو مرعوب کرنے کا باعث بنی۔ اللہ ہی کی مہربانی سے مشرک کے بدن پر کپکپی طاری ہوئی۔ تلوار اس کے ہاتھ سے گر گئی اور وہ آپ ﷺ کے روبرو سر جھکائے بیٹھ گیا۔ جو کچھ ہوا اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے مطابق ہوا:

[1] فتح الباري، شرح الحديث: 4136. [2] فقه السيرة للبوطي، ص: 200. [3] دروس و عبر من الجهاد النبوي للدكتور فوزي فيض الله، ص: 178.

﴿ يَاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۭ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ۭ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ○ ﴾

''اے رسول! آپ کے رب کی طرف سے آپ پر جو نازل کیا گیا ہے وہ لوگوں تک پہنچا دیجیے۔ اور اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو گویا آپ نے اس کی پیغمبری کا حق ادا نہ کیا اور اللہ آپ کو لوگوں (کے شر) سے بچائے گا اور بلاشبہ اللہ کافر قوم کو ہدایت نہیں دیتا۔''[1]

اس آیت مبارکہ میں عصمت سے مراد یہ نہیں کہ آپ کو تکلیف اور قوم کو اذیت سے واسطہ نہیں پڑے گا۔ یہ تو اپنے بندوں کے متعلق اللہ تعالیٰ کی عام روش ہے۔ عصمت سے مراد یہ ہے کہ کوئی ایسا ہاتھ آپ ﷺ تک رسائی نہ پا سکے گا جو اچانک دھوکا دے کر یا قتل کر کے دعوتِ اسلامیہ کی راہ میں رکاوٹ بن جائے۔[2]

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما کے ساتھ آپ ﷺ کا معاملہ

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما کا بیان ہے کہ وادی نخل میں غزوہ ذات الرقاع کے لیے میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ اپنے ایک کمزور اونٹ پر بیٹھ گیا۔ جب آپ ﷺ واپس ہوئے تو میرے ساتھی آگے نکلتے جا رہے تھے اور میں پیچھے رہتا جا رہا تھا۔ اتنے میں رسول اللہ ﷺ نے مجھے آلیا اور فرمایا: «مَالَكَ يَا جَابِرُ؟» ''جابر تمھیں کیا ہوا ہے؟''

میں نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! اونٹ نے مجھے پیچھے کر دیا ہے۔''

فرمایا: «أَنِخْهُ» ''اسے بٹھاؤ۔''

میں نے اونٹ کو بٹھا دیا اور خود رسول اللہ ﷺ نے بھی اپنا اونٹ بٹھا دیا، پھر فرمایا: «أَعْطِنِي هٰذِهِ الْعَصَا مِنْ يَدِكَ أَوِ اقْطَعْ لِي عَصًا مِّنْ شَجَرَةٍ» ''اپنے ہاتھ والی

[1] المآئدة 5:67. [2] فقه السيرة للبوطي، ص: 200.

چھڑی مجھے دو یا کسی درخت سے چھڑی کاٹ لاؤ۔"

جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے ایسا ہی کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چھڑی سے اونٹ کو کچوکے لگائے، پھر فرمایا: «وَارْكَبْ» "اب سوار ہو جاؤ۔"

میں سوار ہو گیا۔ اور اب جو چلا تو اللہ کی قسم! میرا اونٹ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ناقہ کے برابر چل رہا تھا۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے باتیں کرتا چلا جا رہا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «أَتَبِيعُنِي جَمَلَكَ هٰذَا يَا جَابِرُ؟» "جابر! کیا تم اپنا اونٹ میرے ہاتھ فروخت کرتے ہو؟"

میں نے عرض کیا: "اے اللہ کے رسول! بلکہ میں اسے آپ کو ہبہ کرتا ہوں۔"

فرمایا: «لَا وَلٰكِنْ بِعْنِيهِ» "نہیں! بلکہ اسے میرے ہاتھ فروخت کر دو۔"

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: "اے اللہ کے رسول! آپ اس کی قیمت لگائیے۔"

فرمایا: «قَدْ أَخَذْتُهُ بِدِرْهَمٍ» "میں اسے ایک درہم کے عوض لیتا ہوں۔"

میں نے عرض کیا: "اے اللہ کے رسول! اس میں تو آپ مجھے گھاٹے میں ڈال رہے ہیں۔"

فرمایا: «فَبِدِرْهَمَيْنِ» "اچھا دو درہم کے عوض میں۔"

جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: "نہیں۔"

جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اونٹ کی قیمت بڑھاتے بڑھاتے ایک اوقیہ[1] کر دی۔ جابر کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: "کیا آپ واقعی رضا مند ہیں۔"

فرمایا: «نَعَمْ!» "ہاں" میں نے عرض کیا: "اچھا تو یہ اونٹ آپ کا ہو گیا۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «قَدْ أَخَذْتُهُ» "میں نے اسے لے لیا۔"

پھر فرمایا: «يَا جَابِرُ! هَلْ تَزَوَّجْتَ بَعْدُ؟» "جابر! تم نے شادی کر لی ہے؟"

[1] ایک اوقیہ میں چالیس درہم ہوتے ہیں اور یہی اہل حجاز کا اوقیہ ہے۔

میں نے جواب دیا: ''ہاں، اے اللہ کے رسول!''

فرمایا: «أَثَيِّبًا أَمْ بِكْرًا؟» ''شوہر دیدہ سے یا کنواری سے؟''

میں نے جواب دیا: ''نہیں شوہر دیدہ سے۔''

فرمایا: «أَفَلَا جَارِيَةً تُلَاعِبُهَا وَتُلَاعِبُكَ؟» ''کنواری سے کیوں نہیں شادی کی کہ تم دونوں ایک دوسرے سے کھیلتے؟''

اس پر میں نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! جنگ احد میں میرے والد شہید ہو گئے تھے۔ انھوں نے سات لڑکیاں چھوڑی ہیں۔ میں نے ایسی عورت سے نکاح کیا ہے جو ان لڑکیوں کی نگہداشت کرے، بال سنوارے۔''

فرمایا: «أَصَبْتَ، أَمَا إِنَّا لَوْ قَدْ جِئْنَا صِرَارًا، أَمَرْنَا بِجَزُورٍ فَنُحِرَتْ وَأَقَمْنَا عَلَيْهَا يَوْمَنَا ذَاكَ وَسَمِعَتْ بِنَا فَنَفَضَتْ نَمَارِقَهَا» ''تم نے اچھا کیا۔ اب جو ہم لوگ مقام صرار[1] پر پہنچیں گے تو اونٹ ذبح کرنے کے لیے کہیں گے اور ایک روز وہاں ٹھہریں گے اور جب وہ (جابر رضی اللہ عنہ کی بیوی) سنے گی تو تکیے جھاڑ کر صاف کرے گی۔''

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! ہمارے گھر میں تکیے نہیں ہیں۔''

فرمایا: «إِنَّهَا سَتَكُونُ، فَإِذَا قَدِمْتَ فَاعْمَلْ عَمَلًا كَيِّسًا» ''تکیے بھی آ جائیں گے۔ ہاں، جب تم گھر پہنچو تو (بیوی سے جماع کے حوالے سے ہوشیاری اور) سمجھداری کا مظاہرہ کرنا (کہیں وہ حالت حیض میں نہ ہو)۔''

چنانچہ جب ہم لوگ صرار پہنچے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا اور اونٹ ذبح کر دیا گیا، وہاں ہم نے ایک روز قیام کیا۔ شام ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے گئے اور ہم اپنے گھروں کو چلے گئے۔ اور میں نے سارا قصہ بیوی سے کہہ سنایا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو

[1] صرار: مدینہ منورہ سے تین میل کے فاصلے پر ایک مقام ہے۔

کچھ مجھے فرمایا تھا وہ بھی کہہ دیا۔ اس پر بیوی نے کہا: ''آپ کو سمع و طاعت سے کام لینا چاہیے۔'' صبح ہوئی تو میں نے اونٹ پکڑا اور اسے لے کر مسجد کے دروازے پر پہنچ گیا اور اسے رسول اللہ ﷺ کے دروازے کے پاس بٹھا دیا اور میں خود رسول اللہ ﷺ کے پاس مسجد میں جا بیٹھا۔ آپ ﷺ مسجد سے باہر نکلے۔ اونٹ دیکھ کر فرمایا: «مَا هٰذَا؟» ''یہ کیا ہے؟''

لوگوں نے جواب دیا: ''یہ اونٹ جابر رضی اللہ عنہ لائے ہیں۔''

فرمایا: «أَيْنَ جَابِرٌ؟» ''جابر کہاں ہے؟''

مجھے بلایا گیا تو آپ ﷺ فرمانے لگے: «يَا ابْنَ أَخِي، خُذْ بِرَأْسِ جَمَلِكَ، فَهُوَ لَكَ» ''بھتیجے! یہ اونٹ لے جا، یہ تیرا ہی ہے۔''

آپ ﷺ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو بلا کر فرمایا: «اِذْهَبْ بِجَابِرٍ فَأَعْطِهِ أُوقِيَّةً» ''جابر کو لے جاؤ اور اسے ایک اوقیہ دے دو۔''

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں ان کے ساتھ ہو لیا۔ انھوں نے مجھے ایک اوقیہ دیا بلکہ کچھ زیادہ ہی دیا۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا کہنا ہے: ''اللہ کی قسم! یہ اوقیہ برابر بڑھتا رہا اور ہمارے گھر میں اس کی موجودگی واضح طور پر محسوس ہوتی رہی۔''[1]

اس قصے میں صحابہ کرام کے ساتھ معاملات میں رسول اللہ ﷺ کے بلند پایہ اخلاق کی تصویر سامنے آتی ہے۔ آپ ﷺ نے جابر رضی اللہ عنہ سے بلا تکلف باتیں کیں۔ بلند پایہ اخلاق کا مظاہرہ کیا۔ نرم خوئی اور خوش طبعی سے کام لیا۔ آپ ﷺ اپنے صحابہ کے نجی معاملات سے باخبر رہتے ہوئے ان کی مادی، معنوی اور اجتماعی مشکلات کا ازالہ کرتے تھے۔ آپ ﷺ نے محسوس کیا کہ جابر رضی اللہ عنہ کا قافلے سے پیچھے رہ جانا کمزور اونٹ کی وجہ سے ہے۔ اور جابر رضی اللہ عنہ کے پاس غربت کے سبب اس کے علاوہ اور کوئی سواری نہیں تھی۔

---

1 صحيح البخاري، حديث: 2097، وصحيح مسلم، حديث: [1401,4100] (111,110)-715، ومسند أحمد: 376,375/3.

ان کے والد جنگ احد میں شہید ہوئے تو کئی بیٹیاں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی کفالت میں چھوڑ گئے جو بذات خود نادار تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی موقع کو غنیمت جانتے ہوئے بھائی چارہ سے کام لیا اور حسب استطاعت اپنا بابرکت روپیہ پیش کیا۔[1] کرم نوازی و غمخواری کا یہ کیسا شاندار نمونہ ہے! حسنِ صحبت اور آپس میں صاف دلی کی کیسی یادگار تصویر ہے! بے تکلفی ایسی کہ غزوے سے واپسی پر سابقہ طے شدہ پروگرام کے بغیر حسنِ سلوک! معجزانہ طور پر اونٹ کو ایسی چھڑی لگائی کہ کمال ہوگیا۔ پھر اس کی قیمت بھی دی اور اونٹ بھی نہ لیا اور جابر رضی اللہ عنہ کی شادی کی خوشی میں تحفہ دے کر شرکت کی۔ اونٹ ذبح کیے گئے تاکہ بیویاں استقبال کے لیے تیار ہوسکیں۔ ساتھ ہی مستقبل میں جناب جابر رضی اللہ عنہ کو تونگری کی بشارت بھی دی۔

یہ ان اخلاق عالیہ کا ایک نمونہ ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مرحمت فرمائے گئے تاکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں عمدہ اخلاق کی تکمیل فرما دیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عمدہ اور دھیمے انداز، دلی دوست کے سے رہن سہن، سچے بھائی چارے اور دوستی جیسے اوصاف سیکھتے رہتے تھے۔[2]

طے شدہ غزوۂ بدر اور غزوۂ دومۃ الجندل

طے شدہ غزوۂ بدر

جنگ احد کے بعد ابوسفیان کی طرف سے طے پانے والی جنگ کی تنفیذ اور وعدے کی پاسداری کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ سے 1500 مجاہدین اور دس گھڑسواروں کی معیت میں ذوالقعدہ 4 ھ میں روانہ ہوئے۔

---

1 فقه السيرة للبوطي، ص:3/213,212، والسيرة النبوية للدكتور مهدي رزق الله، ص:429.

2 صور و عبر من الجهاد النبوي للدكتور فوزي فيض الله، ص:181.

لشکر کا علم حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بدر میں حسب وعدہ قریش کے لشکر کی آمد کا آٹھ دن تک انتظار کرتے رہے۔ مگر اہل مکہ کا کوئی ایک بھی فرد بدر میں نہ پہنچا۔ ادھر ابوسفیان نے قریش اور ان کے حلیفوں کو ملا کر 2000 کا لشکر تیار کیا۔ لشکر میں 20 گھڑسوار تھے۔ قریش کے لشکر نے مرالظہران کے پاس مکہ سے چالیس (40) میل دور مجنہ کے پانی پر پڑاؤ ڈالا۔ ابوسفیان درج ذیل خطبہ دینے کے بعد واپس مکہ چلا گیا:

''اے گروہِ قریش! (جنگ کے لیے) ہریالی اور شادابی کا سال ہی تمھارے لیے بہتر ہوسکتا ہے۔ اس میں تم اونٹوں کو درختوں کے پتے بھی کھلا سکو گے اور ان کا دودھ بھی پی سکو گے۔ یہ سال قحط سالی والا ہے، اس لیے میں واپس جا رہا ہوں، تم بھی واپس چلو۔''[1]

اس دوران مخشی بن عمرو ضمری آیا۔ اس نے غزوہ ودّان میں بنوضمرہ کی طرف سے مصالحت کی تھی۔ اس نے بدر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کی اور کہا: ''اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)! کیا اس (جگہ) پانی پر قریش سے لڑنے آئے ہو۔'' فرمایا: «نَعَمْ! يَا أَخَا بَنِي ضَمْرَةَ! وَإِنْ شِئْتَ مَعَ ذٰلِكَ رَدَدْنَا إِلَيْكَ مَا كَانَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكَ، ثُمَّ جَادَلْنَاكَ حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ بَيْنَنَا وَبَيْنَكَ» ''ہاں، اے ضمری! اور اگر تمھارا منشا ہو تو میں اس عہد کو جو ہمارے تمھارے درمیان طے پایا تھا، واپس لے لوں اور تم سے بھی جنگ کروں، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ہمارا تمھارا فیصلہ کر دے۔'' مخشی نے کہا: ''نہیں نہیں، بخدا! مجھے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے جنگ کی کوئی ضرورت نہیں۔''[2]

اس ملاقات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کی قوت کا مظاہرہ کیا اور واضح کیا کہ فریقین کے درمیان جنگ بندی کا معاہدہ مسلمانوں کی قوت سے طے پایا ہے نہ کہ کمزوری پر اور یہ بھی کہ جنگ بندی کا معاہدہ مخالف فریق کے مطالبے پر طے پایا ہے۔ یوں مسلمانوں

[1] نضرة النعيم:319,318/1، وغزوة الأحزاب لمحمد أحمد باشميل، ص:88. [2] السيرة النبوية لابن هشام:220/3.

کی قوت کا مظاہرہ ہوا اور دشمن پر مسلمانوں کی دھاک بیٹھ گئی۔[1]

اسلامی لشکر بڑی شان وشوکت کے ساتھ مدینہ سے بدر تک چلا اور بدر میں اسلامی لشکر کی موجودگی مدینہ اور بیرون مدینہ بلکہ مکمل جزیرۃ العرب کے لیے واضح پیغام تھا کہ اسلامی لشکر زبردست قوت اور رعب و دبدبہ کی علامت بن چکا ہے۔ اس امر کی اس سے بڑی کوئی دلیل نہیں تھی کہ مکی لشکر، جزیرۃ العرب میں کثرت تعداد، نظم وضبط اور اعلیٰ پایے کے اسلحے کے باوجود، اسلامی لشکر کے خوف سے رستے ہی سے واپس چلا گیا، جبکہ جنگ کا معاہدہ جنگ احد میں مکی لشکر ہی کے قائد نے طے کیا تھا۔[2]

جنگ احد میں مشرکین کا پلہ بھاری ہونا اور ان کی فتح کی تشہیر ان کے گلے کا طوق بن گیا اور وہ تمام عرب کے لیے مضحکہ بن گئے۔ تمام لوگوں کو معلوم ہوگیا کہ احد میں مسلمانوں کا پھندے میں آجانا اور ان کے افراد کا قتل کسی کمزوری یا شکست کی دلیل نہیں ہے۔[3]

اس غزوے نے مسلمانوں کی جنگی شہرت کو نمایاں کیا اور انھیں بغیر جنگ کے دشمن پر بہت بڑی نفسیاتی فتح سے ہمکنار کیا، نیز وہ بدر کے تجارتی میلے میں شریک ہوئے اور تجارت میں خاصا نفع کمایا۔[4]

قریش کی عہد شکنی مسلمانوں کے مقام و مرتبے کو بلند کرنے اور سابقہ غلبہ و ہیبت دوبارہ قائم کرنے میں بڑی موثر ثابت ہوئی۔[5]

غزوۂ دومۃ الجندل

غزوۂ دومۃ الجندل بھی اسلامی حکومت کی اساس مضبوط کرنے کی ایک کوشش تھی۔

غزوۂ بدر صغریٰ کے بعد اسلامی سپاہ رسول اللہ ﷺ کی قیادت میں بنوقضاعہ کی جانب

1 من معين السيرة لصالح الشامي، ص:265,264. 2 غزوة الأحزاب لمحمد أحمد باشميل، ص: 89,88. 3 التاريخ الإسلامي للحميدي: 66/6. 4 التربية القيادية للدكتور الغضبان: 463/3. 5 المجتمع المدني في عهد النبوة للدكتور العمري، ص:91.

چلی۔ قضاعہ سے مراد وہ علاقہ ہے جو قبائل اسد و غطفان کے بائیں جانب غسانی ریاست کی حدود پر واقع ہے جو رومیوں کی ''بازنطینی'' حکومت کے زیرنگیں تھا۔ مدینہ منورہ کے شمال میں 450 کلومیٹر کے فاصلے پر منعقد ہونے والے دومۃ الجندل کے مشہور میلے پر انھی کا کنٹرول تھا۔

یہ پہلا قبیلہ تھا جس سے مسلمانوں نے ٹکر لی۔ غزوۂ ''دومۃ الجندل'' ربیع الاول 5 ھ / اگست 626ء میں پیش آیا۔ مدینہ منورہ میں یہ خبریں پہنچ رہی تھیں کہ دومۃ الجندل کے پاس کچھ قبائل اکٹھے ہو رہے ہیں تاکہ قریب سے گزرنے والے قافلوں کو لوٹ سکیں۔ اور اہل قافلہ پر ظلم و زیادتی کر سکیں۔ یہ خبریں بھی گرم تھیں کہ یہ قبائل مدینہ منورہ کی اینٹ سے اینٹ بجانے کے متعلق سوچ رہے ہیں۔[1]

دومۃ الجندل مدینہ منورہ سے طویل مسافت پر واقع تھا۔ یہ حجاز اور شام کی سرحد پر مدینہ منورہ سے 16 دن کے مسلسل سفر پر، بحیرۂ اُحمر اور خلیجِ فارس (خلیج عربی) کے درمیان واقع ہے، لہٰذا اگر مسلمان دومۃ الجندل میں دشمن کے اکٹھ سے بے پروائی کرتے اور خاموش رہتے تو کوئی بھی انھیں قابل ملامت نہ سمجھتا اور نہ مستقبل قریب میں وہ نقصان پہنچانے کی استطاعت رکھتے تھے۔ لیکن مسلمانوں کی سیاسی دور اندیشی اور تزویراتی سوچ بچار نے انھیں اس گروہ کی حرکات و سکنات اور اس کے بڑھنے پھولنے سے پہلے ہی کاری ضرب لگانے پر مجبور کیا تاکہ درج ذیل نتائج برآمد ہو سکیں:

① ایسے اجتماعات کے متعلق خاموشی انھیں حد سے بڑھنے کا موقع دے گی۔ نتیجتاً مسلمان کمزور ہو جائیں گے۔ اور دشمن کے دلوں سے ان کا رعب جاتا رہے گا۔ دشمن کی خواہش یہی ہوتی ہے۔

② شام کے رستہ پر اس قسم کے اجتماعات مسلمانوں کے اقتصادی پروگرام کو بھی متاثر کر

[1] تأملات في سيرة الرسول ﷺ لمحمد الوكيل، ص: 169.

سکتے تھے۔ لہٰذا اگر مسلمان اس گروہ سے چشم پوشی کرتے تو یہ اور اس طرح کہ دیگر قبائل اسلامی قافلوں کو لوٹتے رہتے اور نتیجہ معاشی و اقتصادی بدحالی اور سیاسی عدم استحکام کی صورت میں نکلتا۔

③ سابقہ حکمت سے بھی بڑھ کر اس کا مقصد تمام علاقے میں مسلمانوں کا اثر و رسوخ قائم کرنا تھا۔ علاقے کے باشندے اچھی طرح سمجھ لیں کہ وہ مسلمانوں کی حفاظت میں ہیں، اس لیے راستوں کا محفوظ رکھنا ان کا فرض ہے۔ تاکہ وہ ان کی تجارت کا تحفظ کریں اور ان کے لیے خطرہ بننے والی ہر قوت سے نبرد آزما ہوں۔[1]

④ قریش کو اس کی تجارت محفوظ رکھنے والے کسی بھی طرفدار سے محروم کرنا۔ قریش کا اس اہم تجارتی مرکز کو خیر باد کہنا اور ان کے مقابلے میں اسلامی حکومت کا اس شان و شوکت سے سامنے آنا مسلمانوں کے اولین دشمن کی نفسیات پر گہرا اثر ڈالے گا اور وہ اپنی تجارت کے متعلق مسلمانوں سے ہمیشہ مرعوب رہے گا۔[2]

⑤ عربوں کی نفسیاتی مرعوبیت کو دور کرنا کہ وہ کبھی روم سے جنگ نہیں کر سکتے۔ انھیں عملاً یقین دہانی کرانا مقصود تھا کہ ان کا پیغام عالمی پیغام ہے، صرف عرب تک محدود نہیں۔ بعض مؤرخین، مثلاً: ذہبی، واقدی اور محمد باشمیل وغیرہ کا خیال یہ ہے کہ اس غزوے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ رومیوں کو ان کی سرحد پر لشکر کشی کر کے مرعوب رکھا جائے۔ وہاں سے روم کا صوبائی دارالحکومت دمشق صرف پانچ دن کی مسافت پر تھا۔[3]

الغرض رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کو ساتھ چلنے کا حکم دیا۔ آپ ﷺ 1000 مجاہدین کے ہمراہ روانہ ہوئے۔ رات کو سفر کرتے اور دن کو چھپ جاتے تاکہ آپ کی آمد مخفی رہے۔[4]

---

1 تأملات في سيرة الرسول ﷺ لمحمد الوكيل، ص: 169. 2 دراسات في عهد النبوة للدكتور عبدالرحمٰن الشجاع، ص: 144. 3 غزوة الأحزاب لمحمد أحمد باشميل، ص: 93، وتاريخ المغازي للذهبي، ص: 258. 4 تأملات في سيرة الرسول ﷺ لمحمد الوكيل، ص: 170، وغزوة الأحزاب لأبي فارس، ص: 40.

رسول اللہ ﷺ نے بنو عذرہ کا ''مذکور'' نامی صحرائی رہبر ساتھ لیا اور دشمن کے سر پر پہنچ گئے۔ دشمن بکھر گیا۔ آپ کے ہاتھ کوئی نہ لگا۔ وہ اپنے جانور اور بکریاں وغیرہ مسلمانوں کے لیے چھوڑ گئے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ان کے ایک شخص کو پکڑ کر آپ ﷺ کے سامنے پیش کیا۔ آپ ﷺ نے اس سے دریافت کیا تو وہ کہنے لگا: ''جب میری قوم کے لوگوں کو معلوم ہوا کہ آپ نے ان کے جانور قابو کر لیے ہیں تو وہ سب بھاگ کھڑے ہوئے۔'' آپ ﷺ نے اس پر اسلام پیش کیا تو وہ مسلمان ہو گیا اور کئی دن وہیں رہا۔ آپ ﷺ نے مجاہدین کے دستے ہر طرف پھیلا دیے مگر کوئی ہاتھ نہ لگا۔ مدینہ واپسی پر عیینہ بن حصن فزاری آپ سے ملا۔ اس نے دشمنی ترک کرتے ہوئے مدینہ منورہ سے چھتیس (36) میل کے فاصلے پر اپنے اونٹ اور بکریاں چرانے کی اجازت طلب کی۔

دومۃ الجندل تک اسلامی سپاہ کا مدینہ منورہ سے اتنی دور کی مسافت پر چلے جانا، عیینہ بن حصن کا دشمنی ترک کر کے مسلمانوں سے رابطہ اور ایسی زمین میں اونٹ اور بکریاں چرانے کی اجازت طلب کرنا جو مدینہ منورہ سے چھتیس (36) میل کے فاصلے پر ہے، یعنی تقریباً 58 کلومیٹر کے فاصلے پر۔ یہ امور مسلمانوں کی انتہائی قوت و سطوت ظاہر کرتے ہیں۔ اور یہ بھی کہ انھیں اس علاقے کے مسلمانوں کے لیے پرامن زندگی مہیا کرنے کا مکمل احساس ہے۔ یہ دور دراز علاقے حکومت کا حصہ تھے اور حکومت اسلامیہ مستحکم حکومت کی شکل اختیار کر چکی تھی جس پر چڑھائی کرنا کسی کے بس کی بات نہ تھی، تاہم اگر کسی کو اس کی ہمت ہوتی بھی تو وہ عیینہ بن حصن فزاری تھا جس کے اعلانِ جنگ پر دس ہزار نوجوان بھڑک اٹھنے پر تیار ہو جاتے تھے۔[1]

غزوۂ دومۃ الجندل مدینہ منورہ سے بہت دور شام کی جانب پیش آیا۔ اس کے اور دمشق کے درمیان صرف پانچ دن کی مسافت ہے۔ گویا یہ شمالی بستیوں میں اور شام کے جنوبی

[1] تأملات في سيرة الرسول ﷺ لمحمد الوكيل، ص: 170.

اذرح
معان
اردن
دومۃ الجندل
عقبہ
ایلہ
تبوک
سیناء
عرب
تیماء
مدائن صالح (الحجر)
العلا
الوجہ
ذات الرقاع
فدک
خیبر
وادی القریٰ
ذی امر
مصر
بحیرۂ قلزم
(بحیرۂ احمر)
رضوی
بواط
العشیرہ
ینبع
مدینہ منورہ
احد
بدر
حمراء الاسد
بنو سلیم
نوبیہ
سودان
ودان
بحران
المریسیع
رابغ
غزوۂ دومۃ الجندل
ربیع الاول 5ھ
بنو لحیان
حدیبیہ
جدہ
مکہ مکرمہ
حنین
طائف
نقشہ: 14
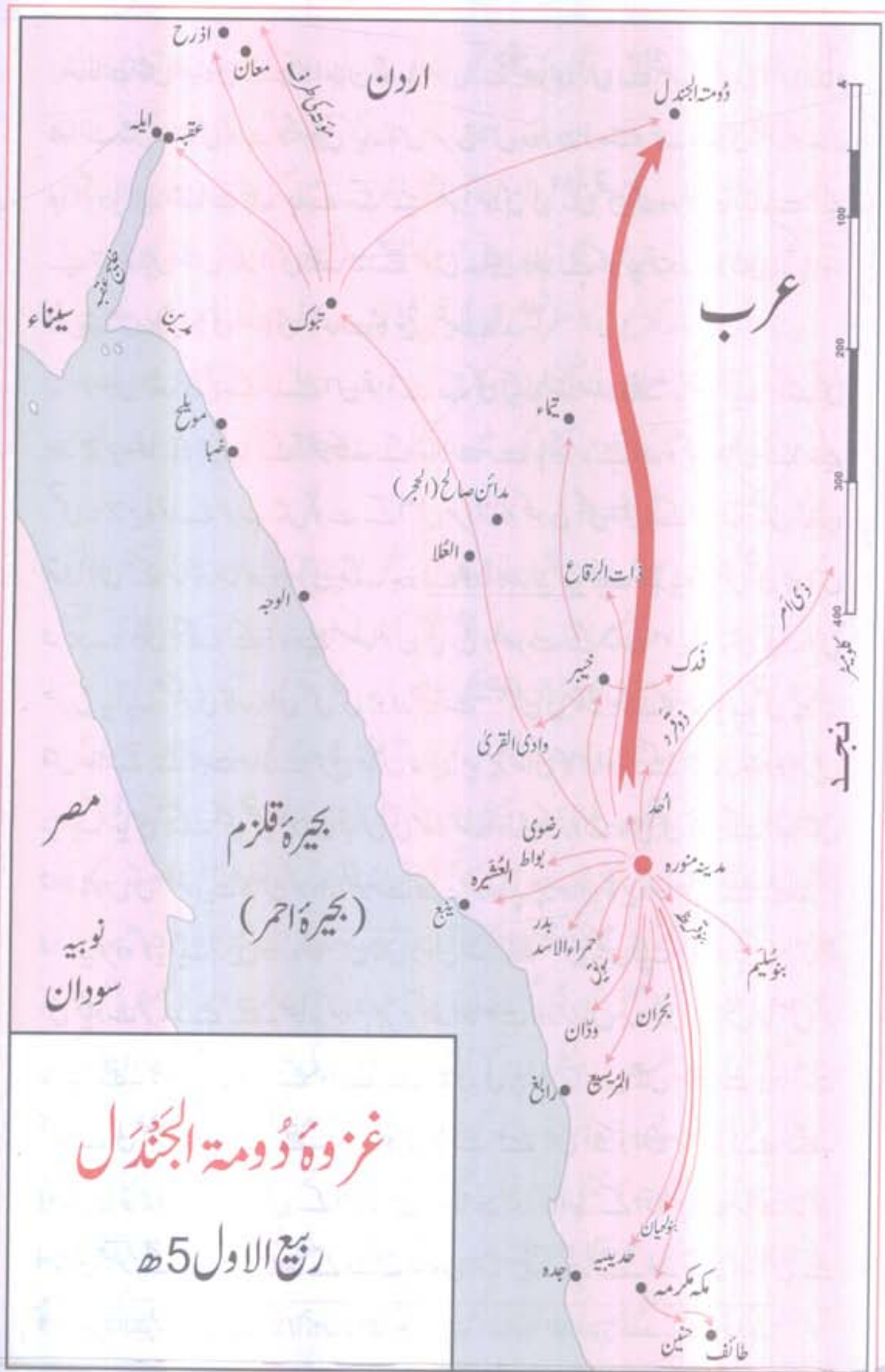
مضافات میں اسلامی دعوت کا اعلان تھا۔ انھوں نے قیصر اور اس کے لشکر کی طرح اطراف و جوانب میں اسلامی قوت کو محسوس کیا۔ اس طرح اس دور دراز مقام تک اسلامی لشکر کو لے جانا گویا بعید مقامات تک جانے کے لیے لشکر اسلامی کی مشق تھی کہ وہ ایسے مقامات کے لیے تیار رہیں جس جگہ ابھی تک نہ گئے ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ غزوہ بعد میں ایشیا اور افریقہ میں بڑی بڑی اسلامی فتوحات کا پیش خیمہ بنا۔[1]

رسول اللہ ﷺ کے سامنے اس غزوے کے کئی ایک مقاصد تھے۔ یہ خود ایک جنگ تھی اور جزیرہ نمائے عرب کے آخر تک کے حالات سے باخبر رہنے اور دیکھ بھال کے لیے تھی۔ جزیرہ نمائے عرب میں قوت کے اصل مراکز کا کھوج بھی اس کے اہداف میں شامل تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ دوسری جنگ بدر کے فوراً بعد یہ گویا ایک میڈیا وار بھی تھی جو اس نہ ہونے والی جنگ کے ذریعے مسلمانوں کی فتح و نصرت کے نتائج سمیٹ رہی تھی۔ اسی طرح یہ ایک عسکری کارروائی بھی تھی جو درحقیقت مستقبل کی ممکنہ جنگ کا سدباب تھی کیونکہ اس علاقے کے بہت سارے عربی قبائل مدینہ پر چڑھائی کا ارادہ رکھتے تھے۔ علاوہ ازیں یہ ایک سیاسی جنگ بھی تھی جو ان قبائل کی ممکنہ حملہ آوری کو روک رہی تھی جو جنگ احد میں مسلمانوں کی مغلوبیت کا سن کر دارالحکومت مدینہ منورہ پر چڑھائی کا پروگرام بنا سکتے تھے۔[2]

یہ غزوہ گویا ایک تربیتی دورہ تھا جس میں رسول اللہ ﷺ بنفس نفیس ایک ہزار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی قیادت فرما رہے تھے۔ صحابہ کرام ہر ہر لحظہ اطاعت اور فرماں برداری کا سبق حاصل کر رہے تھے۔ جسمانی جنگ کے حوالے سے زندگی کی پرخطر راہوں میں مشکلات برداشت کرنے کی مشق کر رہے تھے۔ حلال و حرام کے سلسلے میں فقہ و احکام سیکھ رہے تھے۔ دوسرے خاندانوں اور قبائل کے افراد سے تعلقات اور روابط کے احکام کے ساتھ ساتھ اسلامی لشکر کے اصول و ضوابط کے سامنے سرنگوں ہونا سیکھ رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے

[1] السيرة النبوية لأبي شهبة:2/251,252. [2] التربية القيادية للدكتور الغضبان:3/372.

رسول ﷺ کے لیے دوستی و دشمنی کی مشق تھی جس کے لیے وہ قبائلی تعصب و تعلقات پس پشت ڈالنا سیکھ رہے تھے۔ ان سب امور سے بڑھ کر قیادت کو نئے میسر آنے والے ساتھیوں کی تعلیم وتربیت کا موقع فراہم کیا گیا۔ اس غزوے میں کمزور طبع ساتھیوں اور باہمی برتاؤ میں ان لوگوں کی حالت بھی ظاہر ہوئی جن کا تعلق منافقین کے گروہ سے تھا۔

یہ چند دن یا کچھ گھڑیوں کا سفر نہیں تھا بلکہ تقریباً ایک ماہ کا دورہ تھا۔ جس میں ہر ایک کی طبیعت کا رجحان اور میلان واضح طور پر سامنے آجاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ اس صورت حال سے واقف ہو کر انھیں اسلام کے رنگ میں رنگتے اور چیدہ چیدہ لوگوں کو سیاست و قیادت کے فن روشناس کرتے تھے۔

یہ ایک خاموش معرکہ اور پرسکون تربیت تھی۔ لشکر اپنے قائد کی معیت میں تقریباً ایک ہزار میل کا سفر لق و دق صحرا میں تربیت اور مشق کرتے ہوئے طے کر رہا تھا تاکہ مستقبل کے معرکوں کے لیے تیاری کا سامان ہو سکے۔

رسول اللہ ﷺ نے غزوۂ دومۃ الجندل کو جاتے ہوئے نئے تجربے کے طور پر سباع بن عرفطہ غفاری رضی اللہ عنہ کو مدینہ کا نائب، یعنی والی مقرر فرمایا جو نہ تو اوس سے تعلق رکھتا تھا نہ خزرج سے اور نہ ہی قریش سے۔ اس کا تعلق قبیلۂ غفار سے تھا جو اہل عرب کے ہاں حاجیوں کے چور سمجھے جاتے تھے۔ یوں اسلامی معاشرے کے ذہن میں اطاعت امیر کا درس پختہ ہو رہا تھا۔ امیر کا تعلق کسی بھی گروہ سے ہو، مسلمانوں کو اطاعت امیر کا حکم دیا گیا تھا۔ یہ امر منہج نبوی کی عظمت کی دلیل ہے کہ آپ ﷺ امت کی تربیت کیسے عمدہ اور بلند پایہ طریق پر فرما رہے تھے۔ اسی طرح یہ امر بھی واضح ہوتا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ہاں قیادت و فراست نبوی کی عظمت کا کتنا مقام تھا۔ انھیں آپ ﷺ پر کس قدر اعتبار تھا اور آپ ﷺ کی خداداد صلاحیتوں کا کتنا اعتراف تھا۔ آپ ﷺ کو سباع بن عرفطہ غفاری رضی اللہ عنہ کی قائدانہ صلاحیتوں کا علم تھا۔ آپ ﷺ گویا مدینہ منورہ میں عدم موجودگی پر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم

کی تربیت فرما رہے تھے کہ رب العالمین کے منہج و قانون کو کیسے نافذ کرنا ہے اور اس سے ایسی امت کیسے تشکیل دینی ہے جو کتاب اللہ اور سنت رسول کی تعلیمات کے آگے سر جھکا دیا کرے۔[1]

الحشر 2:69

[1] التربية القيادية للدكتور الغضبان:3/374.

باب 4

غزوۂ بنو المصطلق اور واقعۂ افک

بنو المصطلق

بنو المصطلق خزاعہ کی ایک شاخ ہے۔ مصطلق ان کا کوئی بڑا تھا۔ اس کا نسب یہ ہے:

"جذیمہ بن سعد بن عمرو بن ربیعہ بن حارثہ بن عمرو بن عامر ماء السماء۔"[1]

خزاعہ کے متعلق کئی آرا ہیں۔ ایک رائے یہ ہے کہ خزاعہ عدنانی قبیلہ ہے، جبکہ بعض کے مطابق یہ قبیلہ یمنی قحطانی ہے۔ اور یہی زیادہ راجح ہے۔ زیادہ تر علماء کی رائے بھی یہی ہے۔[2]

غزوے کی تاریخ

غزوۂ بنو المصطلق کی تاریخ کے متعلق علمائے سیرت کے تین اقوال ہیں:

① امام المغازی ابن اسحاق، خلیفہ بن خیاط، ابن جریر طبری، ابن حزم، ابن عبدالبر، ابن العربی، ابن الاثیر اور ابن خلدون کی رائے یہ ہے کہ غزوۂ بنو المصطلق شعبان چھ 6 ہجری میں پیش آیا۔[3]

② مسعودی اور ابن العربی مالکی کی رائے یہ ہے کہ یہ غزوہ شعبان 4 ہجری میں واقع ہوا۔

③ مؤرخین کی کثیر تعداد، مثلاً: موسیٰ بن عقبہ، ابن سعد، ابن قتیبہ، بلاذری، ذہبی، ابن قیم،

---

[1] حديث القرآن عن غزوات الرسول ﷺ للدكتور محمد بكر آل عابد: 311/1. [2] مرويات غزوة بني المصطلق لإبراهيم القريبي، ص: 45-51. [3] صحيح السيرة النبوية لإبراهيم العلي، ص: 329، حديث القرآن عن غزوات الرسول للدكتور محمد بكر آل عابد، ص: 313،312.

ابن حجر عسقلانی اور ابن کثیر رحمہ اللہ کی رائے یہ ہے کہ غزوہ بنی المصطلق شعبان 5 ہجری میں پیش آیا۔ دور حاضر کے سیرت نگاروں میں سے محمد خضری بک، محمد غزالی، سعید رمضان بوطی، ابو شہبہ، ساعاتی، محمد ابو زہرہ، سید قطب، حسن مشاط، محمد علی صابونی، محمد بکر آل عابد، مہدی رزق اللہ احمد کی بھی یہی رائے ہے۔[1] میرے نزدیک یہی رائے حسب ذیل اسباب کی بنا پر راجح ہے:

❁ جمہور اہل سیرت اور مرتبین غزوات کے علاوہ معاصر سیرت نگاروں کی اکثریت کی بھی یہی رائے ہے۔

❁ شعبان 4 ھ میں تو پہلے سے طے شدہ غزوۂ بدر لڑا گیا تھا۔ یوں قدرتی بات ہے کہ غزوۂ بنو المصطلق اس برس پیش نہیں آیا۔

❁ غزوۂ بنی المصطلق میں حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کی موجودگی بھی اس امر کو تقویت دیتی ہے کہ یہ 5 ھ میں ہوا 6 میں نہیں کیونکہ اس غزوے کے فوراً بعد واقعہ إفک پیش آیا جس میں حضرت سعد رضی اللہ عنہ کا تذکرہ موجود ہے۔ صحیح بخاری کی روایت میں ہے: حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے......۔[2]

حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کی وفات غزوۂ بنو قریظہ کے بعد ہوئی تھی، جبکہ غزوۂ بنو قریظہ راجح قول کے مطابق 5 ہجری ذی القعدہ میں پیش آیا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ غزوۂ بنی المصطلق اس سے پہلے پیش آیا تھا۔[3]

غزوۂ بنی المصطلق کے اسباب

غزوۂ بنی المصطلق کے اہم اسباب درج ذیل ہیں:

❁ قبیلۂ بنی المصطلق نے جنگ احد میں مسلمانوں کے خلاف قریش کی حمایت کی تھی۔ یہ

[1] حديث القرآن عن غزوات الرسول ﷺ للدكتور محمد بكر آل عابد: 312/1. [2] صحيح البخاري، حديث: 4750. [3] مزید دیکھیے: مرويات غزوة بني المصطلق لإبراهيم القريبي، ص: 97.

لوگ احابیش [1] کے گروہ میں شامل تھے جو قریش کی حمایت میں جنگ احد میں شریک ہوا تھا۔

❁ مکہ مکرمہ جانے والی شاہراہ پر ان لوگوں کا کنٹرول تھا۔ یہ لوگ مکہ میں مسلمانوں کے عمل دخل کو روکنے کے لیے مضبوط رکاوٹ کی حیثیت رکھتے تھے۔ [2]

❁ رسول اللہ ﷺ کو بنو مصطلق کے اکٹھے ہونے کی اطلاعات مل رہی تھیں، ان کے منتشر گروہوں کو جمع کرنے والا قائد حارث بن ابی ضرار تھا جو انھیں منظّم کر رہا تھا۔ آپ ﷺ نے ان کے اکٹھے ہونے کے متعلق سنا تو خود ان کی جانب روانہ ہوئے اور ''مریسیع'' کے چشمے پر انھیں زبردست شکست دی۔ یہ چشمہ قدید کی طرف سے ساحل سمندر پر واقع ہے۔ [3]

مسلمانوں کا اچانک حملہ اور دیگر واقعات

رسول اللہ ﷺ کو جب ان کی مشکوک حرکتوں کا علم ہوا تو آپ ﷺ نے ان کا ارادہ جاننے کے لیے حضرت بریدہ بن حصیب اسلمی رضی اللہ عنہ کو روانہ کیا۔ بریدہ رضی اللہ عنہ نے ظاہر کیا کہ وہ ان کی مدد کے لیے آئے ہیں۔ اس دوران میں انھوں نے صورت حال کا بخوبی جائزہ لیا اور واپس مدینہ پہنچ کر رسول اللہ ﷺ کو خبر دی۔

5 ہجری 2 شعبان بروز پیر رسول اللہ ﷺ مدینہ منورہ سے 700 جنگجوؤں اور تیس گھڑسواروں کے ہمراہ ان کی جانب روانہ ہوئے۔ [4] اسلام کی دعوت انھیں پہلے ہی پہنچ چکی تھی اور وہ جنگ احد میں قریش کا ساتھ بھی دے چکے تھے۔ مزید برآں مسلمانوں سے

---

1 احابیش: اس سے مراد وہ قبائل ہیں جن کا تعلق بنیادی طور پر قریش سے نہیں تھا لیکن وہ قریش میں ضم ہو گئے تھے۔ اور قریش کے حلیف تھے۔ غزوۂ احد میں مشرکین کے ساتھ شامل تھے۔ احابیش کے مشہور قبائل یہ ہیں: بنو حارث، بنو ہون بن خزیمہ اور بنو مصطلق۔ انھیں احابیش اس لیے کہا جاتا ہے کہ انھوں نے مکہ کی نچلی جانب وادی احبش میں قریش کے ساتھ معاہدہ کیا تھا۔ 2 صحیح السیرة النبویة لإبراهیم العلي، ص: 332. 3 حدیث القرآن عن غزوات الرسول للدکتور محمد بکر آل عابد: 315/1. 4 تاریخ الإسلام للذهبي، ص: 259، والمغازي للواقدي: 405/1.

جنگ کے لیے جمعیت اکٹھی کر رہے تھے۔ امام بخاری و مسلم رحمہما اللہ نے روایت کیا ہے کہ مسلمانوں نے ان پر اچانک دھاوا بول دیا۔ وہ چشمے پر جانوروں کو پانی پلا رہے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے جنگجوؤں کو قتل کرنے کا حکم دیا اور بچوں کو قیدی بنا لیا۔ جویریہ بنت حارث بن ابوضرار رضی اللہ عنہا بنو المصطلق کے قیدیوں میں شامل تھیں۔ [1]

حضرت جویریہ بنت حارث رضی اللہ عنہا سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عقد

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو المصطلق کے قیدی تقسیم کیے۔ قیدیوں میں سیدہ جویریہ بھی شامل تھیں۔ وہ اپنی قوم کے لیے باعث برکت ثابت ہوئیں۔ آیئے ان کا واقعہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی زبانی سنتے ہیں:

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو المصطلق کے قیدی تقسیم کیے تو جویریہ بنت حارث، حضرت ثابت بن قیس بن شماس رضی اللہ عنہ یا ان کے چچا زاد کے حصے میں آئیں، جویریہ نے ان سے آزادی کے لیے مکاتبت کر لی۔ یہ بڑی میٹھی طبیعت کی مالک، صاحب جمال خاتون تھیں۔ تاوانِ غلامی کی ادائیگی کے سلسلے میں مدد طلب کرنے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئیں۔ سیدہ عائشہ کا بیان ہے کہ واللہ! میں نے اسے اپنے حجرے کے دروازے پر دیکھا تو مجھے اس کی موجودگی ناگوار گزری۔ مجھے معلوم تھا کہ جس طرح یہ مجھے بھلی لگی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اچھی لگے گی۔ اتنے میں وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچی اور عرض کرنے لگی: ”اے اللہ کے رسول! میں حارث بن ضرار کی بیٹی ہوں۔ حارث بن ضرار اپنے قبیلے کا سردار تھا۔ میں جس امتحان میں پڑی ہوں، آپ واقف ہیں۔ میں ثابت بن قیس (یا اس کے چچا زاد) کے حصے میں آئی ہوں۔ میں نے اس سے مکاتبت کر لی ہے اور رقم کی ادائیگی کے سلسلے میں مدد لینے کے لیے حاضر ہوئی ہوں۔“

---

[1] صحيح البخاري، حديث:2541، وصحيح مسلم، حديث:1730، والسيرة النبوية في ضوء المصادر الأصلية للدكتور مهدي رزق الله، ص:433.

آپ ﷺ نے فرمایا: «فَهَلْ لَّكِ فِي خَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكَ؟» ''اس سے بھی بہتر صورت چاہتی ہو؟'' جویریہ نے پوچھا: ''وہ کیا ہے اے اللہ کے رسول!؟''

فرمایا: «أَقْضِي عَنْكِ كِتَابَتَكِ وَأَتَزَوَّجُكِ» ''میں تمھاری طرف سے مکاتبت کی رقم ادا کر دوں اور تم سے شادی کر لوں۔''

جویریہ نے کہا: ''اے اللہ کے رسول! میں راضی ہوں۔''

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ یہ بات تمام لوگوں میں پھیل گئی کہ رسول اللہ ﷺ نے جویریہ سے عقد فرما لیا ہے۔ لوگوں نے کہا: ''اب تو بنومصطلق رسول اللہ ﷺ کے سسرالی رشتہ دار ہو گئے ہیں۔'' چنانچہ بنومصطلق کے تمام قیدی آزاد کر دیے گئے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جویریہ کو اپنی زوجیت میں لیا تو لوگوں نے بنومصطلق کے 100 قیدی آزاد کر دیے۔ میری نظر میں ایسی کوئی عورت نہیں جو اپنی قوم کے لیے جویریہ سے بڑھ کر باعث برکت ثابت ہوئی ہو۔[1]

غزوۂ بنومصطلق ان منفرد اور مبارک غزوات میں سے ہے جن کے بعد قبیلے کا قبیلہ اسلام لے آیا۔ وجہ یہی تھی کہ صحابہ کرام نے بنومصطلق کے تمام قیدی آزاد کر دیے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کے سسرالیوں کو قیدی بنا کر رکھنا ان پر بہت شاق گزرتا تھا۔ رسول اللہ ﷺ اور صحابۂ کرام کے اعلیٰ اخلاق سے متاثر ہو کر قبیلے کا قبیلہ مسلمان ہو گیا۔[2]

بنومصطلق کی آزادی کے تاریخی واقعے کا اصل سبب یہ تھا کہ صحابۂ کرام رسول اللہ ﷺ سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ ان کے دلوں میں آپ ﷺ کی عظیم شخصیت کا جو احترام تھا وہی اس واقعے کی بنیاد بنا۔ محبت نبوی کی برکت سے ایسے ہی عمدہ نتائج برآمد ہوئے اور اسی نوع کے بے مثال تاریخی واقعات جنم لیتے رہے۔

---

1 سنن أبي داود، حديث:3931، ومسند أحمد:277/6، وصحيح ابن حبان، رقم: 4055,4054، والسيرة النبوية لابن هشام:308,307/3. 2 حديث القرآن عن غزوات الرسول ﷺ للدكتور محمد بكر آل عابد:317/1.

حضرت جویریہ بنت حارث رضی اللہ عنہا سے عقد کے دور رس مقاصد تھے۔ جو ان کی قوم کے اسلام لانے کی صورت میں سامنے آئے۔ ان کے ساتھ عقد سے رسول اللہ ﷺ کا مقصد یہی تھا کہ آپ کو ان کی قوم کے اسلام لانے کی امید تھی۔ یوں مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہوا اور اسلام کو مزید عزت ملی۔ اسلام کے لیے یہ بڑی نتیجہ خیز مصلحت تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس عقد مبارک کے ذریعے اس مصلحت کا حصول آسان کر دیا۔ علاوہ ازیں جو مقاصد مطلوب تھے انھیں پورا فرمایا۔ جویریہ رضی اللہ عنہا اور ان کے والد اسلام لائے تو ان کے ساتھ ہی قبیلہ بھر مسلمان ہو گیا۔ یوں اس عقد مبارک سے اسلام اور مسلمانوں کو برکت و قوت ملی اور دیگر مادی وسائل بھی میسر آئے۔[1]

حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا اب سید المرسلین کی زوجہ محترمہ اور ام المؤمنین تھیں۔ موصوفہ رسول اللہ ﷺ کی جو سنتیں یاد کرتیں ان پر عمل پیرا ہوتیں۔ بڑی عبادت گزار، پرہیزگار، تقویٰ شعار، دین کے معاملات کی سمجھ رکھنے والی، صاف دل اور روشن دماغ خاتون تھیں۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ سے بہت محبت کرنے والی اور مسلمانوں کی انتہائی خیر خواہ تھیں۔ احادیث نبوی کی عظیم راویہ ہیں۔ مخزن رشد و ہدایت اور منبع وحی سے حقائق دین نقل کرتیں۔ جلیل القدر صحابۂ کرام نے آپ سے حدیث روایت کی ہے۔[2]

ابن عباس، عبید بن سباق، کریب مولیٰ ابن عباس، مجاہد اور ابو ایوب یحییٰ بن مالک ازدی رضی اللہ عنہم نے ام المومنین جویریہ رضی اللہ عنہا سے روایات نقل کی ہیں۔ مسند بقی بن مخلد میں آپ کے واسطے سے سات روایات مرقوم ہیں جن میں سے چار روایات سنن میں ہیں۔[3]

صحیح بخاری میں ایک اور صحیح مسلم میں دو روایات ہیں۔ ام المؤمنین جویریہ رضی اللہ عنہا کی روایات میں جمعہ کو روزہ کے ساتھ خاص نہ کرنے کی روایت،[4] دعا کے باب میں تسبیح

---

1 صور و عبر من الجهاد النبوي في المدينة للدكتور محمد فوزي فيض الله، ص:200,199.

2 محمد رسول الله ﷺ لصادق عرجون: 250/4. 3 دورالمرأة في خدمة الحديث لآمال قرداش، ص: 88. 4 صحيح البخاري، حديث: 1986، ومسند أحمد:324/6.

(سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ، عَدَدَ خَلْقِهٖ وَرِضَا نَفْسِهٖ......) کے ثواب کے متعلق ایک حدیث [1] اور زکاۃ کے باب سے متعلقہ روایات میں نبی مکرم ﷺ کے لیے ہدیے کی اباحت (اگرچہ ہدیہ دینے والے کو وہ ہدیہ خود صدقے میں ملا ہو) [2] کی روایات موجود ہیں۔ آپ نے غلام آزاد کرنے کے متعلق بھی ایک روایت بیان کی ہے۔ [3]

ان سات احادیث کے ذریعے سے ام المؤمنین جویریہ بنت حارث رضی اللہ عنہا نے اپنا نام روایات کی دنیا میں ہمیشہ کے لیے زندۂ جاوید کر لیا ہے تاکہ صحبت نبوی اور ام المؤمنین کے شرف کے ساتھ حتی المقدور آپ ﷺ کی سنتوں کی تبلیغ کرنے کی فضیلت بھی حاصل ہو۔ [4]

ام المؤمنین جویریہ بنت حارث رضی اللہ عنہا پابندی اور کثرت سے اللہ کا ذکر کرنے والی، پرہیزگار خاتون تھیں۔ ام المؤمنین جویریہ خود اپنا واقعہ بیان کرتی ہیں: ''رسول اللہ ﷺ صبح سویرے ان کے ہاں سے نکلے، آپ ﷺ نے صبح کی نماز پڑھی تو وہ مصلے پر تھیں۔ آپ ﷺ چاشت کے وقت واپس تشریف لائے تو دیکھا کہ وہ وہیں بیٹھی تھیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: «مَازِلْتِ عَلَى الْحَالِ الَّتِي فَارَقْتُكِ عَلَيْهَا؟» ''جب سے میں گیا ہوں کیا اسی حالت میں ہو؟'' جویریہ رضی اللہ عنہا نے جواب دیا: ''جی ہاں!'' آپ ﷺ نے فرمایا: «لَقَدْ قُلْتُ بَعْدَكِ أَرْبَعَ كَلِمَاتٍ، ثَلَاثَ مَرَّاتٍ، لَوْ وُزِنَتْ بِمَا قُلْتِ مُنْذُ الْيَوْمِ لَوَزَنَتْهُنَّ: سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ عَدَدَ خَلْقِهٖ وَرِضَا نَفْسِهٖ، وَزِنَةَ عَرْشِهٖ، وَمِدَادَ كَلِمَاتِهٖ»

''میں نے تمھارے بعد تین بار چار کلمات کہے ہیں اگر ان کلمات کا موازنہ ان کلمات کے ساتھ کیا جائے جو تم نے صبح سے اب تک کہے ہیں تو میرے کہے کلمات یقیناً بھاری ہوں گے۔ وہ کلمات یہ ہیں: «سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ، عَدَدَ خَلْقِهٖ، وَرِضَا نَفْسِهٖ،

---

1 صحيح مسلم، حديث: 2726، ومسند أحمد: 324/6، یہ حدیث چند سطور بعد آرہی ہے۔
2 صحيح مسلم، حديث: 1073، ومسند أحمد: 429/6. 3 السنن الكبرىٰ للنسائي: 23/5.
4 دور المرأة في خدمة الحديث لآمال قرداش، ص: 89,88.

وَزِنَةَ عَرْشِهِ، وَمِدَادَ كَلِمَاتِهِ»[1]

ام المؤمنین جویریہ رضی اللہ عنہا نے 50ھ اور بعض کے بقول 56ھ میں وفات پائی۔[2]

غزوۂ بنو مصطلق میں منافقین کی انصار و مہاجرین کو باہم لڑانے کی کوشش

غزوۂ بنومصطلق میں منافقین بھی خاصی تعداد میں شریک ہوئے۔ اس سے پہلے کی جنگوں میں وہ اکثر پیچھے رہتے تھے۔ اس غزوے میں انھیں مسلمانوں کی فتح نظر آرہی تھی۔ یوں وہ غنیمت کے لالچ میں ساتھ ہو لیے۔[3]

مریسیع کے چشمے پر پہنچے تو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف منافقین کا کینہ ظاہر ہو گیا۔ اسلام کو جہاں بھی فتح ملتی منافقین مارے غیظ و غضب کے جل بھن جاتے۔ وہ منتظر رہتے تھے کہ مسلمان شکست خوردہ ہوں تاکہ ان کے سینے ٹھنڈے ہوں۔ مگر جب مریسیع میں بھی مسلمان فتح سے ہمکنار ہوئے تو منافقین نے مہاجرین و انصار کے درمیان جاہلی تعصب کو ہوا دینے کی کوشش کی، تاہم وہ بری طرح ناکام ہوئے۔ تب انھوں نے رسول اللہ ﷺ کو اور آپ کے اہل بیت کو اذیت دینی چاہی۔ انھوں نے واقعہ ''اِفک'' گھڑا اور انتہائی مہلک نفسیاتی جنگ بھڑکائی۔ آئیے یہ واقعہ زید بن ارقم رضی اللہ عنہ کی زبانی سنتے ہیں۔ وہ اس کے عینی شاہد تھے۔[4]

حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں ایک غزوے میں شریک تھا۔ میں نے عبداللہ بن ابی کی آواز سنی۔ وہ کہہ رہا تھا: ''تم ان لوگوں کو کچھ مت دو جو رسول اللہ (ﷺ) کے ساتھ ہیں یہاں تک کہ وہ آپ ﷺ کو چھوڑ کر بھاگ نکلیں۔ اور یقیناً اگر ہم مدینہ

---

1 صحيح مسلم، حديث: 2726، وسنن أبي داود، حديث: 1503، ومسند أحمد: 258/1، والسنن الكبرىٰ للنسائي، رقم:1277و9912. 2 الطبقات لابن سعد: 121/8، وتاريخ خليفة بن خياط، ص:234. 3 حديث القرآن عن غزوات الرسول للدكتور محمد بكر آل عابد:318/1. 4 السيرة النبوية الصحيحة للعمري:408/2.

واپس گئے تو مدینہ کے معزز افراد وہاں کے ذلیل لوگوں کو نکال باہر کریں گے۔'' زید بن ارقم رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میں واپس آیا اور اپنے چچا جان کو یہ بات بتائی۔ انھوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بتا دی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بلا کر پوچھا تو میں نے تصدیق کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن ابی اور اس کے ساتھیوں کو بلا بھیجا۔ انھوں نے قسم کھائی کہ ہم نے ایسا کچھ نہیں کہا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن ابی کو سچا اور مجھے جھوٹا قرار دیا۔ مجھے ایسا سخت صدمہ ہوا کہ کبھی نہ ہوا تھا۔ میں گھر میں بیٹھ گیا۔ چچا نے کہا: ''کیا تم نے یہی چاہا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمھیں جھٹلاتے اور تم سے ناراض ہوتے۔'' اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی:

﴿اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ ۘ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ ؕ وَ اللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ۝﴾

''(اے نبی!) جب منافق آپ کے پاس آتے ہیں تو وہ کہتے ہیں: ہم شہادت دیتے ہیں کہ بے شک آپ اللہ کے رسول ہیں اور اللہ جانتا ہے کہ بے شک آپ اس کے رسول ہیں۔ اور اللہ شہادت دیتا ہے کہ یقیناً منافق البتہ جھوٹے ہیں۔''[1]

یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بلا بھیجا۔ یہ فرمان الٰہی سنایا اور فرمایا: «إِنَّ اللّٰهَ قَدْ صَدَّقَكَ يَا زَيْدُ!» ''زید! اللہ تعالیٰ نے تمھیں سچا قرار دیا ہے۔''[2]

مریسیع کے چشمے پر پیش آمدہ واقعہ جس نے منافقین کی طرف سے اسلامی وحدت پارہ پارہ کرنے اور جاہلی تعصب بیدار کرنے کی صورت اختیار کر لی تھی، اس کے ایک اور عینی شاہد حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم ایک غزوے میں شریک تھے۔ ایک مہاجر نے کسی انصاری کے لات مار دی۔ انصاری نے دہائی دی: ''ہائے انصار!'' مہاجر نے بھی پکارا: ''ہائے مہاجرین!'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا تو فرمایا: «مَا بَالُ دَعْوَى الْجَاهِلِيَّةِ؟»

1 المنافقون 1:63. 2 صحيح البخاري، حديث: 4900، وصحيح مسلم، حديث: 2772، والسيرة النبوية الصحيحة للعمري: 408/2.

''یہ جاہلیت کی پکار کیا ہے؟'' لوگوں نے بتایا کہ ایک مہاجر نے کسی انصاری کے لات ماری ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: «دَعُوهَا فَإِنَّهَا مُنْتِنَةٌ» ''چھوڑو! یہ گندی بات ہے۔'' عبداللہ بن ابی کو اس کی خبر ہوئی تو کہنے لگا: ''کیا واقعی (مہاجرین نے) ایسا کیا ہے؟ اللہ کی قسم! ہم مدینہ لوٹیں گے تو ہم میں سے عزت والا ذلیل کو وہاں سے نکال باہر کرے گا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! مجھے اس منافق کی گردن مارنے کی اجازت دیجیے۔ فرمایا: «دَعْهُ، لَا يَتَحَدَّثُ النَّاسُ أَنَّ مُحَمَّدًا يَقْتُلُ أَصْحَابَهُ» ''رہنے دو! لوگ کہیں گے کہ محمد (ﷺ) اپنے ساتھیوں کو قتل کرتا ہے۔''[1]

ایک روایت میں ہے کہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بھی وہیں تھے۔ انھوں نے کہا: ''عباد بن بشر رضی اللہ عنہ کو حکم دیجیے کہ جا کر اسے قتل کر دے۔'' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «فَكَيْفَ يَا عُمَرُ! إِذًا تَحَدَّثَ النَّاسُ أَنَّ مُحَمَّدًا يَقْتُلُ أَصْحَابَهُ؟ لَا وَلٰكِنْ أَذِّنْ بِالرَّحِيلِ» ''اے عمر! یہ کیونکر ہو سکتا ہے تب تو لوگ کہیں گے محمد (ﷺ) اپنے ساتھیوں کو قتل کرتا ہے۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ ہاں! کوچ کا اعلان کر دو۔'' اس وقت آپ عموماً کوچ نہیں کیا کرتے تھے مگر لوگ یہ اعلان سن کر کوچ کر گئے۔[2]

ابن ابی کو جب معلوم ہوا کہ زید بن ارقم نے جو باتیں سنی تھیں وہ رسول اللہ ﷺ کو پہنچا دی ہیں تو وہ دوڑا دوڑا آیا اور قسم کھائی کہ جو زید نے آپ کو بتایا ہے میں نے ایسا ہرگز نہیں کہا۔ ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ موقع پر موجود انصار صحابہ نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! ممکن ہے لڑکے کو ابن ابی کی بات سننے میں غلطی لگی ہو۔'' آپ ﷺ چل پڑے تو اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ آپ ﷺ سے ملے۔ سلام کیا اور عرض کیا: ''اے اللہ کے نبی! آپ شام کے ناپسندیدہ وقت چل پڑے ہیں۔ ایسے وقت تو آپ سفر نہیں کیا کرتے؟''

1 صحیح البخاري، حدیث: 3518، وصحیح مسلم، حدیث: 2584، والسیرة النبویة الصحیحة للعمري: 409/2. 2 السیرة النبویة لابن هشام: 303/3، وتفسیر الطبري: 116,115/28.

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «أَوَمَا بَلَّغَكَ مَا قَالَ صَاحِبُكُمْ؟» ''کیا تمھارے ساتھی نے جو کہا ہے وہ تمھیں معلوم نہیں؟''

اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! کون سا ساتھی؟''

فرمایا: «عَبْدُاللّٰهِ بْنُ أُبَيٍّ» ''عبداللہ بن ابی۔''

عرض کیا: ''کیا کہا ہے اس نے؟''

فرمایا: «زَعَمَ إِنْ رَّجَعَ إِلَى الْمَدِينَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْأَعَزُّ مِنْهَا الْأَذَلَّ» ''اس کا خیال ہے کہ جب وہ واپس مدینہ لوٹے گا تو جو معزز ہے وہ ذلیل کو نکال باہر کرے گا۔''

حضرت اسید رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ''آپ چاہیں گے تو اللہ کی قسم! خود آپ ہی اسے مدینہ سے نکال دیں گے، اے اللہ کے رسول! آپ صاحب عزت ہیں۔ ذلیل تو وہی ہے۔'' پھر عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! اس سے نرمی برتیے۔ اللہ کی قسم! اللہ تعالیٰ آپ کو ہمارے پاس اس وقت لایا جب قوم اس کے لیے موتی پرو رہی تھی کہ اسے (بادشاہی کا) تاج پہنا دیں۔ وہ سمجھتا ہے کہ آپ نے اس کی بادشاہت چھین لی ہے۔''

رسول اللہ ﷺ تمام لوگوں کے ساتھ دن بھر چلتے رہے، یہاں تک کہ شام ہو گئی، پھر رات بھر چلے اور صبح ہو گئی۔ دوسرے دن کا بیشتر حصہ گزر گیا اور دھوپ نے لوگوں کو پریشان کر دیا تو آپ ﷺ نے لوگوں کو ٹھہرایا۔ سب لوگ تھکاوٹ سے چور تھے۔ اترتے ہی نیند آ گئی۔ ایسا آپ ﷺ نے اس لیے کیا تھا کہ لوگ عبداللہ بن ابی کی بات پر چہ میگوئیاں نہ کریں۔ عبداللہ بن ابی اور دیگر منافقوں کے بارے میں سورت نازل ہوئی۔ سورت کے نازل ہوتے ہی رسول اللہ ﷺ نے زید بن ارقم کا کان پکڑا اور فرمایا: «هٰذَا الَّذِي أَوْفَى اللّٰهُ بِأُذُنِهِ» ''یہی ہے وہ جس کی کان سنی بات کو اللہ تعالیٰ نے سچ قرار دیا ہے۔''[1]

1 السيرة النبوية لابن هشام: 305/3، وتفسير الطبري: 116/28.

دروس و نصیحتیں: سیرت نبوی کے اس واقعے سے ہمیں کئی سبق ملتے اور کئی حکمتوں کا پتا چلتا ہے۔ ان میں سے چند ایک درج ذیل ہیں:

❁ اپنی صفوں کو متحد رکھنا اور سیاسی شہرت کو داغدار ہونے سے بچانا: رسول اللہ ﷺ نے عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی پیشکش کے جواب میں فرمایا تھا:

''عمر! تب کیا ہوگا جب لوگ کہیں گے کہ محمد (ﷺ) اپنے ساتھیوں کو قتل کر دیتا ہے؟''

رسول اللہ ﷺ کے فرمان گرامی سے یہ سبق ملتا ہے کہ جہاں تک بس چلے سیاسی شہرت کو داغدار ہونے سے بچانا چاہیے۔ ایک طرف لوگ یہ کہیں کہ محمد ﷺ کے ساتھی آپ ﷺ سے بہت محبت کرتے ہیں جیسا کہ ایک بڑے سپہ سالار ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی زبانی اس کی تصدیق بھی ہوگئی انھوں نے اسلام قبول کرنے سے پہلے کہا تھا:

«مَارَأَيْتُ أَحَدًا يُحِبُّ أَحَدًا كَحُبِّ أَصْحَابِ مُحَمَّدٍ مُّحَمَّدًا»

''میں نے کسی کو کسی سے اتنی محبت کرتے نہیں دیکھا جتنی محبت محمد ﷺ کے ساتھی خود اُن سے کرتے ہیں۔''

دوسری طرف لوگ یہ کہیں کہ محمد (ﷺ) اپنے ساتھیوں کو قتل کر دیتا ہے، ان دونوں باتوں کے تاثر میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اور بلاشبہ اگر ایسا ہو جاتا یا ایسی کوئی بات پھیل جاتی تو دشمن کو مسلمانوں کی صفوں میں گھسنے کا موقع مل جاتا۔ مسلمانوں کے دشمن تھے بھی اسی کوشش میں، تاہم رسول اللہ ﷺ کے حکیمانہ طرز عمل نے انھیں مایوس کر دیا اور وہ ایسا کوئی موقع نہیں پا سکے۔[1]

مسلمانوں کی صفیں توڑنے اور جاہلی تعصب کو ہوا دینے کے سلسلے میں ابن ابی نے جو کوشش کی تھی رسول اللہ ﷺ نے اس کے جواب میں درج ذیل نہایت مثبت اقدامات کیے:

[1] التربية القيادية للدكتور الغضبان:3/463.

٭ رسول اللہ ﷺ تمام لوگوں کے ساتھ دن بھر چلتے رہے، پھر رات بھر چلتے رہے۔ اگلے دن کا بیشتر حصہ گزر گیا اور دھوپ نے لوگوں کو پریشان کر دیا تو آپ ﷺ نے پڑاؤ کیا۔ سب لوگ تھکاوٹ سے چور تھے۔ پڑاؤ ڈالتے ہی سو گئے۔[1]

آپ ﷺ نے صاف ستھری سیاست اور انتہائی دانش مندی کے ساتھ فتنے کو جڑ سے اکھاڑ دیا اور لوگوں کو ابن ابی کی بات پر چہ میگوئیاں کرنے کا موقع نہ دیا۔

٭ رسول اللہ ﷺ کو مسلمانوں کی وحدت کا تحفظ مقصود تھا۔ یوں آپ ﷺ نے عبداللہ ابن اُبی کی سازش کو بزور بازو ناکام کرنے کی کوشش نہیں کی۔ چند فریب خوردہ مسلمان اس کے طرفدار بھی تھے۔ آپ ﷺ عبداللہ بن ابی کو سزا دیتے تو ان بیوقوفوں کی رگ حمیت پھڑک اٹھتی اور وہ بے سوچے سمجھے اٹھ کھڑے ہوتے۔ نتیجتاً اسلامی وحدت پارہ پارہ ہو جاتی۔ اسلام اور مسلمانوں کو اس سے کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ یہ تو حکمت سے بھرپور شرعی سیاست تھی۔ اس کی مدد سے تعصب کے امراض کا پوری احتیاط، دانش مندی اور دور اندیشی سے علاج کیا گیا۔ حکمت و سیاست اور معاملات کے حسن تدبیر کی یہ خوبی اس امر کی دلیل ہے کہ آپ ﷺ اللہ کے سچے نبی اور رسول تھے۔ معاملات میں بھی امت کو آپ ﷺ کی پیروی کرنی چاہیے۔[2]

منافقین کے سرغنے سے نرمی برتنے اور درگزر کرنے کا نتیجہ بہت اچھا نکلا۔ اب ابن ابی کوئی شرارت کرتا تو اس کی قوم کے لوگ بھی اسے ڈانٹ پلاتے اور سرزنش کرتے تھے۔ وہ آپ ﷺ سے اس کے قتل کی اجازت مانگتے لیکن آپ ﷺ انکار کرتے اور درگزر فرماتے۔ آپ ﷺ نے اسی سیاسی پالیسی کی حکمت بیان کرتے ہوئے عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

---

1 السيرة النبوية لأبي شهبة: 255/2. 2 فقه السيرة للبوطي، ص: 409، وصور و عبر من الجهاد النبوي للدكتور فوزي فيض الله، ص: 202.

«كَيْفَ تَرَىٰ يَا عُمَرُ؟ أَمَا وَاللّٰهِ! لَوْ قَتَلْتُهُ يَوْمَ قُلْتَ لِي لَأُرْعِدَتْ لَهُ أُنُوفٌ لَّوْ أَمَرْتُهَا الْيَوْمَ لَقَتَلَتْهُ»

''عمر! اب بتاؤ؟ اللہ کی قسم! اگر میں اس روز اسے قتل کر دیتا جب تم نے کہا تھا تو اس کے لیے ان لوگوں کی ناک بھوں ضرور چڑھ جاتی جنھیں اگر آج اس کے قتل کا حکم دوں تو وہ خود اسے قتل کر دیں گے۔''

اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ''اللہ کی قسم! مجھے معلوم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان میری بات سے کہیں زیادہ بابرکت ہے۔''[1]

❁ **اتحاد کے لیے نرمی اور حسن سلوک کا حکم:** عبداللہ بن ابی کے بیٹے عبداللہ رضی اللہ عنہ بڑے مخلص مومن تھے۔ انھیں جب ان واقعات کا اور ان کے متعلق سورت کے نزول کا علم ہوا تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! مجھے پتا چلا ہے کہ آپ ابن ابی کے قتل کا ارادہ رکھتے ہیں۔ آپ کہتے ہیں تو میں خود اس کا سر کاٹ کر آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ اللہ کی قسم! سارے خزرج کو معلوم ہے کہ قبیلے کا کوئی آدمی مجھ سے بڑھ کر اپنے والد کا خدمت گار نہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ آپ نے کسی اور کو اس کے قتل کا حکم دیا تو شاید میں برداشت نہ کر پاؤں۔ عبداللہ بن ابی کے قاتل کو لوگوں میں چلتا پھرتا دیکھوں گا تو کافر کے بدلے مسلمانوں کو قتل کر بیٹھوں اور جہنم کا مستحق ٹھہروں!''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «بَلْ نَتَرَفَّقُ بِهِ وَنُحْسِنُ صُحْبَتَهُ مَا بَقِيَ مَعَنَا»

''بلکہ ہم اس سے نرمی کا برتاؤ کریں گے اور جب تک وہ ہمارے ساتھ ہے، اس سے اچھا سلوک کریں گے۔''[2]

---

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 305/3، وتفسير الطبري: 117,116/28. [2] السيرة النبوية لابن هشام: 305/3، والمعجم الأوسط للطبراني، رقم: 231، ومسند البزار، رقم: 2708، ومجمع الزوائد: 318/9، وتفسير الطبري: 116/28.

مسلمان مدینہ منورہ کے قریب پہنچے تو ابن ابی کے بیٹے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ باپ کے راستے میں کھڑے ہوگئے اور کہنے لگے: ''رک جائیے۔ اللہ کی قسم! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت کے بغیر آپ یہاں سے آگے نہیں بڑھ سکتے۔'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے۔ ابن ابی نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت طلب کی تو آپ نے اجازت دے دی۔ تب عبداللہ رضی اللہ عنہ نے اسے مدینہ جانے دیا۔

* **ایمان کی بلند ترین مثال:** باپ کے متعلق عبداللہ رضی اللہ عنہ کا مضبوط موقف، اللہ اور اس کے رسول کے لیے اخلاص، اللہ اور اس کے رسول کی محبت و رضا کو باپ کی محبت و رضا پر مقدم کرنا عبداللہ رضی اللہ عنہ کے ایمان کامل کی دلیل ہے۔ نیک بخت بیٹے نے باپ کی محبت قربان کر کے مثال قائم کر دی۔ اس کا جواب بھی کشادہ دل اور خلق عظیم کے مالک نے درگزر، شفقت اور حسن سلوک کے ساتھ یوں دیا:

> ''بلکہ ہم اس کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کریں گے اور جب تک وہ ہمارے ساتھ ہے اس سے اچھا سلوک کریں گے۔''

ایسے درگزر کے کیا کہنے!! عظمت نبوی کے جاہ وجلال کی کیا بات ہے![1]

* **جاہلیت کے تعصب کی بیخ کنی:** مکروہ تعصب جسے ہم جاہلیت سے تعبیر کرتے ہیں، ایک قبیلے یا ایک خاندان تک محدود نہیں رہتا بلکہ کسی ایک صفت میں مشترک ہونے اور تعاون کرنے پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ وہ اس صفت سے متصف تمام لوگوں کی مدد کرتے ہیں، خواہ وہ حق پر ہوں یا باطل پر۔ ان کی دوستی اسی قدرِ مشترک کی بنیاد پر قائم ہوتی ہے۔ جب ایک مہاجر نے ایک انصاری کو مارا تو انصاری نے فوراً دہائی دی: ''ہائے انصار!'' اور مہاجر نے بھی پکارا: ''ہائے مہاجرین!'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سن کر فرمایا: ''یہ جاہلیت کی پکار کیسی ہے؟'' لوگوں نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! ایک مہاجر نے ایک انصاری

1 محمد رسول اللہ لصادق عرجون: 163/3.

کے لات ماردی ہے۔'' آپ ﷺ نے فرمایا:

''اسے چھوڑو۔ یہ گندی (اور بدبودار) بات ہے۔''

رسول اللہ ﷺ نے ایسی پکار کو ناپسند جانا کیونکہ اس سے تعصب کا اظہار ہوتا تھا، اگرچہ آواز دینے والے نے جو کلمہ استعمال کیا تھا، یعنی ''مہاجرین''، ''انصار'' اسے خود قرآن مجید نے بھی استعمال کیا ہے۔ مہاجر نے مدد کے لیے مہاجرین کو آواز دی، حالانکہ خود اس نے تو لات ماری تھی، گویا یوں پکارنے سے اس کا مقصود ان کی مدد حاصل کرنا تھا کیونکہ وہ خود اور جنھیں ندا دی گئی تھی وہ ''مہاجر'' ہونے کے لحاظ سے ایک تھے۔ انصاری نے مدد کے لیے انصار کو پکارا کیونکہ وہ اور دیگر انصار ''انصار'' کے مفہوم میں مشترک تھے۔ اگر مدد لینی ہی تھی تو اسے چاہیے تھا کہ تمام مسلمانوں کو پکارتا۔ رسول اللہ ﷺ کا اصل مقصود یہ تھا کہ ہر قسم کے تعصب کو دور بھگا دیا جائے، خواہ وہ قبیلے کے ایک ہونے کی بنا پر ہو یا کسی اور بنا پر، مثلاً: شہر، مذہب، گروہ، خاندان، رنگ، خون یا جنس کے اشتراک کی بنا پر ہو۔ اس کے بالمقابل دوستی اور ایک دوسرے کی مدد اخوت اسلامی کی قدر مشترک پر ہونی چاہیے جسے خود اللہ تعالیٰ نے قائم فرمایا اور مسلمانوں میں راسخ کرنے کا حکم فرمایا تھا، چنانچہ فرمایا: ﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ﴾ ''مومنین تو بھائی بھائی ہی ہیں۔''[1]

امداد باہمی نیکی اور تقوے کی بنیاد پر ہونی چاہیے نہ کہ گناہ اور زیادتی کی بنیاد پر مطلب یہ ہے کہ انھیں چاہیے اہل حق کی مدد کریں اور انھی کا ساتھ دیں نہ کہ ظالم اور حق سے تجاوز کرنے والے کا۔[2]

رسول اللہ ﷺ نے واضح طور پر فرما دیا کہ تعصب پروری جاہلیت کی روایت ہے۔ ارشاد نبوی ہے: «اُنْصُرْ أَخَاكَ ظَالِماً أَوْ مَظْلُوماً»

''اپنے بھائی کی مدد کر خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔'' ایک شخص نے عرض کیا: ''اگر وہ

1 الحجرات 49:10. 2 المستفاد من قصص القرآن لعبدالكريم زيدان: 2/302,301.

مظلوم ہے تو مدد کروں گا لیکن وہ ظالم ہے تو کیسے مدد کروں؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: «تَحْجُزُهُ۔ أَوْ تَمْنَعُهُ۔ مِنَ الظُّلْمِ فَإِنَّ ذٰلِكَ نَصْرُهُ» ''اسے ظلم سے روکو یہی اس کی مدد ہے۔''[1]

رسول اللہ ﷺ نے ''مدد کر اس کی ظالم ہو یا مظلوم۔'' فرما کر حق اور انصاف کے معاملات میں ایک دوسرے کی مدد کرنے کا حکم دیا ہے اور زمانۂ جاہلیت کے مفہوم کی نفی کر دی ہے۔ داعیانِ اسلام، علماء وطلبہ اور فقہاء کا فرض ہے کہ تعصب سے کنارہ کشی کریں اور رسول اللہ ﷺ کے حکم کو بجالاتے ہوئے مسلمانوں کو بھی اسے ترک کرنے کی دعوت دیں۔ یہ کام مشکل ضرور ہے مگر ناممکن نہیں اور اس کی غیر معمولی اہمیت کے پیش نظر اہل علم پر فرض ہے کہ اسے دلوں سے اکھاڑ پھینکنے کے لیے مقدور بھر طاقت صرف کر دیں۔[2]

غزوۂ بنومصطلق کے بعد اسلامی معاشرے کے لیے قرآنی رہنمائی

مسلمان غزوۂ بنومصطلق سے واپس آرہے تھے کہ سورۂ منافقون نازل ہوئی۔ امام ترمذی رحمہ اللہ کی روایت میں ہے کہ صبح ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے سورۂ منافقون کی تلاوت فرمائی۔[3]

اس سورت نے منافقوں کے متعلق بڑی تفصیل بیان کی ہے۔ ان سے متعلق کئی واقعات و اقوال اور ان کے معاملات اور ان کے جھوٹے بیانات کا ذکر کر کے انھیں رسوا کیا گیا ہے۔ سورت کے اختتام پر مومنوں کو دنیا کی زیب و زینت میں مشغول ہونے سے منع کیا اور انفاق فی سبیل اللہ کا حکم دیا ہے۔ سورۂ منافقون کا مطالعہ کرنے سے کئی ایک مقاصد کا پتا چلتا ہے۔ ان میں سے چند ایک یہ ہیں:

سورت نے ابتدا میں منافقوں کے اخلاق بیان کیے ہیں، جھوٹ بولنے کی قباحت کا تذکرہ کیا اور ان کی عام حالت کی عکاسی کی ہے۔

1 صحيح البخاري، حديث:6952، وجامع الترمذي، حديث:2255، ومسند أحمد: 201/3.

2 المستفاد من قصص القرآن لعبدالكريم زيدان: 302/2. 3 جامع الترمذي، حديث: 3313.

ان کی مذموم صفات کے تذکرے سے سورت کی ابتدا ہو رہی ہے۔ خاص طور پر ان کا دعوائے ایمان میں جھوٹ بولنا، جھوٹی قسمیں کھانا، بزدلی کا مظاہرہ کرنا، نبی اکرم ﷺ اور مومنوں کے خلاف سازشیں کرنا اور لوگوں کو اللہ کے دین سے روکنا۔

بعد کی آیات نے ان کی ہٹ دھرمی اور ان کے عناد کا ذکر کیا اور یہ بیان کیا کہ وہ حق کی دعوت دینے والوں کی نافرمانی کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کی نہایت بیہودہ باتیں مفصل بیان کی گئی ہیں۔ خاص طور پر جو انھوں نے غزوہ بنو مصطلق کے موقع پر کی تھیں کہ وہ رسول گرامی قدر ﷺ اور دیگر مومنوں کو مدینہ سے نکال دیں گے اور عزت صرف انھی کو حاصل ہے۔[1]

مومنوں کو دنیا کی زینت میں مشغولیت اور منافقین کی مشابہت کے متعلق انتباہ پر سورت کا اختتام ہوتا ہے۔ مومنوں کو زندگی کی فرصت ختم ہونے سے پہلے پہلے صدقہ کر لینے کی ترغیب دی گئی ہے۔ صدقہ ہی تو ایمان بالآخرت کی دلیل ہے۔[2]

آخری آیات اسلامی معاشرے کو اطاعت الٰہی، قراءتِ قرآن، ہمیشہ ذکر الٰہی، نمازوں کی ادائیگی اور تمام فرائض کی بجا آوری کی ترغیب دلاتی ہیں اور اموال میں مشغولیت، حقوق اللہ کو پس پشت ڈال کر گھریلو معاملات میں مشغول ہونے سے باز رہنے کا درس دے رہی ہیں کہ یہ تو منافقین کا کردار ہے۔ انھوں نے بخل ہی کی بنا پر کہا تھا کہ رسول اللہ ﷺ کا ساتھ دینے والوں پر خرچ نہ کرو۔ جو بھی رب تعالیٰ کی اطاعت کے بجائے مال و اولاد میں مشغول ہو گیا وہی خسارہ پانے والا ہے۔

سورت کا اختتام مومنوں کو دنیا کی زینت میں عدم مشغولیت کی ترغیب سے ہوا کہ یہ تو منافقین کے اخلاقِ رذیلہ ہیں۔ اس معاشرے میں اسی طرح کے واقعات رونما ہو رہے

---

1 حديث القرآن عن غزوات الرسول ﷺ للدكتور محمد بكر آل عابد: 327/1. 2 حديث القرآن عن غزوات الرسول ﷺ للدكتور محمد بكر آل عابد: 327/1.

تھے اور یوں مومنوں کی تربیت کا بندوبست بھی ہو رہا تھا۔ قرآن کریم اسلامی معاشرے کی رہنمائی و تعلیم کا فریضہ انجام دے رہا تھا اور رسول اللہ ﷺ اس کی نگرانی فرما رہے تھے۔

واقعۂ افک

منافقین کی طرف سے ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا پر تہمت لگا کر نبی مکرم ﷺ کی عزت داغدار کرنے کی ناکام کوشش کی گئی جو واقعۂ افک کے نام سے مشہور ہے۔ منافقوں نے جاہلی تعصب بیدار کرنے کی کوشش ناکام ہونے پر غزوۂ بنو مصطلق میں واقعہ افک گھڑ لیا۔ نبی مکرم ﷺ کے گھرانے پر بہت بڑی آزمائش ٹوٹ پڑی جس کے پس پردہ آپ ﷺ اور آپ کے پاکیزہ اہل بیت کی پامالی عزت مقصود تھی۔ تمام مؤرخین اور سیرت نگاروں کا اتفاق ہے کہ واقعہ افک غزوۂ بنو مصطلق کے بعد پیش آیا۔ یہی خیال مفسرین اور محدثین کا بھی ہے۔[1]

امام بخاری اور امام مسلم رحمہما اللہ نے یہ واقعہ اپنی اپنی کتاب میں بیان کیا ہے۔ صحیح بخاری میں یہ واقعہ یوں ہے:

خود ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا طریقہ یہ تھا کہ جب آپ ﷺ سفر پر روانہ ہوتے تو اپنی ازواج میں قرعہ ڈالتے۔ قرعہ میں جس زوجہ کا نام نکلتا اس کو سفر میں ساتھ لے جاتے۔ آپ ایک غزوے پر روانہ ہو رہے تھے۔ آپ ﷺ نے قرعہ ڈالا تو قرعہ میرے نام نکلا۔ میں آپ ﷺ کے ہمراہ روانہ ہوئی۔ یہ واقعہ حجاب کا حکم اترنے کے بعد کا ہے۔ میں ہودج (اونٹ پر رکھا جانے والا قبہ نما کپڑوں سے ڈھانپا ہوا کیبن سا جس میں عورتیں سوار ہوتی تھیں) میں سوار تھی۔ ہودج سمیت مجھے (اونٹ

---

[1] مؤرخین اور سیرت نگاروں میں سے واقدی، ذہبی، طبری، ابن سعد اور ابن حزم، جبکہ مفسرین میں سے ابن کثیر، رازی، طبری اور محدثین میں سے ابن حجر اور امام نووی رحمہ اللہ کا اتفاق ہے کہ واقعہ افک غزوۂ بنو مصطلق کے بعد پیش آیا۔

سے) اتارا جاتا تھا۔ رسول اللہ ﷺ جنگ سے فارغ ہو کر واپس روانہ ہوئے تو ہم لوگ مدینہ کے قریب پہنچ گئے۔ ایک رات ایسا اتفاق ہوا کہ کوچ کا حکم دے دیا گیا۔ کوچ کے حکم پر میں اٹھی اور چل کر لشکر سے باہر نکل گئی۔ قضائے حاجت سے فارغ ہوئی اور اپنے ٹھکانے پر واپس آئی تو معلوم ہوا کہ ظفار[1] کے نگینوں کا ہار ٹوٹ کر گر چکا ہے۔ میں اسے تلاش کرنے چلی گئی۔ اتنے میں وہ لوگ آپہنچے جو میرا ہودج اٹھا کر اونٹ پر رکھتے تھے۔ انھوں نے ہودج اٹھا کر اونٹ پر لاد دیا۔ وہ سمجھے کہ میں ہودج میں ہوں۔ اس زمانے میں عورتیں ہلکی پھلکی ہوا کرتی تھیں۔ جو تھوڑا بہت کھانا ملتا تھا اسی سے پیٹ بھر جاتا تھا ویسے بھی میں ان دنوں نوعمر لڑکی تھی۔ یوں ان لوگوں کو ہودج کے ہلکے پن کا کچھ خیال نہ آیا اور قافلہ چل دیا۔ میرا ہار مل گیا۔ جب میں لشکر کے پڑاؤ کی جگہ آئی تو وہاں نہ کوئی بلانے والا تھا نہ جواب دینے والا، پھر میں اسی جگہ چلی گئی جہاں میں پہلے تھی۔ میں نے سوچا کہ جب لشکر کے لوگ مجھ کو نہ پائیں گے تو میری تلاش میں یہیں آئیں گے۔ میں اسی جگہ بیٹھ گئی اور بیٹھے بیٹھے اونگھنے لگی اور مجھے نیند آگئی۔ صفوان بن معطل سلمی رضی اللہ عنہ لشکر کے پیچھے تھے۔ وہ پچھلی رات سے چلے آرہے تھے۔ صبح اس جگہ پہنچے جہاں میں تھی۔ انھیں سوتا ہوا انسان نظر آیا تو وہ میرے پاس آئے۔ انھوں نے حجاب سے قبل مجھے دیکھا تھا، لہٰذا وہ مجھے پہچان گئے۔ انھوں نے انا للّٰہ و انا الیہ راجعون پڑھا تو میں بیدار ہوگئی۔ میں نے اپنی چادر سے چہرہ ڈھانپ لیا۔ اللہ کی قسم! انھوں نے مجھ سے کوئی بات کی نہ میں نے انا للّٰہ و انا الیہ راجعون کے سوا ان کے منہ سے کوئی بات سنی۔ پھر وہ جلدی سے آگے بڑھے اور اپنا اونٹ بٹھایا اور اونٹ کی اگلی ٹانگ پر کھڑے ہوگئے (تاکہ آسانی سے بیٹھا جاسکے) تو میں اونٹ پر سوار ہوگئی۔ وہ اپنی اونٹنی کو آگے سے پکڑے چلتے رہے۔ ہم لشکر میں اس وقت پہنچے جب عین دوپہر کو گرمی کی شدت میں قافلہ پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا۔ اب (الزام

---

[1] ظفار: یمن کے ایک شہر کا نام ہے۔ وہاں کے نگینے سیاہ ہوتے ہیں مگر ان میں کچھ کچھ سفیدی بھی ہوتی ہے۔

لگا کر) تباہ ہونے والے تباہ ہوگئے۔ اس معاملے (واقعۂ افک) کا سرغنہ ابن ابی تھا۔

مدینہ منورہ میں افواہ کا پھیلنا

بہر حال ہم مدینہ پہنچے۔ وہاں پہنچ کر میں بیمار ہوگئی۔ ایک مہینا بیمار رہی۔ لوگ جھوٹا قصہ جوڑنے والوں کی باتوں کا چرچا کرتے رہے لیکن مجھے کچھ خبر نہ ہوئی۔ مجھے صرف ایک وہم سا ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کی وہ مہربانی جو اس سے پہلے بیمار ہونے پر میں پاتی تھی اب وہ نہیں تھی۔ فقط اتنا تھا کہ رسول اللہ ﷺ تشریف لاتے اور پوچھتے: «کَیْفَ تِیکُمْ؟» ''کیسی ہو؟'' پھر چلے جاتے۔ اس سے مجھے شک سا ہوا مگر مجھے اس طوفان کی کوئی خبر نہیں تھی۔ ابھی میں ناتواں ہی تھی کہ میرے ساتھ ام مسطح مناصع کی طرف گئی جو جائے قضائے حاجت تھی۔ ہماری عادت تھی کہ ہم رات ہی کو قضائے حاجت کے لیے باہر جاتی تھیں۔ یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب گھروں میں ایسا کوئی انتظام نہیں تھا۔ اور جیسے پہلے زمانے کے لوگوں کی عادت تھی ہم بھی اسی طرح قضائے حاجت کے لیے ویرانے میں جاتی تھیں۔ دراصل گھروں کے قریب لیٹرین بنانے سے بہت بدبو آتی تھی۔ خیر میں اور ام مسطح (جو ابو رہم بن عبد مناف کی بیٹی تھیں اور ان کی ماں صخر بن عامر کی بیٹی اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خالہ تھیں) دونوں حاجت سے فراغت کے بعد گھر آرہی تھیں کہ ام مسطح کا پاؤں چادر میں الجھ کر پھسلا تو وہ کہنے لگیں: ''مسطح برباد ہو'' میں نے کہا: ''غلط کہتی ہیں۔ مسطح بدری صحابی ہیں۔ آپ انھیں کوس رہی ہیں؟'' انھوں نے کہا: ''اری پگلی! تو نے مسطح کی باتیں نہیں سنیں؟'' میں نے پوچھا: ''کون سی باتیں؟'' تو انھوں نے مجھے اہل افک کے بارے میں بتایا۔ یہ سن کر میری بیماری بڑھ گئی اور میں اپنے حجرے میں لوٹ آئی۔ آپ ﷺ تشریف لائے اور سلام کر کے پوچھا: «کَیْفَ تِیکُمْ؟» ''اب کیسی ہو؟'' میں نے عرض کیا: ''آپ مجھے اجازت دیں تو میں اپنے ماں باپ کے پاس چلی جاؤں؟'' میرا

مطلب یہ تھا کہ ان سے اس بارے میں تحقیق کروں گی۔ رسول اللہ ﷺ نے مجھے اجازت دے دی۔ میں اپنے والدین کے ہاں چلی گئی۔ میں نے والدہ سے پوچھا: ''اماں جان! یہ لوگ کیا باتیں کر رہے ہیں؟'' انھوں نے کہا: ''بیٹی رنج مت کر۔ اللہ کی قسم! بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ کسی مرد کے پاس کوئی خوب صورت عورت ہو جس سے وہ محبت کرتا ہو اور اس کی سوکنیں بھی ہوں اور وہ اس عورت کے متعلق بے جا باتیں نہ کریں۔'' میں نے کہا: ''سبحان اللہ! کیا واقعی لوگوں نے ایسی باتیں کی ہیں؟'' میں رات بھر روتی رہی، صبح ہو گئی مگر آنسو تھمے نہ نیند آئی۔

وحی کی تاخیر پر رسول اللہ ﷺ کا بعض صحابہ رضی اللہ عنہم سے مشورہ

چونکہ وحی اترنے میں دیر ہو گئی تھی لہٰذا آپ ﷺ نے حضرت علی اور اسامہ بن زید رضی اللہ عنہم کو بلوایا تاکہ مجھے چھوڑنے کے متعلق ان سے مشورہ لیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما نے آپ ﷺ کو وہی مشورہ دیا جو وہ جانتے تھے کہ آپ ﷺ کی اہلیہ اس الزام سے بری ہیں۔ انھوں نے کہا: ''اے اللہ کے رسول! آپ کے گھر والے ہیں اور ہم ان کے متعلق اچھی معلومات ہی رکھتے ہیں۔''

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: ''اے اللہ کے رسول! آپ پر اللہ تعالیٰ نے کوئی تنگی نہیں رکھی اور بہت سی عورتیں موجود ہیں۔ آپ اگر لونڈی (بریرہ) سے پوچھیں گے تو وہ سچ بتائے گی۔'' آپ ﷺ نے بریرہ کو بلوایا اور فرمایا: «أَيْ بَرِيرَةُ! هَلْ رَأَيْتِ مِنْ شَيْءٍ يُرِيبُكِ؟» ''بریرہ! تو نے عائشہ میں کوئی ایسی بات دیکھی جس سے تجھ کو کوئی شبہ ہوا ہو؟'' بریرہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: ''قسم اس ذات کی جس نے آپ کو سچا پیغمبر بنا کر بھیجا ہے! میں نے تو کوئی بات عائشہ رضی اللہ عنہا کی ایسی نہیں دیکھی جس پر عیب لگا سکوں۔ اتنی بات ہے کہ وہ ابھی کم سن ہے۔ گھر کا آٹا گندھا ہوتا ہے اور وہ سو جاتی ہے۔ اور بکری آٹا کھا جاتی ہے۔''

رسول اللہ ﷺ اس دن منبر پر خطبے کے لیے کھڑے ہوئے اور عبداللہ بن ابی کے مقابل مدد چاہی اور فرمایا:

«يَا مَعْشَرَ الْمُسْلِمِينَ! مَنْ يَّعْذِرُنِي مِنْ رَّجُلٍ قَدْ بَلَغَنِي أَذَاهُ فِي أَهْلِ بَيْتِي؟ فَوَاللّٰهِ مَاعَلِمْتُ عَلٰى أَهْلِي إِلَّا خَيْرًا. وَلَقَدْ ذَكَرُوا رَجُلًا مَّاعَلِمْتُ عَلَيْهِ إِلَّاخَيْرًا وَّمَا كَانَ يَدْخُلُ عَلٰى أَهْلِي إِلَّامَعِي»

''مسلمانو! کون میری حمایت و مدد کرتا ہے ایسے شخص کے بالمقابل جس نے میرے گھر والوں پر تہمت لگا کر مجھے اذیت دی ہے؟ اللہ کی قسم! میں تو اپنے گھر والوں کو نیک ہی سمجھتا ہوں۔ اور جس شخص پر تہمت لگائی گئی اس کو بھی نیک ہی سمجھتا ہوں، وہ کبھی میرے گھر میں اکیلا نہیں آیا۔ ہمیشہ میرے ساتھ ہی آیا کرتا تھا۔''

حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے: ''اے اللہ کے رسول! میں اس شخص کے مقابل آپ کی مدد کو تیار ہوں۔ اگر یہ شخص اوس قبیلے کا ہے تو ابھی اس کی گردن مارتا ہوں اور اگر ہمارے خزرجی بھائیوں سے ہے تو آپ جو حکم دیں گے ہم بجالائیں گے۔''

فتنۂ افک کے اثرات

ادھر خزرج کے سردار حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے۔ وہ اچھے نیک بخت آدمی تھے مگر انھیں قبائلی عصبیت نے آدبوچا۔ وہ سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ سے کہنے لگے: ''اللہ کی قسم! تو جھوٹ کہتا ہے۔ تو نہ اس کو مارے گا نہ مار سکے گا۔ اگر وہ تیرے قبیلے سے ہوتا تو تو کبھی اس کے قتل کو پسند نہ کرتا۔'' اتنے میں حضرت اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ جو سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے چچا زاد بھائی تھے کھڑے ہو گئے اور سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ سے کہنے لگے: ''اللہ کی قسم! تو جھوٹا ہے۔ ہم اس شخص کو ضرور قتل کریں گے۔ تو منافق ہے اور منافقوں کی طرف داری کرتا ہے۔'' اس گفتگو پر اوس اور خزرج دونوں قبائل کے لوگ کھڑے ہو گئے اور آپس میں

لڑنے ہی والے تھے۔ ادھر رسول اللہ ﷺ منبر ہی پر تھے۔ آپ ﷺ ان کو برابر پرسکون کر رہے تھے حتی کہ وہ خاموش ہو گئے۔ آپ ﷺ نے بھی خاموشی اختیار کی۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ دن بھر میرا یہ حال رہا کہ نہ آنسو تھمتے تھے نہ نیند آتی تھی۔ صبح کو میرے والدین بھی میرے پاس موجود تھے۔ میرا دو راتیں اور ایک دن سے یہی حال تھا کہ نہ نیند آتی نہ آنسو رکتے۔ میرے والدین یہ سمجھے کہ روتے روتے میرا کلیجہ پھٹ جائے گا۔

میرے والدین میرے پاس بیٹھے تھے۔ میں رو رہی تھی۔ اتنے میں ایک انصاری عورت نے اندر آنے کی اجازت مانگی۔ میں نے اجازت دے دی۔ وہ بھی میرے ساتھ بیٹھ کر رونے لگی۔ اس حالت میں رسول اللہ ﷺ تشریف لے آئے۔ آپ ﷺ نے سلام کیا اور بیٹھ گئے۔ جب سے یہ باتیں کہی جا رہی تھیں آپ ﷺ میرے پاس اس سے پہلے نہیں بیٹھے تھے۔

رسول اللہ ﷺ کا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے استفسار

ایک ماہ تک آپ ﷺ انتظار کرتے رہے لیکن میرے متعلق کوئی وحی نہ آئی۔ جب آپ ﷺ تشریف فرما ہوئے تو آپ ﷺ نے خطبہ پڑھا اور اس کے بعد فرمایا: «يَاعَائِشَةُ! فَإِنَّهُ قَدْ بَلَغَنِي عَنْكِ كَذَا وَكَذَا، فَإِنْ كُنْتِ بَرِيئَةً فَسَيُبَرِّئُكِ اللّٰهُ، وَإِنْ كُنْتِ أَلْمَمْتِ بِذَنْبٍ، فَاسْتَغْفِرِي اللّٰهَ وَتُوبِي إِلَيْهِ، فَإِنَّ الْعَبْدَ إِذَا اعْتَرَفَ بِذَنْبِهِ ثُمَّ تَابَ إِلَى اللّٰهِ، تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِ» ''عائشہ! مجھے تیرے متعلق ایسی ایسی بات پہنچی ہے۔ اب اگر تو پاک صاف ہے تو اللہ تعالیٰ تیری پاک دامنی عنقریب بیان کر دے گا۔ اور اگر واقعی تجھ سے کوئی قصور ہو گیا ہے تو تو اللہ تعالیٰ سے اپنے قصور کی بخشش مانگ اور توبہ کر کیونکہ بندہ جب اپنے گناہ کا اقرار کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں توبہ

کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کا گناہ معاف کر دیتے ہیں۔‘‘

آپ ﷺ یہ گفتگو کر چکے تو میرے آنسو ایسے رک گئے کہ آنسو کا ایک بھی قطرہ مجھے محسوس نہیں ہوتا تھا۔ میں نے اپنے والد صاحب سے کہا: ’’رسول اللہ ﷺ کو جواب دیں۔‘‘ انھوں نے کہا: ’’اللہ کی قسم! میں نہیں جانتا کہ رسول اللہ ﷺ کو کیا جواب دوں۔‘‘ پھر میں نے والدہ سے کہا: ’’آپ رسول اللہ کو جواب دیں۔‘‘ انھوں نے کہا: ’’میں نہیں جانتی کہ کیا جواب دوں۔‘‘ میں ایک کم عمر عورت تھی قرآن بھی زیادہ نہیں پڑھا تھا، بہر حال میں نے کہا: اللہ کی قسم! یہ بات جو آپ نے مسلسل سنی ہے یہ آپ کے دلوں میں بیٹھ گئی ہے۔ اور آپ اسے سچ سمجھنے لگے ہیں۔ اب اگر میں یہ کہوں کہ میں پاک ہوں اور اللہ خوب جانتا ہے کہ میں پاک ہوں، آپ مجھے سچا نہ سمجھیں گے اور اگر میں آپ کے سامنے گناہ کا اقرار کر لوں اور اللہ جانتا ہے کہ میں اس سے بری ہوں تو آپ مجھے سچا سمجھیں گے۔ اللہ کی قسم! میں اس وقت اپنی اور آپ کی مثال ایسی سمجھتی ہوں جو حضرت یوسف علیہ السلام کے والد کی تھی، انھوں نے یہی کہا تھا: ﴿فَصَبْرٌ جَمِيلٌ ۖ وَاللَّهُ الْمُسْتَعَانُ عَلَىٰ مَا تَصِفُونَ ۝﴾

’’لہٰذا صبر ہی بہتر ہے اور اس پر اللہ ہی سے مدد مطلوب ہے جو تم بیان کرتے ہو۔‘‘ [1]

یہ کہہ کر میں اپنے بستر پر لیٹ گئی۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ مجھ کو یقین تھا کہ میں پاک ہوں اور اللہ تعالیٰ میری براءت ضرور بیان کرے گا مگر اللہ کی قسم! مجھ کو ہرگز یہ گمان نہ تھا کہ اللہ تعالیٰ میرے متعلق قرآن کی ایسی آیات اتارے گا جو قیامت تک پڑھی جائیں گی۔ میں اپنے آپ کو اس سے حقیر سمجھتی تھی کہ میرے متعلق اللہ تعالیٰ اپنا ایسا کلام اتارے جسے لوگ ہمیشہ پڑھتے رہیں گے۔ ہاں یہ امید ضرور تھی کہ آپ ﷺ کو کوئی خواب دکھائی دے گا جس میں اللہ تعالیٰ میری براءت بیان کر دے گا۔

[1] یوسف 18:12۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی پاک دامنی پر وحی کا اترنا

عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ اللہ کی قسم! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس جگہ بیٹھے تھے وہاں سے ابھی ادھر ادھر نہ ہوئے اور نہ میرے گھر والوں میں سے کوئی باہر گیا کہ وحی آنا شروع ہو گئی۔ آپ پر حسب معمول شدت وحی والی کیفیت طاری ہو گئی۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بدن مبارک سے پسینہ موتیوں کی طرح ٹپکنے لگا، حالانکہ سردی کا دن تھا۔ جب وحی موقوف ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسکرا رہے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلی بات یہ فرمائی: «يَا عَائِشَةُ! أَمَّا اللّٰهُ۔ عَزَّ وَجَلَّ۔ فَقَدْ بَرَّأَكِ» ”عائشہ! اللہ تعالیٰ نے تجھے بے گناہ قرار دیا ہے۔“ یہ سنتے ہی میری والدہ کہنے لگیں: ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بڑھو۔“ میں نے کہا: ”اللہ کی قسم! نہیں اٹھوں گی۔ میں تو صرف اللہ کا شکر ادا کروں گی جو عزت اور بزرگی والا ہے۔“

اس وقت اللہ تعالیٰ نے سورۂ نور کی آیات نازل فرمائیں۔ اور پوری دس آیات۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ جَآءُوْ بِالْاِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنْكُمْ ۚ لَا تَحْسَبُوْهُ شَرًّا لَّكُمْ ۖ بَلْ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ مَّا اكْتَسَبَ مِنَ الْاِثْمِ ۚ وَالَّذِيْ تَوَلّٰى كِبْرَهٗ مِنْهُمْ لَهٗ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝ لَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بِاَنْفُسِهِمْ خَيْرًا وَّقَالُوْا هٰذَآ اِفْكٌ مُّبِيْنٌ ۝ لَوْلَا جَآءُوْ عَلَيْهِ بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ ۚ فَاِذْ لَمْ يَاْتُوْا بِالشُّهَدَآءِ فَاُولٰٓئِكَ عِنْدَ اللّٰهِ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ ۝ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ لَمَسَّكُمْ فِيْ مَآ اَفَضْتُمْ فِيْهِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝ اِذْ تَلَقَّوْنَهٗ بِاَلْسِنَتِكُمْ وَتَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِكُمْ مَّا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ وَّتَحْسَبُوْنَهٗ هَيِّنًا ۖ وَّهُوَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمٌ ۝ وَلَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ قُلْتُمْ مَّا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّتَكَلَّمَ بِهٰذَا سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ ۝ يَعِظُكُمُ اللّٰهُ اَنْ تَعُوْدُوْا لِمِثْلِهٖٓ اَبَدًا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ وَيُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ ۚ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ

يُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ○ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ وَاَنَّ اللّٰهَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ○﴾

''بے شک جو لوگ (ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر) بہتان گھڑ لائے وہ تمھی میں سے ایک گروہ ہیں، تم اسے اپنے لیے برا نہ سمجھو، بلکہ وہ تمھارے لیے بہتر ہے، ان میں سے ہر شخص کے لیے اتنا ہی گناہ ہے جو اس نے کمایا، اور ان میں سے وہ شخص جس نے اس (گناہ) کا بڑا بوجھ اٹھایا، اس کے لیے بہت بڑا عذاب ہے۔ جب تم نے یہ (جھوٹ) سنا تو کیوں نہ مومن مردوں اور مومن عورتوں نے اپنے نفسوں میں اچھا گمان کیا اور (کیوں نہ) کہا کہ یہ تو صریح بہتان ہے۔ وہ اس (الزام) پر چار گواہ کیوں نہ لائے؟ پھر جب وہ گواہ نہیں لائے تو وہی لوگ اللہ کے ہاں جھوٹے ہیں۔ اور اگر تم پر دنیا و آخرت میں اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو تم جن باتوں میں پڑ گئے تھے اس پر تمھیں بہت بڑا عذاب آلیتا۔ جب تم اسے ایک دوسرے سے اپنی زبانوں کے ساتھ لیتے تھے اور اپنے مونہوں سے (وہ بات) کہہ رہے تھے جس کا تمھیں علم نہ تھا، اور تم اسے معمولی سمجھ رہے تھے، جبکہ وہ اللہ کے ہاں بہت بڑی بات ہے۔ اور جب تم نے اسے سنا تھا تو کیوں نہ کہا: یہ ہمارے لائق نہیں کہ ہم اس کے متعلق بولیں (یا اللہ!) تو پاک ہے، یہ بہت بڑا بہتان ہے۔ اللہ تمھیں نصیحت کرتا ہے کہ اگر تم مومن ہو تو دوبارہ کبھی بھی اس جیسی بات نہ کرنا۔ اور اللہ تمھارے لیے (اپنی) آیات بیان کرتا ہے اور اللہ بڑا جاننے والا، خوب حکمت والا ہے۔ بے شک جو لوگ یہ پسند کرتے ہیں کہ ایمان لانے والوں میں بے حیائی پھیلے، ان کے لیے دنیا اور آخرت میں دردناک عذاب ہے اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔ اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ

ہوتی (تو اللہ بہتان لگانے والوں کو فوراً عذاب دیتا) اور یہ کہ بلاشبہ اللہ نہایت شفقت کرنے والا، بڑا رحم کرنے والا ہے۔''[1]

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا شوق مغفرت

ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں: جب میری براءت والی آیات نازل ہوئیں تو ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جو پہلے مسطح بن اثاثہ رضی اللہ عنہ پر رشتہ داری اور غربت کی بنا پر خرچ کرتے تھے یہ کہہ کر خرچ بند کر دیا: ''اللہ کی قسم! اب میں مسطح کو کبھی کچھ نہ دوں گا۔ اس نے عائشہ کے متعلق ایسی ایسی باتیں کی ہیں۔'' تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

﴿وَلَا يَأْتَلِ أُولُوا الْفَضْلِ مِنكُمْ وَالسَّعَةِ أَن يُؤْتُوا أُولِي الْقُرْبَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۖ وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا ۗ أَلَا تُحِبُّونَ أَن يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ ۗ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ﴾

''اور تم میں سے فضل اور وسعت والے، قرابت داروں اور مسکینوں اور اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے والوں کو (مالی مدد) دینے سے قسم نہ کھائیں اور چاہیے کہ وہ معاف کر دیں اور درگزر کریں۔ کیا تم یہ پسند نہیں کرتے کہ اللہ تمھاری مغفرت فرمائے اور اللہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔''[2]

اس پر ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''کیوں نہیں واقعتاً مجھے یہ پسند ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے بخش دے۔'' پھر وہ مسطح رضی اللہ عنہ پر اسی طرح خرچ کرنے لگے جس طرح پہلے کرتے تھے۔ اور کہنے لگے: ''اللہ کی قسم! میں مسطح رضی اللہ عنہ کا یہ خرچ کبھی بند نہیں کروں گا۔''

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے متعلق حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا سے بھی پوچھا تھا: «يَا زَيْنَبُ، مَاذَا عَلِمْتِ أَوْ رَأَيْتِ؟» ''زینب! تم

[1] النور 24:11-20. صحيح البخاري، حديث:4141، وصحيح مسلم، حديث:2770. [2] النور 22:24.

عائشہ کے متعلق کیا جانتی ہو یا تم نے کیا دیکھا ہے؟'' انھوں نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! میں اپنے کان اور آنکھ کی حفاظت کرتی ہوں۔ میں تو عائشہ کو اچھا ہی سمجھتی ہوں۔''

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج میں سے زینب رضی اللہ عنہا ہی میرے برابر تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی پرہیز گاری کی بنا پر انھیں بچا لیا اور ان کی بہن حمنہ بنت جحش رضی اللہ عنہا اپنی بہن کے لیے لڑتی ہوئی (کوشش کرتی ہوئی کیونکہ زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا ہی عائشہ رضی اللہ عنہا کے ہم پلہ تھیں) دیگر بہتان لگانے والوں کی طرح ہلاک ہوئی۔ [1]

دشمنانِ دین کی طرف سے تکالیف اور آزمائشوں کی ایک کڑی واقعۂ افک بھی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنوں پر اللہ تعالیٰ کی کرم نوازی تھی کہ اس کے غلط اور جھوٹا ہونے کو واضح فرما دیا۔ تاریخ نے متعدد صحیح روایات کی روشنی میں اس کے متعلق اہل ایمان کا موقف نقل کیا ہے۔ خاص طور پر حضرت ابو ایوب اور ام ایوب رضی اللہ عنہما کا کردار، [2] یہ ایسے کردار ہیں جن سے اہل ایمان رہنمائی لے سکتے ہیں۔ وحی کا سلسلہ اب منقطع ہو چکا ہے مگر قیامت تک آنے والی انسانی نسلوں کے لیے قرآن میں اسباق، نصائح اور عبرتیں موجود ہیں۔ [3]

آیات افک سے ماخوذ اہم احکام و مسائل

علماء نے واقعہ افک سے متعلق نازل شدہ آیات سے کئی ایک احکام و مسائل استنباط کیے ہیں، چیدہ چیدہ حسب ذیل ہیں:

[1] صحيح البخاري، حديث: 2661 و 4141. [2] واقعۂ افک کے سلسلے میں حضرت ابو ایوب اور ام ایوب رضی اللہ عنہما کا کردار نہایت ہی قابل ستائش ہے۔ اس موقع پر ام ایوب رضی اللہ عنہا نے حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ سے کہا: ''ابو ایوب! کیا آپ نے وہ باتیں سنی ہیں جو لوگ عائشہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں کہہ رہے ہیں؟'' ابو ایوب رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: ''جی ہاں! میں نے یہ باتیں سنی ہیں اور یہ سب جھوٹ ہے، اچھا یہ بتاؤ کیا تم ایسا (برا) کام کر سکتی ہو؟'' ام ایوب نے کہا: ''ہرگز نہیں، اللہ کی قسم! میں ایسا ہرگز نہیں کر سکتی۔'' سیدنا ابو ایوب رضی اللہ عنہ نے کہا: ''اللہ کی قسم! عائشہ تو تم سے کہیں بہتر ہیں (وہ ایسا گھناؤنا کام کیسے کر سکتی ہیں۔'') (السيرة النبوية لابن هشام: 268/4) [3] السيرة النبوية للدكتور مهدي رزق الله، ص: 440.

① قرآن پاک، جس کی تلاوت تاقیامت ہوتی رہے گی، میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی براءت کا اعلان: ارشاد ربانی ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ جَاءُوا بِالْإِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنكُمْ ۚ لَا تَحْسَبُوهُ شَرًّا لَّكُم ۖ بَلْ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُم مَّا اكْتَسَبَ مِنَ الْإِثْمِ ۚ وَالَّذِي تَوَلَّىٰ كِبْرَهُ مِنْهُمْ لَهُ عَذَابٌ عَظِيمٌ ○﴾

''بے شک جو لوگ (ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر) بہتان گھڑ لائے وہ تمھی میں سے ایک گروہ ہیں، تم اسے اپنے لیے برا نہ سمجھو، بلکہ وہ تمھارے لیے بہتر ہے، ان میں سے ہر شخص کے لیے اتنا ہی گناہ ہے جو اس نے کمایا اور ان میں سے وہ شخص جس نے اس (گناہ) کا بڑا بوجھ اٹھایا، اس کے لیے بہت بڑا عذاب ہے۔''[1]

② اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضا تھا کہ شر میں سے خیر پھوٹے۔ واقعۂ افک میں خاندان ابوبکر رضی اللہ عنہ کا امتحان ان کے لیے باعث خیر بن گیا۔ ان کے صبر اور ایمانی قوت پر ان کے لیے اجر عظیم لکھ دیا گیا۔

③ اہل ایمان کی اچھی شہرت اور باہمی حسنِ ظن کا انتہائی خیال، ارشاد الٰہی ہے:

﴿لَّوْلَا إِذْ سَمِعْتُمُوهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بِأَنفُسِهِمْ خَيْرًا وَقَالُوا هَٰذَا إِفْكٌ مُّبِينٌ ○﴾

''جب تم نے یہ (جھوٹ) سنا تو کیوں نہ مومن مردوں اور مومن عورتوں نے اپنے نفسوں میں اچھا گمان کیا اور (کیوں نہ) کہا کہ یہ تو صریح بہتان ہے۔''[2]

④ اس بہتان میں ملوث ہونے والوں کو جھوٹا قرار دینا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿لَّوْلَا جَاءُوا عَلَيْهِ بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ ۚ فَإِذْ لَمْ يَأْتُوا بِالشُّهَدَاءِ فَأُولَٰئِكَ عِندَ اللَّهِ هُمُ الْكَاذِبُونَ ○﴾

[1] النور 11:24. [2] النور 12:24.

”وہ اس (الزام) پر چار گواہ کیوں نہ لائے؟ پھر جب وہ گواہ نہیں لائے تو وہی لوگ اللہ کے ہاں جھوٹے ہیں۔“[1]

⑤ مومنوں پر اللہ تعالیٰ کے فضل اور ان کے ساتھ اللہ کی شفقت کا بیان، ارشاد ہے:

﴿وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ لَمَسَّكُمْ فِيْ مَآ اَفَضْتُمْ فِيْهِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ﴾

”اور اگر تم پر دنیا و آخرت میں اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو تم جن باتوں میں پڑ گئے تھے اس پر تمھیں بہت بڑا عذاب آلیتا۔“[2]

⑥ بات پھیلانے سے پہلے اس کی تحقیق کر لینی چاہیے۔ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَلَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ قُلْتُمْ مَّا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّتَكَلَّمَ بِهٰذَا سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ﴾

”اور تم نے ایسی بات کو سنتے ہی کیوں نہ کہہ دیا کہ ہمیں ایسی بات منہ سے نکالنی بھی لائق نہیں۔ اے اللہ! تو پاک ہے۔ یہ تو بڑا بہتان ہے۔“[3]

⑦ ایسے بڑے بڑے گناہوں کے ارتکاب کی ممانعت اور دوبارہ ایسی بات سے اجتناب کا حکم، ارشاد فرمایا:

﴿يَعِظُكُمُ اللّٰهُ اَنْ تَعُوْدُوْا لِمِثْلِهٖٓ اَبَدًا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾

”اللہ تمھیں نصیحت کرتا ہے کہ اگر تم مومن ہو تو دوبارہ کبھی بھی اس جیسی بات نہ کرنا۔“[4]

⑧ مومنوں میں بے حیائی پھیلانے کی ممانعت، ارشادِ الٰہی ہے:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾

”بے شک جو لوگ یہ پسند کرتے ہیں کہ ایمان لانے والوں میں بے حیائی پھیلے، ان

---

[1] النور 13:24. [2] النور 14:24. [3] النور 16:24. [4] النور 17:24.

کے لیے دنیا اور آخرت میں دردناک عذاب ہے اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔''[1]

⑨ بندوں پر اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کا بیان، اسے اللہ تعالیٰ نے بطور تاکید مکرر بیان فرمایا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ وَاَنَّ اللّٰهَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝ ﴾

''اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی (تو اللہ بہتان لگانے والوں کو فوراً عذاب دیتا) اور یہ کہ بلاشبہ اللہ نہایت شفقت کرنے والا، بڑا رحم کرنے والا ہے۔''[2]

⑩ شیطان کے نقش قدم پر چلنے کی ممانعت کیونکہ وہ ہلاکت میں ڈالتا ہے۔ ارشاد ہے:

﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۚ وَمَنْ يَّتَّبِعْ خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ فَاِنَّهٗ يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ﴾

''اے ایمان والو! تم شیطان کے قدموں کی اتباع نہ کرو اور جو کوئی شیطان کے قدموں کی اتباع کرتا ہے، تو بلاشبہ وہ (شیطان) تو بے حیائی اور برے کام ہی کا حکم دیتا ہے۔''[3]

⑪ رشتہ دار اگرچہ بدسلوکی کریں تب بھی ان پر خرچ کرنے کی ترغیب،[4] ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَلَا يَاْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ اَنْ يُّؤْتُوْۤا اُولِي الْقُرْبٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَالْمُهٰجِرِيْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۖ وَلْيَعْفُوْا وَلْيَصْفَحُوْا ۗ اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ ۗ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ ﴾

''اور تم میں سے فضل اور وسعت والے، قرابت داروں اور مسکینوں اور اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے والوں کو (مالی مدد) دینے سے قسم نہ کھائیں اور چاہیے کہ وہ معاف کر دیں اور درگزر کریں۔ کیا تم یہ پسند نہیں کرتے کہ اللہ تمھاری مغفرت

[1] النور 19:24۔ [2] النور 20:24۔ [3] النور 21:24۔ [4] حدیث القرآن عن غزوات الرسول ﷺ للدکتور محمد بکر آل عابد: 386,385/1۔

فرمائے اور اللہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔''[1]

⑫ سچے مومن بندوں کے متعلق اللہ تعالیٰ کی حمیت (غیرت)، ان کا دفاع اور جو کوئی ان پر بے حیائی کی تہمت لگائے اسے دنیا و آخرت میں لعنت کی ڈانٹ، ارشاد ربانی ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ يَرْمُونَ الْمُحْصَنَاتِ الْغَافِلَاتِ الْمُؤْمِنَاتِ لُعِنُوا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ○ يَوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ أَلْسِنَتُهُمْ وَأَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ○ يَوْمَئِذٍ يُوَفِّيهِمُ اللَّهُ دِينَهُمُ الْحَقَّ وَيَعْلَمُونَ أَنَّ اللَّهَ هُوَ الْحَقُّ الْمُبِينُ ○﴾

''بلاشبہ جو لوگ پاک دامن، بے خبر مومن عورتوں پر (زنا کی) تہمت لگاتے ہیں، ان پر دنیا اور آخرت میں لعنت کی گئی اور ان کے لیے بہت بڑا عذاب ہے۔ جس دن ان کی زبانیں اور ان کے ہاتھ اور ان کے پیر ان کے خلاف، ان اعمال کی گواہی دیں گے جو وہ کرتے تھے۔ اس دن اللہ انھیں پورا پورا، ان (کے حساب کتاب) کا ٹھیک بدلہ دے گا (جس کے وہ مستحق ہیں) اور وہ جان لیں گے کہ بے شک اللہ ہی واضح حق ہے۔''[2]

مذکورہ آیات کی تفسیر میں صاحب کشاف کا بیان ہے: پورے قرآن پاک کی ورق گردانی کر جائیے آپ کو گناہ گاروں کے متعلق اللہ تعالیٰ کی اتنی شدید وعید کہیں اور نظر نہیں آئے گی جتنی کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر تہمت لگانے والوں کے متعلق کی گئی ہے۔ اس ضمن میں واقعے کے مرکزی کرداروں کو اور ان کے طرز عمل کو بے حد قبیح سمجھا گیا ہے۔[3]

⑬ اللہ تعالیٰ کے ابدی قانون کا بیان کہ اللہ تعالیٰ نیک اور پاکیزہ مردوں کو پاکیزہ عورتوں کے نصیب میں کرتا ہے اور پاکدامن عورتوں کو پاکیزہ مردوں کے نصیب میں کرتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

---

1 النور22:24. 2 النور23:24-25. 3 حدیث القرآن عن غزوات الرسولﷺ للدکتور محمد بکر آل عابد:386/1.

﴿اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَالْخَبِيْثُوْنَ لِلْخَبِيْثٰتِ ۚ وَالطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَالطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبٰتِ ۚ اُولٰٓئِكَ مُبَرَّءُوْنَ مِمَّا يَقُوْلُوْنَ ۭ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ﴾

''خبیث عورتیں خبیث مردوں کے لیے ہیں اور خبیث مرد خبیث عورتوں کے لیے اور پاکیزہ عورتیں پاکیزہ مردوں کے لیے ہیں اور پاکیزہ مرد پاکیزہ عورتوں کے لیے، یہ (پاکیزہ) لوگ ان باتوں سے بری ہیں جو وہ (خبیث لوگ ان کی بابت) کہتے ہیں، ان کے لیے مغفرت اور بہت اچھا رزق ہے۔''[1]

⑭ واقعہ افک کے باعث لوگ چار گروہوں میں تقسیم ہو گئے: اس سلسلے میں ڈاکٹر شعبۃ الحمد حدیثِ اِفک پر حاشیہ آرائی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جب ام المؤمنین صدیقہ بنت صدیق رضی اللہ عنہا پر تہمت لگی تو لوگ حسب ذیل چار گروہوں میں بٹ گئے:[2]

❁ لوگوں کی اکثریت نے زبانوں اور کانوں پر کنٹرول کر لیا اور خاموشی اختیار کی۔ بات کی تو اچھی ورنہ تصدیق کی نہ تکذیب۔

❁ کچھ لوگ وہ تھے جنھوں نے فوراً اس کو جھوٹ اور بہتان سمجھا۔ ان میں ابو ایوب اور ام ایوب رضی اللہ عنہما تھے۔ انھوں نے سنتے ہی اسے جھوٹ کہا۔

❁ دیگر مسلمانوں نے اسے نہ سچا کہا نہ جھوٹا۔ نہ اس کی نفی کی لیکن وہ اہل اِفک کی باتوں کی طرح باتیں کرتے اور سمجھتے کہ اس معاملے پر باتیں کرنا اتنا سنگین نہیں کہ اللہ تعالیٰ گرفت فرمائے گا، اس لیے کہ نقل کفر کفر نہ باشد۔ واقعہ افک کو بیان کرنا تو بہتان تراشی نہیں۔ حمنہ بنت جحش، حسان بن ثابت اور مسطح بن اثاثہ انھی میں شامل تھے۔

❁ چوتھے وہ لوگ تھے جنھوں نے طوفان کھڑا کیا۔ ان کا سرغنہ اللہ کا دشمن عبداللہ بن ابی رئیس المنافقین تھا، یہی شخص واقعۂ افک کا ماسٹر مائنڈ تھا۔

ان میں دوسری قسم کے لوگوں کی فضیلت کے متعلق جل شانہ نے فرمایا کہ تمام مومنوں

[1] النور 24:26. [2] حدیث القرآن عن غزوات الرسول ﷺ للدکتور محمد بکر آل عابد: 387/1.

کو یہی موقف اختیار کرنا چاہیے تھا۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿لَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بِاَنْفُسِهِمْ خَيْرًا وَّقَالُوْا هٰذَآ اِفْكٌ مُّبِيْنٌ ۝﴾

”جب تم نے یہ (جھوٹ) سنا تو کیوں نہ مومن مردوں اور مومن عورتوں نے اپنے نفسوں میں اچھا گمان کیا اور (کیوں نہ) کہا کہ یہ تو صریح بہتان ہے۔“ [1]

تیسری قسم کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ایسی باتیں کرنا اُن کے لائق نہیں تھا۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿اِذْ تَلَقَّوْنَهٗ بِاَلْسِنَتِكُمْ وَتَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِكُمْ مَّا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ وَّتَحْسَبُوْنَهٗ هَيِّنًا وَّهُوَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمٌ ۝ وَلَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ قُلْتُمْ مَّا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّتَكَلَّمَ بِهٰذَا سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ ۝﴾

”جب تم اسے ایک دوسرے سے اپنی زبانوں کے ساتھ لیتے تھے اور اپنے مونہوں سے (وہ بات) کہہ رہے تھے جس کا تمھیں علم نہ تھا اور تم اسے معمولی سمجھ رہے تھے، جبکہ وہ اللہ کے ہاں بہت بڑی بات ہے۔ اور جب تم نے اسے سنا تھا تو کیوں نہ کہا: یہ ہمارے لائق نہیں کہ ہم اس کے متعلق بولیں (یا اللہ!) تو پاک ہے، یہ بہت بڑا بہتان ہے۔“ [2]

اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کے اعمال کی فضیلت کا تذکرہ فرمایا، مثلاً مسطح کی ہجرت اور ایمان کا بطور خاص اس وقت اثبات کیا جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مسطح کے رشتہ دار ہونے کے باوجود اس پر اس وقت صدقہ اور انفاق نہ کرنے کی قسم کھائی تو ارشاد ہوا:

﴿وَلَا يَاْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ اَنْ يُّؤْتُوْٓا اُولِي الْقُرْبٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَالْمُهٰجِرِيْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۖ وَلْيَعْفُوْا وَلْيَصْفَحُوْا ۭ اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝﴾

---

[1] النور 12:24. [2] النور 16,15:24.

''اور تم میں سے فضل اور وسعت والے، قرابت داروں اور مسکینوں اور اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے والوں کو (مالی مدد) دینے سے قسم نہ کھائیں اور چاہیے کہ وہ معاف کردیں اور درگزر کریں۔ کیا تم یہ پسند نہیں کرتے کہ اللہ تمھاری مغفرت فرمائے اور اللہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔''[1]

اس چوتھی قسم یعنی ابن ابی کا گروہ جنھوں نے یہ طوفان بدتمیزی برپا کیا تھا، ان کے خاتمہ بالکفر، مستقبل میں توبہ کے نامقبول ہونے اور دنیا و آخرت میں ان پر لعنت کا اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

﴿ إِنَّ الَّذِينَ يَرْمُونَ الْمُحْصَنَاتِ الْغَافِلَاتِ الْمُؤْمِنَاتِ لُعِنُوا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۝ يَوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ أَلْسِنَتُهُمْ وَأَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝ يَوْمَئِذٍ يُوَفِّيهِمُ اللَّهُ دِينَهُمُ الْحَقَّ وَيَعْلَمُونَ أَنَّ اللَّهَ هُوَ الْحَقُّ الْمُبِينُ ۝ ﴾

''بلاشبہ جو لوگ پاک دامن، بے خبر مومن عورتوں پر (زنا کی) تہمت لگاتے ہیں، ان پر دنیا اور آخرت میں لعنت کی گئی اور ان کے لیے بہت بڑا عذاب ہے۔ جس دن ان کی زبانیں اور ان کے ہاتھ اور ان کے پیر ان کے خلاف، ان اعمال کی گواہی دیں گے جو وہ کرتے تھے۔ اس دن اللہ انھیں پورا پورا، ان (کے حساب کتاب) کا ٹھیک بدلہ دے گا (جس کے وہ مستحق ہیں) اور وہ جان لیں گے کہ بے شک اللہ ہی واضح حق ہے۔''[2]

واقعۂ افک سے ماخوذ حکمتیں اور فوائد

بشریت رسول ﷺ: واقعۂ افک کے امتحان کی گھڑی اللہ تعالیٰ کی متعدد حکمتوں کو ساتھ لے کر آئی جن کا مقصود رسول گرامی ﷺ کی شخصیت کو نکھارنا تھا اور آپ کی شخصیت کو تمام

[1] النور 22:24. [2] النور 23:24-25، فقہ الإسلام شرح بلوغ المرام لعبدالقادر شیبة الحمد: 5/9.

عیوب سے مبرا کر کے پیش کرنا تھا۔ مثلاً: اگر وحی پیغمبر ﷺ کے اختیار میں ہوتی تو آپ ﷺ پورا ایک ماہ کڑی آزمائش میں نہ گزارتے۔ اس سے آپ ﷺ کی بشریت اور نبوت ثابت ہوگئی۔ لہٰذا جب وحی نے ام المؤمنین کے گرد اٹھنے والے اس طوفانِ بدتمیزی کو ختم کیا تو ام المؤمنین اور آپ ﷺ کے باہمی معاملات پہلی سطح پر واپس آ گئے۔ عسرت کی گھڑی کے بعد سب کے چہروں پر رونق لوٹ آئی۔ اس واقعے نے وحی کی حقیقت سے بھی پردہ کشائی کی۔ اگر یہ معاملہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہ ہوتا تو اس کے تاریک پہلو رسول گرامی ﷺ کے دل میں ہمیشہ کے لیے جگہ پکڑ لیتے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ معاملات میں اس کی جھلک ضرور نظر آتی۔ اللہ تعالیٰ کی یہی مشیت تھی کہ یہ آزمائش محمد رسول اللہ ﷺ کی نبوت کی بہت بڑی دلیل بن جائے۔[1]

حد قذف اور مسلمانوں کی عزتوں کی حفاظت میں اس کی اہمیت: واقعات وحوادث پیش آرہے تھے اور اسلامی معاشرے کی تربیت ہو رہی تھی۔ ''واقعۂ افک'' پیش آیا تو اللہ تعالیٰ نے کچھ ایسے احکام مقرر فرما دیے جو مسلمانوں کی عزت و ناموس کی حفاظت کے سلسلے میں ممد و معاون ثابت ہوئے۔ لہٰذا سورۂ نور نازل ہوئی۔ اس میں بدکار مرد و عورت کی سزا بتائی گئی، بدکاری کی قباحت بیان کی گئی اور یہ بتایا گیا کہ خاوند بیوی ایک دوسرے پر تہمت لگا دیں تو حاکم کی کیا ذمہ داری ہے اور یہ کہ جب کچھ لوگ پاک دامن عورتوں پر تہمت لگا دیں اور پھر ان کے پاس چار گواہ بھی نہ ہوں تو کیا کیا جائے۔ اس کے علاوہ دیگر احکام بھی اس سورت میں نازل ہوئے۔[2]

اسلام نے زنا کو حرام اور زنا کرنے والے کو سزا کا مستحق قرار دیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ زنا کا باعث بننے والے اسباب و ذرائع کا سد باب کیا، فحاشی کی تشہیر اور تہمت کو بھی

1 السيرة النبوية للدكتور مهدي رزق الله، ص:441. 2 حديث القرآن عن غزوات الرسول ﷺ للدكتور محمد بكر آل عابد:357/1.

حرام قرار دیا تاکہ معاشرے کو ایسی قباحتوں سے پاک رکھا جائے۔ کیونکہ بدکاری کے متعلق چہ میگوئیاں اور ہر وقت ایسی باتیں کرنا سننا اس معاملے کو سامعین کے لیے آسان کر دیتا ہے۔ اور کمزور دل افراد بھی اس کے ارتکاب کی جرأت کر دکھاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شریعت نے بدکاری کی تہمت حرام قرار دی اور جو کسی پاک دامن مرد عورت، طاہر مرد عورت، بے گناہ مرد، عورت پر تہمت لگائے اس کے لیے ''حد قذف'' یعنی 80 کوڑے کی سزا مقرر کر دی۔ اور جب تک وہ پکی سچی توبہ نہ کرے اس کی شہادت بھی نامقبول قرار دی۔[1]

رسول اللہ ﷺ نے مسطح، حسان اور حمنہ بنت جحش رضی اللہ عنہم پر حد قائم کی۔ محمد بن اسحاق وغیرہ کا خیال ہے کہ آپ ﷺ نے تہمت پر دو مردوں اور ایک عورت مسطح، حسان اور حمنہ رضی اللہ عنہم پر حد لگائی۔ اسے ترمذی نے نقل کیا ہے۔[2] امام قرطبی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ علماء کے ہاں مشہور و معروف یہی ہے کہ حضرت حسان، مسطح اور حمنہ رضی اللہ عنہم کو حد لگائی گئی تھی، جبکہ عبداللہ بن ابی کے متعلق حد کا تذکرہ نہیں آیا۔[3]

چند ضعیف اور ناقابل یقین روایات ایسی بھی ہیں جن میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ ابن ابی کو حد لگائی گئی تھی مگر وہ جملہ روایات اثبات مسئلہ کے لیے ناکافی ہیں۔[4] امام ابن قیم رحمہ اللہ ابن ابی پر حد نہ لگانے کی حکمت بیان کرتے ہیں:

- کہا گیا ہے کہ حدود جس پر نافذ کی جائیں اس کے لیے تخفیف اور کفارے کا سبب بنتی ہیں، جبکہ خبیث انسان اس لائق ہی نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس سے آخرت میں عذاب عظیم کا وعدہ کر رکھا ہے جو بذات خود حد قذف سے کفایت کر رہا ہے۔
- کہا گیا ہے کہ حد صرف شہادت، دلیل یا اقرار پر لگتی ہے، جبکہ اس نے نہ تو قذف کا

---

1 آثار تطبيق الشريعة للدكتور محمد الزاحم، ص: 117. 2 جامع الترمذي، حديث: 3181، امام ترمذی رحمہ اللہ نے ناموں کی صراحت نہیں کی۔ ناموں کی صراحت کے لیے دیکھیں: سنن أبي داود، حديث: 4475. 3 تفسير القرطبي: 12/197 و 201. 4 مرويات غزوة بني المصطلق لإبراهيم القريبي، ص: 242.

اقرار کیا اور نہ کسی نے اس کے خلاف گواہی دی۔ وہ اپنے ساتھیوں میں تذکرہ تو کرتا تھا مگر انھوں نے اس کے خلاف گواہی نہیں دی، جبکہ اہل ایمان میں وہ گفتگو ہی نہیں کرتا تھا۔

❁ کہا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مصلحت کے تحت اس پر حد قائم نہ کی جو حد لگانے سے بھی اہم تھی جیسا کہ آپ ﷺ نے اس کی طرف سے نفاق کے ظہور اور بار بار ایسی گفتگو ہونے کے باوجود جس کی سزا صرف قتل تھی، اسے قتل نہ کیا۔ یہ صرف اس لیے تھا کہ اس کی قوم کو اسلام سے محبت ہو اور وہ اسلام سے نفرت نہ کرنے لگیں۔ آخر میں امام ابن قیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ عین ممکن ہے کہ انھی اسباب کے پیش نظر آپ ﷺ نے اسے سزا نہ دی ہو۔[1]

ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا سے حضرت حسان رضی اللہ عنہ کی معذرت

روایات نے اس کی توضیح کر دی ہے کہ ابن ابی کے علاوہ جس کسی نے بھی واقعہ افک میں حصہ لیا سب نے توبہ کر لی۔ حضرت حسان رضی اللہ عنہ نے بھی اپنے فعل سے معذرت کر لی تھی۔ انھوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے شایان شان یہ اشعار بھی کہے تھے:[2]

''میں نے آپ کو آزاد عورت پایا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو معاف فرمائے۔ آپ پاک دامنوں میں سے ہیں نہ کہ گمراہی اختیار کرنے والیوں سے۔

عفیفہ باوقار اور باعصمت ہیں۔ انھیں کسی شبہ پر متہم نہیں کیا جاسکتا۔ وہ بے خبر مومن عورتوں کی غیبت سے بالکل پاک صبح کرتی ہیں۔

بلاشبہ جو بات کہی گئی ہے آپ قطعاً اس سے مبرا ہیں۔ وہ ایسے شخص کی بات ہے جو چغلی کرنے والا ہے (میری جانب سے ایسے اشعار نقل کرنے والا ہے جو میرے نہیں)

اگر میں آپ کی مذمت کر چکا ہوں جیسا کہ (چغل خوروں نے) آپ تک بات پہنچائی ہے تو (خدا کرے) میری انگلیاں میرا کوڑا (رسی) ہی نہ اٹھا سکیں (اپنا دفاع نہ کرسکوں)

[1] زاد المعاد:3/264,263. [2] زاد المعاد:3/264,263.

یہ کیونکر ہو سکتا ہے، جبکہ میری محبت اور میری حمایت، جب تک زندہ ہوں، آلِ رسول
کے لیے ہے جو محافل و مجالس کی زینت ہے۔
خاندانِ رسول کے لیے ایسی عزت اور مقام ہے کہ اس کے بالمقابل تمام لوگ
بونے (چھوٹے) نظر آتے ہیں۔''[1]

غزوۂ بنو مصطلق سے مستنبط احکام و مسائل

- جنھیں اسلام کی دعوت پہنچ چکی ہے ان پر بلا انتباہ شب خون مارنا جائز ہے۔
- آزادی کو بھی حق مہر قرار دیا جاسکتا ہے جیسا کہ آپ ﷺ نے غزوۂ بنو مصطلق میں جویریہ بنت حارث رضی اللہ عنہا کی آزادی کو اُن کا حق مہر ٹھہرایا تھا۔
- سفر میں متعدد بیویوں میں سے کسی ایک کو ہمراہ رکھنا ہو تو ان کے بیچ قرعہ اندازی درست ہے۔
- عرب کو بھی غلام بنایا جاسکتا ہے جیسا کہ اس غزوے میں ہوا، جمہور علماء کا بھی یہی نقطۂ نظر ہے۔[2]

علمائے امت کا اجماع ہے کہ نص قرآنی سے ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا کی پاک دامنی کے ثبوت کے بعد کوئی انھیں برا کہے یا جو تہمت ان پر لگی، پھر لگائے تو وہ قرآن پاک کا معاند و مخالف ہونے کی وجہ سے کافر ہے۔[3]

اس غزوے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سوال اور آپ ﷺ کی اجازت سے معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں سے عزل کرنا درست ہے۔ آپ ﷺ نے جواباً فرمایا تھا:

«مَاعَلَيْكُمْ أَلَّا تَفْعَلُوا، مَامِنْ نَسَمَةٍ كَائِنَةٍ إِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ إِلَّا وَهِيَ كَائِنَةٌ»

1 تاريخ الإسلام (المغازي) للذهبي، ص: 281، والسيرة النبوية لأبي شهبة: 263/2. 2 الأم للشافعي: 186/4. 3 شرح النووي: 643/5.

"عزل کرنے میں کیا حرج ہے؟ اللہ کے علم میں قیامت تک جو جان آنے والی ہے وہ ضرور آئے گی۔"[1]

جمہور کا خیال ہے کہ آزاد عورت کی اجازت کے ساتھ اس سے عزل کرنا جائز ہے۔[2]

نماز کا مقام و مرتبہ واضح کرنے اور اس کی اہمیت جتانے کے لیے آیت تیمّم اس غزوے میں اتری۔ یہ بات واضح کردی گئی ہے کہ پانی کی عدم دستیابی بھی ادائیگی نماز میں مانع نہیں ہوسکتی، حالانکہ پانی ہی طہارت کا ذریعہ ہے اور طہارت نماز کی اہم شرط ہے۔ اسی طرح خوف اور بے امنی بھی اقامت نماز میں رکاوٹ نہیں۔[3]

——— الحمد للہ دوسری جلد مکمل ہوئی ———

1 صحيح البخاري، حديث: 5210، وصحيح مسلم، حديث:1438، ومسند أحمد: 68/3 و 72. 2 نيل الأوطار للشوكاني:6/222-224. 3 صور و عبر من الجهاد النبوي للدكتور فوزي فيض الله، ص: 211,210.

سیرت النبی ﷺ

جلد دوم

نبی امی ﷺ کی سیرت مبارکہ کو امت نے ہر دور میں نئے سے نئے اسلوب میں پیش کیا ہے۔ سیرت کا موضوع ہر مؤلف، مترجم اور ناشر کے لیے حصول سعادت کا ذریعہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سیرت کی کتب اپنے اندر ندرت و حکمت کے کئی پہلو لیے ہوئے منصۂ شہود پر آتی اور داد تحسین وصول کرتی ہیں۔

زیر نظر کتاب بھی ندرت کے کئی پہلوؤں کی حامل ہے۔ سیرت مبارکہ اور قرآن مجید کے باہمی ربط کا اظہار، واقعات سیرت کے بیان میں اختلاف کا حل، اسلوب میں ادبی چاشنی اور سطر سطر سے نبی کریم ﷺ سے محبت کے جھلکتے آثار اس کتاب کی نمایاں خوبیاں ہیں مگر اس میں جس پہلو کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے وہ ہے واقعات سیرت کو متعدد قدیم مراجع سے اخذ کر کے انھیں موجودہ حالات پر منطبق کرنا اور ان سے دروس و عبر اور اسباق و نصائح کشید کر کے دور جدید سے ہم آہنگ کرنا ہے۔

علاوہ ازیں مؤلف کتاب ڈاکٹر علی محمد صلابی ﷾ سیرت طیبہ پر مستشرقین کے رکیک حملوں کا دندان شکن جواب دیتے ہیں اور اصول روایت کا دامن بھی نہیں چھوڑتے۔ اس طرح 350 قدیم و جدید مصادر و مراجع کی روشنی میں مرتب کردہ یہ کتاب سیرت اعلیٰ ترتیب، عمدہ اسلوب، دلکش پیرائے، انتہائی جامعیت، عبرتوں، حکمتوں اور اسباق سے لبریز، عمدہ طباعت کے ساتھ ایک عظیم شاہکار بن گئی ہے۔